معارف القرآن

جلد اوّل

سورۂ فاتحہ و سورۂ بقرہ

پارہ ۱ تا پارہ ۳ رکوع ۸

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان

مع

آسان ترجمہ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

ادارۃ المعارف
کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

نَحمدُہٗ ونستعینُہٗ ونستغفِرُہٗ ونُؤمن بہٖ ونتوکّلُ علیہِ

ونعوذُ باللہِ مِن شُرورِ انفُسِنا ومِن سیّأٰتِ أعمالِنا

من یّہدِہِ اللہُ فلا مُضِلّ لہٗ ومن یُّضللہ فلا ہادیَ لہٗ

ونشہدُ أن لّا اِلٰہ اِلّا اللہُ وحدہٗ لا شریک لہٗ

ونشہدُ أن سیّدنا ومولانا محمّدًا عبدہٗ ورسُولہٗ

صلّی اللہ تعالیٰ علیہِ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

معارف القرآن

جلد اوّل

سورۂ فاتحہ و سورۂ بقرہ ◻ پارہ: ۱ تا پارہ: ۳، رکوع: ۸

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مع

آسان ترجمۂ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

دفتر ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف حکومت سندھ

فون نمبر 021-99332012

موبائل نمبر 0300-3311811

جامع مسجد آرام باغ کراچی

نشانِ مجاریہ: آر۔آر۔او (اوقاف)
R.O. 38-2021

مورخہ 04-02-2021

تصدیق نامہ

ہم نے ''ادارۃ المعارف کراچی'' احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کی مطبوعہ تفسیر ''معارف القرآن'' مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان، جلد اوّل کی اپنی نگرانی میں مولانا مفتی محمد حنیف خالد صاحب (رجسٹرڈ پروف ریڈر محکمۂ اوقاف سندھ) سے پروف ریڈنگ کروائی ہے۔ تفسیر ''معارف القرآن'' کے مکمّل متن کو بغور پڑھا گیا، جو اَغلاط تھیں، انہیں بحمد اللہ دُرست کروادیا گیا ہے۔

لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ تفسیر ''معارف القرآن'' حتیّ الامکان لفظی اور اِعرابی اَغلاط سے اِن شاء اللہ تعالیٰ پاک ومبرّا ہے۔

نوٹ:۔حکومتِ پاکستان کے قانون کے مطابق کاپی رائٹس رجسٹریشن نمبر 2736 کے تحت تفسیر ''معارف القرآن'' (جلد اوّل) کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

المصدق

4-2-2021

RESEARCH AND REGISTRATION OFFICER
GOVERNMENT OF SINDH
AUQAF DEPARTMENT

مولانا مفتی منیر احمد طارق
ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف سندھ
حکومتِ سندھ

باھتمام : محمد مشتاق ستی

طبع جدید : محرّم ۱۴۴۴ھ - اگست ۲۰۲۲ء ④

مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر : اِدارۃ المعارف کراچی

عرضِ ناشر:- اگرچہ ''معارف القرآن'' کی تصحیح کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی کمپیوٹر کمپوزنگ وکتابت، طباعت اور جلد بندی وغیرہ میں سہواً غلطی ہوجاتی ہے، اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو برائے کرم مُطّلع فرمائیں۔

اِدارۃ المعارف کراچی

احاطۂ جامعہ دارالعلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی پوسٹ کوڈ: 75180

فون: 021-35032020 ، 021-35123161

موبائل: 0300 - 2831960

ای میل: imaarif@live.com

Idaratul-ma-Arif Karachi-14 Pakistan.

بسم الله الرحمن الرحيم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

❋❋❋

پیش لفظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی، وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی

اما بعد: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے والدِ ماجد مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کی تفسیر ''معارف القرآن'' کو جو مقبولیت اور نافعیت عطا فرمائی ہے، اس کی نظیر دوسری کتابوں میں خال خال ہی مل سکتی ہے۔ اگرچہ حضرت والد ماجد قدس سرہٗ نے یہ تفسیر اپنی عمر کے آخری پانچ سالوں میں تالیف فرمائی جبکہ ایک طرف آپ پر ضعف وعلالت کا غلبہ تھا، اور دوسری طرف آپ گوناگوں مشاغل میں گھرے ہوئے تھے۔ لیکن جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیقِ خاص شاملِ حال ہوتی ہے تو یہ رکاوٹیں رکاوٹیں نہیں رہتیں، چنانچہ حضرت نے ان تمام عوائق کے باوجود کراماتی رفتار سے یہ تفسیر مکمل فرمائی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اس کی نافعیت چاردانگِ عالم میں پھیلی۔ اسی مقبولیت کا یہ ثمرہ ہے کہ اس کے ترجمے انگریزی، فارسی، بنگلہ، پشتو، سندھی اور ٹامل زبانوں میں بھی ہوئے جو اپنے اپنے علاقوں کو سیراب کررہے ہیں، اور اب عربی زبان میں بھی اس کا ترجمہ سہ ماہی ''البلاغ'' عربی میں قسط وار شائع ہورہا ہے۔

اب تک یہ کتاب پرانے طرز کی کتابت میں شائع ہوتی رہی ہے جس میں متعدد کاتبوں کے قلم لگے ہیں، اور کتابت کی اغلاط بھی وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی ہیں جن کی مختلف اوقات میں تصحیح بھی ہوتی رہی۔ لیکن اب اس بات کی ضرورت محسوس ہورہی تھی کہ اسے کمپیوٹر پر کمپوز کرکے جدید انداز میں شائع کیا جائے اور حتی الامکان کتابت کی غلطیوں کو بھی مزید درست کیا جائے۔

جب اس کام کا ارادہ کیا گیا تو قارئین کی طرف سے متعدد فرمائشیں تھیں، ان کو بھی اس نئے ایڈیشن میں پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ نئی کمپوزنگ کے علاوہ اس اڈیشن میں مندرجہ ذیل کام کئے گئے ہیں:-

(۱) قرآنِ کریم کا عربی متن ایک تصحیح شدہ سافٹ ویئر خرید کر اُس سے لیا گیا ہے جس کے بارے میں قوی اُمید ہے کہ انشاء اللہ وہ اغلاط سے خالی ہوگا۔

(۲) زمانے کی تبدیلی سے قارئین کی اردو زبان کی سمجھ میں بھی کمی آرہی ہے، اور یہ شکایت بکثرت ملتی رہتی تھی کہ قرآنِ کریم کے جو ترجمے ''معارف القرآن'' میں شامل ہیں وہ قارئین کی سمجھ سے بالاتر ہوگئے ہیں۔ اس لئے اس اڈیشن

میں بندہ کا کیا ہوا ''آسان ترجمۂ قرآن'' بھی شامل کر دیا گیا ہے جس کے بارے میں ابھی تک لوگوں کا یہ تبصرہ سامنے آیا ہے کہ وہ ان کی سمجھ سے قریب تر ہے۔ چنانچہ اب اس اڈیشن میں قرآنِ کریم کے تین ترجمے بیک وقت قارئین کے سامنے ہوں گے۔ یعنی ایک تو شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ کا ترجمہ، دوسرے حکیم الامہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کا ترجمہ مع خلاصۂ تفسیر۔ اور تیسرے بندہ کا ''آسان ترجمۂ قرآن''۔

(۳) اب تک معارف القرآن کے قارئین کی طرف سے کتابت وغیرہ کی جن اغلاط کی نشاں دہی کی گئی تھی، بفضلہٖ تعالیٰ ان سب کو دارالعلوم کراچی کے مستند علماء کرام کے ذریعے درست کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، اور بیشتر مواقع پر بندہ نے خود اس کام کی نگرانی کی ہے۔

(۴) ہماری درخواست پر مولانا محمد حنیف خالد صاحب استاذ دارالعلوم کراچی نے پوری تفسیر کو از اوّل تا آخر پڑھ کر جہاں ضروری سمجھا، اصل مسودے سے اس کا مقابلہ کیا ہے اور جہاں کتابت وغیرہ کی غلطی محسوس کی، وہاں اس کو درست کر دیا ہے۔ نیز تفسیر میں جہاں جہاں دوسری آیتیں مذکور ہیں، اُن کی سورت اور آیت نمبر کا حوالہ درج کر دیا ہے۔ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی پر حرکات لگادی گئی ہیں۔

(۵) تفسیر کے دوران حضرت مصنف قدس سرہٗ نے بکثرت عربی یا فارسی کے اشعار درج فرمائے تھے، قارئین کی فرمائش کے مطابق ان کا ترجمہ درج کر دیا گیا ہے۔

(۶) ''معارف ومسائل'' میں جو تفسیری اقوال یا فقہی مسائل مذکور ہیں، ان کی تخریج کی بھی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ مولانا طاہر اقبال صاحب استاذ دارالعلوم کراچی نے بڑی محنت سے ان تمام حوالوں کی مکمل تخریج فرمائی ہے، اور ان کے مآخذ صفحہ اور جلد نمبر کی تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائے ہیں۔ ان دونوں حضرات کی خدمت کے لئے ادارہ تہِ دل سے شکر گزار ہے، جزاهما الله تعالىٰ خيرًا۔

برادرِ عزیز محمد مشتاق سنی صاحب نے اس اڈیشن کی تیاری میں جو محنت کی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اس کی بہترین جزا دنیا و آخرت میں عطا فرمائیں۔ آمین

اس طرح اُمید ہے کہ انشاء اللہ اس نئے لباس میں اس عظیم اور شہرۂ آفاق تفسیر کی افادیت اور زیادہ عام اور تام ہوگی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائیں، اور یہ مسلمانوں کے لئے مزید نفع اور حضرت مؤلف قدس سرہٗ کے لئے درجات میں مزید بلندی کا ذریعہ بنے۔ آمین

بندہ محمد تقی عثمانی

۲۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مُقدّمہ

علومِ قرآن اور علمِ تفسیر سے متعلّق ضروری معلومات

از

محمّد تقی عُثمانی

اُستاذِ حدیث جامعہ دار العلوم کراچی

(فرزند حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

پیش لفظ

والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مد ظلہم کی تفسیر ''معارف القرآن'' کو اللہ تعالیٰ نے عوام وخواص میں غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی، اور جلد اوّل کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہوگیا۔ دُوسرے ایڈیشن کی طباعت کے وقت حضرت مصنف مد ظلہم نے جلد اوّل پر مکمل طور سے نظرِ ثانی فرمائی، اوراس میں کافی ترمیم واضافہ عمل میں آیا۔ اسی کے ساتھ حضرتِ موصوف مد ظلہم کی خواہش تھی کہ دُوسری اِشاعت کے وقت جلد اوّل کے شروع میں علومِ قرآن اور اُصولِ تفسیر سے متعلق ایک مختصر مقدمہ بھی تحریر فرمائیں، تاکہ تفسیر کے مطالعے سے پہلے قارئین ان ضروری معلومات سے مستفید ہوسکیں، لیکن متواتر اَمراض اور ضعف کی بناء پر موصوف کے لئے بذاتِ خود اس مقدمے کی تصنیف مشکل تھی، چنانچہ حضرتِ موصوف نے یہ ذمہ داری احقر کے سپرد فرمائی۔

احقر نے تعمیلِ حکم اور تحصیلِ سعادت کے لئے یہ کام شروع کیا تو یہ مقدمہ بہت طویل ہوگیا، اور علومِ قرآن کے موضوع پر خاصی مفصل کتاب کی صورت بن گئی، اس پوری کتاب کو ''معارف القرآن'' کے شروع میں بطورِ مقدمہ شامل کرنا مشکل تھا، اس لئے حضرت والد صاحب مد ظلہم کے ایماء پر احقر نے اس مفصل کتاب کی تلخیص کی، اور صرف وہ مباحث باقی رکھے جن کا مطالعہ تفسیر ''معارف القرآن'' کے مطالعہ کرنے والے کے لئے ضروری تھا، اور جو ایک عام قاری کے لئے دِلچسپی کا باعث ہوسکتے تھے۔ یہ تلخیص ''معارف القرآن'' جلد اوّل کے زیرِ نظر ایڈیشن میں بطورِ مقدمہ شامل کی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ اسے مسلمانوں کے لئے نافع اور مفید بنائے اور اس ناچیز کے لئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہو۔

ان موضوعات پر مبسوط علمی مباحث احقر کی اُس مفصل کتاب میں مل سکیں گے جو اِن شاء اللہ عنقریب مستقل کتابی صورت میں شائع ہوگی، [1] لہٰذا جو حضرات تحقیق اور تفصیل کے طالب ہوں، وہ اُس کتاب کی طرف رُجوع فرمائیں۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ

احقر

محمد تقی عثمانی

۲۳/ربیع الاوّل ۱۳۹۴ھ

جامعہ دار العلوم کراچی

---

[1] الحمد للہ یہ کتاب ''علوم القرآن'' کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ (ناشر)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی

وحی اور اُس کی حقیقت

قرآنِ کریم چونکہ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل کیا گیا ہے، اس لئے سب سے پہلے وحی کے بارے میں چند ضروری باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

وحی کی ضرورت

ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِنسان کو اِس دُنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا ہے، اور اس کے ذمہ کچھ فرائض عائد کر کے پوری کائنات کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے، لہٰذا دُنیا میں آنے کے بعد اِنسان کے لئے دو کام ناگزیر ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے اور اس میں پیدا کی ہوئی اشیاء سے ٹھیک ٹھیک کام لے، اور دُوسرے یہ کہ اس کائنات کو اِستعمال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اَحکام کو مدِنظر رکھے، اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔

ان دونوں کاموں کے لئے اِنسان کو ''علم'' کی ضرورت ہے، اس لئے کہ جب تک اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کونسی چیز کے کیا خواص ہیں؟ ان سے کس طرح فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دُنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے کے لئے اِستعمال نہیں کرسکتا، نیز جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کونسے کاموں کو پسند اور کن کو ناپسند فرماتا ہے؟ اس وقت تک اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا ممکن نہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اِنسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعہ اسے مذکورہ باتوں کا علم حاصل ہوتا ہے، ایک اِنسان کے حواس، یعنی آنکھ، کان، منہ اور ہاتھ پاؤں، دُوسرے عقل، اور تیسرے وحی، چنانچہ اِنسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعہ معلوم ہوجاتی ہیں، بہت سی عقل کے ذریعہ، اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہوسکتیں اُن کا علم وحی کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے۔

علم کے ان تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص دائرۂ کار ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں دیتا، چنانچہ جو چیزیں اِنسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں اُن کا علم نِری عقل سے نہیں ہوسکتا، مثلاً ایک دیوار کو آنکھ سے دیکھ کر آپ کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ اس کا رنگ سفید ہے، لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں کو بند کر کے صرف عقل کی مدد سے اس دیوار کا رنگ معلوم کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم نہیں ہوسکتیں، مثلاً آپ آنکھوں سے دیکھ کر یا ہاتھوں سے چھوکر یہ پتہ نہیں لگا سکتے کہ اس دیوار کو کسی اِنسان نے بنایا ہے، بلکہ اس نتیجے تک پہنچنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔

غرض جہاں تک حواسِ خمسہ کام دیتے ہیں وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی، اور جہاں حواسِ خمسہ جواب دے دیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے، لیکن اس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے، یہ بھی ایک حد پر جا کر رُک جاتی ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے اور نہ عقل کے ذریعہ، مثلاً اسی دیوار کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ اس کو کس طرح اِستعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی اور کس طرح اِستعمال کرنے سے ناراض ہوگا، یہ نہ حواس کے ذریعہ ممکن ہے نہ عقل کے ذریعہ، اس قسم کے سوالات کا جواب اِنسان کو دینے کے لئے جو ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مقرّر فرمایا ہے اسی کا نام ''وحی'' ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب فرما کر اسے اپنا پیغمبر قرار دے دیتا ہے اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے، اسی کلام کو ''وحی'' کہا جاتا ہے۔

اس سے واضح ہوگیا کہ وحی اِنسان کے لئے وہ اعلیٰ ترین ذریعۂ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق اُن سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ حل نہیں ہوسکتے، لیکن ان کا علم حاصل کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرف عقل اور مشاہدہ اِنسان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس کی ہدایت کے لئے وحیٔ اِلٰہی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور چونکہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اُس جگہ آتی ہے جہاں عقل کام نہیں دیتی، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ وحی کی ہر بات کا اِدراک عقل سے ہو ہی جائے، بلکہ جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے، اسی طرح بہت سے دِینی عقائد کا علم عطا کرنا بھی عقل کے بجائے وحی کا منصب ہے، اور ان کے اِدراک کے لئے نِری عقل پر بھروسہ کرنا دُرست نہیں۔

جو شخص (معاذ اللہ) خدا کے وجود ہی کا قائل نہ ہو، اس سے تو وحی کے مسئلہ پر بات کرنا بالکل بے سود ہے، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرتِ کاملہ پر اِیمان رکھتا ہے اس کے لئے وحی کی عقلی ضرورت، اس کے اِمکان اور حقیقی وجود کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں، اگر آپ اس بات پر اِیمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادرِ مطلق نے پیدا کی ہے، وہی اس کے مربوط اور مستحکم نظام کو اپنی حکمتِ بالغہ سے چلا رہا ہے، اور اسی نے اِنسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے،

تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے اِنسان کو پیدا کرنے کے بعد اُسے بالکل اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو، اور اُسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دُنیا میں آیا ہے؟ یہاں اس کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ اس کی منزلِ مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصدِ زندگی کو حاصل کرسکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کے ہوش وحواس سلامت ہوں ایسا کرسکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت کسی سفر پر بھیج دے، اور اُسے نہ چلتے وقت سفر کا مقصد بتائے، اور نہ بعد میں کسی پیغام کے ذریعہ اُس پر یہ واضح کرے کہ اُسے کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے؟ اور سفر کے دوران اس کی ڈیوٹی کیا ہوگی؟ جب ایک معمولی عقل کا اِنسان بھی ایسی حرکت نہیں کرسکتا تو آخر اس خداوندِ قدّوس کے بارے میں یہ تصوّر کیسے کیا جاسکتا ہے جس کی حکمتِ بالغہ سے کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے؟ یہ آخر کیسے ممکن ہے کہ جس ذات نے چاند، سورج، آسمان، زمین، ستاروں اور سیاروں کا ایسا محیر العقول نظام پیدا کیا ہو وہ اپنے بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا انتظام بھی نہ کرسکے جس کے ذریعہ اِنسانوں کو ان کے مقصدِ زندگی سے متعلق ہدایات دی جاسکیں؟ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ پر ایمان ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس نے اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا، بلکہ ان کی رہنمائی کے لئے کوئی باقاعدہ نظام ضرور بنایا ہے، بس رہنمائی کے اسی باقاعدہ نظام کا نام وحی و رِسالت ہے۔

اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ''وحی'' محض ایک دِینی اِعتقاد ہی نہیں بلکہ ایک عقلی ضرورت ہے، جس کا اِنکار درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا اِنکار ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کے طریقے

وحی و رِسالت کا یہ مقدس سلسلہ سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا، اب کسی اِنسان پر نہ وحی نازل ہوگی اور نہ اس کی ضرورت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف طریقوں سے وحی نازل ہوتی تھی، صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حارث بن ہشامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے، اور وحی کی یہ صورت میرے لئے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس آواز نے کہا ہوتا ہے، مجھے یاد ہو چکا ہوتا ہے، اور کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک مرد کی صورت میں آجاتا ہے۔[1]

اس حدیث میں آپ نے ''وحی'' کی آواز کو گھنٹیوں کی آواز سے جو تشبیہ دی ہے، شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک تو وحی کی آواز گھنٹی کی طرح مسلسل ہوتی ہے اور بیچ میں ٹوٹتی نہیں، دُوسرے گھنٹی جب مسلسل بجتی

[1] صحیح بخاری ج:۱ ص:۲

ہے تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور کلامِ الٰہی کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی کوئی ایک سمت نہیں ہوتی، بلکہ ہر جہت سے آواز سنائی دیتی ہے، اس کیفیت کا صحیح اِدراک تو بغیر مشاہدہ کے ممکن نہیں، لیکن اس بات کو عام ذہنوں سے قریب کرنے کے لئے آپ نے اُسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دی ہے۔ [۱]

جب اس طریقے سے آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ پر بہت زیادہ بوجھ پڑتا تھا، حضرت عائشہؓ اسی حدیث کے آخر میں فرماتی ہیں کہ میں نے سخت جاڑوں کے دن میں آپ پر وحی نازل ہوتے ہوئے دیکھی ہے، ایسی سردی میں بھی جب وحی کا سلسلہ ختم ہوتا تو آپ کی مبارک پیشانی پسینے سے شرابور ہو چکی ہوتی تھی۔ ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کا سانس رُکنے لگتا، چہرۂ انور متغیر ہو کر کھجور کی شاخ کی طرح زرد پڑ جاتا، سامنے کے دانت سردی سے کپکپانے لگتے، اور آپ کو اتنا پسینہ آتا کہ اس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے۔ [۲]

وحی کی اس کیفیت میں بعض اوقات اتنی شدّت پیدا ہو جاتی کہ آپ جس جانور پر اُس وقت سوار ہوتے وہ آپ کے بوجھ سے دَب کر بیٹھ جاتا۔ اور ایک مرتبہ آپ نے اپنا سرِ اَقدس حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے زانو پر رکھا ہوا تھا کہ اسی حالت میں وحی نازل ہونی شروع ہوگئی، اس سے حضرت زیدؓ کی ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی۔ [۳]

بعض اوقات اس وحی کی ہلکی ہلکی آواز دُوسروں کو بھی محسوس ہوتی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کے چہرۂ انور کے قریب شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سنائی دیتی تھی۔ [۴]

وحی کی دُوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ کسی اِنسانی شکل میں آپ کے پاس آکر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیتا تھا، ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبریل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے، البتہ بعض اوقات کسی دُوسری صورت میں بھی تشریف لائے ہیں۔ بہرکیف! جب حضرت جبریل اِنسانی شکل میں وحی لے کر آتے تو نزولِ وحی کی یہ صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سب سے آسان ہوتی تھی۔ [۵]

وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبریل علیہ السلام کسی اِنسان کی شکل اِختیار کئے بغیر اپنی اصل صورت میں دِکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپ کی تمام عمر میں صرف تین مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ اس وقت جب آپ نے خود حضرت جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، دُوسری مرتبہ معراج میں، اور تیسری بار نبوّت کے

---

۱ فیض الباری ج:۱ ص:۱۹ و۲۰ — ۲ الإتقان ج:۱ ص:۴۶

۳ زاد المعاد ج:۱ ص:۱۸ و۱۹ — ۴ تبویب مسند احمد، کتاب السیرة النبویة ج:۲۰ ص:۲۱۲

۵ الإتقان ج:۱ ص:۴۶

بالکل ابتدائی زمانے میں مکہ مکرمہ کے مقام "اَجیاد" پر۔ پہلے دو واقعات تو صحیح سند سے ثابت ہیں، البتہ یہ آخری واقعہ سنداً کمزور ہونے کی وجہ سے مشکوک ہے۔ [۱]

چوتھی صورت براہِ راست اور بلاواسطہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہم کلامی کی ہے، یہ شرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری کی حالت میں صرف ایک بار، یعنی معراج کے وقت حاصل ہوا ہے، البتہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے ہیں۔ [۲]

وحی کی پانچویں صورت یہ تھی کہ حضرت جبریل علیہ السلام کسی بھی صورت میں سامنے آئے بغیر آپ کے قلبِ مبارک میں کوئی بات القاء فرمادیتے تھے، اسے اِصطلاح میں "نفث فی الروع" کہتے ہیں۔ [۳]

تاریخ نزولِ قرآن

قرآنِ کریم دراصل کلام اِلٰہی ہے، اس لئے اَزَل سے لوحِ محفوظ میں موجود ہے، قرآنِ کریم کا اِرشاد ہے: بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾ (البروج) (بلکہ یہ قرآن مجید ہے، لوحِ محفوظ میں)۔ پھر لوحِ محفوظ سے اس کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ یہ پورے کا پورا آسمانِ دُنیا کے بیتِ عزّت میں نازل کردیا گیا تھا، بیتِ عزّت (جسے البیت المعمور بھی کہتے ہیں) کعبۃ اللہ کے محاذات میں آسمان پر فرشتوں کی عبادت گاہ ہے، یہ نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا، پھر دُوسری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھوڑا تھوڑا کرکے حسبِ ضرورت نازل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ تیئس سال میں اس کی تکمیل ہوئی، نزولِ قرآن کی یہ دو صورتیں خود قرآنِ کریم کے اندازِ بیان سے بھی واضح ہیں، اس کے علاوہ نسائیؒ، بیہقیؒ اور حاکم وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدّد روایتیں نقل کی ہیں، جن کا خلاصہ یہی ہے کہ قرآنِ کریم کا پہلا نزول یکبارگی آسمانِ دُنیا پر ہوا، اور دُوسرا نزول بتدریج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ [۴]

قرآنِ کریم کو پہلی مرتبہ آسمانِ دُنیا پر نازل کرنے کی حکمت اِمام ابوشامہؒ نے یہ بیان کی ہے کہ اس سے قرآنِ کریم کی رفعتِ شان کو ظاہر کرنا مقصود تھا، اور ملائکہ کو یہ بات بتانی تھی کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے جو اہلِ زمین کی ہدایت کے لئے اُتاری جانے والی ہے۔

شیخ زرقانیؒ نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ اس طرح دو مرتبہ اُتارنے سے یہ بھی جتانا مقصود تھا کہ یہ کتاب ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک کے علاوہ یہ دو جگہ اور بھی محفوظ ہے، ایک لوحِ محفوظ میں

---

[۱] فتح الباری ج:۱ ص:۱۸ و ۱۹
[۲] الإتقان ج:۱ ص:۴۶
[۳] بحوالۂ بالا۔
[۴] الإتقان ج:۱ ص:۴۱

اور دُوسرے بیتِ عزّت میں۔ [1]

اس پر تقریباً اِتفاق ہے کہ قرآنِ کریم کا دُوسرا تدریجی نزول جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر ہوا، اس کا آغاز اس وقت ہوا جب آپ کی عمر چالیس سال تھی، اس نزول کی اِبتداء بھی صحیح قول کے مطابق لیلۃ القدر میں ہوئی ہے اور یہی وہ تاریخ تھی جس میں چند سال بعد غزوۂ بدر پیش آیا۔ لیکن یہ رات رمضان کی کونسی تاریخ میں تھی؟ اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، بعض روایات سے رمضان کی سترہویں، بعض سے اُنیسویں اور بعض سے ستائیسویں شب معلوم ہوتی ہے۔ [2]

سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت

صحیح قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآنِ کریم کی سب سے پہلی جو آیتیں اُتریں وہ سورۂ عَلَق کی اِبتدائی آیات ہیں، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ اس کا واقعہ یہ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی اِبتدا تو سچے خوابوں سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپ کو خلوت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس دوران آپ غارِ حراء میں کئی کئی راتیں گزارتے، اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ ایک دن اسی غار میں آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتہ آیا، اور اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ "اِقْرَأْ" (یعنی پڑھو) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس کے بعد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ بیان کیا کہ میرے اس جواب پر فرشتے نے مجھے پکڑا اور مجھے اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی اِنتہا ہوگئی، پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا، اور دوبارہ کہا کہ "اِقْرَأْ" میں نے جواب دیا کہ "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں" فرشتے نے مجھے پھر پکڑا اور دوبارہ اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی اِنتہا ہوگئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا کہ "اِقْرَأْ" میں نے جواب دیا کہ "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس پر اُس نے مجھے تیسری مرتبہ پکڑا اور بھینچ کر چھوڑ دیا، پھر کہا:-

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝١ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝٢ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝٣ الخ (العلق)

"پڑھو، اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے اِنسان کو منجمد خون سے پیدا کیا،
پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے۔" الخ

یہ آپ پر نازل ہونے والی پہلی آیات تھیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ بند رہا، اسی زمانہ کو "فترتِ وحی" کا زمانہ کہتے ہیں، پھر تین سال کے بعد وہی فرشتہ جو غارِ حراء میں آیا تھا، آپ کو آسمان و زمین کے درمیان دِکھائی دیا، اور اس

---

[1] مناھل العرفان ج:۱ ص:۳۹ [2] تفسیر ابن جریر ج:۱۰ ص:۷

نے سورۂ مدثر کی آیات آپ کو سنائیں، اس کے بعد وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

مکی اور مدنی آیات

آپ نے قرآنِ کریم کی سورتوں کے عنوان میں دیکھا ہو گا کہ کسی سورۃ کے ساتھ ''مکی'' اور کسی کے ساتھ ''مدنی'' لکھا ہوتا ہے، اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے، مفسرین کی اِصطلاح میں ''مکی آیت'' کا مطلب وہ آیت ہے جو آپ کے بغرضِ ہجرت مدینہ طیبہ پہنچنے سے پہلے پہلے نازل ہوئی، اور ''مدنی آیت'' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آپ کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی۔ بعض لوگ ''مکی'' کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہرِ مکہ میں نازل ہوئی، اور ''مدنی'' کا یہ کہ وہ شہرِ مدینہ میں اُتری، لیکن یہ مطلب دُرست نہیں، اس لئے کہ کئی آیتیں ایسی ہیں جو شہرِ مکہ میں نازل نہیں ہوئیں لیکن چونکہ ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھیں اس لئے انہیں ''مکی'' کہا جاتا ہے، چنانچہ جو آیات منیٰ، عرفات یا سفرِ معراج کے دوران نازل ہوئیں ان کو بھی ''مکی'' کہا جاتا ہے، یہاں تک کہ جو آیتیں سفرِ ہجرت کے دوران مدینہ کے راستے میں نازل ہوئیں ان کو بھی ''مکی'' کہا جاتا ہے، اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو شہرِ مدینہ میں نازل نہیں ہوئیں، مگر وہ ''مدنی'' ہیں، چنانچہ ہجرت کے بعد آپ کو بہت سے سفر پیش آئے جن میں آپ مدینہ طیبہ سے سینکڑوں میل دُور بھی تشریف لے گئے، ان تمام مقامات پر نازل ہونے والی آیتیں ''مدنی'' ہی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ اُن آیتوں کو بھی ''مدنی'' کہا جاتا ہے جو فتحِ مکہ یا غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر خاص شہرِ مکہ یا اس کے مضافات میں نازل ہوئیں، چنانچہ آیتِ قرآنی اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (النساء:۵۸) مدنی ہے، حالانکہ وہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ [1]

پھر بعض سورتیں تو ایسی ہیں کہ وہ پوری کی پوری مکی، یا پوری کی پوری مدنی ہیں، مثلاً سورۂ مدثر پوری مکی ہے، اور سورۂ آلِ عمران پوری مدنی ہے، لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری سورت مکی ہے، لیکن اس میں ایک یا چند آیات مدنی بھی آگئی ہیں، اور بعض مرتبہ اس کے برعکس بھی ہوا ہے، مثلاً سورۂ اعراف مکی ہے، لیکن اس میں وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ (الاعراف:۱۶۳) سے لے کر وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِىْۤ اٰدَمَ الخ (الاعراف:۱۷۲) تک کی آیات مدنی ہیں۔ اسی طرح سورۂ حج مدنی ہے، لیکن اس میں چار آیتیں ہیں یعنی وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى سے لے کر عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ (الحج:۵۲ تا ۵۵) تک مکی ہیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی سورت کا مکی یا مدنی ہونا عموماً اس کی اکثر آیتوں کے اِعتبار سے ہوتا ہے، اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جس سورت کی اِبتدائی آیات ہجرت سے پہلے نازل ہو گئیں اُسے مکی قرار دے دیا گیا، اگرچہ بعد میں

[1] البرہان ج:۱ ص:۱۸۸، ومناہل العرفان ج:۱ ص:۱۸۸

اس کی بعض آیتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہوں۔ [۱]

مکی ومدنی آیتوں کی خصوصیات

علمائے تفسیر نے مکی اور مدنی سورتوں کا اِستقراء کر کے ان کی بعض ایسی خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن سے پہلی نظر میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکی ہے یا مدنی؟ ان میں سے بعض خصوصیات قاعدۂ کلیہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اور بعض اکثری ہیں، قواعدِ کلیہ یہ ہیں:-

۱- ہر وہ سورت جس میں لفظ "کَلَّا" (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکی ہے، یہ لفظ پندرہ سورتوں میں ۳۳ مرتبہ اِستعمال ہوا ہے، اور یہ ساری آیتیں قرآنِ کریم کے آخری نصف حصہ میں ہیں۔

۲- ہر وہ سورت جس میں (حنفی مسلک کے مطابق) کوئی سجدے کی آیت آئی ہے، مکی ہے۔ [۲]

۳- سورۂ بقرہ کے سوا ہر وہ سورت جس میں آدمؑ و اِبلیس کا واقعہ مذکور ہے وہ مکی ہے۔

۴- ہر وہ سورت جس میں جہاد کی اِجازت یا اس کے اَحکام مذکور ہیں، مدنی ہے۔

۵- ہر وہ آیت جس میں منافقوں کا ذِکر آیا ہے، مدنی ہے۔

اور مندرجہ ذیل خصوصیات عمومی اور اکثری ہیں، یعنی کبھی کبھی ان کے خلاف بھی ہو جاتا ہے لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔

۱- مکی سورتوں میں عموماً یَآ اَیُّھَا النَّاسُ (اے لوگو) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے، اور مدنی سورتوں میں یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو) کے الفاظ سے۔

۲- مکی آیتیں اور سورتیں عموماً چھوٹی چھوٹی اور مختصر ہیں، اور مدنی آیات وسوَر طویل اور مفصل ہیں۔

۳- مکی سورتیں زیادہ تر توحید، رِسالت اور آخرت کے اِثبات، حشر ونشر کی منظر کشی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر وتسلی کی تلقین اور پچھلی اُمتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، اور ان میں اَحکام وقوانین کم بیان ہوئے ہیں، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدنی قوانین، جہاد وقتال کے اَحکام اور حدود وفرائض بیان کئے گئے ہیں۔

۴- مکی سورتوں میں زیادہ تر مقابلہ بت پرستوں سے ہے، اور مدنی سورتوں میں اہلِ کتاب اور منافقین سے۔

۵- مکی سورتوں کا اُسلوبِ بیان زیادہ پُرشکوہ ہے، اس میں اِستعارات وتشبیہات اور تمثیلیں زیادہ ہیں، اور

---

[۱] مناهل العرفان ج:۱ ص:۱۹۲

[۲] یہ قاعدہ "اِتقان" وغیرہ سے مأخوذ ہے، اور یہ اس قول کے مطابق تو دُرست ہے جس کی رُو سے سورۂ حج مکی ہے، لیکن اگر اسے مدنی قرار دِیا جائے جیسا کہ بعض صحابہؓ وتابعینؒ سے مروی ہے تو سورۂ حج اس قاعدے سے مستثنیٰ ہوگی۔ محمد تقی عثمانی

ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع ہے، اس کے برخلاف مدنی سورتوں کا انداز نسبۃً سادہ ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کے انداز و اُسلوب میں یہ فرق دراصل حالات، ماحول اور مخاطبوں کے اِختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چونکہ زیادہ تر عرب کے بت پرستوں سے تھا اور کوئی اِسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، اس لئے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی دُرستی، اخلاق کی اِصلاح، بت پرستوں کی مدلل تردید اور قرآنِ کریم کی شانِ اِعجاز کے اِظہار پر دیا گیا، اس کے برخلاف مدینہ طیبہ میں ایک اِسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی، لوگ جوق در جوق اِسلام کے سائے تلے آرہے تھے، عملی سطح پر بت پرستی کا اِبطال ہو چکا تھا اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہلِ کتاب سے تھا، اس لئے یہاں اَحکام وقوانین اور حدود وفرائض کی تعلیم اور اہلِ کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی، اور اسی کے مناسب اُسلوبِ بیان اِختیار کیا گیا۔

قرآنِ کریم کا تدریجی نزول

پیچھے آچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآنِ کریم دفعۃً اور یکبارگی نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کرکے تقریباً تئیس سال میں اُتارا گیا ہے، بعض اوقات جبریل علیہ السلام ایک چھوٹی سی آیت بلکہ آیت کا کوئی ایک جزو لے کر بھی تشریف لے آتے، اور بعض مرتبہ کئی کئی آیتیں بیک وقت نازل ہوجاتیں، قرآنِ کریم کا سب سے چھوٹا حصہ جو مستقلاً نازل ہوا وہ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ (النساء:۹۵) ہے، جو ایک طویل آیت کا ٹکڑا ہے، دُوسری طرف پوری سورۂ اَنعام ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہے۔[۱]

قرآنِ کریم کو یکبارگی نازل کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کرکے کیوں نازل کیا گیا؟ یہ سوال خود مشرکینِ عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، باری تعالیٰ نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے:-

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۚ كَذَٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ ۖ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ﴿۳۳﴾ (الفرقان)

''اور کافروں نے کہا کہ آپ پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح (ہم نے قرآن کو تدریجاً اُتارا ہے) تاکہ ہم آپ کے دِل کو مطمئن کردیں، اور ہم نے اس کو رفتہ رفتہ پڑھا ہے، اور وہ کوئی بات آپ کے پاس نہیں لائیں گے، مگر ہم آپ کے پاس حق لائیں گے، اور (اس کی) عمدہ تفسیر پیش کریں گے۔''

---

[۱] ابن کثیر ج:۲ ص:۱۲۲

اِمام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں قرآنِ کریم کے تدریجی نزول کی جو حکمتیں بیان فرمائی ہیں یہاں ان کا خلاصہ سمجھ لینا کافی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:-

۱- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے اگر سارا قرآن ایک مرتبہ نازل ہوگیا ہوتا تو اس کا یاد رکھنا اور ضبط کرنا دُشوار ہوتا، اس کے برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لئے اُن پر تورات ایک ہی مرتبہ نازل کردی گئی۔

۲- اگر پورا قرآن ایک دفعہ نازل ہوجاتا تو تمام اَحکام کی پابندی فوراً لازم ہوجاتی، اور یہ اس حکیمانہ تدریج کے خلاف ہوتا جو شریعتِ محمدی میں ملحوظ رہی ہے۔

۳- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے ہر روز نئی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جبریل علیہ السلام کا بار بار قرآنِ کریم لے کر آنا ان اذیتوں کے مقابلے کو آسان بنا دیتا تھا، اور آپ کی تقویتِ قلب کا سبب بنتا تھا۔

۴- قرآنِ کریم کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سوالات کے جواب اور مختلف واقعات سے متعلق ہے، اس لئے ان آیتوں کا نزول اسی وقت مناسب تھا جس وقت وہ سوالات کئے گئے، یا وہ واقعات پیش آئے، اس سے مسلمانوں کی بصیرت بھی بڑھتی تھی، اور قرآنِ کریم کی غیبی خبریں بیان کرنے سے اس کی حقانیت اور زیادہ آشکار ہوجاتی تھی۔[1]

شانِ نزول

قرآنِ کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اَزخود نازل فرمائیں، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ اُن کے نزول کا سبب نہیں بنا۔ دُوسری آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی سوال کے جواب میں ہوا، جسے ان آیتوں کا پس منظر کہنا چاہئے، یہ پس منظر مفسرین کی اِصطلاح میں ''سببِ نزول'' یا ''شانِ نزول'' کہلاتا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۱ ہے:-

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ

''مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، اور بلاشبہ ایک مؤمن کنیز ایک مشرکہ سے بہتر ہے خواہ مشرکہ تمہیں پسند ہو۔''

یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی تھی، زمانۂ جاہلیت میں حضرت مرثد بن ابی مرثد غنویؓ کے عناق نامی ایک عورت سے تعلقات تھے، اسلام لانے کے بعد یہ مدینہ طیبہ چلے آئے، اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں رہ گئی، ایک

[1] تفسیر کبیر ج:۶ ص:۳۳۶

مرتبہ حضرت مرثدؓ کسی کام سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عناق نے انہیں گناہ کی دعوت دی، حضرت مرثدؓ نے صاف اِنکار کرکے فرمایا کہ اسلام میرے اور تمہارے درمیان حائل ہو چکا ہے، لیکن اگر تم چاہو تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اِجازت کے بعد تم سے نکاح کرسکتا ہوں۔ مدینہ طیبہ تشریف لاکر حضرت مرثدؓ نے آپ سے نکاح کی اِجازت چاہی اور اپنی پسندیدگی کا اِظہار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کردی۔ [1]

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کا ''شانِ نزول'' یا ''سببِ نزول'' ہے۔ قرآنِ کریم کی تفسیر میں ''شانِ نزول'' نہایت اہمیت کا حامل ہے، بہت سی آیتوں کا مفہوم اس وقت تک صحیح طور سے سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک اُن کا شانِ نزول معلوم نہ ہو۔

قرآنِ کریم کے سات حروف اور قراءتیں

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے لئے اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا السلام) کو ایک سہولت یہ عطا فرمائی ہے کہ اس کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اِجازت دی ہے، کیونکہ بعض اوقات کسی شخص سے کوئی لفظ ایک طریقہ سے نہیں پڑھا جاتا تو اسے دُوسرے طریقہ سے پڑھ سکتا ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بنوغفار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آگئے، اور انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنی اُمت کو حکم دیں کہ وہ قرآن کو ایک ہی حرف پر پڑھے، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ سے اس کی معافی اور مغفرت طلب کرتا ہوں، میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر جبریل علیہ السلام دوبارہ آپ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآنِ کریم کو دو حرفوں پر پڑھے، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں، میری اُمت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے۔ پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآنِ کریم کو تین حرفوں پر پڑھے، آپ نے پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت چاہتا ہوں، میری اُمت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآن کو سات حروف پر پڑھے، پس وہ ان میں سے جس حرف پر پڑھیں گے اُن کی قراءت دُرست ہوگی۔ [2]

---

[1] اسباب النزول للواحدی ص:۳۸

[2] بحوالہ مناهل العرفان ج:۱ ص:۱۳۳

سات حروف سے مراد سات نوعیتیں ہیں

چنانچہ ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

[۱] اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَۃِ اَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْہُ۔

''یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس ان میں سے جو تمہارے لئے آسان ہو اس طریقہ سے پڑھ لو۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں سات حروف سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں اہلِ علم کے مختلف اقوال ہیں۔ [۲] لیکن محقق علماء کے نزدیک اس میں راجح مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی جو قراءتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، اُن میں باہمی فرق و اختلاف کل سات نوعیتوں پر مشتمل ہے، اور وہ سات نوعیتیں یہ ہیں:-

۱- اسماء کا اختلاف: جس میں اِفراد، تثنیہ، جمع اور تذکیر و تانیث دونوں کا اختلاف داخل ہے، مثلاً ایک قراءت میں تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّكَ (الانعام:۱۱۵) ہے، اور دُوسری قراءت میں تَمَّتْ کَلِمٰتُ رَبِّكَ۔

۲- افعال کا اختلاف: کہ کسی قراءت میں صیغۂ ماضی ہے، کسی میں مضارع اور کسی میں امر، مثلاً ایک قراءت میں رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا (سبا:۱۹) ہے، اور دُوسری میں رَبَّنَا بَعِّدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا اور تیسری میں رَبُّنَا بٰعَدَ بَیْنَ اَسْفَارِنَا، نیز فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ (السجدۃ:۱۷) میں مَا اُخْفِی کو یاء کے سکون کے ساتھ مضارع واحد متکلم کے صیغے سے اور یاء کے فتحہ کے ساتھ مَا اُخْفِیَ ماضی کے صیغے سے پڑھا گیا ہے۔

۳- وجوہِ اعراب کا اختلاف: جس میں اِعراب یا زیر، زَبر، پیش کا فرق پایا جاتا ہے، مثلاً لَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ (البقرۃ:۲۸۲) کی جگہ لَا یُضَآرُّ کَاتِبٌ، اور ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ (البروج:۱۵) کی جگہ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدِ۔

۴- الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ کم اور دُوسری میں زیادہ ہو، مثلاً ایک قراءت میں تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اور دُوسری میں تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ۔

۵- تقدیم و تاخیر کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ مقدم ہے اور دُوسری میں مؤخر ہے، مثلاً وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا (آل عمران:۱۹۵) اور وَقُتِلُوْا وَقٰتَلُوْا، نیز فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا (التوبۃ:۱۱۱) اور فَیُقْتَلُوْنَ وَیَقْتُلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا۔

۶- بدلیت کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہے اور دُوسری قراءت میں اس کی جگہ کوئی دُوسرا لفظ مثلاً

---

[۱] صحیح بخاری مع القسطلانی ج:۷ ص:۴۵۳

[۲] ان اقوال کی تفصیل اور اس مسئلے کی مبسوط تحقیق کے لئے ملاحظہ فرمائیے ''علوم القرآن'' احقر کی مفصل کتاب۔ ۱۲

نُنْشِزُهَا (البقرۃ:۲۵۹) اور نَنْشُرُهَا، نیز فَتَبَيَّنُوا (الحجرات:۶) اور فَتَثَبَّتُوا، بِضَنِينٍ (التکویر:۲۴) اور بِظَنِينٍ۔

۷۔ لہجوں کا اختلاف: جس میں تفخیم، ترقیق، اِمالہ، مد، قصر، ہمز، اظہار اور اِدغام وغیرہ کے اختلافات داخل ہیں، یعنی اس میں لفظ تو نہیں بدلتا، لیکن اس کے پڑھنے کا طریقہ بدل جاتا ہے، مثلاً مُوْسٰی کو ایک قراءت میں مُوسَیٰ کی طرح پڑھا جاتا ہے۔

بہرحال! اختلافِ قراءت کی ان سات نوعیّتوں کے تحت بہت سی قراءتیں نازل ہوئی تھیں، اور ان کے باہمی فرق سے معنی میں کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں ہوتا تھا، صرف تلاوت کی سہولت کے لئے ان کی اجازت دی گئی تھی۔

شروع میں چونکہ لوگ قرآنِ کریم کے اُسلوب کے پوری طرح عادی نہیں تھے، اس لئے اُن سات اقسام کے دائرے میں بہت سی قراءتوں کی اجازت دے دی گئی تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہر سال رمضان میں جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآنِ کریم کا دور کیا کرتے تھے، جس سال آپ کی وفات ہوئی، اس سال آپ نے دو مرتبہ دور فرمایا، اس دور کو "عرضۂ اخیرہ" کہتے ہیں، اس موقع پر بہت سی قراءتیں منسوخ کر دی گئیں، اور صرف وہ قراءتیں باقی رکھی گئیں جو آج تک تواتر کے ساتھ محفوظ چلی آتی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تلاوتِ قرآن کے معاملہ میں غلط فہمیاں رفع کرنے کے لئے اپنے عہدِ خلافت میں قرآنِ کریم کے سات نسخے تیار کرائے، اور ان سات نسخوں میں تمام قراءتوں کو اس طرح سے جمع فرمایا کہ قرآنِ کریم کی آیتوں پر نقطے اور زیر، زبر، پیش نہیں ڈالے، تاکہ انہی مذکورہ قراءتوں میں سے جس قراءت کے مطابق چاہیں پڑھ سکیں، اس طرح اکثر قراءتیں اس رسم الخط میں سما گئیں، اور جو قراءتیں رسم الخط میں نہ سما سکیں اُن کو محفوظ رکھنے کا طریقہ آپ نے یہ اختیار فرمایا کہ ایک نسخہ آپ نے ایک قراءت کے مطابق لکھا اور دُوسرا دُوسری قراءت کے مطابق، اُمت نے ان نسخوں میں جمع شدہ قراءتوں کو یاد رکھنے کا اس قدر اہتمام کیا کہ علمِ قراءت ایک مستقل علم بن گیا اور سینکڑوں علماء، قرّاء اور حفاظ نے اس کی حفاظت میں اپنی عمریں خرچ کر دیں۔

قراءت میں قبولیت کا معیار

دراصل ہوا یہ تھا کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآنِ کریم کے سات نسخے مختلف خطوں میں بھیجے تو ان کے ساتھ ایسے قاریوں کو بھی بھیجا تھا جو اُن کی تلاوت سکھا سکیں، چنانچہ یہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انہوں نے اپنی اپنی قراءتوں کے مطابق لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قراءتیں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قراءتوں کو یاد کرنے اور دُوسروں کو سکھانے ہی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور اس طرح "علمِ قراءت" کی بنیاد پڑ گئی، اور ہر خطے کے لوگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے ائمۂ قراءت سے رُجوع

کرنے لگے، کسی نے صرف ایک قراءت یاد کی، کسی نے دو، کسی نے تین، کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ، اس سلسلے میں ایک اُصولی ضابطہ پوری اُمت میں مسلّم تھا، اور ہر جگہ اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ صرف وہ "قراءت" قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں:-

۱- مصاحفِ عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو۔

۲- عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو۔

۳- وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو اور ائمۂ قراءت میں مشہور ہو۔

جس قراءت میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو اُسے قرآن کا جزء نہیں سمجھا جاسکتا، اس طرح متواتر قراءتوں کی ایک بڑی تعداد نسلاً بعد نسلٍ نقل ہوتی رہی، اور سہولت کے لئے ایسا بھی ہوا کہ ایک اِمام نے ایک یا چند قراءتوں کو اختیار کرکے انہی کی تعلیم دینی شروع کردی، اور وہ قراءت اُس اِمام کے نام سے مشہور ہوگئی، پھر علماء نے ان قراءتوں کو جمع کرنے کے لئے کتابیں لکھنا شروع کیں، چنانچہ سب سے پہلے اِمام ابوعبید قاسم بن سلامؒ، اِمام ابوحاتم سجستانیؒ، قاضی اسماعیلؒ اور اِمام ابوجعفر طبریؒ نے اس فن پر کتابیں مرتب کیں جن میں بیس سے زیادہ قراءتیں جمع تھیں، پھر علامہ ابوبکر ابنِ مجاہدؒ (متوفی ۳۲۴ھ) نے ایک کتاب لکھی، جس میں صرف سات قاریوں کی قراءتیں جمع کی گئی تھیں، اُن کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قرّاء کی قراءتیں دُوسرے قرّاء کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشہور ہوگئیں، بلکہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ صحیح اور متواتر قراءتیں صرف یہی ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابنِ مجاہدؒ نے محض اتفاقاً ان سات قراءتوں کو جمع کردیا تھا، اُن کا منشاء یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کے سوا دُوسری قراءتیں غلط یا ناقابلِ قبول ہیں، علامہ ابنِ مجاہدؒ کے اس عمل سے دُوسری غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوئی کہ بعض لوگ "سبعة احرف" کا مطلب یہ سمجھنے لگے کہ ان سے یہی سات قراءتیں مراد ہیں، جنہیں ابنِ مجاہدؒ نے جمع کیا ہے، حالانکہ پیچھے بتایا جاچکا ہے کہ یہ سات قراءتیں صحیح قراءتوں کا محض ایک حصہ ہیں، ورنہ ہر وہ قراءت جو مذکورہ بالا تین شرائط پر پوری اُترتی ہو، صحیح، قابلِ قبول اور ان سات حروف میں داخل ہے جن پر قرآنِ کریم نازل ہوا۔

سات قرّاء

بہر حال! علامہ ابنِ مجاہدؒ کے اس عمل سے جو سات قاری سب سے زیادہ مشہور ہوئے وہ یہ ہیں:-

۱- نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیمؒ (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے ستر ایسے تابعین سے اِستفادہ کیا تھا جو براہِ راست حضرت اُبیّ بن کعب، عبداللہ بن عباس اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت مدینہ طیبہ میں زیادہ مشہور ہوئی اور آپ کے راویوں میں ابوموسیٰ قالونؒ (متوفی ۲۲۰ھ) اور ابوسعید ورشؒ (متوفی ۱۹۷ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

۲- عبداللہ بن کثیر الداریؒ (متوفی ۱۲۰ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت انس بن مالک، عبداللہ بن زبیر اور

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم کی زیارت کی تھی، اور آپ کی قراءت مکہ مکرمہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کی قراءت کے راویوں میں بزّیؒ اور قنبلؒ زیادہ مشہور ہیں۔

۳- ابوعمرو زبان بن العلاءؒ (متوفی ۱۵۴ھ) آپ نے حضرت مجاہدؒ اور سعید بن جبیرؒ کے واسطے سے حضرت ابنِ عباسؓ اور اُبیّ بن کعبؓ سے روایت کی ہے، اور آپ کی قراءت بصرہ میں کافی مشہور ہوئی، آپ کی قراءت کے راویوں میں ابوعمر الدوریؒ (متوفی ۲۴۶ھ) اور ابوشعیب سوسیؒ (متوفی ۲۶۱ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

۴- عبداللہ الیحصبیؒ، جو ابنِ عامرؒ کے نام سے معروف ہیں (متوفی ۱۱۸ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت نعمان بن بشیرؓ اور حضرت واثلہ بن اسقعؓ کی زیارت کی تھی، اور قراءت کا فن حضرت مغیرہ بن شہاب مخزومیؒ سے حاصل کیا تھا جو حضرت عثمانؓ کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت کا زیادہ رِواج شام میں رہا، اور آپ کی قراءت کے راویوں میں ہشامؒ اور ابنِ ذکوانؒ زیادہ مشہور ہیں۔

۵- حمزۃ بن حبیب الزیات مولیٰ عکرمہ بن ربیع التیمیؒ (متوفی ۱۵۶ھ) آپ سلیمان اعمشؒ کے شاگرد ہیں، وہ یحییٰ بن وثابؒ کے، وہ زرّ بن حُبیشؒ کے اور انہوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اِستفادہ کیا تھا، آپ کے راویوں میں خلف بن ہشام (متوفی ۲۲۹ھ) اور خلاد بن خالدؒ (متوفی ۲۲۰ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

۶- عاصم بن ابی النجودؒ الاسدیؒ (متوفی ۱۲۷ھ) آپ زرّ بن حُبیشؒ کے واسطے سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ کے واسطے سے حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں، آپ کی قراءت کے راویوں میں شعبہ بن عیاشؒ (متوفی ۱۹۳ھ) اور حفص بن سلیمانؒ (متوفی ۱۸۰ھ) زیادہ مشہور ہیں۔ آج کل عموماً تلاوت انہی حفص بن سلیمانؒ کی روایت کے مطابق ہوتی ہے۔

۷- ابوالحسن علی بن حمزۃ الکسائی النحویؒ (متوفی ۱۸۹ھ) ان کے راویوں میں ابوالحارث مروزیؒ (متوفی ۲۴۰ھ) اور ابوعمر الدوریؒ (جو ابوعمروؒ کے راوی بھی ہیں) زیادہ مشہور ہیں، مؤخر الذکر تینوں حضرات کی قراءتیں زیادہ تر کوفہ میں رائج ہوئیں۔

دس اور چودہ قراءتیں

لیکن جیسا کہ پیچھے عرض کیا جاچکا ہے ان سات کے علاوہ اور بھی کئی قراءتیں متواتر اور صحیح ہیں، چنانچہ بعد میں جب یہ غلط فہمی پیدا ہونے لگی کہ صحیح قراءتیں ان سات ہی میں منحصر ہیں تو متعدّد علماء (مثلاً علامہ شنذائیؒ اور ابوبکر بن مہرانؒ) نے سات کے بجائے دس قراءتیں ایک کتاب میں جمع فرمائیں، چنانچہ ''قراآتِ عشرہ'' کی اِصطلاح مشہور ہوگئی، ان دس قراءتوں میں مندرجہ بالا سات قرّاء کے علاوہ ان تین حضرات کی قراءتیں بھی شامل کی گئیں:-

۱- ابوجعفر یزید بن القعقاعؒ (متوفی ۱۳۰ھ) جن کی قراءت مدینہ طیبہ میں زیادہ رائج ہوئی۔

۲- یعقوب بن اسحاق حضرمیؒ (متوفی ۲۰۵ھ) آپ کی قراءت زیادہ تر بصرہ میں مشہور ہوئی۔

۳- خلف بن ہشامؒ (متوفی ۲۲۹ھ) جو حمزہؒ کی قراءت کے بھی راوی ہیں، آپ کی قراءت کوفہ میں زیادہ رائج تھی۔

اس کے علاوہ بعض حضرات نے چودہ قاریوں کی قراءتیں جمع کیں اور مذکورہ دس حضرات پر مندرجہ ذیل قرّاء کی قراءتوں کا اضافہ کیا:-

۱- حسن بصریؒ (متوفی ۱۱۰ھ) جن کی قراءت کا مرکز بصرہ تھا۔

۲- محمد بن عبدالرحمٰن ابن مُحَیصِنؒ (متوفی ۱۲۳ھ) جن کا مرکز مکہ مکرمہ میں تھا۔

۳- یحییٰ بن مبارک یزیدیؒ (متوفی ۲۰۲ھ) جو بصرہ کے باشندے تھے۔

۴- ابوالفرج شنبوذیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جو بغداد کے باشندے تھے۔

بعض حضرات نے چودہ قاریوں میں حضرت شنبوذی کے بجائے حضرت سلیمان اعمشؒ کا نام شمار کیا ہے، ان میں سے پہلی دس قراءتیں صحیح قول کے مطابق متواتر ہیں، اوران کے علاوہ شاذ ہیں۔ [۱]

تاریخ حفاظتِ قرآن

عہدِ رسالت میں حفاظتِ قرآن

قرآنِ کریم چونکہ ایک ہی دفعہ پورا کا پورا نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالات کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لئے عہدِ رسالت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اُسے کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کرلیا جائے، چنانچہ اِبتدائے اسلام میں قرآنِ کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظہ پر دِیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپ اُس کے الفاظ کو اُسی وقت دُہرانے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہوجائیں، اس پر سورۂ قیامہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ قرآنِ کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپ کو عین نزولِ وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دُہرانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپ میں ایسا حافظہ پیدا فرمادے گا کہ ایک مرتبہ نزولِ وحی کے بعد آپ اُسے بھول نہیں سکیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ اِدھر آپ پر آیاتِ قرآنی نازل ہوتیں اور اُدھر آپ کو یاد ہوجاتیں، اس طرح سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک قرآنِ کریم کا سب سے زیادہ محفوظ گنجینہ تھا، جس میں کسی ادنیٰ غلطی یا ترمیم وتغیر کا اِمکان نہیں تھا، پھر آپ مزید اِحتیاط کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبریل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے، اور جس سال آپ کی وفات ہوئی، اس سال آپ نے دو مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ دور کیا۔ [۲]

---

[۱] مناہل العرفان بحوالہ منجد المقرئین لابن الجزریؒ ج:۱ ص:۲۵۵

[۲] صحیح بخاری مع فتح الباری ج:۹ ص:۳۶

پھر آپ صحابہ کرامؓ کو قرآنِ کریم کے معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انہیں اس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے، اور خود صحابہ کرامؓ کو قرآنِ کریم سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملہ میں دُوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا۔ بعض عورتوں نے اپنے شوہروں سے سوائے اس کے کوئی مہر طلب نہیں کیا کہ وہ انہیں قرآنِ کریم کی تعلیم دیں گے۔ سینکڑوں صحابہؓ نے اپنے آپ کو ہر غم ماسوا سے آزاد کرکے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کردی تھی، وہ قرآنِ کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نماز میں اسے دُہراتے رہتے تھے، حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہجرت کرکے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آتا تو آپ اُسے ہم انصاریوں میں سے کسی کے حوالے فرمادیتے، تاکہ وہ اسے قرآن سکھائے، اور مسجدِ نبوی میں قرآن سیکھنے سکھانے والوں کی آوازوں کا اتنا شور ہونے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید فرمانا پڑی کہ اپنی آوازیں پست کرو، تاکہ کوئی مغالطہ پیش نہ آئے۔ [1]

چنانچہ تھوڑی ہی مدّت میں صحابہ کرامؓ کی ایک ایسی بڑی جماعت تیار ہوگئی جسے قرآنِ کریم اَز بر حفظ تھا، اس جماعت میں خلفائے راشدینؓ کے علاوہ حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت ابنِ مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن السائبؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت اُمِّ سلمہؓ وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ [2]

غرض اِبتدائے اِسلام میں زیادہ زور حفظِ قرآن پر دِیا گیا، اور اس وقت کے حالات میں یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابلِ اِعتماد تھا، اس لئے کہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لئے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لئے اگر صرف لکھنے پر اِعتماد کیا جاتا تو نہ قرآنِ کریم کی وسیع پیمانے پر اِشاعت ہوسکتی، اور نہ اُس کی قابلِ اِعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب کو حافظے کی ایسی قوّت عطا فرمادی تھی کہ ایک ایک شخص ہزاروں اَشعار کا حافظ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دیہاتیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں، اُن کے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے تھے، اس لئے قرآنِ کریم کی حفاظت میں اسی قوّتِ حافظہ سے کام لیا گیا، اور اسی کے ذریعہ قرآنِ کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئیں۔

کتابتِ وحی

قرآنِ کریم کو حفظ کرانے کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم کو لکھوانے کا بھی خاص اہتمام فرمایا۔ حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں آپ کے لئے وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کو

[1] مناهل العرفان ج:۱ ص:۲۳۴

[2] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''علوم القرآن'' احقر کی مفصل کتاب۔

سخت گرمی لگتی، اور آپ کے جسمِ اَطہر پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے، پھر جب آپ سے یہ کیفیت ختم ہو جاتی تو میں مونڈھے کی کوئی ہڈی یا (کسی اور چیز کا) ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا، آپ لکھواتے رہتے اور میں لکھتا جاتا، یہاں تک کہ جب میں لکھ کر فارغ ہوتا تو قرآن کو نقل کرنے کے بوجھ سے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا۔ بہر حال! جب میں فارغ ہوتا تو آپ فرماتے "پڑھو!" میں پڑھ کر سناتا، اگر اس میں کوئی فروگزاشت ہوتی تو آپ اس کی اِصلاح فرما دیتے اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے۔ [1]

حضرت زید بن ثابتؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہؓ کتابتِ وحی کے فرائض انجام دیتے تھے، جن میں خلفائے راشدینؓ، حضرت اُبیّ بن کعبؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت خالد بن الولیدؓ، حضرت ثابت بن قیسؓ، حضرت ابان بن سعیدؓ وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذِکر ہیں۔ [2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب قرآنِ کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کاتبِ وحی کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے۔ [3] اُس زمانے میں چونکہ عرب میں کاغذ کمیاب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی اِستعمال کئے گئے۔ [4]

اس طرح عہدِ رِسالت میں قرآنِ کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگرچہ وہ مرتب کتاب کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ متفرق پارچوں کی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابہ کرامؓ بھی اپنی یادداشت کے لئے آیاتِ قرآنی اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اِسلام کے اِبتدائی عہد سے جاری تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ کے اِسلام لانے سے پہلے ہی اُن کی بہن اور بہنوئی کے ایک صحیفہ میں آیاتِ قرآنی لکھی ہوئی تھی۔ [5]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمعِ قرآن

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآنِ کریم کے جتنے نسخے لکھے گئے تھے اُن کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے، کوئی آیت چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر، یا وہ مکمل نسخے نہیں تھے، کسی صحابیؓ کے پاس ایک سورت لکھی ہوئی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں اور کسی کے پاس صرف چند آیات، اور بعض صحابہؓ کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھے ہوئے تھے۔

[1] مجمع الزوائد ج:۱ ص:۱۵۲ بحوالہ طبرانی۔
[2] تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری ج:۹ ص:۱۸ اور زاد المعاد ج:۱ ص:۳۰
[3] فتح الباری ج:۹ ص:۱۸
[4] ایضًا ج:۹ ص:۱۱
[5] سیرت ابن ہشام۔

اس بناء پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں یہ ضروری سمجھا کہ قرآنِ کریم کے ان منتشر حصوں کو یکجا کر کے محفوظ کر دیا جائے، انہوں نے یہ کارنامہ جن محرکات کے تحت اور جس طرح انجام دیا، اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابتؓ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگِ یمامہ کے فوراً بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک روز مجھے پیغام بھیج کر بلوایا، میں ان کے پاس پہنچا تو وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ "عمر نے ابھی آ کر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگِ یمامہ میں قرآنِ کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہوگئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآنِ کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآنِ کریم کا ایک بڑا حصہ ناپید نہ ہوجائے، لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآنِ کریم کو جمع کروانے کا کام شروع کر دیں۔ میں نے عمر سے کہا کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں۔

عمر نے جواب دیا کہ اللہ کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمر مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرحِ صدر ہوگیا اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمر کی ہے۔" اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ "تم نوجوان اور سمجھدار آدمی ہو، ہمیں تمہارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتابتِ وحی کا کام بھی کرتے رہے ہو لہٰذا تم قرآنِ کریم کی آیتوں کو تلاش کر کے انہیں جمع کرو۔"

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ "اللہ کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمعِ قرآن کے کام کا ہوا، میں نے اُن سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟" حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ "اللہ کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے۔" اس کے بعد حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسی کے لئے کھول دیا جو حضرت ابوبکر وعمر کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا، اور کھجور کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآنِ کریم کو جمع کیا۔ [1]

جمعِ قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا طریقِ کار

اس موقع پر جمعِ قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کے طریقِ کار کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، جیسا کہ پیچھے ذکر آچکا ہے، وہ خود حافظِ قرآن تھے، لہٰذا وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، اُن کے علاوہ بھی سینکڑوں حفاظ اُس وقت موجود تھے، اُن کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآنِ کریم لکھا جا سکتا تھا۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن۔

نیز قرآنِ کریم کے جو نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھے گئے تھے، حضرت زیدؓ ان سے بھی قرآنِ کریم نقل فرما سکتے تھے، لیکن انہوں نے اِحتیاط کے پیشِ نظر صرف کسی ایک طریقہ پر بس نہیں کیا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں درج نہیں کی جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں، وہ مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زیدؓ نے انہیں یکجا فرمایا تاکہ نیا نسخہ ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اِعلانِ عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآنِ کریم کی جتنی آیات لکھی ہوئی موجود ہوں وہ حضرت زیدؓ کے پاس لے آئے، اور جب کوئی شخص اُن کے پاس قرآنِ کریم کی کوئی لکھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے:-

۱- سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے۔

۲- پھر حضرت عمرؓ بھی حافظِ قرآن تھے، اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اُن کو بھی اس کام میں حضرت زیدؓ کے ساتھ لگا دیا تھا، اور جب کوئی شخص کوئی آیت لے کر آتا تھا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے تھے۔ [۱]

۳- کوئی لکھی ہوئی آیت اُس وقت تک قبول نہیں کی جاتی تھی جب تک دو قابلِ اِعتماد گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دے دی ہو کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی۔ [۲]

۴- اس کے بعد ان لکھی ہوئی آیتوں کا اُن مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے۔ [۳]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمعِ قرآن کا یہ طریقِ کار ذہن میں رہے تو حضرت زید بن ثابتؓ کے اس اِرشاد کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ "سورۂ براءۃ کی آخری آیات لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الخ (التوبۃ:۱۲۸) مجھے صرف حضرت ابوخزیمہؓ کے پاس ملیں، ان کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں۔" اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ آیتیں سوائے حضرت ابوخزیمہؓ کے کسی اور کو یاد نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں، اور اُن کے سوا کسی کو ان کا جزءِ قرآن ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی متفرق آیتیں لے لے کر آ رہے تھے اُن میں سے یہ آیتیں سوائے حضرت ابوخزیمہؓ کے کسی کے پاس نہیں ملیں، ورنہ جہاں تک ان آیات کے جزوِ قرآن ہونے کا تعلق ہے یہ بات تواتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، کیونکہ سینکڑوں صحابہؓ کو یاد بھی تھی، اور جن حضرات کے

---

[۱] فتح الباری ج:۹ ص:۱۱ بحوالہ ابن ابی داود۔ [۲] الإتقان ج:۱ ص:۶۰

[۳] البرهان فی علوم القرآن للزرکشیؒ ج:۱ ص:۲۳۸

پاس آیاتِ قرآنی کے مکمل مجموعے تھے اُن کے پاس لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابوخزیمہؓ کے پاس ملیں، کسی اور کے پاس نہیں۔ [1]

''اُمّ'' کی خصوصیات

بہرکیف! حضرت زید بن ثابتؓ نے اس زبردست اِحتیاط کے ساتھ آیاتِ قرآنی کو جمع کرکے انہیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا۔ [2] لیکن ہر سورت علیحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لئے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں پر مشتمل تھا، اِصطلاح میں اس نسخے کو ''اُمّ'' کہا جاتا ہے، اور اس کی خصوصیات یہ تھیں:-

۱- اس نسخہ میں آیاتِ قرآنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں، لیکن سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی۔ [3]

۲- اس نسخہ میں قرآن کے ساتوں حروف (جن کی تشریح پیچھے آچکی ہے) جمع تھے۔ [4]

۳- اس میں وہ تمام آیتیں جمع کی گئی تھیں جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی۔

۴- اس نسخہ کو لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتب نسخہ تمام اُمت کی اِجماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہوجائے، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رُجوع کیا جاسکے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لکھوائے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہے، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد انہیں اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل کردیا گیا، پھر حضرت حفصہؓ کی وفات کے بعد مروان بن الحکمؒ نے اسے اس خیال سے نذرِ آتش کردیا کہ اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تیار کرائے ہوئے مصاحف تیار ہوچکے تھے اور اس بات پر اُمت کا اِجماع منعقد ہوچکا تھا کہ رسم الخط اور سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے ان مصاحف کی پیروی لازم ہے، مروان بن الحکم نے سوچا کہ اب کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہئے جو اس رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو۔ [5]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمعِ قرآن

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اِسلام عرب سے نکل کر رُوم اور اِیران کے دُور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقے کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدینِ اسلام یا اُن تاجروں سے قرآنِ کریم سیکھتے جن کی بدولت

---

[1] البرہان ج:۱ ص:۲۳۴ و ۲۳۵ [2] إتقان ج:۱ ص:۶۰ [3] إتقان، حوالہ بالا۔
[4] مناهل العرفان ج:۱ ص:۲۴۶، وتاریخ القرآن للکردیؒ ص:۲۸ [5] فتح الباری ج:۹ ص:۱۶

انہیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی، اُدھر آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابہ کرامؓ نے اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لئے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا تھا، اس طرح قراءتوں کا یہ اِختلاف دُور دراز ممالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآنِ کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اُس وقت تک اس اِختلاف سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اِختلاف دُور دراز ممالک میں پہنچا اور یہ بات اُن میں پوری طرح مشہور نہ ہوسکی کہ قرآنِ کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے، بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دُوسرے کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآنِ کریم کی متواتر قراءتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دُوسرے سوائے حضرت زیدؓ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، پورے عالمِ اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری اُمت کے لئے حجت بن سکے، کیونکہ دُوسرے نسخے اِنفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے، اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اِہتمام نہیں تھا، اس لئے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی قابلِ اِعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالمِ اسلام میں پھیلا دیئے جائیں، جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انہیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قراءت صحیح اور کونسی غلط ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔

اس کارنامے کی تفصیل روایاتِ حدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ آرمینیا اور آذربیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انہوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآنِ کریم کی قراءتوں کے بارے میں اِختلاف ہو رہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور جاکر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ اُمت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اِختلافات کی شکار ہو، آپ اس کا علاج کیجئے۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیا کے محاذ پر جہاد میں شامل تھا، وہاں میں نے دیکھا کہ شام کے لوگ اُبیّ بن کعبؓ کی قراءت پڑھتے ہیں، جو اہلِ عراق نے نہیں سنی ہوتی، اور اہلِ عراق عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہلِ شام نے نہیں سنی ہوتی، اس کے نتیجہ میں ایک دُوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ خود بھی اس خطرے کا اِحساس پہلے ہی کرچکے تھے، انہیں یہ اِطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ قرآنِ کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگردوں کو ایک قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، اور دُوسرے معلم نے دُوسری قراءت کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملتے تو ان میں اِختلاف ہوتا، اور بعض مرتبہ یہ اِختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دُوسرے کی قراءت کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن

یمانؓ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دِلائی تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہؓ کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ ''مجھے یہ اِطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دُوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے، اور بات کفر کی حد تک پہنچ سکتی ہے، لہٰذا آپ لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟'' صحابہؓ نے خود حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ ''آپ نے کیا سوچا ہے؟'' حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ ''میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں تاکہ کوئی اِختلاف اور اِفتراق پیش نہ آئے'' صحابہؓ نے اس رائے کو پسند کر کے حضرت عثمانؓ کی تائید فرمائی۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، اور اس میں فرمایا کہ تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآنِ کریم کی قراءتوں کے بارے میں ایک دُوسرے کی تکذیب اور ایک دُوسرے سے اِختلاف کرتے ہو، اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دُور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اِختلاف کرتے ہوں گے، لہٰذا تمام لوگ مل کر قرآنِ کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجب الاقتداء ہو۔

اس غرض کے لئے حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابوبکرؓ کے تیار کرائے ہوئے) جو صحیفے موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم اُن کو مصاحف میں نقل کر کے آپ کو واپس کر دیں گے۔ حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی، جو حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشامؓ پر مشتمل تھی، اس جماعت کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے صحیفوں سے نقل کر کے کئی ایسے مصاحف تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، ان چار صحابہؓ میں سے حضرت زیدؓ انصاری تھے، اور باقی تینوں حضرات قریشی، اسی لئے حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمایا کہ ''جب تمہارا اور زیدؓ کا قرآن کے کسی حصہ میں اِختلاف ہو (یعنی اس میں اِختلاف ہو کہ کونسا لفظ کس طرح لکھا جائے؟) تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لے کہ قرآنِ کریم انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔''

بنیادی طور پر تو یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پھر دُوسرے صحابہؓ کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگا دیا گیا، [1] ان حضرات نے کتابتِ قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیئے:-

۱- حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا۔ [2]

۲- قرآنِ کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قراءتیں سما جائیں، اسی لئے اُن پر نہ نقطے

---

[1] یہ پوری تفصیل اور اس سلسلے کی تمام روایات فتح الباری ج:۹ ص:۱۳ تا ۱۵ سے ماخوذ ہیں۔
[2] مستدرک ج:۲ ص:۲۲۹

لگائے گئے اور نہ حرکات (زیر، زبر، پیش) تاکہ اسے تمام متواتر قراءتوں کے مطابق پڑھا جاسکے، مثلاً ننسرھا لکھا تاکہ اسے نَنْشُرُهَا اور نُنْشِزُهَا دونوں طرح پڑھا جاسکے کیونکہ یہ دونوں قراءتیں دُرست ہیں۔ [1]

۳- اب تک قرآنِ کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری اُمت کی اِجتماعی تصدیق سے تیار کیا گیا ہو صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ مصاحف تیار کرائے تھے، لیکن ابوحاتم سجستانیؒ کا اِرشاد ہے کہ کل سات نسخے تیار کئے گئے تھے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا۔ [2]

۴- مذکورہ بالا کام کرنے کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر تو انہی صحیفوں کو سامنے رکھا جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی مزید اِحتیاط کے لئے وہی طریقِ کار اِختیار کیا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اِختیار کیا گیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں انہیں دوبارہ طلب کیا گیا اور ان کے ساتھ اَزسرِنو مقابلہ کرکے یہ نسخے تیار کئے گئے، اس مرتبہ سورۂ اَحزاب کی ایک آیت نمبر ۲۳ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ علیحدہ لکھی ہوئی صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی۔ پیچھے ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یاد نہیں تھی، کیونکہ حضرت زیدؓ خود فرماتے ہیں کہ: ''مصحف لکھتے وقت سورۂ اَحزاب کی وہ آیت نہ ملی جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا۔'' اس سے صاف واضح ہے کہ یہ آیت حضرت زیدؓ اور دُوسرے صحابہؓ کو اچھی طرح یاد تھی، اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی نہ تھی، کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو صحیفے لکھے گئے ظاہر ہے کہ یہ آیت اُن میں موجود تھی، نیز دُوسرے صحابہؓ کے پاس قرآنِ کریم کے جو اِنفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے ان میں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی اُن تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابہ کرامؓ کے پاس لکھی ہوئی تھیں اس لئے حضرت زیدؓ وغیرہ نے کوئی آیت ان مصاحف میں اُس وقت تک نہیں لکھی جب تک اُن تحریروں میں بھی وہ نہ مل گئی، اس طرح دُوسری آیتیں تو متعدد صحابہؓ کے پاس علیحدہ لکھی ہوئی بھی ملیں، لیکن سورۂ اَحزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خزیمہؓ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی۔

۵- قرآنِ کریم کے یہ متعدد معیاری نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ تمام اِنفرادی نسخے نذرِ آتش فرمادیئے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے تاکہ رسم الخط، مسلّمہ قراءتوں کے اِجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اِعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہوجائیں، اور ان میں کوئی اِختلاف باقی نہ رہے۔

---

[1] مناهل العرفان ج:۱ ص:۲۵۳ و ۲۵۴ [2] فتح الباري ج:۹ ص:۱۷

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کارنامے کو پوری اُمت نے بہ نظرِ استحسان دیکھا، اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں اُن کی تائید اور حمایت فرمائی، صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس معاملہ میں کچھ رنجش رہی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں،[1] حضرت علیؓ فرماتے ہیں:-

''عثمان کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوا نہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم! انہوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں مشورے سے کیا۔''[2]

تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے اِقدامات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا کارنامے کے بعد اُمت کا اس پر اجماع ہوگیا کہ قرآنِ کریم کو رسمِ عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں، چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقے کے مطابق لکھے گئے، اور صحابہؓ وتابعینؒ نے مصاحفِ عثمانی کی نقول تیار کرکر کے قرآنِ کریم کی وسیع پیمانے پر اِشاعت کی۔

لیکن ابھی تک قرآنِ کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیر، زبر، پیش سے خالی تھے، اس لئے اہلِ عجم کو ان کی تلاوت میں دُشواری ہوتی تھی، چنانچہ جب اِسلام عجمی ممالک میں اور زیادہ پھیلا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں نقطوں اور حرکات کا اِضافہ کیا جائے، تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کرسکیں، اس مقصد کے لئے مختلف اِقدامات کئے گئے، جن کی مختصر تاریخ درج ذیل ہے:

نقطے

اہلِ عرب میں اِبتداءً حروف پر نقطے لگانے کا رِواج نہیں تھا، پڑھنے والے اس طرز کے اتنے عادی تھے کہ انہیں بغیر نقطوں کی تحریر پڑھنے میں کوئی دُشواری نہیں ہوتی تھی اور سیاق وسباق کی مدد سے مشتبہ حروف میں اِمتیاز بھی بہ آسانی ہوجاتا تھا، خاص طور سے قرآنِ کریم کے معاملے میں کسی اِشتباہ کا اِمکان اس لئے نہیں تھا کہ اس کی حفاظت کا مدار کتابت پر نہیں، بلکہ حافظوں پر تھا، اور حضرت عثمانؓ نے جو نسخے عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں بھیجے تھے ان کے ساتھ قاری بھی بھیجے گئے تھے، جو اُسے پڑھنا سکھا سکیں۔

اس میں روایات مختلف ہیں کہ قرآنِ کریم کے نسخے پر سب سے پہلے کس نے نقطے ڈالے؟ بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے حضرت ابوالاسوَد دوئلیؒ نے انجام دیا،[3] بعض کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ کام حضرت علیؓ کی تلقین

---

[1] اس کی تفصیل کے لئے احقر کی مفصل کتاب ''علوم القرآن'' ملاحظہ فرمایئے۔

[2] فتح الباری ج:۹ ص:۱۵ [3] البرہان ج:۱ ص:۲۵۰

کے تحت کیا،[1] اور بعض نے کہا ہے کہ کوفہ کے گورنر زیاد بن ابی سفیان نے ان سے یہ کام کرایا، اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ کارنامہ حجاج بن یوسف نے حسن بصریؒ، یحییٰ بن یعمرؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ کے ذریعہ انجام دیا۔[2]

حرکات

نقطوں کی طرح شروع میں قرآنِ کریم پر حرکات (زیر، زبر، پیش) بھی نہیں تھیں، اور اس میں بھی روایات کا بڑا اِختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے حرکات لگائیں؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؒ نے انجام دیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ کام حجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعمرؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ سے کرایا۔[3]

اس سلسلے میں تمام روایات کو پیشِ نظر رکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرکات سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؒ نے وضع کیں، لیکن یہ حرکات اُس طرح کی نہ تھیں جیسی آج کل رائج ہیں، بلکہ زبر کے لئے حرف کے اُوپر ایک نقطہ ''ـٔ''، زیر کے لئے حرف کے نیچے ایک نقطہ ''ـ۪''، اور پیش کے لئے حرف کے سامنے ایک نقطہ ''ـ•''، اور تنوین کے لئے دو نقطے ''ـٔٔ'' یا ''ـ۪۪'' یا ''ـ••'' مقرّر کئے گئے۔ بعد میں خلیل بن احمدؒ نے ہمزہ اور تشدید کی علامتیں وضع کیں۔[4] اس کے بعد حجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعمر، نصر بن عاصم لیثی اور حسن بصری رحمہم اللہ سے بیک وقت قرآنِ کریم پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی، اس موقع پر حرکات کے اِظہار کے لئے نقطوں کے بجائے زیر، زبر، پیش کی موجودہ صورتیں مقرّر کی گئیں، تاکہ حروف کے ذاتی نقطوں سے اُن کا اِلتباس پیش نہ آئے، واللہ سبحانہ اعلم۔

اَحزاب یا منزلیں

صحابہؓ اور تابعینؒ کا معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے ایک قرآن ختم کر لیتے تھے، اس مقصد کے لئے انہوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار مقرّر کی ہوئی تھی جسے ''حزب'' یا ''منزل'' کہا جاتا ہے، اس طرح پورے قرآن کو کل سات اَحزاب پر تقسیم کیا گیا تھا۔[5]

اَجزاء یا پارے

آج کل قرآنِ کریم تیس اَجزاء پر منقسم ہے، جنہیں تیس پارے کہا جاتا ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اِعتبار سے نہیں، بلکہ بچوں کو پڑھانے کے لئے آسانی کے خیال سے تیس مساوی حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے، چنانچہ بعض اوقات بالکل

---

[1] صبح الأعشی ج:۳ ص:۱۵۵ [2] تفسیر القرطبی ج:۱ ص:۶۳ [3] قرطبی ج:۱ ص:۶۳
[4] صبح الأعشی ج:۳ ص:۱۶۰ و ۱۶۱ [5] البرہان ج:۱ ص:۲۵۰

ادھوری بات پر پارہ ختم ہو جاتا ہے۔ یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تیس پاروں کی تقسیم کس نے کی ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مصاحف نقل کراتے وقت انہیں تیس مختلف صحیفوں میں لکھوایا تھا، لہٰذا یہ تقسیم آپ ہی کے زمانہ کی ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ علامہ بدرالدین زرکشیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے تیس پارے مشہور چلے آتے ہیں اور مدارس کے قرآنی نسخوں میں اُن کا رواج ہے۔ [1] بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم عہدِ صحابہؓ کے بعد تعلیم کی سہولت کے لئے کی گئی ہے، واللہ اعلم۔

اَخماس اور اَعشار

قرونِ اُولیٰ کے قرآنی نسخوں میں ایک اور علامت کا رِواج تھا، اور وہ یہ کہ ہر پانچ آیتوں کے بعد (حاشیہ پر) لفظ ''خمس'' یا ''خ'' اور ہر دس آیتوں کے بعد لفظ ''عشر'' یا ''ع'' لکھ دیتے تھے۔ پہلی قسم کی علامتوں کو ''اَخماس'' اور دُوسری قسم کی علامتوں کو ''اَعشار'' کہا جاتا تھا۔ [2] علمائے متقدمین میں یہ اِختلاف بھی رہا ہے کہ بعض حضرات ان علامتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے تھے، یقینی طور سے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ یہ علامتیں سب سے پہلے کس نے لگائیں؟ ایک قول یہ ہے کہ اس کا موجد حجاج بن یوسف تھا، اور دُوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے عباسی خلیفہ مأمون نے اس کا حکم دیا تھا۔ [3] لیکن یہ دونوں اقوال اس لئے دُرست معلوم نہیں ہوتے کہ خود صحابہؓ کے زمانے میں ''اَعشار'' کا تصوّر ملتا ہے، چنانچہ حضرت مسروقؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مصحف میں ''اَعشار'' کا نشان ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ [4]

رُکوع

''اَخماس'' اور ''اَعشار'' کی علامتیں تو بعد میں متروک ہوگئیں، لیکن ایک اور علامت جو آج تک رائج چلی آتی ہے، رُکوع کی علامت ہے، اور اس کی تعیین قرآنِ کریم کے مضامین کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلۂ کلام ختم ہوا وہاں رُکوع کی علامت (حاشیہ پر حرف ع) بنادی گئی، احقر کو جستجو کے باوجود مستند طور پر یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ رُکوع کی اِبتدا کس نے اور کس دور میں کی؟ البتہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد آیات کی ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جاسکے، اور اس کو ''رُکوع'' اسی لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہنچ کر رُکوع کیا جائے۔

---

[1] البرهان ج:۱ ص:۲۵۰ و مناهل العرفان ج:۱ ص:۴۰۲

[2] مناهل العرفان ج:۱ ص:۴۰۳

[3] البرهان ج:۱ ص:۲۵۱

[4] مصنف ابن ابی شیبة ج:۲ ص:۴۹۷

پورے قرآن میں ۵۴۰ رُکوع ہیں،[۱] اس طرح اگر تراویح کی ہر رکعت میں ایک رُکوع پڑھا جائے، تو ستائیسویں شب میں قرآنِ کریم ختم ہوسکتا ہے۔[۲]

رُموزِ اَوقاف

تلاوت اور تجوید کی سہولت کے لئے ایک اور مفید کام یہ کیا گیا کہ مختلف قرآنی جملوں پر ایسے اِشارے لکھ دیئے گئے جن سے یہ معلوم ہوسکے کہ اس جگہ وقف کرنا (سانس لینا) کیسا ہے؟ ان اِشارات کو ''رُموزِ اَوقاف'' کہتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک غیر عربی داں اِنسان بھی جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقف کر سکے، اور غلط جگہ سانس توڑنے سے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو، ان میں سے اکثر رُموز سب سے پہلے علامہ ابوعبداللہ محمد بن طیفور سجاوندی رحمۃ اللہ علیہ نے وضع فرمائے۔[۳] ان رُموز کی تفصیل یہ ہے:-

ط یہ ''وقفِ مطلق'' کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بات پوری ہوگئی ہے، اس لئے یہاں وقف کرنا بہتر ہے۔

ج یہ ''وقفِ جائز'' کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے۔

ز یہ ''وقفِ مجوَّز'' کا مخفف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وقف کرنا دُرست تو ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ وقف نہ کیا جائے۔

ص یہ ''وقفِ مرخص'' کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ بات تو پوری نہیں ہوئی، لیکن جملہ چونکہ طویل ہوگیا ہے، اس لئے سانس لینے کے لئے دُوسرے مقامات کے بجائے یہاں وقف کرنا چاہئے۔[۴]

م یہ ''وقفِ لازم'' کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنی میں فحش غلطی کا اِمکان ہے، لہٰذا یہاں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے۔ بعض حضرات اسے وقفِ واجب بھی کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد فقہی واجب نہیں جس کے ترک سے گناہ ہو، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تمام اوقاف میں اس جگہ وقف کرنا سب سے زیادہ بہتر ہے۔[۵]

---

[۱] فتاویٰ عالمگیریہ میں مشائخ بخارا کے حوالے سے رُکوعات کی تعداد ۵۴۰ ہی بیان کی گئی ہے، لیکن جب ہم نے قرآنِ کریم کے مروّجہ نسخوں میں خود گنتی کی تو رکوعات کی تعداد ۵۵۸ پائی، اور بعض اَصحاب نے ہمیں خط میں لکھا کہ ان کی گنتی کے مطابق رُکوعات کی کل تعداد ۵۶۷ ہے، ہوسکتا ہے کہ رُکوع کی علامات لگانے میں بھی مختلف نسخوں میں کچھ اِختلاف رہا ہو۔ واللہ اعلم (از ناشر ۱۶/۱۲/۱۴۱۲ھ)

[۲] فتاویٰ عالمگیریة، فصل فی التراویح ج:۱ ص:۱۱۸

[۳] النشر فی القراآت العشر ج:۱ ص:۲۲۵

[۴] المنح الفکریة ص:۶۳

[۵] النشر ج:۱ ص:۲۳۱

لا یہ "لَا تَـقِفْ" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ "یہاں نہ ٹھہرو" لیکن اس کا منشاء یہ نہیں کہ یہاں وقف کرنا ناجائز ہے، بلکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں وقف کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور اس کے بعد والے لفظ سے اِبتدا کرنا بھی جائز ہے، لہٰذا اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ اسے دوبارہ لوٹا کر پڑھا جائے، اگلے لفظ سے اِبتداء کرنا مستحسن نہیں۔ [۱] [۲]

ان رُموز کے بارے میں تو یقینی طور پر ثابت ہے کہ یہ علامہ سجاوندیؒ کے وضع کئے ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بھی بعض رُموز قرآنِ کریم کے نسخوں میں موجود ہیں، مثلاً:-

مع یہ "معانقہ" کا مخفف ہے، یہ علامت اس جگہ لکھی جاتی ہے جہاں ایک ہی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہیں، ایک تفسیر کے مطابق وقف ایک جگہ ہوگا، اور دُوسری تفسیر کے مطابق دُوسری جگہ، لہٰذا ان میں سے کسی ایک جگہ وقف کیا جاسکتا ہے، لیکن ایک جگہ وقف کرنے کے بعد دُوسری جگہ وقف کرنا دُرست نہیں۔ مثلاً ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ الخ (الفتح:۲۹) اس میں اگر التَّوْرٰىةِ پر وقف کرلیا تو الْاِنْجِيْلِ پر وقف دُرست نہیں، اور اگر الْاِنْجِيْلِ پر وقف کرنا ہے تو التَّوْرٰىةِ پر وقف دُرست نہیں، ہاں دونوں جگہ وقف نہ کریں تو دُرست ہے۔ اس کا ایک نام "مقابلہ" بھی ہے، اور اس کی سب سے پہلے نشاندہی اِمام ابوالفضل رازیؒ نے فرمائی۔ [۳]

سکتة یہ "سکتہ" کی علامت ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ رُکنا چاہئے، لیکن سانس نہ ٹوٹنے پائے، یہ عموماً اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں ملاکر پڑھنے سے معنی میں غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔

وقفة اس جگہ "سکتہ" سے قدرے زیادہ دیر تک رُکنا چاہئے، لیکن سانس یہاں بھی نہ ٹوٹے۔

ق یہ "قِيْلَ عَلَيْهِ الْوَقْفُ" کا مخفف ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہاں وقف ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے۔

قف یہ لفظ "قِفْ" ہے، جس کے معنی ہیں "ٹھہر جاؤ"، اور یہ اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہوسکتا ہو کہ یہاں وقف دُرست نہیں۔

صلے یہ "اَلْوَصْلُ اَوْلٰی" کا مخفف ہے، جس کے معنی ہیں کہ "ملاکر پڑھنا بہتر ہے"۔

صل یہ "قَدْ يُوْصَلُ" کا مخفف ہے، یعنی یہاں بعض لوگ ٹھہرتے ہیں اور بعض ملاکر پڑھنے کو پسند کرتے ہیں۔

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ اُن مقامات پر لکھا جاتا ہے جہاں کسی روایت کی رُو سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت کرتے ہوئے اس جگہ وقف فرمایا تھا۔

---

[۱] النشر ج:۱ ص:۲۳۳ [۲] ○ گول دائرہ یہ علامت آیت ہے۔ (ناشر) [۳] النشر ج:۱ ص:۲۳۷، الإتقان ج:۱ ص:۸۸

قرآنِ کریم کی طباعت

جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا، قرآنِ کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے تھے، اور ہر دور میں ایسے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہی ہے جس کا کتابتِ قرآن کے سوا کوئی مشغلہ نہیں تھا، قرآنِ کریم کے حروف کو بہتر سے بہتر انداز میں لکھنے کے لئے مسلمانوں نے جو محنتیں کیں اور جس طرح اس عظیم کتاب کے ساتھ اپنے والہانہ شغف کا اظہار کیا، اس کی ایک بڑی مفصل اور دلچسپ تاریخ ہے، جس کے لئے مستقل تصنیف چاہئے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔

پھر جب پریس ایجاد ہوا تو سب سے پہلے ہیمبرگ کے مقام پر ۱۱۱۳ھ میں قرآنِ کریم طبع ہوا، جس کا ایک نسخہ اب تک دار الکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد مستشرقین نے قرآنِ کریم کے نسخے طبع کرائے، لیکن اسلامی دُنیا میں ان کو قبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ اس کے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے رُوس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ میں ۱۷۸۷ء میں قرآنِ کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۲۸ء میں اِیران کے شہر تہران میں قرآنِ کریم کو پتھر پر طبع کیا گیا، پھر اس کے مطبوعہ نسخے دُنیا بھر میں عام ہوگئے۔ [۱]

علمِ تفسیر

اب کچھ ضروری معلومات علمِ تفسیر کے سلسلے میں پیشِ خدمت ہیں۔ عربی زبان میں ''تفسیر'' کے لفظی معنی ہیں ''کھولنا'' اور اِصطلاح میں علمِ تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآنِ کریم کے معانی بیان کئے جائیں، اور اس کے اَحکام اور حکمتوں کو کھول کر واضح کیا جائے۔ [۲] قرآنِ کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے اِرشاد ہے:-

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل:۴۴)

''اور ہم نے قرآن آپ پر اُتارا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان فرمادیں جو اُن کی طرف اُتاری گئی ہیں۔''

نیز قرآنِ کریم کا اِرشاد ہے:-

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران:۱۶۴)

''بلاشبہ اللہ نے مسلمانوں پر بڑا اِحسان فرمایا جبکہ اُن کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ القرآن للکردیؒ ص:۱۸۶، اور علوم القرآن، ڈاکٹر صبحی صالح اُردو ترجمہ غلام احمد حریری ص:۱۴۲

[۲] البرہان۔

اُن کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرے، اور انہیں پاک صاف کرے، اور انہیں اللہ کی کتاب اور دانائی کی باتوں کی تعلیم دے۔"

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو صرف قرآنِ کریم کے الفاظ ہی نہیں سکھاتے تھے، بلکہ اس کی پوری تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کو ایک ایک سورت پڑھنے میں بعض اوقات کئی کئی سال لگ جاتے تھے، جس کی تفصیل اِن شاء اللہ آگے آئے گی۔

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں تشریف فرما تھے اُس وقت تک کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں تھا، صحابہ کرامؓ کو جہاں کوئی دُشواری پیش آتی وہ آپ سے رُجوع کرتے اور انہیں تسلی بخش جواب مل جاتا۔ لیکن آپ کے بعد اس بات کی ضرورت تھی کہ تفسیرِ قرآن کو ایک مستقل علم کی صورت میں محفوظ کیا جاتا، تاکہ اُمت کے لئے قرآنِ کریم کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح معنی بھی محفوظ ہو جائیں، اور مُلحد و گمراہ لوگوں کے لئے اس کی معنوی تحریف کی گنجائش باقی نہ رہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اس اُمت نے یہ کارنامہ اس حسن وخوبی سے انجام دیا کہ آج ہم یہ بات بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی اس آخری کتاب کے صرف الفاظ ہی محفوظ نہیں ہیں بلکہ اس کی وہ صحیح تفسیر وتشریح بھی محفوظ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہؓ کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔

تفسیرِ قرآن کے مآخذ

علمِ تفسیر کو اِس اُمت نے کس کس طرح محفوظ کیا؟ اس راہ میں انہوں نے کیسی کیسی مشقتیں اُٹھائیں؟ اور یہ جدوجہد کتنے مراحل سے گزری؟ اس کی ایک طویل اور دِلچسپ تاریخ ہے جس کا یہاں موقع نہیں[1]۔ لیکن یہاں مختصراً یہ بتانا ہے کہ تفسیرِ قرآن کے مآخذ کیا کیا ہیں؟ اور علمِ تفسیر پر جو بے شمار کتابیں ہر زبان میں ملتی ہیں انہوں نے قرآنِ کریم کی تشریح میں کن سرچشموں سے اِستفادہ کیا ہے، یہ سرچشمے کل چھ ہیں:

۱- قرآنِ کریم

علمِ تفسیر کا پہلا مأخذ خود قرآنِ کریم ہے، چنانچہ ایسا بہ کثرت ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی بات مجمل اور تشریح طلب ہوتی ہے تو خود قرآنِ کریم ہی کی کوئی دُوسری آیت اس کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے، مثلاً سورۂ فاتحہ کی دُعا میں یہ جملہ موجود ہے کہ "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" یعنی "ہمیں اُن لوگوں کے راستہ کی ہدایت کیجئے جن پر آپ کا اِنعام ہوا۔" اب یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اِنعام فرمایا، لیکن ایک دُوسری آیت میں ان کو واضح

[1] اس کے لئے علوم القرآن پر احقر کی مفصل کتاب ملاحظہ فرمایئے۔

طور سے متعین کر دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:-

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ (النساء:٦٩)

"یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے اِنعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالح لوگ۔"

چنانچہ مفسرینِ کرامؒ جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآنِ کریم ہی میں کسی اور جگہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔

۲- حدیث

"حدیث" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کو کہتے ہیں، اور جیسا کہ پیچھے بیان کیا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے ساتھ آپ کو مبعوث ہی اس لئے فرمایا تھا کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآنِ کریم کی صحیح تشریح کھول کھول کر بیان فرمادیں، چنانچہ آپ نے اپنے قول اور عمل دونوں سے یہ فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا، اور درحقیقت آپ کی پوری مبارک زندگی قرآن ہی کی عملی تفسیر ہے، اس لئے مفسرینِ کرامؒ نے قرآنِ کریم کو سمجھنے کے لئے دُوسرے نمبر پر سب سے زیادہ زور حدیث پر دِیا ہے، اور اَحادیث کی روشنی میں کتابُ اللہ کے معنی متعین کئے ہیں، البتہ چونکہ حدیث میں صحیح، ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں، اس لئے محقق مفسرین اس وقت تک کسی روایت کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے جب تک وہ تنقیدِ روایات کے اُصولوں پر پوری نہ اُترتی ہو، لہٰذا جو روایت جہاں نظر آجائے اُسے دیکھ کر قرآنِ کریم کی کوئی تفسیر متعین کرلینا دُرست نہیں، کیونکہ وہ روایت ضعیف اور دُوسری مضبوط روایتوں کے خلاف بھی ہوسکتی ہے، درحقیقت یہ معاملہ بڑا نازک ہے، اور اس میں قدم رکھنا انہی لوگوں کا کام ہے جنھوں نے اپنی عمریں ان علوم کو حاصل کرنے میں خرچ کی ہیں۔

۳- صحابہ کے اقوال

صحابہ کرام نے قرآنِ کریم کی تعلیم براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ نزولِ وحی کے وقت وہ بہ نفسِ نفیس موجود تھے، اور انہوں نے نزولِ قرآن کے پورے ماحول اور پس منظر کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا، اس لئے فطری طور پر قرآنِ کریم کی تفسیر میں ان حضرات کے اقوال جتنے مستند اور قابلِ اعتماد ہوسکتے ہیں، بعد کے لوگوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا، لہٰذا جن آیتوں کی تفسیر قرآن یا حدیث سے معلوم نہیں ہوتی، ان میں سب سے زیادہ اہمیت صحابہ کرام کے اقوال کو حاصل ہے، چنانچہ اگر کسی آیت کی تفسیر پر صحابہ کا اِتفاق ہو تو مفسرینِ کرام اسی کو اِختیار کرتے ہیں اور اس کے خلاف کوئی اور تفسیر بیان کرنا جائز نہیں۔ ہاں! اگر کسی آیت کی تفسیر میں صحابہ کرام کے اقوال مختلف ہوں تو بعد کے مفسرین دُوسرے دلائل کی روشنی میں یہ دیکھتے ہیں کہ کونسی تفسیر کو ترجیح دی جائے؟ اس معاملے میں اہم اُصول اور قواعد

اُصولِ فقہ، اُصولِ حدیث اور اُصولِ تفسیر میں مدوّن ہیں، ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

۴- تابعین کے اقوال

صحابہ کے بعد تابعین کا نمبر آتا ہے، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے قرآنِ کریم کی تفسیر صحابہ کرام سے سیکھی ہے، اس لئے اُن کے اقوال بھی علمِ تفسیر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اگرچہ اس معاملے میں علماء کا اِختلاف ہے کہ تابعین کے اقوال تفسیر میں حجت ہیں یا نہیں؟ [1] لیکن ان کی اہمیت سے اِنکار نہیں کیا جاسکتا۔

۵- لغتِ عرب

قرآنِ کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لئے تفسیرِ قرآن کے لئے اس زبان پر مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کے پس منظر میں چونکہ کوئی شانِ نزول یا کوئی اور فقہی یا کلامی مسئلہ نہیں ہوتا، اس لئے اُن کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ وتابعین کے اقوال منقول نہیں ہوتے، چنانچہ اُن کی تفسیر کا ذریعہ صرف لغتِ عرب ہوتی ہے، اور لغت ہی کی بنیاد پر اس کی تشریح کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اِختلاف ہو تو مختلف آراء میں محاکمہ کے لئے بھی علمِ لغت سے کام لیا جاتا ہے۔

۶- تدبر اور اِستنباط

تفسیر کا آخری مأخذ ''تدبر اور اِستنباط'' ہے، قرآنِ کریم کے نکات واَسرار ایک ایسا بحرِ ناپیدا کنار ہے، جس کی کوئی حد ونہایت نہیں، چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی علوم میں بصیرت عطا فرمائی ہو، وہ جتنا جتنا اس میں غور وفکر کرتا ہے اُتنے ہی نئے نئے اَسرار ونکات سامنے آتے ہیں، چنانچہ مفسرینِ کرام اپنے اپنے تدبر کے نتائج بھی اپنی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں، لیکن یہ اَسرار ونکات اسی وقت قابلِ قبول ہوتے ہیں جبکہ وہ مذکورہ بالا پانچ مآخذ سے متصادم نہ ہوں، لہٰذا اگر کوئی شخص قرآن کی تفسیر میں کوئی ایسا نکتہ یا اِجتہاد بیان کرے جو قرآن وسنت، اجماع، لغت یا صحابہ وتابعین کے اقوال کے خلاف ہو، یا کسی دُوسرے شرعی اُصول سے ٹکراتا ہو تو اس کا کوئی اِعتبار نہیں۔ بعض صوفیاء نے تفسیر میں اس قسم کے اَسرار ونکات بیان کرنے شروع کئے تھے، لیکن اُمت کے محقق علماء نے انہیں قابلِ اِعتبار نہیں سمجھا، کیونکہ قرآن وسنت اور شریعت کے بنیادی اُصولوں کے خلاف کسی کی شخصی رائے ظاہر ہے کہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ [2]

---

[1] الإتقان ج:۲ ص:۱۷۹ [2] إتقان ج:۲ ص:۱۸۴

اسرائیلیات کا حکم

''اِسرائیلیات'' اُن روایتوں کو کہتے ہیں جو اہلِ کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں۔ پہلے زمانے کے مفسرینؒ کی عادت تھی کہ وہ کسی آیت کے ذیل میں ہر قسم کی وہ روایات لکھ دیتے تھے جو انہیں سند کے ساتھ پہنچتی تھیں، ان میں بہت سی روایتیں اِسرائیلیات بھی ہوتی تھیں، اس لئے اُن کی حقیقت سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ ان کی حقیقت یہ ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ پہلے اہلِ کتاب کے مذہب سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں جب وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی تو انہیں قرآنِ کریم میں پچھلی اُمتوں کے بہت سے وہ واقعات نظر آئے جو انہوں نے اپنے سابقہ مذہب کی کتابوں میں بھی پڑھے تھے، چنانچہ وہ قرآنی واقعات کے سلسلے میں وہ تفصیلات مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے تھے جو انہوں نے اپنے پُرانے مذہب کی کتابوں میں دیکھی تھیں، یہی تفصیلات ''اِسرائیلیات'' کے نام سے تفسیر کی کتابوں میں داخل ہوگئی ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے، جو بڑے محقق مفسرین میں سے ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ اِسرائیلیات کی تین قسمیں ہیں:-

۱- وہ روایات جن کی سچائی قرآن وسنت کے دُوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً فرعون کا غرق ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر تشریف لے جانا وغیرہ۔

۲- وہ روایات جن کا جھوٹ ہونا قرآن وسنت کے دُوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً اِسرائیلی روایات میں یہ مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی آخری عمر میں (معاذ اللہ) مرتد ہوگئے تھے، اس کی تردید قرآنِ کریم سے ثابت ہے، اِرشاد ہے کہ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (البقرۃ:۱۰۲) (اور سلیمانؑ کافر نہیں ہوئے، بلکہ شیاطین نے کفر کیا)۔ اسی طرح مثلاً اِسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ (معاذ اللہ) حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار ''اوریا'' کی بیوی سے زنا کیا، یا اُسے مختلف تدبیروں سے مروا کر اس کی بیوی سے نکاح کرلیا، یہ بھی کھلا جھوٹ ہے اور اس قسم کی روایتوں کو غلط سمجھنا لازم ہے۔

۳- وہ روایات جن کے بارے میں قرآن وسنت اور دُوسرے شرعی دلائل خاموش ہیں، جیسے کہ توراۃ کے اَحکام وغیرہ، ایسی روایات کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے بارے میں سکوت اِختیار کیا جائے، نہ اُن کی تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب۔ البتہ اس مسئلہ میں علماء کا اِختلاف ہے کہ آیا ایسی روایات نقل کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ حافظ ابنِ کثیرؒ نے قولِ فیصل یہ بیان کیا ہے کہ انہیں نقل کرنا جائز تو ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ شرعی اِعتبار سے وہ حجت نہیں ہے۔[1]

---

[1] مقدمة تفسير ابن كثير-

تفسیرِ قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ قرآنِ کریم کی تفسیر ایک اِنتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لئے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مفسرِ قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے نحو وصَرف اور بلاغت واَدب کے علاوہ علمِ حدیث، اُصولِ فقہ وتفسیر اور عقائد وکلام کا وسیع وعمیق علم رکھتا ہو، کیونکہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو، اِنسان قرآنِ کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔

افسوس ہے کہ کچھ عرصے سے مسلمانوں میں یہ خطرناک وبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف عربی پڑھ لینے کو تفسیرِ قرآن کے لئے کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان پڑھ لیتا ہے، وہ قرآنِ کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کردیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی نہایت معمولی شُدبُد رکھنے والے لوگ جنہیں عربی پر بھی مکمل عبور نہیں ہوتا، نہ صرف من مانے طریقے پر قرآن کی تفسیر شروع کردیتے ہیں، بلکہ پرانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے درپے ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کرکے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ اِنتہائی خطرناک طرزِ عمل ہے جو دِین کے معاملہ میں نہایت مہلک گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ دُنیوی علوم وفنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کرلے تو دُنیا کا کوئی صاحبِ عقل اُسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کرسکتا، اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کرسکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم وتربیت حاصل نہ کی ہو، اس لئے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے صرف انگریزی سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم وتربیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح کوئی انگریزی داں انجینئرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کرکے انجینئر بننا چاہے تو دُنیا کا کوئی بھی باخبر اِنسان اسے انجینئر تسلیم نہیں کرسکتا، اس لئے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آسکتا، بلکہ اس کے لئے ماہر اَساتذہ کے زیرِ تربیت رہ کر ان سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے۔ جب ڈاکٹر اور انجینئر بننے کے لئے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن وحدیث کے معاملہ میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کیسے کافی ہوسکتا ہے؟ زندگی کے ہر شعبہ میں ہر شخص اس اُصول کو جانتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم وفن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، جنہیں پورا کئے بغیر اس علم وفن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن وسنت اتنے لاوارث کیسے ہوسکتے ہیں کہ ان کی تشریح وتفسیر کے لئے

کسی علم وفن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو، اور اس کے معاملہ میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کردے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے خود اِرشاد فرمایا ہے کہ:-

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (القمر:۱۷)

''اور بلاشبہ ہم نے قرآنِ کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کردیا ہے۔''

اور جب قرآنِ کریم ایک آسان کتاب ہے تو اس کی تشریح کے لئے کسی لمبے چوڑے علم وفن کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ اِستدلال ایک شدید مغالطہ ہے جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی آیات دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت وموعظت کے مضامین بیان کئے گئے ہیں، مثلاً دُنیا کی ناپائیداری، جنت ودوزخ کے حالات، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت پیدا کرنے والی باتیں، اور زندگی کے دُوسرے سیدھے سادے حقائق، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انہیں سمجھ کر نصیحت حاصل کرسکتا ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں اسی قسم کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو ہم نے آسان کردیا ہے، چنانچہ خود اس آیت میں لفظ لِلذِّكْرِ (نصیحت کے واسطے) اس پر دَلالت کررہا ہے۔

اس کے برخلاف دُوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو اَحکام وقوانین، عقائد اور عملی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کماحقہٗ سمجھنا اور ان سے اَحکام ومسائل مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور پختگی حاصل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لئے انہیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآنِ کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدّتیں صَرف کرتے تھے۔ علامہ سیوطیؒ نے اِمام ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضراتِ صحابہؓ نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآنِ کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ انہوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآنِ کریم کی دس آیتیں سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علمی اور عملی باتوں کا اِحاطہ نہ کرلیں، وہ فرماتے تھے کہ:-

فَتَعَلَّمْنَا الْقُرْاٰنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَمِيْعًا۔ [1]

''ہم نے قرآن اور علم وعمل ساتھ ساتھ سیکھا ہے۔''

چنانچہ مؤطا اِمام مالکؒ میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صرف سورۂ بقرہ یاد کرنے میں پورے آٹھ سال صَرف کئے، اور مسندِ احمد میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھ لیتا

[1] اِتقان ج:۲ ص:۱۷۸

ہماری نگاہوں میں اُس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔ [۱]

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضراتِ صحابہؓ جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی کے شعر واَدب میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے اَزبر ہو جایا کرتے تھے، انہیں قرآنِ کریم کو یاد کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے اتنی طویل مدّت کی کیا ضرورت تھی کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہو جائیں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآنِ کریم اور اس کے علوم سیکھنے کے لئے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اُٹھانا ضروری تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جب صحابہ کرامؓ کو عربی زبان کی مہارت اور نزولِ وحی کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود "عالمِ قرآن" بننے کے لئے باقاعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو نزولِ قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شُدبُد پیدا کر کے یا صرف ترجمے دیکھ کر مفسرِ قرآن بننے کا دعویٰ کتنی بڑی جسارت اور علم و دِین کے ساتھ کیسا افسوسناک مذاق ہے؟ ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا اِرتکاب کرتے ہیں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اِرشاد اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ:-

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔ [۲]

"جو شخص قرآن کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔"

اور:-

مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْاٰنِ بِرَاْيِهٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَاَ۔ [۳]

"جو شخص قرآن کے معاملہ میں (محض) اپنی رائے سے گفتگو کرے اور اس میں کوئی صحیح بات بھی کہہ دے تب بھی اس نے غلطی کی۔"

مشہور تفسیریں

عہدِ رِسالت کے بعد سے قرآنِ کریم کی بے شمار تفسیریں لکھی گئی ہیں، بلکہ دُنیا کی کسی کتاب کی بھی اتنی خدمت نہیں کی گئی، جتنی قرآنِ کریم کی کی گئی ہے، ان سب تفاسیر کا تعارف کسی مفصل کتاب میں بھی ممکن نہیں، چہ جائیکہ اس مختصر مقدمہ میں اس کا اِرادہ کیا جائے۔ لیکن یہاں ہم اُن اہم تفسیروں کا مختصر تعارف کرانا چاہتے ہیں جو "معارف القرآن" کا

---

[۱] إتقان ج:۲ ص:۱۷۶ نوع:۷۷

[۲] سنن أبي داوٗد، کتاب العلم، باب التشديد في الكذب على رسول الله صلى الله عليه وسلم، از إتقان ج:۲ ص:۱۷۹

[۳] سنن أبي داوٗد، بحوالۂ بالا، نسائی، از إتقان ج:۲ ص:۱۷۹

خاص مأخذ رہی ہیں، اور جن کا حوالہ ''معارف القرآن'' میں بار بار آیا ہے، اگرچہ ''معارف القرآن'' کی تصنیف کے دوران بہت سی تفاسیر اور سینکڑوں کتابیں پیشِ نظر رہی ہیں، لیکن یہاں صرف اُن تفاسیر کا تذکرہ مقصود ہے جن کے حوالے بکثرت آئیں گے۔

تفسیر ابنِ جریر

اس تفسیر کا اصل نام ''جامع البیان'' ہے، اور یہ علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۱۰ھ) کی تالیف ہے۔ علامہ طبریؒ اُونچے درجے کے مفسر، محدث اور مؤرّخ ہیں، منقول ہے کہ وہ چالیس سال تک مسلسل لکھنے میں مشغول رہے، اور ہر روز چالیس ورق لکھنے کا معمول تھا۔[1] بعض حضرات نے ان پر شیعہ ہونے کا اِلزام عائد کیا ہے، لیکن محققین نے اس اِلزام کی تردید کی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اہلِ سنت کے جلیل القدر عالم ہیں، بلکہ ان کا شمار ائمۂ مجتہدین میں ہوتا ہے۔

ان کی تفسیر تیس جلدوں میں ہے، اور بعد کی تفاسیر کے لئے بنیادی مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے، وہ آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال نقل کرتے ہیں، اور پھر جو قول اُن کے نزدیک راجح ہوتا ہے اُسے دلائل کے ذریعے ثابت کرتے ہیں۔ البتہ ان کی تفسیر میں صحیح وسقیم ہر طرح کی روایات جمع ہوگئی ہیں، اس لئے اُن کی بیان کی ہوئی ہر روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل اس تفسیر سے ان کا مقصد یہ تھا کہ تفسیرِ قرآن کے بارے میں جس قدر روایات انہیں دستیاب ہوسکیں اُن سب کو جمع کر دیا جائے، تاکہ اس جمع شدہ مواد سے کام لیا جاسکے، البتہ انہوں نے ہر روایت کے ساتھ اس کی سند بھی ذِکر کی ہے، تاکہ جو شخص چاہے راویوں کی تحقیق کر کے روایت کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرسکے۔

تفسیر ابنِ کثیر

یہ حافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن کثیر دمشقی شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۷۴ھ) کی تصنیف ہے، جو آٹھویں صدی کے ممتاز اور محقق علماء میں سے ہیں، اُن کی تفسیر چار جلدوں میں شائع ہوچکی ہے، اس میں زیادہ زور تفسیری روایات پر دِیا گیا ہے، اور خاص بات یہ ہے کہ مصنفؒ روایتوں پر محدثانہ تنقید بھی کرتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کتاب تمام کتبِ تفسیر میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

تفسیر القرطبی

اس کا پورا نام ''الجامع لاحکام القرآن'' ہے، اندلس کے مشہور اور محقق عالم علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن

[1] البدایۃ ج:۱۱ ص:۱۴۵

فرح القرطبی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۷۱ھ) کی تصنیف ہے، جو فقہ میں اِمام مالکؒ کے مسلک کے پیرو تھے، اور عبادت وزُہد کے اِعتبار سے شہرۂ آفاق تھے۔ اصل میں اس کتاب کا بنیادی موضوع تو قرآنِ کریم سے فقہی اَحکام و مسائل کا اِستنباط تھا، لیکن اس ضمن میں انہوں نے آیتوں کی تشریح، مشکل الفاظ کی تحقیق، اِعراب و بلاغت اور متعلقہ روایات کو بھی تفسیر میں خوب جمع کیا ہے، یہ کتاب بارہ جلدوں میں ہے، اور بار بار شائع ہوچکی ہے۔

تفسیر کبیر

یہ اِمام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۰۶ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا اصلی نام ''مفاتیح الغیب'' ہے، لیکن ''تفسیر کبیر'' کے نام سے مشہور ہے۔ اِمام رازیؒ متکلمینِ اسلام کے اِمام ہیں، اس لئے ان کی تفسیر میں عقلی اور کلامی مباحث اور باطل فرقوں کی تردید پر بہت زور دِیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حلِ قرآن کے لحاظ سے بھی یہ تفسیر اپنی نظیر آپ ہے، اور اس میں جس دِلنشین انداز میں قرآنِ کریم کے معانی کی توضیح اور آیاتِ قرآنی کے باہمی ربط کی تشریح کی گئی ہے، وہ بڑا قابلِ قدر ہے، اَغلب یہ ہے کہ اِمام رازیؒ نے سورۂ فتح تک کی تفسیر خود لکھی ہے، اس کے بعد وہ اسے پورا نہ کرسکے، چنانچہ سورۂ فتح سے آخر تک کا حصہ قاضی شہاب الدین بن خلیل الخولی الدمشقیؒ (متوفی ۶۳۹ھ) یا شیخ نجم الدین احمد بن محمد القمولیؒ (متوفی ۷۷۷ھ) نے مکمل فرمایا۔ [1]

اِمام رازیؒ نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق چونکہ کلامی بحث اور باطل فرقوں کی تردید پر خاص زور دِیا ہے، اور اس ضمن میں ان کی بحثیں بہت سے مقامات پر اِنتہائی طویل ہوگئی ہیں، اس لئے بعض حضرات نے اُن کی تفسیر پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ ''فِیْهِ كُلُّ شَیْءٍ اِلَّا التَّفْسِیْر'' (اس کتاب میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے)۔ لیکن یہ تبصرہ تفسیر کبیر پر بڑا ظلم ہے، اور حقیقت وہی ہے جو اُوپر بیان ہوئی، کہ حلِ قرآن کے لحاظ سے بھی اس تفسیر کا پایہ بہت بلند ہے، البتہ چند ایک مقامات پر انہوں نے جمہورِ اُمت کی راہ سے ہٹ کر آیاتِ قرآنی کی تفسیر کی ہے، لیکن ایسے مقامات آٹھ ضخیم جلدوں کی اس کتاب میں خال خال ہیں۔

تفسیر البحر المحیط

یہ علامہ ابوحیان غرناطی اندلسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۵۴ھ) کی تصنیف ہے، جو اِسلامی علوم کے علاوہ علمِ نحو و بلاغت میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، چنانچہ ان کی تفسیر میں نحو و بلاغت کا رنگ نمایاں ہے، وہ ہر آیت کے الفاظ کی تحقیق، ترکیبوں کے اِختلاف اور بلاغت کے نکات بیان کرنے پر خاص زور دیتے ہیں۔

---

[1] کشف الظنون ج:۲ ص:۴۷۷

اَحکام القرآن للجصّاصؒ

یہ اِمام ابوبکر جصّاص رازی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۷۰ھ) کی تصنیف ہے، جو فقہائے حنفیہ میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں، ان کی اس کتاب کا موضوع قرآنِ کریم سے فقہی اَحکام ومسائل کا اِستنباط ہے، اور انہوں نے مسلسل آیتوں کی تفسیر کے بجائے صرف اُن آیتوں کی فقہی تفصیلات بیان فرمائی ہیں جو فقہی اَحکام پر مشتمل ہیں۔ اس موضوع پر اور بھی متعدّد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس کتاب کو ان سب میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔

تفسیر الدُّرُّ المنثور

یہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۱۰ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا پورا نام "الدُّرُّ المنثور فی التَّفسیر بالمأثور" ہے، اس میں علامہ سیوطیؒ نے ان تمام روایات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو قرآنِ کریم کی تفسیر سے متعلق ان کو ملی ہیں، ان سے پہلے بہت سے محدثین مثلاً حافظ ابنِ جریرؒ، اِمام بغویؒ، ابنِ مردویہؒ، ابنِ حبانؒ اور ابنِ ماجہؒ وغیرہ اپنے اپنے طور پر یہ کام کرچکے تھے۔ علامہ سیوطیؒ نے ان سب کی بیان کردہ روایات کو اس کتاب میں جمع کردیا ہے، البتہ انہوں نے روایات کے ساتھ ان کی پوری سند ذِکر کرنے کے بجائے صرف اس مصنف کا نام ذِکر کرنے پر اِکتفا کیا ہے جس نے اس روایت کو اپنی سند سے بیان کیا ہے، تاکہ بوقتِ ضرورت اس کی مراجعت کرکے سند کی تحقیق کی جاسکے، چونکہ ان کا مقصد روایات کے ذخیرہ کو یکجا کرنا تھا، اس لئے اس کتاب میں بھی صحیح وسقیم ہرطرح کی روایتیں جمع ہوگئی ہیں، اور سند کی تحقیق کئے بغیر ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت کو قابلِ اِعتماد نہیں سمجھا جاسکتا۔ علامہ سیوطیؒ بعض مرتبہ ہر روایت کے ساتھ یہ بھی بتادیتے ہیں کہ اس کی سند کس درجے کی ہے؟ لیکن چونکہ تنقیدِ حدیث کے معاملہ میں وہ خاصے متساہل مشہور ہیں، اس لئے اس پر بھی کماحقہٗ اِعتماد کرنا مشکل ہے۔

تفسیر مظہری

یہ علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۲۵ھ) کی تصنیف ہے، اور انہوں نے اپنے شیخ طریقت مرزا مظہر جانِ جاناں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر اس تفسیر کا نام "تفسیر مظہری" رکھا ہے، ان کی یہ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے، اور اِختصار کے ساتھ آیاتِ قرآنی کی تشریح معلوم کرنے کے لئے نہایت مفید، انہوں نے الفاظِ قرآنی کی تشریح کے ساتھ متعلقہ روایات کو بھی کافی تفصیل سے ذِکر کیا ہے، اور دُوسری تفسیروں کے مقابلے میں زیادہ چھان پھٹک کر روایات لینے کی کوشش کی ہے۔

رُوح المعانی

اس کا پورا نام "رُوح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی" ہے، اور یہ بغداد کے آخری دور کے مشہور عالم علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۷۰ھ) کی تصنیف ہے، اور تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنی اس تفسیر کو بڑی حد تک جامع بنانے کی کوشش کی ہے، لغت، نحو، ادب اور بلاغت کے علاوہ فقہ، عقائد، کلام، فلسفہ اور ہیئت، تصوّف اور متعلقہ روایات پر بھی مبسوط بحثیں کی ہیں، اور کوشش یہ کی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علمی گوشہ تشنہ نہ رہے۔ روایاتِ حدیث کے معاملے میں بھی اس کے مصنف دُوسرے مفسرین کے مقابلے میں محتاط رہے ہیں، اس لحاظ سے یہ بڑی جامع تفسیر ہے، اور اَب تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں کوئی بھی کام اس کی مدد سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

❋❋❋

تمہید

تمہید

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ عَدَدَ خَلۡقِہٖ وَزِنَۃَ عَرۡشِہٖ وَمِدَادَ کَلِمَاتِہٖ وَرِضٰی نَفۡسِہٖ
وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی صَفۡوَۃِ رُسُلِہٖ وَخَیۡرِ خَلۡقِہٖ سَیِّدِنَا
مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحۡبِہٖ وَجَمِیۡعِ الۡاَنۡبِیَآءِ وَالۡمُرۡسَلِیۡنَ
اَمَّا بَعۡدُ

دُنیا کی سب سے بڑی نعمت قرآن ہے

قرآنِ کریم اس جہان میں وہ نعمتِ بے بہا ہے کہ سارا جہان آسمان وزمین اور ان میں پیدا ہونے والی مخلوقات اس کا بدل نہیں بن سکتیں۔

اِنسان کی سب سے بڑی سعادت اور خوش نصیبی اپنی مقدور بھر قرآنِ کریم میں اِشتغال اور اس کو حاصل کرنا ہے، اور سب سے بڑی شقاوت وبد نصیبی اس سے اِعراض اور اُسے چھوڑنا ہے، اس لئے ہر مسلمان کو اس کی فکر تو فرضِ عین اور ضروری ہے کہ قرآنِ کریم کو صحتِ لفظی کے ساتھ پڑھنے اور اولاد کو پڑھانے کی کوشش کرے، اور پھر جس قدر ممکن ہو اس کے معانی اور اَحکام کو سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے کی فکر میں لگا رہے، اور اس کو اپنی پوری عمر کا وظیفہ بنائے، اور اپنے حوصلے اور ہمت کے مطابق اس کا جو حصہ بھی نصیب ہو جائے اُس کو اس جہان کی سب سے بڑی نعمت سمجھے۔

***

مختصر سرگزشت مصنف

ناکارۂ خلائق بندہ محمد شفیع ابن مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس نعمت کا شکر اَدا نہیں کرسکتا کہ حق تعالیٰ نے اس کا مولد و وطن مرکزِ علومِ اسلامیہ دیوبند کو بنادیا، اور ایسے والدِ محترم کی آغوش میں پرورِش کا موقع عطا فرمایا جو حافظِ قرآن اور عالمِ دِین ہونے کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے ہم عمر تھے، دارالعلوم دیوبند کے بانیان علمائے ربانی کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کے مواقع اُن کو ہمیشہ میسر رہے، اُن کا وجود اُن بزرگوں کا زِندہ تذکرہ تھا، اور اُن کی زندگی بچپن سے وفات تک دارالعلوم دیوبند ہی میں پوری ہوئی، وہیں تعلیم حاصل کی، وہیں مدرّس ہوکر ساری عمر تعلیم کی خدمت گزاری کی۔

احقر کی اِبتداء تعلیمِ قرآن والدِ محترم کی تجویز سے دارالعلوم کے اساتذۂ قرآن حافظ عبدالعلیم صاحب اور حافظ نامدار خان صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے پاس ہوئی، اور پھر خود والدِ محترم کی خدمت میں رہ کر اُردو، فارسی، حساب، ریاضی اور اِبتدائی عربی کی تعلیم حاصل کی، پھر ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم کے درجہ عربی میں باقاعدہ داخلہ لے کر ۱۳۳۵ھ تک درسِ نظامی کا نصاب اُن ماہرِ فن اساتذہ کی خدمت میں رہ کر پورا کیا جن کی نظیر آج دُنیا کے کسی گوشے میں ملنا مشکل ہے۔ بچپن سے متوسط تعلیم عربی تک شیخ العرب والعجم سیّدی حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری دی، کبھی کبھی درسِ بخاری کی غیررسمی حاضری نصیب رہی، مالٹا جیل سے واپس تشریف لانے کے بعد انہی کے دستِ حق پرست پر بیعتِ طریقت نصیب ہوئی۔ اور علومِ عربیہ کی باقاعدہ تعلیم حضراتِ ذیل سے حاصل کی، حافظِ حدیث جامع العلوم حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری، عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، عالمِ ربانی حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اِعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین، اور ماہرِ علومِ معقول و منقول حضرت علامہ مولانا محمد اِبراہیم صاحب و حضرت مولانا محمد رسول خان صاحب، افسوس ہے کہ ان سطور کی تحریر کے وقت آخر الذکر دو بزرگوں کے سوا سب اس دارِ فانی سے رحلت فرماچکے ہیں، حق تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کا سایہ تادیر[1] بعافیت قائم رکھیں، اور اہلِ علم کو ان سے فیض یاب ہونے کا زیادہ سے زیادہ موقع عطا فرمائیں۔

---

[1] ۲۳ رشعبان ۱۳۹۳ھ کو جبکہ ''معارف القرآن'' پر نظرِ ثانی کا کام شروع ہوا تو یہ دونوں بزرگ بھی رُخصت ہوچکے ہیں، حق تعالیٰ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں، اور درجاتِ عالیہ نصیب فرمائیں۔ ۱۲ منہ

اساتذہ اور اکابرِ دارالعلوم کی نظرِ شفقت وعنایت اوّل ہی سے اس ناکارہ پر مبذول تھی، ۱۳۳۶ھ میں احقر نے فنون کی بقیہ چند کتابیں ''قاضی'' اور ''میر زاہد'' اور اُمورِ عامہ وغیرہ پڑھنا شروع کیا تھا کہ اسی سال میں اکابرِ دارالعلوم نے احقر کو کچھ سبق پڑھانے کے لئے دے دیئے، اس طرح ۱۳۳۶ھ میری تعلیم وتعلّم کا مشترک سال تھا، ۱۳۳۷ھ سے باقاعدہ دارالعلوم میں تدریس کی خدمت پر لگا دیا گیا، بارہ سال مسلسل مختلف علوم وفنون کی متوسط اور اعلیٰ کتابوں کے درس کی خدمت انجام دی، ۱۳۴۹ھ میں مجھے صدر مفتی کی حیثیت سے دارالعلوم کا منصبِ فتویٰ سپرد کیا گیا، اس کے ساتھ کچھ کتابیں حدیث وتفسیر کی بھی زیرِ درس رہیں، اور بالآخر ۱۳۶۲ھ میں تحریکِ پاکستان کی جدوجہد اور کچھ دوسرے اسباب کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوگیا۔

دارالعلوم کی چھبیس سالہ خدمتِ درس وفتویٰ کے ساتھ خاص خاص موضوعات پر تصنیف کا بھی سلسلہ جاری رہا، ان تمام مشاغل اور بزرگانِ دارالعلوم کی صحبت سے اپنے حوصلے کے مطابق قرآن وحدیث سے کچھ مناسبت ہوگئی تھی، حضرت مجدّد الملّۃ حکیم الامت سیّدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری کا شرف تو طالب علمی کے زمانے میں بھی ہوتا رہتا تھا مگر ۱۳۴۶ھ سے تجدید بیعت کے ساتھ مسلسل حاضر باشی کا شرف حاصل ہوا جو تقریباً بیس سال حضرتِ اقدس کی وفات رجب ۱۳۶۲ھ تک جاری رہا۔ حضرت قدس سرہٗ کو حق تعالیٰ نے جملہ علوم وفنون کی کامل مہارت عطا فرمائی تھی، اور اُن میں سے خصوصاً تفسیر اور تصوّف آپ کے مخصوص فن تھے، ان دونوں علوم میں آپ کی تصانیف ''بیان القرآن''، ''التّکشّف'' اور ''التّشرّف'' ودیگر رسائلِ تصوّف اس پر کافی شاہد ہیں، حضرت قدس سرہٗ نے اپنی آخری عمر میں یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ اَحکام القرآن پر کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جس میں عصرِ حاضر کے مسائل کو بھی جس قدر قرآنِ کریم سے ثابت ہوتے ہیں واضح کیا جائے، اس کام کو جلد پورا کرانے کے خیال سے چند اَصحاب میں تقسیم فرمایا، اس کا ایک حصہ احقر کے بھی سپرد ہوا، جس کا کچھ حصہ تو حضرت قدس سرہٗ کی حیات ہی میں آپ کی زیرِ نگرانی لکھا گیا، باقی حضرتؒ کی وفات کے بعد بعونہ تعالیٰ پورا ہوگیا، اور دو جلدوں میں شائع بھی ہوچکا، یہ مجموعہ عربی زبان میں ہے۔

اس سلسلے نے حضرتؒ کی برکت سے بحمد اللہ قرآنِ کریم کے ساتھ ایک خصوصی تعلق اور طلب پیدا کردی، اس کے بعد قضاء وقدر سے زندگی میں ایک نئے اِنقلاب کا دروازہ کھلا، ۱۳۶۵ھ یعنی ۱۹۴۶ء میں پاکستان کی تحریک قوی ہوکر پورے ملک میں پھیلی، حضرت قدس سرہٗ کے سابقہ ایماء اور موجودہ اکابر کے اِرشاد پر اس تحریک میں حصہ لیا، اور دو سال کے شب وروز اس جدوجہد میں صَرف کیے، مدراس سے پشاور تک اور مغرب میں کراچی تک پورے ملک کے دورے کیے، یہی تحریکِ پاکستان اور اس کی جدوجہد بالآخر دارالعلوم دیوبند سے اِستعفاء دینے پر منتہی ہوئی، اور آخرکار اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی یہ دیرینہ تمنا پوری فرمادی کہ ہندوستان تقسیم ہوکر مسلمانوں کے لئے خالص اسلام کے نام پر دُنیا کی سب سے

بڑی اسلامی سلطنت پاکستان کے نام سے وجود میں آگئی۔

اسلامی سلطنت، اسلامی نظام، اسلامی قانون کی قدیم تمنائیں اب اُمید کی صورت میں تبدیل ہونے لگیں، اور اس کے ساتھ وطنِ مالوف کو ترک کرنے اور پاکستان کو وطن بنانے کی کشمکش دِل میں موجزن ہوئی، وطنِ اصلی دیوبند کے علومِ اسلامیہ کا مرکز اور منتخب علمائے اُمت کا مرجع ہونے پر نظر جاتی تو سعدی شیرازیؒ کا یہ شعر یاد آتا ۔

تولّائے مردانِ ایں پاک بوم
برانگیختم خاطر از شام و رُوم [1]

لیکن جب ملک کے سیاسی حالات اور ہندوستان میں مسلمانوں اور ان کے اِداروں کے مستقبل پر نظر جاتی تو کوئی روشن پہلو سامنے نہ آتا، اس کے خلاف پاکستان میں ہر طرح کی صلاح وفلاح کی اُمید بظاہرِ اَسباب نظر آتی تھی، اِدھر یہ کشمکش جاری تھی اور دُوسری طرف پورے ملک میں بدامنی اور قتل وغارت گری کے قیامت خیز ہنگامے کھڑے ہوگئے، ہندوستان میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا، لاکھوں اِنسانوں کو بجبر پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا، اور پھر جانے والوں کو عافیت کے ساتھ جانے کا موقع بھی نہ دیا گیا، جابجا قتلِ عام، خوں ریزی، لوٹ مار اور اِغوا کے رُوح فرسا نظارے تھے، کسی کا صحیح سالم پاکستان پہنچ جانا ایک اعجوبہ یا کرامت سمجھا جاتا تھا۔ آٹھ ماہ کے بعد یہ ہنگامے کچھ فرو ہوئے تو میرے اُستاذِ محترم اور پھوپھی زاد بھائی شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور چند عمائدِ کراچی نے یہ اِرادہ کیا کہ پاکستان کے لئے اسلامی دستور کا ایک خاکہ مرتب کر کے حکومت کے سامنے رکھا جائے، تاکہ جس مقصد کے لئے پاکستان بنا ہے، وہ جلد سے جلد بروئے کار آسکے، اس تجویز کے لئے من جملہ چند علماء کے احقر کو بھی ہندوستان سے کراچی آنے کی دعوت دی گئی۔

۲۰ر جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ - یکم مئی ۱۹۴۸ء میری عمر میں عظیم اِنقلاب کا دِن تھا، جس میں وطنِ مالوف، مرکزِ علوم دیوبند کو خیر باد کہہ کر صرف چھوٹے بچوں اور ان کی والدہ کو ساتھ لے کر پاکستان کا رُخ کیا، والدہ محترمہ اور اکثر اولاد اور سب عزیزوں اور گھر بار کو چھوڑنے کا دِل گداز منظر، اور جس طرف جارہا ہوں وہاں ایک غریب الوطن کی حیثیت سے وقت گزارنے کی مشکلات کے ساتھ ایک نئی اسلامی حکومت کا وجود اور اس میں دِینی رُجحانات کے برُوئے کار آنے کی خوش کن اُمیدوں کے ملے جلے تصوّرات میں غلطاں و پیچاں۔

دہلی اور چند مقامات پر اُترتے ہوئے ۲۶ر جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ - ۶ر مئی ۱۹۴۸ء کو اللہ تعالیٰ نے حدودِ پاکستان میں پہنچا دیا، اور کراچی غیر اِختیاری طور پر اپنا وطن بن گیا، یہاں آئے ہوئے اس وقت پندرہ سال پورے

[1] ترجمہ:- اس پاک وطن کے لوگوں کے ساتھ تعلق کی وجہ سے میرا دِل شام اور رُوم سے اُکھڑ گیا ہے۔

ہو کر تین ماہ زیادہ ہو رہے ہیں، اس پندرہ سال میں کیا کیا اور کیا دیکھا، اس کی سرگزشت بہت طویل ہے، یہ مقام اُس کے لکھنے کا نہیں، جن مقاصد کے لئے پاکستان محبوب و مطلوب تھا اور اس کے لئے سب کچھ قربان کیا تھا، حکومتوں کے اِنقلابات نے ان کی حیثیت ایک لذیذ خواب سے زیادہ باقی نہ چھوڑی ؎

بلبل ہمہ تن خوں شد و گل شد ہمہ تن چاک
اے وائے بہارے اگر ایں ست بہارے [1]

حکومت کے راستے سے کسی دِینی اِنقلاب اور نمایاں اِصلاح کی اُمیدیں خواب و خیال ہوتی جاتی ہیں، تاہم عام مسلمانوں میں دِینی بیداری اور اُمورِ دِین کا اِحساس بحمد اللہ ابھی تک سرمایۂ زندگی بنا ہوا ہے، ان میں اہلِ صلاح و تقویٰ کی بحمد اللہ خاصی تعداد موجود ہے، اسی اِحساس نے یہاں دِینی خدمتوں کی راہیں کھولی ہوئی ہیں۔

حکومت کے پیمانے پر اِصلاحی کوششوں کے علاوہ عوامی طرز سے اِصلاحی جدوجہد اور اس کے لئے کچھ اِداروں کا قیام جو شروع سے پیشِ نظر تھا اُس کی اِبتداء ۱۳۷۰ھ - ۱۹۵۰ء میں اس طرح ہوئی کہ آرام باغ کراچی کے متصل مسجد باب الاسلام میں روزانہ بعد صبح درسِ قرآن شروع ہوا اور ہر طرف سے آنے والے سوالات کے جواب میں جو فتاویٰ مسلسل لکھے جاتے اور بغیر نقل کے روانہ کر دیئے جاتے تھے، اب اس کا اِنتظام اسی مسجد میں ایک دارالافتاء کے قیام کی صورت میں عمل میں آیا، یہ درسِ قرآن اُمید سے زیادہ مفید و مؤثر ثابت ہوا، سننے والوں کی زندگی میں اِنقلاب کے آثار دیکھے گئے، احقر ناکارہ کو زندگی کا ایک اچھا مشغلہ مل گیا، بعد نمازِ فجر روزانہ ایک گھنٹے کے عمل سے سات سال میں بحمد اللہ یہ درسِ قرآن مکمل ہو گیا۔

یہاں تک کی تمہید ماہِ صفر ۱۳۸۳ھ میں اُس وقت لکھی گئی تھی جبکہ تفسیر ''معارف القرآن'' کو کتابی صورت میں لانے کا اِرادہ ہوا تھا، پھر ۱۳۸۸ھ تک یہ سلسلہ ملتوی رہا، ۱۳۸۸ھ سے اس پر کام شروع ہوا جو ۱۳۹۲ھ تک پانچ سال میں بحمد اللہ مکمل ہو گیا، اس تمہید کا آگے آنے والا حصہ تکمیلِ تفسیر کے بعد ۱۳۹۲ھ میں لکھا گیا۔

تفسیر ''معارف القرآن'' کی تصنیف قدرتی اسباب سے

احقر ناکارہ گناہگار بے علم و بے عمل کی یہ جرأت کبھی بھی نہ ہوتی کہ قرآنِ کریم کی تفسیر لکھنے کا اِرادہ کرتا، مگر نیرنگِ تقدیر سے اس کے اسباب اس طرح شروع ہوئے کہ ریڈیو پاکستان سے روزانہ نشر ہونے والے درسِ قرآن کے

[1] ترجمہ:- بلبل کا پورا بدن خون میں لت پت ہے اور پھول کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، اگر موسمِ بہار یہی ہے تو ایسے موسم بہار پر سخت افسوس ہے۔

متعلق مجھ سے فرمائش کی گئی جس کو چند اعذار کی بناء پر میں قبول نہ کر سکا، پھر انہوں نے ایک دُوسری تجویز پیش کی کہ روزانہ درس کے سلسلہ سے الگ ایک ہفتہ واری درس بنام ''معارف القرآن'' جاری کیا جائے، جس میں پورے قرآن کی تفسیر پیشِ نظر نہ ہو بلکہ عام مسلمانوں کی موجودہ ضرورت کے پیشِ نظر خاص خاص آیات کا اِنتخاب کر کے اُن کی تفسیر اور متعلقہ اَحکام بیان ہوا کریں۔ احقر نے اس کو اس شرط کے ساتھ منظور کر لیا کہ درس کا کوئی معاوضہ نہ لوں گا اور کسی ایسی پابندی کو بھی قبول نہ کروں گا جو میرے نزدیک درسِ قرآن کے مناسب نہ ہو، یہ شرط منظور کر لی گئی۔

بنامِ خدا تعالیٰ یہ درس بنام ''معارف القرآن'' ۳؍شوال ۱۳۷۳ھ - ۲؍جولائی ۱۹۵۴ء سے شروع ہوا، اور تقریباً گیارہ سال پابندی سے جاری رہا، یہاں تک کہ جون ۱۹۶۴ء میں ریڈیو پاکستان کی اپنی نئی پالیسی کے تحت اس درس کو ختم کر دیا گیا۔ یہ درسِ ''معارف القرآن'' تیرہویں پارے اور سورۂ اِبراہیم پر ختم ہو گیا، جس میں ان تیرہ پاروں کی مکمل تفسیر نہیں بلکہ منتخب آیات کی تفسیر تھی، احقر نے ایسی درمیانی آیات کو اس میں شامل نہیں کیا تھا جو خالص علمی مضامین پر مشتمل تھیں اور ریڈیائی تقریر کے ذریعہ عوام کے ذہن نشین کرنا اس کا مشکل تھا، یا وہ آیات جو مکرّر سہ کرّر آتی ہیں۔

جس وقت یہ کام شروع کر رہا تھا، اس کا کوئی دُور دُور خیال نہ تھا کہ یہ کسی وقت کتابی صورت میں ایک مستقل تفسیر کے انداز پر شائع ہوگی، مگر ہوا یہ کہ جب یہ درس نشر ہونا شروع ہوا تو پاکستان کے سب علاقوں سے اور ان سے زیادہ غیر ممالک افریقہ، یورپ وغیرہ میں بسنے والے مسلمانوں کی طرف سے بے شمار خطوط ریڈیو پاکستان کو اور خود احقر کو وصول ہوئے جن سے معلوم ہوا کہ بہت سے دِین دار اور نو تعلیم یافتہ مسلمان اس درس سے بہت شغف رکھتے ہیں، افریقہ میں چونکہ یہ درس آخرِ شب یا بالکل صبحِ صادق کے وقت پہنچتا تھا، وہاں کے لوگوں نے اس کو ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے محفوظ کر کے بعد میں سب کو بار بار سنانے کا اِہتمام کیا، اور جگہ جگہ سے اس کا تقاضا ہوا کہ اس درس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ عام مسلمانوں کے اس اِشتیاق نے اس ناکارہ کی ہمت بڑھا دی اور اَمراض وضعف کے باوجود گیارہ سال تک یہ سلسلہ بڑی پابندی سے جاری رکھا، ۱۳۸۳ھ اور ۱۹۶۴ء میں جب درس کا سلسلہ بند ہوا تو بہت سے حضرات کی طرف سے یہ تقاضا ہوا کہ جتنا ہو چکا ہے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے، اور درمیان میں جو آیات چھوڑی گئی ہیں ان کی بھی تکمیل کر دی جائے۔ بنامِ خدا یہ اِرادہ کر لیا کہ موجودہ پر نظرِ ثانی اور درمیان سے باقی ماندہ آیات کی تکمیل کا کام شروع کیا جائے، چنانچہ ۱۶؍صفر ۱۳۸۳ھ میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر نظرِ ثانی مکمل ہو گئی، اور سورۂ بقرہ پر کام شروع کیا، اس میں اَحکام کی آیاتِ مشکلہ بہت ہیں جو ریڈیو پر نشری تقریر میں نہیں آئی تھیں، یہ کام بہت محنت اور فرصت کا متقاضی تھا، ہجومِ مشاغل اور اَمراض نے فرصت نہ دی اور تقریباً یہ کام ذہول میں پڑ گیا۔

بہ نیرنگِ تقدیر ایک شدید وطویل بیماری تکمیلِ تفسیر کا سبب بن گئی

۱۳۸۸ھ کے شعبان میں احقر کے اسفل بدن میں کچھ پھوڑے کی شکل نمودار ہوئی، اور رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، آخر رمضان میں اس نے کھڑے ہونے سے معذور کر دیا، آخری آٹھ روزے بھی قضا ہوئے، گھر میں بیٹھ کر نماز ہونے لگی، اس کے ساتھ پاؤں میں نقرس کا پُرانا درد شروع ہوا، اس کا جو علاج پہلے کارگر ہو جاتا تھا وہ بھی کامیاب نہ ہوا، اور دونوں پاؤں سے معذور ہو گیا، تقریباً دس مہینے اسی طرح معذوری و بیماری کے ساتھ موت وحیات کی کشمکش میں گزرے، جب چلنے پھرنے اور ہر کام سے معذور ہو گیا، زندگی کی اُمید بھی مضمحل ہوگئی تو اَب اس پر افسوس ہوا کہ یہ تفسیری اوراق جس قدر ہو چکے تھے اُن پر نظرِ ثانی اور تکمیل بھی نہ ہو سکی، اب یہ اوراق یونہی ضائع ہو جائیں گے، حق تعالیٰ نے قلب میں ہمت عطا فرمائی اور شوال ۱۳۸۸ھ کے آخر میں بسترِ علالت پر ہی اللہ تعالیٰ نے اس کام کو شروع کرا دیا، اور ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ کو سورۂ بقرہ کی تکمیل ہو کر کتابت وطباعت کے لئے دے دی، اس کے بعد سے عین بیماری ومعذوری کی حالت میں یہ کام تدریجی رفتار سے چلتا رہا، اللہ تعالیٰ نے اس کی برکت سے دس ماہ کے بعد معذوری بھی رفع فرما دی تو رَجب ۱۳۸۹ھ سے کام کسی قدر تیز ہوا، مگر اسی کے ساتھ ملک میں جدید اِنتخابات نے سیاسی ہنگاموں کا ایک طوفان کھڑا کر دیا، میں اگرچہ عرصۂ دراز سے سیاست سے بالکل یکسو ہو چکا تھا، مگر ان اِنتخابات نے پاکستان میں خالص اسلامی حکومت کے بجائے کمیونزم اور سوشلزم پھیل جانے کے خطرات قوی کر دیئے، اور سوشلزم کو عین اِسلام باور کرانے کے لئے جدوجہد اور جلسے وجلوس عام ہو گئے، اس مسئلے کی نزاکت نے پھر اس پر آمادہ کر دیا کہ کم ازکم اسلام اور سوشلزم میں فرق اور سوشلزم کے خطرناک نتائج سے قوم کو آگاہ کرنے کی حد تک اس سیاسی میدان میں حصہ لیا جائے، اس کے لئے تحریری مقالے بھی لکھنے پڑے، اور مشرقی ومغربی پاکستان کے اہم مواقع میں جلسوں میں شرکت بھی کرنا پڑی، مسئلہ کی وضاحت تو مقدور بھر پوری ہو گئی، مگر سیاست کے میدان میں مسائل اور حقائق سے زیادہ زورو زَر کام کرتے ہیں، اِنتخابات کا نتیجہ بالکل خلاف اور برعکس نکلا، اس کے اثر سے پاکستان پر جو زوال آنا تھا وہ آگیا، لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ۔

اِنتخابات کے بعد احقر نے پھر سیاست سے مستعفی ہو کر اپنا یہ کام شروع کیا، اور الحمدللہ علیٰ کرمہ کہ رجب ۱۳۹۰ھ تک تیرہ پاروں کی ''معارف القرآن'' پر نظرِ ثانی اور درمیانی متروکہ آیات کی تفسیر بھی مکمل ہو گئی، اور سورۂ اِبراہیم سے سورۂ نحل تک دو پاروں کی مزید تفسیر بھی لکھی گئی، اب قرآن مجید نصف کے قریب ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ہمت عطا فرمائی اور باقی ماندہ قرآن کی تفسیر لکھنا شروع کیا، اس کا اس وقت کوئی تصوّر نہیں تھا کہ پچھتّر سال کی عمر اور سقوطِ قویٰ، اس کے ساتھ

مختلف قسم کے امراض کے تسلسل میں یہ تفسیر پوری ہو سکے گی، مگر یہ سمجھ کر کہ قرآن کو ختم کرنا مقصود نہیں، قرآن میں اپنی عمر کو ختم کرنا ہے، اللہ کے نام پر یہ سلسلہ شروع کر دیا، شعبان ۱۳۹۰ھ سے سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر شروع ہوئی اور ۲۳ر صفر ۱۳۹۱ھ کو قرآن کی چوتھی منزل سورۂ فرقان پارہ ۱۹ تک مکمل ہوگئی۔

آگے قرآن کی تین منزلیں یعنی تقریباً ایک تہائی قرآنِ کریم باقی تھا، عمر کے ضعف اور مختلف قسم کے امراض کی بناء پر یہ خیال آیا کہ اس سب کی تکمیل تو شاید مجھ سے نہ ہو سکے، مگر درمیانی پانچویں اور چھٹی منزل کی تفسیر احقر نے ''اَحکام القرآن'' میں بزبانِ عربی لکھ دی ہے جو شائع بھی ہو چکی ہے، اگر میں اس کو نہ لکھ سکا تو میرے بعد بھی کوئی اللہ کا بندہ اسی ''اَحکام القرآن'' کی تفسیر کو اُردو میں منتقل کر کے یہ حصہ پورا کر دے گا، اور اس کی وصیت بھی چند حضرات کو کر دی، اور درمیان کی یہ دو منزلیں چھوڑ کر آخری ساتویں منزل سورۂ قٓ سے لکھنا شروع کر دیا، حق تعالیٰ کی مدد نے دستگیری فرمائی اور ۱۲ر ربیع الاوّل ۱۳۹۱ھ سے شروع ہو کر شوال ۱۳۹۱ھ تک یہ آخری منزل پوری ہوگئی، صرف معوّذتین یعنی آخری دو سورتیں چھوڑ دی گئیں۔

اب درمیانی دو منزلیں سورۂ شعراء سے سورۂ حجرات تک باقی تھیں، اللہ کے نام پر ان کو بھی شروع کر دیا، ان میں سورۂ صٓ، صافات، زُخرف تو برخوردار عزیزی مولوی محمد تقی سلّمہٗ سے لکھوائی، اور خود اس پر نظرِ ثانی کر کے مکمل کیا، باقی سورتیں خود لکھنا شروع کیں، اور قرآن مجید کا تقریباً ڈیڑھ پارہ باقی رہ گیا تھا کہ ۲۴ر ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ - ۸ر جون ۱۹۷۲ء کو اچانک مجھے قلب کا ایک شدید مرض پیش آیا کہ موت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا، دیکھنے والے تھوڑی دیر کا مہمان سمجھتے تھے، کراچی میں امراضِ قلب کے ہسپتال میں غیر شعوری طور پر پہنچا دیا گیا، تین روز کے بعد ڈاکٹروں نے کچھ اِطمینان کا اِظہار کیا، جب کچھ ہوش و حواس دُرست ہوئے تو باقی ماندہ تفسیر کا خیال ایک حسرت بن کر رہ گیا، برخوردار عزیزی مولوی محمد تقی سلّمہٗ کو وصیت کر دی کہ بقیہ کی تکمیل وہ کر دیں، اس طرح قلب کا کچھ بوجھ ہلکا ہوگیا، اللہ تعالیٰ کا ہزاراں ہزار شکر کہ اس نے اس مرض سے صحت بھی عطا فرمائی، اور تین مہینے کے بعد اتنی طاقت تھی کہ کچھ لکھنے پڑھنے کی ہمت ہونے لگی، مگر تھوڑی دیر کام کرنے سے دِماغ، دِل و نگاہ سب تھک جاتے تھے، محض حق تعالیٰ کا فضل و کرم ہی تھا کہ اس نے اسی حالت میں یہ بقیہ تفسیر ۲۱ر شعبان ۱۳۹۲ھ روز شنبہ کو مکمل کرا دی، اور حسنِ اِتفاق سے یہی روز ۱۳۱۴ھ میں میری ولادت کا دِن تھا، اس روز میری عمر کی ستتر منزلیں پوری ہو کر اٹھتر واں سال شروع ہوا۔

اس تفسیر کا آغاز ۱۳۸۸ھ کی شدید بیماری میں ہوا اور خاتمہ پانچ سال کے بعد ۱۳۹۲ھ کی شدید بیماری کے متصل بعد ہوا، یہ پانچ سال آخرِ عمر کے طبعی ضعف، مختلف قسم کے امراض کے تسلسل، اَفکار کے ہجوم اور ملک میں اِنقلابی ہنگاموں

کے سال تھے، انہی میں حق تعالیٰ نے اس تفسیر کے تقریباً [۱] سات ہزار صفحات اس ناکارہ کے قلم سے لکھوادیئے، اور یہ بات آنکھوں سے دِکھلادی کہ ؎

اِنَّ الْمَقَادِيْرَ إِذَا سَاعَدَتْ
اَلْحَقَتِ الْعَاجِزَ بِالْقَادِرِ

''یعنی جب تقدیرِ الٰہی مدد کرتی ہے تو عاجز کو قادر کے ساتھ ملادیتی ہے۔''

علم وعمل پہلے ہی برائے نام تھا، اس ضعف وپیری اور اَمراض ومشاغل وذواہل نے وہ رہا سہا بھی رُخصت کردیا، ان حالات میں کسی تصنیف خصوصاً قرآنِ کریم کی تفسیر کا اِرادہ کرنا بھی ایک بڑی جسارت تھی، اِطمینان اس پر تھا کہ اس میں میری اپنی کوئی چیز نہیں، اکابر علماءؒ اور سلف صالحینؒ کی تفسیر کو آسان زبان میں اہلِ عصر کی طبائع کے قریب بنانا میری ساری محنت کا حاصل تھا۔ میں نے آخرِ عمر کے پانچ سال کی یہ محنتِ شاقہ اس تمنا میں صرف کی کہ عصرِ جدید کے مسلمان جو عموماً علمی اِصطلاحات اور علمی زبان سے بیگانہ ہوچکے ہیں، اکابرؒ کی تفسیر کو ان کے لئے اَقرب الی الفہم کردوں تو شاید اس زمانے کے مسلمانوں کو اس سے نفع پہنچے، اور میرے لئے زادِ آخرت بن جائے۔ علمائے محققین اپنی علمی تحقیقات کے کمالات دِکھلاتے ہیں، اس ناکارہ نے اپنی بے علمی کو اس پردے میں چھپایا ہے، اللہ تعالیٰ مجھ سے اپنی ستاری کا معاملہ فرمادیں، اور اس ناچیز کی خدمت کو قبول فرمادیں، جس میں کسی علمی کمال کا تو کوئی دخل نہیں، البتہ اپنے آپ کو تھکایا ضرور ہے، اور یہ تھکانا بھی اللہ ہی کی توفیق سے تھا، ورنہ ایک قدم چلنے کی بھی کیا مجال تھی، کاش! اللہ تعالیٰ میرے اس تھکنے پر نظر فرمائیں اور میری تقصیرات کو جو اس کی کتابِ کریم کے حقوق ادا کرنے میں ہوئی معاف فرماکر اس کو شرفِ قبولیت عطا فرمادیں ؎

نہ بحرف ساختہ سرخوشم
نہ بہ نقش بستہ مشوشم
نفسے بیادِ تو مے زنم
چہ عبارت وچہ معانیم [۲]

تصنیفِ کتاب کی یہ لمبی کہانی احقر کے لئے تو ایک یادداشت اور شکرگزاری کے لئے ایک تذکرہ ہے، مگر عام

---

[۱] یہ بھی اس حال میں کہ دارالعلوم کی اِنتظامی ذمہ داریوں اور فتوے کی مستقل خدمات کے علاوہ دُوسرے اہم موضوعات پر دس مختصر اور مفصل کتابیں اور بھی لکھی گئیں جو شائع ہوچکی ہیں: ۱-اَحکام الحج (جو مختصر اور سلیس ہونے کے ساتھ تمام ضروری اَحکام کو جامع بھی ہے)۔ ۲-الیواقیت فی اَحکام المواقیت (مواقیتِ حج اور جدہ سے اِحرام کی تحقیق)۔ ۳-منہج الخیر فی الحج عن الغیر (یعنی حجِ بدل کے اَحکام)۔ ۴-مقامِ صحابہؓ (مشاجراتِ صحابہ اور عدالتِ صحابہ کی مکمل بحث اور سلف صالحین کا طرزِ عمل)۔ ۵-اسلامی ذبیحہ (ذبیحہ کے شرعی اَحکام مفصل، یہود ونصاریٰ کے ذبیحے کی حیثیت، تحریفات کی تردید)۔ ۶-اعضائے اِنسانی کی پیوندکاری۔ ۷-بیمۂ زندگی۔ ۸-پراویڈنٹ فنڈ۔ ۹-اسلام اور سوشلزم۔ ۱۰-اسلامی نظام میں اِقتصادی اِصلاحات۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ۔ ۱۲منہ

[۲] ترجمہ:- نہ حرف جوڑ کر میں خوش ہوں، نہ نقش ونگار بنا کر مجھے کچھ تشویش ہے، آپ کی یاد میں سانس لے رہا ہوں، کیا میری عبارت اور کیا اس کے معانی؟

لوگوں کے ذوق کی چیز نہیں، اس کے باوجود اس لئے لکھا کہ لوگوں کو میری اس جسارت کا عذر معلوم ہو جائے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تفسیرِ قرآن پر مستقل تصنیف کے لئے جرأت کرنے کا میرے لئے دُور دُور بھی کوئی احتمال نہ تھا، مگر غیر ارادی طور پر اس کے اسباب ہوتے چلے گئے، البتہ زمانۂ دراز سے ایک تمنا دِل میں تھی کہ حکیم الامت مجدّد الملّۃ سیّدی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی تفسیر ''بیان القرآن'' جو ایک بے نظیر، مختصر مگر جامع تفسیر اور سلف صالحین کی تفسیروں کا لبِ لباب ہے، لیکن وہ علمی زبان اور علمی اِصطلاحات میں لکھی گئی ہے، آج کل کے عوام اس سے اِستفادہ کرنے سے قاصر ہوگئے ہیں، اس کے مضامین کو سہل زبان میں پیش کر دیا جائے، مگر یہ کام بھی کافی محنت اور فرصت چاہتا تھا، پاکستان میں آنے سے پہلے کچھ شروع بھی کیا، پھر رہ گیا تھا۔ ''معارف القرآن'' کی اس تحریر نے بحمداللہ وہ آرزو بھی پوری کر دی، کیونکہ اس تفسیر کی بنیاد احقر نے ''بیان القرآن'' ہی کو بنایا ہے، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

''معارف القرآن'' کی خصوصیات و اِلتزامات

۱- تفسیرِ قرآن جو عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں ہو، اس میں سب سے اہم اور اِحتیاط کی چیز قرآن کا ترجمہ ہے، کیونکہ وہ اللہ کے کلام کی حکایت ہے، اس میں ادنیٰ سی کمی بیشی بھی اپنی طرف سے رَوا نہیں، اس لئے میں نے خود کوئی ترجمہ لکھنے کی ہمت نہیں کی، اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی، کیونکہ اکابر علماء یہ کام بڑی اِحتیاط کے ساتھ انجام دے چکے ہیں، اُردو زبان میں اس خدمت کو سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دو فرزند ارجمند حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے اپنے طرز میں انجام دیا، اوّل الذکر ترجمہ میں بالکل تحت اللفظ ترجمہ کو اِختیار کیا گیا ہے، اُردو محاورہ کی بھی زیادہ رعایت نہیں رکھی گئی، اور بڑے کمال کے ساتھ قرآن کے الفاظ کو اُردو میں منتقل فرمایا ہے۔ اور دُوسرے ترجمہ میں تحت اللفظ کے ساتھ اُردو محاورہ کی رعایت بھی ہے، جس کو حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے چالیس سال مسجد میں معتکف رہ کر پورا کیا ہے، یہاں تک کہ آپ کا جنازہ مسجد ہی سے نکلا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرّس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا فرمانا ہے کہ بلاشبہ یہ ترجمہ اِلہامی ہے، اِنسان کے بس کی بات نہیں کہ ایسا ترجمہ کر سکے۔ شیخ العرب والعجم سیّدی حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ نے اپنے وقت میں جب یہ دیکھا کہ اب بہت سے محاورات بدل جانے کی وجہ سے بعض مقامات میں ترمیم کی ضرورت ہے تو انہوں نے اسی ترجمہ کی یہ خدمت انجام دی، جو ''ترجمہ شیخ الہندؒ'' کے نام سے معروف و مشہور ہوا، احقر نے قرآنِ کریم کے زیرِ متن اسی ترجمے کو بعینہٖ لیا ہے۔

۲- سیّدی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے اصل تفسیر ''بیان القرآن'' کو اس انداز میں لکھا ہے کہ متنِ قرآن کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہی اس کی تفسیر و توضیح قوسین کے درمیان فرمائی ہے، ترجمہ کو اس کے اُوپر خط دے کر اور تفسیر کو

بین القوسین لکھ کر ممتاز کر دیا ہے، اس طرح خط کشیدہ الفاظ میں ترجمۂ قرآن ہے، اور بین القوسین اس کی تفسیر ہے، بہت سے لوگوں نے اُسی خط کشیدہ ترجمہ کو الگ کر کے قرآن مجید کے زیرِ متن ترجمہ حکیم الامتؒ کے نام سے خود حضرتؒ کے زمانے میں شائع بھی کر دیا تھا۔

مجھے چونکہ ''بیان القرآن'' کی تسہیل کا کام پہلے سے پیشِ نظر تھا، اس وقت احقر نے حضرتؒ کی اس تفسیر کو بنام ''خلاصۂ تفسیر'' شروع میں بعینہٖ صرف ایک تصرف کے ساتھ نقل کر دیا ہے، وہ یہ کہ اس تفسیر میں جس جگہ خاص اِصطلاحی اور مشکل الفاظ آئے تھے، وہاں ان کو آسان لفظوں میں منتقل کر دیا، اور اس کا نام ''خلاصۂ تفسیر'' رکھنا اس لئے موزوں ہوا کہ خود حضرتؒ نے ''خطبۂ بیان القرآن'' میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ اس کو تفسیرِ مختصر یا ترجمۂ مطوّل کہا جا سکتا ہے۔

اور اگر کوئی مضمون ہی خالص علمی اور مشکل تھا تو اس کو یہاں سے الگ کر کے ''معارف ومسائل'' میں اپنی آسان عبارت میں لکھ دیا، تاکہ مشغول آدمی اگر زیادہ نہ دیکھ سکے تو اس ''خلاصۂ تفسیر'' سے ہی کم از کم مفہومِ قرآنی کو پورا سمجھ لے، [1] ان دونوں چیزوں کا اِلتزام جلدِ اوّل کی طبعِ اوّل میں پارۂ الٓمّٓ کے رُبعِ اوّل آیت نمبر ۴۴، معارف جلد اوّل صفحہ: ۲۱۲ تک نہیں ہو سکا تھا، اب طبعِ ثانی میں اس حصے کو بھی مکمل کر کے پوری تفسیر کے مطابق کر دیا گیا ہے، البتہ ایک اِلتزام جو جلدِ ثانی سے شروع ہوا کہ متنِ قرآن کے نیچے ترجمہ شیخ الہندؒ لکھا جائے، یہ پہلی طباعت کی پوری جلدِ اوّل میں نہیں تھا، طبعِ ثانی میں اس کو بھی تحت المتن لکھ کر سب کے مطابق کر دیا گیا، یہ دونوں کام تو اکابر علماءؒ کے تھے۔

۳- تیسرا کام جو احقر کی طرف منسوب ہے وہ ''معارف ومسائل'' کا عنوان ہے، اس میں بھی غور کیا جائے تو احقر کی صرف اُردو عبارت ہی ہے، مضامین سب علمائے سلف کی تفسیر سے لئے ہوئے ہیں جن کے حوالے ہر جگہ لکھ دیئے ہیں، اس میں احقر نے چند چیزوں کا اِلتزام کیا ہے:-

(الف) علماء کے لئے تفسیرِ قرآن میں سب سے پہلا اور اہم کام لغات کی تحقیق، نحوی ترکیب، فنِ بلاغت کے نکات اور اِختلافِ قراءت کی بحثیں ہیں، جو بلا شبہ اہلِ علم کے لئے فہمِ قرآن میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی کے ذریعہ قرآن کے صحیح مفہوم کو پایا جا سکتا ہے۔ لیکن عوام تو عوام ہیں، آج کل کے بہت سے اہلِ علم بھی ان تفصیلات میں اُلجھن محسوس کرتے ہیں، بالخصوص عوام کے لئے تو یہ بحثیں ان کی فہم سے بالا اور اَصل مقصد میں مخل بنتی ہیں، وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھنا مشکل کام ہے، حالانکہ قرآنِ کریم کا جو اَصل مقصد ہے کہ اِنسان کا تعلق اپنے رَبّ کے ساتھ قوی ہو اور اس کے نتیجے میں مادّی تعلقات اِعتدال پر آ جائیں کہ وہ دِین کی راہ میں رُکاوٹ نہ بنیں، دُنیا سے زیادہ آخرت کی فکر پیدا ہو، اور اِنسان اپنے ہر قول وفعل پر یہ سوچنے کا عادی ہو جائے کہ اس میں کوئی چیز اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف تو

[1] جلد ھذا ص: ۲۳۹ (ناشر)

نہیں، اس چیز کو قرآن نے اتنا آسان کر دیا ہے کہ معمولی لکھا پڑھا آدمی خود دیکھ کر اور بالکل اَن پڑھ جاہل سن کر بھی یہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے، قرآنِ کریم نے خود اس کا اعلان فرمادیا ہے: [1] وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿١٧﴾ (القمر)۔ تفسیر ''معارف القرآن'' میں عوام کی سہولت کے پیشِ نظر اُن علمی اور اصطلاحی بحثوں کی تفصیل نہیں لکھی گئی، بلکہ ائمۂ تفسیر کے اقوال میں جس کو جمہور نے راجح قرار دِیا ہے اس کے مطابق تفسیر لے لی گئی اور کہیں کہیں بضرورت یہ بحث بھی لی گئی ہے تو وہاں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا کہ خالص علمی اصطلاحات اور غیر معروف اور مشکل الفاظ نہ آئیں، اور اسی لئے ایسی مباحثِ علمیہ کو بھی چھوڑ دِیا گیا ہے جو عوام کے لئے غیر ضروری اور ان کی سطح سے بلند ہیں۔

(ب) مستند و معتبر تفاسیر سے ایسے مضامین کو اہمیت کے ساتھ نقل کیا گیا ہے جو اِنسان کے دِل میں قرآن کی عظمت اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی عظمت و محبت کو بڑھائیں، اور قرآن پر عمل اور اپنے اعمال کی اِصلاح کی طرف مائل کریں۔

(ج) اس پر تو مؤمن کا اِیمان ہے کہ قرآنِ کریم قیامت تک آنے والی نسلوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے، اور قیامت تک پیدا ہونے والے تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے، بشرطیکہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان وتشریح کی روشنی میں دیکھا اور پڑھا جائے، اور اس میں پورے تدبر سے کام لیا جائے، اسی لئے ہر زمانہ کے علمائے تفسیر نے اپنی اپنی تفسیروں میں اُن جدید مسائل اور مباحث پر زیادہ زور دِیا ہے جو اُن کے زمانہ میں پیدا ہوئے، یا ملحدین اہلِ باطل کی طرف سے شکوک وشبہات کی صورت میں پیدا کر دیئے گئے، اسی لئے قرونِ متوسطہ کی تفسیریں معتزلہ، جہمیہ، صفوانیہ وغیرہ فرقوں کی تردید اوران کے شبہات کے اِزالہ سے پُر نظر آتی ہیں۔ احقر ناکارہ نے بھی اسی اُصول کے تحت ایسے ہی مسائل اور مباحث کو اہمیت دی ہے جو یا تو اس زمانے کے مشینی دور نے نئے نئے پیدا کر دیئے، اور یا اس زمانہ کے ملحدین اور یہودی اور نصرانی مستشرقین نے مسلمانوں کے دِلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لئے کھڑے کر دیئے، جدید مسائل کے حل کے لئے مقدور بھر اس کی کوشش کی ہے کہ قرآن وسنت یا فقہائے اُمت کے اقوال میں اس کا کوئی ثبوت ملے یا کم از کم اس کی کوئی نظیر ملے، اور الحمدللہ اس میں کامیابی ہوئی، ایسے مسائل میں دُوسرے علمائے عصر سے مشورہ لینے کا بھی اِلتزام کیا گیا ہے اور ملحدانہ شکوک وشبہات کے اِزالہ میں بھی مقدور بھر اس کی کوشش رہی ہے کہ جواب اطمینان بخش ہو، اوراس جواب دہی کے لئے اسلامی مسائل میں ادنیٰ ترمیم کو گوارا نہیں کیا جیسا کہ دورِ حاضر کے بعض مصنفین نے اس جواب دہی میں خود اِسلامی مسائل میں تاویلیں کر کے ترمیم کر ڈالنے کا طریقہ اِختیار کیا ہے۔ یہ سب کچھ اپنی معلومات اور اپنی کوشش کی حد تک ہے، جس میں بہت سی خطاؤں اور لغزشوں کا اِحتمال ہے، اللہ تعالیٰ معاف

[1] ترجمہ:- اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا ہے۔ اب کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟

فرمائیں اور ان کی اِصلاح کا راستہ نکال دیں۔

مذکور الصدر اِلتزامات نے تفسیر ''معارف القرآن'' کو مندرجہ ذیل چیزوں کا جامع بنادیا ہے:-

۱- قرآن مجید کے دو مستند ترجمے ایک حضرت شیخ الہندؒ کا جو دراصل شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمہ ہے، دُوسرا حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا ترجمہ۔

۲- ''خلاصۂ تفسیر'' جو درحقیقت ''بیان القرآن'' کا خلاصہ مع تسہیل ہے جس کو علیحدہ بھی قرآن مجید کے حاشیہ پر طبع کرلیا جائے تو تھوڑی فرصت والوں کے لئے فہمِ قرآن کا مستند اور بہترین ذریعہ ہے، اس نے ایک اور ضرورت کو پورا کردیا جس کی طرف مجھے اخی فی اللہ مولانا بدرعالم صاحب مہاجرؒ مدینہ منوّرہ نے علامہ فرید وجدیؒ کی ایک مختصر تفسیر حاشیہ قرآن پر دِکھلا کر توجہ دِلائی تھی کہ کاش اُردو میں بھی کوئی ایسی تفسیر ہوتی جو اس کی طرح مختصر اور آسان ہو، اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ آرزو بھی پوری فرمادی، یہ دونوں چیزیں تو اکابر علماء کی مستند اور معروف ہیں۔

۳- تیسری چیز ''معارف ومسائل'' ہیں جو میری طرف منسوب ہیں، اور میری محنت کا محوَر ہیں، الحمدللہ کہ اس میں بھی میرا اپنا کچھ نہیں، سب اَسلافِ اُمت ہی سے لیا ہوا ہے، آج کل کے اہلِ علم واہلِ قلم اکثر اس فکر میں رہتے ہیں کہ اپنی کوئی تحقیق اور اپنی طرف سے کوئی نئی چیز پیش کریں، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکرگزار ہوں کہ اس سب کام میں میرا اپنا کچھ نہیں۔

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر پیچ

بے عنایاتِ خدا ہیچیم وہیچ [1]

وَاللهَ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى اَسْاَلُ الصَّوَابَ وَالسَّدَادَ فِي الْمَبْدَءِ وَالْمَعَادِ وَبِهٖ اَسْتَعِيْنُ مِنْ زَلَّةِ الْقَدَمِ فِيْمَا عَلِمْتُ وَمَا لَا اَعْلَمُ وَاِيَّاهُ اَسْاَلُ اَنْ يَّجْعَلَهٗ خَالِصًا لِّوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ وَاَنْ يَّتَقَبَّلَ مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلَ مِنْ صَالِحِيْ عِبَادِهٖ وَاَنْ يَّنْفَعَنِيْ بِهٖ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَّآخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا وَّصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَصَفْوَةِ رُسُلِهٖ خَاتَمِ اَنْبِيَآئِهٖ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔

بندہ ضعیف ونا کارہ

محمد شفیع

خادم دارالعلوم کراچی

۲۵؍شعبان ۱۳۹۲ھ

---

[1] ترجمہ:- یہ سب کچھ ہم نے کہا لیکن ارادے میں خدا کی عنایتوں کے بغیر ہم ہیچ در ہیچ ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سُورَةُ الفَاتِحَة

سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ

یہ مکی سورت ہے جس میں سات آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

سورۂ فاتحہ کے فضائل اور خصوصیات

سورۂ فاتحہ کو قرآنِ کریم میں بہت سی خصوصیات حاصل ہیں، اوّل یہ کہ قرآن اسی سے شروع ہوتا ہے، نماز اسی سے شروع ہوتی ہے، اور نزول کے اعتبار سے بھی سب سے پہلی سورت جو مکمل طور پر نازل ہوئی یہی سورت ہے، سورۂ اقرأ، مزمل اور مدثر کی چند آیات ضرور اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں، مگر مکمل سورت سب سے پہلے فاتحہ ہی نازل ہوئی ہے، جن حضراتِ صحابہؓ سے سورۂ فاتحہ کا اوّل ما نزل یعنی نزول میں سب سے پہلی سورت ہونا منقول ہے، اُن کا مطلب غالباً یہی ہے کہ پوری سورت اس سے پہلے اور کوئی نازل نہیں ہوئی، شاید اسی وجہ سے اس سورت کا نام بھی "فاتحة الكتاب" رکھا گیا ہے۔

دُوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ سورت ایک حیثیت سے پورے قرآن کا متن اور سارا قرآن اس کی شرح ہے، خواہ اس وجہ سے کہ پورے قرآن کے مقاصد ایمان اور عملِ صالح میں دائر ہیں، اور ان دونوں چیزوں کے بنیادی اُصول اس سورت میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ تفسیر ''رُوح المعانی'' اور ''رُوح البیان'' میں اس کا تفصیلی بیان ہے، [۱] اسی وجہ سے سورۂ فاتحہ کے نام اُمّ القرآن، اُمّ الکتاب اور قرآن عظیم بھی اَحادیثِ صحیحہ میں آئے ہیں۔ (قرطبی) [۲]

یا اس وجہ سے کہ اس سورت میں اس شخص کے لئے جو قرآن کی تلاوت یا مطالعہ شروع کرے ایک خاص ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے تمام پچھلے خیالات اور نظریات سے خالی الذہن ہو کر خالص طلبِ حق اور راہِ راست کی جستجو کے لئے پڑھے اور دیکھے، اور اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا بھی کرے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا ہو، اور شروع سورت میں اُس ذات کی حمد و ثنا کا بیان ہے جس کی بارگاہ میں یہ درخواستِ ہدایت پیش کرتا ہے، اور اسی درخواست کا جواب پورا قرآن ہے، جو الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے شروع ہوتا ہے، گویا اِنسان نے جو اللہ تعالیٰ سے راہِ راست طلب کی تھی اس کے جواب میں ذٰلِكَ الْكِتٰبُ فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ جو تم مانگتے ہو وہ اس کتاب میں موجود ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ سورۂ فاتحہ کی نظیر

---

[۱] روح البیان فی الابتداء ج:۱ ص:۶۱، ۶۲ [۲] تفسیر القرطبی فی الابتداء ج:۱ ص:۱۱۲

نہ توراۃ میں نازل ہوئی نہ انجیل اور زبور میں اور نہ خود قرآنِ کریم میں کوئی دوسری سورت اس کی مثل ہے۔(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَقَالَ: حَسَنٌ صَحِيْحٌ، وَالْحَاكِمُ وَقَالَ: صَحِيْحٌ عَلٰى شَرْطِ مُسْلِمٍ، مِنَ الْمَظْهَرِيْ) [1]

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ ہر بیماری کی شفا ہے۔(رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ بِسَنَدٍ صَحِيْحٍ، مظهری) [2]

سورۂ فاتحہ کا ایک نام حدیث میں سورۂ شفاء بھی آیا ہے (قرطبی) [3]، اور صحیح بخاری [4] میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآنِ کریم کی سب سورتوں میں عظیم ترین الحمدللہ ربّ العٰلمین ہے۔(قرطبی)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

بسم اللہ قرآن کی ایک آیت ہے

اس پر تمام اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ قرآن میں سورۂ نمل کا جزو ہے، اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ سوائے سورۂ توبہ کے ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ لکھی جاتی ہے، اس میں ائمۂ مجتہدین کا اختلاف ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا یا تمام سورتوں کا جزء ہے یا نہیں؟ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ بسم اللہ بجز سورۂ نمل کے اور کسی سورت کا جزء نہیں، بلکہ ایک مستقل آیت ہے جو ہر سورت کے شروع میں دو سورتوں کے درمیان فصل اور امتیاز ظاہر کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔

تلاوتِ قرآن اور ہر مہم کام کو بسم اللہ سے شروع کرنے کا حکم

اہلِ جاہلیت کی عادت تھی کہ اپنے کاموں کو بتوں کے نام سے شروع کیا کرتے تھے، اس رسم جاہلیت کو مٹانے کے لئے قرآن کی سب سے پہلی آیت جو جبریلِ امین لے کر آئے اس میں قرآن کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ۔(العلق:۱) [5]

---

[1] جامع الترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ما جاء فی فاتحة الکتاب ج:۲ ص:۱۱۵

[2] شعب الإيمان للبيهقی رقم الحديث:۲۲۷۷، والتفسير المظهری ج:۱ ص:۲

[3] تفسير القرطبی ج:۱ ص:۱۱۲

[4] صحيح البخاری، کتاب التفسير، باب ما جاء فی فاتحة الکتاب ج:۲ ص:۶۴۲ وتفسير القرطبی ج:۱ ص:۱۱۲

[5] ترجمہ:- پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر۔

علامہ سیوطیؒ نے فرمایا کہ قرآن کے سوا دُوسری تمام آسمانی کتابیں بھی بسم اللہ سے شروع کی گئی ہیں، اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قرآن اور اُمتِ محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے، دونوں قول کی تطبیق یہ ہے کہ اللہ کے نام سے شروع کرنا تو تمام آسمانی کتابوں میں مشترک ہے، مگر الفاظ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قرآن کی خصوصیت ہے، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اِبتدا میں ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کے لئے "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ" کہتے اور لکھتے تھے، جب آیت بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نازل ہوئی تو انہیں الفاظ کو اِختیار فرمالیا، اور ہمیشہ کے لئے یہ سنت جاری ہوگئی۔ (قرطبی ورُوح المعانی) [۱]

قرآنِ کریم میں جابجا اس کی ہدایت ہے کہ ہر کام کو اَللّٰہ کے نام سے شروع کیا جائے، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہرمہم کام جو بِسْمِ اللّٰہِ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت رہتا ہے۔

ایک حدیث میں اِرشاد فرمایا کہ گھر کا دروازہ بند کرو تو بِسْمِ اللّٰہِ کہو، چراغ گل کرو تو بِسْمِ اللّٰہِ کہو، برتن ڈھکو تو بِسْمِ اللّٰہِ کہو، کھانا کھانے، پانی پینے، وضو کرنے، سواری پر سوار ہونے اور اُترنے کے وقت بِسْمِ اللّٰہِ پڑھنے کی ہدایات قرآن وحدیث میں بار بار آئی ہیں۔ (قرطبی) [۲]

ہر کام کو بسم اللہ سے شروع کرنے کی حکمت

اسلام نے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کی ہدایت دے کر اِنسان کی پوری زندگی کا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح پھیر دِیا ہے کہ وہ قدم قدم پر اس حلفِ وفاداری کی تجدید کرتا رہے کہ میرا وجود اور میرا کوئی کام بغیر اللہ تعالیٰ کی مشیت واِرادے اور اس کی اِمداد کے نہیں ہوسکتا، جس نے اس کی ہر نقل وحرکت اور تمام معاشی اور دُنیوی کاموں کو بھی ایک عبادت بنادیا۔

عمل کتنا مختصر ہے کہ نہ اس میں کوئی وقت خرچ ہوتا ہے نہ محنت، اور فائدہ کتنا کیمیاوی اور بڑا ہے کہ دُنیا بھی دِین بن گئی۔ ایک کافر بھی کھاتا پیتا ہے اور ایک مسلمان بھی، مگر مسلمان اپنے لقمے سے پہلے بسم اللہ کہہ کر یہ اِقرار کرتا ہے کہ یہ لقمہ زمین سے پیدا ہونے سے لے کر پک کر تیار ہونے تک آسمان وزمین اور سیاروں اور ہوا وفضائی مخلوقات کی طاقتیں، پھر لاکھوں اِنسانوں کی محنت صرف ہوکر تیار ہوا ہے، اس کا حاصل کرنا میرے بس میں نہ تھا، اللہ ہی کی ذات ہے جس نے ان تمام مراحل سے گزار کر یہ لقمہ یا گھونٹ مجھے عطا فرمایا ہے۔ مؤمن وکافر دونوں سوتے جاگتے بھی ہیں، چلتے پھرتے بھی ہیں، مگر ہر مؤمن سونے سے پہلے اور بیدار ہونے کے وقت اللہ کا نام لے کر اللہ کے ساتھ اسی طرح اپنے رابطے کی تجدید کرتا

---

[۱] تفسیر القرطبی ج:۱ ص:۹۲ ورُوح المعانی ج:۱ ص:۱

[۲] تفسیر القرطبی ج:۱ ص:۹۷

ہے جس سے یہ تمام دُنیاوی اور معاشی ضرورتیں ذِکرِ خدا بن کر عبادت میں لکھی جاتی ہیں۔ مؤمن سواری پر سوار ہوتے ہوئے بسم اللہ کہہ کر گویا یہ شہادت دیتا ہے کہ اس سواری کا پیدا کرنا یا مہیا کرنا، پھر اس کو میرے قبضے میں دے دینا انسان کی قدرت سے باہر چیز ہے، رَبّ العزّت ہی کے بنائے ہوئے نظامِ محکم کا کام ہے کہ کہیں کی لکڑی، کہیں کا لوہا، کہیں کی مختلف دھاتیں، کہیں کے کاریگر، کہیں کے چلانے والے سب کے سب میری خدمت میں لگے ہوئے ہیں، چند پیسے خرچ کرنے سے اتنی بڑی خلقِ خدا کی محنت کو ہم اپنے کام میں لاسکتے ہیں، اور وہ پیسے بھی ہم اپنے ساتھ کہیں سے نہیں لائے تھے، بلکہ اس کے حاصل کرنے کے تمام اسباب بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ غور کیجئے کہ اسلام کی صرف اسی ایک ہی مختصر سی تعلیم نے اِنسان کو کہاں سے کہاں پہنچادیا، اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ بِسۡمِ اللّٰهِ ایک نسخۂ اکسیر ہے جس سے تانبے کا نہیں بلکہ خاک کا سونا بنتا ہے، فَلِلّٰهِ الۡحَمۡدُ عَلٰى دِيۡنِ الۡاِسۡلَامِ وَتَعۡلِيۡمَاتِهٖ۔

مسئلہ:- قرآن کی تلاوت شروع کرنے کے وقت اوّل اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ اور پھر بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ پڑھنا سنت ہے، اور درمیانِ تلاوت بھی سورۂ براءت کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔

اس تمہید کے بعد آیت بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کی تفسیر دیکھئے:-

بِسۡمِ اللّٰهِ الخ کی تفسیر

بِسۡمِ اللّٰهِ، یہ کلمہ تین لفظوں سے مرکب ہے، ایک حرفِ باء، دُوسرے اسم، تیسرے اللہ۔ حرفِ باءِ عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے اِستعمال ہوتی ہے، جن میں سے تین معنی مناسبِ مقام ہیں، ان میں سے ہر ایک معنی اس جگہ لئے جاسکتے ہیں:-

اوّل: مصاحبت، یعنی کسی چیز کا کسی چیز سے متصل ہونا۔ دُوسرے: اِستعانت، یعنی کسی چیز سے مدد حاصل کرنا۔ تیسرے: تبرک، یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

لفظ اِسۡـــم میں لغوی اور علمی تفصیلات بہت ہیں، جن کا جاننا عوام کے لئے ضروری نہیں، اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اُردو میں اس کا ترجمہ "نام" سے کیا جاتا ہے۔

لفظ اللّٰه، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جامع نام ہے، اور بعض علماء نے اسی کو اِسمِ اَعظم کہا ہے، اور یہ نام اللہ کے سوا کسی دُوسرے کا نہیں ہوسکتا، اس لئے اس لفظ کا تثنیہ اور جمع نہیں آتے، کیونکہ اللہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نام ہے اس موجودِ حق کا جو تمام صفاتِ کمال کا جامع اور صفاتِ رُبوبیت کے ساتھ متصف، یکتا اور بے مثال ہے۔

اس لئے کلمۂ بِسْمِ اللّٰهِ کے معنی حرفِ باء کے مذکورہ تین معنی کی ترتیب سے یہ ہوئے:-

اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے نام کی مدد سے، اللہ کے نام کی برکت سے،

لیکن تینوں صورتوں میں یہ ظاہر ہے کہ یہ کلام نامکمل ہے، جب تک اس کام کا ذِکر نہ کیا جائے جو اللہ کے نام کے ساتھ یا اس کے نام کی برکت سے کرنا مقصود ہے، اس لئے نحوی قاعدے کے مطابق یہاں کوئی فعل مناسبِ مقام محذوف ہوتا ہے، مثلاً ''شروع کرتا ہوں یا پڑھتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ۔''

اور مناسب یہ ہے کہ یہ فعل بھی بعد میں محذوف مانا جائے، تاکہ حقیقۃً شروع اسم اللہ ہی سے ہو، وہ فعلِ محذوف بھی اسم اللہ سے پہلے نہ آئے، صرف حرفِ باء کا اسم اللہ سے پہلے آنا عربی زبان کے لحاظ سے ضروری وناگزیر ہے، اس میں بھی مصحفِ عثمانی میں باجماعِ صحابہؓ یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ حرفِ باء رسم الخط کے قاعدے سے ''الف'' کے ساتھ ملا کر لکھنا چاہئے تھا، اور لفظ ''اسم'' الگ، جس کی صورت ہوتی: "باسم الله"، لیکن مصحفِ عثمانی کے رسم الخط میں حرفِ ہمزہ کو حذف کرکے حرفِ باء کو ''سین'' کے ساتھ ملا کر صورۃً ''اسم'' کا جزء بنا دیا، تاکہ شروع اسم اللہ سے ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ دُوسرے مواقع میں یہ حرفِ الف حذف نہیں کیا جاتا، جیسے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ (العلق:۱) میں ''ب'' کو ''الف'' کے ساتھ لکھا جاتا ہے، یہ صرف بسم اللہ کی خصوصیت ہے کہ حرفِ باء کو ''سین'' کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، رَحْمٰنٌ کے معنی عام الرحمۃ کے اور رَحِيْمٌ کے معنی تام الرحمۃ کے ہیں، عام الرحمۃ سے مطلب یہ ہے کہ وہ ذات جس کی رحمت سارے عالم اور ساری کائنات اور جو کچھ اب تک پیدا ہوا ہے اور جو کچھ ہوگا سب پر حاوی اور شامل ہو، اور تام الرحمۃ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی رحمت کامل و مکمل ہو۔

یہی وجہ ہے کہ لفظ رَحْمٰنٌ اللہ جل شانہٗ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، کسی مخلوق کو ''رحمٰن'' کہنا جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں ہوسکتا جس کی رحمت سے عالم کی کوئی چیز خالی نہ رہے، اسی لئے جس طرح لفظ ''اللہ'' کا جمع اور تثنیہ نہیں آتا ''رحمٰن'' کا بھی جمع و تثنیہ نہیں آتا، کیونکہ وہ ایک ہی ذاتِ پاک کے ساتھ مخصوص ہے، دُوسرے اور تیسرے کا وہاں احتمال ہی نہیں۔ (تفسیر قرطبی) بخلاف لفظ رَحِيْمٌ کے کہ اس کے معنی میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا پایا جانا مخلوق میں ناممکن ہو، کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص کسی شخص سے پوری پوری رحمت کا معاملہ کرے۔

اسی لئے لفظ رَحِيْمٌ انسان کے لئے بھی بولا جاسکتا ہے، قرآنِ کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ لفظ استعمال فرمایا ہے: بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾[1] - (التوبۃ)

---

[1] ترجمہ:- مؤمنوں کے لئے انتہائی شفیق، نہایت مہربان ہے!

مسئلہ:- اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آج کل ''عبدالرحمٰن''، ''فضل الرحمٰن'' وغیرہ ناموں میں تخفیف کرکے ''رحمٰن'' کہتے ہیں، اور اس شخص کو اس لفظ سے خطاب کرتے ہیں، یہ ناجائز و گناہ ہے۔

حکمت

بسم اللہ میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ کمال میں سے صرف دو صفتیں ذکر کی گئی ہیں، اور وہ دونوں لفظِ رحمت سے مشتق ہیں، اور وسعتِ رحمت اور کمالِ رحمت پر دَلالت کرنے والی ہیں، اس میں اِشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تخلیقِ عالم اور آسمان، زمین اور تمام کائنات کے پیدا کرنے اور ان کو پالنے وغیرہ کا منشا اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت ہے، نہ اس کو ان چیزوں کی خود کوئی ضرورت تھی نہ کوئی دُوسرا ان چیزوں کے پیدا کرنے پر مجبور کرنے والا تھا، صرف اسی کی رحمت کے تقاضے سے یہ ساری چیزیں اور ان کی پرورِش کے سارے اِنتظامات وجود میں آئے ہیں۔

ما نبودیم وتقاضا ما نبود
لطفِ تو ناگفتۂ ما می شنود [۱]

اَحکام و مسائل

مسئلہ تعوُّذ

تعوُّذ کے معنی ہیں اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھنا، قرآنِ کریم میں اِرشاد ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۹۸﴾ (النحل) یعنی ''جب تم قرآن کی تلاوت کرو تو اللہ سے پناہ مانگو شیطان مردود کے شر سے۔''

[۲] قراءتِ قرآن سے پہلے تعوُّذ پڑھنا باجماعِ اُمت سنت ہے، خواہ تلاوت نماز کے اندر ہو یا خارجِ نماز (شرح مُنیہ)۔

تعوُّذ پڑھنا تلاوتِ قرآن کے ساتھ مخصوص ہے، علاوہ تلاوت کے دُوسرے کاموں کے شروع میں صرف بسم اللہ پڑھی جائے، تعوُّذ مسنون نہیں۔ (عالمگیری، باب رابع، من الکراھیة) [۳]

جب قرآن شریف کی تلاوت کی جائے اس وقت اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اور بِسْمِ اللّٰہِ دونوں پڑھی جائیں، درمیانِ تلاوت

---

[۱] ترجمہ:- ہم نہیں تھے اور ہماری طرف سے کوئی تقاضا بھی نہیں تھا، آپ کی مہربانی نے ہماری وہ دُعا بھی سن لی جو ہم نے نہیں مانگی تھی۔

[۲] شرح منیة ص:۳۰۳، ۳۰۴

[۳] ج:۵ ص:۳۱۶

میں جب ایک سورت ختم ہو کر دُوسری شروع ہو تو سورۂ براءت کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں مکرّر بسم اللہ پڑھی جائے، اعوذ باللہ نہیں، اور سورۂ براءت اگر درمیانِ تلاوت میں آجائے تو اس پر بسم اللہ نہ پڑھے، اور اگر قرآن کی تلاوت سورۂ براءت ہی سے شروع کر رہا ہے تو اس کے شروع میں اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھنا چاہئے۔ (عالمگيرية عن المحيط) [1]

اَحکامِ بسم اللہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ قرآن مجید میں سورۂ نمل میں آیت کا جزء ہے، اور ہر دو سورتوں کے درمیان مستقل آیت ہے، اس لئے اس کا اِحترام قرآن مجید ہی کی طرح واجب ہے، اس کو بے وضو ہاتھ لگانا جائز نہیں (علی مختار الکرخی وصاحب الکافی والہدایہ، شرح مُنیہ)۔ اور جنابت یا حیض ونفاس کی حالت میں اس کو بطورِ تلاوت پڑھنا بھی پاک ہونے سے پہلے جائز نہیں، ہاں کسی کام کے شروع میں، جیسے کھانے پینے سے پہلے بطورِ دُعا پڑھنا ہر حال میں جائز ہے۔ (شرح مُنیہ کبیر) [2]

مسئلہ:- پہلی رکعت کے شروع میں اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ کے بعد بِسۡمِ اللّٰہِ پڑھنا مسنون ہے، البتہ اس میں اِختلاف ہے کہ آواز سے پڑھا جائے یا آہستہ، اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ اور بہت سے دُوسرے ائمہ آہستہ پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

پہلی رکعت کے بعد دُوسری رکعتوں کے شروع میں بھی بِسۡمِ اللّٰہِ پڑھنا چاہئے، اس کے مسنون ہونے پر سب کا اِتفاق ہے، اور بعض روایات میں ہر رکعت کے شروع میں بِسۡمِ اللّٰہِ پڑھنے کو واجب کہا گیا ہے۔ (شرح مُنیہ) [3]

مسئلہ:- نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۃ شروع کرنے سے پہلے بِسۡمِ اللّٰہِ نہیں پڑھنا چاہئے، خواہ جہری نماز ہو یا سری، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ سے ثابت نہیں ہے، شرح مُنیہ میں اسی کو اِمامِ اعظمؒ اور ابو یوسفؒ کا قول لکھا ہے، [4] اور شرح مُنیہ، درمختار، برہان وغیرہ میں اسی کو ترجیح دی ہے، مگر اِمام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ سری نمازوں میں پڑھنا بہتر ہے، بعض روایات میں یہ قول ابوحنیفہؒ کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے، اور شامی نے بعض فقہاء سے اس کی ترجیح بھی نقل کی ہے، ''بہشتی زیور [5]'' میں بھی اسی کو اِختیار کیا گیا ہے، اور اس پر سب کا اِتفاق ہے کہ کوئی پڑھ لے تو مکروہ نہیں۔ (شامی) [6]

---

[1] بحوالۂ بالا۔
[2] شرح منية كبير ص:۵۷
[3] شرح منية ص:۳۰۶
[4] شرح منية ص:۳۰۸، ۳۰۹
[5] حصه دوم ص:۲۰
[6] ج:۱ ص:۴۹۰

ایاتها ۷　　۱ سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ ۵　　رکوعها ۱

اس میں سات آیتیں ہیں، سورۂ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی، اور ایک رُکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا۔ بے حد مہربان نہایت رحم والا۔ مالک روزِ جزا کا۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵ صِرَاطَ

تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ بتلا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ

الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷ ع

اُن لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا، جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

تمام تعریفیں اللہ کی ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے ۝۱ جو سب پر مہربان، بہت مہربان ہے ۝۲ جو روزِ جزا کا مالک ہے ۝۳ (اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں ۝۴ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما ۝۵ اُن لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے اِنعام کیا ہے ۝۶ نہ کہ اُن لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا ہے، اور نہ اُن کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں ۝۷

خلاصہ تفسیر

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سب تعریفیں

اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے (مخلوقات الگ الگ جنس ایک ایک عالم کہلاتا ہے، مثلاً عالمِ ملائکہ، عالمِ اِنسان، عالمِ جن)، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں، مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ جو مالک ہیں روزِ جزا کے (مراد قیامت کا دِن ہے جس میں ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پاوے گا)، اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اِعانت کی کرتے ہیں، اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا (مراد دِین کا راستہ ہے)، صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے اِنعام فرمایا (مراد دِین کا اِنعام ہے)، غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب ہوا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستہ سے گم ہوگئے (راہِ ہدایت چھوڑنے کی دو وجہ ہوا کرتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کی پوری تحقیق ہی نہ کرے، ضَآلِّيْن سے ایسے لوگ مراد ہیں، دُوسری وجہ یہ ہے کہ تحقیق پوری ہونے کے باوجود اس پر عمل نہ کرے، مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے ایسے لوگ مراد ہیں، کیونکہ جان بوجھ کر خلاف کرنا زیادہ ناراضی کا سبب ہوتا ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ فاتحہ کے مضامین

سورۂ فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے، جن میں سے پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے، اور آخری تین آیتوں میں اِنسان کی طرف سے دُعا و درخواست کا مضمون ہے، جو رَبّ العزّت نے اپنی رحمت سے خود ہی اِنسان کو سکھایا ہے، اور درمیانی ایک آیت میں دونوں چیزیں مشترک ہیں، کچھ حمد و ثنا کا پہلو ہے، کچھ دُعا و درخواست کا۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز (یعنی سورۂ فاتحہ) میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے، نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے، اور جو کچھ میرا بندہ مانگتا ہے وہ اس کو دیا جائے گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جب کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میرے بندے نے میری حمد کی ہے'' اور جب وہ کہتا ہے: الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میرے بندے نے میری تعریف و ثنا بیان کی ہے'' اور جب بندہ کہتا ہے: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی ہے'' اور جب بندہ کہتا ہے: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے'' کیونکہ اس میں ایک پہلو حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کا ہے، اور دُوسرا پہلو بندے کی دُعا و درخواست کا، اس کے ساتھ یہ بھی اِرشاد ہوا کہ: ''میرے بندے کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی۔'' پھر جب بندہ کہتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (آخر تک) تو

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یہ سب میرے بندے کے لئے ہے، اور اس کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی"۔ (مظہری) [۱]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے معنی یہ ہیں کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، یعنی دُنیا میں جہاں کہیں کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے، وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہے، کیونکہ اس جہانِ رنگ و بو میں جہاں ہزاروں حسین مناظر اور لاکھوں دِل کش نظارے اور کروڑوں نفع بخش چیزیں اِنسان کے دامنِ دِل کو ہر وقت اپنی طرف کھینچتی رہتی ہیں اور اپنی تعریف پر مجبور کرتی ہیں، اگر ذرا نظر کو گہرا کیا جائے تو ان سب چیزوں کے پردے میں ایک ہی دستِ قدرت کارفرما نظر آتا ہے، اور دُنیا میں جہاں کہیں کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں جیسے کسی نقش و نگار یا تصویر کی یا کسی صنعت کی تعریف کی جائے کہ یہ سب تعریفیں درحقیقت نقاش اور مصوّر کی یا صناع کی ہوتی ہیں، اس جملے نے کثرتوں کے تلاطم میں پھنسے ہوئے اِنسان کے سامنے ایک حقیقت کا دروازہ کھول کر یہ دِکھلا دیا کہ یہ ساری کثرتیں ایک ہی وحدت سے مربوط ہیں، اور ساری تعریفیں درحقیقت اسی ایک قادرِ مطلق کی ہیں، ان کو کسی دُوسرے کی تعریف سمجھنا نظر و بصیرت کی کوتاہی ہے ۔

حمد را با تو نسبتے است درست
بر درِ ہر کہ رفت بر درِ تست [۲]

اور یہ ظاہر ہے کہ جب ساری کائنات میں لائقِ حمد درحقیقت ایک ہی ذات ہے تو عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہوسکتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اگرچہ حمد و ثنا کے لئے لایا گیا ہے، لیکن اس ضمن میں ایک معجزانہ انداز سے مخلوق پرستی کی بنیاد ختم کردی گئی، اور دِل نشین طریق پر توحید کی تعلیم دی گئی ہے۔

غور کیجئے کہ قرآن کے اس مختصر سے اِبتدائی جملے میں ایک طرف تو حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کا بیان ہوا، اسی کے ساتھ مخلوقات کی رنگینیوں میں اُلجھے ہوئے دِل و دِماغ کو ایک حقیقت کی طرف متوجہ کرکے مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی، اور معجزانہ انداز سے اِیمان کے سب سے پہلے رُکن توحیدِ باری کا نقش اس طرح جما دیا گیا کہ جو دعویٰ ہے اس میں غور کرو تو وہی اپنی دلیل بھی ہے: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ (المؤمنون) [۳]

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی تفسیر

اس مختصر اِبتدائی جملے کے بعد اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ذِکر کی گئی ہے، مختصر الفاظ میں اس کی بھی تشریح دیکھئے:-

---

[۱] التفسیر المظهری ج:۱ ص:۱۱، صحیح مسلم، کتاب الصلوٰة، باب وجوب قراءة الفاتحة الخ ج:۱ ص:۱۶۹

[۲] ترجمہ:- حمد کی نسبت صرف تیری طرف دُرست ہے، کوئی جس دروازے پر بھی چلا جائے وہ تیرے ہی دروازے پر ہے۔

[۳] ترجمہ:- غرض بڑی شان ہے اللہ کی جو سارے کاریگروں سے بڑھ کر کاریگر ہے!

لفظ ''رَبّ'' کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے تربیت و پرورِش کرنے والے کے ہیں، اور تربیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے درجہ بدرجہ آگے بڑھایا جائے یہاں تک کہ وہ حدِ کمال کو پہنچ جائے۔

یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے لئے مخصوص ہے، کسی مخلوق کو بدون اضافت کے رَبّ کہنا جائز نہیں، کیونکہ ہر مخلوق خود محتاجِ تربیت ہے، وہ کسی دُوسرے کی کیا تربیت کرسکتا ہے۔

الْعٰلَمِيْنَ عالم کی جمع ہے، جس میں دُنیا کی تمام اَجناس، آسمان، چاند، سورج اور تمام ستارے اور ہوا وفضا، برق وباراں، فرشتے، جنات، زمین اور اس کی تمام مخلوقات، حیوانات، اِنسان، نباتات، جمادات سب ہی داخل ہیں، اس لئے **رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ تمام اَجناسِ کائنات کی تربیت کرنے والے ہیں، اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ جیسا یہ ایک عالم ہے جس میں ہم بستے ہیں اور اس کے نظامِ شمسی وقمری اور برق وباراں اور زمین کی لاکھوں مخلوقات کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں، یہ سارا ایک ہی عالم ہو، اور اسی جیسے اور ہزاروں لاکھوں دُوسرے عالم ہوں جو اس عالم سے باہر کی خلا میں موجود ہوں، اِمام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر [1] میں فرمایا ہے کہ اس عالم سے باہر ایک لامتناہی خلا کا وجود دلائلِ عقلیّہ سے ثابت ہے، اور یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے، اُس کے لئے کیا مشکل ہے کہ اُس نے اس لامتناہی خلا میں ہمارے پیشِ نظر عالم کی طرح کے اور بھی ہزاروں لاکھوں عالم بنا رکھے ہوں۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے منقول ہے کہ ''عالم چالیس ہزار ہیں، یہ دُنیا مشرق سے مغرب تک ایک عالم ہے، باقی اس کے سوا ہیں۔'' اسی طرح حضرت مقاتلؒ اِمامِ تفسیر سے منقول ہے کہ ''عالم اَسّی ہزار ہیں'' (قرطبی) [2]۔ اس پر جو یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ خلا میں اِنسانی مزاج کے مناسب ہوا نہیں ہوتی، اس لئے اِنسان یا کوئی حیوان وہاں زندہ نہیں رہ سکتا، اِمام رازیؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ اِس عالم سے خارج خلا میں جو دُوسرے عالم کے باشندے ہوں اُن کا مزاج بھی ہمارے عالم کے باشندوں کی طرح ہو جو خلا میں زندہ نہ رہ سکیں، یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ اُن عالموں کے باشندوں کے مزاج وطبائع، ان کی غذا و ہوا یہاں کے باشندوں سے بالکل مختلف ہو۔

یہ مضمون تو اَب سے سات سو ستتر سال پہلے کے اِسلامی فلاسفر اِمام رازیؒ کا لکھا ہوا ہے، جبکہ فضا وخلا کی سیر اور اس کی پیمائش کے آلات و ذرائع ایجاد نہ ہوئے تھے، آج راکٹوں اور اسپٹنکوں کے زمانے میں خلا کے مسافروں نے جو کچھ آکر بتلایا وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہ اس عالم سے باہر کی خلا کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے، اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس غیر متناہی خلا میں کیا کچھ موجود ہے، اس دُنیا سے قریب ترین سیاروں، چاند اور مریخ کی آبادی کے بارے میں جو قیاسات

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے التفسیر الکبیر ج:۱ ص:۲۲۸

[2] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۱ ص:۱۳۸

آج کے جدید ترین ماہرینِ سائنس پیش کررہے ہیں وہ بھی یہی ہیں کہ اگر ان سیارات کے اُوپر کچھ لوگ آباد ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ وہ انہیں خصوصیات اور اسی مزاج وطبیعت کے ہوں جو اس عالم کے اِنسان اور حیوانات ونباتات کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں، بلکہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ اُن کے مزاج وطبیعت، ان کی غذا وضروریات یہاں کے لوگوں سے بالکل مختلف ہوں، اس لئے ایک کو دُوسرے پر قیاس کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

اِمام رازیؒ کی تائید اور اس سلسلے کی جدید معلومات کے لئے وہ مقالہ کافی ہے جو امریکی خلائی مسافر جان گلین نے حال میں خلا کے سفر سے واپس آکر شائع کرایا ہے، جس میں شعاعی سال کا نام دے کر ایک طویل مدّت ومسافت کا پیمانہ قائم کیا، اور اس کے ذریعے اپنی وسعتِ فکر کی حد تک خلا کا کچھ اندازہ لگایا اور پھر یہ اقرار کیا کہ کچھ نہیں بتلایا جاسکتا کہ خلا کی وسعت کتنی اور کہاں تک ہے۔

قرآن کے اس مختصر جملے کے ساتھ اب تمام عالم اور اس کی کائنات پر نظر ڈالئے، اور بچشمِ بصیرت دیکھئے کہ حق تعالیٰ نے تربیتِ عالم کا کیسا مضبوط اور محکم، محیر العقول نظام بنایا ہے، افلاک سے لے کر عناصر تک، سیارات ونجوم سے لے کر ذرّات تک ہر چیز اس سلسلۂ نظام میں بندھی ہوئی، اور حکیمِ مطلق کی خاص حکمتِ بالغہ کے ماتحت ہر چیز اپنے اپنے کام میں مصروف ہے۔ ایک لقمہ جو اِنسان کے منہ تک پہنچتا ہے، اگر اس کی پوری حقیقت پر اِنسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تیاری میں آسمان اور زمین کی تمام قوّتیں اور کروڑوں اِنسانوں اور جانوروں کی محنتیں شامل ہیں، سارے عالم کی قوّتیں مہینوں مصروفِ خدمت رہیں جب یہ لقمہ تیار ہوا، اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اِنسان اس میں غور وتدبر سے کام لے اور سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لے کر زمین تک اپنی تمام مخلوقات کو اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے، تو جس ہستی کو اس نے مخدومِ کائنات بنا رکھا ہے وہ بھی بیکار وبیہودہ نہیں ہوسکتی، اس کا بھی کوئی کام ہوگا، اس کے ذمے بھی کوئی خدمت ہوگی۔

ابر و باد ومہ وخورشید وفلک در کار اند
تا تو نانے بکف آری وبغفلت نخوری [۱]

ہمہ از بہرِ تو سرگشتہ وفرمانبردار
شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری [۲]

قرآنِ حکیم نے اِنسانی آفرینش اور اس کے مقصدِ حیات کو اس آیت میں واضح فرمایا ہے:-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ (الذاریات)

---

[۱] ترجمہ:- بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان سب تیرے کام میں لگے ہوئے ہیں، تاکہ تو روٹی ہاتھ میں لے کر غفلت کے ساتھ نہ کھائے۔

[۲] ترجمہ:- سب تیرے لئے پریشان اور تیرے فرمانبردار ہیں تو اگر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کرے تو یہ انصاف نہیں ہے۔

''میں نے جن اور انسان کو اور کسی کام کے لئے نہیں بنایا بجز اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

تقریرِ مذکور سے معلوم ہوا کہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ایک حیثیت سے پہلے جملے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کی دلیل ہے کہ جب تمام کائنات کی تربیت و پرورِش کی ذمہ دار صرف ایک ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو حمد وثنا کی حقیقی مستحق بھی وہی ذات ہوسکتی ہے، اس لئے پہلی آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں حمد وثنا کے ساتھ ایمان کے سب سے پہلے رُکن توحید باری تعالیٰ کا بیان بھی مؤثر انداز میں آ گیا۔

دُوسری آیت میں صفتِ رحمت کا ذِکر بلفظ صفت رَحْمٰن و رَحِیْم کیا گیا ہے، یہ دونوں صیغے مبالغہ کے ہیں، جن میں رحمتِ خداوندی کی وسعت و کثرت اور کمال کا بیان ہے، اس صفت کے ذِکر کرنے میں شاید اس طرف اِشارہ ہے کہ یہ تمام کائنات ومخلوقات کی تربیت و پرورِش کی ذمہ داری جوحق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے وہ کسی اپنی ضرورت یا دباؤ اور مجبوری سے نہیں، بلکہ یہ سب کچھ اس کی صفتِ رحمت کا تقاضا ہے، اگر پوری کائنات نہ ہو تو اس کا کچھ نقصان نہیں، اور ہو جائے تو اس پر کچھ بار نہیں ؂

نہ تنہا بدی چونکہ خلقت نبود
نہ چوں کردہ شد بر تو زحمت فزود [۱]

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ لفظ مَالِك مِلك سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز پر ایسا قبضہ کہ وہ اس میں تصرف کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو (قاموس)۔ لفظ دِیْن کے معنی جزا دینا، مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کا لفظی ترجمہ ہوا ''مالک روزِ جزا کا''، یعنی روزِ جزا میں ملکیت رکھنے والا، وہ ملکیت کس چیز پر ہوگی؟ اس کا ذِکر نہیں کیا گیا۔ تفسیر کشاف میں ہے کہ اس میں اِشارہ عموم کی طرف ہے، یعنی روزِ جزا میں تمام کائنات اور تمام اُمور کی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی۔ (کشاف) [۲]

روزِ جزا کی حقیقت اور عقلاً اُس کی ضرورت

اب یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں:-

اوّل یہ کہ روزِ جزا کس دِن کا نام ہے، اور اس کی کیا حقیقت ہے؟

دُوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت تمام کائنات پر جس طرح روزِ جزا میں ہوگی ایسے ہی آج بھی ہے، پھر روزِ جزا کی کیا خصوصیت ہے؟

---

[۱] ترجمہ:- جب مخلوق نہیں تھی اس وقت بھی اللہ تعالیٰ اکیلا نہیں تھا، جب مخلوق پیدا کر دی گئی تو اللہ تعالیٰ پر کسی زحمت کا اضافہ نہیں ہوا۔

[۲] تفسیر کشاف ج:۱ ص:۵۴، ۵۵

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ روزِ جزا اس دِن کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نیک و بداعمال کا بدلہ دینے کے لئے مقرّر فرمایا ہے، لفظ ''روزِ جزاء'' سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ حاصل ہوا کہ دُنیا نیک و بداعمال کی جزا وسزا کی جگہ نہیں، بلکہ ایک دارالعمل فرض ادا کرنے کا دفتر ہے، تنخواہ یا صلہ وصول کرنے کی جگہ نہیں، اس سے معلوم ہوگیا کہ دُنیا میں کسی کو عیش وعشرت، دولت وراحت سے مالامال دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول ومحبوب ہے، یا کسی کو رَنج ومصیبت میں مبتلا پاکر یہ نہیں قرار دِیا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک معتوب ومبغوض ہے۔ جس طرح دُنیا کے دفتروں اور کارخانوں میں کسی کو اپنا فرض ادا کرنے میں مصروفِ محنت دیکھا جائے تو کوئی عقل منداس کو مصیبت زدہ نہیں کہتا، اور نہ وہ خود اپنی مشقت کے باوجود اپنے آپ کو گرفتارِ مصیبت سمجھتا ہے، بلکہ وہ اس محنت ومشقت کو اپنی سب سے بڑی کامیابی تصوّر کرتا ہے، اور کوئی مہربان اُس کو اِس مشقت سے سبکدوش کرنا چاہے تو وہ اس کو اپنا بدترین دُشمن خیال کرتا ہے، کیونکہ وہ اس تیس روزہ محنت کے پسِ پردہ اُس راحت کو دیکھ رہا ہے جو اس کو تنخواہ کی شکل میں ملنے والی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دُنیا میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے بعد اولیاء اللہ سب سے زیادہ مصیبت وبلا میں مبتلا ہوتے ہیں، اور وہ اپنی اس حالت پر نہایت مطمئن اور بسا اوقات مسرور نظر آتے ہیں ۔

نشود نصیبِ دُشمن کہ شود ہلاک تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی [۱]

الغرض دُنیا کی عیش وعشرت حق وصداقت کی اور رَنج ومصیبت بدعملی کی یقینی علامت نہیں ہے، ہاں کبھی کبھی کسی کسی عمل کی جزا یا سزا کا ہلکا سا نمونہ دُنیا میں بھی ظاہر کردیا جاتا ہے، وہ اس کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، محض متنبہ کرنے کے لئے ایک نمونہ ہوتا ہے، اس کے متعلق قرآن کا اِرشاد ہے:-

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٢١﴾ (السجدۃ)

''یعنی ہم لوگوں کو (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے (بعض اوقات) دُنیا میں ایک عذابِ قریب کا مزہ چکھادیتے ہیں تاکہ وہ باز آجائیں۔''

اور دُوسری جگہ اِرشاد ہے:-

كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾ (القلم)

''ایسا ہوتا ہے عذاب، اور آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے، اگر وہ سمجھیں۔''

الغرض دُنیا کی راحت ومصیبت بعض اوقات تو اِمتحان اور آزمائش ہوتی ہے، اور کبھی عذاب بھی ہوتی ہے، مگر وہ

---

[۱] ترجمہ:- خدا کرے کہ میرا دُشمن تیری تلوار سے ہلاک نہ ہو (بلکہ میں ہوں) دوستوں کا سر سلامت رہے تم خنجر آزماؤ۔

عمل کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک نمونہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب کچھ چند روزہ اور محض عارضی ہے، مدار و معیار وہ راحت وکلفت ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، اور جو اس عالم سے گزرنے کے بعد عالمِ آخرت میں آنے والی ہے، اسی کا نام روزِ جزا ہے، اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ نیک و بدعمل کا بدلہ یا پورا بدلہ اس دُنیا میں نہیں ملتا، اور عدل و انصاف اور عقل کا تقاضا ہے کہ نیک و بد، اچھا اور برا برابر نہ رہے، بلکہ ہر عمل کی جزا یا سزا ملنا چاہئے۔

اس لئے ضروری ہے کہ اس عالم کے بعد کوئی دُوسرا عالم ہو، جس میں ہر چھوٹے بڑے اور اچھے برے عمل کا حساب اور اس کی جزا یا سزا انصاف کے مطابق ملے، اسی کو قرآن کی اِصطلاح میں روزِ جزا یا قیامت یا آخرت کہا جاتا ہے، قرآن نے خود اس مضمون کو سورۂ مؤمن میں وضاحت سے بیان فرمایا ہے:-

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيرُ ۙ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۚ قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ ﴿۵۸﴾ إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۵۹﴾ (المؤمن)

''یعنی بینا اور نابینا اور (ایک) وہ لوگ جو اِیمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور (دُوسرے) بدکردار باہم برابر نہیں ہوسکتے، تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو، قیامت تو ضرور ہی آکر رہے گی (تاکہ ہر ایک عمل کا پورا بدلہ اس کو مل جائے) اس کے آنے میں کسی طرح کا شک ہے ہی نہیں، مگر اکثر لوگ نہیں اِیمان لاتے۔

مالک کون ہے؟

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ میں دُوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہر اہلِ عقل کے نزدیک یہ بات بدیہی اور بالکل ظاہر ہے کہ حقیقی مالک تمام کائنات کے ذرّے ذرّے کی وہی ذاتِ پاک ہے، جس نے ان کو پیدا کیا، بڑھایا، تربیت کی، اور جس کی ملکیت ہر چیز پر مکمل ہے، ظاہر پر بھی، باطن پر بھی، زندہ پر بھی، مردہ پر بھی، اور جس کی ملکیت کی نہ کوئی اِبتدا ہے نہ اِنتہا، بخلاف اِنسان کی ملکیت کے کہ وہ اِبتدا و اِنتہا کے دائرے میں محدود ہے، پہلے نہیں تھی اور پھر نہ رہے گی، نیز اس کی ملکیت وتصرف اشیاء کے ظاہر پر ہے، باطن پر نہیں، زندہ پر ہے، مردہ پر نہیں، اس لئے ہر اہلِ بصیرت کے نزدیک صرف روزِ جزا کی نہیں بلکہ دُنیا میں بھی تمام کائنات کی حقیقی ملکیت صرف حق تعالیٰ ہی کی ہے، پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو خاص روزِ جزا کا مالک فرمانے میں کیا حکمت ہے؟

سو قرآن کی دُوسری آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوا کہ دُنیا میں بھی اگرچہ حقیقی اور مکمل ملکیت تمام کائنات پر صرف پروردگارِ عالم ہی کی ہے، لیکن اسی نے اپنے کرم اور حکمتِ بالغہ سے ایک قسم کی ناقص ملکیت اِنسان کو بھی عطا فرما رکھی

ہے، اور دُنیا کے قوانین میں اس کی ملکیت کا کافی اِحترام بھی کیا گیا ہے، آج کی دُنیا میں اِنسان مال و دولت کا مالک ہے، زمین جائیداد کا مالک ہے، کوٹھی، بنگلہ اور فرنیچر کا مالک ہے، حشم وخدم کا مالک ہے، اور یہ ناقص سی ملکیت جو اس کو محض آرائش کے لئے دی گئی تھی، وہ اسی میں مغرور و بدمست ہو گیا، اس آیت میں حق تعالیٰ نے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ فرما کر اس مغرور و غافل اِنسان کو آگاہ فرمایا کہ یہ ملکیتیں اور سب تعلقات و روابط صرف چند روز کے لئے ہیں، ایک دن ایسا آنے والا ہے جس میں کوئی کسی چیز کا ظاہری طور پر بھی مالک نہ رہے گا، نہ کوئی کسی کا خادم رہے گا، نہ مخدوم، نہ کوئی کسی کا آقا رہے گا نہ غلام، تمام کائنات کی مِلک اور مُلک صرف ایک ذاتِ پاک اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی۔

اس آیت کی پوری تفسیر اور روزِ جزا کی وضاحت سورۂ مؤمن کی اِن آیات میں ہے:-

يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۭ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿١٦﴾ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۭ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿١٧﴾ (المؤمن)

اس میں روزِ جزا کا بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

''جس دِن سب لوگ (خدا کے) سامنے آموجود ہوں گے (کہ) ان کی کوئی بات خدا سے (صورۃً) بھی مخفی نہ رہے گی، آج کے روز کس کی حکومت ہوگی؟ بس اللہ ہی کی ہوگی، جو یکتا اور غالب ہے، آج ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا، آج کسی پر ظلم نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔''

سورۂ فاتحہ کے شروع میں بیان کیا گیا تھا کہ اس سورت کی تین اِبتدائی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کا بیان ہے، یہ تینوں آیتیں آچکیں، اور ان کی تفسیر میں آپ یہ بھی معلوم کر چکے کہ پہلی دو آیتوں میں حمد وثنا کے ضمن میں اِیمان کے بنیادی اُصول، اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کا بیان بھی ایک معجزانہ انداز میں آگیا ہے، اس تیسری آیت کی تفسیر میں آپ نے اب معلوم کر لیا کہ اس کے صرف دو لفظوں میں حمد وثنا کے ساتھ اسلام کے عظیم الشان اِنقلابی عقیدہ یعنی قیامت و آخرت کا بیان بھی مع دلیل کے آگیا، اب چوتھی آیت کا بیان آتا ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ، اس آیت میں ایک پہلو حمد وثنا کا اور دُوسرا دُعا و درخواست کا ہے۔ نَعْبُدُ عبادت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی کی اِنتہائی تعظیم ومحبت کی وجہ سے اس کے سامنے اپنی اِنتہائی عاجزی اور فرمانبرداری کا اِظہار۔ نَسْتَعِيْنُ اِستعانت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی سے مدد مانگنا، آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں''۔ اِنسان پر تین حالات گزرتے ہیں، ماضی، حال، مستقبل، پچھلی تین آیتوں میں سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں اِنسان کو اس پر متنبہ کر دیا گیا کہ وہ اپنے ماضی اور حال میں صرف اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے کہ اس کو ماضی میں نابود سے بود کیا، اور اس کو تمام کائنات سے زیادہ بہترین شکل وصورت اور

عقل وبصیرت عطافرمائی، اور حال میں اس کی پرورش اور تربیت کا سلسلہ جاری ہے، اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں یہ بتادیا کہ مستقبل میں بھی وہ خدا ہی کا محتاج ہے، کہ روزِ جزا میں اس کے سوا کسی کا کوئی مددگار نہیں ہوسکتا، اور جب ان تینوں آیتوں نے یہ واضح کردیا کہ اِنسان اپنی زندگی کے تینوں دور میں خدا ہی کا محتاج ہے تو اس کا طبعی اور عقلی تقاضا یہ ہوا کہ عبادت بھی صرف اسی کی کی جائے، کیونکہ عبادت جو اِنتہائی تعظیم ومحبت کے ساتھ اپنی اِنتہائی عاجزی اور تذلل کا نام ہے، وہ کسی دُوسری ہستی کے لائق نہیں، اس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ ایک عاقل اِنسان پکار اُٹھے کہ ہم تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، اسی مقتضائے طبع کو اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں ظاہر فرمایا گیا ہے، اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ حاجت روا صرف ایک ہی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو اِقتضائے عقلی وطبعی یہ ہے کہ اپنے کاموں میں مدد بھی صرف اسی سے مانگنا چاہئے، اسی اِقتضائے عقل وطبع کو وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں ذِکر فرمایا گیا ہے۔ (رُوح البیان) [۱]

غرض اس چوتھی آیت میں ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ہے کہ عبادت واِعانت کے لائق صرف وہی ہے، اور دُوسری حیثیت سے اِنسان کی دُعا ودرخواست ہے کہ ہماری مدد فرمائے اور تیسری حیثیت اور بھی ہے کہ اس میں اِنسان کو اس کی تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے، اور حقیقی طور پر اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا نہ سمجھے، اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے، کسی نبی یا ولی وغیرہ کو وسیلہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنا اس کے منافی نہیں۔

اس آیت میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اِرشاد یہ ہے کہ ''ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں'' کس کام میں مدد مانگتے ہیں اس کا ذِکر نہیں، جمہور مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا ذِکر نہ کرنے میں عموم کی طرف اِشارہ ہے کہ ہم اپنی عبادت اور ہر دِینی ودُنیوی کام اور ہر مقصد میں صرف آپ ہی کی مدد چاہتے ہیں۔

پھر عبادت صرف نماز روزے کا نام نہیں، اِمام غزالیؒ نے اپنی کتاب اَربعین میں عبادت کی دس قسمیں لکھی ہیں: ۱-نماز، ۲-زکوٰۃ، ۳-روزہ، ۴-حج، ۵-تلاوتِ قرآن، ۶-ہر حالت میں اللہ کا ذِکر کرنا، ۷-حلال روزی کے لئے کوشش کرنا، ۸-پڑوسی اور ساتھی کے حقوق ادا کرنا، ۹-لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کرنا اور برے کاموں سے منع کرنا، ۱۰-رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اِتباع کرنا۔ [۲]

اس لئے عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے کے معنیٰ یہ ہوگئے کہ نہ کسی کی محبت اللہ تعالیٰ کے برابر ہو، نہ کسی کا خوف اس کے برابر ہو، نہ کسی سے اُمید اس کی طرح ہو، نہ کسی پر بھروسہ اللہ کے مثل ہو، نہ کسی کی اِطاعت وخدمت اور کام کو اتنا ضروری سمجھے جتنا اللہ تعالیٰ کی عبادت کو، نہ اللہ تعالیٰ کی طرح کسی کی نذر اور منّت مانے، نہ اللہ تعالیٰ کی

---

[۱] تفسیر رُوح البیان ج:۱ ص:۱۴

[۲] کتاب الأربعین فی أصول الدِّین ص:۲۶ تا ۸۹

طرح کسی دُوسرے کے سامنے اپنی مکمل عاجزی اور تذلّل کا اِظہار کرے، نہ وہ افعال کسی دُوسرے کے لئے کرے جو اِنتہائی تذلّل کی علامات ہیں، جیسے رُکوع وسجدہ۔

آخری تین آیتیں جن میں اِنسان کی دُعا و درخواست کا مضمون ہے اور ایک خاص دُعا کی تلقین ہے یہ ہیں: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: ''بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا، راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے اِنعام فرمایا، نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستہ سے گم ہوگئے۔''

ان تینوں آیات میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:-

تکمیل الدرایہ فی تفصیل درجات الہدایہ [۱]

یہاں پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کے لئے دُعا جو اس آیت میں تعلیم فرمائی گئی ہے اس کے مخاطب جس طرح تمام اِنسان اور عامۂ مؤمنین ہیں، اسی طرح اولیاء اللہ اور حضراتِ انبیاء علیہم السلام بھی اس کے مأمور ہیں، جو بلاشبہ ہدایت یافتہ بلکہ دُوسروں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہیں، پھر اس حاصل شدہ چیز کی بار بار دُعا مانگنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب ہدایت کی پوری حقیقت معلوم کرنے پر موقوف ہے، اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، جس سے سوالِ مذکور کے علاوہ ان تمام اِشکالات کا بھی جواب معلوم ہوجائے گا جو مفہومِ ہدایت کے متعلق قرآنِ کریم کے بہت سے مقامات میں عموماً پیش آتے ہیں، اور ہدایت کی حقیقت سے ناآشنا قرآن کی بہت سی آیات میں باہمی تضاد و اِختلاف محسوس کرنے لگتا ہے۔

لفظ ''ہدایت'' کی بہترین تشریح اِمام راغب اصفہانیؒ نے ''مفردات القرآن'' [۲] میں تحریر فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت کے اصل معنی ہیں کسی شخص کو منزلِ مقصود کی طرف مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنا، اور ہدایت کرنا حقیقی معنی میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہے، جس کے مختلف درجات ہیں:-

ایک درجہ ہدایت کا عام ہے، جو کائنات و مخلوقات کی تمام اَقسام جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ کو شامل ہے، یہاں آپ یہ خیال نہ کریں کہ اِن بے جان، بے شعور چیزوں کو ہدایت سے کیا کام؟

---

[۱] ترجمہ:- ہدایت کے مختلف درجات۔

[۲] المفردات فی غریب القرآن ص: ۵۳۸ تا ۵۴۱

کیونکہ قرآنی تعلیمات سے یہ واضح ہے کہ کائنات کی تمام اَقسام اوران کا ذرّہ ذرّہ اپنے اپنے درجے کے موافق حیات و احساس بھی رکھتا ہے اور عقل وشعور بھی، یہ دُوسری بات ہے کہ یہ جوہر کسی نوع میں کم کسی میں زیادہ ہے، اسی وجہ سے جن اشیاء میں یہ جوہر بہت کم ہے اُن کو بے جان، بے شعور سمجھا اور کہا جاتا ہے، اَحکامِ اِلٰہیہ میں بھی اُن کے ضعفِ شعور کا اتنا اثر آیا کہ ان کو اَحکام کا مکلّف نہیں بنایا گیا، جن مخلوقات میں حیات کے آثار تو نمایاں ہیں مگر عقل وشعور نمایاں نہیں، ان کو ذِی حیات، جاندار مگر بے عقل وشعور کہا جاتا ہے، اور جن میں حیات کے ساتھ عقل وشعور کے آثار بھی نمایاں نظر آتے ہیں اُن کو ذَوی العقول کہا جاتا ہے، اور اسی اختلافِ درجات اور عقل وشعور کی کمی بیشی کی وجہ سے تمام کائنات میں اَحکامِ شرعیہ کا مکلّف صرف اِنسان اور جنات کو قرار دِیا گیا ہے کہ ان میں عقل وشعور بھی مکمل ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ دُوسری اَنواع واَقسام میں حیات و اِحساس یا عقل وشعور بالکل نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ کا اِرشاد ہے:-

وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَلٰکِنۡ لَّا تَفۡقَھُوۡنَ تَسۡبِیۡحَھُمۡ ؕ (بنی اسرائیل: ۴۴)

"یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی (قالاً یا حالاً) بیان نہ کرتی ہو، لیکن تم لوگ اُن کی پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں ہو۔"

اور سورۂ نور میں اِرشاد ہے:-

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالطَّیۡرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ کُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسۡبِیۡحَہٗ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۴۱﴾ (النور)

"یعنی کیا تجھ کو معلوم نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں، اور (بالخصوص) پرندے جو پر پھیلائے ہوئے اُڑتے پھرتے ہیں، سب کو اپنی اپنی دُعا اور تسبیح معلوم ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے۔"

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کی پاکی بیان کرنا اللہ تعالیٰ کی معرفت پر موقوف ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہی سب سے بڑا علم ہے، اور یہ علم بدون عقل وشعور کے نہیں ہوسکتا، اس لئے ان آیات سے ثابت ہوا کہ تمام کائنات کے اندر رُوح وحیات بھی ہے، اِدراک و اِحساس بھی، عقل وشعور بھی، مگر بعض کائنات میں یہ جوہر اتنا کم اور مخفی ہے کہ عام دیکھنے والوں کو اس کا اِحساس نہیں ہوتا، اسی لئے عرف میں ان کو بے جان یا بے عقل کہا جاتا ہے، اور اس بنا پر اُن کو اَحکامِ شرعیہ کا مکلّف بھی نہیں بنایا گیا، قرآن کا یہ فیصلہ اُس وقت کا ہے جب دُنیا میں نہ کہیں کوئی فلسفی تھا، نہ کوئی فلسفہ مدوّن تھا، بعد میں آنے والے فلاسفروں نے بھی اپنے اپنے وقت میں اس کی تصدیق کی، قدیم فلاسفہ میں بھی اِس خیال کے کچھ لوگ گزرے ہیں، اور جدید فلاسفہ اور اہلِ سائنس نے تو پوری وضاحت کے ساتھ اس کو ثابت کیا ہے۔

الغرض ہدایتِ خداوندی کا یہ درجۂ اُولیٰ تمام مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات، اِنسان اور جنات کو شامل ہے، اسی ہدایتِ عامہ کا ذِکر قرآنِ کریم کی آیت: اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی ﴿۵۰﴾ (طٰہٰ) میں فرمایا گیا ہے، یعنی ''اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی، پھر اس خلقت کے مناسب اس کو ہدایت دی۔'' اور یہی مضمون سورۂ اعلیٰ میں ان الفاظ سے اِرشاد ہوا:-

سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّكَ الۡاَعۡلَى ﴿۱﴾ الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ﴿۲﴾ وَالَّذِیۡ قَدَّرَ فَھَدٰی ﴿۳﴾ (الاعلیٰ)

''یعنی آپ اپنے پروردگار عالی شان کی تسبیح کیجئے جس نے ساری مخلوقات کو بنایا، پھر ٹھیک بنایا، اور جس نے تجویز کیا، پھر راہ بتائی۔''

یعنی جس نے تمام مخلوقات کے لئے خاص خاص مزاج اور خاص خاص خدمتیں تجویز فرما کر ہر ایک کو اس کے مناسب ہدایت کردی۔

اسی ہدایتِ عامہ کا نتیجہ ہے کہ کائناتِ عالم کے تمام اَنواع واَصناف اپنا اپنا مقرّرہ فرض نہایت سلیقہ سے ادا کر رہے ہیں، جو چیز جس کام کے لئے بنادی ہے وہ اس کو ایسی خوبی کے ساتھ ادا کررہی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، حضرت مولانا رُومیؒ نے اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے ۔

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند

بامن وتو مردہ، باحق زندہ اند [۱]

زبان سے نکلی ہوئی آواز کے معنی کا اِدراک نہ ناک کرسکتی ہے نہ آنکھ، حالانکہ یہ زبان سے زیادہ قریب ہیں، اس اِدراک کا فریضہ اللہ تعالیٰ نے کانوں کے سپرد کیا ہے، وہی زبان کی بات کو لیتے ہیں اور اِدراک کرلیتے ہیں، دانائے رُومؒ نے خوب فرمایا ۔

مر زباں را مشتری جز گوش نیست

واقفِ ایں رازِ جز بے ہوش نیست [۲]

اسی طرح کانوں سے دیکھنے یا سونگھنے کا کام نہیں لیا جاسکتا، ناک سے دیکھنے یا سننے کا کام نہیں لیا جاسکتا، سورۂ مریم میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

اِنۡ کُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ﴿۹۳﴾ (مریم)

---

[۱] ترجمہ:- مٹی، تیز ہوا، پانی اور آگ سب اللہ کے فرمانبردار ہیں، میں اور تو ان کو مردہ سمجھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ زندہ ہیں۔

[۲] ترجمہ:- میری زباں کا خریدار سوائے کان کے اور کوئی نہیں، بے ہوش آدمی کے سوا اس راز کو جاننے والا اور کوئی نہیں۔

''یعنی کوئی نہیں آسمان اور زمین میں جو نہ آوے رحمٰن کا بندہ ہو کر۔''

دُوسرا درجہ ہدایت کا اس کے مقابلے میں خاص ہے، یعنی صرف اُن چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے جو عرف میں ذوی العقول کہلاتی ہیں، یعنی اِنسان اور جن، یہ ہدایت انبیاء اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ ہر اِنسان کو پہنچتی ہے، پھر کوئی اس کو قبول کر کے مؤمن و مسلم ہو جاتا ہے، کوئی رَدّ کر کے کافر ٹھہرتا ہے۔

تیسرا درجہ ہدایت کا اس سے بھی زیادہ خاص ہے کہ صرف مؤمنین و متقین کے ساتھ مخصوص ہے، یہ ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ اِنسان پر فائض ہوتی ہے، اس ہدایت کا دُوسرا نام توفیق ہے، یعنی ایسے اسباب اور حالات پیدا کر دینا کہ قرآنی ہدایات کا قبول کرنا اور اُن پر عمل کرنا آسان ہو جائے، اور اُن کی خلاف ورزی دُشوار ہو جائے۔ اس تیسرے درجے کی وسعت غیر محدود اور اس کے درجات غیر متناہی ہیں، یہی درجہ اِنسان کی ترقی کا میدان ہے، اعمالِ صالحہ کے ساتھ ساتھ اس درجۂ ہدایت میں زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ قرآنِ کریم کی متعدّد آیات میں اس زیادتی کا ذِکر ہے، مثلاً: وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى [۱] (محمد:۱۷)، وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ (التغابن:۱۱) ''جو شخص اللہ پر ایمان لائے اس کے دِل کو ہدایت کر دیتے ہیں''۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:۶۹)

''جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں، ہم اُن کو اپنے راستوں کی مزید ہدایت کر دیتے ہیں۔''

یہی وہ میدان ہے جہاں ہر بڑے سے بڑا نبی و رسول اور ولی اللہ آخر عمر تک زیادتیٔ ہدایت و توفیق کا طالب نظر آتا ہے، اِسی مقامِ ہدایت کے متعلق مولانا رُومیؒ نے فرمایا ؎

اے برادر بے نہایت در گہے ست
ہر چہ بروے میرسی بروے مایست [۲]

اور سعدی شیرازیؒ نے فرمایا ؎

نگویم کہ بر آب قادر نیند
کہ بر ساحلِ نیل مستسقی اند [۳]

درجاتِ ہدایت کی اس تشریح سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ ہدایت ایک ایسی چیز ہے جو سب کو حاصل بھی ہے، اور اس کے مزید درجاتِ عالیہ حاصل کرنے سے کسی بڑے سے بڑے اِنسان کو اِستغناء بھی نہیں، اسی لئے سورۂ فاتحہ کی اہم

[۱] ترجمہ:- اور جن لوگوں نے ہدایت کا راستہ اختیار کیا ہے، اللہ نے اُنہیں ہدایت میں اور ترقی دی ہے۔
[۲] ترجمہ:- اے بھائی! اس درگاہ کی کوئی انتہا نہیں ہے، تم جس مقام پر بھی پہنچ جاؤ اس کو آخری سمجھ کر وہیں رُک نہ جاؤ۔
[۳] ترجمہ:- میں یہ نہیں کہتا کہ ان کے پاس پانی نہیں ہے بلکہ وہ تو نیل کے کنارے پر ہیں (مگر) پھر بھی پانی کے طلب گار ہیں۔

ترین دُعا ہدایت کو قرار دِیا گیا، جو ایک ادنیٰ مؤمن کے لئے بھی مناسبِ حال ہے، اور بڑے سے بڑے رسول اور ولی کے لئے بھی اُتنی ہی اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخرِ عمر میں سورۂ فتح کے اندر فتحِ مکہ کے فوائد وثمرات بتلاتے ہوئے یہ بھی اِرشاد ہوا کہ: وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ (الفتح) یعنی ''مکہ مکرمہ اس لئے آپ کے ہاتھوں فتح کرایا گیا تاکہ آپ کو صراطِ مستقیم کی ہدایت ہو۔'' ظاہر ہے کہ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نہ صرف ہدایت یافتہ بلکہ دُوسروں کے لئے بھی ہدایتِ مجسم تھے، پھر اس موقع پر آپ کو ہدایت ہونے کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں ہوسکتے کہ ہدایت کا کوئی بہت اعلیٰ مقام آپ کو اس وقت حاصل ہوا۔

ہدایت کی اس تشریح سے آپ کے لئے فہم قرآن میں بہت سے فوائد حاصل ہوگئے:-

اوّل یہ کہ قرآن میں کہیں تو ہدایت کو ہر مؤمن وکافر کے لئے بلکہ کل مخلوقات کے لئے عام فرمایا گیا ہے، اور کہیں اس کو محض متقین کے ساتھ مخصوص لکھا گیا، جس میں ناواقف کو تعارض کا شبہ ہوسکتا ہے، ہدایت کے عام وخاص درجات معلوم ہونے کے بعد یہ شبہ خود بخود درفع ہوجاتا ہے کہ ایک درجہ سب کو عام اور شامل ہے، اور دُوسرا درجہ مخصوص ہے۔

دُوسرا فائدہ یہ ہے کہ قرآن میں ایک طرف تو جگہ جگہ یہ اِرشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالمین یا فاسقین کو ہدایت نہیں فرماتے، اور دُوسری طرف مکرّر سہ کرّر یہ اِرشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت فرماتے ہیں، اس کا جواب بھی درجات کی تفصیل سے واضح ہوگیا کہ ہدایتِ عامہ سب کو کی جاتی ہے، اور ہدایت کا تیسرا مخصوص درجہ ظالمین وفاسقین کو نصیب نہیں ہوتا۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ ہدایت کے تین درجات میں سے پہلا اور تیسرا درجہ بلاواسطہ حق تعالیٰ کا فعل ہے، اس میں کسی نبی یا رسول کا دَخل نہیں، انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کا کام صرف دُوسرے درجۂ ہدایت سے متعلق ہے۔

قرآنِ کریم میں جہاں کہیں انبیاء علیہم السلام کو ہادی قرار دِیا ہے، وہ اسی دُوسرے درجے کے اِعتبار سے ہے، اور جہاں یہ اِرشاد ہے: إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ (القصص:۵۶) یعنی ''آپ ہدایت نہیں کرسکتے جس کو چاہیں'' تو اس میں ہدایت کا تیسرا درجہ مراد ہے، یعنی توفیق دینا آپ کا کام نہیں۔

الغرض اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ایک جامع اور اہم ترین دُعا ہے، جو اِنسان کو سکھلائی گئی ہے، اِنسان کا کوئی فرد اس سے بے نیاز نہیں، دِین اور دُنیا دونوں میں صراطِ مستقیم کے بغیر فلاح وکامیابی نہیں، دُنیا کی اُلجھنوں میں بھی صراطِ مستقیم کی دُعا نسخۂ اکسیر ہے، مگر لوگ توجہ نہیں کرتے، ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ ''بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا۔''

صراطِ مستقیم کونسا راستہ ہے؟

سیدھا راستہ وہ ہے جس میں موڑ نہ ہوں، اور مراد اس سے دِین کا وہ راستہ ہے جس میں اِفراط وتفریط نہ ہو،

''اِفراط'' کے معنی حد سے آگے بڑھنا اور ''تفریط'' کے معنی کوتاہی کرنا، پھر اس کے بعد کی دو آیتوں میں اُس صراطِ مستقیم کا پتہ دِیا گیا ہے جس کی دُعا اس آیت میں تلقین کی گئی ہے۔

اِرشاد ہوتا ہے: صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی ''راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے اِنعام فرمایا'' اور وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا اِنعام ہوا ان کی تفصیل ایک دُوسری آیت میں اس طرح آئی ہے: اَلَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (النساء:۶۹) یعنی ''وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا اِنعام ہوا، یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین'' مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کے یہ چار درجات ہیں جن میں سب سے اعلیٰ انبیاء علیہم السلام ہیں، اور صدیقین وہ لوگ ہیں جو اَنبیاء کی اُمت میں سب سے زیادہ رُتبے کے ہوتے ہیں، جن میں کمالاتِ باطنی بھی ہوتے ہیں، عرف میں اُن کو اولیاء کہا جاتا ہے، شہداء وہ ہیں جنھوں نے دِین کی محبت میں اپنی جان تک دے دی، اور صلحاء وہ ہیں جو شریعت کے پورے متبع ہوتے ہیں، واجبات میں بھی، مستحبات میں بھی، جن کو عرف میں نیک دِین دار کہا جاتا ہے۔

اس آیت میں پہلے مثبت اور اِیجابی طریق سے صراطِ مستقیم کو متعین کیا گیا ہے کہ ان چار طبقوں کے حضرات جس راستے پر چلیں وہ صراطِ مستقیم ہے، اس کے بعد آخری آیت میں سلبی اور منفی صورت سے اس کی تعیین کی گئی ہے، ارشاد ہے:-

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ یعنی ''نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستے سے گم ہوگئے۔'' مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے وہ لوگ مراد ہیں جو دِین کے اَحکام کو جاننے پہچاننے کے باوجود شرارت یا نفسانی اَغراض کی وجہ سے اُن کی خلاف ورزی کرتے ہیں، یا دُوسرے لفظوں میں اَحکامِ اِلٰہیہ کی تعمیل میں کوتاہی (یعنی تفریط) کرتے ہیں، جیسے عام طور پر یہود کا حال تھا کہ دُنیا کے ذلیل مفاد کی خاطر دِین کو قربان کرتے اور اَنبیاء کی توہین کرتے تھے۔ اور ضَآلِّيْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ناواقفیت اور جہالت کے سبب دِین کے معاملے میں غلط راستے پر پڑ گئے، اور دِین کی مقرّرہ حدود سے نکل کر اِفراط اور غلوّ میں مبتلا ہوگئے، جیسے عام طور پر نصاریٰ تھے کہ نبی کی تعظیم میں اتنے بڑھے کہ انہیں کو خدا بنالیا، ایک طرف یہ ظلم کہ اللہ کے انبیاء کی بات نہ مانیں، اُنہیں قتل تک کرنے سے گریز نہ کریں، اور دُوسری طرف یہ زیادتی کہ ان کو خدا بنالیں۔

آیت کا حاصلِ مطلب یہ ہوا کہ ہم وہ راستہ نہیں چاہتے جو اَغراضِ نفسانی کے تابع بدعمل اور دِین میں تفریط کرنے والوں کا ہے، اور نہ وہ راستہ چاہتے ہیں جو جاہل گمراہ اور دِین میں غلوّ (اِفراط) کرنے والوں کا ہے، بلکہ اُن کے درمیان کا سیدھا راستہ چاہتے ہیں جس میں نہ اِفراط ہے نہ تفریط، اور جو شہوات اور اَغراضِ نفسانی کے اِتباع سے نیز شبہات اور عقائدِ فاسدہ سے پاک ہے۔

سورۂ فاتحہ کی ساتوں آیات کی تفسیر ختم ہوگئی، اس پوری سورت کا خلاصہ اور حاصلِ مطلب یہ دُعا ہے کہ یا اللہ!

ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما، اور چونکہ دُنیا میں صراطِ مستقیم کا پہچاننا ہی سب سے بڑا علم اور بڑی کامیابی ہے، اور اسی کی پہچان میں غلطی ہونے سے اَقوامِ عالم تباہ ہوتی ہیں، ورنہ خدا طلبی اور اس کے لئے مجاہدات کی تو بہت سے کفار میں بھی کوئی کمی نہیں، اسی لئے قرآن نے صراطِ مستقیم کو پوری وضاحت کے ساتھ ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں سے واضح فرمایا ہے۔

صراطِ مستقیم کتابُ اللہ اور رِجالُ اللہ دونوں کے مجموعہ سے ملتا ہے

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے اور اس میں غور کرنے سے ایک بڑے علم کا دروازہ کھلتا ہے، وہ یہ کہ صراطِ مستقیم کی تعیین کے لئے بظاہر صاف بات یہ تھی کہ ''صراط الرسول'' یا ''صراط القرآن'' فرمادیا جاتا جو مختصر بھی تھا اور واضح بھی، کیونکہ پورا قرآن درحقیقت صراطِ مستقیم کی تشریح ہے، اور پوری تعلیماتِ رسول اسی کی تفصیل، لیکن قرآن کی اس مختصر سورت میں اِختصار اور وضاحت کے اس پہلو کو چھوڑ کر صراطِ مستقیم کی تعیین کے لئے اللہ تعالیٰ نے مستقل دو آیتوں میں ایجابی اور سلبی پہلوؤں سے صراطِ مستقیم کو اس طرح متعین فرمایا کہ اگر سیدھا راستہ چاہتے ہو تو ان لوگوں کو تلاش کرو اور ان کے طریق کو اِختیار کرو، قرآنِ کریم نے اس جگہ نہ یہ فرمایا کہ قرآن کا راستہ اِختیار کرو، کیونکہ محض کتاب اِنسانی تربیت کے لئے کافی نہیں، اور نہ یہ فرمایا کہ رسول کا راستہ اِختیار کرو، کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بقاء اس دُنیا میں دائمی نہیں، اور آپ کے بعد کوئی دُوسرا رسول اور نبی نہیں، اس لئے صراطِ مستقیم جن لوگوں کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے اُن میں نبیین کے علاوہ ایسے حضرات بھی شامل کردیئے گئے جو تا قیامت ہمیشہ موجود رہیں گے، مثلاً صدیقین، شہداء اور صالحین۔

خلاصہ یہ ہے کہ سیدھا راستہ معلوم کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے کچھ رِجال اور اِنسانوں کا پتہ دیا، کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا، ایک حدیث میں ہے کہ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو خبر دی کہ پچھلی اُمتوں کی طرح میری اُمت بھی ستر فرقوں میں بٹ جائے گی، اور صرف ایک جماعت ان میں حق پر ہوگی، تو صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ وہ کونسی جماعت ہے؟ اس پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا ہے اس میں بھی کچھ رِجالُ اللہ ہی کا پتہ دیا گیا ہے، فرمایا: ''مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ'' یعنی حق پر وہ جماعت ہوگی جو میرے اور میرے صحابہؓ کے طرز پر ہو۔[1]

اس خاص طرز میں شاید اس کی طرف اشارہ ہو کہ اِنسان کی تعلیم و تربیت محض کتابوں اور روایتوں سے نہیں ہوسکتی، بلکہ رِجالِ ماہرین کی صحبت اور ان سے سیکھ کر حاصل ہوتی ہے، یعنی درحقیقت اِنسان کا معلم اور مربی اِنسان ہی ہوسکتا ہے، محض کتاب معلم اور مربی نہیں ہوسکتی، بقول اکبر مرحوم ؎

---

[1] جامع الترمذی، ابواب الإیمان، باب إفتراق ھذہ الاُمّۃ ج:۲ ص:۹۲

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں

آدمی، آدمی بناتے ہیں

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو دُنیا کے تمام کاروبار میں مشاہد ہے کہ محض کتابی تعلیم سے نہ کوئی کپڑا سینا سیکھ سکتا ہے، نہ کھانا پکانا، نہ ڈاکٹری کی کتاب پڑھ کر کوئی ڈاکٹر بن سکتا ہے، نہ انجینئری کی کتابوں کے محض مطالعے سے کوئی انجینئر بنتا ہے، اسی طرح قرآن وحدیث کا محض مطالعہ اِنسان کی تعلیم اور اَخلاقی تربیت کے لئے ہرگز کافی نہیں ہوسکتا، جب تک اس کو کسی محقق ماہر سے باقاعدہ حاصل نہ کیا جائے۔ قرآن وحدیث کے معاملے میں بہت سے لکھے پڑھے آدمی اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ محض ترجمے یا تفسیر دیکھ کر وہ قرآن کے ماہر ہوسکتے ہیں، یہ بالکل فطرت کے خلاف تصوّر ہے، اگر محض کتاب کافی ہوتی تو رسولوں کے بھیجنے کی ضرورت نہ تھی، کتاب کے ساتھ رسول کو معلم بنا کر بھیجنا اور صراطِ مستقیم کو متعین کرنے کے لئے اپنے مقبول بندوں کی فہرست دینا، اس کی دلیل ہے کہ محض کتاب کا مطالعہ تعلیم وتربیت کے لئے کافی نہیں، بلکہ کسی ماہر سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔

معلوم ہوا کہ اِنسان کی صلاح وفلاح کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک کتابُ اللہ جس میں اِنسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلقہ اَحکام موجود ہیں، دُوسرے رِجالُ اللہ، یعنی اللہ والے، ان سے اِستفادے کی صورت یہ ہے کہ کتابُ اللہ کے معروف اُصول پر رِجالُ اللہ کو پرکھا جائے، جو اس معیار پر نہ اُتریں، ان کو رِجالُ اللہ ہی نہ سمجھا جائے، اور جب رِجالُ اللہ صحیح معنی میں حاصل ہوجائیں تو ان سے کتابُ اللہ کا مفہوم سیکھنے اور عمل کرنے کا کام لیا جائے۔

فرقہ وارانہ اِختلافات کا بڑا سبب

یہی ہے کہ کچھ لوگوں نے صرف کتابُ اللہ کو لے لیا، رِجالُ اللہ سے قطع نظر کرلی، اُن کی تفسیر وتعلیم کو کوئی حیثیت نہ دی، اور کچھ لوگوں نے صرف رِجالُ اللہ کو معیارِ حق سمجھ لیا، اور کتابُ اللہ سے آنکھ بند کرلی، اور ان دونوں طریقوں کا نتیجہ گمراہی ہے۔

سورۂ فاتحہ کے متعلق اَحکام ومسائل

سورۂ فاتحہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ہے، پھر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کا اِقرار اور اس کا اِظہار ہے کہ ہم اس کے سوا کسی کو اپنا حاجت روا نہیں سمجھتے، یہ گویا حلفِ وفاداری ہے جو اِنسان اپنے رَبّ کے ساتھ کرتا ہے، اس کے بعد پھر ایک اہم دُعا ہے جو تمام اِنسانی مقاصد وضروریات پر حاوی ہے، اور اس میں بہت سے فوائد اور مسائل ضمنی آئے ہیں، ان میں سے چند اہم مسائل کو لکھا جاتا ہے۔

دُعا کرنے کا طریقہ

۱- اس خاص اُسلوبِ کلام کے ذریعہ اِنسان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب اللہ جل شانہٗ سے کوئی دُعا و درخواست کرنا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کی حمد و ثنا کا فرض بجالا کر پھر حلفِ وفاداری اس بات کا کرو کہ ہم اس کے سوا نہ کسی کو لائقِ عبادت سمجھتے ہیں اور نہ کسی کو حقیقی معنی میں مشکل کشا اور حاجت رَوا مانتے ہیں، اس کے بعد اپنے مطلب کی دُعا کرو، اس طریقہ سے جو دُعا کی جائے گی اس کے قبول ہونے کی قوی اُمید ہے۔ (اَحکام بصاص) [1]

اور دُعا میں بھی ایسی جامع دُعا اِختیار کرو جس میں اِختصار کے ساتھ اِنسان کے تمام مقاصد داخل ہو جائیں، جیسے ہدایتِ صراطِ مستقیم کہ دُنیا و دِین کے ہر کام میں اگر اِنسان کا راستہ سیدھا ہو جائے تو کہیں ٹھوکر لگنے اور نقصان پہنچنے کا خطرہ نہیں رہتا، غرض اس جگہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے اپنی حمد و ثنا بیان کرنے کا اصل مقصد اِنسان کو تعلیم دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اِنسان کا فطری فرض ہے

۲- اس سورت کے پہلے جملے میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنے کی تعلیم و ترغیب ہے، مگر حمد کسی نعمت یا صفت کی بنا پر ہوا کرتی ہے، یہاں کسی نعمت یا صفت کا ذِکر نہیں، اس میں اِشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں، اُن کا کوئی اِنسان احاطہ نہیں کر سکتا، جیسا کہ قرآنِ کریم کا اِرشاد ہے: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا (ابراہیم: ۳۴) یعنی ''اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔'' اِنسان اگر سارے عالم کو چھوڑ کر اپنے ہی وجود پر نظر ڈال لے تو معلوم ہوگا کہ اس کا وجود خود ایک عالمِ اصغر ہے، جس میں عالمِ اکبر کے سارے نمونے موجود ہیں، اس کا بدن زمین کی مثال ہے، اُس پر اُگنے والے بال نباتات کی مثال ہیں، اُس کی ہڈیاں پہاڑوں کی شبیہ ہیں، اس کے بدن کی رگیں جس میں خون رواں ہے زمین کے نیچے بہنے والے چشموں اور نہروں کی مثال ہیں۔

اِنسان دو جزء سے مرکب ہے، ایک بدن، دُوسرے رُوح، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قدر و قیمت کے اِعتبار سے رُوح اصل، اعلیٰ اور افضل ہے، بدن محض اس کے تابع اور ادنیٰ درجہ رکھتا ہے، اس ادنیٰ جزء کے متعلق بدنِ اِنسان کی تحقیق کرنے والے اطباء اور اہلِ تشریح نے بتلایا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے تقریباً پانچ ہزار مصالح اور منافع رکھے ہیں، اس کے بدن میں تین سو سے زیادہ جوڑ ہیں، ہر ایک جوڑ کو اللہ تعالیٰ ہی کی قدرتِ کاملہ نے ایسا مستحکم بنایا ہے کہ ہر وقت کی حرکت کے باوجود نہ وہ گھستا ہے، نہ اس کی مرمت کی ضرورت ہوتی ہے، عادۃً اِنسان کی عمر ساٹھ ستر سال ہوتی ہے، پوری عمر اس کے یہ نرم و نازک اعضاء اور اُن کے سب جوڑ اکثر اوقات اس طرح حرکت میں رہتے ہیں کہ فولاد بھی ہوتا تو گھس جاتا، مگر

---

[1] احکام القرآن ج:۱ ص:۲۳

حق تعالیٰ نے فرمایا: نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ (الدہر: ۲۸) یعنی ''ہم نے ہی اِنسان کو پیدا کیا، اور ہم نے ہی اس کے جوڑ بند مضبوط کئے۔'' اسی قدرتی مضبوطی کا نتیجہ ہے کہ عام عادت کے مطابق یہ نرم و نازک جوڑ ستر برس اور اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کام دیتے ہیں، اِنسانی اعضاء میں سے صرف ایک آنکھ ہی کو لے لیجئے، اس میں جو اللہ تعالیٰ جل شانہ' کی حکمتِ بالغہ کے مظاہر موجود ہیں، اِنسان کو عمر بھر خرچ کر کے بھی اُن کا پورا اِدراک آسان نہیں۔

پھر اس آنکھ کے صرف ایک مرتبہ کے عمل کو دیکھ کر یہ حساب لگائیے کہ اس ایک منٹ کے عمل میں حق تعالیٰ کی کتنی نعمتیں کام کر رہی ہیں تو حیرت ہوتی ہے، کیونکہ آنکھ اُٹھی اور اس نے کسی چیز کو دیکھا، اس میں جس طرح آنکھ کی اندرونی طاقتوں نے عمل کیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بیرونی مخلوقات کا اس میں بڑا حصہ ہے، اگر آفتاب کی روشنی نہ ہو تو آنکھ کے اندر کی روشنی کام نہیں دے سکتی، پھر آفتاب کے لئے بھی ایک فضا کی ضرورت ہوتی ہے، اِنسان کے دیکھنے اور آنکھ کو کام میں لانے کے لئے غذا، ہوا وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ نظر اُٹھ کر جو کچھ دیکھتی ہے اس میں پورے عالم کی طاقتیں کام کرتی ہیں، یہ ایک مرتبہ کا عمل ہوا، پھر آنکھ دن میں کتنی مرتبہ دیکھتی اور سال میں کتنی مرتبہ، عمر میں کتنی مرتبہ، یہ ایسا سلسلہ ہے جس کے اَعداد و شمار اِنسانی طاقت سے خارج ہیں۔

اسی طرح کان، زبان، ہاتھ، پاؤں کے جتنے کام ہیں اُن سب میں پورے عالم کی قوتیں شامل ہو کر کام پورا ہوتا ہے، یہ تو وہ نعمت ہے جو ہر زِندہ اِنسان کو میسر ہے، اُس میں شاہ و گدا، امیر و غریب کا کوئی اِمتیاز نہیں، اور اللہ جل شانہ' کی بڑی بڑی نعمتیں سب ایسی ہی وقفِ عام ہیں کہ ہر فردِ اِنسانی اُن سے نفع اُٹھاتا ہے، آسمان، زمین ان دونوں میں اور اُن کے درمیان پیدا ہونے والی تمام کائنات، چاند، سورج، ثوابت اور سیارے، ہوا، فضا کا نفع ہر جاندار کو پہنچ رہا ہے۔

اس کے بعد اللہ جل شانہ' کی نعمائے خاصہ جو اِنسان کے اَفراد میں بتقاضائے حکمت کم و بیش کر کے عطا ہوتی ہیں، مال اور دولت، عزّت اور جاہ، راحت اور آرام سب اسی قسم میں داخل ہیں، اور اگرچہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ نعمائے عامہ جو تمام اِنسانوں میں مساوی طور پر مشترک ہیں، جیسے آسمان، زمین اور ان کی تمام مخلوقات یہ نعمتیں بہ نسبت نعمائے خاصہ مال، دولت وغیرہ کے زیادہ اہم اور اَشرف ہیں، مگر بھولا بھالا اِنسان تمام اَفرادِ اِنسان میں عام ہونے کی بنا پر کبھی ان عظیم الشان نعمتوں کی طرف اِلتفات بھی نہیں کرتا ہے کہ یہ کوئی نعمت ہے، صرف گرد و پیش کی معمولی چیزیں، کھانے پینے، رہنے سہنے کی خصوصی چیزوں ہی پر اس کی نظر رُک جاتی ہے۔

بہرحال یہ ایک سرسری نمونہ ہے اُن نعمتوں کا جو ہر اِنسان پر ہر وقت مبذول ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی چاہئے کہ اِنسان اپنی مقدور بھر ان اِحسانات و اِنعامات کرنے والے کی حمد و ثنا کرے، اور کرتا رہے، اسی کے تقاضائے

فطرت کی تلقین کے لئے قرآن کی سب سے پہلی سورت کا سب سے پہلا کلمہ اَلْحَمْدُ لایا گیا ہے، اور اللہ کی حمد وثنا کو عبادت میں بڑا درجہ دیا گیا ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو کوئی نعمت عطا فرمائیں اور وہ اس پر "الحمد للہ" کہے تو ایسا ہو گیا کہ گویا جو کچھ اس نے لیا ہے اس سے افضل چیز دے دی۔ (قرطبی از ابنِ ماجہ بروایت انسؓ) [۱]

ایک دُوسری حدیث میں ہے کہ "اگر ساری دُنیا کی نعمتیں کسی ایک شخص کو حاصل ہو جائیں اور وہ اس پر "الحمد للہ" کہہ لے تو یہ "الحمد للہ" اُن ساری دُنیا کی نعمتوں سے افضل ہے۔" قرطبیؒ نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "الحمد للہ" زبان سے کہنا بھی اللہ ہی کی ایک نعمت ہے، اور یہ نعمت ساری دُنیا کی نعمتوں سے افضل ہے۔ اور حدیثِ صحیح میں ہے کہ "الحمد للہ" سے میزانِ عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے، [۲] اور "حمد" کی حقیقت حضرت شقیق بن ابراہیمؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی چیز عطا فرمائے تو اوّل اس کے دینے والے کو پہچانو، پھر جو کچھ اس نے دیا ہے اس پر راضی ہو جاؤ، پھر جب تک تمہارے جسم میں اس کی عطا کی ہوئی قوت موجود ہے، اس کی نافرمانی کے قریب نہ جاؤ۔ (قرطبی) [۳]

دُوسرا کلمہ لِلّٰهِ ہے، اِس میں لفظ "اللہ" کے ساتھ شروع میں حرفِ لام لگا ہوا ہے، جس کو عربیت کے قاعدے سے لامِ اختصاص کہا جاتا ہے، جو کسی حکم یا وصف کی خصوصیت پر دَلالت کرتا ہے، اِس جگہ معنی یہ ہیں کہ صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اِنسان کا فرض ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حمد وثنا صرف اُسی کی ذاتِ قدوس کے ساتھ مخصوص ہے، حقیقی طور پر اس کے سوا عالم میں کوئی مستحق حمد وثنا کا نہیں ہوسکتا، جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، ہاں اس کے ساتھ یہ بھی اس کا اِنعام ہے کہ اِنسان کو تہذیبِ اخلاق سکھانے کے لئے اس کو یہ بھی حکم دے دیا کہ میری نعمت و اِحسان جن واسطوں سے تمہارے ہاتھ آئے ان کا بھی شکر اَدا کرو، کیونکہ جو شخص اپنے محسن اِنسان کا شکر اَدا کرنے کا خوگر نہ ہو وہ خدا کا بھی شکر ادا نہیں کرے گا۔

خود اپنی مدح وثنا کسی اِنسان کے لئے جائز نہیں

۳- خود اپنی حمد وثنا کا بیان کرنا کسی مخلوق کے لئے جائز نہیں، قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:-

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ؀ (النجم)

"یعنی تم اپنی پاکی اور صفائی کا دعویٰ نہ کرو، اللہ ہی جانتا ہے کہ کون تقویٰ شعار ہے۔"

---

[۱] ابن ماجة، ابواب الأدب، باب فضل الحامدين ج:۲ ص:۲۷۰

[۲] صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب فضل الوضوء ج:۱ ص:۱۱۸

[۳] تفسير القرطبي تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۱۳۴

مطلب یہ ہے کہ انسان کی تعریف اور مدح کا مدار تقویٰ پر ہے، اور اس کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کا تقویٰ کس درجے کا ہے، اور حق تعالیٰ نے جو اپنی حمد وثنا خود بیان فرمائی، اس کی وجہ یہ ہے کہ بیچارہ انسان اس کی اِستعداد نہیں رکھتا کہ بارگاہِ عزّت وجلال کی حمد وثنا کیسے بیان کرے، اور کسی کی تو کیا مجال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان حمد وثنا کر سکے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ" یعنی "میں آپ کی ثنا کما حقہٗ نہیں کر سکتا۔" [۱] اس لئے اللہ جل شانہٗ نے خود ہی حمد وثنا کا طریقہ انسان کو تعلیم فرمادیا۔

لفظ "رَبّ" اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے، غیر اللہ کو رَبّ کہنا جائز نہیں

۴- لفظ "رَبّ" کو ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی چیز کا مالک ہو اور اس کی تربیت واِصلاح کی تدبیر اور پوری نگرانی بھی کرتا ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ ساری کائنات ومخلوقات کا ایسا رَبّ سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہوسکتا، اس لئے یہ لفظ اپنے اِطلاق کے وقت حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، غیر اللہ کو "رَبّ" کہنا جائز نہیں، صحیح مسلم کی حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے کہ کوئی غلام یا نوکر اپنے آقا کو "رَبّ" کہے، البتہ کسی خاص چیز کی طرف اِضافت کرکے اِنسان وغیرہ کے لئے یہ بھی لفظ بولا جاسکتا ہے مثلاً "رَبُّ الْمَالِ، رَبُّ الدَّارِ" وغیرہ۔ (قرطبی) [۲]

اِستعانت کے معنی کی تشریح اور مسئلۂ توسل کی تحقیق

۵- اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کے معنی مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، تیرے سوا کسی سے نہیں مانگتے۔ (ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ) [۳]

بعض سلف صالحینؒ نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ پورے قرآن کا راز (خلاصہ) ہے، اور آیت اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ پوری سورۂ فاتحہ کا راز (خلاصہ) ہے، کیونکہ اس کے پہلے جملے میں شرک سے بری ہونے کا اِعلان ہے، اور دُوسرے جملے میں اپنی قوّت وقدرت سے بری ہونے کا اِظہار ہے کہ بندہ عاجز بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد کے کچھ نہیں کرسکتا، جس کا نتیجہ اپنے سب کاموں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے، جس کی ہدایت قرآنِ کریم میں جابجا آئی ہے: فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ

---

[۱] جامع الترمذی، ابواب الدعوات، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید ج:۲ ص:۱۸۶

[۲] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۱۳۶، ۱۳۷

[۳] تفسیر ابن ابی حاتم رقم الحدیث:۲۷

عَلَيۡهِ ۚ (ہود: ۱۲۳)، [۱] قُلۡ هُوَ الرَّحۡمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيۡهِ تَوَكَّلۡنَا ۚ (الملک: ۲۹)، [۲] رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذۡهُ وَكِيۡلًا ۝۹ (المزمل) [۳]

ان تمام آیات کا حاصل یہی ہے کہ مؤمن اپنے ہر عمل میں اعتماد اور بھروسہ نہ اپنی قابلیت پر کرے، نہ کسی دُوسرے کی مدد پر بلکہ کلی اِعتماد صرف اللہ تعالیٰ ہی پر ہونا چاہئے، وہی کارسازِ مطلق ہے۔

اس سے دو مسئلے اُصولِ عقائد کے ثابت ہوئے، اوّل یہ کہ:-

اللہ کے سوا کسی کی عبادت روا نہیں، اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا حرام اور ناقابلِ معافی جرم ہے

عبادت کے معنی اُوپر معلوم ہوچکے ہیں کہ کسی ذات کی اِنتہائی عظمت ومحبت کی بنا پر اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی اور تذلل کا اِظہار ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے تو یہی شرک کہلاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شرک صرف اِسی کو نہیں کہتے کہ بت پرستوں کی طرح کسی پتھر کی مورتی وغیرہ کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھے، بلکہ کسی کی عظمت، محبت، اِطاعت کو وہ درجہ دینا جو اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے، یہ بھی شرکِ جلی میں داخل ہے، قرآن مجید میں یہود ونصاریٰ کے شرک کا بیان کرتے ہوئے اِرشاد فرمایا ہے:-

اِتَّخَذُوۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (التوبة: ۳۱)

''یعنی ان لوگوں نے اپنے دِینی عالموں کو اپنا رَبّ بنالیا ہے۔''

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ جو مسلمان ہونے سے پہلے نصرانی تھے، انہوں نے اِس آیت کے بارے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم تو اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے، پھر قرآن میں ان کو معبود بنانے کا اِلزام ہم پر کیسے لگایا گیا، آپ نے فرمایا: کیا ایسا نہیں ہے کہ تمہارے علماء بہت سی ایسی چیزوں کو حرام قرار دے دیتے ہیں جن کو اللہ نے حلال کیا ہے، اور تم اپنے علماء کے کہنے پر ان کو حرام ہی سمجھتے ہو، اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے، تمہارے علماء ان کو حلال کردیتے ہیں، تو تم ان کے کہنے کا اِتباع کرکے حلال کرلیتے ہو۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ: بیشک ایسا تو ہے، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو اُن کی عبادت ہے۔ [۴]

---

[۱] ترجمہ:- لہٰذا (اے پیغمبر!) اُس کی عبادت کرو، اور اُس پر بھروسہ رکھو۔

[۲] ترجمہ:- کہہ دو کہ: وہ رحمٰن ہے، ہم اس پر اِیمان لائے ہیں، اور اسی پر ہم نے بھروسہ کیا ہے۔

[۳] ترجمہ:- وہ مشرق ومغرب کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس لئے اُسی کو کارساز بنالو۔

[۴] المعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث: ۱۳۶۷۳

اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے حلال یا حرام قرار دینے کا حق صرف حق تعالیٰ کا ہے، جو شخص اس میں کسی دوسرے کو شریک قرار دے اور اللہ تعالیٰ کے اَحکامِ حرام و حلال معلوم ہونے کے باوجود ان کے خلاف کسی دُوسرے کے قول کو واجب الاتباع سمجھے وہ گویا اس کی عبادت کرتا ہے اور شرک میں مبتلا ہے۔

عام مسلمان جو قرآن و سنت کو براہِ راست سمجھنے کی اور ان سے اَحکامِ شرعیہ نکالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لئے کسی اِمام، مجتہد یا عالم و مفتی کے قول پر اِعتماد کر کے عمل کرتے ہیں، اُس کا اِس آیت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ وہ درحقیقت قرآن و سنت ہی پر عمل ہے اور اَحکامِ خداوندی ہی کی اِطاعت ہے، اور خود قرآنِ کریم نے اس کی ہدایت فرمائی ہے:-

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾ (النحل)

''یعنی اگر تم خود اَحکامِ اِلٰہیہ کو نہیں جانتے، تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔''

اور جس طرح اَحکامِ حلال و حرام میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو شریک کرنا شرک ہے، اسی طرح کسی کے نام کی نذر (منّت) ماننا بھی شرک میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دُوسرے کو حاجت رَوا، مشکل کشا سمجھ کر اُس سے دُعا مانگنا بھی شرک ہے، کیونکہ حدیث میں دُعا کو عبادت فرمایا گیا ہے۔

اسی طرح ایسے اعمال و افعال جو علاماتِ شرک کی سمجھے جاتے ہیں ان کا ارتکاب بھی بحکمِ شرک ہے، جیسے حضرت عدی بن حاتمؓ نے فرمایا کہ (مسلمان ہونے کے بعد) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی، آپ نے مجھ سے فرمایا کہ اس بت کو اپنے گلے سے نکال دو۔[1]

اگرچہ اُس وقت عدی بن حاتمؓ کا عقیدہ صلیب کے متعلق وہ نہ تھا جو نصرانیوں کا ہوتا ہے، مگر ظاہری طور پر بھی علامتِ شرک سے اِجتناب کو ضروری سمجھ کر یہ ہدایت کی گئی۔ افسوس کہ آج کل ہزاروں مسلمان ریڈ کراس کا صلیبی نشان لگائے ہوئے پھرتے ہیں، اور کوئی پروا نہیں کرتے کہ بلاوجہ ایک مشرکانہ جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اسی طرح کسی کو رُکوع، سجدہ کرنا، یا بیت اللہ کے سوا کسی دُوسری چیز کے گرد طواف کرنا، یہ سب علاماتِ شرک ہیں جن سے اِجتناب اِیَّاكَ نَعْبُدُ کے اِقرار یا حلفِ وفاداری کا جزء ہے۔ دُوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اِستعانت اور اِستغاثہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے کرنا ہے، کسی دُوسرے سے جائز نہیں۔

مسئلۂ اِستعانت و توسل کی تحقیق اور اَحکام کی تفصیل

یہ دُوسرا مسئلہ کسی سے مدد مانگنے کا ذرا تشریح طلب ہے، کیونکہ ایک مدد تو مادّی اسباب کے ماتحت ہر اِنسان

[1] جامع الترمذی، ابواب التفسیر ومن سورة التوبة ج:۲ ص:۱۴۰

دُوسرے اِنسان سے لیتا ہے، اس کے بغیر اس دُنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا، صنعت کار اپنی صنعت کے ذریعہ ساری مخلوق کی خدمت کرتا ہے، مزدور، معمار، بڑھئی، لوہار سب مخلوق کی مدد میں لگے ہوئے ہیں، اور ہر شخص ان سے مدد لینے مانگنے پر مجبور ہے، ظاہر ہے کہ یہ کسی دِین اور شریعت میں ممنوع نہیں، وہ اُس اِستعانت میں داخل نہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، اسی طرح غیر مادّی اسباب کے ذریعہ کسی نبی یا ولی سے دُعا کرنے کی مدد مانگنا یا ان کا وسیلہ دے کر براہِ راست اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنا روایاتِ حدیث اور اِرشاداتِ قرآن سے اس کا بھی جواز ثابت ہے، وہ بھی اُس اِستعانت میں داخل نہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص اور غیر اللہ کے لئے حرام اور شرک ہے۔

اب وہ مخصوص اِستعانت و اِمداد جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور غیر اللہ کے لئے شرک ہے، کونسی ہے؟ اس کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی اور اِنسان کو خدا تعالیٰ کی طرح قادرِ مطلق اور مختارِ مطلق سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے، یہ تو ایسا کھلا ہوا کفر ہے کہ عام مشرکین بت پرست بھی اس کو کفر سمجھتے ہیں، اپنے بتوں، دیوتاؤں کو بالکل خدا تعالیٰ کی مثل قادرِ مطلق اور مختارِ مطلق یہ کفار بھی نہیں مانتے۔

دُوسری قسم وہ ہے جس کو کفار اِختیار کرتے ہیں، اور قرآن اور اِسلام اس کو باطل و شرک قرار دیتا ہے، اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں یہی مراد ہے کہ ایسی اِستعانت و اِمداد ہم اللہ کے سوا کسی سے نہیں چاہتے، وہ یہ ہے کہ اللہ کی کسی مخلوق فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی دیوتا کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ اگرچہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور کامل اِختیارات اسی کے ہیں، لیکن اس نے اپنی قدرت و اِختیار کا کچھ حصہ فلاں شخص کو سونپ دیا ہے، اور اُس دائرے میں وہ خود مختار ہے، یہی وہ اِستعانت و اِستمداد ہے جو مؤمن و کافر میں فرق اور اِسلام و کفر میں اِمتیاز کرتی ہے، قرآن اس کو شرک و حرام قرار دیتا ہے، بت پرست مشرکین اس کے قائل اور اس پر عامل ہیں۔

اس معاملے میں دھوکا یہاں سے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے فرشتوں کے ہاتھوں دُنیوی نظام کے بہت سے کام جاری کرتے ہیں، دیکھنے والا اس مغالطے میں پڑ سکتا ہے کہ اس فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے یہ اِختیار سپرد کر دیا ہے، یا انبیاء علیہم السلام کے ذریعے بہت سے ایسے کام وجود میں آتے ہیں جو عام اِنسانوں کی قدرت سے خارج ہیں، جن کو "معجزات" کہا جاتا ہے، اسی طرح اولیاء اللہ کے ذریعے بھی ایسے ہی بہت سے کام وجود میں آتے ہیں جن کو "کرامات" کہا جاتا ہے، یہاں سرسری نظر والوں کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کاموں کی قدرت و اِختیار ان کو سپرد نہ کرتا تو اُن کے ہاتھ سے یہ کیسے وجود میں آتے؟ اس سے وہ ان انبیاء و اولیاء کے ایک درجے میں مختار کار ہونے کا عقیدہ بنا لیتے ہیں، حالانکہ حقیقت یوں نہیں، بلکہ معجزات اور کرامات براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، صرف اس کا ظہور پیغمبر یا ولی کے ہاتھوں پر ان کی عظمت ثابت کرنے کے لئے کیا جاتا ہے، پیغمبر اور ولی کو اس کے وجود میں لانے کا کوئی اِختیار نہیں ہوتا،

قرآن مجید کی بے شمار آیات اس پر شاہد ہیں، مثلاً آیت: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ (الانفال: ١٧) میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزے کا ذِکر ہے جس میں آپ نے دُشمن کے لشکر کی طرف ایک مٹھی کنکریوں کی پھینکی، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ سارے لشکر کی آنکھوں میں جا لگیں، اس کے متعلق اِرشاد ہے کہ "یہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی"، جس سے معلوم ہوا کہ معجزہ جو نبی کے واسطے سے صادر ہوتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کو جب اُن کی قوم نے کہا کہ اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب سے ڈرا رہے ہیں وہ بلا لیجئے، تو انہوں نے فرمایا: اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ (ہود: ٣٣) یعنی "معجزہ کے طور پر آسمانی عذاب نازل کرنا میرے قبضے میں نہیں، اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو یہ عذاب آجائے گا، پھر تم اس سے بھاگ نہ سکو گے۔"

سورۂ اِبراہیم میں انبیاء ورُسل کی ایک جماعت کا یہ قول ذِکر فرمایا ہے: وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ (اِبراہیم: ١١) یعنی "کسی معجزہ کا صادر کرنا ہمارے ہاتھ میں نہیں، اللہ تعالیٰ کے اِذن ومشیت کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔"

اسی وجہ سے کوئی پیغمبر یا کوئی ولی جب چاہے جو چاہے معجزہ یا کرامت دِکھادے، یہ قطعاً کسی کے بس میں نہیں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دُوسرے انبیاء سے بہت سے معین معجزات کا مطالبہ مشرکین نے کیا، مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے چاہا ظاہر کردیا، جس کو نہ چاہا نہیں ہوا، پورا قرآن اس کی شہادتوں سے بھرا ہوا ہے۔

ایک محسوس مثال سے اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ آپ جس کمرے میں بیٹھے ہیں اس میں بجلی کی روشنی بلب سے اور ہوا برقی پنکھے سے آپ کو پہنچ رہی ہے، مگر یہ بلب اور پنکھا اس روشنی اور ہوا پہنچانے میں قطعاً خودمختار نہیں، بلکہ ہر آن اس جوڑ (کنکشن) کے محتاج ہیں جو تار کے ذریعے پاور ہاؤس کے ساتھ اُن کو حاصل ہے، ایک سیکنڈ کے لئے یہ جوڑ ٹوٹ جائے تو نہ بلب آپ کو روشنی دے سکتا ہے، نہ پنکھا ہوا دے سکتا ہے، کیونکہ درحقیقت وہ عمل بلب اور پنکھے کا ہے ہی نہیں، بلکہ بجلی کی رَو کا ہے، جو پاور ہاؤس سے یہاں پہنچ رہی ہے۔ انبیاء واولیاء اور سب فرشتے ہر عمل میں، ہر کام میں ہر آن حق تعالیٰ کے محتاج ہیں، اسی کی قدرت ومشیت سے سب کام وجود میں آتے ہیں، اگرچہ ظہور اس کا بلب اور پنکھے کی طرح انبیاء واولیاء کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔

اس مثال سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ ان چیزوں کے صدور اور وجود میں اگرچہ اِختیار انبیاء واولیاء کا نہیں مگر اُن کا وجود باوجود اُن سے بالکل بے دخل بھی نہیں، جیسے بلب اور پنکھے کے بغیر آپ کو روشنی اور ہوا نہیں پہنچ سکتی، یہ معجزات وکرامات بھی انبیاء واولیاء کے بغیر نہیں ملتے، اگرچہ یہ فرق ضرور ہے کہ پوری فٹنگ اور کنکشن کے دُرست ہونے کے باوجود آپ کو بغیر بلب کے روشنی اور بغیر پنکھے کے ہوا کا ملنا عادۃً ناممکن ہے، اور معجزات وکرامات میں حق تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے کہ بغیر واسطہ کسی پیغمبر وولی کے بھی اس کا ظہور فرمادیں، مگر عادۃ اللہ یہی ہے کہ اُن کا صدور بغیر واسطۂ اولیاء وانبیاء کے

نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے خوارقِ عادات کے اظہار سے جو مقصد ہے وہ اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

اس لئے معلوم ہوا کہ عقیدہ تو یہی رکھنا ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت ومشیت سے ہو رہا ہے، اس کے ساتھ انبیاء واولیاء کی عظمت وضرورت کا بھی اعتراف ضروری ہے، اس کے بغیر رضائے الٰہی اور طاعتِ احکامِ خداوندی سے محروم رہے گا، جس طرح کوئی شخص بلب اور پنکھے کی قدر نہ پہچانے اور ان کو ضائع کردے تو روشنی اور ہوا سے محروم رہتا ہے۔

وسیلہ، استعانت اور استمداد کے مسئلے میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے، اُمید ہے کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء واولیاء کو وسیلہ بنانا نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز، بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اُوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو مختارِ مطلق سمجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک وحرام ہے، اور محض واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے، اس میں عام طور پر لوگوں میں افراط وتفریط کا عمل نظر آتا ہے۔

وَاللهَ اَسْاَلُ الصَّوَابَ وَالسَّدَادَ وَبِيَدِهِ الْمَبْدَأُ وَالْمَعَادُ

صراطِ مستقیم کی ہدایت دُنیا ودِین میں کلیدِ کامیابی ہے

۶- اصل تفسیر میں یہ بات وضاحت سے آگئی ہے کہ قرآنِ کریم نے جس دُعا کو ہر شخص کے لئے ہر کام کے لئے ہر حال میں انتخاب فرمایا ہے وہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کی دُعا ہے، جس طرح آخرت کی کامیابی اُس صراطِ مستقیم پر موقوف ہے جو اِنسان کو جنت کی طرف لے جائے، اِسی طرح دُنیا کے سارے کاموں میں بھی غور کرو تو کامیابی کا مدار صراطِ مستقیم ہی ہے، جس کام میں وہ آلات وذرائع اِختیار کئے گئے جس کے نتیجے میں مقصد کا حصول عادۃً لازمی ہے تو کامیابی عادۃً لازمی ہوتی ہے، جہاں کہیں اِنسان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا تو اگر وہ غور کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ کام کے کسی مرحلے میں اس نے غلطی کی ہے، صحیح راستہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، اس لئے ناکامیابی ہوئی۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت صرف آخرت اور دِین کے کاموں کے ساتھ مخصوص نہیں، دُنیا کے سب کاموں کی دُرستی اور کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے، اس لئے یہ دُعا ایسی ہے کہ مؤمن کو ہر وقت حرزِ جان بنانے کے قابل ہے، شرط یہ ہے کہ استحضار اور نیت کے ساتھ کی جائے، محض الفاظ کا پڑھ لینا نہ ہو، وَاللهُ الْمُوَفِّقُ وَالْمُعِيْنُ۔

بعونہٖ تعالیٰ تفسیر سورۂ فاتحہ ختم ہوئی،

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلَهٗ وَآخِرَهٗ وَظَاهِرَهٗ وَبَاطِنَهٗ

سُورَةُ البَقَرَةِ

بسم الله الرحمن الرحيم

سُورَةُ البَقَرَة

نام اور تعدادِ آیات

اس سورت کا نام سورۂ بقرہ ہے، اور اسی نام سے حدیث اور آثارِ صحابہؓ میں اس کا ذِکر موجود ہے، جس روایت میں سورۂ بقرہ کہنے کو منع کیا ہے، وہ صحیح نہیں (ابنِ کثیر) [1]۔ تعدادِ آیات دو سو چھیاسی ہے، اور کلمات چھ ہزار دو سو اکیس اور حروف پچّیس ہزار پانچ سو ہیں۔ (ابنِ کثیر) [2]

زمانۂ نزول

یہ سورت مدنی ہے، یعنی ہجرتِ مدینہ طیبہ کے بعد نازل ہوئی، اگرچہ اس کی بعض آیات مکہ مکرمہ میں حج کے وقت نازل ہوئی ہیں، مگر وہ بھی باصطلاحِ مفسرین مدنی کہلاتی ہیں۔

سورۂ بقرہ قرآنِ کریم کی سب سے بڑی سورت ہے، اور مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے اس کا نزول شروع ہوا، اور مختلف زمانوں میں مختلف آیتیں نازل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ رِبا یعنی سود کے متعلق جو آیات ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں فتحِ مکہ کے بعد نازل ہوئیں، اور اس کی ایک آیت: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللهِ (البقرۃ:۲۸۱) تو قرآن کی بالکل آخری آیت ہے جو ۱۰ھ میں ۱۰؍ذی الحجہ کو منیٰ کے مقام پر نازل ہوئی جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے فرائض ادا کرنے میں مشغول تھے (قرطبی) [3]۔ اور اس کے اَسّی نوّے دِن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور وحیٔ اِلٰہی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۱ ص:۱۵۶ [2] تفسیر ابن کثیر ج:۱ ص:۱۴۹ [3] ج:۱ ص:۱۵۲

فضائل سورۂ بقرہ

یہ قرآنِ کریم کی سب سے بڑی سورت اور بہت سے اَحکام پر مشتمل ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: ''سورۂ بقرہ کو پڑھا کرو، کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے، اور اس کا چھوڑنا حسرت اور بدنصیبی ہے، اور اہلِ باطل اس پر قابو نہیں پاسکتے۔'' [۱]

قرطبی نے حضرت معاویہؓ سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ اہلِ باطل سے مراد جادوگر ہیں، مراد یہ ہے کہ اس سورت کے پڑھنے والے پر کسی کا جادو نہ چلے گا۔ (قرطبی از مسلم بروایت ابواُمامہ باہلیؓ) [۲]

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔ (ابنِ کثیر از حاکم) [۳]

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سورۂ بقرہ سنام القرآن اور ذروۃ القرآن ہے۔'' ''سنام'' اور ''ذروہ'' ہر چیز کے اعلیٰ و افضل حصے کو کہا جاتا ہے، اس کی ہر آیت کے نزول کے وقت اسّی فرشتے اس کے جلو میں نازل ہوئے ہیں (ابنِ کثیر از مسندِ احمد)۔ [۴] اور حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ اس سورت میں ایک آیت ایسی ہے جو تمام آیاتِ قرآن میں اشرف و افضل ہے، اور وہ آیت الکرسی ہے۔ (ابنِ کثیر از ترمذی) [۵]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ: ''سورۂ بقرہ کی دس آیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص اُن کو رات میں پڑھ لے تو اس رات کو جن، شیطان گھر میں داخل نہ ہوگا، اور اس کو اور اس کے اہل و عیال کو اس رات میں کوئی آفت، بیماری، رنج وغم وغیرہ ناگوار چیز پیش نہ آئے گی، اور اگر یہ آیتیں کسی مجنون پر پڑھی جائیں تو اس کو اِفاقہ ہوجائے گا۔'' وہ دس آیتیں یہ ہیں: چار آیتیں شروع سورۂ بقرہ کی، پھر تین آیتیں درمیانی یعنی آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں، پھر آخر سورۂ بقرہ کی تین آیتیں۔ [۶]

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن إلخ، باب فضل قراءة القرآن وسورة البقرة ج:۱ ص:۲۷۰

[۲] بحوالۂ بالا۔

[۳] مستدرك حاكم رقم الحديث:۲۰۶۰، ومسند احمد رقم الحديث:۷۴۸۷

[۴] مسند احمد رقم الحديث:۱۹۴۱۵ وتفسير ابن كثير ج:۱ ص:۱۵۰

[۵] جامع الترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ما جاء فی سورة البقرة وآية الكرسی ج:۲ ص:۱۱۵

[۶] شعب الإيمان رقم الحديث:۲۳۱۴

اَحکام ومسائل

مضامین ومسائل کے اِعتبار سے بھی سورۂ بقرہ کو ایک خاص اِمتیاز حاصل ہے، ابنِ عربیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ سورۂ بقرہ میں ایک ہزار اَمر، اور ایک ہزار نہی، اور ایک ہزار حکمتیں، ایک ہزار خبر اور قصص ہیں (قرطبی وابنِ کثیر)[۱]۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے جب سورۂ بقرہ کو تفسیر کے ساتھ پڑھا تو اس کی تعلیم میں بارہ سال خرچ ہوئے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ سورت آٹھ سال میں پڑھی۔ (قرطبی)[۲]

سورۂ فاتحہ درحقیقت پورے قرآن کا خلاصہ ہے، اس کے بنیادی مضامین تین ہیں: اوّل اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت، یعنی پروردگارِ عالم ہونے کا بیان، دُوسرے اُس کا مستحقِ عبادت ہونا، اور اس کے سوا کسی کا لائقِ عبادت نہ ہونا، تیسرے طلبِ ہدایت۔ سورۂ فاتحہ کا آخری مضمون صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کرنا ہے اور درحقیقت پورا قرآن اس کے جواب میں ہے کہ جو شخص صراطِ مستقیم چاہتا ہے قرآن ہی میں ملے گا۔

اِسی لئے فاتحہ کے بعد پہلی سورت سورۂ بقرہ رکھی گئی، اور اس کو ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے شروع کر کے اِس طرف اِشارہ کردیا گیا کہ جس صراطِ مستقیم کو تم ڈھونڈھتے ہو وہ یہ کتاب ہے۔

اس کے بعد اس سورت میں اوّل اِیمان کے بنیادی اُصول، توحید، رِسالت، آخرت اِجمالی طور پر اور آخرِ سورت میں اِیمانِ مفصل بیان فرمایا گیا ہے، اور درمیان میں ہر شعبۂ زندگی: عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق، اِصلاحِ ظاہر وباطن کے متعلق ہدایات کے بنیادی اُصول اور اُن کے ساتھ بہت سی جزئیات بیان ہوئی ہیں۔

***

[۱] تفسیر ابن کثیر ج:۱ ص:۱۵۴ والقرطبی ج:۱ ص:۱۵۲

[۲] تفسیر القرطبی ج:۱ ص:۱۵۲

رکوعاتھا ۴۰ | ۲ سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۸۷ | اٰیاتھا ۲۸۶

سورۂ بقرہ مدنی ہے، اس میں ۲۸۶ آیتیں ہیں اور ۴۰ رُکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

معانقۃ

الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞ الَّذِيْنَ

اس کتاب میں کچھ شک نہیں راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو۔ جو کہ

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۞

یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو ہم نے روزی دی ہے اُن کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو

هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞

وہ یقینی جانتے ہیں۔ وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے۔

آسان ترجمۂ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

الٓمّٓ ① یہ کتاب ایسی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں، یہ ہدایت ہے ان ڈر رکھنے والوں کے لئے ② جو بے دیکھی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اُس میں سے (اللہ کی خوشنودی کے کاموں میں) خرچ کرتے ہیں ③ اور جو اُس (وحی) پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ پر اُتاری گئی اور اُس پر بھی جو آپ سے

پہلے اُتاری گئی، اور آخرت پر وہ مکمل یقین رکھتے ہیں ④ یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے پروردگار کی طرف سے صحیح راستے پر ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں ⑤

خلاصۂ تفسیر

یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں (یعنی قرآن کے من جانب اللہ ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں، اگرچہ کوئی نافہم اس میں شبہ رکھتا ہو، کیونکہ یقینی بات کسی کے شبہ کرنے سے بھی حقیقت میں یقینی ہی رہتی ہے) راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر (یعنی جو چیزیں اُن کے حواس وعقل سے پوشیدہ ہیں صرف اللہ ورسول کے فرمانے سے ان کو صحیح مان لیتے ہیں) اور قائم رکھتے ہیں نماز کو (قائم رکھنا یہ ہے کہ اس کو پابندی کے ساتھ اس کے وقت میں پورے شرائط واَرکان کے ساتھ ادا کریں) اور جو کچھ ہم نے ان کو دِیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (یعنی نیک کاموں میں) اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اُتاری گئی ہے اور اُن کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اُتاری جاچکی ہیں (مطلب یہ ہے کہ اُن کا ایمان قرآن پر بھی ہے اور پہلی کتابوں پر بھی، اور اِیمان سچا سمجھنے کو کہتے ہیں، عمل کرنا دُوسری بات ہے، جتنی کتابیں اللہ نے پہلے انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کو سچا سمجھنا فرض اور شرطِ اِیمان ہے، یعنی یہ سمجھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھیں وہ صحیح ہیں، خودغرض لوگوں نے جو اس میں تبدیل وتحریف کی ہے وہ غلط ہے، رہ گیا عمل سو وہ صرف قرآن پر ہوگا، پہلی کتابیں سب منسوخ ہوگئیں، اُن پر عمل جائز نہیں) اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں، بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب (یعنی ایسے لوگوں کو دُنیا میں تو یہ نعمت ملی کہ راہِ حق ملی اور آخرت میں ہر طرح کی کامیابی اُن کے لئے ہے)۔

حلِ لغات

ذٰلِكَ کسی دُور کی چیز کی طرف اِشارہ کے لئے اِستعمال ہوتا ہے، رَيْبٌ شک وشبہ، هُدًى ہدایت سے بنا ہے، اور ہدایت کے معنی رہنمائی، مُتَّقِيْنَ جن میں صفتِ تقویٰ ہو، تقویٰ کے لفظی معنی بچنے کے ہیں، مراد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ہے، غَيْبِ لفظی معنی ہر وہ چیز جو اِنسان کی نظر اور دُوسرے حواس سماعت وغیرہ سے باہر ہو، يُقِيْمُوْنَ اِقامت سے بنا ہے، جس کے معنی سیدھا کرنے کے ہیں، اور نماز کا سیدھا کرنا یہ ہے کہ آداب اور خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کی جائے، رَزَقْنٰهُمْ رِزق سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں روزی اور گزارے کا سامان دینا، يُنْفِقُوْنَ انفاق سے بنا ہے، خرچ کرنے کے معنی میں آتا ہے، اٰخِرَة لغت میں مؤخر اور بعد میں آنے والی چیز کو آخرۃ کہا جاتا ہے، اس جگہ عالمِ دُنیا کے مقابلے میں

عالم آخرت بولا گیا، **يُوقِنُوْنَ** اِیقان سے ہے اور وہ یقین سے بنا ہے، اور یقین اس کو کہتے ہیں جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو، **مُفْلِحُوْنَ** اِفلاح سے اور وہ فَلَاحٌ سے بنا ہے، فلاح کے معنی پوری کامیابی۔

معارف ومسائل

حروفِ مقطعہ جو بہت سی سورتوں کے شروع میں آتے ہیں اُن کی تحقیق

الٓمّٓ، بہت سی سورتوں کے شروع میں چند حرفوں سے مرکب ایک کلمہ لایا گیا ہے جیسے: الٓمّٓ، حٰمٓ، الٓمّٓصٓ، وغیرہ، ان کو اِصطلاح میں حروفِ مقطعہ کہا جاتا ہے، ان میں سے ہر حرف جدا جدا ساکن پڑھا جاتا ہے، الف، لام، میم۔

حروفِ مقطعہ جو اَوائلِ سوَر میں آئے ہیں، اُن کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ اُن سورتوں کے نام ہیں، بعض حضرات نے فرمایا کہ اسمائے اِلٰہیہ کے رُموز ہیں، مگر جمہور صحابہؓ وتابعینؒ اور علمائے اُمت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حروف رُموز اور اَسرار ہیں، جس کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں، اور ہوسکتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو، جس کی تبلیغ اُمت کے لئے روک دی گئی ہو، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تفسیر وتشریح کچھ منقول نہیں، اِمامِ تفسیر قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اِختیار فرمایا ہے، اُن کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

> ''عامر شعبیؒ، سفیان ثوریؒ اور ایک جماعتِ محدثین نے فرمایا ہے کہ ہر آسمانی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص رُموز واَسرار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ حروفِ مقطعہ قرآن میں حق تعالیٰ کا راز ہے، اس لئے یہ اُن متشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے، ہمارے لئے ان میں بحث وگفتگو بھی جائز نہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہمارے فائدے سے خالی نہیں، اوّل تو اُن پر اِیمان لانا، پھر اُن کا پڑھنا ہمارے لئے ثوابِ عظیم ہے، دُوسرے اُن کے پڑھنے کے معنوی فوائد وبرکات ہیں، جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر غیب سے وہ ہمیں پہنچتے ہیں۔''

پھر فرمایا:-

> ''حضرت صدیقِ اکبرؓ، فاروقِ اعظمؓ، عثمانِ غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ جمہور صحابہ کا ان حروف کے متعلق یہی عقیدہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اَسرار ہیں، ہمیں اُن پر اِیمان لانا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں، اور جس طرح آئے ہیں اُن کی تلاوت کرنا چاہئے، مگر معنی معلوم کرنے کی فکر میں پڑنا دُرست نہیں۔'' [1]

---

[1] تفسیر القرطبی ج:۱ ص:۱۵۴

ابنِ کثیرؒ نے بھی قرطبیؒ سے نقل کر کے اسی مضمون کو ترجیح دی ہے،[1] اور بعض اکابر علماء سے جو اِن حروف کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تمثیل وتنبیہ اور تسہیل مقصود ہے، یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ کی یہ ہے، اس لئے اس کو بھی غلط کہنا تحقیق علماء کے خلاف ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ لفظ ذٰلِكَ کسی دُور کی چیز کی طرف اشارے کے لئے آتا ہے، اور کِتَابُ سے مراد قرآنِ کریم ہے، رَیْب کے معنی شک وشبہ، معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں، یہ موقع بظاہر اِشارۂ بعید کا نہیں تھا، کیونکہ اِسی قرآن کی طرف اِشارہ کرنا مقصود ہے جو لوگوں کے سامنے ہے، مگر اِشارۂ بعید سے اس کی طرف اِشارہ پایا جاتا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جس صراطِ مستقیم کی درخواست کی گئی تھی یہ سارا قرآن اس درخواست کا جواب بصورتِ قبولیت اور صراطِ مستقیم کی تشریح وتفصیل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے یہ دُعا سن لی اور قرآن بھیج دیا، جو ہدایت کا آفتاب ہے، جو شخص ہدایت چاہتا ہے وہ اس کو پڑھے، سمجھے اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کرے۔

اور پھر اس کے متعلق اِرشاد ہے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں، کیونکہ کسی کلام میں شک وشبہ کی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ خود کلام میں غلطی ہو، تو وہ کلام محلِ شک وشبہ ہو جاتا ہے، دُوسرے یہ کہ سمجھنے والے کی فہم میں غلطی ہو، اس صورت میں کلام محلِ شک وشبہ نہیں ہوتا، گو کج فہمی یا کم فہمی کی وجہ سے کسی کو شبہ ہو جائے، جس کا ذِکر خود قرآنِ کریم میں چند آیتوں کے بعد وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ میں آیا ہے۔

اس لئے ہزاروں کم فہموں یا کج فہموں کے شبہات واعتراضات کے باوجود یہ کہنا صحیح ہے کہ اس کتاب میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے، یعنی مخصوص ہدایت جو نجاتِ آخرت کا ذریعہ بنے، وہ متقین ہی کا حصہ ہے، اگرچہ قرآن کی ہدایت نہ صرف نوعِ بشر کے لئے بلکہ تمام کائناتِ عالم کے لئے عام ہے، سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ ہدایت کے تین درجے ہیں، ایک درجہ تمام نوعِ اِنسان بلکہ تمام حیوانات وغیرہ کے لئے بھی عام اور شامل ہے، دُوسرا درجہ مؤمنین کے لئے خاص اور تیسرا درجہ مقربینِ خاص کے لئے مخصوص ہے، پھر اس کے درجات کی کوئی حد واِنتہا نہیں، قرآنِ کریم کے مختلف مواقع میں کہیں ہدایتِ عامہ کا ذِکر آیا ہے، کہیں ہدایتِ خاصہ کا، اِس جگہ ہدایتِ خاصہ کا ذِکر ہے، اس لئے متقین کی تخصیص کی گئی ہے، اس پر یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہدایت کی زیادہ ضرورت تو ان لوگوں کو ہے جو متقی نہیں، کیونکہ مذکورہ تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ اس جگہ متقین کی خصوصیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن غیر متقی لوگوں کے لئے ہدایت نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۱ ص:۱۵۶

متقین کی خاص صفات

اس کے بعد دو آیتوں میں متقین کی مخصوص صفات وعلامات بیان کر کے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ یہ جماعت ہدایت یافتہ ہے، انہیں کا راستہ صراطِ مستقیم ہے، جس کو سیدھا راستہ مطلوب ہو، اس جماعت میں شامل ہو جائے، اُن کے ساتھ رہے، اُن کے عقائد ونظریات اور اَعمال واَخلاق کو اَپنا نصب العین بنائے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ متقین کی مخصوص صفات بیان کرنے کے بعد اِرشاد ہوا ہے: اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۵ یعنی یہی لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے رَبّ کی طرف سے ملی ہے، اور یہی لوگ ہیں پورے کامیاب۔

متقین کی صفات جو اِن دو آیتوں میں بیان ہوئی ہیں ان میں ایمان کی اِجمالی تعریف اور اس کے بنیادی اُصول بھی آگئے ہیں، اور عملِ صالح کے بنیادی اُصول بھی، اس لئے ان صفات کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۳ یعنی ”خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا، اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، اور جو ہم نے روزی دی ہے اُس میں سے کچھ خرچ کرتے ہیں۔“

اس آیت میں متقین کی تین صفات بیان کی گئی ہیں: ایمان بالغیب، اِقامتِ صلوٰۃ، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ اس کے ضمن میں بہت سے اہم مسائل آگئے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

پہلا مسئلہ:- ایمان کی تعریف

اِیمان کی تعریف کو قرآن نے يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے صرف دو لفظوں میں پورا بیان کر دیا ہے، لفظ ایمان اور غیب کے معنی سمجھ لئے جاویں تو ایمان کی پوری حقیقت اور تعریف سمجھ میں آجاتی ہے۔

لغت میں کسی کی بات کو کسی کے اِعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ”اِیمان“ ہے، اسی لئے محسوسات ومشاہدات میں کسی کے قول کی تصدیق کرنے کو ایمان نہیں کہتے، مثلاً کوئی شخص سفید کپڑے کو سفید یا سیاہ کو سیاہ کہہ رہا ہے اور دُوسرا اس کی تصدیق کرتا ہے اس کو تصدیق کرنا تو کہیں گے، اِیمان لانا نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس تصدیق میں قائل کے اِعتماد کو کوئی دخل نہیں، بلکہ یہ تصدیق مشاہدہ کی بنا پر ہے، اور اصطلاحِ شرع میں خبرِ رسول کو بغیر مشاہدہ کے محض رسول کے اِعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام اِیمان ہے۔ لفظ ”غیب“ لغت میں ایسی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے جو نہ بدیہی طور پر اِنسان کو معلوم ہوں، اور نہ انسان کے حواسِ خمسہ اس کا پتہ لگاسکیں، یعنی نہ وہ آنکھ سے نظر آئیں، نہ کان سے سنائی دیں، نہ ناک

سے سونگھ کر یا زبان سے چکھ کر اُن کا علم ہو سکے، اور نہ ہاتھ سے چھو کر اُن کو معلوم کیا جا سکے۔

قرآن میں لفظ ''غیب'' سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، اور ان کا علم بداہتِ عقل اور حواسِ خمسہ کے ذریعہ نہیں ہو سکتا، اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات بھی آ جاتی ہیں، تقدیری اُمور، جنت و دوزخ کے حالات، قیامت اور اس میں پیش آنے والے واقعات بھی، فرشتے، تمام آسمانی کتابیں اور تمام انبیائے سابقین بھی، جس کی تفصیل اِسی سورۂ بقرہ کے ختم پر اٰمَنَ الرَّسُوْلُ میں بیان کی گئی ہے، گویا یہاں ایمانِ مجمل کا بیان ہوا ہے، اور آخری آیت میں ایمانِ مفصل کا۔

تو اَب ایمان بالغیب کے معنی یہ ہوگئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایات وتعلیمات لے کر آئے ہیں اُن سب کو یقینی طور پر دِل سے ماننا، شرط یہ ہے کہ اس تعلیم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا قطعی طور پر ثابت ہو، جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک ایمان کی یہی تعریف ہے۔ (عقیدۂ طحاوی، عقائد نسفی وغیرہ)

اس تعریف میں ماننے کا نام ایمان بتلایا گیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ محض جاننے کو ایمان نہیں کہتے، کیونکہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ تو ابلیس وشیطان اور بہت سے کفار کو بھی حاصل ہے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق کا یقین تھا، مگر اس کو مانا نہیں، اس لئے وہ مؤمن نہیں۔

دُوسرا مسئلہ: - اِقامتِ صلوٰۃ

اِقامت کے معنی محض نماز پڑھنے کے نہیں، بلکہ نماز کو ہر جہت اور ہر حیثیت سے دُرست کرنے کا نام اقامت ہے، جس میں نماز کے تمام فرائض، واجبات، مستحبات اور پھر اُن پر دوام والتزام، یہ سب اِقامت کے مفہوم میں داخل ہیں، اور صحیح یہ ہے کہ اس جگہ نماز سے کوئی خاص نماز مراد نہیں، بلکہ فرائض وواجبات اور نفلی نمازوں کو یہ لفظ شامل ہے، خلاصۂ مضمون یہ ہوا کہ وہ لوگ جو نمازوں کی پابندی بھی قواعدِ شرعیہ کے مطابق کرتے ہیں، اور اُن کے پورے آداب بھی بجالاتے ہیں۔

تیسرا مسئلہ: - اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

اس میں بھی صحیح اور تحقیقی بات جس کو جمہور مفسرین نے اِختیار فرمایا ہے، یہی ہے کہ ہر قسم کا وہ خرچ داخل ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے، خواہ فرض زکوٰۃ ہو، یا دُوسرے صدقاتِ واجبہ یا نفلی صدقات وخیرات، کیونکہ قرآنِ کریم میں جہاں کہیں لفظ اِنفاق اِستعمال ہوا ہے عموماً نفلی صدقات میں یا عام معنی میں اِستعمال کیا گیا ہے، زکوٰۃ فرض کے لئے عموماً لفظ ''زکوٰۃ'' ہی آیا ہے۔

اس مختصر جملہ میں لفظ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ پر غور کیجئے تو ایک طرف یہ لفظ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ایک قوی داعیہ

شریف اِنسان کے دِل میں پیدا کردیتا ہے کہ جو کچھ مال ہمارے پاس ہے یہ سب خدا ہی کا عطا کیا ہوا اور اسی کی امانت ہے، اگر ہم اس تمام مال کو بھی اللہ کی راہ میں اس کی رضا کے لئے خرچ کردیں تو حق اور بجا ہے، اس میں بھی ہمارا کوئی اِحسان نہیں ۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس پر مزید اِضافہ لفظ مِمَّا نے کردیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دیئے ہوئے مال کو بھی پورا خرچ کرنا نہیں، بلکہ اس کا کچھ حصہ خرچ کرنا ہے۔

یہاں متقین کی صفات کا بیان کرتے ہوئے اوّل ایمان بالغیب کا ذِکر فرمایا گیا، پھر اِقامتِ نماز اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا۔ ایمان کی اہمیت تو سب کو معلوم ہے کہ وہی اصل الاصول اور سارے اعمال کی مقبولیت کا دار و مدار ہے، لیکن جب ایمان کے ساتھ اعمال کا بیان کیا جائے تو ان کی فہرست طویل اور فرائض و واجبات کی تعداد کثیر ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعمال میں سے صرف دو عمل نماز اور اِنفاقِ مال کے ذِکر پر اِکتفا کرنے میں کیا راز ہے؟

اس میں غالباً اسی طرف اِشارہ ہے کہ جتنے اعمال اِنسان پر فرض یا واجب ہیں، ان کا تعلق یا اِنسان کی ذات اور بدن سے ہے یا اس کے مال سے، بدنی اور ذاتی عبادات میں سب سے اہم نماز ہے، اس کا ذِکر کرنے پر اِکتفا کیا گیا، اور مالی عبادات سب کی سب لفظ اِنفاق میں داخل ہیں، اس لئے درحقیقت یہ تنہا دو اَعمال کا ذِکر نہیں، بلکہ تمام اعمال و عبادات اُن کے ضمن میں آگئے، اور پوری آیت کے یہ معنی ہوگئے کہ متقین وہ لوگ ہیں جن کا ایمان بھی کامل ہے اور عمل بھی، اور ایمان و عمل کے مجموعہ کا نام ہی اسلام ہے، گویا اس آیت میں ایمان کی مکمل تعریف کے ساتھ اسلام کے مفہوم کی طرف بھی اِشارہ ہوگیا، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس جگہ اس کی بھی وضاحت کردی جائے کہ ایمان اور اِسلام میں کیا فرق ہے؟

اِیمان اور اِسلام میں فرق

لغت میں ایمان کسی چیز کی دِل سے تصدیق کرنے کا نام ہے اور اِسلام اِطاعت و فرمانبرداری کا۔ ایمان کا محل قلب ہے، اور اِسلام کا بھی قلب اور سب اعضاء و جوارح لیکن شرعاً ایمان بغیر اِسلام کے اور اِسلام بغیر ایمان کے معتبر نہیں، یعنی اللہ اور اس کے رسول کی محض دِل میں تصدیق کرلینا شرعاً اس وقت تک معتبر نہیں جب تک زبان سے اس تصدیق کا اِظہار اور اِطاعت و فرمانبرداری کا اِقرار نہ کرے، اسی طرح زبان سے تصدیق کا اِظہار یا فرمانبرداری کا اِقرار اُس وقت تک معتبر نہیں جب تک دِل میں اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ لغت کے اِعتبار سے اِیمان اور اِسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں، اور قرآن و حدیث میں اسی لغوی

مفہوم کی بنا پر ایمان اور اسلام میں فرق کا ذکر بھی ہے، مگر شرعاً ایمان بدون اسلام کے اور اسلام بدون ایمان کے معتبر نہیں۔

جب اسلام یعنی ظاہری اقرار و فرمانبرداری کے ساتھ دِل میں ایمان نہ ہو تو اس کو قرآن کی اصطلاح میں ''نفاق'' کا نام دیا گیا ہے، اور اس کو کھلے کفر سے زیادہ شدید جرم ٹھہرایا ہے:-

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء:۱۴۵)

''یعنی منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے طبقے میں رہیں گے۔''

اسی طرح ایمان یعنی تصدیقِ قلبی کے ساتھ اگر اقرار و اطاعت نہ ہو تو اس کو بھی قرآنی نصوص میں کفر ہی قرار دِیا ہے، اِرشاد ہے: يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرۃ:۱۴۶) یعنی ''یہ کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی حقانیت کو ایسے یقینی طریق پر جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔''

اور دُوسری جگہ اِرشاد ہے:-

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل:۱۴) یعنی ''یہ لوگ ہماری آیات کا اِنکار کرتے ہیں، حالانکہ اُن کے دِلوں میں اُن کا یقین کامل ہے، اور اُن کی یہ حرکت محض ظلم و تکبر کی وجہ سے ہے۔''

میرے اُستاذِ محترم حضرت العلامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس مضمون کو اس طرح بیان فرماتے تھے کہ ایمان اور اِسلام کی مسافت ایک ہے، فرق صرف ابتدا و اِنتہا میں ہے، یعنی ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہرِ عمل پر پہنچ کر مکمل ہوتا ہے، اور اِسلام ظاہرِ عمل سے شروع ہوتا ہے اور قلب پر پہنچ کر مکمل سمجھا جاتا ہے، اگر تصدیقِ قلبی ظاہری اِقرار و اِطاعت تک نہ پہنچے وہ تصدیقِ ایمان معتبر نہیں، اسی طرح اگر ظاہری اطاعت و اِقرار تصدیقِ قلبی تک نہ پہنچے تو وہ اِسلام معتبر نہیں۔

اِمام غزالیؒ اور اِمام سبکیؒ کی بھی یہی تحقیق ہے، اور اِمام ابنِ ہمامؒ نے مسامرہ میں اس تحقیق پر تمام اہلِ حق کا اِتفاق ذکر کیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ یعنی ''متقین ایسے ہیں کہ ایمان رکھتے ہیں اُس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اُتاری گئی اور اُن کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اُتاری جاچکی ہیں اور آخرت پر بھی وہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔''

اس آیت میں متقین کی باقی صفات کا بیان ہے جس میں ایمان بالغیب کی کچھ تفصیل اور ایمان بالآخرت کا ذکر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ عہدِ رِسالت میں

مؤمنینِ متقین دو طرح کے حضرات تھے، ایک وہ جو پہلے مشرکین میں سے تھے پھر مشرف باسلام ہوئے، دُوسرے وہ جو پہلے اہلِ کتاب یہودی یا نصرانی تھے پھر مسلمان ہوگئے، اس سے پہلی آیت میں پہلے طبقے کا ذِکر تھا، اور اس آیت میں دُوسرے طبقے کا ذِکر ہے، اسی لئے اس آیت میں قرآن پر اِیمان لانے کے ساتھ پچھلی آسمانی کتابوں پر اِیمان لانے کی بھی تصریح فرمائی گئی کہ وہ حسبِ تصریحِ حدیث دُہرے ثواب کے مستحق ہیں، ایک پچھلی کتابوں کے زمانے میں ان پر اِیمان لانے اور عمل کرنے کا ثواب، دُوسرے قرآن کے زمانے میں قرآن پر اِیمان لانے اور عمل کرنے کا ثواب۔ پچھلی آسمانی کتابوں پر اِیمان لانا آج بھی ہر مسلمان کے لئے لازم ہے، فرق اتنا ہے کہ آج ان کتابوں پر اِیمان اس طرح ہوگا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُن کتابوں میں نازل فرمایا تھا، وہ سب حق ہے، اور اُس زمانے کے لئے وہی واجب العمل تھا، مگر قرآن نازل ہونے کے بعد چونکہ پچھلی کتابیں اور شریعتیں سب منسوخ ہوگئیں، تو اَب عمل صرف قرآن ہی پر ہوگا۔

مسئلۂ ختمِ نبوّت کی ایک واضح دلیل

آیت کے اس طرزِ بیان سے ایک اہم اُصولی مسئلہ بھی نکل آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، اور آپ کی وحی آخری وحی، کیونکہ اگر قرآن کے بعد کوئی اور کتاب یا وحی بھی نازل ہونے والی ہوتی تو جس طرح اس آیت میں پچھلی کتابوں اور وحی پر اِیمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اسی طرح آئندہ نازل ہونے والی کتاب اور وحی پر اِیمان لانے کا ذِکر بھی ضروری ہوتا، بلکہ اس کی ضرورت زیادہ تھی، کیونکہ توراۃ واِنجیل اور تمام کتبِ سابقہ پر اِیمان لانا تو پہلے سے جاری اور معلوم تھا، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی سلسلۂ وحی اور نبوّت جاری ہوتا تو ضرورت اس کی تھی کہ اس کتاب اور اس نبی کا ذِکر زیادہ اِہتمام سے کیا جاتا جو بعد میں آنے والے ہوں تاکہ کسی کو اِشتباہ نہ رہے۔

مگر قرآن نے جہاں اِیمان کا ذِکر کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل ہونے والی وحی اور پہلے انبیاء کا ذِکر فرمایا، بعد میں آنے والی کسی وحی یا نبی کا کہیں قطعاً ذِکر نہیں، پھر صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ قرآنِ کریم میں یہ مضمون اوّل سے آخر تک مختلف مقامات میں چالیس پچاس آیتوں میں آیا ہے، سب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء، پہلی وحی، پہلی کتابوں کا ذِکر ہے، کسی ایک آیت میں اس کا اِشارہ تک نہیں کہ آئندہ بھی کوئی وحی یا نبی آنے والا ہے، جس پر اِیمان لانا ہے، مثلاً اِرشاد ہے:-

۱- وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ (النحل: ۴۳)

۲- وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ (المؤمن: ۷۸)

۳- وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا (الروم: ۴۷)

۴- وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (النساء:۶۰)

۵- وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (الزمر:۶۵)

۶- كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (الشوریٰ:۳)

۷- كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (البقرۃ:۱۸۳)

۸- سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا (بنی اسرائیل:۷۷)

ان آیات میں اور ان کی اَمثال دُوسری آیات میں جہاں کہیں نبی یا رسول یا وحی و کتاب بھیجنے کا ذِکر ہے سب کے ساتھ مِنْ قَبْلُ اور مِنْ قَبْلِكَ کی قید لگی ہوئی ہے، کہیں مِنْۢ بَعْدُ کا اِشارہ تک نہیں، اگر ختمِ نبوّت اور انقطاعِ وحی کا دُوسری آیات میں صراحۃً ذِکر نہ ہوتا تو قرآن کا یہ طرز ہی اس مضمون کی شہادت کے لئے کافی تھا، مسئلۂ ختمِ نبوّت پر قرآنی تصریحات اور اَحادیثِ متواترہ کی شہادت اور اُمت کا اِجماع تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو تو میرا رسالہ ''ختمِ نبوّت'' دیکھا جائے۔

متقین کی تفسیر میں صفتِ ایمان بالآخرۃ

اس آیت میں متقین کی دُوسری صفت یہ بیان فرمائی گئی کہ وہ آخرت پر اِیمان رکھتے ہیں، آخرت سے مراد وہ دارِ آخرت ہے جس کو قرآن میں دارُ القرار، دارُالحیوان اور عقبیٰ کے نام سے بھی ذِکر کیا گیا ہے، اور پورا قرآن اس کے ذِکر اور اس کے ہولناک حالات سے بھرا ہوا ہے۔

آخرت پر ایمان ایک اِنقلابی عقیدہ ہے

آخرت پر اِیمان لانا اگرچہ اِیمان بالغیب کے لفظ میں آچکا ہے، مگر اس کو پھر صراحۃً اس لئے ذِکر کیا گیا کہ یہ اجزائے اِیمان میں اس حیثیت سے سب میں اہم جزء ہے کہ مقتضائے اِیمان پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا اسی کا اثر ہے۔

اور اِسلامی عقائد میں یہی وہ اِنقلابی عقیدہ ہے جس نے دُنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی، اور جس نے آسمانی تعلیم پر عمل کرنے والوں کو پہلے اخلاق و اعمال میں اور پھر دُنیا کی سیاست میں بھی تمام اقوامِ عالم کے مقابلے میں ایک اِمتیازی مقام عطا فرمایا، اور جو عقیدہ توحید و رِسالت کی طرح تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلا آتا ہے۔

وجہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے سامنے صرف دُنیا کی زندگی اور اسی کی عیش و عشرت ان کا اِنتہائی مقصود ہے، اسی کی تکلیف کو تکلیف سمجھتے ہیں، آخرت کی زندگی اور اعمال کے حساب کتاب اور جزا و سزا کو وہ نہیں مانتے، وہ جب جھوٹ، سچ اور حلال حرام کی تفریق کو اپنی عیش و عشرت میں خلل انداز ہوتے دیکھیں تو اُن کو جرائم سے روکنے والی کوئی چیز باقی نہیں رہتی،

حکومت کے تعزیری قوانین قطعاً اِنسدادِ جرائم اور اِصلاحِ اَخلاق کے لئے کافی نہیں، عادی مجرم تو اُن سزاؤں کے عادی ہو ہی جاتے ہیں، کوئی شریف اِنسان اگر تعزیری سزا کے خوف سے اپنی خواہشات کو ترک بھی کرے تو اسی حد تک کہ اس کو حکومت کی دار و گیر کا خطرہ ہو، خلوتوں میں اور راز دارانہ طریقوں پر جہاں حکومت اور اس کے قوانین کی رسائی نہیں، اُسے کون مجبور کرسکتا ہے کہ اپنی عیش و عشرت اور خواہش کو چھوڑ کر پابندیوں کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے۔

ہاں وہ صرف عقیدۂ آخرت اور خوفِ خدا ہی ہے جس کی وجہ سے اِنسان کی ظاہری اور باطنی حالت جلوَت و خلوَت میں یکساں ہوسکتی ہے، وہ یقین رکھتا ہے کہ مکان کے بند دروازوں اور اُن پُر پہرہ چوکیوں میں اور رات کی تاریکیوں میں بھی کوئی دیکھنے والا مجھے دیکھ رہا ہے، کوئی لکھنے والا میرے اعمال کو لکھ رہا ہے۔

یہی وہ عقیدہ تھا جس پر پورا عمل کرنے کی وجہ سے اِسلام کے اِبتدائی دور میں ایسا پاکباز معاشرہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی صورت دیکھ کر، چال چلن دیکھ کر لوگ دِل و جان سے اِسلام کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں بِالْاٰخِرَةِ کے ساتھ لفظ یُؤْمِنُوْنَ نہیں بلکہ یُوْقِنُوْنَ استعمال فرمایا گیا ہے، کیونکہ ایمان کا مقابل تکذیب ہے، اور اِیقان کا مقابل شک و تردّد، اس میں اِشارہ ہے کہ آخرت کی زندگی کی محض تصدیق کرنا مقصد کو پورا نہیں کرتا، بلکہ اس کا ایسا یقین ضروری ہے جیسے کوئی چیز آنکھوں کے سامنے ہو، متقین کی یہی صفت ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیشی اور حساب کتاب، پھر جزا و سزا کا نقشہ ہر وقت اُن کے سامنے رہتا ہے۔

وہ شخص جو دُوسروں کا حق غصب کرنے کے لئے جھوٹے مقدمے لڑتا ہے، جھوٹی گواہی دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے خلاف حرام مال کمانے اور کھانے میں لگا ہوا ہے، یا دُنیا کے ذلیل مقاصد حاصل کرنے کے لئے خلافِ شرع ذرائع اِختیار کر رہا ہے، وہ ہزار بار آخرت پر اِیمان لانے کا اِقرار کرے اور ظاہرِ شریعت میں اس کو مؤمن کہا بھی جائے، لیکن قرآن جس اِیقان کا مطالبہ کرتا ہے وہ اسے حاصل نہیں، اور وہ ہی اِنسان کی زندگی میں اِنقلاب لانے والی چیز ہے، اُسی کے نتیجے میں متقین کو ہدایت اور کامیابی کا وہ اِنعام دیا گیا ہے جس کا ذِکر سورۂ بقرہ کی پانچویں آیت میں ہے: اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ یعنی ”بس یہی لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے، اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب۔“

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ

بے شک جو لوگ کافر ہوچکے برابر ہے اُن کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے،

لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٦ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ

وہ ایمان نہ لائیں گے۔ مہر کردی اللہ نے اُن کے دِلوں پر اور اُن کے کانوں پر اور اُن کی آنکھوں پر

غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝٧ ع

پردہ ہے، اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر اپنا لیا ہے، اُن کے حق میں دونوں باتیں برابر ہیں، چاہے آپ ان کو ڈرائیں، یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ۝٦ اللہ نے اُن کے دِلوں پر اور اُن کے کانوں پر مُہر لگادی ہے، اور اُن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، اور اُن کے لئے زبردست عذاب ہے ۝٧

خلاصۂ تفسیر

بے شک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے اُن کے حق میں خواہ آپ اُن کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ اِیمان نہ لاویں گے (یہ بات اُن کافروں کے متعلق ہے جن کی نسبت خدا تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوگا، عام کافر مراد نہیں، ان میں بہت سے لوگ بعد میں مسلمان ہو گئے) بند لگا دیا ہے اللہ نے اُن کے دِلوں پر اور اُن کے کانوں پر اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لئے سزا بڑی ہے۔

معارف و مسائل

خلاصۂ مضمون مع ربط

سورۂ بقرہ کی پہلی پانچ آیتوں میں قرآنِ کریم کا کتابِ ہدایت اور ہر شک وشبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد اُن خوش نصیب لوگوں کا ذِکر تھا جنہوں نے اس کتابِ ہدایت سے پورا فائدہ اُٹھایا، جن کو قرآن کی اِصطلاح میں مؤمنین اور متقین کا لقب دیا گیا ہے، اور ان حضرات کی مخصوص صفات وعلامات بھی بیان کی گئیں، اس کے بعد پندرہ آیتوں میں اُن

لوگوں کا ذِکر ہے جنہوں نے اس ہدایت کو قبول نہیں کیا، بلکہ اِنکار وعناد سے پیش آئے۔

پھر اُن لوگوں میں دو گروہ تھے، ایک وہ جنہوں نے کھل کر اِنکار ومخالفت کا راستہ اِختیار کیا جن کو قرآن کی اِصطلاح میں کافر کہا گیا، دُوسرے وہ لوگ جو اپنی اخلاقی پستی اور دُنیا کی ذلیل اَغراض کی بنا پر یہ جرأت بھی نہ کر سکے کہ اپنے ضمیر کی آواز اور دِلی عقیدے کو صاف طور پر ظاہر کر دیتے، بلکہ دھوکا اور فریب کی راہ اِختیار کی، مسلمانوں سے یہ کہتے کہ ہم مسلمان ہیں، قرآن اور اس کی ہدایات کو مانتے ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، اور دِلوں میں اُن کے کفر واِنکار تھا، کفار کی مجلسوں میں جا کر یہ کہتے کہ ہم تمہارے عقیدے پر اور تمہارے ساتھ ہیں، مسلمانوں کو دھوکا دینے اور ان کے راز معلوم کرنے کے لئے ہم اُن سے ملتے ہیں۔

اس گروہ کا نام قرآن کی اِصطلاح میں منافق ہے، یہ پندرہ آیتیں ہیں جو قرآن نہ ماننے والوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں، ان میں سے مذکورہ دو آیتوں میں کھلے کافروں کا ذِکر ہے، اور آگے تیرہ آیتوں میں منافقین کا ذِکر اور ان کے متعلقہ حالات وعلامات اور ان کا انجام مذکور ہے۔

ان تمام آیات کی تفصیل پر یکجا نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم نے سورۂ بقرہ کی اِبتدائی بیس آیتوں میں ایک طرف تو چشمۂ ہدایت کا پتہ دے دیا کہ وہ قرآن ہے، اور دُوسری طرف تمام اَقوامِ عالم کو اسی ہدایت کے قبول یا اِنکار کے معیار سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک ہدایت یافتہ جن کو مؤمنین ومتقین کہا جاتا ہے، دُوسرے ہدایت سے اِنحراف واِنکار کرنے والے جن کو کافر یا منافق کہا جاتا ہے۔

پہلی قسم وہ ہے جن کا راستہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ میں طلب کیا گیا ہے، اور دُوسری قسم وہ ہے جن کے راستے سے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ میں پناہ مانگی گئی ہے۔

قرآنِ کریم کی اِس تعلیم سے ایک اُصولی مسئلہ یہ بھی نکل آیا کہ اَقوامِ عالم کے حصوں یا گروہوں میں ایسی تقسیم جو اُصول پر اَثر اَنداز ہو سکے وہ صرف اُصول ونظریات ہی کے اِعتبار سے ہو سکتی ہے، نسب، وطن، زبان، رنگ اور جغرافیائی حالات ایسی چیزیں نہیں جن کے اِشتراک یا اِختلاف سے قوموں کے ٹکڑے کئے جا سکیں، قرآنِ کریم کا اس بارے میں واضح فیصلہ بھی سورۂ تغابن میں مذکور ہے:-

خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ (التغابن:۲)

''یعنی اللہ نے تم سب کو پیدا کیا، پھر کچھ لوگ تم میں سے مؤمن اور کچھ کافر ہو گئے۔''

مذکور الصدر دو آیتوں میں حق تعالیٰ نے اُن کافروں کا ذِکر فرمایا ہے جو اپنے کفر واِنکار میں ضد اور عناد تک پہنچ گئے تھے، اور اس ضد کی وجہ سے وہ کسی حق بات کو سننے اور روشن دلیل کو دیکھنے کے لئے بھی تیار نہ تھے، ایسے لوگوں کے بارے میں

سنۃ اللہ یہی ہے کہ ان کو ایک سزا اسی جہان میں نقد یہ دی جاتی ہے کہ اُن کے دِلوں پر مہر لگادی جاتی ہے، کانوں، آنکھوں کو حق وصدق کے قبول کرنے سے بند کردیا جاتا ہے، اُن کا حال حق وصدق کے بارے میں ایسا ہوجاتا ہے کہ گویا نہ اُن کو سمجھنے کی عقل، نہ دیکھنے کے لئے آنکھیں، نہ سننے کے لئے کان۔

آخرِ آیت میں ایسے لوگوں کا عذابِ عظیم میں مبتلا ہونا ذِکر کیا گیا ہے۔

کفر کی تعریف

''کفر'' کے لفظی معنی چھپانے کے ہیں، ناشکری کو بھی کفر اس لئے کہتے ہیں کہ محسن کے اِحسان کو چھپانا ہے۔ اِصطلاحِ شریعت میں جن چیزوں پر اِیمان لانا فرض ہے ان میں سے کسی چیز کے اِنکار کا نام ''کفر'' ہے، مثلاً اِیمان کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور اس کا ثبوت قطعی ویقینی ہے اُن سب چیزوں کی دِل سے تصدیق کرنا، اور حق سمجھنا، اس لئے جو شخص رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن تعلیمات میں سے جن کا ثبوت یقینی اور قطعی ہے کسی ایک کو بھی حق نہ سمجھے اور اس کی تصدیق نہ کرے وہ کافر کہلائے گا۔

اِنذار کے معنی

لفظ ''اِنذار'' ایسی خبر دینا جس سے خوف پیدا ہو، جیسا کہ ''اِبشار'' ایسی خبر دینے کو کہتے ہیں جس سے سرور پیدا ہوا، اُردو زبان میں اس کا ترجمہ ''ڈرانے'' سے کیا جاتا ہے، مگر درحقیقت مطلقاً ڈرانے کو اِنذار نہیں کہتے، بلکہ ایسا ڈرانا جو شفقت ورحمت کی بنا پر ہو، جیسے اولاد کو آگ سے، سانپ بچھو اور درندوں سے ڈرایا جاتا ہے، اسی لئے جو ڈاکو، چور، ظالم کسی اِنسان کو دھمکاتے ڈراتے ہیں اس کو ''اِنذار'' اور ان لوگوں کو ''نذیر'' نہیں کہا جاتا۔ انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت سے ''نذیر'' کا لقب دیا جاتا ہے، کہ وہ اَز راہِ شفقت آئندہ آنے والے مصائب سے ڈراتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کے لئے اس لفظ کو اِختیار کرنے میں اس کی ہدایت ہے کہ مصلح مبلغ کے لئے ضروری ہے کہ مخاطب کی خیرخواہی کے ساتھ ہمدردی سے گفتگو کرے، محض ایک کلمہ پہنچادینا مقصد نہ ہو۔

اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ ضدی اور معاند کفار جو حقیقت کو پہچاننے کے باوجود کفر واِنکار پر جمے ہوئے ہیں، یا اپنے تکبر اور کج رائی کی بنا پر کسی حق بات کو سننے اور روشن دلائل کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، ان کی اِصلاح اور ایمان کے متعلق جو آپ کوشش کرتے ہیں اُن کے لئے مؤثر ثابت نہ ہوگی، بلکہ آپ کا کوشش کرنا اور نہ کرنا اُن کے حق میں برابر ہے۔

اس کی وجہ اگلی آیت میں یہ بتلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دِلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے، اور ان کی

آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، سوچنے سمجھنے کے جتنے راستے تھے، وہ سب بند ہیں، اس لئے ان سے اِصلاح کی توقع رکھنا دردِ سری ہے۔

کسی چیز پر مہر اس لئے لگائی جاتی ہے کہ باہر سے کوئی چیز اس میں داخل نہ ہوسکے، ان کے دِلوں اور کانوں پر مہر لگانے کا یہی مطلب ہے کہ ان میں قبولِ حق کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اُن کی اس حالت کو دِلوں اور کانوں پر تو مہر کرنے سے تعبیر فرمایا ہے، مگر آنکھوں کے لئے مہر کے بجائے پردہ پڑنے کا ذِکر کیا گیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ دِلوں میں آنے والا کوئی مضمون یا کوئی فکر وخیال کسی ایک سمت سے نہیں آتا، ہر طرف سے آسکتا ہے، اسی طرح کانوں میں پہنچنے والی آواز بھی ہر سمت اور جہت سے آسکتی ہے، ان کی بندش جب ہی ہوسکتی ہے جب اُن پر مہر کردی جائے، بخلاف آنکھوں کے کہ ان کا اِدراک صرف ایک سمت یعنی سامنے سے ہوسکتا ہے، اور جب سامنے پردہ پڑجائے تو آنکھوں کا اِدراک ختم ہوجاتا ہے۔ (مظہری) [۱]

۱- گناہوں کی دُنیوی سزا سلبِ توفیق

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ کفر اور ہر گناہ کی اصل سزا تو آخرت میں ملے گی، مگر بعض گناہوں کی کچھ سزا دُنیا میں بھی مل جاتی ہے، پھر یہ دُنیا کی سزا بعض اوقات یہ شکل اِختیار کرتی ہے کہ اِصلاحِ حال کی توفیق سلب ہوجاتی ہے، اِنسان آخرت کے حساب وکتاب سے بے فکر ہوکر اپنی نافرمانیوں اور گناہوں میں بڑھتا چلا جاتا ہے، اور اس کی برائی کا اِحساس بھی اس کے دِل سے جاتا رہتا ہے، ایسے حال کے متعلق بعض بزرگوں کا اِرشاد ہے: "اِنَّ مِنْ جَزَاءِ السَّیِّئَةِ السَّیِّئَةُ بَعْدَهَا وَاِنَّ مِنْ جَزَاءِ الْحَسَنَةِ الْحَسَنَةُ بَعْدَهَا" یعنی" گناہ کی ایک سزا یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک گناہ دُوسرے گناہ کو کھینچ لاتا ہے، جس طرح نیکی کا نقد بدلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک نیکی دُوسری نیکی کو کھینچ لاتی ہے۔"

اور حدیث میں ہے کہ اِنسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، اور جس طرح سفید کپڑے پر ایک سیاہ نقطہ اِنسان کو ناگوار نظر آتا ہے، پہلے نقطۂ گناہ سے بھی اِنسان پریشان ہوتا ہے، لیکن اگر اس نے گناہ سے توبہ نہ کی اور دُوسرا گناہ کرلیا تو ایک دُوسرا نقطۂ سیاہ لگ جاتا ہے، اور اسی طرح ہر گناہ پر سیاہ نقطے لگتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ سیاہی سارے قلب پر محیط ہوجاتی ہے، اور اَب اس کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ وہ نہ کسی اچھی چیز کو اچھا سمجھ سکتا ہے نہ بری چیز کو برا، غرض نیکی بدی کا اِمتیاز اس کے دِل سے اُٹھ جاتا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ اسی ظلمت وسیاہی کا نام

---

[۱] التفسیر المظھری تحت ھذہ الآیۃ ج:۱ ص:۲۴

قرآنِ کریم میں ''ران'' یا ''رین'' آیا ہے: كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ [۱] (المطفّفین) (مشکوٰۃ از مسندِ احمد وترمذی)۔ [۲] اور ترمذی نے سندِ صحیح کے ساتھ بروایت ابوہریرہؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِنسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا دِل سیاہ ہوجاتا ہے، پھر اگر وہ توبہ کرلے تو صاف ہوجاتا ہے۔ (قرطبی)

۲- نصیحت ناصح کے لئے ہر حال میں مفید ہے، مخاطب قبول کرے یا نہ کرے

اس آیت میں ازلی کافروں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وعظ ونصیحت کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر قرار دیئے گئے ہیں، مگر اُن کے ساتھ عَلَيْهِمْ کی قید لگا کر بتلا دیا کہ یہ برابری کفار کے حق میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہیں، بلکہ اُن کو تو تبلیغ وتعلیم اور اِصلاحِ خلق کی کوشش کا ثواب بہر حال ملے گا، اسی لئے پورے قرآنِ کریم کی کسی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے لوگوں کو بھی دعوتِ اِیمان دینے سے روکا نہیں گیا، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دعوتِ دِین اور اِصلاح کا کام کرتا ہے خواہ مؤثر ہو یا نہ ہو، اس کو بہر حال اپنے عمل کا ثواب ملتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب

اس آیت کا مضمون وہی ہے جو سورۂ مطفّفین کی اس آیت کا ہے: كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ (المطفّفین) یعنی ''ایسا نہیں، بلکہ اُن کے دِلوں پر ان کے اعمال کا زنگ بیٹھ گیا ہے'' جس میں حقیقت واضح کردی گئی ہے کہ ان کی بداعمالیاں اور سرکشی ہی ان کے دِلوں کا زنگ بن گیا ہے، اسی زنگ کو آیتِ مذکورہ میں ''مہر'' یا ''پردہ'' کے لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے، اس لئے اس پر یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہی اُن کے دِلوں پر مہر کردی، اور حواس کو ماؤف کردیا ہے تو یہ اپنے کفر میں معذور ہوگئے، پھر اُن کو عذاب کیسا؟ وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے شرارت وعناد کرکے باختیارِ خود اپنی اِستعداد برباد کرلی ہے، اس لئے اس تباہیٔ اِستعداد کے فاعل اور مسبّب یہ خود ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے تمام افعال کے خالق ہونے کی حیثیت سے اس جگہ مہر کرنے کو اپنی طرف نسبت کرکے یہ بتلا دیا کہ جب ان لوگوں نے قبولِ حق کی صلاحیت واِستعداد کو اپنے اِختیار سے تباہ کرنا چاہا تو سنتِ اِلٰہیہ کے مطابق ہم نے وہ بد اِستعداد کی کیفیت اُن کے قلوب اور حواس میں پیدا کردی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ (وقف لازم)

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اِیمان لائے اللہ پر اور دِن قیامت پر اور وہ ہرگز مؤمن نہیں۔

[۱] ترجمہ:- ہرگز نہیں! بلکہ جو عمل یہ کرتے رہے ہیں، اُس نے اِن کے دِلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے۔

[۲] مشكوٰة، باب الإستغفار والتوبة ج: ۱ ص: ۲۰۴

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا

دغابازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے اور دراصل کسی کو دغا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو اور نہیں

يَشْعُرُوْنَ ۝٩ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

سوچتے۔ اُن کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھادی اللہ نے اُن کی بیماری اور اُن کے لئے عذاب

اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝١٠ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ

دردناک ہے اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے۔ اور جب کہا جاتا ہے اُن کو فساد نہ ڈالو ملک میں

قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝١١ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ

تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، جان لو وہی ہیں خرابی کرنے والے لیکن

لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝١٢ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا

نہیں سمجھتے۔ اور جب کہا جاتا ہے ان کو ایمان لاؤ جس طرح ایمان لائے سب لوگ تو کہتے ہیں:

اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۗ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ

کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف، جان لو وہی ہیں بیوقوف لیکن

لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝١٣ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا

نہیں جانتے۔ اور جب ملاقات کرتے ہیں مسلمانوں سے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں، اور جب تنہا ہوتے ہیں

اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝١٤

اپنے شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ہنسی کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں سے)۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٥﴾ اُولٰٓئِكَ

اللہ ہنسی کرتا ہے اُن سے اور ترقی دیتا ہے اُن کو اُن کی سرکشی میں (اور) حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں۔ یہ وہی ہیں

الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا

جنہوں نے مول لی گمراہی ہدایت کے بدلے، سو نافع نہ ہوئی ان کی سوداگری اور نہ ہوئے

مُهْتَدِيْنَ ﴿١٦﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ

راہ پانے والے۔ اُن کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب روشن کردیا آگ نے

مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ

اس کے آس پاس کو تو زائل کردی اللہ نے اُن کی روشنی اور چھوڑا ان کو اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے۔ بہرے ہیں، گونگے ہیں،

عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿١٨﴾ ۙ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ

اندھے ہیں، سو وہ نہیں لوٹیں گے۔ یا اُن کی مثال ایسی ہے جیسے زور سے مینھ پڑ رہا ہو آسمان سے، اس میں اندھیرے ہیں

وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ

اور گرج اور بجلی، دیتے ہیں اُنگلیاں اپنے کانوں میں مارے کڑک کے موت کے ڈر سے

وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿١٩﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۭ كُلَّمَآ

اور اللہ احاطہ کرنے والا ہے کافروں کا۔ قریب ہے کہ بجلی اُچک لے اُن کی آنکھیں، جب

اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ

چمکتی ہے اُن پر تو چلنے لگتے ہیں اس کی روشنی میں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں، اور اگر چاہے اللہ تو لے جائے

بِسَمۡعِهِمۡ وَاَبۡصَارِهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝۲۰ ع ۲

ان کے کان اور آنکھیں، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یومِ آخرت پر اِیمان لے آئے، حالانکہ وہ (حقیقت میں) مؤمن
نہیں ہیں ۸ وہ اللہ کو اور اُن لوگوں کو جو (واقعی) ایمان لا چکے ہیں، دھوکا دیتے ہیں۔ اور (حقیقت تو یہ ہے کہ) وہ اپنے سوا
کسی اور کو دھوکا نہیں دے رہے، لیکن انہیں اس بات کا احساس نہیں ہے ۹ ان کے دِلوں میں روگ ہے، چنانچہ اللہ نے ان
کے روگ میں اور اضافہ کر دیا ہے، اور ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے، کیونکہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے ۱۰ اور جب اُن
سے کہا جاتا ہے کہ تم زمین میں فساد نہ مچاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۱۱ یاد رکھو! یہی لوگ فساد
پھیلانے والے ہیں، لیکن انہیں اس بات کا احساس نہیں ہے ۱۲ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اسی طرح ایمان لے
آؤ جیسے دُوسرے لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لائیں جیسے بے وقوف لوگ ایمان لائے
ہیں؟ خوب اچھی طرح سن لو کہ یہی لوگ بے وقوف ہیں، لیکن وہ یہ بات نہیں جانتے ۱۳ اور جب یہ اُن لوگوں سے ملتے ہیں
جو اِیمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، اور جب یہ اپنے شیطانوں کے پاس تنہائی میں جاتے ہیں تو کہتے
ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو مذاق کر رہے تھے ۱۴ اللہ ان سے مذاق (کا معاملہ) کرتا ہے اور انہیں ایسی ڈھیل دیتا
ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں ۱۵ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے، لہٰذا نہ اُن کی تجارت
میں نفع ہوا، اور نہ انہیں صحیح راستہ نصیب ہوا ۱۶ اُن کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے ایک آگ روشن کی، پھر جب اس
(آگ نے) اس کے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے اُن کا نور سلب کر لیا اور انہیں اندھیریوں میں چھوڑ دیا کہ انہیں کچھ سجھائی
نہیں دیتا ۱۷ وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، چنانچہ اب وہ واپس نہیں آئیں گے ۱۸ یا پھر (ان منافقوں کی
مثال ایسی ہے) جیسے آسمان سے برستی ایک بارش ہو، جس میں اندھیریاں بھی ہوں، اور گرج بھی اور چمک بھی۔ وہ کڑکوں
کی آواز پر موت کے خوف سے اپنی اُنگلیاں اپنے کانوں میں دے لیتے ہیں۔ اور اللہ نے کافروں کو گھیرے میں لے رکھا
ہے ۱۹ ایسا لگتا ہے کہ بجلی اُن کی آنکھوں کو اُچک لے جائے گی۔ جب بھی بجلی اُن کے لئے روشنی کر دیتی ہے، وہ اُس
(روشنی) میں چل پڑتے ہیں، اور جب وہ اُن پر اندھیرا کر دیتی ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں، اور اگر اللہ چاہتا تو اُن کے سننے
اور دیکھنے کی طاقتیں چھین لیتا، بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۲۰

خلاصۂ تفسیر

اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دِن پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں (بلکہ) چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لاچکے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چال بازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یعنی اس چال بازی کا انجامِ بد خود اپنے ہی کو بھگتنا پڑے گا) اُن کے دِلوں میں بڑا مرض ہے، سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے اُن کا مرض (اس مرض میں اُن کی بد اعتقادی اور اِسلام اور مسلمانوں کی ترقی دیکھ کر حسد میں جلنا اور ہر وقت اپنا کفر ظاہر ہو جانے کی فکر و خلجان سب داخل ہیں، مسلمانوں کی ترقی سے اُن کا مرضِ حسد اور بڑھنا واضح ہے) اور ان کے لئے سزائے دردناک ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے (یعنی اِیمان کا جھوٹا دعویٰ کیا کرتے تھے) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں ہم تو اِصلاح ہی کرنے والے ہیں (ان کی دورُخی رَوِش سے جب فتنے فساد واقع ہونے لگے اور کسی خیر خواہ نے فہمائش کی کہ ایسی کارروائی موجبِ فساد ہوا کرتی ہے اس کو چھوڑ دو تو اس کے جواب میں یہ اپنے آپ کو بجائے مفسد کے مصلح بتاتے ہیں یعنی اپنے فساد ہی کو اِصلاح سمجھتے ہیں) یاد رکھو بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یہ تو ان کی جہالت اور غباوَت کا بیان ہے کہ اپنے عیب ہی کو ہنر سمجھتے ہیں، آگے دُوسری جہالت کا بیان ہے کہ دُوسروں کے ہنر کو یعنی اِیمانِ خالص کو عیب اور حقیر سمجھتے ہیں) اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا اِیمان لائے ہیں اور لوگ، تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لاویں گے جیسا اِیمان لے آئے ہیں یہ بیوقوف، یاد رکھو کہ بے شک یہی ہیں بیوقوف لیکن اس کا علم نہیں رکھتے (یہ منافق ایسی کھلی ہوئی بات بظاہر غریب مسلمانوں کے سامنے کر لیتے ہوں گے جن سے اُن کو کوئی اندیشہ نہ تھا، ورنہ عام طور پر تو وہ اپنے کفر کو چھپاتے پھرتے تھے) اور جب ملتے ہیں وہ منافقین اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اِیمان لے آئے ہیں، اور جب خلوَت میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو (مسلمانوں سے) صرف اِستہزاء کیا کرتے ہیں (یعنی ہم مسلمانوں سے بطورِ تمسخر کہہ دیتے ہیں کہ ہم اِیمان لائے ہیں ورنہ ہم تو تمہارے، ہم مشرب ہیں، آگے اُن کے اِستہزاء کا جواب ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہی اِستہزاء کر رہے ہیں ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں اُن کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں (وہ اللہ کا اِستہزاء یہی ہے کہ ان کو مہلت دی جارہی ہے، جب وہ خوب کفر میں کامل ہو جاویں اور جرم سنگین ہو جاوے اس وقت اچانک پکڑ لئے جاویں گے، چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل اُن کے اِستہزاء کے مقابلہ میں تھا اس لئے اس کو اِستہزاء کے عنوان سے تعبیر کر دیا گیا) یہ

وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو نفع بخش نہ ہوئی اُن کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقے پر چلے (یعنی اُن کو تجارت کا سلیقہ نہ ہوا کہ ہدایت جیسی قیمتی چیز کے بدلے میں گمراہی لے لی) اُن کی حالت اُس شخص کی حالت کے مشابہ ہے جس نے کہیں آگ جلائی ہو پھر جب روشن کر دیا ہو اس آگ نے اس شخص کے گرداگرد کی سب چیزوں کو، ایسی حالت میں سلب کر لیا ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہو ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہ ہوں (تو جس طرح یہ شخص اور اس کے ساتھی روشنی کے بعد اندھیرے میں رہ گئے اسی طرح منافقین حق واضح ہو کر سامنے آجانے کے بعد گمراہی کے اندھیرے میں جا پھنسے اور جس طرح آگ جلانے والوں کی آنکھ، کان، زبان، اندھیرے میں بیکار ہو گئے، اسی طرح گمراہی کے اندھیرے میں پھنس کر ان کی یہ حالت ہو گئی کہ گویا وہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں سو یہ اب رُجوع نہ ہوں گے (کہ ان کے حواس حق کو دیکھنے سننے سمجھنے کے قابل نہ رہے، یہ مثال تو اُن منافقین کی تھی جو خوب دِل کھول کر کفر پر جمے ہوئے ہیں، کبھی اِیمان کا دھیان بھی دِل میں نہیں آتا، آگے منافقین کے اُس گروہ کی مثال ہے جو فی الواقع تردّد میں تھے، کبھی کبھی اِسلام کی حقانیت دیکھ کر اس کی طرف مائل ہونے لگتے، پھر جب اَغراضِ نفسانی کا غلبہ ہوتا تو یہ میلان بدل جاتا تھا) یا اُن منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے آسمان کی طرف سے بارش ہو اس میں اندھیری بھی ہو اور رَعد برق بھی ہو، (جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں) وہ ٹھونسے لیتے ہیں اپنی اُنگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے سبب اندیشۂ موت سے، اور اللہ تعالیٰ اِحاطے میں لئے ہوئے ہے کافروں کو، برق کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بینائی اس نے لے لی، جہاں ذرا اُن کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کر دیا، اور جب اُن پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے، اور اگر اللہ تعالیٰ اِرادہ کرتے تو ان کے کان اور آنکھ سب سلب کر لیتے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں (تو جس طرح یہ لوگ کبھی طوفانِ باد و باراں میں کبھی چلنے سے رہ جاتے ہیں، کبھی موقع پا کر آگے چلنے لگتے ہیں، یہی حال ان متردّد منافقین کا ہے)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں قرآنِ کریم کا شک وشبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد بیس آیتوں میں اُس کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے حالات کا ذِکر کیا گیا ہے، اوّل پانچ آیتوں میں ماننے والوں کا تذکرہ ''متقین'' کے عنوان سے ہے، پھر دو آیتوں میں ایسے نہ ماننے والوں کا ذِکر ہے جو کھلے طور پر قرآن کا

معاندانہ انکار کرتے تھے، ان تیرہ آیتوں میں ایسے منکرین وکفار کا ذِکر ہے جو ظاہر میں اپنے آپ کو مؤمن مسلمان کہتے تھے، مگر حقیقت میں مؤمن نہ تھے، اِن لوگوں کا نام قرآن میں ''منافقین'' رکھا گیا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں پہلی دو آیتوں میں منافقین کے متعلق فرمایا کہ ''لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر، حالانکہ وہ بالکل اِیمان والے نہیں، بلکہ وہ چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور اُن لوگوں سے جو اِیمان لاچکے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چال بازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔''

اس میں اُن کے دعوئ اِیمان کو غلط اور جھوٹ قرار دِیا گیا، اور یہ کہ ان کا یہ دعویٰ محض فریب ہے، یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں دے سکتا، اور غالباً یہ لوگ بھی ایسا نہ سمجھتے ہوں گے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دے سکتے ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ اُن کی چال بازی کو ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ چال بازی قرار دے کر فرمایا گیا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ چال بازی کرتے ہیں۔ (قرطبی عن الحسن)[1]

اسی لئے اس کا نتیجہ یہ بتلایا گیا کہ یہ بیوقوف اپنے سوا کسی کے ساتھ چال بازی نہیں کر رہے ہیں، کیونکہ اللہ جل شانہٗ تو ہر دھوکہ وفریب سے بالاتر ہیں ہی، ان کے رسول اور مؤمنین بھی وحیٔ اِلٰہی کی وجہ سے ہر دھوکہ، فریب سے محفوظ ہوجاتے ہیں، کوئی نقصان اُن کو نہیں پہنچتا، البتہ ان کے دھوکہ، فریب کا وَبال دُنیا وآخرت میں خود اُنہیں پر پڑتا ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا کہ ''اُن کے دِلوں میں بڑا مرض ہے، سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے اُن کے مرض کو'' مرض اور بیماری اس کیفیت کو کہتے ہیں جس سے اِنسان اپنے اِعتدالِ مناسب سے نکل جائے، اور اس کے افعال میں خلل پیدا ہوجائے، جس کا آخری نتیجہ ہلاکت اور موت ہوتا ہے۔

قرآن وحدیث کی اِصطلاح میں اُن نفسانی کیفیات کو بھی مرض کہا جاتا ہے جو نفسِ اِنسانی کے کمال میں خلل انداز ہوں، اور جن کی وجہ سے اِنسان اپنے اِنسانی اعمال سے محروم ہوتا چلا جائے، جس کا آخری نتیجہ رُوحانی موت وہلاکت ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دِلوں کے اَمراض خواہشاتِ نفسانی کے اِتباع سے پیدا ہوتے ہیں، جیسے بدنِ اِنسان کے امراض اخلاطِ اِنسان کی بے اِعتدالی سے پیدا ہوتے ہیں، اس آیت میں اُن کے دِلوں میں مخفی کفر کو مرض فرمایا گیا ہے جو رُوحانی اور جسمانی دونوں اِعتبار سے بڑا مرض ہے، رُوحانی مرض ہونا تو ظاہر ہے کہ اوّل تو اپنے پیدا کرنے والے، پالنے والے کی ناشکری اور اس کے اَحکام سے سرکشی جس کا نام کفر ہے، یہ خود رُوحِ اِنسانی کے لئے سب سے بڑا مرض اور شرافتِ اِنسانی کے لئے بدترین داغ ہے۔ دُوسرے دُنیا کی ذلیل اَغراض کی خاطر اس کو چھپاتے رہنا اور اپنے دِل کی بات کو ظاہر کرنے کی بھی جرأت نہ کرنا، یہ دُوسری دناءت ہے جو رُوح کا بہت بڑا مرض ہے۔ اور نفاق کا جسمانی

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۱۹۵

مرض ہونا اس بنا پر ہے کہ منافق کے دِل میں ہمیشہ یہ دغدغہ رہتا ہے کہ کہیں میرا اصلی حال کھل نہ جائے، شب وروز اس کی فکر میں رہنا خود ایک جسمانی مرض ہے، اِس کے علاوہ اس مرض کا لازمی نتیجہ حسد ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کو دیکھ کر منافق کو جلن ہوگی، مگر وہ مسکین اپنے دِل کی سوزش کا اِظہار بھی نہیں کرسکتا، یہ اسباب اُن کے جسمانی مرض بھی بن جاتے ہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض اور بھی بڑھا دیا، اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی سے جلتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو یہ ترقی دینا ہے، اور ہر وقت اس کے مشاہدات ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اُن کا یہ مرض بڑھتا ہی رہتا ہے۔

چوتھی اور پانچویں آیتوں میں منافقین کا یہ مغالطہ مذکور ہے کہ فساد کو اِصلاح سمجھتے اور اپنے آپ کو مصلح کہتے تھے، قرآنِ کریم نے واضح کیا کہ فساد و اِصلاح زبانی دعووں پر دائر نہیں ہوتے، ورنہ کوئی چور ڈاکو بھی اپنے آپ کو مفسد کہنے کو تیار نہیں، بلکہ مدارِ کار اس کام پر ہے جو کیا جارہا ہے، وہ فساد ہے، تو کرنے والے کو مفسد ہی کہا جائے گا، خواہ اس کی نیت فساد کی نہ ہو۔

چھٹی آیت میں منافقین کے سامنے صحیح اِیمان کا ایک معیار رکھا گیا کہ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ یعنی ''اِیمان لاؤ جیسے اِیمان لائے ہیں اور لوگ'' اس میں لفظ ''نـــاس'' سے مراد باتفاقِ مفسرین صحابہ کرامؓ ہیں، کیونکہ وہی حضرات ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت اِیمان لائے تھے، کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہی اِیمان معتبر ہے جو صحابہ کرامؓ کے اِیمان کی طرح ہو، جن چیزوں میں جس کیفیت کے ساتھ ان کا اِیمان ہے اسی طرح کا اِیمان دُوسروں کا ہوگا تو اِیمان کہا جائے گا، ورنہ نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کا اِیمان ایک کسوٹی ہے، جس پر باقی ساری اُمت کے اِیمان کو پَرکھا جائے گا، جو اس کسوٹی پر صحیح نہ ہو اس کو شرعاً اِیمان اور ایسا کرنے والے کو مؤمن نہ کہا جائے گا، اس کے خلاف کوئی عقیدہ اور عمل خواہ ظاہر میں کتنا ہی اچھا نظر آئے اور کتنی ہی نیک نیتی سے کیا جائے اللہ کے نزدیک اِیمان معتبر نہیں۔ ان لوگوں نے صحابہ کرامؓ کو ''سفہاء''یعنی بیوقوف کہا، اور یہی ہر زمانے کے گمراہوں کا طریقہ رہا ہے کہ جو اُن کو صحیح راہ بتلائے اس کو بیوقوف جاہل قرار دیتے ہیں، مگر قرآنِ کریم نے بتلادیا کہ درحقیقت وہ خود ہی بیوقوف ہیں کہ ایسی کھلی نشانیوں پر اِیمان نہیں رکھتے۔

ساتویں آیت میں منافقین کے نفاق اور دورُخی پالیسی کا اس طرح ذِکر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ جب مسلمانوں سے ملتے تو کہتے تھے کہ ہم مؤمن مسلمان ہوگئے، اور جب اپنی قوم کے کافر لوگوں سے ملتے تو کہتے تھے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھی ہیں، اور تمہاری قوم کے فرد ہیں، اور مسلمانوں کے ساتھ تو محض تمسخر و اِستہزاء کے لئے، یعنی ان کو بیوقوف بنانے کے لئے ملتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں اُن کی اس احمقانہ گفتگو کا جواب ہے کہ یہ بے شعور سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں سے اِستہزاء کرتے ہیں اور ان کو بیوقوف بنارہے ہیں، حالانکہ درحقیقت خود بیوقوف بن رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حلم وکرم سے

اُن کو ڈھیل دے کر خود انہی کے اِستہزاء کا سامان کر دیا ہے کہ ظاہر میں کسی عذاب کے نہ آنے سے وہ اور غفلت میں پڑ گئے، اور اپنی سرکشی میں بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کا جرم اور سنگین ہو گیا، پھر دفعۃً پکڑ لئے گئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عمل چونکہ ان کے اِستہزاء کے جواب میں تھا اس لئے اس عمل کو بھی اِستہزاء سے تعبیر کیا گیا۔

نویں آیت میں منافقین کے اس حال کا ذِکر ہے کہ انہوں نے اِسلام کو بھی قریب سے دیکھا، اس کا ذائقہ بھی چکھا، اور کفر میں تو پہلے سے مبتلا ہی تھے، پھر کفر و اِسلام دونوں کو دیکھنے سمجھنے کے بعد انہوں نے اپنی ذلیل دُنیاوی اَغراض کی خاطر اِسلام کے بدلے کفر ہی کو ترجیح دی، اُن کے اس عمل کو قرآنِ کریم نے تجارت (بیوپار) کا نام دے کر یہ بتلایا کہ ان لوگوں کو بیوپار کا بھی سلیقہ نہ آیا کہ بہترین قیمتی چیز یعنی اِیمان دے کر رَدّی اور تکلیف دہ چیز یعنی کفر خرید لیا۔

آخری چار آیتوں میں منافقین کے حال کی دو مثالیں دے کر اس کا قابلِ نفرت ہونا بیان فرمایا گیا، دو مثالیں اس بنا پر دی گئیں کہ منافقین میں دو طرح کے آدمی تھے، ایک وہ جو اپنے کفر میں بالکل پختہ تھے، اِیمان کا اِظہار صرف دُنیوی مصلحت کی وجہ سے کرتے تھے، اِیمان و اِسلام سے اُن کو کوئی واسطہ نہ تھا، دُوسرے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اِسلام کی حقانیت سے متأثر ہو کر کبھی کبھی سچے مسلمان ہونے کا اِرادہ بھی کر لیتے تھے، مگر پھر دُنیوی اَغراض سامنے آ کر ان کو اس اِرادے سے روک دیتی تھیں، اسی طرح وہ ایک تذبذب اور تردّد کے حال میں رہتے۔

اسی مضمون کے ضمن میں ان ظالموں کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے اِحاطۂ قدرت سے باہر نہیں، ہر وقت ہر حال میں ہلاک بھی کر سکتے ہیں، اور بینائی و شنوائی کی طاقتیں بھی سلب کر سکتے ہیں۔

یہ تیرہ آیتیں منافقین کے حال و مثال پر مشتمل ہیں، ان میں بہت سے اَحکام و مسائل اور اہم ہدایات بھی ہیں۔

۱- کیا کفر و نفاق عہدِ نبوی کے ساتھ مخصوص تھا یا اب بھی موجود ہے؟

اس معاملہ میں صحیح یہ ہے کہ منافق کے نفاق کو پہچاننا اور اس کو منافق قرار دینا دو طریقوں سے ہوتا تھا، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلا دیا کہ فلاں شخص دِل سے مسلمان نہیں منافق ہے، دُوسرے یہ کہ اُس کے کسی قول و فعل سے، کسی عقیدۂ اِسلام کے خلاف کوئی بات یا اِسلام کی مخالفت کا کوئی عمل ظاہر اور ثابت ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اِنقطاعِ وحی کے سبب اُن کے پہچاننے کی پہلی صورت تو باقی نہ رہی، مگر دُوسری صورت اب بھی موجود ہے، جس شخص کے کسی قول و فعل سے اسلامی قطعی عقائد کی مخالفت یا اُن پر اِستہزاء یا تحریف ثابت ہو جائے، مگر وہ اپنے اِیمان و اِسلام کا مدعی بنے تو وہ منافق سمجھا جائے گا، ایسے منافق کا نام قرآن کی اِصطلاح میں ''ملحد'' ہے: اَلَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا (حم السجدۃ: ۴۰)، اور حدیث میں اُس کو ''زِندیق'' کے نام سے موسوم کیا گیا، مگر

چونکہ اس کا کفر دلیل سے ثابت اور واضح ہوگیا، اس لئے اس کا حکم سب کفار جیسا ہوگیا، الگ کوئی حکم اس کا نہیں ہے، اسی لئے علمائے اُمت نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منافقین کا قضیہ ختم ہوگیا، اب جو مؤمن نہیں وہ کافر کہلائے گا۔

حضرت اِمام مالکؒ سے ''عمدہ'' شرحِ بخاری میں نقل کیا گیا ہے کہ بعد زمانۂ نبوّت کے نفاق کی یہی صورت ہے جس کو پہچانا جاسکتا ہے، اور ایسا کرنے والے کو منافق کہا جاسکتا ہے۔

۲-اِیمان وکفر کی حقیقت

آیاتِ مذکورہ میں غور کرنے سے اِیمان واِسلام کی پوری حقیقت واضح ہوجاتی ہے، اور اس کے بالمقابل کفر کی بھی، کیونکہ ان آیات میں منافقین کی طرف سے اِیمان کا دعویٰ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ میں، اور قرآنِ کریم کی طرف سے اُن کے اس دعوے کا غلط ہونا وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ میں ذِکر کیا گیا ہے۔ یہاں چند باتیں غور طلب ہیں:-

اوّل یہ کہ جن منافقین کا حال قرآنِ کریم میں بیان فرمایا گیا ہے، وہ اصل میں یہودی تھے، اور اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر اِیمان لانا یہود کے مذہب میں بھی ثابت اور مُسلّم ہے، اور جو چیز اُن کے عقیدہ میں نہیں تھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رِسالت ونبوّت کو ماننا اور آپ پر اِیمان لانا، اس کو انہوں نے اپنے بیان میں ذِکر نہیں کیا، بلکہ صرف دو چیزیں ذِکر کیں: اِیمان باللہ، اِیمان بالیوم الآخر، جس میں اُن کو جھوٹا نہیں کہا جاسکتا، پھر قرآنِ کریم میں اُن کو جھوٹا قرار دینا اور اُن کے اِیمان کا اِنکار کرنا کس بنا پر ہے؟

بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی من مانی صورتوں میں خدا تعالیٰ یا آخرت کا اِقرار کرلینا اِیمان نہیں، یوں تو مشرکین بھی کسی نہ کسی انداز سے اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور سب سے بڑا قادرِ مطلق مانتے ہیں، اور مشرکینِ ہندوستان تو ''پرلو'' کا نام دے کر قیامت کا ایک نمونہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر قرآن کی نظر میں یہ اِیمان نہیں، بلکہ صرف وہ اِیمان معتبر ہے جو اس کی بتلائی ہوئی تمام صفات کے ساتھ ہو، اور آخرت پر اِیمان وہ معتبر ہے جو قرآنِ کریم اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے حالات واوصاف کے ساتھ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہود اس معنی کے اِعتبار سے نہ اللہ پر اِیمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر، کیونکہ ایک طرف تو وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں، اور آخرت کے معاملے میں بھی یہ غلط اِعتقاد رکھتے ہیں کہ انبیاء کی اولاد کچھ بھی کرتی رہے وہ بہرحال اللہ تعالیٰ کی محبوب ہے، اُن سے آخرت میں کوئی بازپرس نہ ہوگی، اور کچھ عذاب ہوا بھی تو بہت معمولی ہوگا، اس لئے قرآنی اِصطلاح کے اِعتبار سے اُن کا یہ کہنا کہ ہم اللہ اور روزِ قیامت پر اِیمان لائے ہیں، غلط اور جھوٹ ہوا۔

۳- کفر و ایمان کا ضابطہ

قرآن کی اِصطلاح میں اِیمان وہ ہے جس کا ذِکر اُوپر سورۂ بقرہ کی تیرہویں آیت میں آچکا ہے: وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ، جس سے معلوم ہوا کہ اِیمان کا دعویٰ صحیح یا غلط کے جانچنے کا معیار صحابہ کرامؓ کا اِیمان ہے، جو اس کے مطابق نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اِیمان نہیں۔

اگر کوئی شخص قرآنی عقیدہ کا مفہوم قرآنی تصریح یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے خلاف قرار دے کر یہ کہے کہ میں تو اس عقیدے کو مانتا ہوں تو یہ ماننا شرعاً معتبر نہیں، جیسا کہ آج کل قادیانی گروہ کہتا ہے کہ ہم بھی عقیدۂ ختمِ نبوّت کو مانتے ہیں، مگر اس عقیدہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات اور صحابہ کرامؓ کے اِیمان سے بالکل مختلف تحریف کرتے ہیں، مرزا غلام احمد کی نبوّت کے لئے جگہ نکالتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی اس تصریح کے مطابق وہ اسی کے مستحق ہیں کہ ان کو مَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ کہا جائے، یعنی وہ ہرگز مؤمن نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اِیمانِ صحابہؓ کے خلاف کوئی شخص کسی عقیدہ کا نیا مفہوم بنائے، اور اس عقیدہ کا پابند ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو مؤمن مسلمان بتلائے اور مسلمانوں کے نماز روزہ میں شریک بھی ہو، مگر جب تک وہ قرآن کے اس بتلائے ہوئے معیار کے مطابق اِیمان نہیں لائے گا، اس وقت تک وہ قرآن کی اِصطلاح میں مؤمن نہیں کہلائے گا۔

ایک شبہ کا اِزالہ

حدیث وفقہ کا یہ مشہور مقولہ کہ ''اہلِ قبلہ کو کافر نہیں کہا جاسکتا'' اس کا مطلب بھی آیتِ مذکورہ کے تحت میں یہ متعین ہوگیا کہ اہلِ قبلہ سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو ضروریاتِ دِین میں سے کسی چیز کے منکر نہیں، ورنہ یہ منافقین بھی تو قبلہ کی طرف سب مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتے تھے، مگر یہ صرف رُو بہ قبلہ نماز پڑھنا اُن کے اِیمان کے لئے اس بنا پر کافی نہ ہوا کہ ان کا اِیمان صحابہ کرامؓ کی طرح تمام ضروریاتِ دِین پر نہیں تھا۔

۴- جھوٹ ایک گھناؤنی چیز ہے

یہاں منافقین کے قول: اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ میں غور کیجئے کہ یہ لوگ پرلے درجے کے کافر ہونے کے باوجود اپنی دانست میں جھوٹ بولنے سے اِجتناب کرتے ہیں، کیونکہ دعویٔ اِیمان کے لئے صرف اللہ اور روزِ قیامت پر اِیمان کا ذِکر کرتے ہیں، اِیمان بالرسول کا ذِکر اس لئے نہیں کرتے کہ جھوٹ نہ ہوجائے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی گندی اور گھناؤنی چیز ہے کہ کوئی شریف آدمی خواہ کافر، فاسق ہو، جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا۔

یہ دُوسری بات ہے کہ ان کا دعویٰ ایمان باللہ وبالیوم الآخر بھی قرآنی اِصطلاح کے خلاف ہونے کی وجہ سے نتیجتاً جھوٹ ثابت ہوا۔

۵- انبیاء واولیاء کے ساتھ برا سلوک کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ برائی کرنا ہے

آیاتِ مذکورہ میں منافقین کا ایک حال یہ بتلایا ہے: یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ ،یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں، اوراس کے ساتھ چال بازی کرتے ہیں، حالانکہ گروہِ منافقین میں شاید کوئی بھی ایسا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا قصد رکھتا ہو، یا یہ سمجھتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو فریب دے سکتا ہے، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کو دھوکہ دینے کے قصد سے شنیع حرکتیں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آیتِ مذکورہ میں اس کو اللہ کو دھوکہ دینا قرار دے کر یہ بتلادیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی رسول یا ولی کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرتا ہے، وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کے حکم میں ہے۔ دُوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعتِ شان کی طرف بھی اِشارہ کردیا گیا کہ آپ کی شان میں کوئی گستاخی کرنا ایسا ہی جرم ہے جیسا اللہ جل شانہٗ کی شان میں گستاخی جرم ہے۔

۶- جھوٹ بولنے کا وَبال

آیاتِ مذکورہ میں منافقین کے عذابِ الیم کی وجہ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ یعنی اُن کے جھوٹ بولنے کو قرار دِیا ہے، حالانکہ ان کے کفر ونفاق کا جرم سب سے بڑا تھا، اور دُوسرے جرائم مسلمانوں سے حسد، اُن کے خلاف سازشیں بھی بڑے جرائم تھے، مگر عذابِ الیم کا سبب ان کے جھوٹ بولنے کو قرار دِیا، اس میں یہ اِشارہ پایا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ان کا اصلی جرم تھا، اسی بری عادت نے اُن کو کفر ونفاق تک پہنچا دیا تھا، اس لئے جرم کی حیثیت اگرچہ کفر ونفاق کی بڑھی ہوئی ہے، مگر ان سب خرابیوں کی جڑ اور بنیاد جھوٹ بولنا ہے، اسی لئے قرآنِ کریم نے جھوٹ بولنے کو بت پرستی کے ساتھ جوڑ کر اس طرح اِرشاد فرمایا ہے:-

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۰﴾ (الحج)

''یعنی بچو بت پرستی کی نجاست سے اور بچو جھوٹ بولنے سے۔''

۷- اِصلاح وفساد کی تعریف اور مصلح ومفسد کی پہچان

آیاتِ مذکورہ میں گزر چکا ہے کہ جب کوئی ان منافقین سے یہ کہتا کہ اپنے نفاق کے ذریعہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ بڑے زور اور تاکید سے کہتے تھے: اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ، اس میں لفظ اِنَّمَا جو حصر واِنحصار کے لئے بولا جاتا ہے اس کی

وجہ سے معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ ہم تو مصلح ہی ہیں، یعنی ہمارے کسی عمل کا فساد سے کوئی واسطہ نہیں، مگر قرآنِ کریم نے اُن کے جواب میں فرمایا: اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲ یعنی ''یاد رکھو کہ یہی لوگ مفسد ہی ہیں مگر ان کو اس کا شعور نہیں۔''

اس میں دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ منافقین کی حرکات حقیقۃً زمین میں فتنہ وفساد پھیلنے کا سبب تھیں، دُوسری بات یہ کہ منافقین فتنہ وفساد پھیلانے کی نیت اور قصد سے یہ کام نہ کرتے تھے بلکہ ان کو معلوم بھی نہ تھا کہ اس کا نتیجہ فتنہ وفساد ہے، جیسا کہ قرآن کی تصریح وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ زمین میں فتنہ وفساد جن چیزوں سے پھیلتا ہے اُن میں کچھ تو ایسی چیزیں ہیں جن کو ہر شخص فتنہ وفساد سمجھتا ہے، جیسے قتل، غارتگری، چوری، دھوکا، فریب، اِغوا، بدکاری وغیرہ ہر سمجھ دار آدمی ان کو شر وفساد سمجھتا ہے، اور ہر شریف آدمی ان سے بچتا ہے، اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنی ظاہری سطح کے اِعتبار سے کوئی فتنہ وفساد نہیں ہوتیں، مگر اُن کی وجہ سے اِنسانوں کے اَخلاق برباد ہوتے ہیں، اور اِنسانوں کی اخلاقی گراوٹ سارے فتنوں اور فسادوں کے دروازے کھول دیتی ہے، ان منافقین کا بھی یہی حال تھا کہ چوری، ڈاکا، بدکاری وغیرہ سے بچتے تھے، اسی لئے بڑی زور سے اپنے مفسد ہونے کا اِنکار اور مصلح ہونے کا اِثبات کیا۔

مگر نفاق اور کینہ وحسد اور اس کے ماتحت دُشمنوں سے سازشیں، یہ چیزیں انسان کے اخلاق کو ایسا تباہ کر دیتی ہیں کہ اِنسان بہت سے حیوانوں کی سطح سے بھی نیچے آجاتا ہے، اور ایسے کام کرنے پر اُتر آتا ہے جو کبھی کسی بھلے مانس سے متصوّر نہیں ہوتے، اور جب اِنسان اپنے اِنسانی اخلاق کھو بیٹھا، تو اِنسانی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد ہی فساد آجاتا ہے، فساد بھی ایسا عظیم جو نہ درندے جانوروں سے متوقع ہے، نہ ڈاکوؤں اور چوروں سے، کیونکہ ان کے فساد کو قانون اور حکومت کی طاقت سے روکا جاسکتا ہے، مگر قانون تو اِنسان ہی جاری کرتے ہیں، جب اِنسان اِنسان ہی نہ رہا تو قانون کی جو گت بنے گی اس کا تماشا آج کھلی آنکھوں ہر شخص ہر محکمہ اور ہر اِدارہ میں دیکھتا ہے، آج دُنیا کا تمدّن ترقی پذیر ہے، تعلیم وتعلّم کے اِداروں کا جال گاؤں گاؤں تک پھیلا ہوا ہے، ''تہذیب، تہذیب'' کے الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں، قانون سازی کی مجلس کا بازار گرم ہے، تنفیذِ قانون کے بے شمار اِدارے اَربوں روپے کے خرچ سے قائم ہیں، دفتری اِنتظامات کی بھول بھلیّاں ہے، مگر جرائم اور فتنے وفساد روز بروز بڑھتے ہی جاتے ہیں، وجہ اس کے سوا نہیں کہ کوئی قانون خودکار مشین نہیں ہوتا، بلکہ اس کو اِنسان چلاتے ہیں، جب اِنسان اپنی اِنسانیت کھو بیٹھا تو پھر اس فساد کا علاج نہ قانون سے ہوسکتا ہے نہ حکومت اور محکموں کے چکر سے، اسی لئے اِنسانیت کے عظیم ترین محسن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز فرمائی ہے کہ

اِنسان کو صحیح معنی میں اِنسان بنادیں، تو پھر فساد و جرائم خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، نہ پولیس کی زیادہ ضرورت رہتی ہے، نہ عدالتوں کے اس پھیلاؤ کی جو دُنیا میں پایا جاتا ہے، اور جب تک دُنیا کے جس حصہ میں آپ کی تعلیمات و ہدایات پر عمل ہوتا رہا دُنیا نے وہ امن و امان دیکھا جس کی نظیر نہ پہلے کبھی دیکھی گئی نہ ان تعلیمات کو چھوڑنے کے بعد متوقع ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کی رُوح ہے اللہ تعالیٰ کا خوف، اور قیامت کے حساب کتاب کی فکر، اس کے بغیر کوئی قانون و دستور اور کوئی محکمہ اور کوئی مدرسہ اور یونیورسٹی اِنسان کو جرائم سے باز رکھنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔

آج کی دُنیا میں جن لوگوں کے ہاتھ میں اِختیار کی باگ ہے وہ جرائم کے اِنسداد کے لئے نئے سے نئے اِنتظام کو تو سوچتے ہیں، مگر اس رُوحِ اِنتظام یعنی خوفِ خدا سے نہ صرف غفلت برتتے ہیں بلکہ اس کو فنا کرنے کے اسباب مہیا کرتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ ہمیشہ یہی سامنے آتا رہتا ہے کہ ۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کھلے طور پر فساد مچانے والے چوروں، غارت گروں کا علاج سہل ہے، مگر اُن اِنسانیت فراموش اِنسانوں کا فساد ہمیشہ برنگِ اِصلاح ہوتا ہے، وہ کوئی دِلچسپ دِلفریب اِصلاحی اسکیم بھی سامنے رکھ لیتے ہیں، اور خالص ذاتی اَغراضِ فاسدہ کو اِصلاح کا رَنگ دے کر اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کے نعرے لگاتے رہتے ہیں، اسی لئے حق تعالیٰ سبحانہٗ نے جہاں فساد سے روکا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا: وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ (البقرۃ: ۲۲۰) یعنی ''اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون؟'' جس میں اِشارہ فرمادیا کہ فساد و صلاح کی اصل حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں جو دِلوں کے حال اور نیتوں سے بھی واقف ہیں، اور ہر عمل کے خواص و نتائج کو بھی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ صلاح ہوگا یا فساد، اس لئے اِصلاح کے لئے صرف نیتِ اِصلاح کافی نہیں، بلکہ عمل کا رُخ بھی شریعت کے مطابق صحیح ہونا ضروری ہے، بعض اوقات کوئی عمل پوری نیک نیتی اور اِصلاح کے قصد سے کیا جاتا ہے مگر اس کا اثر فساد و فتنہ ہوتا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ

اے لوگو! بندگی کرو اپنے رَبّ کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم

تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ

پرہیزگار بن جاؤ۔ جس نے بنایا واسطے تمہارے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت اور اُتارا

مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا

آسمان سے پانی، پھر نکالے اس سے میوے تمہارے کھانے کے واسطے، سو نہ ٹھہراؤ کسی کو

لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

اللہ کے مقابل اور تم تو جانتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور اُن لوگوں کو پیدا کیا جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تاکہ تم متقی بن جاؤ ﴿۲۱﴾ (وہ پروردگار) جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا، اور آسمان کو چھت، اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے تمہارے رزق کے طور پر پھل نکالے، لہٰذا اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ، جبکہ تم (یہ سب باتیں) جانتے ہو ﴿۲۲﴾

خلاصۂ تفسیر

اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ (شاہی محاورہ میں ''عجب نہیں'' کا لفظ وعدہ کے موقع پر بولا جاتا ہے) وہ ذاتِ پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر (پردۂ عدم سے) نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے، اب تو مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم تو جانتے بوجھتے ہو، (یعنی یہ جانتے ہو کہ یہ تمام تصرفات خدا تعالیٰ کے سوا کوئی کرنے والا نہیں، پھر خدا کے مقابلہ میں دُوسری چیزوں کو معبود بنانا کیسے دُرست ہوسکتا ہے)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات

سورۂ بقرہ کی دُوسری آیت میں اُس دُعا و درخواست کا جواب تھا جو سورۂ فاتحہ میں آئی ہے، یعنی: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾ یعنی جو صراطِ مستقیم تم طلب کرتے ہو وہ اس کتاب میں ہے، کیونکہ قرآنِ کریم اوّل سے آخر تک صراطِ مستقیم ہی کی تشریح ہے۔

اس کے بعد قرآنی ہدایات کو قبول کرنے اور نہ کرنے کے اِعتبار سے اِنسان کے تین گروہوں کو بیان کیا گیا، پہلی تین آیات میں مؤمنین متقین کا ذِکر ہوا، جنہوں نے ہدایاتِ قرآنی کو اپنا نصب العین بنالیا، بعد کی دو آیتوں میں اُس گروہ کا ذِکر کیا جس نے کھلے طور پر اُس ہدایت کی مخالفت کی، اس کے بعد تیرہ آیتوں میں اُس خطرناک گروہ کے حالات بیان کئے گئے جو حقیقت میں تو قرآنی ہدایات کے مخالف تھے، مگر دُنیا کی ذلیل اَغراض یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے خیال سے اپنے کفر و مخالفت کو چھپا کر مسلمانوں میں شامل رہتے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے۔

اسی طرح سورۂ بقرہ کی اِبتدائی بیس آیتوں میں ہدایت کے قبول کرنے اور نہ کرنے کے معیار پر کل اِنسانوں کو تین گروہوں میں بانٹ دیا گیا، جس میں اس طرف بھی اِشارہ پایا گیا کہ اِنسانوں کی گروہی اور قومی تقسیم، نسب اور وطن یا زبان اور رنگ کی بنیادوں پر معقول نہیں، بلکہ اس کی صحیح تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی ہدایت کو ماننے والے ایک قوم، اور نہ ماننے والے دُوسری قوم جن کو سورۂ مجادلہ میں ''حزبُ اللّٰہ'' اور ''حزبُ الشیطان'' کا نام دیا گیا۔

غرض سورۂ بقرہ کی اِبتدائی بیس آیتوں میں قرآنی ہدایات کو ماننے یا نہ ماننے کی بنیاد پر اِنسان کو تین قوموں میں تقسیم کرکے ہر ایک کا کچھ حال بیان فرمایا گیا۔

اس کے بعد مذکورہ اکیسویں اور بائیسویں آیتوں میں تینوں گروہوں کو خطاب کرکے وہ دعوت پیش کی گئی ہے جس کے لئے قرآن نازل ہوا، اس میں مخلوق پرستی سے باز آنے اور ایک خدا کی عبادت کرنے کی طرف دعوت ایسے انداز سے دی گئی ہے کہ اس میں دعویٰ کے ساتھ اس کے واضح دلائل بھی موجود ہیں، جن میں ادنیٰ سمجھ بوجھ والا اِنسان بھی ذرا سا غور کرے تو توحید کے اِقرار پر مجبور ہوجائے۔

پہلی آیت میں یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ سے خطاب شروع ہوا، لفظ اَلنَّاسُ عربی زبان میں مطلق اِنسان کے معنی میں آتا ہے، اس لئے مذکورہ تینوں گروہ اس میں داخل ہیں، جن کو مخاطب کرکے اِرشاد فرمایا: اُعْبُدُوْا رَبَّكُمُ، عبادت کے معنی ہیں اپنی پوری طاقت مکمل فرمانبرداری میں صرف کرنا، اور خوف وعظمت کے پیشِ نظر نافرمانی سے دُور رہنا (رُوح البیان) [1]۔ اور لفظ ''رَبّ'' کے معنی ''پروردگار'' کے ہیں، جس کی پوری تشریح پہلے گزر چکی ہے، ترجمہ یہ ہوا کہ ''عبادت کرو اپنے رَبّ کی۔''

یہاں پر لفظ ''رَبّ'' کی جگہ لفظ ''اللّٰہ'' یا اسمائے حسنیٰ میں سے کوئی اور نام بھی لایا جاسکتا تھا، مگر ان میں سے اس جگہ لفظ ''رَبّ'' کا اِنتخاب کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اس مختصر سے جملے میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی آگئی، کیونکہ عبادت کی

---

[1] رُوح البیان ج:۱ ص:۵۱

مستحق صرف وہ ذات ہوسکتی ہے جو اِنسان کی پرورِش کی کفیل ہو، جو اس کو ایک قطرہ سے تدریجی تربیت کے ساتھ ایک بھلا چنگا، سمیع وبصیر، عقل وادراک والا ماہر اِنسان بنادے، اور اس کی بقاو ارتقا کے وسائل مہیا کرے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ اِنسان کتنا ہی جاہل ہو، اور اپنی بصیرت کو برباد کرچکا ہو، جب بھی ذرا غور کرے گا تو اس کا یقین کرنے میں اُسے ہرگز تأمل نہیں ہوگا کہ یہ شانِ رُبوبیت بجز حق تعالیٰ کے اور کسی میں نہیں، اور اِنسان پر یہ مربیانہ اِنعامات نہ کسی پتھر کے تراشے ہوئے بت نے کئے ہیں، اور نہ کسی اور مخلوق نے، اور وہ کیسے کرتے جبکہ وہ سب خود اپنے وجود اور بقا میں اُسی ''ذاتِ واحد'' کے محتاج ہیں، ایک محتاج دُوسرے محتاج کی کیا حاجت روائی کرسکتا ہے؟ اور اگر ظاہری طور پر کرے بھی تو وہ بھی درحقیقت اُسی ذات کی تربیت ہوگی جس کی طرف یہ دونوں محتاج ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ لفظ ''رَبّ'' لاکر یہ واضح کردیا گیا کہ جس ذات کی عبادت کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس کے سوا کوئی دُوسری ہستی عبادت کی مستحق ہو ہی نہیں سکتی۔

اس جملہ میں اِنسانوں کے تینوں گروہوں کو خطاب ہے، اور ہر مخاطب کے لئے اس جملہ کا معنی ومطلب جدا ہے، مثلاً جب کہا گیا کہ اپنے رَبّ کی عبادت کرو، تو کفار کے لئے اس خطاب کے معنی یہ ہوئے کہ مخلوق پرستی چھوڑ کر توحید اختیار کرو، اور منافقین کے لئے اس کے یہ معنی ہوئے کہ نفاق چھوڑ کر اِخلاص پیدا کرو، گناہگار مسلمانوں کے لئے معنی یہ ہوئے کہ گناہ سے باز آجاؤ اور کامل اِطاعت اِختیار کرو، اور متقی مسلمانوں کے لئے اس جملہ کے یہ معنی ہوئے کہ اپنی طاعت وعبادت پر ہمیشہ قائم رہو، اور اس میں ترقی کی کوشش کرو۔ (رُوح البیان) [1]

اس کے بعد ''رَبّ'' کی چند صفاتِ خاصہ کا ذِکر کرکے اس مضمون کی مزید توضیح فرمادی گئی، اِرشاد ہوتا ہے: الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ، یعنی ''تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، اور ان قوموں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں''، اس میں ''رَبّ'' کی وہ صفت بتلائی گئی ہے جو اللہ جل شانہٗ کے سوا کسی مخلوق میں پائے جانے کا کسی کو وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا، کہ نیست سے ہست اور نابود سے بود کرنا، پھر بطنِ مادر کی تاریکیوں اور گندگیوں میں ایسا حسین وجمیل، پاک وصاف اِنسان بنادینا کہ فرشتے بھی اس کی پاکی پر رَشک کریں، یہ سوائے اُس ذاتِ حق کے کس کا کام ہوسکتا ہے جو کسی کا محتاج نہیں، اور سب اُس کے محتاج ہیں۔

اس آیت میں خَلَقَکُمْ کے ساتھ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ کا اِضافہ کرکے ایک تو یہ بتلادیا کہ تم اور تمہارے آباء واجداد یعنی تمام بنی نوعِ اِنسان کا خالق وہی پروردگار ہے۔ دُوسرے صرف مِنْ قَبْلِکُمْ کا ذِکر فرمایا، من بعدکم یعنی بعد میں پیدا ہونے والے لوگوں کا ذِکر نہیں کیا، اس میں اس کی طرف بھی اِشارہ ہوگیا کہ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے

[1] تفسیر رُوح البیان تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۵۱

بعد کوئی دُوسری اُمت یا دُوسری ملت نہیں ہوگی، کیونکہ خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ کوئی نبی مبعوث ہوگا، نہ اس کی کوئی جدید اُمت ہوگی۔

اس کے بعد اسی آیت کا آخری جملہ ہے: لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ یعنی دُنیا میں گمراہی اور آخرت میں عذاب سے نجات پانے کی اُمید تمہارے لئے صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ توحید کو اِختیار کرو، اور شرک سے باز آؤ۔

کائناتِ زمین و آسمان میں قدرتِ حق کے مظاہر

پھر دُوسری آیت میں ''رَبّ'' کی دُوسری صفات کا بیان اس طرح فرمایا گیا ہے: اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ ۚ، یعنی ''رَبّ وہ ذات ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش، اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر اس پانی کے ذریعے پردۂ عدم سے نکالی پھلوں کی غذا تمہارے لئے۔''

پہلی نعمت

اِس سے پہلی آیت میں اُن اِنعامات کا ذِکر تھا جو اِنسان کی ذات سے متعلق ہیں، اور اس آیت میں اُن انعامات کا ذِکر ہے جو اِنسان کے گردوپیش کی چیزوں سے متعلق ہیں، یعنی پہلی آیت میں ''اَنفسی'' اور دُوسری میں ''آفاقی'' نعمتوں کا ذِکر فرما کر تمام اَقسامِ نعمت کا اِحاطہ فرمایا گیا۔

ان ''آفاقی'' نعمتوں میں سے زمین کی پیدائش کا ذِکر ہے کہ اس کو اِنسان کے لئے فرش بنادیا، نہ پانی کی طرح نرم ہے، جس پر قرار نہ ہوسکے، اور نہ لوہے، پتھر کی طرح سخت ہے کہ ہم اسے اپنی ضرورت کے مطابق آسانی سے اِستعمال نہ کرسکیں، بلکہ نرمی اور سختی کے درمیان ایسا بنایا گیا جو عام اِنسانی ضروریاتِ زندگی میں کام دے سکے۔

''فِرَاش'' کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین گول نہ ہو، کیونکہ زمین کا یہ عظیم الشان کرہ گول ہونے کے باوجود دیکھنے میں ایک سطح نظر آتا ہے، اور قرآن کا عام طرز یہی ہے کہ ہر چیز کی وہ کیفیت بیان کرتا ہے جس کو ہر دیکھنے والا عالم، جاہل، شہری، دیہاتی سمجھ سکے۔

دُوسری نعمت یہ ہے کہ آسمان کو ایک مزین اور نظر فریب چھت بنادیا، تیسری نعمت یہ ہے کہ آسمان سے پانی برسایا، پانی آسمان سے برسانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ بادل کا واسطہ درمیان میں نہ ہو، بلکہ محاورات میں ہر اُوپر سے آنے والی چیز کو ''آسمان سے آنا'' بولتے ہیں۔

خود قرآنِ کریم نے متعدّد مقامات میں بادلوں سے پانی برسانے کا ذِکر فرمایا ہے، مثلاً اِرشاد ہے:-

ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾ (الواقعہ)

''کیا بارش کا پانی سفید بادلوں سے تم نے اُتارا ہے یا ہم اس کے اُتارنے والے ہیں۔''

دُوسری جگہ اِرشاد ہے:-

وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾ (النبأ)

''ہم نے اُتارا پانی بھرے ہوئے بادلوں سے پانی کا ریلا۔''

چوتھی نعمت اس پانی کے ذریعے پھل پیدا کرنا اور پھلوں سے اِنسان کی غذا پیدا کرنا ہے۔ پروردگارِ عالم کی چار مذکورہ صفات میں سے پہلی تین باتیں تو ایسی ہیں کہ ان میں اِنسان کی سعی وعمل تو کیا خود اس کے وجود کو بھی دخل نہیں، بیچارے اِنسان کا نام ونشان بھی نہ تھا، جب زمین اور آسمان پیدا ہوچکے تھے اور بادل اور بارش اپنا کام کررہے تھے، ان کے متعلق تو کسی بیوقوف جاہل کو بھی یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ یہ کام سوائے حق جل شانہٗ کے کسی اِنسان یا بت یا کسی اور مخلوق نے کئے ہوں گے۔

ہاں زمین سے پھل اور پھلوں سے اِنسانی غذا نکالنے میں کسی سادہ لوح اور سطحی نظر رکھنے والے کو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ یہ اِنسانی سعی وعمل اور اس کی دانشمندانہ تدبیروں کا نتیجہ ہیں کہ وہ زمین کو نرم کرنے اور کمانے میں، پھر بیج ڈالنے اور جمانے میں، پھر اس کی تربیت اور حفاظت میں اپنی محنت خرچ کرتا ہے۔

لیکن قرآنِ کریم نے دُوسری آیات میں اس کو بھی صاف کردیا کہ اِنسان کی سعی اور محنت کو دَرخت اُگانے یا پھل نکالنے میں قطعاً کوئی دخل نہیں، بلکہ اس کی ساری تدبیروں اور محنتوں کا حاصل ''رُکاوٹوں کو دُور کرنے'' سے زیادہ کچھ نہیں، یعنی اِنسان کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ پیدا ہونے والے درخت کی راہ سے رُکاوٹیں دُور کرے اور بس۔

غور کیجئے کہ زمین کا کھودنا، اس میں ہل چلانا، اس میں سے جھاڑ جھنکاڑ کو دُور کرنا، اس میں کھاد ڈال کر زمین کو نرم کرنا جو کاشتکاروں کا اِبتدائی کام ہے، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ بیج یا گٹھلی کے اندر سے جو نازک کونپل قدرتِ خداوندی سے نکلے گی زمین کی سختی یا کوئی جھاڑ جھنکاڑ اس کی راہ میں حائل نہ ہوجائیں، بیج میں سے کونپل نکالنے اور اس میں پھول پتیاں پیدا کرنے میں اس بیچارے کاشتکار کی محنت کا کیا دَخل ہے؟

اسی طرح کاشتکار کا دُوسرا کام زمین میں بیج ڈالنا، پھر اس کی حفاظت کرنا، پھر جو کونپل نکلے اس کی سردی گرمی اور جانوروں سے حفاظت کرنا ہے، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ قدرتِ خداوندی سے پیدا ہونے والے کونپلوں کو ضائع ہونے سے بچایا جائے، ان سب کاموں کو کسی درخت کے نکلنے یا پھلنے پھولنے میں بجز دفعِ موانع کے اور کیا دخل ہے؟ ہاں

پانی سے جمنے والے بیج کی اور اس سے نکلنے والے درخت کی غذا تیار ہوتی ہے، اور اسی سے وہ پھلتا پھولتا ہے، لیکن پانی کاشتکار کا پیدا کیا ہوا نہیں، اس میں بھی کاشتکار کا کام صرف اتنا ہے کہ قدرت کے پیدا کئے ہوئے پانی کو قدرت ہی کے پیدا کئے ہوئے درخت تک ایک مناسب وقت میں اور مناسب مقدار میں پہنچا دے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ درخت کی پیدائش اور اس کے پھلنے پھولنے میں اوّل سے آخر تک اِنسان کی محنت اور تدبیر کا اس کے سوا کوئی اثر نہیں کہ نکلنے والے درخت کے راستے سے روڑے ہٹا دے، یا اس کو ضائع ہونے سے بچالے، باقی رہی درخت کی پیدائش، اس کا بڑھنا، اس میں پتے اور شاخیں پھر پھول اور پھل پیدا کرنا، سو اُس میں سوائے خدا تعالیٰ کی قدرت کے اور کسی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی مضمون کو قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:-

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾ (الواقعہ)

''بتلاؤ جو کچھ تم بوتے ہو، اُسے تم اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں؟''

قرآن کے اس سوال کا جواب اِنسان کے پاس بجز اس کے اور کیا ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ان سب درختوں کو اُگانے والے ہیں۔

اِس تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ جس طرح زمین اور آسمان کی پیدائش اور برق وباراں کے منظم سلسلۂ کار میں اِنسانی سعی ومحنت کا کوئی دخل نہیں، اسی طرح کھیتی اور درختوں کے پیدا ہونے اور ان سے پھول پھل نکلنے، اور ان سے اِنسان کی غذائیں تیار ہونے میں بھی اس کا دخل صرف برائے نام ہے، اور حقیقت میں یہ سب کاروبار صرف حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا نتیجہ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ کی ایسی چار صفات کا بیان ہے جو سوائے اس کے اور کسی مخلوق میں پائی ہی نہیں جاسکتیں، اور جب ان دونوں آیتوں سے یہ معلوم ہوگیا کہ اِنسان کو عدم سے وجود میں لانا اور پھر اس کی بقاوترقی کے سامان زمین اور آسمان، بارش اور پھل پھول کے ذریعے مہیا کرنا سوائے ذاتِ حق جل شانہٗ کے اور کسی کا کام نہیں، تو ہر اَدنیٰ سمجھ بوجھ رکھنے والے اِنسان کو اس پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ عبادت واطاعت کے لائق اور مستحق بھی صرف وہی ذات ہے، اور اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں کہ اِنسان کے بود و وجود اور اس کے بقاوارتقا کے سارے سامان تو اللہ تعالیٰ پیدا کرے، اور غافل اِنسان دُوسروں کی چوکھٹوں پر سجدہ کرتا پھرے، دُوسری چیزوں کی بندگی میں مشغول ہو جائے، مولانا رُومیؒ نے اسی غافل اِنسان کی زبان پر فرمایا ہے ؎

نعمت را خوردہ عصیاں میکنم

نعمت از تو من بغیرے می تنم [۱]

اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی ساری مخلوقات کا سردار اس لئے بنایا تھا کہ ساری کائنات اس کی خدمت کرے، اور یہ صرف ربّ کائنات کی خدمت اور عبادت میں مشغول رہے، اور کسی کی طرف نظر نہ کرے، اس کا یہ رنگ ہو جائے ۔

بگذر از یاد گل و گلبن کہ ہیچم یاد نیست

در زمین و آسماں جز ذکر حق آباد نیست [۲]

لیکن غافل اِنسان نے اپنی حماقت سے اللہ تعالیٰ ہی کو بھلا دیا تو اسے ایک خدا کی غلامی کے بجائے ستر کروڑ دیوتاؤں کی غلامی کرنا پڑی ۔

ایک دَر چھوڑ کے ہم ہوگئے لاکھوں کے غلام

ہم نے آزادیٔ عرفی کا نہ سوچا انجام

اسی غیروں کی غلامی سے نجات دِلانے کے لئے اس آیت کے آخر میں حق تعالیٰ نے اِرشاد فرمایا: فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ”اب تو مت ٹھہراؤ اللہ کا مقابل اور تم تو جانتے بوجھتے ہو۔“ یعنی جب تم نے یہ جان لیا کہ تم کو نیست سے ہست کرنے والا، تمہاری تربیت اور پرورِش کے سارے سامان مہیا کر کے ایک قطرہ سے حسین وجمیل، حساس اور عاقل اِنسان بنانے والا، تمہارے رہن سہن کے لئے زمین اور دُوسری ضروریات کے لئے آسمان بنانے والا، آسمان سے پانی برسانے والا، پانی سے پھل اور پھل سے غذا مہیا کرنے والا بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں تو عبادت و بندگی کا مستحق دُوسرا کون ہوسکتا ہے کہ اس کو خدا کا مقابل یا سہیم وشریک ٹھہرایا جائے، اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو اس جہان میں اس سے بڑھ کر کوئی ظلم اور بیوقوفی و بے عقلی نہیں ہوسکتی کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر مخلوق سے دِل لگایا جائے اور اس پر بھروسہ کیا جائے ۔

آنانکہ بجز روی تو جائے نگرانند

کوتہ نظر انند چہ کوتہ نظر انند [۳]

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں اس چیز کی دعوت دی گئی ہے جو تمام آسمانی کتابوں کے اور تمام انبیاء کے بھیجنے کا اصل مقصد ہے، یعنی صرف ایک خدا کی عبادت وبندگی جس کا نام توحید ہے۔

---

[۱] ترجمہ:- تیری نعمت کھا کر، تیری نافرمانی کرتا ہوں، نعمت تیری ہے وابستگی کسی اور کے ساتھ ہے۔

[۲] ترجمہ:- پھول اور باغ کی یاد کو چھوڑ دو کیونکہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے، زمین اور آسمان میں اللہ تعالیٰ کے ذِکر کے سوا کچھ آباد نہیں ہے۔

[۳] ترجمہ:- جو لوگ آپ کی ذات کو چھوڑ کر کسی اور طرف جارہے ہیں ان کی عقل کمزور ہے، کتنی زیادہ کمزور ہے۔

اور یہ وہ اِنقلابی نظریہ ہے جو اِنسان کے تمام اعمال واحوال اور اخلاق ومعاشرت پر گہرا اَثر رکھتا ہے، کیونکہ جو شخص یہ یقین کرے کہ تمام عالم کا خالق و مالک اور تمام نظامِ عالم میں متصرف اور تمام چیزوں پر قادر صرف ایک ذات ہے، بغیر اس کی مشیت اور اِرادے کے نہ کوئی ذرّہ حرکت کرسکتا ہے، نہ کوئی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے، تو اس کی پوری توجہ ہر مصیبت وراحت اور ہر تنگی وفراخی میں صرف ایک ذات کی طرف ہو جائے گی، اور اس کو وہ بصیرت حاصل ہو جائے گی جس کے ذریعے وہ اسبابِ ظاہرہ کی حقیقت کو پہچان لے گا کہ یہ سلسلۂ اسباب درحقیقت ایک پردہ ہے جس کے پیچھے دستِ قدرت کارفرما ہے۔

برق اور بھاپ کے پوجنے والے دانایانِ یورپ اگر اس حقیقت کو سمجھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ برق اور بھاپ سے آگے بھی کوئی حقیقت ہے، اور حقیقی پاور اور طاقت نہ برق میں ہے نہ بھاپ میں، بلکہ سب طاقتوں اور قوّتوں کا سرچشمہ اسی ذاتِ حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جس نے یہ برق اور بھاپ پیدا کئے، اس کو سمجھنے کے لئے بصیرت چاہئے، اور جس نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا وہ دُنیا میں کتنا ہی دانش مند وفلاسفر کہلاتا ہو مگر اس کی مثال اس دیہاتی بیوقوف کی سی ہے جو کسی ریلوے اسٹیشن پر پہنچا اور دیکھا کہ گارڈ کے ہاتھ میں دو جھنڈیاں سرخ اور سبز ہیں، سبز کے دِکھلانے سے ریل چلنے لگتی ہے، اور سرخ جھنڈی دِکھلانے سے ریل تھم جاتی ہے، یہ دیکھ کر وہ ان جھنڈیوں ہی کو ڈنڈوت کرنے لگے، اور یہ سمجھے کہ یہ جھنڈیاں ہی طاقت کی مالک ہیں کہ اتنی بڑی تیز رفتار پہاڑ کی طرح بوجھل گاڑی کو چلانا اور روکنا ان کا کام ہے۔ جس طرح دُنیا اس دیہاتی پر ہنستی ہے کہ اس جاہل کو یہ خبر نہیں کہ جھنڈیاں محض علامت ہیں اور کام درحقیقت ڈرائیور کا ہے کہ وہ ریل کو چلاتا ہے اور روکتا ہے، بلکہ اس کا بھی نہیں مشین کے کل پرزوں کا ہے، اور جس نے ذرا نگاہ کو اور گہرا کرلیا تو اُسے یہ نظر آجاتا ہے کہ درحقیقت اُس کا چلانا نہ ڈرائیور کا کام ہے، نہ انجن کے کل پرزوں کا، بلکہ اصل طاقت اس اسٹیم کی ہے جو انجن کے اندر پیدا ہو رہی ہے۔ اسی طرح ایک موحد اِنسان ان سب عقل مندوں پر ہنستا ہے کہ حقیقت کو تم نے بھی نہیں پایا، فکر ونظر کی منزل ابھی اور آگے ہے، ذرا نگاہ کو تیز کرو اور غور سے کام لو، تو معلوم ہوگا کہ اسٹیم اور آگ و پانی بھی کچھ نہیں، طاقت وقوّت صرف اسی ذات کی ہے جس نے آگ اور پانی پیدا کئے ہیں، اور اسی کی مشیت واَمر کے ماتحت یہ سب چیزیں اپنی ڈیوٹی ادا کر رہی ہیں۔

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند

با من وتو مردہ، باحق زندہ اند [1]

---

[1] ترجمہ:- مٹی، ہوا، پانی، آگ اللہ کی مخلوق ہیں، یہ چیزیں میرے اور تیرے ہاں مردہ ہیں مگر اللہ کے ہاں زندہ ہیں۔

کسی کا عمل اس کی نجات اور جنت کا یقینی سبب نہیں

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ اس جملے میں لفظ "لَعَلَّ" استعمال فرمایا ہے جو "رجاء" یعنی اُمید کے معنی میں آتا ہے، اور ایسے مواقع پر بولا جاتا ہے جہاں کسی فعل کا وقوع یقینی نہ ہو، حکمِ ایمان وتوحید کے نتیجے میں نجات اور جنت کا حصول وعدۂ الٰہیہ کے مطابق یقینی ہے، مگر اس یقینی شے کو اُمید ورجاء کے عنوان سے بیان کرنے میں حکمت یہ بتلانا ہے کہ اِنسان کا کوئی عمل اپنی ذات میں نجات وجنت کی قیمت نہیں بن سکتا، بلکہ فضلِ خداوندی اس کا اصل سبب ہے، اِیمان وعمل کی توفیق ہونا اس فضلِ خداوندی کی علامت ہے، علت نہیں۔

عقیدۂ توحید ہی دُنیا میں امن وامان اور سکون واِطمینان کا ضامن ہے

عقیدۂ توحید جو اِسلام کا سب سے پہلا بنیادی عقیدہ ہے، یہ صرف ایک نظریہ نہیں، بلکہ اِنسان کو صحیح معنی میں اِنسان بنانے کا واحد ذریعہ ہے جو اِنسان کی تمام مشکلات کا حل، اور ہر حالت میں اس کے لئے پناہ گاہ، اور ہر غم وفکر میں اس کا غمگسار ہے، کیونکہ عقیدۂ توحید کا حاصل یہ ہے کہ عناصر کے کون وفساد اور ان کے سارے تغیرات صرف ایک ہستی کی مشیت کے تابع اور اس کی حکمت کے مظاہر ہیں ۔

ہر تغیر ہے غیب کی آواز
ہر تجدّد میں ہیں ہزاروں راز

اور ظاہر ہے کہ جب یہ عقیدہ کسی کے قلب ودِماغ پر چھا جائے اور اس کا حال بن جائے تو یہ دُنیا ہی اس کے لئے جنت بن جائے گی، سارے جھگڑے فساد اور ہر فساد کی بنیادیں ہی منہدم ہو جائیں گی، کیونکہ اس کے سامنے یہ سبق ہوگا ۔

اَز خدا داں خلاف دشمن ودوست
کہ دِل ہر دو در تصرفِ اوست [1]

اس عقیدہ کا مالک ساری دُنیا سے بے نیاز ہر خوف وخطر سے بالاتر زندگی گزارتا ہے، اُس کا حال یہ ہوتا ہے ۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش
چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید وہراسش نباشد زکس
ہمیں است بنیاد توحید وبس [2]

[1] ترجمہ:- دُشمن اور دوست کا فرق اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھو کیونکہ دونوں کے دِل اسی کے اختیار میں ہیں۔

[2] ترجمہ:- موحد وہ ہے کہ جس کے قدموں میں سونا لا کر ڈال دو یا اس کے سر پر تلوار رکھ دو، وہ نہ تو کسی سے کوئی لالچ رکھتا ہے، نہ کسی سے ڈرتا ہے، توحید کی بنیاد بس یہی ہے۔

کلمہ ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ''، جو کلمۂ توحید کہلاتا ہے اس کا یہی مفہوم ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ توحید کا محض زبانی اِقرار اس کے لئے کافی نہیں، بلکہ سچے دِل سے اس کا یقین اور یقین کے ساتھ اِستحضار ضروری ہے، کیونکہ توحیدِ خدا ''واحد دیدن بود نہ واحد گفتن''۔[۱]

کلمہ ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کے پڑھنے والے تو آج دُنیا میں کروڑوں ہیں، اور اتنے ہیں کہ کسی زمانے میں اتنے نہیں ہوئے، لیکن عام طور پر یہ صرف زبانی جمع خرچ ہے، توحید کا رَنگ ان میں رَچا نہیں ورنہ اُن کا بھی وہی حال ہوتا جو پہلے بزرگوں کا تھا کہ نہ کوئی بڑی سے بڑی قوت وطاقت ان کو مرعوب کرسکتی تھی، اور نہ کسی قوم کی عددی اکثریت اُن پر اَثر اَنداز ہوسکتی تھی، نہ کوئی بڑی سے بڑی دولت وسلطنت اُن کے قلوب کو خلافِ حق اپنی طرف جھکا سکتی تھی، ایک پیغمبر کھڑا ہوکر ساری دُنیا کو للکار کر کہہ دیتا تھا کہ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کِيدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ[۲] (الاعراف:۱۹۵)۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہؓ وتابعینؒ جو تھوڑی سی مدّت میں دُنیا پر چھا گئے اُن کی طاقت وقوت اسی حقیقی توحید میں مضمر تھی، اللہ تعالیٰ ہمیں اور سب مسلمانوں کو یہ دولت نصیب فرمائے۔

رِسالتِ محمدی کا اِثبات

بذریعہ اِعجازِ قرآن[۳]

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ

اور اگر تم شک میں ہو اس کلام سے جو اُتارا ہم نے اپنے بندے پر، تو لے آؤ ایک سورت اس جیسی

وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا

اور بلاؤ اس کو جو تمہارا مددگار ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر ایسا نہ کرسکو،

۱ ترجمہ:- خدا کی توحید ایک جاننا ہے، ایک کہنا نہیں۔

۲ ترجمہ:- پھر میرے خلاف کوئی سازش کرو، اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔

۳ الحمدللہ یہ مضمون الگ سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوچکا ہے۔ (ناشر)

وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ

اور ہرگز نہ کرسکوگے، تو پھر بچو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں،

أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

تیار کی ہوئی ہے کافروں کے واسطے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اگر تم اس (قرآن) کے بارے میں ذرا بھی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر اُتارا ہے، تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ، اور اگر سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو ﴿۲۳﴾ پھر بھی اگر تم یہ کام نہ کرسکو، اور یقیناً کبھی نہیں کرسکو گے، تو ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، وہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ ﴿۲۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اگر تم لوگ کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندے خاص پر تو اَچھا پھر تم بنالاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو (کیونکہ تم بھی عربی زبان جانتے ہو اور اس کی نظم ونثر کے مشاق ہو، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی مشق بھی نہیں کی، اور جب اس کے باوجود تم قرآن کے ایک ٹکڑے کی بھی مثل نہ بنا سکو تو بشرطِ انصاف بے تأمل ثابت ہو جاوے گا کہ یہ معجزہ من جانب اللہ ہے اور آپ اللہ کے پیغمبر ہیں) اور بلا لو اپنے حمائیتیوں کو (جو) خدا سے الگ (الگ تجویز کر رکھے ہیں) اگر تم سچے ہو، پھر اگر تم یہ کام نہ کرسکو اور قیامت تک بھی نہ کرسکو گے تو پھر ذرا بچتے رہیو دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، تیار رکھی ہوئی ہے کافروں کے واسطے۔

معارف ومسائل

ربطِ آیات وخلاصۂ مضمون

یہ سورۂ بقرہ کی تیئیسویں اور چوبیسویں آیتیں ہیں، اس سے پہلی دو آیتوں میں توحید کا ثبوت تھا، ان دونوں آیتوں

میں رِسالتِ محمدی کا اِثبات ہے (علیہ الصلوٰۃ والسلام)۔ وہ ہدایت جو قرآن لے کر آیا ہے اس کے دو عمود ہیں: توحید اور رِسالت، پہلی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے چند مخصوص کام ذِکر کر کے توحید ثابت کی گئی تھی، ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا کلام پیش کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رِسالت ثابت فرمائی گئی ہے، اور طریقِ اِثبات دونوں کا ایک ہی ہے کہ پہلی دو آیتوں میں چند ایسے کام مذکور تھے جو سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں کرسکتا، مثلاً زمین اور آسمان کا پیدا کرنا، آسمان سے پانی اُتارنا، پانی سے پھل پھول پیدا کرنا۔

اور خلاصۂ اِستدلال یہ تھا کہ جب یہ کام اللہ کے سوا کوئی دُوسرا نہیں کرسکتا تو مستحق عبادت بھی اس کے سوا کوئی دُوسرا نہیں ہوسکتا، اور ان دونوں آیتوں میں ایک ایسا کلام پیش کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دُوسرے کا نہیں ہوسکتا، اور نہ کوئی اِنسانی فرد یا جماعت اس کی مثال ونظیر لاسکتی ہے، جس طرح زمین وآسمان کی بناوٹ، پانی برسانے اور اس سے پھل پھول نکالنے سے اِنسانی طاقت کا عاجز ہونا اس کی دلیل تھی کہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، اسی طرح کلامِ اِلٰہی کا مثل یا نظیر پیش کرنے سے پوری مخلوق کا عاجز رہنا اس کی دلیل ہے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، کسی مخلوق کا نہیں، اس آیت میں قرآن نے پوری دُنیا کے اِنسانوں کو خطاب کر کے چیلنج دیا ہے کہ اگر تم اس کلام کو اللہ کا کلام نہیں، بلکہ کسی اِنسان کا کلام سمجھتے ہو تو تم بھی اِنسان ہو، تمہیں بھی ایسا کلام پیش کرنے پر قدرت ہونا چاہئے، پورا کلام تو کیا تم اس کلام کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی نظیر ومثال بنا کر دِکھلا دو، اور اس پر تمہارے لئے یہ مزید آسانی دی جاتی ہے کہ تنہا کوئی آدمی نہ بناسکے تو تمہیں اِختیار ہے سارے جہان سے اپنے حمایتی اور مددگار جمع کرلو، اور ایک بین العالمی کانفرنس کر کے اس قرآن کی چھوٹی سی سورت کی مثال بنالاؤ۔

پھر اسی پر بس نہیں کیا، دُوسری آیت میں اُن کو غیرت دِلائی کہ تمہاری مجال نہیں کہ اس جیسی ایک سورت بناسکو، پھر عذاب سے ڈرایا کہ جب تم اس کلام کی مثال بنانے سے اپنا عجز محسوس کرتے ہو، اور یہ صاف اس کی دلیل ہے کہ یہ اِنسان کا کلام نہیں، بلکہ ایسی ہستی کا کلام ہے جو تمام مخلوق سے مافوق اور بلند وبالا ہے، جس کی قدرتِ کاملہ سب پر حاوی ہے، تو پھر اس پر اِیمان نہ لانا اپنے ہاتھوں جہنم میں اپنا ٹھکانا کرنا ہے، اس سے بچو۔

حاصل یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں قرآنِ کریم کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلیٰ معجزہ بتلا کر آپ کی رِسالت اور سچائی کا ثبوت پیش کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تو ہزاروں ہیں اور بڑے بڑے حیرت انگیز ہیں، لیکن اُن سب میں سے اس جگہ آپ کے علمی معجزے یعنی قرآن کے ذِکر پر اِکتفا کر کے یہ بتلا دیا گیا کہ آپ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے، اور اس معجزے کو انبیاء علیہم السلام کے عام معجزات میں بھی ایک خاص اِمتیاز یہ حاصل ہے کہ عام دستور یہ ہے کہ ہر نبی ورسول کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے کچھ معجزات ظاہر فرماتے ہیں، مگر یہ معجزات ان رسولوں کے

ہاتھوں ظاہر ہوتے ہیں، انہیں کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں، مگر قرآنِ حکیم ایک ایسا معجزہ ہے جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ، لفظ "رَيْبٍ" کا ترجمہ اُردو میں شک کا کیا جاتا ہے، مگر امام راغب اصفہانیؒ نے فرمایا کہ درحقیقت رَیب ایسے تردّد اور وہم کو کہا جاتا ہے جس کی بنیاد کوئی نہ ہو، ذرا غور و تامّل کرنے سے رفع ہو جائے، اسی لئے قرآنِ کریم میں اہلِ علم سے رَیب کی نفی کی گئی ہے، اگرچہ وہ مسلمان نہ ہوں، جیسے ارشاد ہے: وَلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (المدثر:۳۱) یہی وجہ ہے کہ شروع سورۂ بقرہ میں قرآنِ کریم کے متعلق فرمایا: لَا رَيْبَ فِيْهِ کہ اس میں کسی رَیب کی گنجائش نہیں، اور اس آیت میں فرمایا: وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ، یعنی "اگر ہو تم کسی تردّد میں" جس کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ قرآنِ کریم اپنے واضح اور معجزانہ دلائل کی بنا پر کسی شک و تردّد کا محل نہیں ہے، لیکن اپنی ناواقفیت سے پھر بھی تمہیں کوئی تردّد ہو تو سن لو: فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ، لفظ سورہ کے معنی محدود قطعہ کے ہیں، اور سورتِ قرآن اس خاص حصۂ قرآن کو کہا جاتا ہے جو بذریعۂ وحی ممتاز اور علیحدہ کر دیا گیا ہے۔

پورے قرآن میں اس طرح ایک سو چودہ سورتیں چھوٹی بڑی ہیں، اور اس جگہ لفظ سورت بغیر الف لام کے لانے سے اس طرف اشارہ پایا گیا کہ چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی اس حکم میں شامل ہے، معنی یہ ہیں کہ اگر تمہیں اس قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے میں کوئی تردّد ہے، اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی دُوسرے انسان نے خود بنالیا ہے تو اس کا فیصلہ بڑی آسانی سے اس طرح ہوسکتا ہے کہ تم بھی اس قرآن کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال بنالاؤ، اگر تم اس کی مثال بنانے میں کامیاب ہوگئے تو بے شک تمہیں حق ہوگا کہ اس کو بھی کسی انسان کا کلام قرار دو، اور اگر تم عاجز ہوگئے تو سمجھ لو کہ یہ انسان کی طاقت سے بالاتر خالص اللہ جل شانہٗ کا کلام ہے۔

یہاں کوئی کہہ سکتا تھا کہ ہمارا عاجز ہو جانا تو اس کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ سبھی انسان عاجز ہیں، ہوسکتا ہے کہ کوئی دُوسرا آدمی یا جماعت یہ کام کرلے، اس لئے ارشاد فرمایا: وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ، شہداء، شاہد کی جمع ہے، جس کے معنی حاضر کے آتے ہیں، گواہ کو بھی شاہد اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا حاضرِ عدالت ہونا ضروری ہے، اس جگہ شہداء سے مراد یا تو عام حاضرین ہیں، کہ سارے جہان میں جس جس سے تم اس کام میں مدد لینا چاہو لے سکتے ہو، اور یا اس سے مراد اُن کے بت ہیں، جن کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ قیامت کے روز یہ ہمارے لئے گواہی دیں گے۔

دُوسری آیت میں ان کو ڈرایا گیا کہ اگر تم یہ کام نہ کرسکو تو پھر جہنم کی ایسی سخت آگ سے بچنے کا سامان کرو جس کے انگارے آدمی اور پتھر ہوں گے، اور وہ تم ہی جیسے انکار کرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے، اور اسی جملہ کے بیچ میں جو واقعہ ہونے والا تھا، اُس کی خبر بھی دے دی: وَلَنْ تَفْعَلُوْا یعنی خواہ تم کتنا ہی انفرادی اور اجتماعی زور لگاؤ تمہاری مجال نہیں کہ اس کی مثال بنا سکو۔

اس پر غور کیا جائے کہ جو قوم اِسلام اور قرآن کی مخالفت اور اس کو گرانے مٹانے کے لئے اپنی جان، مال، آبرو، اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لئے تلی ہوئی تھی، اس کو یہ آسان موقع دیا جاتا ہے کہ قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال بنالاؤ تو تم اپنے مطلب میں کامیاب ہو سکتے ہو، اور یہ کہہ کر ان کی غیرت کو جوش میں لایا جاتا ہے کہ تم ہرگز یہ کام نہ کرسکو گے، مگر پوری قوم میں کوئی بھی اس کام کے لئے آگے نہ بڑھا، اس سے بڑھ کر کونسا اِعتراف اپنے عجز کا اور قرآنِ کریم کے کلامُ اللہ ہونے کا ہوسکتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا کھلا ہوا معجزہ ہے جس نے تمام سرکشوں کی گردنیں جھکادیں۔

قرآن ایک زندہ اور قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ ہے

تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات صرف اُن کی حیات تک معجزہ ہوتے، لیکن قرآن کا معجزہ بعد وفاتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح معجزہ کی حیثیت میں باقی ہے، آج بھی ایک ادنیٰ مسلمان ساری دُنیا کے اہلِ علم ودانش کو للکار کر دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس کی مثال نہ کوئی پہلے لاسکا، نہ آج لاسکتا ہے، اور جس کو ہمت ہو پیش کر کے دِکھلائے۔

شیخ جلال الدین سیوطیؒ مفسر جلالین نے اپنی کتاب ''خصائصِ کبریٰ'' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو معجزوں کے متعلق بحوالۂ حدیث لکھا ہے کہ قیامت تک باقی ہیں، ایک قرآن کا معجزہ، دُوسرے یہ کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! اَیامِ حج میں تینوں جمرات پر لاکھوں آدمی تین روز تک مسلسل کنکریاں پھینکتے ہیں، پھر کوئی اُن کنکریوں کے ڈھیر کو یہاں سے اُٹھاتا بھی نظر نہیں آتا، اور ایک مرتبہ پھینکی ہوئی کنکر کو دوبارہ اِستعمال کرنا بھی ممنوع ہے، اس لئے ہر حاجی اپنے لئے مزدلفہ سے کنکریاں نئی لے کر آتا ہے، اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ جمرات کے گرد ایک ہی سال میں ٹیلہ لگ جاتا جس میں جمرات چھپ جاتے اور چند سال میں تو پہاڑ ہوجاتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ ہاں مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مقرّر کر رکھا ہے کہ جس جس شخص کا حج قبول ہو اس کی کنکریاں اُٹھالی جائیں، تو اَب اس جگہ صرف اُن کم نصیبوں کی کنکریاں باقی رہ جاتی ہیں جن کا حج مقبول نہیں ہوا، اس لئے اس جگہ پڑی ہوئی کنکریاں بہت کم نظر آتی ہیں، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہاں پہاڑ کھڑا ہوگیا ہوتا۔ یہ روایت سننِ بیہقی میں موجود ہے۔[1]

یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کے ذریعہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی تصدیق ہر سال اور ہر زمانے میں ہوسکتی ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ حج میں لاکھوں آدمی ہر سال جمع ہوتے ہیں، اور ہر شخص ہر جمرہ پر ہر روز سات سات

[1] السنن الکبریٰ للبیهقی، باب اخذ الحصٰی لرمی جمرة العقبة ...إلخ ج:۵ ص:۱۲۸

کنکریاں پھینکتا ہے، اور بعض جاہل تو بڑے بڑے پتھر پھینکتے ہیں، اور یہ بھی یقینی طور پر معلوم ہے کہ ان کنکریوں کو یہاں سے اُٹھانے اور صاف کرنے کا حکومت یا کوئی جماعت بھی روزانہ انتظام نہیں کرتی، نہ اُٹھائی جاتی ہیں، اور جیسا قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ اس جگہ سے کنکریاں اُٹھائی ہی نہیں جاتیں، تو اگلے سال اس کا دُگنا اور تیسرے سال تگنا ہو جائے گا، پھر کیا شبہ ہے کہ چند سال میں یہ حصۂ زمین مع جمرات کے اُن کنکریوں میں چھپ جائے گا، اور بجائے جمرات کے ایک پہاڑ کھڑا نظر آئے، مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے، اور یہ مشاہدہ ہر زمانے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور آپ پر ایمان لانے کے لئے کافی ہے۔ سنا ہے کہ اب یہاں سے کنکریاں اُٹھانے کا کچھ انتظام ہونے لگا ہے، مگر تیرہ سو برس تک کا عمل بھی اس مضمون کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔

اسی طرح معجزۂ قرآن ایک زندہ اور ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اس کی نظیر یا مثال پیش نہیں کی جاسکی، آج بھی نہیں کی جاسکتی۔

اِعجازِ قرآنی کی تشریح

اس اجمالی بیان کے بعد آپ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ قرآنِ کریم کو کس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا گیا، اور اس کا اعجاز کن کن وجوہ سے ہے، اور کیوں ساری دُنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہوگئی۔

دُوسرے یہ کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ چودہ سو برس کے عرصے میں قرآن کی زبردست تحدی (چیلنج) کے باوجود کوئی اس کی یا اس کے کسی ٹکڑے کی مثال پیش نہیں کرسکا، یہ تاریخی حیثیت سے کیا وزن رکھتا ہے، یہ دونوں باتیں طویل الذکر اور تفصیل کی طالب ہیں۔

وجوہِ اعجازِ قرآنی

پہلی بات کہ قرآن کو معجزہ کیوں کہا گیا؟ اور وہ کیا وجوہ ہیں جن کے سبب ساری دُنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے، اس پر قدیم و جدید علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور ہر مفسر نے اپنے اپنے طرز میں اس مضمون کو بیان کیا ہے، میں اختصار کے ساتھ چند ضروری چیزیں عرض کرتا ہوں۔

اس جگہ سے سب سے پہلے غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب کل علوم کی جامع کتاب، کس جگہ، کس ماحول میں اور کس پر نازل ہوئی؟ اور کیا وہاں کچھ ایسے علمی سامان موجود تھے جن کے ذریعے دائرۂ اسباب میں ایسی جامع بے نظیر کتاب تیار ہوسکے، جو علومِ اوّلین و آخرین کی جامع، اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق بہترین

ہدایت پیش کر سکے، جس میں اِنسان کی جسمانی اور رُوحانی تربیت کا مکمل نظام ہو، اور تدبیرِ منزل سے لے کر سیاستِ ممالک تک ہر نظام کے بہترین اُصول ہوں۔

جس سرزمین اور جس ذات پر یہ کتابِ مقدس نازل ہوئی اس کی جغرافیائی کیفیت اور تاریخی حالت معلوم کرنے کے لئے آپ کو ایک ریگستانی خشک اور گرم علاقہ سے سابقہ پڑے گا جس کو بطحاء مکہ کہتے ہیں، اور جو نہ زرعی ملک ہے نہ صنعتی، نہ اس ملک کی آب وہوا کچھ ایسی خوشگوار ہے جس کے لئے باہر کے آدمی وہاں پہنچنے کی رغبت کریں، نہ راستے ہی کچھ ہموار ہیں جن سے وہاں تک پہنچنا آسان ہو، اکثر دُنیا سے کٹا ہوا ایک جزیرہ نما ہے، جہاں خشک پہاڑوں اور گرم ریگ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور دُور تک نہ کہیں بستی نظر آتی ہے نہ کوئی کھیت نہ درخت۔

اس پورے خطۂ ملک میں کچھ بڑے شہر بھی نہیں، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور ان میں اُونٹ بکریاں پال کر اپنی زندگی گزارنے والے اِنسان بستے ہیں، اس کے چھوٹے دیہات کا تو دیکھنا کیا، جو برائے نام چند شہر کہلاتے ہیں ان میں بھی کسی قسم کے علم وتعلیم کا کوئی چرچا نہیں، نہ وہاں کوئی اسکول اور کالج ہے، نہ کوئی بڑی یونیورسٹی یا دارالعلوم، وہاں کے باشندوں کو اللہ تعالیٰ نے محض قدرتی اور پیدائشی طور پر فصاحت وبلاغت کا ایک فن ضرور دے دیا ہے، جس میں وہ ساری دُنیا سے فائق اور ممتاز ہیں، وہ نثر اور نظم میں ایسے قادر الکلام ہیں کہ جب بولتے ہیں تو رَعد کی طرح کڑکتے اور بادل کی طرح برستے ہیں، ان کی ادنیٰ ادنیٰ چھوکریاں ایسے فصیح وبلیغ شعر کہتی ہیں کہ دُنیا کے ادیب حیران رہ جائیں۔

لیکن یہ سب کچھ اُن کا فطری فن ہے، جو کسی مکتب یا مدرسے میں حاصل نہیں کیا جاتا، غرض نہ وہاں تعلیم وتعلّم کا کوئی سامان ہے، نہ وہاں کے رہنے والوں کو اُن چیزوں سے کوئی لگاؤ یا دِل بستگی ہے، اُن میں کچھ لوگ شہری زندگی بسر کرنے والے ہیں تو وہ تجارت پیشہ ہیں، مختلف اَجناسِ مال کی درآمد وبرآمد ان کا مشغلہ ہے۔

اس ملک کے قدیم شہر مکہ کے ایک شریف گھرانہ میں وہ ذاتِ مقدس پیدا ہوئی ہے جو مہبطِ وحی ہے، جس پر قرآن اُترا ہے، اب اُس ذاتِ مقدس کا حال سنئے:-

ولادت سے پہلے ہی والدِ ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، پیدا ہونے سے پہلے یتیم ہوگئے، ابھی سات سال کی بھی عمر نہ تھی کہ والدہ کی بھی وفات ہوگئی، آغوشِ مادر کا گہوارہ بھی نصیب نہ رہا، شریف آباء واَجداد کی فیاضی اور بے مثل سخاوت نے اپنے گھر میں کوئی اندوختہ نہ چھوڑا تھا، جس سے یتیم کی پرورِش اور آئندہ زندگی کا سامان ہو سکے، نہایت عسرت کی زندگی پھر ماں باپ کا سایہ سر پر نہیں، ان حالات میں آپ نے پرورِش پائی، اور عمر کا اِبتدائی حصہ گزارا جو تعلیم وتعلّم کا اصلی وقت ہے، اس وقت اگر مکہ میں کوئی دارالعلوم یا اسکول وکالج بھی ہوتا تو بھی آپ کے لئے اس سے اِستفادہ مشکل تھا، مگر معلوم ہو چکا کہ وہاں سرے سے یہ علمی مشغلہ اور اس سے دِلچسپی ہی کسی کو نہ تھی، اسی لئے یہ پوری قومِ عرب اُمّیین کہلاتے تھے،

قرآنِ کریم نے بھی اُن کے متعلق یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ آپ ہر قسم کی تعلیم و تعلّم سے بے خبر رہے، وہاں کوئی بڑا عالم بھی ایسا نہ تھا جس کی صحبت میں رہ کر یہ علوم حاصل کئے جاسکیں، جن کا قرآن حامل ہے، پھر قدرت کو تو ایک فوق العادۃ معجزہ دِکھلانا تھا، آپ کے لئے خصوصی طور پر ایسے سامان ہوئے، معمولی نوشت و خواند جو ہر جگہ کے لوگ کسی نہ کسی طرح سیکھ ہی لیتے ہیں، آپ نے وہ بھی نہ سیکھی، بالکل اُمّی محض رہے کہ اپنا نام تک بھی نہ لکھ سکتے تھے، عرب کا مخصوص فن شعر و سخن تھا، جس کے لئے خاص خاص اجتماعات کئے جاتے اور مشاعرے منعقد ہوتے، اور اس میں ہر شخص مسابقت کی کوشش کرتا تھا، آپ کو حق تعالیٰ نے ایسی فطرت عطا فرمائی تھی کہ ان چیزوں سے بھی دِلچسپی نہ تھی، نہ کبھی کوئی شعر یا قصیدہ لکھا، نہ کسی ایسی مجلس میں شریک ہوئے۔

ہاں اُمّی محض ہونے کے ساتھ بچپن ہی سے آپ کی شرافتِ نفس، اخلاقِ فاضلہ، فہم و فراست کے غیر معمولی آثار، دیانت و امانت کے اعلیٰ ترین شاہکار آپ کی ذاتِ مقدس میں ہر وقت مشاہدہ کئے جاتے تھے، جن کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب کے بڑے بڑے مغرور و متکبر سردار آپ کی تعظیم کرتے تھے، اور سارے مکہ میں آپ کو ''امین'' کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔

یہ اُمّی محض چالیس سال تک مکہ میں اپنی برادری کے سامنے رہتے ہیں، کسی دُوسرے ملک کا سفر بھی نہیں کرتے، جس سے یہ خیال پیدا ہو سکے کہ وہاں جا کر علوم حاصل کئے ہوں گے، صرف ملکِ شام کے دو تجارتی سفر ہوئے، وہ بھی گنے چنے چند دِن کے لئے جس میں اس کا کوئی اِمکان نہیں۔

اس اُمّی محض ذاتِ مقدس کی زندگی کے چالیس سال مکہ میں اپنی برادری میں اس طرح گزرے کہ نہ کبھی کسی کتاب یا قلم کو ہاتھ لگایا، نہ کسی مکتب میں گئے، نہ کسی مجلس میں کوئی نظم و قصیدہ ہی پڑھا، ٹھیک چالیس سال کے بعد اُن کی زبانِ مبارک پر وہ کلام آنے لگا جس کا نام ''قرآن'' ہے، جو اپنی لفظی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اور معنوی علوم و فنون کے لحاظ سے محیر العقول کلام ہے، اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو بھی اس کے معجزہ ہونے میں کسی اِنصاف پسند کو کیا شبہ رہ سکتا ہے، مگر یہاں یہی نہیں بلکہ اس نے ساری دُنیا کو تحدی کی، چیلنج دیا کہ کسی کو اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں شبہ ہو تو اس کا مثل بنا لائے۔

اب ایک طرف قرآن کی یہ تحدی اور چیلنج اور دُوسری طرف ساری دُنیا کی مخالف طاقتیں جو اِسلام اور پیغمبرِ اسلام کو شکست دینے کے لئے اپنی مال، جان، اولاد، آبرو سب گنوا دینے کو تیار ہیں، مگر اتنا کام کرنے کے لئے کوئی جرأت نہیں کرتا کہ قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت کی مثال بنا لائے، فرض کر لیجئے کہ یہ کتاب بے مثال و بے نظیر بھی نہ ہوتی، جب بھی ایک اُمّی محض کی زبان سے اس کا ظہور اِعجازِ قرآن اور وجوہِ اِعجاز کی تفصیل میں جائے بغیر بھی قرآنِ کریم کے معجزہ ہونے کے لئے کم نہیں جس کو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے۔

اعجازِ قرآنی کی دُوسری وجہ

اب اعجازِ قرآن کی دُوسری وجہ دیکھئے، یہ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن اور اس کے اَحکام ساری دُنیا کے لئے آئے، لیکن اس کے بلا واسطہ اور پہلے مخاطب عرب تھے، جن کو اور کوئی علم وفن آتا تھا یا نہیں مگر فصاحت و بلاغت ان کا فطری ہنر اور پیدائشی وصف تھا، جس میں وہ اَقوامِ دُنیا سے ممتاز سمجھے جاتے تھے، قرآن اُن کو مخاطب کر کے چیلنج کرتا ہے کہ اگر تمہیں میرے کلامِ اِلٰہی ہونے میں کوئی شبہ ہے تو تم میری ایک سورت کی مثال بنا کر دِکھلا دو، اگر قرآن کی یہ تحدی (چیلنج) صرف اپنے حسنِ معنوی یعنی حکیمانہ اُصول اور علمی معارف واَسرار ہی کی حد تک ہوتی تو قومِ اُمّیین کے لئے اس کی نظیر پیش کرنے سے عذر معقول ہوتا، لیکن قرآن نے صرف حسنِ معنوی ہی کے متعلق تحدی نہیں کی، بلکہ لفظی فصاحت و بلاغت کے اِعتبار سے بھی پوری دُنیا کو چیلنج دیا ہے، اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے اَقوامِ عالم میں سب سے زیادہ مستحق عرب ہی تھے، اگر فی الواقع یہ کلام قدرتِ بشر سے باہر کسی مافوق قدرت کا کلام نہیں تھا تو بلغائے عرب کے لئے کیا مشکل تھا کہ ایک اُمی شخص کے کلام کی مثال بلکہ اس سے بہتر کلام فوراً پیش کر دیتے، اور ایک دو آدمی یہ کام نہ کر سکتے تو قرآن نے ان کو یہ سہولت بھی دی تھی کہ ساری قوم مل کر بنا لائے، مگر قرآن کے اس بلند بانگ دعوے اور پھر طرح طرح سے غیرت دِلانے پر بھی عرب کی غیور قوم پوری کی پوری خاموش ہے، چند سطریں بھی مقابلہ پر نہیں پیش کرتی۔

عرب کے سرداروں نے قرآن اور اِسلام کے مٹانے اور پیغمبرِ اِسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مغلوب کرنے میں جس طرح اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگایا، وہ کسی لکھے پڑھے آدمی سے مخفی نہیں، شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گنے چنے رُفقاء کو طرح طرح کی اِیذائیں دے کر چاہا کہ وہ کلمۂ اِسلام کو چھوڑ دیں، مگر جب دیکھا کہ ”یاں وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے“ تو خوشامد کا پہلو اِختیار کیا، عرب کا سردار عتبہ ابن ربیعہ قوم کا نمائندہ بن کر آپ کے پاس حاضر ہوا، اور عرب کی پوری دولت وحکومت اور بہترین حسن و جمال کی لڑکیوں کی پیشکش اس کام کے لئے کی کہ آپ اِسلام کی تبلیغ چھوڑ دیں، آپ نے اس کے جواب میں قرآن کی چند آیتیں سنا دینے پر اِکتفا فرمایا۔ جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو جنگ و مقابلہ کے لئے تیار ہو کر قبل اَز ہجرت اور بعد اَز ہجرت جو قریشِ عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے مقابلہ میں سر دھڑ کی بازی لگائی، جان، مال، اولاد، آبرو، سب کچھ اس مقابلہ میں خرچ کرنے کے لئے تیار ہوئے، یہ سب کچھ کیا، مگر یہ کسی سے نہ ہوسکا کہ قرآن کے چیلنج کو قبول کرتا، اور چند سطریں مقابلہ پر پیش کر دیتا، کیا ان حالات میں سارے عرب کا اس کے مقابلہ سے سکوت اور عجز اس کی کھلی ہوئی شہادت نہیں کہ یہ اِنسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کے کام یا کلام کی نظیر اِنسان کیا ساری مخلوق کی قدرت سے باہر ہے۔

پھر صرف اتنا ہی نہیں کہ عرب نے اس کے مقابلہ سے سکوت کیا، بلکہ اپنی خاص مجلسوں میں سب نے اس کے بے مثل ہونے کا اعتراف کیا، اور جو ان میں سے منصف مزاج تھے، انہوں نے اس اعتراف کا اظہار بھی کیا، پھر اُن میں سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے، اور کچھ اپنی آبائی رُسوم کی پابندی یا بنی عبد مناف کی ضد کی وجہ سے اسلام قبول کرنے سے باوجود اعتراف کے محروم رہے۔ قریشِ عرب کی تاریخ ان واقعات پر شاہد ہے، میں اس میں سے چند واقعات اس جگہ بیان کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو سکے کہ پورے عرب نے اس کلام کے بے مثل، بے نظیر ہونے کو تسلیم کیا، اور اس کی مثال پیش کرنے کو اپنی رُسوائی کے خیال سے چھوڑ دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا چرچا مکہ سے باہر حجاز کے دُوسرے مقامات میں ہونے لگا، اور حج کا موسم آیا تو قریشِ مکہ کو اس کی فکر ہوئی کہ اب اَطرافِ عرب سے حجاج آئیں گے، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ کلام سنیں گے تو فریفتہ ہو جائیں گے، اور غالب خیال یہ ہے کہ مسلمان ہو جائیں گے۔ اس کے اِنسداد کی تدبیر سوچنے کے لئے قریش نے ایک اِجلاس منعقد کیا، اس اِجلاس میں عرب کے بڑے بڑے سردار موجود تھے، اُن میں ولید بن مغیرہ عمر میں سب سے بڑے اور عقل میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، سب نے ولید بن مغیرہ کو یہ مشکل پیش کی کہ اب اَطرافِ ملک سے لوگ آئیں گے، اور ہم سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق پوچھیں گے تو ہم کیا کہیں؟ ہمیں آپ کوئی ایسی بات بتلایئے کہ ہم سب وہ ہی بات کہہ دیں، ایسا نہ ہو کہ خود ہمارے بیانات میں اِختلاف ہو جائے۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ہی کہو کیا کہنا چاہئے؟

لوگوں نے کہا کہ ہمارے خیال میں ہم سب یہ کہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) (معاذ اللہ) مجنون ہیں، اُن کا کلام مجنونانہ بڑ ہے۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ایسا ہرگز نہ کہنا، کیونکہ یہ لوگ جب اُن کے پاس جائیں گے، اور اُن سے ملاقات وگفتگو کریں گے، اور ان کو ایک فصیح و بلیغ عاقل اِنسان پائیں گے تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے۔ پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ اچھا ہم ان کو یہ کہیں کہ وہ ایک شاعر ہیں۔ ولید نے اس سے بھی منع کیا، اور کہا کہ جب لوگ ان کا کلام سنیں گے تو وہ شعر و شاعری کے ماہر ہیں، انہیں یقین ہو جائے گا کہ یہ شعر نہیں اور نہ آپ شاعر ہیں، نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ سب لوگ تمہیں جھوٹا سمجھیں گے۔ پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ تو پھر ہم ان کو کاہن قرار دیں جو شیاطین وجنات سے سن کر غیب کی خبریں دیا کرتے ہیں۔ ولید نے کہا: یہ بھی غلط ہے، کیونکہ جب لوگ اُن کا کلام سنیں گے تو پتہ چل جائے گا کہ یہ کلام کسی کاہن کا نہیں ہے، وہ پھر بھی تمہیں ہی جھوٹا سمجھیں گے۔ اس کے بعد قرآن کے بارے میں جو ولید بن مغیرہ کے تأثرات تھے اُن کو اِن الفاظ میں بیان کیا:-

''خدا کی قسم! تم میں کوئی آدمی شعر و شاعری اور اَشعارِ عرب سے میرے برابر واقف نہیں، خدا کی

قسم! اس کلام میں خاص حلاوت ہے، اور ایک خاص رونق ہے، جو میں کسی شاعر یا فصیح و بلیغ کے کلام میں نہیں پاتا۔''

پھر اُن کی قوم نے دریافت کیا کہ آپ ہی بتلایئے پھر ہم کیا کریں؟ اور اُن کے بارے میں لوگوں سے کیا کہیں؟ ولید نے کہا: میں غور کرنے کے بعد کچھ جواب دُوں گا۔ پھر بہت سوچنے کے بعد کہا کہ اگر کچھ کہنا ہی ہے تو تم اُن کو ساحر کہو کہ اپنے جادو سے باپ بیٹے اور میاں بیوی میں تفرقہ ڈال دیتے ہیں۔

قوم اس پر مطمئن اور متفق ہوگئی، اور سب سے یہی کہنا شروع کیا، مگر خدا کا چراغ کہیں پھونکوں سے بجھنے والا تھا؟ اَطرافِ عرب کے لوگ آئے، قرآن سنا اور بہت سے مسلمان ہوگئے، اور اَطرافِ عرب میں اِسلام پھیل گیا۔ (خصائصِ کبریٰ)

اسی طرح ایک قریشی سردار نضر بن حارث نے ایک مرتبہ اپنی قوم کو خطاب کر کے کہا:-

''اے قومِ قریش! آج تم ایک مصیبت میں گرفتار ہو کہ اس سے پہلے کبھی ایسی مصیبت سے سابقہ نہیں پڑا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہاری قوم کے ایک نوجوان تھے، اور تم سب اُن کے عادات و اَخلاق کے گرویدہ اور اپنی قوم میں اُن کو سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ امانت دار جانتے اور کہتے تھے، اب جبکہ اُن کے سر میں سفید بال آنے لگے، اور انہوں نے ایک بے مثل کلام اللہ کی طرف سے پیش کیا تو تم ان کو جادوگر کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ جادوگر نہیں، ہم نے جادوگروں کو دیکھا اور برتا ہے، اُن کے کلام سنے ہیں اور طریقوں کو سمجھا ہے، وہ بالکل اس سے مختلف ہیں۔

اور کبھی تم ان کو کاہن کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ کاہن بھی نہیں، ہم نے بہت کاہنوں کو دیکھا اور اُن کے کلام سنے ہیں، ان کو ان کے کلام سے کوئی مناسبت نہیں۔

اور کبھی تم ان کو شاعر کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ شاعر بھی نہیں، ہم نے خود شعر، شاعری کے تمام فنون کو سیکھا سمجھا ہے، اور بڑے بڑے شعراء کے کلام ہمیں یاد ہیں، اُن کے کلام سے اُس کو کوئی مناسبت نہیں۔ پھر کبھی تو ان کو مجنون بتاتے ہو، خدا کی قسم! وہ مجنون بھی نہیں، ہم نے بہت سے مجنونوں کو دیکھا بھالا، ان کی بکواس سنی ہے، اُن کے مختلف اور مختلط کلام سنے ہیں، یہاں یہ کچھ نہیں، اے میری قوم! تم اِنصاف کے ساتھ اُن کے معاملہ میں غور کرو، یہ سرسری ٹلا دینے کی چیز نہیں۔'' (خصائصِ کبریٰ ج:١ ص:١١٤)

حضرت ابوذر صحابیؓ فرماتے ہیں کہ میرا بھائی اُنیس ایک مرتبہ مکہ معظمہ گیا، اُس نے واپس آکر مجھے بتلایا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو یہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہاں کے لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ بھائی نے کہا کہ کوئی ان کو شاعر کہتا ہے، کوئی کاہن بتلاتا ہے، کوئی جادوگر کہتا ہے۔ میرا بھائی اُنیس خود بڑا شاعر اور کہانت وغیرہ سے واقف آدمی تھا، اس نے مجھ سے کہا کہ جہاں تک میں نے غور کیا لوگوں کی یہ سب باتیں غلط ہیں، اُن کا کلام نہ

شعر ہے نہ کہانت ہے، نہ مجنونانہ کلمات ہیں، بلکہ مجھے وہ کلام صادق نظر آتا ہے۔

ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ بھائی سے یہ کلمات سن کر میں نے مکہ کا سفر کیا، اور مسجدِ حرام میں آکر پڑ گیا، تیس روز میں نے اس طرح گزارے کہ سوائے زمزم کے پانی کے میرے پیٹ میں کچھ نہیں گیا، اس تمام عرصہ میں نہ مجھے بھوک کی تکلیف معلوم ہوئی نہ کوئی ضعف محسوس کیا۔ (خصائص ج:۱ ص:۱۱۶)

واپس گئے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے رُوم اور فارس کے فصحاء و بلغاء کے کلام بہت سنے ہیں، اور کاہنوں کے کلمات اور حمیر کے مقالات بہت سنے ہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام کی مثال میں نے آج تک کہیں نہیں سنی، تم سب میری بات مانو اور آپ کا اِتباع کرو۔ چنانچہ فتحِ مکہ کے سال میں اُن کی پوری قوم کے تقریباً ایک ہزار آدمی مکہ پہنچ کر مسلمان ہوگئے۔ (خصائص ج:۱ ص:۱۱۶)

اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دُشمن ابوجہل اور اَخنس بن شریق وغیرہ بھی لوگوں سے چھپ کر قرآن سنا کرتے، اور اس کے عجیب و غریب، بے مثل و بے نظیر اَثرات سے متأثر ہوتے تھے، مگر جب قوم کے کچھ لوگوں نے ان کو کہا کہ جب تم اس کلام کو ایسا بے نظیر پاتے ہو تو اس کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ تو ابوجہل کا جواب یہ تھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ بنی عبد مناف میں اور ہمارے قبیلہ میں ہمیشہ سے رقابت اور معاصرانہ مقابلہ چلتا رہتا ہے، وہ جس کام میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں ہم بھی اس کا جواب دیتے ہیں، اب جبکہ ہم اور وہ دونوں برابر حیثیت کے مالک ہیں تو اَب وہ یہ کہنے لگے کہ ہم میں ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے، اب ہم اس میں کیسے اُن کا مقابلہ کریں، میں تو کبھی اس کا اِقرار نہ کروں گا۔ (خصائص)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے اور چیلنج پر صرف یہی نہیں کہ پورے عرب نے ہار مان لی اور سکوت کیا، بلکہ اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے اور اپنے عجز کا کھلے طور پر اِعتراف بھی کیا ہے، اگر یہ کسی اِنسان کا کلام ہوتا تو اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا عرب بلکہ ساری دُنیا اس کا مثل لانے سے عاجز ہو جاتی۔

قرآن اور پیغمبرِ قرآن کے مقابلہ میں جان و مال، اولاد و آبرو سب کچھ قربان کرنے کے لئے تو وہ تیار ہو گئے، مگر اس کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا کہ قرآن کے چیلنج کو قبول کر کے دو سطریں اس کے مقابلہ میں پیش کر دیتا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے جاہلانہ اعمال و افعال کے باوجود منصف مزاج تھے، جھوٹ کے پاس نہ جاتے تھے، جب انہوں نے قرآن کو سن کر یہ سمجھ لیا کہ جب درحقیقت اس کلام کی مثل ہم نہیں لا سکتے تو محض دھاندلی اور کٹھ حجتی کے طور پر کوئی کلام پیش کرنا اپنے لئے عار سمجھا، کیونکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہم نے کوئی چیز پیش بھی کر دی تو پورے عرب کے فصحاء و بلغاء اس اِمتحانی مقابلہ میں ہمیں فیل کر دیں گے، اور خواہ مخواہ کی رُسوائی ہوگی، اسی لئے پوری قوم نے سکوت اِختیار

کیا، اور جو زیادہ منصف مزاج تھے انہوں نے صاف طور پر اِقرار و تسلیم بھی کیا جس کے کچھ وقائع پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

اِسی سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ عرب کے سردار اَسعد بن زرارہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کے سامنے اِقرار کیا کہ:-

''ہم نے خواہ مخواہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کر کے اپنے رشتے ناتے توڑے، اور تعلقات خراب کئے، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ بلا شبہ اللہ کے رسول ہیں، ہرگز جھوٹے نہیں، اور جو کلام وہ لائے ہیں بشر کا کلام نہیں ہو سکتا''۔ (خصائص ج:۱ ص:۱۱۶)

قبیلہ بنی سلیم کا ایک شخص مسمّیٰ قیس بن نسیبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ سے قرآن سنا، اور چند سوالات کئے، جن کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا، تو یہ اُسی وقت مسلمان ہو گئے، اور پھر اپنی قوم میں واپس گئے، تو لوگوں سے کہا:-

''میں نے رُوم و فارس کے فصحاء و بلغاء کے کلام سنے ہیں، بہت سے کاہنوں کے کلمات سننے کا تجربہ ہوا ہے، حِمیر کے مقالات سنتا رہا ہوں، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی مثل میں نے آج تک کہیں نہیں سنا، تم سب میری بات مانو اور ان کا اِتباع کرو۔''

انہی کی تحریک و تلقین پر ان کی قوم کے ایک ہزار آدمی فتحِ مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ (خصائص ج:۱ ص:۱۱۶)

یہ اِقرار و تسلیم صرف ایسے ہی لوگوں سے منقول نہیں جو آپ کے معاملات سے یکسو اور غیر جانب دار تھے، بلکہ وہ لوگ جو ہر وقت ہر طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں لگے ہوئے تھے، قرآن کے متعلق ان کا بھی یہی حال تھا، مگر اپنی ضد اور حسد کی وجہ سے اس کا اِظہار لوگوں پر نہ کرتے تھے۔

علامہ سیوطیؒ نے خصائصِ کبریٰ میں بحوالہ بیہقی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل اور ابوسفیان اور اَخنس بن شریق رات کو اپنے اپنے گھروں سے اس لئے نکلے کہ چھپ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنیں، ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ نکلا، ایک کی دُوسرے کو خبر نہ تھی، اور علیحدہ علیحدہ گوشوں میں چھپ کر قرآن سننے لگے، تو اس میں ایسے محو ہوئے کہ ساری رات گزر گئی، جب صبح ہو گئی تو سب واپس ہوئے، اِتفاقاً راستہ میں مل گئے، اور ہر ایک نے دُوسرے کا قصہ سنا، تو سب آپس میں ایک دُوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ تم نے یہ بری حرکت کی، اور کسی نے یہ بھی کہا کہ آئندہ کوئی ایسا نہ کرے، کیونکہ اگر عرب کے عوام کو اس کی خبر ہو گئی تو وہ سب مسلمان ہو جائیں گے۔

یہ کہہ سن کر سب اپنے اپنے گھر چلے گئے، اگلی رات آئی تو پھر اُن میں سے ہر ایک کے دِل میں یہی ٹیس اُٹھی کہ

قرآن سنیں، اور پھر اسی طرح چھپ چھپ کر ہر ایک نے قرآن سنا، یہاں تک کہ رات گزر گئی، اور صبح ہوتے ہی یہ لوگ واپس ہوئے، تو پھر آپس میں ایک دُوسرے کو ملامت کرنے لگے، اور اس کے ترک کرنے پر سب نے اِتفاق کیا۔ مگر تیسری رات آئی تو پھر قرآن کی لذّت وحلاوت نے انہیں چلنے اور سننے پر مجبور کر دیا، پھر پہنچے اور رات بھر قرآن سن کر لوٹنے لگے، تو پھر راستہ میں اِجتماع ہو گیا، تو اَب سب نے کہا کہ آؤ آپس میں معاہدہ کرلیں کہ آئندہ ہم ہرگز ایسا نہ کریں گے، چنانچہ اس معاہدہ کی تکمیل کی گئی، اور سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ صبح کو اَخنس بن شریق نے اپنی لاٹھی اُٹھائی اور پہلے ابوسفیان کے پاس پہنچا کہ بتلاؤ اس کلام کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اُس نے دبے دبے لفظوں میں قرآن کی حقانیت کا اِعتراف کیا، تو اَخنس نے کہا کہ بخدا میری بھی یہی رائے ہے۔ اس کے بعد وہ ابوجہل کے پاس پہنچا، اور اُس سے بھی یہی سوال کیا کہ تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام کو کیسا پایا؟

ابوجہل نے کہا کہ صاف بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان اور بنوعبدمناف کے خاندان میں ہمیشہ سے چشمک چلی آتی ہے، قوم کی سیادت وقیادت میں وہ جس محاذ پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں ہم ان کا مقابلہ کرتے ہیں، انہوں نے سخاوت وبخشش کے ذریعے قوم پر اَپنا اثر جمانا چاہا تو ہم نے اُن سے بڑھ کر یہ کام کر دِکھایا، انہوں نے لوگوں کی ذمہ داریاں اپنے سر لیں تو ہم اس میدان میں بھی ان سے پیچھے نہیں رہے، یہاں تک کہ پورا عرب جانتا ہے کہ ہم دونوں خاندان برابر حیثیت کے مالک ہیں۔

ان حالات میں اُن کے خاندان سے یہ آواز اُٹھی کہ ہمارے میں ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے، اب ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ ہم کیسے کریں، اس لئے ہم نے تو یہ طے کرلیا ہے کہ ہم زور اور طاقت سے اُن کا مقابلہ کریں گے، اور ہرگز ان پر ایمان نہ لائیں گے۔ (خصائص ج:۱ ص:۱۱۵)

یہ ہے قرآن کا وہ کھلا ہوا معجزہ جس کا دُشمنوں کو بھی اِعتراف کرنا پڑا ہے، یہ تمام واقعات علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے ''خصائصِ کبریٰ'' میں نقل کئے ہیں۔

تیسری وجہ

تیسری وجہ اعجازِ قرآنی کی یہ ہے کہ اس میں غیب کی اور آئندہ پیش آنے والے واقعات کی بہت سی خبریں ہیں جو قرآن نے دیں، اور ہو بہو اسی طرح واقعات پیش آئے جس طرح قرآن نے خبر دی تھی، مثلاً قرآن نے خبر دی کہ رُوم وفارس کے مقابلہ میں اِبتداءً اہلِ فارس غالب آئیں گے اور رُومی مغلوب ہوں گے، لیکن ساتھ ہی یہ خبر دی کہ دس سال گزرنے نہ پائیں گے کہ پھر رُومی اہلِ فارس پر غالب آجائیں گے، مکہ کے سرداروں نے قرآن کی اس خبر پر حضرت صدیقِ

اکبرؓ سے ہار جیت کی شرط کرلی، اور پھر ٹھیک قرآن کی خبر کے مطابق رُومی غالب آ گئے تو سب کو اپنی ہار ماننا پڑی، اور ہارنے والے پر جو مال دینے کی شرط کی تھی، وہ مال ان کو دینا پڑا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کو قبول نہیں فرمایا، کیونکہ وہ ایک قسم کا جوا تھا۔ اسی طرح اور بہت سے واقعات اور خبریں ہیں جو اُمورِ غیبیہ کے متعلق قرآن میں دی گئیں اور ان کی سچائی بالکل روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی۔

چوتھی وجہ

چوتھی وجہ اِعجازِ قرآنی کی یہ ہے کہ اس میں پچھلی اُمتوں اور ان کی شرائع اور تاریخی حالات کا ایسا صاف تذکرہ ہے کہ اُس زمانہ کے بڑے بڑے علمائے یہود و نصاریٰ جو پچھلی کتابوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے ان کو بھی اتنی معلومات نہ تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی نہ کسی مکتب میں قدم رکھا، نہ کسی عالم کی صحبت اُٹھائی، نہ کسی کتاب کو ہاتھ لگایا، پھر یہ اِبتدائے دُنیا سے آپ کے زمانہ تک تمام اَقوامِ عالم کے تاریخی حالات اور نہایت صحیح اور سچے سوانح اور ان کی شریعتوں کی تفصیلات کا بیان ظاہر ہے کہ بجز اس کے نہیں ہوسکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو یہ خبریں دی ہوں۔

پانچویں وجہ

یہ ہے کہ اس کی متعدّد آیات میں لوگوں کے دِل کی چھپی ہوئی باتوں کی اِطلاع دی گئی اور پھر اُن کے اِقرار سے ثابت ہوگیا کہ وہ بات صحیح اور سچ تھی، یہ کام بھی عالم الغیب والشہادۃ ہی کرسکتا ہے، کسی بشر سے عادۃً ممکن نہیں، مثلاً اِرشادِ قرآنی ہے:-

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (آل عمران:۱۲۲)

''جب تمہاری دو جماعتوں نے دِل میں اِرادہ کیا کہ پسپا ہوجائیں۔''

اور یہ اِرشاد کہ:-

وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ (المجادلۃ:۸)

''وہ لوگ اپنے دِلوں میں کہتے ہیں کہ ہمارے انکار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔''

یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کو انہوں نے کسی سے ظاہر نہیں کیا، قرآنِ کریم نے ہی ان کا اِنکشاف کیا ہے۔

چھٹی وجہ

چھٹی وجہ اِعجازِ قرآنی کی، وہ آیات ہیں جن میں قرآن نے کسی قوم یا فرد کے متعلق یہ پیشین گوئی کی کہ وہ فلاں کام

نہ کرسکیں گے، اور پھر وہ لوگ باوجود ظاہری قدرت کے اس کام کو نہ کرسکے، جیسے یہود کے متعلق قرآن نے اعلان کیا کہ اگر وہ فی الواقع اپنے آپ کو اللہ کے دوست اور ولی سمجھتے ہیں تو انہیں اللہ کے پاس جانے سے محبت ہونا چاہئے، وہ ذرا موت کی تمنا کر کے دِکھائیں، اور پھر اِرشاد فرمایا:-

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا (البقرۃ:۹۵)　　"وہ ہرگز موت کی تمنا نہ کرسکیں گے۔"

موت کی تمنا کرنا کسی کے لئے مشکل نہ تھا، خصوصاً اُن لوگوں کے لئے جو قرآن کو جھٹلاتے تھے، قرآن کے اِرشاد کی وجہ سے اُن کو تمنائے موت میں خوف و ہراس کی کوئی وجہ نہ تھی، یہود کے لئے تو مسلمانوں کو شکست دینے کا یہ موقع بڑا غنیمت تھا کہ فوراً تمنائے موت کا ہر مجلس و محفل میں اِعلان کرتے۔

مگر یہود ہوں یا مشرکین، زبان سے کتنا ہی قرآن کو جھٹلائیں ان کے دِل جانتے تھے کہ قرآن سچا ہے، اس کی کوئی بات غلط نہیں ہوسکتی، اگر موت کی تمنا ہم اِس وقت کریں گے تو فوراً مرجائیں گے، اس لئے قرآن کے اس کھلے ہوئے چیلنج کے باوجود کسی یہودی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک مرتبہ زبان سے تمنائے موت کا اِظہار کردے۔

ساتویں وجہ

وہ خاص کیفیت ہے جو قرآن کے سننے سے ہر خاص و عام اور مؤمن و کافر پر طاری ہوتی ہے، جیسے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کو اِسلام لانے سے پہلے پیش آیا کہ اِتفاقاً انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازِ مغرب میں سورۂ طور پڑھتے ہوئے سنا، جب آپ آخری آیت پر پہنچے تو جبیرؓ کہتے ہیں کہ میرا دِل گویا اُڑنے لگا، اور یہ سب سے پہلا دِن تھا کہ میرے دِل میں اِسلام نے اثر کیا، وہ آیات یہ ہیں:-

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ (الطّور)

"کیا وہ بن گئے ہیں آپ ہی آپ، یا وہی ہیں بنانے والے، یا انہوں نے بنائے ہیں آسمان اور زمین؟ کوئی نہیں، پر یقین نہیں کرتے، کیا اُن کے پاس ہیں خزانے تیرے رَبّ کے، یا وہی داروغہ ہیں۔"

آٹھویں وجہ

یہ ہے کہ اس کو بار بار پڑھنے اور سننے سے کوئی اُکتاتا نہیں، بلکہ جتنا زیادہ پڑھا جاتا ہے اُس کا شوق اور بڑھتا ہے، دُنیا کی کوئی بہتر سے بہتر مرغوب کتاب لے لیجئے، اس کو دو چار مرتبہ پڑھا جائے تو اِنسان کی طبیعت اُکتا جاتی ہے، پھر نہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے نہ سننے کو، یہ صرف قرآن کا خاصہ ہے کہ جتنا کوئی اس کو زیادہ پڑھتا ہے اُتنا ہی اس کو شوق و رغبت

بڑھتا جاتا ہے، یہ بھی قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے ہی کا اثر ہے۔

نویں وجہ

یہ ہے کہ قرآن نے اِعلان کیا ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، وہ قیامت تک بغیر کسی ادنیٰ تغیر وترمیم کے باقی رہے گا، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو اس طرح پورا فرمایا کہ جب سے قرآن نازل ہوا ہے آج چودہ سو برس کے قریب ہونے کو آئے ہیں، ہر قرن، ہر زمانے میں لاکھوں اِنسان ایسے رہے ہیں اور رہیں گے جن کے سینوں میں پورا قرآن اس طرح محفوظ رہا کہ ایک زیر وزبر کی غلطی کا اِمکان نہیں، ہر زمانے میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے اس کے حافظ ملتے ہیں، بڑے سے بڑا عالم اگر کہیں ایک زیر وزَبر کی غلطی کر جائے تو ذرا ذرا سے بچے وہیں غلطی پکڑ لیں گے، دُنیا کا کوئی مذہب اپنی مذہبی کتاب کے متعلق اس کی مثال تو کیا اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں کر سکتا، بہت سے مذاہب کی کتابوں میں تو آج یہ پتہ چلانا بھی مشکل ہو گیا ہے کہ اس کی اصل کس زبان میں آئی تھی، اور اس کے کتنے اَجزاء تھے۔

کتاب کی صورت میں بھی ہر قرن، ہر زمانے میں جتنی اشاعت قرآن کی ہوئی شاید دُنیا کی کسی کتاب کو یہ بات نصیب نہیں، حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کی تعداد دُنیا میں بہ نسبت منکرین اور کافروں کے بہت کم رہی، اور ذرائع نشر واشاعت بھی جتنے غیر مسلموں کو حاصل رہے ہیں مسلمانوں کو اس کا کوئی معتد بہ حصہ نصیب نہ تھا، مگر ان باتوں کے باوجود کسی قوم کسی مذہب کی کوئی کتاب دُنیا میں اتنی شائع نہیں ہوئی جتنا قرآن شائع ہوا۔

پھر قرآن کی حفاظت کو اللہ تعالیٰ نے صرف کتابوں اور صحیفوں پر موقوف نہیں رکھا، جن کے جل جانے اور محو ہو جانے کا اِمکان ہو، بلکہ اپنے بندوں کے سینوں میں بھی محفوظ کر دیا، اگر آج ساری دُنیا کے قرآن (معاذ اللہ) نابود کر دیئے جائیں، تو اللہ کی یہ کتاب پھر بھی اسی طرح محفوظ رہے گی، چند حافظ مل کر بیٹھ جائیں تو چند گھنٹوں میں پھر ساری کی ساری لکھی جا سکتی ہے، یہ بے نظیر حفاظت بھی صرف قرآن ہی کا خاصہ اور اس کے کلامِ الٰہی ہونے کا نمایاں ثبوت ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اس پر کسی مخلوق کا تصرف نہیں چل سکتا، اسی طرح اس کا کلام بھی ہمیشہ تمام مخلوقات کی دستبرد اور تصرفات سے بالاتر ہو کر ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا، قرآن کی یہ پیشین گوئی چودہ سو برس تک مشاہدہ میں آچکی ہے، اور تا قیامت اِن شاء اللہ تعالیٰ آتی رہے گی، اس کھلے معجزے کے بعد قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے میں کیا کسی کو شک وشبہ کی گنجائش رہ سکتی ہے۔

دسویں وجہ

وہ علوم ومعارف ہیں جن کا اِحاطہ نہ آج تک کسی کتاب نے کیا ہے، نہ آئندہ اِمکان ہے کہ اتنے مختصر حجم اور محدود

کلمات میں اتنے علوم وفنون جمع کئے جاسکیں جو تمام کائنات کی دائمی ضروریات کو حاوی اور اِنسان کی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حال سے متعلق پورا مرتب اور بہترین نظام پیش کر سکے، شخصی پھر عائلی زندگی سے لے کر قبائلی اور شہری زندگی تک، اور پھر عمرانیات واجتماعیات اور سیاستِ ممالک کے ہر پہلو پر حاوی نظام پیش کردے۔

پھر صرف نظری اور علمی طور پر نظام پیش کرنا ہی نہیں عملی طور پر اس کا رواج پانا اور تمام نظام ہائے دُنیا پر غالب آکر قوموں کے مزاج، اخلاق، اعمال، معاشرت اور تمدّن میں وہ انقلابِ عظیم پیدا کرنا جس کی نظیر نہ قرونِ اُولیٰ میں مل سکتی ہے نہ قرونِ مابعد میں، یہ حیرت انگیز انقلاب کیا کسی اِنسان کی قدرت اور اس کی حکمتِ عملی کا نتیجہ ہوسکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ وہ اِنسان بھی اُمّی اور اس کی قوم بھی اُمّی ہو۔

مخدرات سراپردہائے قرآنی
چہ دلبرند کہ دل می برند پنہانی [١]

یہی وہ محیر العقول تاثیرات ہیں کہ جن کی وجہ سے قرآن کو کلامِ الٰہی ماننے پر ہر وہ شخص مجبور ہے جس کی عقل وبصیرت کو تعصب وعناد نے بالکل ہی برباد نہ کردیا ہو۔

یہاں تک کہ اس دورِ مادّہ پرستی کے مسیحی مصنّفین جنہوں نے کچھ بھی قرآن میں غور وفکر سے کام لیا، اس اقرار پر مجبور ہوگئے کہ یہ ایک بے مثل وبے نظیر کتاب ہے۔

فرانس کا مشہور مستشرق ڈاکٹر مارڈریس جس کو حکومتِ فرانس کی وزارتِ معارف نے قرآنِ حکیم کی باسٹھ سورتوں کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کرنے پر مأمور کیا تھا، اس نے اِعتراف کیا ہے، جس کا اُردو ترجمہ یہ ہے:-

> ''بے شک قرآن کا طرزِ بیان خالقِ جل وعلا کا طرزِ بیان ہے، بلاشبہ جن حقائق ومعارف پر یہ کلام حاوی ہے وہ ایک کلامِ الٰہی ہی ہوسکتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں شک وشبہ کرنے والے بھی جب اس کی تاثیرِ عظیم کو دیکھتے ہیں تو تسلیم واعتراف پر مجبور ہوتے ہیں، پچاس کروڑ مسلمان جو سطحِ زمین کے ہر حصے پر پھیلے ہوئے ہیں اُن میں قرآن کی خاص تاثیر کو دیکھ کر مسیحی مشن میں کام کرنے والے بالاجماع اس کا اِعتراف کرتے ہیں کہ ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جاسکتا کہ جس مسلمان نے اِسلام اور قرآن کو سمجھ لیا وہ کبھی مرتد ہوا یا قرآن کا منکر ہوگیا ہو۔''

مسلمانوں میں تاثیرِ قرآنی کا یہ اعتراف اس مسیحی مستشرق سے ایک ایسے دور میں ہو رہا ہے جبکہ خود مسلمان اِسلام اور قرآن سے بیگانہ، اس کی تعلیمات سے دُور، اس کی تلاوت سے غافل ہوچکے ہیں، کاش! یہ مصنف اِسلام اور قرآن کے

---

[١] ترجمہ:- قرآنِ کریم کے پوشیدہ مضامین ایسے دِلفریب ہیں کہ چپکے سے دِلوں کو لے اُڑتے ہیں۔

اُس دور کو دیکھتا جبکہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن کا عمل تھا اور ان کی زبانوں پر قرآن کی آیات تھیں۔

اسی طرح دُوسرے مسیحی مصنّفین نے بھی جو منصف مزاج ہیں اسی قسم کے اِعتراف کئے ہیں، مسٹر ولیم میور نے اپنی کتاب "حیاتِ محمدؐ" میں واضح طور پر اس کا اِعتراف کیا ہے، اور ڈاکٹر شبلی شمیل نے اس پر ایک مستقل مقالہ لکھا ہے۔

قرآن کے کلامِ اِلٰہی اور معجزۂ نبوی ہونے پر دس وجوہ آپ سُن چکے ہیں، آخر میں ایک اِجمالی نظر اس پر ڈالئے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدائشی یتیم ہو کر دُنیا میں تشریف لائے ہیں، عمر بھر کسی مکتب میں قدم نہیں رکھتے، قلم اور کتاب کو ہاتھ نہیں لگاتے، اپنا نام بھی خود نہیں لکھ سکتے، اسی میں جوان ہوتے ہیں، آپ کی طبیعت عزلت پسند ہے، کسی کھیل، تماشے، جلسوں ہنگاموں میں جانے کے بھی عادی نہیں، شعر و سخن سے بھی مناسبت نہیں، کسی قومی اِجتماع میں کبھی کوئی خطبہ دینے یا تقریر کرنے کا بھی عمر بھر اِتفاق نہیں ہوتا، چالیس سال ہونے کے بعد جبکہ ادھیڑ عمر میں پہنچ جاتے ہیں، اور عادۃً کسی علم کے سیکھنے سکھانے کا وقت ختم ہو جاتا ہے، اُس وقت آپ کی زبانِ مبارک پر ایک ایسا محیر العقول، جامع حقائق فصاحت و بلاغت میں اِعجاز نما کلام آنے لگتا ہے، جو کسی بڑے سے بڑے عالم، ماہر اور فصیح و بلیغ سے بھی ممکن نہیں جس کے ذریعہ آپ عرب کے بڑے بڑے فصحاء و بلغاء کو خطاب فرماتے ہیں، ان کے جلسوں میں پہنچ کر خطبے دیتے ہیں، اور پوری دُنیا کے لئے عموماً، عرب کے لئے خصوصاً یہ چیلنج سناتے ہیں کہ کوئی اس کے کلامِ اِلٰہی ہونے میں شبہ کرے تو اس کے کسی چھوٹے سے حصے کی مثال بنا کر دِکھلا دے، اس پر پوری قوم مثال پیش کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے۔

پوری قوم جو آپ کو پہلے "امین" کے لقب سے پکارتی اور تعظیم کرتی تھی، آپ کی مخالف ہو جاتی ہے، اس کلام کی تبلیغ سے باز رکھنے کے لئے دولت، حکومت، اور ہر اِنسانی خواہش کی چیزیں پیش کرتی ہے، آپ ان میں سے کسی چیز کو قبول نہیں کرتے، پوری قوم آپ کو اور آپ کے رُفقاء کو ستانے، ظلم کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے، آپ یہ سب کچھ برداشت کرتے ہیں، مگر اس کلام کی تبلیغ نہیں چھوڑتے، قوم آپ کے قتل کی سازشیں کرتی ہے، جنگ وجدل پر آمادہ ہو جاتی ہے، آپ کو اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ جانا پڑتا ہے، آپ کی قوم آپ کو وہاں بھی سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی۔

سارا عرب اور اہلِ کتاب آپ کی مخالفت پر جمع ہو جاتے ہیں، آئے دن مدینہ پر حملے ہوتے ہیں، آپ کے مخالفین یہ سب کچھ کرتے ہیں، مگر قرآن کے چیلنج کو قبول کر کے ایک چھوٹی سی سورت قرآن کی مثل بنا کر پیش نہیں کرتے، قرآن ان کو غیرت دِلاتا ہے، اس پر بھی ان کی رگِ حمیت میں حرکت نہیں ہوتی۔

صرف یہی نہیں کہ پورا عرب قرآن کی مثال پیش کرنے سے عاجز رہا، بلکہ خود وہ ذاتِ اقدس جس پر یہ قرآن نازل ہوا، وہ بھی اس کی مثال اپنی طرف سے پیش نہیں کر سکتے، ان کا سارا کلام یعنی "حدیث" جس طرح کا ہے قرآن کا کلام یقیناً اس سے ممتاز ہے، قرآنِ کریم کا اِرشاد ہے:-

قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ (یونس:۱۵)

''جو لوگ آخرت میں ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسی جیسا ایک اور قرآن بنا دیجئے یا اس کو بدل دیجئے، تو آپ فرما دیجئے کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس کو بدل ڈالوں۔''

ایک طرف تو قرآن کے یہ کھلے کھلے معجزات ہیں جو اس کے کلامِ الٰہی ہونے پر شاہد ہیں، دُوسری طرف اس کے مضامین و مضمرات اور حقائق و معارف پر نظر ڈالئے تو وہ اس سے زیادہ محوِ حیرت بنا دینے والی چیز ہے۔

نزولِ قرآن کے اِبتدائی دور کے چند سال تو اس حالت میں گزرے کہ قرآنی تعلیمات کو کھلے طور پر پیش کرنا بھی ممکن نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خفیہ طور پر لوگوں کو اُصولِ قرآنی کی طرف دعوت دیتے تھے، پھر بے شمار مزاحمتوں اور مخالفتوں کے نرغہ میں کچھ علانیہ دعوت بھی شروع کی جاتی ہے، مگر قرآنِ کریم کے مجوّزہ قانون کی تنفیذ کا کوئی اِمکان نہ تھا۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد صرف دس سال ایسے ملے جن کو مسلمانوں کے لئے آزادی کا زمانہ کہا جاسکتا ہے، جس میں قرآنی نظام کی مکمل تعلیم اور تنفیذ کی کوشش اور کوئی تعمیری کام کیا جاسکتا تھا۔

لیکن اُن دس سال میں بھی آپ تاریخِ اِسلام پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اِبتدائی چھ سال دُشمنوں کے نرغہ اور منافقین اور یہودِ مدینہ کی سازشوں سے کس کو فرصت تھی کہ کوئی تعمیری کام اور ایسا نظام جو ساری دُنیا کے نظاموں سے مختلف ہے، عملی طور پر نافذ کرسکے، مسلمانوں کے خلاف سب بڑے بڑے معرکے انہیں چھ سال کے اندر پیش آئے، غزوۂ بدر، اُحد، اَحزاب وغیرہ سب اسی مدّت کے اندر ہوئے، ہجرت کے چھٹے سال دس سال کے لئے حدیبیہ کا صلح نامہ لکھا گیا اور صرف ایک سال اس معاہدہ پر قریشِ عرب قائم رہے، اس کے بعد انہوں نے اس کو بھی توڑ ڈالا، اور پھر جنگ و جہاد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ظاہر اَسباب میں صرف یہ ایک دو سال ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے لئے ملے کہ قرآن کی دعوت کو عام کرسکیں، اور اس کے نظام کو نافذ کرنے کی کوشش کرسکیں، اسی عرصہ میں آپ نے بڑے بڑے سلاطینِ دُنیا کو خطوط لکھے، قرآن کی دعوت اُن کو پہنچائی، قرآنی نظام کو قائم کرنے، پھیلانے کی سعی فرمائی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخرِ عمرِ مبارک تک اس آزادی کے صرف چار سال ہوتے ہیں جن میں فتحِ مکہ کا جہاد بھی پیش آیا اور مکہ مکرّمہ فتح ہوا۔

اب اس چار سال کی قلیل مدّت کو دیکھئے، اور قرآن کے اس نفوذ و اثر پر نظر ڈالئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تقریباً پورے جزیرۃ العرب پر قرآن کی حکومت تھی، ایک طرف سرحدِ رُوم تک اور دُوسری طرف عراق تک،

تیسری طرف عدن تک پہنچ چکی تھی۔

اگر اس سے بھی قطع نظر کر لی جائے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُمی تھے، اس کو بھی نظر انداز کیا جائے کہ آپ کی قوم ایک ایسی قوم تھی کہ جس نے کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کی تھی، اس کو بھی بھول جایئے کہ ساری دُنیا آپ کے خلاف تھی، اور مشرکینِ عرب، یہود و نصاریٰ سب کے سب مل کر آپ کو اور قرآن کو دُنیا سے مٹانے پر تلے ہوئے تھے، بالکل سازگار فضا مان لیجئے تو بھی ایک نئے نظام، نئے قانون اور نئے اُصول کی پہلے تو تدوین و ترتیب، پھر اس کی تعلیم و تفہیم، پھر اس کی عملی تنفیذ اور اس کے ذریعہ ایک پاکباز معاشرہ، اور ملک بھر میں امن و سکون پیدا کرنے کے لئے کتنی مدّت، کتنا سرمایہ، کتنے آدمی درکار ہیں، اور کیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو حاصل تھے؟ آج کے نظاموں کو سامنے رکھ کر حساب لگایئے تو ایک اندھے کی بھی آنکھیں کھل جائیں گی کہ یہ نفوذ و اثر، یہ رُوحانی تأثیر بجز خاص قدرتِ الٰہیہ کے کسی طرح ظاہر نہیں ہوسکتی۔

اِعجازِ قرآنی کے پورے وجوہ اور اُن کی تفصیلات کا بیان ایک نہایت طویل بحث ہے، علمائے اُمت نے اس پر بیسیوں مستقل کتابیں ہر زمانے میں مختلف زبانوں میں تصنیف فرمائی ہیں۔

سب سے پہلے تیسری صدی ہجری میں جاحظؒ نے ''نظم القرآن'' کے نام سے مستقل کتاب لکھی، پھر چوتھی صدی کے اَوائل میں ابوعبداللہ واسطیؒ نے بنام ''اِعجازُ القرآن'' ایک کتاب تصنیف کی، پھر اسی صدی میں ابنِ عیسیٰ ربانیؒ نے ایک مختصر رسالہ بنام ''اِعجازُ القرآن'' لکھا، قاضی ابوبکر باقلانیؒ نے پانچویں صدی کے اَوائل میں ''اِعجازُ القرآن'' کے نام سے ایک مفصل و مبسوط کتاب لکھی، علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے ''اِتقان'' اور ''خصائصِ کبریٰ'' میں، امام رازیؒ نے ''تفسیرِ کبیر'' میں، قاضی عیاضؒ نے ''شفاء'' میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ اس مضمون کی تفصیل لکھی، آخری دور میں مصطفیٰ صادق رافعی مرحوم نے ''اِعجازُ القرآن'' کے نام سے اور جناب سیّد رشید رضا مصری نے ''الوحی المحمدی'' کے نام سے مستقل، جامع اور مبسوط کتابیں لکھیں، اُردو زبان میں اُستاذِ محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ایک رسالہ بنام ''اِعجازُ القرآن'' تصنیف فرمایا۔

یہ بھی قرآن مجید کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس کے ایک ایک مسئلہ پر مکمل تفسیروں کے علاوہ مستقل رسائل و کتابیں اتنی لکھی گئی ہیں کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

عرض کرنا یہ ہے کہ یہ مضمون اپنی پوری تفصیل کے ساتھ تو اس جگہ بیان نہیں ہوسکتا، لیکن جتنا بیان ہو چکا ہے، وہ بھی ایک منصف مزاج اِنسان کو اس پر مجبور کر دینے کے لئے کافی ہے کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان معجزہ تسلیم کرلے۔

چند شبہات اور جوابات

بعض لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ قرآن کے مقابلہ میں کتابیں اور مقالات لکھے گئے مگر وہ محفوظ نہ رہے ہوں۔

لیکن اگر ذرا بھی انصاف سے کام لیا جائے تو اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، کیونکہ دُنیا جانتی ہے کہ جب سے قرآن نازل ہوا، پوری دُنیا میں قرآن کے ماننے والے کم اور منکرین زیادہ رہے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہے کہ ذرائع نشر واشاعت جتنے منکرینِ قرآن کو حاصل رہے ہیں قرآن کے ماننے والوں کو اکثر قرون میں اس کا کوئی قابلِ ذکر حصہ حاصل نہیں رہا۔ قرآن اتنا بلند و بانگ دعویٰ اپنے مخالفین کے سامنے کرتا ہے، اُن کو چیلنج دیتا ہے، غیرتیں دِلاتا ہے، اور مخالفینِ اسلام اس کے مقابلہ میں جان، مال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں، اگر انہوں نے قرآن کا چیلنج قبول کرکے کوئی چیز مقابلہ کے لئے پیش کی ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ وہ ساری دُنیا میں شائع نہ ہوتی، اور ہر زمانے میں منکرینِ قرآن مسلمانوں کے مقابلے میں اس کو پیش نہ کرتے، اور مسلمانوں کی طرف سے اس پر جرح وقدح میں سینکڑوں کتابیں نہ لکھی گئی ہوتیں۔

اِسلام کے قرنِ اوّل میں صرف ایک واقعہ مسیلمہ کذّاب یمامی کا پیش آیا کہ اس نے کچھ چند بے حیائی کے اُلٹے سیدھے کلمات لکھ کر یہ کہا تھا کہ یہ وحیٔ آسمانی قرآن کی مثل ہے، مگر دُنیا جانتی ہے کہ اُن کلمات کا کیا حشر ہوا، خود اس کی قوم نے اس کے منہ پر مار دیئے۔ وہ کلمات ایسے شرمناک، غیر مہذب تھے کہ کسی مہذّب سوسائٹی میں ان کو بیان بھی نہیں کیا جاسکتا، اور بہرحال جیسے بھی تھے وہ آج تک کتابوں میں نقل ہوتے چلے آئے ہیں، اگر کسی اور شخص نے کوئی اچھا کلام قرآن کے مقابلہ میں پیش کیا ہوتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دُنیا کی تاریخ اس کو یکسر بھلا دیتی، اور منکرینِ قرآن اس کو ہر قیمت پر باقی رکھنے کی کوشش نہ کرتے۔

وہ لوگ جو قرآن کے مقابلہ پر ہر وقت سینہ سپر تھے، قرآن کے اس چیلنج کے جواب میں انہوں نے طرح طرح کی باتیں کیں جن کو قرآن میں نقل کرکے جواب دیا گیا، مگر اس کا ایک واقعہ نہیں کہ کوئی کلام مقابلہ پر پیش کرکے اس کے قرآن کا مثل ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو۔ ایک رُومی غلام جو مدینہ میں لوہار کا کام کیا کرتا تھا اور کچھ توراۃ وانجیل پڑھا ہوا تھا، کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا تھا، عرب کے کچھ جاہلوں نے تعصب وعناد سے یہ مشہور کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قرآنی مضامین اس نے سکھائے ہیں، قرآن نے اُن کا یہ اعتراض نقل کرکے خود جواب دیا کہ جس شخص کی طرف سکھانے کی نسبت کرتے ہیں وہ تو خود عجمی ہے، عربی زبان کی بلاغت کو کیا جانے، اور یہ قرآن عربی کی اِنتہائی بلیغ کتاب ہے، سورۂ

نحل کی آیت نمبر: ۱۰۳ دیکھئے:-

لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۰۳﴾ (النحل)

''(ہم جانتے ہیں کہ یہ مخالفینِ اسلام یہ کہتے ہیں کہ آپ کو یہ قرآن ایک آدمی سکھاتا ہے، حالانکہ) وہ جس آدمی کی طرف نسبت کرتے ہیں وہ عجمی ہے، اور قرآن ایک بلیغ عربی زبان میں ہے۔''

کچھ لوگوں نے قرآن کی تحدی کے جواب میں یہ کہا کہ:-

لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (الانفال: ۳۱) ''اگر ہم چاہتے تو ہم بھی قرآن کے مثل کلام کہہ دیتے۔''

لیکن کوئی ان سے پوچھے کہ پھر چاہا کیوں نہیں؟ قرآن کے مقابلہ کے لئے سارا ایڑی چوٹی کا زور تو خرچ کیا، جان و مال کی قربانی دی، اگر تمہیں اس کا مثل کلام لکھنے یا کہنے کی قدرت تھی تو قرآن کی اس تحدی کے بعد تم نے اس کی مثل کلام بنا کر فتح کا سہرا اپنے سر کیوں نہ لیا؟

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے کے بعد مخالفین نے کچھ شریفانہ سکوت نہیں کر لیا بلکہ جو کچھ اُن کے منہ پر آیا اس کے مقابلہ پر کہتے رہے، لیکن یہ پھر بھی کسی نے نہ کہا کہ ہم میں سے فلاں آدمی نے قرآن جیسا فلاں کلام لکھا ہے اس لئے قرآن کا یہ دعویٰ یکتائی (معاذ اللہ) غلط ہے۔

بعض معاندین کو یہ سوجھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو قبل اَز نبوّت چند روز کے لئے ملکِ شام تشریف لے گئے، اور راستے میں بحیراء راہب سے ملاقات ہوئی، وہ توراۃ کا ماہر تھا، اس سے آپ نے علوم سیکھے۔ مگر کوئی ان سے پوچھے کہ ایک دن کی ایک ملاقات میں اس سے یہ سارے علوم و معارف فصاحت و بلاغت کا اِعجاز، اخلاقی تربیت، نظامِ خانگی، نظامِ مملکت کیسے سیکھ لئے۔

آج کل کے بعض معترضین نے کہا کہ کسی کلام کی مثل نہ بنایا جانا اس کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ وہ خدا کا کلام یا معجزہ ہے، ہوسکتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا ماہر بلاغت کوئی نثر یا نظم ایسی لکھے کہ دُوسرے آدمی اس کی نظیر نہ لاسکیں۔

سعدی شیرازی کی گلستان، فیضی کی تفسیر بے نقط کو عام طور پر بے مثل و بے نظیر کتابیں کہا جاتا ہے، تو کیا وہ بھی معجزہ ہیں؟

لیکن اگر ذرا غور کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ سعدی اور فیضی کے پاس سامانِ تعلیم و تالیف کس قدر موجود تھا، کتنے عرصہ تک انہوں نے تعلیم حاصل کی، برسوں مدرسوں میں پڑے رہے، راتوں جاگے، مدتوں محنتیں کیں، بڑے بڑے علماء کے سامنے زانوئے ادب طے کئے، سالہا سال کی محنتوں اور دِماغ سوزیوں کے نتیجے میں اگر بالفرض فیضی یا حریری یا متنبّی یا کوئی اور عربی زبان میں اور سعدی فارسی میں اور ملٹن انگریزی میں، یا ہومر یونانی میں، یا کالی داس سنسکرت میں ایسے ہوئے

ہیں کہ ان کا کلام دُوسروں کے کلام سے فائق ہوگیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

معجزہ کی تعریف تو یہ ہے کہ وہ اسبابِ متعارفہ کے توسط کے بغیر وجود میں آئے، کیا ان لوگوں کی باقاعدہ تحصیلِ علوم، اُستادوں کے ساتھ طویل ملازمت وصحبت، وسیع مطالعہ، مدتوں کی مشاقی، ان کی علمی مہارت کے کھلے ہوئے اسباب نہیں ہیں؟ اگر ان کے کلام دُوسروں سے ممتاز ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس نے کبھی کتاب وقلم کو ہاتھ نہ لگایا ہو، کسی مدرسہ ومکتب میں قدم نہ رکھا ہو، وہ ایسی کتاب دُنیا کے سامنے پیش کرے کہ ہزاروں سعدی اور لاکھوں فیضی اس پر قربان ہوجانے کو اپنا سرمایۂ فخر سمجھیں، اور ان کو جو کچھ علم وحکمت حاصل ہوئے اس کو بھی آپ ہی کے فیضِ تعلیم کا اثر قرار دیں، اس کے علاوہ سعدی اور فیضی کے کلام کا مثل پیش کرنے کی کسی کو ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا انہوں نے نبوّت کا دعویٰ کیا تھا، اور اپنے کلام کے بےمثل وبےنظیر ہونے کو اپنا معجزہ کہا تھا، اور دُنیا کو اس کا چیلنج دیا تھا کہ ہمارے کلام کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی، جس کے نتیجہ میں لوگ اس کا مقابلہ کرنے اور مثال پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے۔

پھر قرآن کی صرف فصاحت وبلاغت اور نظم وترتیب ہی بےمثال نہیں، لوگوں کے دِل ودِماغ پر اس کی تاثیراتِ عجیبہ اس سے زیادہ بےمثال اور حیرت انگیز ہیں، جن کی وجہ سے قوموں کے مزاج بدل گئے، اِنسانی اخلاق میں ایک کایا پلٹ ہوگئی، عرب کے تندخو، گنوار، حلم واخلاق اور علم وحکمت کے اُستاد مانے گئے، ان حیرت انگیز اِنقلابی تاثیرات کا اِقرار صرف مسلمان نہیں موجودہ زمانے کے سینکڑوں غیرمسلموں نے بھی کیا ہے، یورپ کے مستشرقین کے مقالات اس بارے میں جمع کئے جائیں تو ایک مستقل کتاب ہوجائے، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام ''شہادۃ الاقوام علیٰ صدق الاسلام'' تحریر فرمائی ہے۔ اس جگہ چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر گستاولی بان نے اپنی کتاب ''تمدّنِ عرب'' میں صفائی سے اس حیرت انگیزی کا اِعتراف کیا، اُن کے الفاظ کا ترجمہ اُردو میں یہ ہے:-

''اس پیغمبرِ اِسلام اس نبیٔ اُمی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگزشت ہے، جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو جو اُس وقت تک کسی ملک گیر کے زیرِ حکومت نہ آئی تھی، رام کیا، اور اس درجہ پر پہنچادیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیروزَبر کرڈالا، اور اس وقت بھی وہی نبیٔ اُمی اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمۂ اِسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔''

مسٹر وڈول جس نے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے، لکھتا ہے کہ:-

''جتنا بھی ہم اس کتاب (یعنی قرآن) کو اُلٹ پلٹ کر دیکھیں اُسی قدر پہلے مطالعہ میں اس کی

نا مرغوبی نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے، لیکن فوراً ہمیں مسخر کرلیتی ہے، متحیر بنا دیتی ہے، اور آخر میں ہم سے تعظیم کرا کر چھوڑتی ہے، اس کا طرزِ بیان باعتبار اس کے مضامین واَغراض کے، عفیف، عالی شان اور تہدید آمیز ہے، اور جابجا اس کے مضامین سخن کی غایتِ رفعت تک پہنچ جاتے ہیں۔غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا پُر زور اَثر دِکھاتی رہے گی۔'' (شہادۃ الاقوام ص: ۱۳)

مصر کے مشہور مصنف احمد فتحی بک زاغلول نے ۱۸۹۸ء میں مسٹر کونٹ ہنروی کی کتاب ''الاسلام'' کا ترجمہ عربی میں شائع کیا تھا، اصل کتاب فرنچ زبان میں تھی، اس میں مسٹر کونٹ نے قرآن کے متعلق اپنے تأثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں:-

''عقل حیران ہے کہ اس قسم کا کلام ایسے شخص کی زبان سے کیونکر اَدا ہو جو بالکل اُمی تھا، تمام مشرق نے اِقرار کرلیا ہے کہ نوعِ اِنسانی لفظاً و معنیً ہر لحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ وہ کلام ہے جس کی بلند اِنشاپردازی نے عمر بن خطاب کو مطمئن کر دیا، اُن کو خدا کا معترف ہونا پڑا، یہ وہی کلام ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق اس کے جملے جعفر بن ابی طالب نے حبشہ کے بادشاہ کے دربار میں پڑھے تو اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہوگئے، اور بشپ چلا اُٹھا کہ یہ کلام اُسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام کا کلام نکلا تھا۔'' (شہادۃ الاقوام ص: ۱۴)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد: ۱۶ ص: ۵۹۹ میں ہے:-

''قرآن کے مختلف حصص کے مطالب ایک دُوسرے سے بالکل متفاوت ہیں، بہت سی آیات دِینی واخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں، مظاہرِ قدرت، تاریخ، اِلہاماتِ انبیاء کے ذریعے اس میں خدا کی عظمت، مہربانی اور صداقت کی یاد دِلائی گئی ہے، بالخصوص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطہ سے خدا کو واحد اور قادرِ مطلق ظاہر کیا گیا ہے، بت پرستی اور مخلوق پرستی کو بلا لحاظ ناجائز قرار دِیا گیا ہے، قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ وہ دُنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔''

انگلستان کے نامور مؤرّخ ڈاکٹر گبن اپنی مشہور تصنیف (سلطنتِ روما کا اِنحطاط و زوال) کی جلد ۵ باب ۵۰ میں لکھتے ہیں:-

''قرآن کی نسبت بحر اٹلانٹک سے لے کر دریائے گنگا تک نے مان لیا ہے کہ یہ پارلیمنٹ کی رُوح ہے، قانونِ اساسی ہے، اور صرف اُصولِ مذہب ہی کے لئے نہیں، بلکہ اَحکامِ تعزیرات کے لئے اور قوانین کے لئے بھی ہے جن پر نظام کا مدار ہے، جن سے نوعِ اِنسان کی زندگی وابستہ ہے، جن کو

حیاتِ انسانی کی ترتیب وتنسیق سے گہرا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت سب پر حاوی ہے، یہ شریعت ایسے دانش مندانہ اُصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سارے جہان میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔''

اس جگہ مستشرقینِ یورپ کے اقوال واعترافات کا اِستیعاب کرنا نہیں کہ اس کی گنجائش نہیں، نمونہ کے طور پر چند اَقوال نقل کئے گئے ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ باعتبار فصاحت وبلاغت کے اور باعتبار اَغراض ومقاصد کے اور باعتبار علوم ومعارف کے قرآن کے بے نظیر وبے مثل ہونے کا اِقرار صرف مسلمانوں نے نہیں، ہر زمانہ کے منصف مزاج غیر مسلموں نے بھی کیا ہے۔

قرآن نے ساری دُنیا کو اپنی مثال لانے کا چیلنج دیا تھا اور کوئی نہ لا سکا، آج بھی ہر مسلمان دُنیا کے ماہرینِ علم وسیاست کو چیلنج کر کے کہہ سکتا ہے کہ پوری دُنیا کی تاریخ میں ایک واقعہ ایسا دِکھلا دو کہ ایک بڑے سے بڑا ماہر حکیم فیلسوف کھڑا ہو اور ساری دُنیا کے عقائد ونظریات اور رُسوم وعادات کے خلاف ایک نیا نظام پیش کرے، اور اس کی قوم بھی اتنی جاہل گنوار ہو، پھر وہ اتنے قلیل عرصہ میں اس کی تعلیم کو بھی عام کر دے اور عملی تنفیذ کو بھی اس حد پر پہنچا دے کہ اس کی نظیر آج کے مضبوط ومستحکم نظاموں میں ملنا ناممکن ہے۔

دُنیا کی پہلی تاریخ میں اگر اس کی کوئی نظیر نہیں تو آج تو بڑی روشنی، روشن خیالی، بڑی تیز رفتاری کا زمانہ ہے، آج کوئی کر کے دِکھلا دے، اکیلا کوئی نہ کر سکے تو اپنی قوم کو بلکہ دُنیا کی ساری اَقوام کو جمع کر کے اس کی مثال پیدا کر دے۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

''اگر تم اس کی مثال نہ لا سکے اور ہرگز نہ لا سکو گے تو پھر اس جہنم کی آگ سے ڈرو، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، جو منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔''

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

اور خوش خبری دے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ اُن کے واسطے باغ ہیں کہ بہتی ہیں ان کے نیچے

الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا

نہریں، جب ملے گا ان کو وہاں کا کوئی پھل کھانے کو تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ملا تھا ہم کو

مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ

اس سے پہلے اور دیئے جائیں گے اُن کو پھل ایک صورت کے اور ان کے لئے وہاں عورتیں ہوں گی پاکیزہ

وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور وہ وہیں ہمیشہ رہیں گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، ان کو خوشخبری دے دو کہ ان کے لئے ایسے باغات (تیار) ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جب کبھی ان کو ان (باغات) میں سے کوئی پھل رزق کے طور پر دیا جائے گا، تو وہ کہیں گے "یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی دیا گیا تھا" اور انہیں وہ رزق ایسا ہی دیا جائے گا جو دیکھنے میں ملتا جلتا ہوگا، اور اُن کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی، اور وہ ان (باغات) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اور خوش خبری سنا دیجئے آپ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور کام کئے اچھے اس بات کی کہ بے شک ان کے واسطے بہشتیں ہیں کہ چلتی ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں جب کبھی دیئے جاویں گے وہ لوگ ان بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا تو ہر بار یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے پہلے اور ملے گا بھی اُن کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا اور ان کے واسطے ان بہشتوں میں بیبیاں ہوں گی صاف پاک کی ہوئی اور وہ لوگ ان بہشتوں میں ہمیشہ کو بسنے والے ہوں گے (ہر بار میں ملتا جلتا پھل ملنا لطف کے واسطے ہوگا کہ دونوں مرتبہ پھلوں کی صورت ایک سی ہوگی، جس سے وہ سمجھیں گے کہ یہ پہلی ہی قسم کا پھل ہے، مگر کھانے میں مزہ دُوسرا ہوگا جس سے حظ و سرور بڑھے گا)۔

ربطِ آیات

اس سے پہلی آیت میں قرآنِ کریم کو نہ ماننے والوں کے عذاب کا بیان تھا، اس آیت میں ماننے والوں کے لئے بشارت اور خوشخبری مذکور ہے جس میں جنت کے عجیب و غریب پھلوں کا اور حورانِ جنت کا ذِکر ہے۔

معارف و مسائل

اہلِ جنت کو مختلف پھل ایک ہی شکل وصورت میں پیش کرنے سے مقصد بھی ایک تفریح اور لطف کا سامان بنانا ہوگا، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ پھلوں کے متشابہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ جنت کے پھل صورت شکل میں دُنیا کے پھلوں کی طرح ہوں گے، جب اہلِ جنت کو ملیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو وہی پھل ہیں جو دُنیا میں ہمیں ملا کرتے تھے، مگر ذائقہ اور لذّت میں دُنیا کے پھلوں سے اُن کو کوئی نسبت نہ ہوگی، صرف نام کا اِشتراک ہوگا۔

جنت میں اُن لوگوں کو پاک صاف بیبیاں ملنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دُنیا کی تمام ظاہری اور اَخلاقی گندگیوں سے پاک ہوں گی، بول و براز، حیض ونفاس اور ہر ایسی چیز سے پاک ہوں گی جس سے اِنسان کو نفرت ہوتی ہے، اسی طرح کج خلقی، بیوفائی معنوی عیوب سے بھی پاک ہوں گی۔

آخر میں فرمایا کہ پھر جنت کی نعمتوں کو دُنیا کی آنی فانی نعمتوں کی طرح نہ سمجھو جن کے فنا ہوجانے یا سلب ہوجانے کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے، بلکہ یہ لوگ ان نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ خوش وخرم رہیں گے۔

یہاں مؤمنین کو جنت کی بشارت دینے کے لئے اِیمان کے ساتھ عملِ صالح کی بھی قید لگائی ہے کہ اِیمان بغیر عملِ صالح کے اِنسان کو اس بشارت کا مستحق نہیں بناتا، اگرچہ صرف اِیمان بھی جہنم میں خلود اور دَوام سے بچانے کا سبب ہے، اور مؤمن کتنا بھی گناہگار ہو کسی نہ کسی وقت میں وہ جہنم سے نکالا جائے گا اور جنت میں پہنچے گا، مگر عذابِ جہنم سے بالکل نجات کا بغیر عملِ صالح کے کوئی مستحق نہیں ہوتا۔ (رُوح البیان، قرطبی) [1]

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ

بے شک اللہ شرماتا نہیں اس بات سے کہ بیان کرے کوئی مثال مچھر کی یا اس چیز کو جو اس سے بڑھ کر ہے، سو جو لوگ

آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ

مؤمن ہیں وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ مثال ٹھیک ہے جو نازل ہوئی اُن کے رَبّ کی طرف سے، اور جو کافر ہیں سو کہتے ہیں

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱ ص:۲۳۸

مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ

وقف لازم

کیا مطلب تھا اللہ کا اس مثال سے، گمراہ کرتا ہے خدائے تعالیٰ اس مثال سے بہتیروں کو اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتیروں کو،

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ

اور گمراہ نہیں کرتا اس مثال سے مگر بدکاروں کو۔ جو توڑتے ہیں خدا کے معاہدہ کو

مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ

مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو اللہ نے فرمایا ملانے کو اور فساد کرتے ہیں

فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

ملک میں، وہی ہیں ٹوٹے والے۔

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ (کسی بات کو واضح کرنے کے لئے) کوئی بھی مثال دے، چاہے وہ مچھر (جیسی معمولی چیز) کی ہو، یا کسی ایسی چیز کی جو مچھر سے بھی زیادہ (معمولی) ہو، اب جو لوگ مؤمن ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مثال ایک حق بات ہے جو ان کے پروردگار کی طرف سے آئی ہے۔ البتہ جو لوگ کافر ہیں، وہ یہی کہتے ہیں کہ بھلا اس (حقیر) مثال سے اللہ کا کیا مطلب ہے؟ (اس طرح) اللہ اس مثال سے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کرتا ہے، اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔ (مگر) وہ گمراہ انہی کو کرتا ہے جو نافرمان ہیں ﴿۲۶﴾ وہ جو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پختہ کرنے کے بعد بھی توڑ دیتے ہیں، اور جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، انہیں کاٹ ڈالتے ہیں، اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، ایسے ہی لوگ بڑا نقصان اُٹھانے والے ہیں ﴿۲۷﴾

خلاصہ تفسیر

(بعض مخالفین نے قرآن کے کلام اِلٰہی ہونے پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اس میں بہت ہی حقیر و ذلیل چیزوں کا ذِکر

تمثیلات میں کیا گیا ہے، جیسے مچھر، مکھی وغیرہ، اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو ایسی حقیر چیزوں کا ذِکر اس میں نہ ہوتا، اس کا جواب دیا گیا کہ) ہاں واقعی اللہ تعالیٰ تو نہیں شرماتے کہ بیان کر دیں کوئی مثال بھی خواہ مچھر ہو خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو (یعنی حقیر ہونے میں مچھر سے بھی بڑھی ہوئی ہو) سو جو لوگ اِیمان لائے ہوئے ہیں (خواہ کچھ ہی ہو) وہ تو یہی یقین کریں گے کہ بے شک یہ مثال بہت ہی موقع کی ہے ان کے رَبّ کی جانب سے اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہو چکے ہیں (سوچا ہے کچھ ہی ہو جائے) وہ یوں ہی کہتے رہیں گے کہ وہ کونسا مطلب ہوگا جس کا قصد کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے، گمراہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتوں کو اور ہدایت کرتے ہیں اس کی وجہ سے بہتوں کو، اور گمراہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو مگر صرف نافرمانی کرنے والوں کو جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدہ کو جو اللہ سے کر چکے تھے اس کے اِستحکام کے بعد (یعنی عہدِ اَزل جس میں سب کی اَرواح نے اللہ تعالیٰ کے رَبّ ہونے کا اِقرار کیا تھا) اور قطع کرتے رہتے ہیں اُن تعلقات کو کہ حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو جوڑنے کا (اس میں تمام تعلقاتِ شرعیہ داخل ہیں خواہ وہ تعلقات ہوں جو بندہ اور خدا کے درمیان ہیں، یا وہ جو اس کے اور اَقرباء اور رشتہ داروں کے درمیان ہیں، اور عام اہلِ اِسلام کے درمیان ہیں اور جو عام اِنسانوں کے درمیان ہیں) اور فساد کرتے رہتے ہیں زمین میں (کفر و شرک خود بھی فساد ہے اور دُوسروں پر ظلم اور ناحق شناسی جو کفر کے لوازم میں سے ہے، وہ بھی اس فساد میں شامل ہے) بس یہ لوگ ہیں پورے خسارہ میں پڑنے والے (کہ دُنیا کی راحت اور آخرت کی نعمت سب ہاتھ سے دے بیٹھے، کیونکہ حاسد کی دُنیوی زندگی بھی ہمیشہ تلخ ہی رہتی ہے)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات

چند آیات پہلے قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ مذکور ہے کہ قرآنِ کریم میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اور اگر کسی کو کوئی شک اس کے کلامِ اِلٰہی ہونے میں ہو تو وہ اس کی چھوٹی سی سورت کی مثل بنا کر دِکھلا دے، ان آیات میں منکرینِ قرآن کا ایک شبہ ذِکر کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، شبہ یہ تھا کہ قرآنِ کریم میں مکھی اور مچھر جیسے حقیر جانوروں کا ذِکر آیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی اور اس کے کلام کی عظمت کے خلاف ہے، اگر یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا تو اس میں ایسی حقیر گھناؤنی چیزوں کا ذِکر نہ ہوتا، کیونکہ بڑے لوگ ایسی چیزوں کے ذِکر سے شرم وحیا محسوس کرتے ہیں۔

جواب یہ دیا گیا کہ جب کسی حقیر وذلیل چیز کی مثال دینی ہو تو کسی ایسی ہی حقیر چیز سے مثال دینا مقتضائے عقل

وبلاغت ہے، اس غرض کے لئے کسی حقیر گھناؤنی چیز کا ذِکر کرنا شرم وحیا کے قطعاً منافی نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں کے ذِکر سے نہیں شرماتے، اور یہ بھی بتلا دیا کہ ایسے احمقانہ شبہات صرف اُن لوگوں کو پیدا ہوا کرتے ہیں جن کے قلوب اور دِماغوں سے اُن کے کفر کی وجہ سے سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی ہو، اِیمان والوں کو کبھی ایسے شبہات دامن گیر نہیں ہوتے۔

اِس کے بعد اس کی ایک اور حکمت بھی بتلادی کہ ایسی مثالوں سے لوگوں کا ایک اِمتحان بھی ہوتا ہے، نظر وفکر کرنے والوں کے لئے یہ مثالیں ہدایت کا سامان پیدا کرتی ہیں، اور بے پروائی برتنے والوں کے لئے اور زیادہ گمراہی کا سبب بنتی ہیں، اس کے بعد یہ بھی بتلا دیا کہ قرآنِ کریم کی ان مثالوں سے صرف ایسے سرکش لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں، اور جن تعلقات وروابط کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے یہ لوگ اُن کو توڑتے ہیں، جس کا نتیجہ زمین میں فساد پھیلانا ہوتا ہے۔

بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ مچھر ہو یا اس سے بھی زیادہ، اس جگہ ''زیادہ'' سے مراد یہ ہے کہ حقارت میں زیادہ ہو۔ (مظہری) [1]

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا قرآن اور اس کی مثالوں کے ذریعہ بہت سی مخلوق کو ہدایت کرنا تو ظاہر ہے، مگر اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ قرآن اس کے ماننے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کے لئے ذریعۂ ہدایت ہے، اسی طرح اس کا اِنکار کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کے لئے ذریعۂ گمراہی بھی ہے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ؁ فاسقین، فسق کے لفظی معنی خروج اور باہر نکل جانے کے ہیں، اِصطلاحِ شرع میں اللہ تعالیٰ کی اِطاعت سے نکل جانے کو ''فسق'' کہتے ہیں، اور اِطاعتِ اِلٰہیہ سے نکل جانا کفر واِنکار کے ذریعہ بھی ہوتا ہے، اور عملی نافرمانی کے ذریعہ بھی، اس لئے لفظ ''فاسق'' کافر کے لئے بھی بولا جاتا ہے، قرآنِ کریم میں بیشتر لفظ ''فاسقین'' کافروں ہی کے لئے اِستعمال ہوا ہے۔ اور مؤمن گناہگار کو بھی ''فاسق'' کہا جاتا ہے، فقہاء کی اِصطلاح میں عموماً لفظ ''فاسق'' اسی معنی کے لئے اِستعمال ہوا ہے، ان کی اِصطلاح میں فاسق کو کافر کے بالمقابل اس کی قسیم قرار دیا گیا ہے، جو شخص کسی کبیرہ گناہ کا اِرتکاب کرے، اور پھر اس سے توبہ بھی نہ کرے، یا صغیرہ گناہ پر اِصرار کرے، اس کی عادت بنالے، وہ فقہاء کی اِصطلاح میں ''فاسق'' کہلاتا ہے (مظہری)۔[2] اور جو شخص یہ فسق کے کام اور گناہ علانیہ جرأت کے ساتھ کرتا پھرے اس کو ''فاجر'' کہا جاتا ہے۔

[1] التفسير المظهری تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۴۲

[2] التفسير المظهری تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۴۳

معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کی ان مثالوں سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے، اور بہت سے لوگوں کے حصہ میں گمراہی آتی ہے، مگر ان مثالوں سے گمراہی صرف انہی لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جو فاسق یعنی اِطاعتِ خداوندی سے نکل جانے والے ہیں، اور جن میں کچھ بھی خدا تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے وہ تو ہدایت ہی حاصل کرتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ ''عہد'' اس صورتِ معاملہ اور معاہدے کو کہا جاتا ہے جو دو شخصوں کے درمیان طے ہو جائے، اور ''میثاق'' ایسے معاہدے کو کہتے ہیں جو قسم کے ساتھ مضبوط و مستحکم کیا جائے۔

اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی مزید تشریح ہے اور منکرینِ قرآن کے انجامِ بد کا ذِکر ہے کہ قرآن کی ان مثالوں سے جن پر مشرکین نے اِعتراض کیا ہے صرف وہی لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو حق تعالیٰ کی اِطاعت وفرمانبرداری سے سرکشی کرتے ہیں، جس کی دو وجہ ہیں:-

اوّل یہ کہ ایسا کرنے والے اُس ازلی معاہدے کو توڑ ڈالتے ہیں جو تمام اِنسانوں نے اپنے رَبّ سے باندھا تھا، جبکہ تمام اِنسانوں کی اس عالم میں پیدائش سے پہلے حق تعالیٰ نے تمام پیدا ہونے والے اِنسانوں کی اَرواح کو جمع کر کے ایک سوال فرمایا تھا کہ: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (الاعراف: ١٧٢) یعنی ''کیا میں تمہارا رَبّ اور پروردگار نہیں ہوں؟'' اُس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا: بَلٰی، یعنی ''آپ رَبّ کیوں نہ ہوتے'' جس میں بڑی تاکید کے ساتھ اس کا اِقرار ہے کہ اللہ جل شانہٗ ہمارے رَبّ اور پروردگار ہیں، اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کی اِطاعت سے سرِمو تجاوز نہ کریں، اس لئے یہ عہدِ اَزلی اِنسان اور اللہ جل شانہٗ کے درمیان ہو چکا، اب دُنیا میں پیدا ہونے کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں اسی عہد کی تجدید اور یاددہانی اور اس پر عمل کی تفصیلات بتلانے کے لئے آتے ہیں، جس نے اس معاہدے ہی کو توڑ ڈالا، اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی پیغمبر یا آسمانی کتاب سے فائدہ اُٹھائے؟

دُوسری وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اُن تمام تعلقات کو قطع کر ڈالا ہے جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، ان تعلقات میں وہ تعلق بھی داخل ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان ہے، اور وہ تعلق بھی جو اِنسان کا اپنے ماں باپ اور دُوسرے عزیزوں سے ہے، اور وہ تعلق بھی جو ایک اِنسان کا اپنے پڑوسی اور دُوسرے شرکائے کار کے ساتھ ہے، اور وہ تعلق بھی جو عام مسلمانوں یا عام اِنسانوں کے ساتھ ہے، ان تمام تعلقات کے پورے حقوق ادا کرنے ہی کا نام اِسلام، یا شریعتِ اِسلام ہے، اور انہی میں کوتاہی کرنے سے ساری زمین میں فساد آتا ہے، اسی لئے اس جملے کے بعد فرمایا: وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ یعنی ''یہ لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں'' آخرِ آیت میں ان کے انجامِ بد کا ذِکر فرمایا کہ یہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں۔

مثال میں کسی حقیر و ذلیل یا شرمناک چیز کا ذِکر کرنا کوئی عیب نہیں ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي سے ثابت ہوا کہ کسی مفید مضمون کی توضیح میں کسی حقیر، ذلیل یا شرمناک چیز کا ذِکر کرنا نہ کوئی عیب وگناہ ہے، اور نہ قائل کی عظمتِ شان کے منافی ہے، قرآن وسنت اور علمائے سلف کے اقوال میں بکثرت ایسی مثالیں بھی مذکور ہیں جو عرفاً شرمناک سمجھی جاتی ہیں، مگر قرآن وسنت نے اس عرفی شرم وحیا کی پروا کئے بغیر اَصل مقصد پر نظر رکھ کر ان مثالوں سے اِجتناب گوارا نہیں کیا۔

يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ سے ثابت ہوا کہ عہد ومعاہدہ کی خلاف ورزی شدید گناہ ہے، جس کا نتیجہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ تمام نیکیوں سے محروم ہوجائے۔

تعلقات کے حقوقِ شرعیہ ادا کرنا واجب ہے، اس کے خلاف کرنا گناہِ عظیم

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ سے معلوم ہوا کہ جن تعلقات کو قائم رکھنے کا شریعتِ اِسلام نے حکم دیا ہے ان کا قائم رکھنا ضروری اور قطع کرنا حرام ہے، غور کیا جائے تو دِین ومذہب نام ہی ان حدود وقیود کا ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے مقرّر کی گئی ہیں، اور اس عالم کا صلاح وفساد انہیں تعلقات کو دُرست رکھنے یا توڑنے پر موقوف ہے، اسی لئے ان تعلقات کے قطع کرنے کو وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ کے الفاظ میں وجہِ فسادِ عالم بتلایا ہے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ میں خسارہ والا صرف اسی شخص کو قرار دیا ہے جو مذکورہ اَحکام کی خلاف ورزی کرے، اس میں اِشارہ ہے کہ اَصل خسارہ اور نقصان آخرت ہی کا ہے، دُنیا کا خسارہ کوئی قابلِ توجہ چیز نہیں۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ

کس طرح کافر ہوتے ہو خدائے تعالیٰ سے حالانکہ تم بے جان تھے پھر جلایا تم کو، پھر مارے گا تم کو، پھر جلائے گا تم کو، پھر

اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى

اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب، پھر قصد کیا

اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ ع ۳

آسمان کی طرف سو ٹھیک کر دیا اُن کو سات آسمان، اور خدا تعالیٰ ہر چیز سے خبردار ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

تم اللہ کے ساتھ کفر کا طرزِ عمل آخر کیسے اختیار کر لیتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے، اُسی نے تمہیں زندگی بخشی، پھر وہی تمہیں موت دے گا، پھر وہی تم کو (دوبارہ) زندہ کرے گا، اور پھر تم اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے ﴿۲۸﴾ وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمہارے لئے پیدا کیا، پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا، چنانچہ ان کو سات آسمانوں کی شکل میں ٹھیک ٹھیک بنا دیا، اور وہ ہر چیز کا پورا علم رکھنے والا ہے ﴿۲۹﴾

خلاصۂ تفسیر

بھلا کیونکر ناشکری کرتے ہو اللہ کے ساتھ (کہ اس کے اِحسانات کو بھلا دیتے ہو، اور غیروں کا کلمہ پڑھتے ہو) حالانکہ (اس پر دلائلِ واضحہ قائم ہیں کہ صرف ایک اللہ ہی مستحقِ عبادت ہے مثلاً یہ کہ) تھے تم بے جان (یعنی نطفہ میں جان پڑنے سے پہلے) سو تم کو جاندار کیا، پھر تم کو موت دیں گے، پھر زندہ کریں گے (یعنی قیامت کے دِن) پھر انہی کے پاس لے جائے جاؤ گے (یعنی میدانِ قیامت میں حساب کتاب کے لئے حاضر کئے جاؤ گے) وہ ذاتِ پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب (یہ فائدہ عام ہے کھانے پینے کا ہو یا پہننے اور برتنے کا یا نکاح اور رُوح کو تازگی بخشنے کا، اس سے معلوم ہوا کہ دُنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے اِنسان کو فائدہ نہ پہنچتا ہو، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر چیز کا ہر استعمال حلال ہو، جیسے سمیاتِ قاتلہ بھی فائدۂ اِنسان سے خالی نہیں، مگر اُن کا کھالینا عقلاء کے نزدیک ممنوع ہے) پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف (یعنی اس کی تخلیق و تکمیل کی طرف) تو دُرست کر کے بنا دیئے ان کو سات آسمان اور وہ تو سب چیزوں کے جاننے والے ہیں۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات

پچھلی آیتوں میں خدا تعالیٰ کے وجود، توحید اور رِسالت کے دلائلِ واضحہ اور منکرین و مخالفین کے خیالاتِ باطلہ کا رَدّ مذکور تھا، مذکورہ دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے اِحسانات اور اِنعامات کا ذِکر کر کے اس پر اظہارِ تعجب کیا گیا ہے کہ اتنے اِحسانات کے ہوتے ہوئے کیسے یہ ظالم کفر و اِنکار میں مبتلا ہیں، جس میں اس پر تنبیہ ہے کہ اگر دلائل میں غور کرنے کی زحمت

گوارا نہیں کرتے تو کم از کم محسن کا اِحسان ماننا، اس کی تعظیم و اِطاعت کرنا تو ہر شریف اِنسان کا طبعی اور فطری تقاضا ہے، اسی راستہ سے تم اللہ تعالیٰ کی اِطاعت پر آجاؤ۔

پہلی آیت میں اُن مخصوص نعمتوں کا ذِکر ہے جو ہر اِنسان کی ذات اور نفس کے اندر موجود ہیں کہ پہلے وہ بے جان ذرّات کی صورت میں تھا، پھر اس میں اللہ تعالیٰ نے زندگی پیدا فرمائی۔

دُوسری آیت میں اُن عام نعمتوں کا ذِکر ہے جن سے اِنسان اور تمام مخلوقات فائدہ اُٹھاتی ہیں، اور وہ اِنسان کی زندگی اور بقا کے لئے ضروری ہیں، ان میں پہلے زمین اور اس کی پیداوار کا ذِکر کیا گیا، جس سے اِنسان کا قریبی تعلق ہے، پھر آسمانوں کا ذِکر کیا گیا جن کے ساتھ زمین کی حیات اور پیداوار وابستہ ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ (کیسے اللہ کا اِنکار کرتے ہو) ان لوگوں نے اگرچہ بظاہر خدا کا اِنکار نہیں کیا، مگر رسولِ خدا کے اِنکار کو خدا ہی کا اِنکار قرار دے کر ایسا خطاب کیا گیا ہے۔

كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ، اموات، میّت کی جمع ہے، مردہ اور بے جان چیز کو کہا جاتا ہے، مراد یہ ہے کہ اِنسان اپنی اصلی حقیقت پر غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس کے وجود کی اِبتدا وہ بے جان ذرّات ہیں جو کچھ منجمد چیزوں ں کی شکل میں، کچھ بہنے والی چیزوں میں، کچھ غذاؤں کی صورت میں تمام دُنیا میں پھیلے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن بے جان ذرّات کو کہاں کہاں سے جمع فرمایا، پھر اُن میں جان ڈالی، ان کو زِندہ اِنسان بنادیا، یہ اس کی اِبتدائے پیدائش کا ذِکر ہے۔

ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ یعنی ''جس نے پہلی مرتبہ تمہارے بے جان ذرّات کو جمع کر کے اُن میں جان پیدا کی، وہ اس عالم میں تمہاری عمر کا مقرّرہ وقت پورا ہونے کے بعد پھر تمہیں موت دے گا، اور پھر ایک عرصہ کے بعد قیامت میں اسی طرح تمہارے جسم کے بے جان اور منتشر ذرّات کو جمع کر کے تمہیں زندہ کرے گا''، اس طرح ایک موت یعنی بے جان ہونا تمہاری اِبتدا میں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں زندہ کیا، دُوسری موت دُنیا کی پوری عمر ہونے کے وقت اور دُوسری زندگی قیامت کے روز ہوگی۔

پہلی موت اور زندگی کے درمیان چونکہ کوئی فاصلہ نہ تھا، اس لئے اس میں حرفِ فاء اِستعمال کیا گیا: فَاَحْيَاكُمْ ۚ، اور چونکہ دُنیا کی حیات اور موت کے درمیان اور اسی طرح اُس موت اور قیامت کی زندگی کے درمیان خاصا فاصلہ تھا، اس لئے وہاں لفظ ثُمَّ اِختیار کیا گیا، ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ، کیونکہ لفظ ثُمَّ بعدِ مدّت کے لئے اِستعمال ہوتا ہے۔

ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ یعنی ''پھر تم اُسی ذاتِ پاک کی طرف پھر کر جاؤ گے'' اس سے مراد حشر و نشر اور قیامت کا وقت ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اُس اِنعام واِحسان کا ذِکر کیا ہے جو ہر اِنسان کی اپنی ذات سے متعلق ہے، اور جو سارے اِنعامات واِحسانات کا مدار ہے، یعنی زندگی، دُنیا و آخرت اور زمین و آسمان کی جتنی نعمتیں اِنسان کو حاصل ہیں وہ سب اِسی زندگی پر موقوف ہیں، زندگی نہ ہو تو کسی نعمت سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، زندگی کا نعمت ہونا تو ظاہر ہے، مگر اس آیت میں موت کو بھی نعمتوں کی فہرست میں شمار اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ دُنیا کی موت دروازہ ہے اُس دائمی زندگی کا جس کے بعد موت نہیں، اِس لحاظ سے یہ موت بھی ایک نعمت ہے۔

مسئلہ:- آیتِ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ:-

جو شخص رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رِسالت کا منکر ہو، یا قرآن کے کلامِ اِلٰہی ہونے کا منکر ہو، وہ اگرچہ بظاہر خدا کے وجود و عظمت کا اِنکار نہ کرے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ منکرینِ خدا ہی کی فہرست میں شمار ہے۔

حیاتِ برزخی

اس آیت میں دُنیا کی زندگی اور موت کے بعد صرف ایک حیات کا ذِکر ہے، جو قیامت کے روز ہونے والی ہے، قبر کی زندگی جس کے ذریعہ قبر کا سوال و جواب اور قبر میں ثواب و عذاب ہونا قرآنِ کریم کی متعدّد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے ثابت ہے، اس کا ذِکر نہیں۔

وجہ یہ ہے کہ یہ برزخی زندگی اُس طرح کی زندگی نہیں ہے جو اِنسان کو دُنیا میں حاصل ہے، یا آخرت میں پھر ہوگی، بلکہ ایک درمیانی صورت مثل خواب کی زندگی کے ہے، اس کو دُنیا کی زندگی کا تکملہ بھی کہا جاسکتا ہے، اور آخرت کی زندگی کا مقدمہ بھی، اس لئے کوئی مستقل زندگی نہیں جس کا جداگانہ ذِکر کیا جائے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ''اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے، سب کا سب'' یہ اُس نعمتِ عامہ کا ذِکر ہے جس میں تمام اِنسان بلکہ حیوانات وغیرہ بھی شریک ہیں، اور ایک لفظ میں اُن تمام نعمتوں کا اِجمال آگیا جو دُنیا میں کسی اِنسان کو حاصل ہوئیں یا ہوسکتی ہیں، کیونکہ اِنسان کی غذا، لباس، مکان اور دَوا اور راحت کے کل سامان زمین ہی کی پیداوار ہیں۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ استواء کے لفظی معنی سیدھا ہونے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ زمین کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی تخلیق کا قصد راست فرمایا، جس میں کوئی حائل اور مانع نہ ہوسکے، یہاں تک کہ سات آسمانوں کی تخلیق مکمل فرمادی، اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے، اس لئے تخلیقِ کائنات اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔

دُنیا کی ہر چیز نفع بخش ہے، کوئی شے بیکار نہیں

اس آیت میں زمین کی تمام چیزوں کو اِنسان کے لئے پیدا فرمانے کا بیان ہوا ہے۔

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ دُنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے اِنسان کو کسی نہ کسی حیثیت سے بلا واسطہ یا بالواسطہ فائدہ نہ پہنچتا ہو، خواہ یہ فائدہ دُنیا میں اِستعمال کرنے کا ہو، یا آخرت کے لئے عبرت ونصیحت حاصل کرنے کا، بہت سی چیزوں کا فائدہ تو اِنسان محسوس کرتا ہے، اس کی غذا یا دوا یا اِستعمال میں براہِ راست آتی ہیں، اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ اِنسان کو ان سے فائدہ پہنچتا ہے، مگر اس کو خبر بھی نہیں ہوتی، یہاں تک کہ جو چیزیں اِنسان کے لئے مضر سمجھی جاتی ہیں جیسے زہریلی اشیاء، زہریلے جانور وغیرہ، غور کریں تو وہ کسی نہ کسی حیثیت سے اِنسان کے لئے نفع بخش بھی ہوتی ہیں، جو چیزیں اِنسان کے لئے ایک طرح سے حرام ہیں دُوسری کسی طرح اور حیثیت سے ان کا نفع بھی اِنسان کو پہنچتا ہے ؎

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

عارف باللہ ابن عطاءؒ نے اس آیت کے تحت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو تمہارے واسطے اس لئے پیدا فرمایا کہ ساری کائنات تمہاری ہو اور تم اللہ کے لئے ہو، اس لئے عقل مند کا کام یہ ہے کہ جو چیز اسی کے لئے پیدا ہوئی ہے وہ تو اس کو ملے گی، اس کی فکر میں لگ کر اُس ذات سے غافل نہ ہو جس کے لئے یہ پیدا ہوا ہے۔ (بحرِ محیط) [1]

اشیائے عالم میں اصل اِباحت ہے یا حرمت؟

اس آیت سے بعض علماء نے اس پر اِستدلال کیا ہے کہ دُنیا کی تمام چیزوں میں اصل یہ ہے کہ وہ اِنسان کے لئے حلال ومباح ہوں، کیونکہ وہ اسی کے لئے پیدا کی گئی ہیں، بجز اُن چیزوں کے جن کو شریعت نے حرام قرار دے دیا، اس لئے جب تک کسی چیز کی حرمت قرآن وسنت سے ثابت نہ ہو اس کو حلال سمجھا جائے گا۔

اس کے بالمقابل بعض علماء نے یہ قرار دِیا کہ اِنسان کے فائدے کے لئے کسی چیز کے پیدا ہونے سے اس کا حلال ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس لئے اصل اشیاء میں حرمت ہے، جب تک قرآن وسنت کی کسی دلیل سے جواز ثابت نہ ہو ہر چیز حرام سمجھی جائے گی۔

بعض حضرات نے توقف فرمایا۔

---

[1] تفسیر البحر المحیط تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۱۶۵

تفسیر بحرِ محیط میں ابنِ حیانؒ نے فرمایا کہ صحیح یہ ہے کہ اس آیت میں اقوالِ مذکورہ میں سے کسی کے لئے حجت نہیں، کیونکہ خَلَقَ لَكُمْ میں حرفِ لام سببیت بتلانے کے لئے آیا ہے کہ تمہارے سبب سے یہ چیزیں پیدا کی گئی ہیں، اس سے نہ اِنسان کے لئے اُن چیزوں کے حلال ہونے پر کوئی دلیل قائم ہوسکتی ہے نہ حرام ہونے پر، بلکہ حلال وحرام کے اَحکام جداگانہ قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں، انہیں کا اِتباع لازم ہے۔

اس آیت میں زمین کی پیدائش پہلے اور آسمانوں کی پیدائش بعد میں ہونا بلفظ ثُمَّ بیان کیا گیا ہے، اور یہی صحیح ہے، اور سورۂ والنازعات میں جو یہ اِرشاد ہے: وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ (النازعات) یعنی ''زمین کو آسمانوں کے پیدا کرنے کے بعد بچھایا'' اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین کی پیدائش آسمانوں کے بعد ہوئی ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی دُرستی اور اس میں سے پیداوار نکالنے وغیرہ کے تفصیلی کام آسمانوں کی پیدائش کے بعد ہوئے، اگرچہ اصل زمین کی تخلیق آسمانوں سے پہلے ہوچکی تھی۔ (بحرِ محیط وغیرہ) [1]

اس آیت سے آسمانوں کی تعداد سات ہونا ثابت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علمِ ہیئت والوں کا آسمانوں کی تعداد نو بتلانا غلط، بے دلیل اور محض خیالات پر مبنی ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا

اور جب کہا تیرے رَبّ نے فرشتوں کو کہ: میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب، کہا فرشتوں نے:

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ

کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اور اس میں اور خون بہائے، اور ہم پڑھتے رہتے ہیں

بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ

تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو، فرمایا: بے شک مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔ اور سکھلا دیئے اللہ نے

اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ

آدم کو نام سب چیزوں کے پھر سامنے کیا اُن سب چیزوں کو فرشتوں کے، پھر فرمایا: بتاؤ مجھ کو نام

[1] تفسیر البحر المحیط تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۱۶۴

هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝۳۱ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا

ان کے اگر تم سچے ہو۔ بولے: پاک ہے تو ہم کو معلوم نہیں مگر جتنا

عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝۳۲ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ

تو نے ہم کو سکھلایا، بے شک تو ہی ہے اصل جاننے والا حکمت والا۔ فرمایا: اے آدم! بتادے فرشتوں کو

بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ

اُن چیزوں کے نام، پھر جب بتادیئے اس نے ان کے نام، فرمایا: کیا نہ کہا تھا میں نے تم کو کہ میں خوب جانتا ہوں

غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ۝۳۳

چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، وہ کہنے لگے: ''کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو اس میں فساد مچائے، اور خون خرابہ کرے، حالانکہ ہم آپ کی تسبیح اور حمد و تقدیس میں لگے ہوئے ہیں؟'' اللہ نے کہا: ''میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے'' ۝۳۰ اور آدم کو (اللہ نے) سارے کے سارے نام سکھادیے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور (ان سے) کہا: اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام تو بتلاؤ ۝۳۱ وہ بول اُٹھے: آپ ہی کی ذات پاک ہے، جو کچھ علم آپ نے ہمیں دیا ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔ حقیقت میں علم و حکمت کے مالک تو صرف آپ ہیں ۝۳۲ اللہ نے کہا: ''آدم! تم ان کو ان چیزوں کے نام بتادو'' چنانچہ جب اس نے ان کے نام ان کو بتادیے تو اللہ نے (فرشتوں سے) کہا: ''کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہوں؟ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو مجھے اس سب کا علم ہے'' ۝۳۳

خلاصۂ تفسیر

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے ربّ نے فرشتوں سے (تا کہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں جس میں حکمت و مصلحت تھی، مشورہ کی حاجت سے تو حق تعالیٰ بالا و برتر ہیں، غرض اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ) ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب (یعنی وہ میرا نائب ہوگا کہ اپنے اَحکامِ شرعیہ کے اِجراء و نفاذ کی خدمت اس کے سپرد کروں گا) کہنے لگے: کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اس میں اور خوں ریزیاں کریں گے، اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں بحمد اللہ اور آپ کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں (فرشتوں کی یہ گزارش نہ بطورِ اعتراض اور نہ اپنا استحقاق جتانے کے لئے، بلکہ فرشتوں کو کسی طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جو نئی مخلوق زمین سے بنائی جائے گی ان میں نیک و بد ہر طرح کے لوگ ہوں گے، بعض لوگ اس نیابت کے کام کو اور زیادہ خراب کریں گے، اس لئے نیاز مندانہ عرض کیا کہ ہم سب کے سب ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں، اور گروہِ ملائکہ میں کوئی گناہ کرنے والا بھی نہیں، اس لئے کوئی نیا عملہ بڑھانے اور نئی مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، خصوصاً جبکہ اس نئی مخلوق میں یہ بھی اِحتمال ہے کہ وہ آپ کی مرضی کے خلاف کام کریں گے جس سے آپ ناخوش ہوں، ہم ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں اور ہماری خدمت آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگی)، حق تعالیٰ نے اِرشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے (یعنی جو چیز تمہاری نظر میں تخلیقِ بنی آدم سے مانع ہے کہ ان میں بعض فساد بھی پھیلائیں گے، وہی چیز درحقیقت ان کی تخلیق کا اصلی سبب ہے، کیونکہ اِجراءِ اَحکام و انتظام تو جبھی وقوع میں آسکتا ہے جب کوئی اعتدال سے تجاوز کرنے والا بھی ہو، یہ مقصد تم فرمانبرداروں کے جمع ہونے سے پورا نہیں ہوسکتا، اور اعتدال سے تجاوز کر جانے والی ایک مخلوق جنات پہلے سے موجود تھی، اس سے یہ کام کیوں نہ لیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے لئے موزوں وہ مخلوق ہوسکتی ہے جن میں شر و فساد کا عنصر موجود تو ہو مگر غالب نہ ہو، جنات میں یہ عنصر غالب تھا، اس لئے تخلیقِ آدم کی تجویز فرمائی، آگے اسی حکمتِ الٰہیہ کی مزید توضیح اس طرح کی گئی کہ نیابتِ خداوندی کے لئے ایک خاص علم کی ضرورت ہے، وہ علم ملائکہ کی اِستعداد سے خارج ہے، اس لئے فرمایا کہ) اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو (ان کو پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا (یعنی سب چیزوں کے نام اور ان کے خواص و آثار سب کا علم آدم کو دے دیا گیا) پھر وہ چیزیں فرشتوں کے رُوبرو کر دیں، پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھ کو اَسماء ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے آثار و خواص کے) اگر تم سچے ہو (یعنی اپنے اس قول میں سچے ہو کہ ہم خلافتِ ارضی کا کام اچھا انجام دے سکیں گے) فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں (اس اِلزام سے کہ آدم علیہ السلام پر اس علم کو ظاہر فرما دیا، ہم سے پوشیدہ رکھا، کیونکہ کسی آیت یا روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کو علمِ اسماء کی تعلیم فرشتوں سے الگ کر کے دی

گئی، اس سے ظاہر یہ ہے کہ تعلیم تو سب کے سامنے یکساں دی گئی مگر آدم علیہ السلام کی فطرت میں اس علم کے حاصل کر لینے کی صلاحیت تھی انہوں نے حاصل کر لیا، فرشتوں کی طبیعت اس کی متحمل نہ تھی، ان کو یہ علم حاصل نہ ہوا) مگر ہم کو ہی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا، بے شک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں (کہ جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا اسی قدر علم و فہم اس کو عطا فرمایا، اس سے فرشتوں کا یہ اعتراف تو ثابت ہو گیا کہ وہ اُس کام سے عاجز ہیں جو نائب کے سپرد کرنا ہے، آگے حق تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ آدم علیہ السلام میں اس علمِ خاص کی مناسبت کو فرشتوں کے سامنے آشکارا فرمادیں، اس لئے) حق تعالیٰ نے اِرشاد فرمایا کہ اے آدم! تم بتلا دو ان کو ان چیزوں کے اسماء (یعنی مع حالات و خواص کے، جب آدم علیہ السلام نے یہ سب فرشتوں کے رُوبرو بتلا دیا تو فرشتے اتنا سمجھ گئے کہ آدم علیہ السلام اس علم کے ماہر ہو گئے ہیں) سو جب بتلا دیئے اُن کو آدم علیہ السلام نے اُن چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو) میں تم سے نہ کہتا تھا کہ بے شک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو ظاہر کر دیتے ہو اور جس کو دِل میں رکھتے ہو۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات

پچھلی آیات میں اللہ جل شانہ کی خاص و عام نعمتوں کا ذِکر کر کے اِنسان کو ناشکری اور نافرمانی سے بچنے کی ہدایت کی گئی، اس آیت سے آخر رُکوع تک دس آیتوں میں آدم علیہ السلام کا قصہ بھی اسی سلسلہ میں ذِکر فرمایا ہے، کیونکہ نعمت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک صوری یعنی محسوس، جیسے کھانا پینا، روپیہ پیسہ، مکان جائیداد، دُوسری معنوی جیسے عزّت و آبرو، مسرّت، علم۔ پچھلی آیات میں صوری اور ظاہری نعمتوں کا ذِکر تھا، اور ان گیارہ آیتوں میں معنوی نعمتوں کا ذِکر ہے کہ ہم نے تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو دولتِ علم دی اور مسجودِ ملائکہ بنانے کی عزّت دی، اور تم کو ان کی اولاد میں ہونے کا فخر عطا کیا۔

خلاصۂ مضمون آیت کا یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے جب تخلیقِ آدمؑ اور دُنیا میں اس کی خلافت قائم کرنے کا اِرادہ کیا، تو فرشتوں سے بظاہر ان کا اِمتحان لینے کے لئے اس اِرادے کا ذِکر فرمایا، جس میں اِشارہ یہ تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنی رائے کا اِظہار کریں، فرشتوں نے رائے یہ پیش کی کہ اِنسانوں میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد اور خوں ریزی کریں گے، اُن کو زمین کی خلافت اور اِنتظام سپرد کرنا سمجھ میں نہیں آتا، اس کام کے لئے تو فرشتے زیادہ اَنسب معلوم ہوتے ہیں کہ نیکی ان کی فطرت ہے، برائی کا صدور ہی اُن سے ممکن نہیں، وہ مکمل اطاعت گزار ہیں، دُنیا کے اِنتظامات بھی وہ دُرست

کر سکیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے غلط ہونے کا اظہار اوّل ایک حاکمانہ طرز سے دیا کہ خلافتِ ارضی کی حقیقت اور اس کی ضروریات سے تم واقف نہیں، اس کو میں ہی مکمل طور پر جانتا ہوں۔

پھر دُوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقامِ علم میں آدم علیہ السلام کے تفوّق کا ذِکر کر کے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافتِ ارض کے لئے زمینی مخلوقات کے نام اور اُن کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ہے اور فرشتوں کی اِستعداد اس کی متحمل نہیں۔

تخلیقِ آدم کی گفتگو فرشتوں سے کس مصلحت پر مبنی تھی؟

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حضرتِ حق جل وعلا شانہٗ کا فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کا اِظہار کس حیثیت سے تھا؟ کیا اُن سے مشورہ لینا مقصود تھا؟ یا محض ان کو اِطلاع دینا پیشِ نظر تھا؟ یا فرشتوں کی زبان سے اُن کی رائے کا اِظہار کرانا اس کا منشا تھا؟

سو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے جہاں مسئلہ کے سب پہلو کسی پر روشن نہ ہوں، اور اپنے علم و بصیرت پر مکمل اطمینان نہ ہو، اس لئے دُوسرے عقلاء و اہلِ دانش سے مشورہ کیا جاتا ہے، یا ایسی صورت میں جہاں حقوق دُوسروں کے بھی مساوی ہوں، تو اُن کی رائے لینے کے لئے مشورہ ہوتا ہے، جیسے دُنیا کی عام کونسلوں میں رائج ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں دونوں صورتیں نہیں ہوسکتیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ خالقِ کائنات ہیں، ذرّے ذرّے کا علم رکھتے ہیں، اور ظاہر و باطن ہر چیز اُن کے علم و بصر کے سامنے برابر ہے، اُن کو کیا ضرورت کہ کسی سے مشورہ لیں؟

اسی طرح یہاں یہ بھی نہیں کہ کوئی پارلیمانی حکومت ہے، جس میں تمام ارکان کے مساوی حقوق ہیں، اور سب سے مشورہ لینا ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کے خالق اور مالک ہیں، فرشتے ہوں یا جن و انس، سب اُن کی مخلوق و مملوک ہیں، کسی کو حق نہیں کہ اُن کے کسی فعل کے متعلق سوال بھی کر سکے کہ آپ نے یہ کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا: لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾ (الانبیاء) ''اللہ تعالیٰ سے اس کے کسی فعل کے متعلق سوال نہیں کیا جاسکتا، اور سب سے ان کے اعمال کا سوال کیا جائے گا)۔

بات یہی ہے کہ درحقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں اور نہ اُس کی ضرورت ہے، مگر صورت مشورہ کی بنائی گئی، جس میں مخلوق کو سنتِ مشورہ کی تعلیم کا فائدہ ہوسکتا ہے، جیسے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرامؓ سے مشورہ لینے کی ہدایت قرآن میں فرمائی گئی، حالانکہ آپ تو صاحبِ وحی ہیں، تمام معاملات اور اُن کے تمام پہلو آپ کو بذریعۂ وحی بتلائے جاسکتے تھے، مگر آپ کے ذریعہ مشورہ کی سنت جاری کرنے اور اُمت کو سکھانے کے لئے آپ کو بھی مشورے کی تاکید فرمائی گئی۔

غرض فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کے اظہار سے ایک فائدہ تو تعلیمِ مشورہ کا حاصل ہوا (کمافی رُوح البیان)۔[۱]
دُوسرا فائدہ خود اَلفاظِ قرآنی کے اِشارہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِنسان کی پیدائش سے پہلے فرشتے یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے زیادہ افضل واَعلم کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ پیدا نہیں کریں گے۔

اور تفسیر ابنِ جریر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے کہ خلقتِ آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتے آپس میں کہتے تھے کہ: "لَنْ يَّخْلُقَ اللهُ خَلْقًا اَكْرَمَ عَلَيْهِ مِنَّا وَلَا اَعْلَمَ" (یعنی اللہ تعالیٰ کوئی مخلوق ہم سے افضل اور اَعلم پیدا نہ فرمائیں گے)۔[۲] حضرتِ حق جل شانہٗ کے علم میں تھا کہ ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا ہے جو تمام مخلوقات سے زیادہ افضل واَعلم ہوگی، اور جس کو اپنی خلافت و نیابت کا خلعت عطا کیا جائے گا۔

اس لئے فرشتوں کی مجلس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور زمین کے نائب بنانے کا ذِکر کیا گیا کہ وہ اپنے خیال کا اِظہار کریں۔

چنانچہ فرشتوں نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق نیازمندی کے ساتھ رائے کا اِظہار کیا کہ جس مخلوق کو آپ خلیفۂ زمین بنارہے ہیں، اس میں تو شر و فساد کا مادّہ بھی ہے، وہ دُوسروں کی اِصلاح اور زمین میں امن و امان کا اِنتظام کیسے کرسکتا ہے، جبکہ وہ خود خوں ریزی کا بھی مرتکب ہوگا، اس کے بجائے آپ کے فرشتوں میں شر و فساد کا کوئی مادّہ نہیں، وہ خطاؤں سے معصوم ہیں، اور ہر وقت آپ کی تسبیح و تقدیس اور عبادت و اطاعت میں لگے ہوتے ہیں، وہ بظاہر اس خدمت کو اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔

غرض اس سے معاذ اللہ حضرتِ حق جل شانہٗ کے فعل پر اِعتراض نہیں، کیونکہ فرشتے ایسے خیالات و حالات سے معصوم ہیں، بلکہ مقصد محض دریافت کرنا تھا کہ ایک ایسی معصوم جماعت کے موجود ہوتے ہوئے دُوسری غیر معصوم مخلوق پیدا کرکے یہ کام اُس کے حوالے کرنا اور اس کو ترجیح دینا کس حکمت پر مبنی ہے؟

چنانچہ اس کے جواب میں پہلے تو حق تعالیٰ نے اِجمالی طور پر یہ فرمایا کہ: اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰ یعنی تم خلافتِ اِلٰہیہ کی حقیقت اور اس کے لوازم سے واقف نہیں، اس لئے یہ سمجھ رہے ہو کہ ایک معصوم مخلوق ہی اس کو اَنجام دے سکتی ہے، اس کی پوری حقیقت کو ہم ہی جانتے ہیں۔

اس کے بعد فرشتوں کو اس کا کچھ تفصیلی علم کرانے کے لئے ایک خاص واقعہ کا اِظہار کیا گیا کہ تمام کائناتِ عالم کے نام اور ان کے خواص و آثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی، فرشتوں کی فطرت

---

[۱] تفسیر رُوح البیان تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۶۴

[۲] تفسیر الطبری تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۴۶۵

وجبلت اس کے مناسب نہ تھی، وہ سب آدم علیہ السلام کو سکھائے اور بتلائے گئے تھے، مثلاً دُنیا کی نافع و مضر چیزیں اور ان کے خواص و آثار، ہر جان دار اور ہر قوم کے مزاج وطبائع اور ان کے آثار، اُن چیزوں کے معلوم کرنے کے لئے طبیعتِ مَلکی متحمل نہیں، فرشتہ کیا جانے کہ بھوک کیا ہوتی ہے، پیاس کی تکلیف کیسی ہوتی ہے، نفسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا ہے، کسی چیز سے نشہ کس طرح پیدا ہوتا ہے، سانپ اور بچھو کا زہر کس بدن پر کیا اثر کرتا ہے۔

غرض زمینی مخلوقات کے نام اور خواص و آثار کی دریافت فرشتوں کے مزاج اور مخصوص طبیعت سے بالکل علیحدہ چیز تھی، یہ علم صرف آدم علیہ السلام ہی کو سکھلایا جاسکتا تھا، انہی کو سکھلایا گیا، پھر قرآن کی کسی تصریح یا اِشارہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدم علیہ السلام کو یہ تعلیم کسی تنہائی میں فرشتوں سے علیحدہ دی گئی، اس لئے ہوسکتا ہے کہ تعلیم سب کے لئے عام ہی ہو، مگر اس تعلیم سے فائدہ اُٹھانا آدم علیہ السلام کی طبیعت میں تھا، وہ سیکھ گئے، فرشتوں کی طبیعت میں نہ تھا، وہ نہ سیکھ سکے، اسی لئے یہاں تعلیم کو آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا، اگرچہ یہ تعلیم فی نفسہٖ عام تھی، آدم علیہ السلام اور ملائکہ دونوں کو شامل تھی، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ظاہری تعلیم کی صورت ہی عمل میں نہ آئی ہو، بلکہ آدم علیہ السلام کی فطرت میں اُن چیزوں کا علم اِبتدائے آفرینش سے ودیعت کردیا گیا ہو، جیسے بچہ اِبتدائے ولادت میں ماں کا دُودھ پینا جانتا ہے، بطخ کا بچہ تیرنا جانتا ہے، اس میں کسی ظاہری تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو سب کچھ ہے، وہ فرشتوں کا مزاج اور طبیعت بدل کر اُن کو بھی یہ چیزیں سکھا سکتے تھے، تو اُن کو کیوں نہ سکھایا گیا؟ مگر اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ فرشتوں کو ہی اِنسان کیوں نہ بنادیا، کیونکہ اگر فرشتوں کی جبلت وفطرت کو بدلا جاتا تو پھر وہ فرشتے نہ رہتے بلکہ اِنسان ہی ہوجاتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ زمینی مخلوقات کے اسماء اور اُن کے خواص و آثار کا آدم علیہ السلام کو علم دیا گیا، جو فرشتوں کے بس کا نہیں تھا، اور پھر اُن مخلوقات کو فرشتوں کے سامنے کرکے سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ ہم سے زیادہ کوئی مخلوق اَعلم و افضل پیدا نہیں ہوگی، یا یہ کہ زمین کی خلافت و نیابت کے لئے فرشتے بہ نسبت اِنسان کے زیادہ موزوں ہیں تو اُن چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ جن پر خلیفۂ زمین کو حکومت کرنا ہے۔

یہاں سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوگیا کہ حاکم کے لئے ضروری ہے کہ اپنی محکوم رعایا کے مزاج وطبائع سے اور ان کے خواص و آثار سے پورا واقف ہو، اس کے بغیر وہ اُن پر عدل و اِنصاف کے ساتھ حکمرانی نہیں کرسکتا، جو شخص یہ نہیں جانتا کہ بھوک سے کیسی اور کتنی تکلیف ہوتی ہے، اگر اس کی عدالت میں کوئی دعویٰ کسی کو بھوکا رکھنے کے متعلق پیش ہو تو وہ اس کا فیصلہ کیا اور کس طرح کرے گا؟

غرض اسی واقعہ سے حق تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ بتلادیا کہ زمین کی نیابت کے لئے معصوم ہونے کو دیکھنا نہیں بلکہ

اس کو دیکھنا ہے کہ وہ زمین کی چیزوں سے پورا واقف ہو، اُن کے اِستعمال کے طریقوں اور اُن کے ثمرات کو جانتا ہو، اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہے کہ فرشتے اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ۔

فرشتوں کا اظہارِ رائے چونکہ کسی اِعتراض یا فخر وغرور یا اپنا اِستحقاق جتلانے کے لئے نہیں بلکہ محض اپنے خیال کا اظہار ایک نیازمند خادم کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تھا، اس لئے فوراً بول اُٹھے: سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ (پاک ہیں آپ، ہم کو علم نہیں، مگر وہی جو آپ نے عطا فرمایا، بے شک آپ بڑے علم وحکمت والے ہیں) جس کا حاصل اپنے خیال سے رُجوع اور اس کا اِقرار تھا کہ زیادہ اَعلم واَفضل مخلوق بھی موجود ہے، اور یہ کہ زمین کی نیابت کے لئے وہی موزوں ہیں۔

دُوسرا سوال اس جگہ یہ ہے کہ فرشتوں کو اس کی کیسے خبر ہوئی کہ انسان خوں ریزی کرے گا، کیا انہیں علمِ غیب تھا؟ یا محض اٹکل اور تخمینہ سے انہوں نے یہ سمجھا تھا؟

اس کا جواب جمہورِ محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو اِنسان کے حالات اور اس کے ہونے والے معاملات بتلا دیئے تھے، جیسا کہ بعض آثار میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو خلیفۂ زمین بنانے کا ذِکر فرمایا، تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ ہی سے اس خلیفہ کا حال دریافت کیا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی نے اُن کو بتلایا (رُوح المعانی)[1]۔ اس سے فرشتوں کو تعجب ہوا کہ جب اِنسان کا یہ حال ہے کہ وہ فساد وخوں ریزی بھی کرے گا تو اس کو نیابتِ زمین کے لئے منتخب فرمانا کس حکمت پر مبنی ہے۔

اسی کا ایک جواب تو حضرتِ حق جل شانہٗ کی طرف سے آدم علیہ السلام کے علمی تفوّق کا اِظہار فرما کر دے دیا گیا، اور فساد وخوں ریزی سے جو شبہ اس کے اِستحقاقِ نیابت پر کیا گیا تھا، اس کا جواب اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ میں اِجمالاً دے دیا گیا، جس میں اِشارہ ہے کہ جس چیز کو تم نیابت وخلافت کے منافی سمجھ رہے ہو، درحقیقت وہ ہی اس کی اہلیت کا بڑا سبب ہے، کیونکہ نیابتِ زمین کی ضرورت ہی رفعِ فساد کے لئے ہے، جہاں فساد نہ ہو وہاں خلیفہ اور نائب بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں، غرض یہ بتلا دیا گیا کہ مَنشائے اِلٰہی یہ ہے کہ جس طرح اس نے ایک ایسی مقدس معصوم مخلوق فرشتے پیدا کردیئے جس سے کسی گناہ خطا کا صدور ہو ہی نہیں سکتا، اور جس طرح اس نے شیاطین پیدا کردیئے جن میں نیکی اور بھلائی کی صلاحیت نہیں، اسی طرح ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا منشائے خداوندی ہے، جس میں خیر وشر، نیکی اور بدی کا مخلوط مجموعہ ہو، اور جس میں خیر وشر کے دونوں جذبات ہوں، اور جو جذباتِ شر کو مغلوب کرکے خیر کے میدان میں آگے بڑھے، اور رضائے خداوندی کا خلعت حاصل کرے۔

[1] رُوح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۲۵۸

واضعِ لغت خود حق تعالیٰ ہیں

اس قصۂ آدم علیہ السلام اور تعلیمِ اسماء کے واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ زبان اور لغت کے اصل واضع خود حق سبحانہ وتعالیٰ ہیں، پھر اس میں مخلوق کے اِستعمالات سے مختلف صورتیں اور مختلف زبانیں پیدا ہوگئیں، اِمام اشعریؒ نے اسی آیت سے اِستدلال کر کے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کو واضعِ لغت قرار دیا ہے۔[1]

آدم علیہ السلام کا تفوّق فرشتوں پر

اس واقعہ میں قرآنِ حکیم کے یہ بلیغ الفاظ بھی قابلِ نظر ہیں کہ جب فرشتوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ ان چیزوں کے نام بتلاؤ لفظ اَنۢبِـُٔوْنِیْ اِرشاد فرمایا کہ مجھے بتلاؤ، اور جب آدم علیہ السلام کو اسی چیز کا خطاب ہوا تو لفظ اَنۢبِئْهُمْ فرمایا گیا، یعنی آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرشتوں کو یہ اسماء بتلائیں۔

اس طرزِ بیان کے فرق سے واضح ہوگیا کہ آدم علیہ السلام کو معلّم کا درجہ دیا گیا، اور فرشتوں کو طالبِ علم کا، جس میں آدم علیہ السلام کی فضیلت وتفوّق کا ایک اہم صورت سے اِظہار کیا گیا۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتوں کے علوم میں بھی کمی اور زیادتی ہوسکتی ہے، کیونکہ جس چیز کا ان کو علم نہیں تھا، آدم علیہ السلام کے ذریعے اُن کو بھی اُن چیزوں کا اِجمالی طور پر کسی نہ کسی درجہ میں علم دے دیا گیا۔

خلافتِ ارض کا مسئلہ

زمین کا اِنتظام اور اس میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے اس کی طرف سے کسی نائب کا مقرّر ہونا، جو اِن آیات سے معلوم ہوا، اس سے دستورِ مملکت کا اہم باب نکل آیا، کہ اِقتدارِ اعلیٰ تمام کائنات اور پوری زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، جیسا کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ (الانعام:۵۷) اور لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ (البقرۃ:۱۰۷) اور اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ (الاعراف:۵۴) وغیرہ، زمین کے اِنتظام کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نائب آتے ہیں، جو باذنِ خداوندی زمین پر سیاست وحکومت اور بندگانِ خدائے تعالیٰ کی تعلیم وتربیت کا کام کرتے اور اَحکامِ اِلٰہیہ کو نافذ کرتے ہیں، اس خلیفہ ونائب کا تقرّر بلاواسطہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کسی کے کسب وعمل کا کوئی دخل نہیں، اسی لئے پوری اُمت کا اِجماعی عقیدہ ہے کہ نبوّت کسبی چیز نہیں، جس کو کوئی اپنی سعی وعمل سے حاصل کر سکے، بلکہ حق تعالیٰ ہی خود اپنے علم وحکمت کے تقاضے سے خاص خاص اَفراد کو اس کام کے لئے چن لیتے ہیں، جن کو اپنا نبی ورسول یا خلیفہ ونائب قرار دیتے ہیں، قرآنِ حکیم نے جگہ جگہ اس کا اِظہار فرمایا ہے، اِرشاد ہے:-

[1] ملاحظہ فرمایئے: التفسیر الکبیر للإمام الرازیؒ ج:۱ ص:۴۵۳

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۷۵﴾ (الحج)

''اللہ تعالیٰ انتخاب کر لیتا ہے فرشتوں میں سے اپنے رسول کو اور اِنسانوں میں سے بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

نیز اِرشاد ہے:-

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ ؕ (الانعام:۱۲۴)

''اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ اپنی رسالت کس کو عطا فرماویں۔''

یہ خلیفۃ اللہ بلاواسطہ حق تعالیٰ سے اس کے اَحکام معلوم کرتے اور پھر اُن کو دُنیا میں نافذ کرتے ہیں، یہ سلسلۂ خلافت و نیابت اِلٰہیہ آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی انداز میں چلتا رہا، یہاں تک کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے آخری خلیفہ ہوکر بہت ہی اہم خصوصیات کے ساتھ تشریف لائے۔

ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ سے قبل انبیاء خاص خاص قوموں یا ملکوں کی طرف مبعوث ہوتے تھے، اُن کا حلقۂ حکومت واختیار اُنہی قوموں اور ملکوں میں محدود ہوتا تھا، اِبراہیم علیہ السلام ایک قوم کی طرف، لوط علیہ السلام دُوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور ان کے درمیان آنے والے انبیاء بنی اِسرائیل کی طرف بھیجے گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمین میں اللہ کے آخری خلیفہ ہیں اور آپ کی خصوصیات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے عالم اور اس کی دونوں قوم جنات واِنسان کی طرف بھیجا گیا، آپ کا اِختیار واِقتدار پوری دُنیا کی دونوں قوموں پر حاوی فرمایا گیا، قرآنِ کریم نے آپ کی بعثت ونبوّت کے عام ہونے کا اِعلان اس آیت میں فرمایا:-

قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَا الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (الاعراف:۱۵۸)

''آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف، اللہ وہ ذات ہے جس کے قبضے میں ہیں ملک آسمانوں اور زمین کا۔''

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تمام انبیاء علیہم السلام پر چھ چیزوں میں خاص فضیلت بخشی گئی ہے،[۱] ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو تمام عالم کا نبی و رسول بنا کر بھیجا گیا۔

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب المساجد ج:۱ ص:۱۹۹

دُوسری خصوصیت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت و نیابت جس طرح خاص خاص ملکوں اور قوموں میں محدود ہوتی تھی، اسی طرح ایک خاص زمانے کے لئے مخصوص ہوتی تھی، اُس کے بعد دُوسرا رسول آجاتا، تو پہلے رسول کی خلافت و نیابت ختم ہوکر آنے والے رسول کی خلافت قائم ہوجاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے خاتم الانبیاء بنادیا کہ آپ کی خلافت و نیابت قیامت تک قائم رہے گی، اُس کا زمانہ بھی کوئی مخصوص زمانہ نہیں، بلکہ جب تک زمین و آسمان قائم اور زمانے کا وجود ہے وہ بھی قائم ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات و شریعت ایک زمانہ تک محفوظ رہتی اور چلتی تھی، رفتہ رفتہ اُس میں تحریفات ہوتے ہوئے وہ کالعدم ہوجاتی تھیں، اُس وقت کوئی دُوسرا رسول اور دُوسری شریعت بھیجی جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کا دِین، آپ کی شریعت قیامت تک محفوظ رہے گی، قرآن مجید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس کے تو اَلفاظ اور معانی سب چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی، اور اِرشاد فرمایا:-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾ (الحجر)

''ہم نے ہی قرآن نازل فرمایا اور ہم اس کے محافظ ہیں۔''

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و اِرشادات جن کو ''حدیث'' کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے ایک خاص اِنتظام فرمادیا کہ قیامت تک آپ کی تعلیمات اور اِرشادات کو جان سے زیادہ عزیز سمجھنے والی ایک جماعت باقی رہے گی، جو آپ کے علوم و معارف اور آپ کے شرعی اَحکام صحیح صحیح لوگوں کو پہنچاتی رہے گی، کوئی اس جماعت کو مٹا نہ سکے گا، اللہ تعالیٰ کی تائیدِ غیبی اُن کے ساتھ رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی کتابیں اور صحیفے سب مسخ و محرّف ہوجاتے، اور بالآخر دُنیا سے گم ہوجاتے، یا غلط سلط باقی رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب قرآن اور آپ کی بتلائی ہوئی ہدایات حدیث سب کی سب اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ قیامت تک موجود و محفوظ رہیں گی، اسی لئے اس زمین پر آپ کے بعد نہ کسی نئے نبی اور رسول کی ضرورت ہے، نہ کسی اور خلیفۃ اللہ کی گنجائش۔

چوتھی خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت و نیابت جو محدود زمانے کے لئے ہوتی تھی، ہر نبی و رسول کے بعد دُوسرا رسول من جانب اللہ مقرّر ہوتا اور نیابت کا کام سنبھالتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نظامِ خلافت

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ خلافت و نیابت تا قیامت ہے، اس لئے قیامت تک آپ ہی اس زمین میں خلیفۃ اللہ ہیں، آپ کی وفات کے بعد نظام عالم کے لئے جو نائب ہوگا وہ خلیفۃ الرسول اور آپ کا نائب ہوگا، صحیح بخاری ومسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

كَانَتْ بَنُوْ إِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْأَنْبِيَآءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ وَإِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَسَيَكُوْنُ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُوْنَ۔[1]

"بنی اسرائیل کی سیاست وحکومت اُن کے انبیاء کرتے تھے، ایک نبی فوت ہوتا تو دُوسرا نبی آجاتا تھا، اور خبردار رہو کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، ہاں میرے خلیفہ ہوں گے اور بہت ہوں گے۔"

پانچویں خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ آپ کے بعد آپ کی اُمت کے مجموعے کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا جو انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے، یعنی اُمت کے مجموعے کو معصوم قرار دے دیا کہ آپ کی پوری اُمت کبھی بھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، یہ پوری اُمت جس مسئلہ پر اجماع واتفاق کرے وہ حکمِ خداوندی کا مظہر سمجھا جائے گا، اسی لئے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے بعد اسلام میں تیسری حجت اجماعِ اُمت قرار دی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لَنْ تَجْتَمِعَ أُمَّتِيْ عَلَى الضَّلَالَةِ۔[2] "میری اُمت کبھی گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی۔"

اس کی مزید تفصیل اُس حدیث[3] سے معلوم ہوجاتی ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ میری اُمت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، دُنیا کتنی ہی بدل جائے، حق کتنا ہی مضمحل ہوجائے، مگر ایک جماعت حق کی حمایت ہمیشہ کرتی رہے گی، اور انجامِ کار وہی غالب رہے گی۔

اس سے بھی واضح ہوگیا کہ پوری اُمت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، اور جبکہ اُمت کا مجموعہ معصوم قرار دیا گیا تو خلیفۂ رسول کا انتخاب بھی اُسی کے سپرد کردیا گیا، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نیابتِ زمین اور نظمِ حکومت کے

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الأنبياء، باب ما ذكر عن بني إسرائيل ج:۱ ص:۴۹۱ وصحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب وجوب الوفاء ببيعة الخلفاء الأوّل فالأوّل ج:۲ ص:۱۲۶

[2] سنن ابن ماجة، كتاب الفتن، باب السواد الأعظم ج:۲ ص:۲۸۳

[3] مشكوٰة، باب ثواب هذه الأمّة ج:۲ ص:۵۸۳

لئے انتخاب کا طریقہ مشروع ہوگیا، یہ اُمت جسے خلافت کے لئے منتخب کردے، وہ خلیفۂ رسول کی حیثیت سے نظامِ عالم کا واحد ذمہ دار ہوگا، اور خلیفہ سارے عالم کا ایک ہی ہوسکتا ہے۔

خلفائے راشدینؓ کے آخری عہد تک یہ سلسلۂ خلافت صحیح اُصول پر چلتا رہا، اور اسی لئے اُن کے فیصلے صرف دینی اور ہنگامی فیصلوں کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ایک محکم دستاویز اور ایک درجے میں اُمت کے لئے حجت مانے جاتے ہیں، کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا:-

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ۔[1]

''میری سنت کو لازم پکڑو اور خلفائے راشدین کی سنت کو۔''

خلافتِ راشدہ کے بعد

خلافتِ راشدہ کے بعد کچھ طوائف الملوکی کا آغاز ہوا، مختلف خطوں میں مختلف امیر بنائے گئے، ان میں سے کوئی بھی خلیفہ کہلانے کا مستحق نہیں، ہاں کسی ملک یا قوم کا اَمیرِ خاص کہا جاسکتا ہے۔

اور جب پوری دُنیا کے مسلمانوں کا اجتماع کسی ایک فرد پر متعذّر ہوگیا، اور ہر ملک، ہر قوم کا علیحدہ علیحدہ اَمیر بنانے کی رسم چل گئی تو مسلمانوں نے اس کا تقرّر اسی اِسلامی نظریہ کے تحت جاری رکھا کہ ملک کے مسلمانوں کی اکثریت جس کو اَمیر منتخب کرے وہ ہی اس ملک کا اَمیر اور اُولوالامر کہلائے، قرآن مجید کے ارشاد: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۸) کے عموم سے اس پر اِستدلال کیا جاسکتا ہے۔

مغربی جمہوریت اور اِسلامی شورائیت میں فرق

اسمبلیاں اسی طرزِ عمل کا ایک نمونہ ہیں، فرق اتنا ہے کہ عام جمہوری ملکوں کی اسمبلیاں اور ان کے ممبران بالکل آزاد و خودمختار ہیں، محض اپنی رائے سے جو چاہیں اچھا یا بُرا قانون بناسکتے ہیں، اسلامی اسمبلی اور اس کے ممبران اور منتخب کردہ اَمیر سب اس اُصول و قانون کے پابند ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اُن کو ملا ہے، اس اسمبلی یا مجلسِ شوریٰ کی ممبری کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں، اور جس شخص کو یہ منتخب کریں اس کے لئے بھی کچھ حدود و قیود ہیں، پھر اُن کی قانون سازی بھی قرآن و سنت کے بیان کردہ اُصول کے دائرے میں ہوسکتی ہے، اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کا ان کو اِختیار نہیں۔

[1] مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسُّنَّۃ ج:۱ ص:۲۹، ۳۰

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مخاطب کر کے جو اِرشاد فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، اس سے دستورِ مملکت کی چند اہم دفعات پر روشنی پڑتی ہے۔

آیتِ مذکورہ سے دستورِ مملکت کی چند اہم دفعات کا ثبوت

اوّل یہ کہ آسمان اور زمین میں اِقتدارِ اَعلیٰ اللہ جل مجدہٗ کا ہے۔ دُوسرے یہ کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی تنفیذ کے لئے اس کا نائب وخلیفہ اس کا رسول ہوتا ہے، اور ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہوگیا کہ خلافتِ اِلٰہیہ کا سلسلہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا، تو اَب خلافتِ رسول کا سلسلہ اُس کے قائم مقام ہوا، اور اس خلیفہ کا تقرّر ملت کے اِنتخاب سے قرار پایا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى

اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدے میں گر پڑے، مگر شیطان، اس نے نہ مانا

وَاسْتَكْبَرَ ڎ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور تکبر کیا، اور تھا وہ کافروں میں کا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ: آدم کو سجدہ کرو، چنانچہ سب نے سجدہ کیا، سوائے اِبلیس کے کہ اس نے انکار کیا، اور متکبرانہ رویہ اختیار کیا اور کافروں میں شامل ہوگیا ﴿۳۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جس وقت حکم دیا ہم نے سب فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی جیسا کہ بعض روایات میں حضرت ابنِ عباسؓ سے منقول ہے، غرض ان سب کو یہ حکم دیا گیا کہ) سجدے میں گر جاؤ آدم کے سامنے، سو سب سجدے میں گر پڑے بجز اِبلیس کے کہ اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آ گیا، اور ہوگیا کافروں میں سے۔

معارف ومسائل

ربطِ آیات

پچھلے واقعہ میں جب آدم علیہ السلام کی فضیلت فرشتوں پر ظاہر ہوچکی، اور دلائل سے یہ اَمر ثابت ہوگیا کہ صلاحیتِ خلافت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے وہ آدم علیہ السلام میں سب مجتمع ہیں، اور ملائکہ کو ان میں سے بعض علوم حاصل ہیں، اور جنوں کو تو بہت ہی کم حصہ ان علوم کا حاصل ہے، جیسا کہ اُوپر تفصیل کے ساتھ بیان کردیا ہے، اور اس حیثیتِ خاص سے ملائکہ وجن ہر دو گروہ کے علوم کے یہ جامع ہیں، اُن کا شرف ہر دو گروہ پر ظاہر ہوگیا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس مقدمہ کو معاملہ سے بھی ظاہر فرمادیا جاوے، اور ملائکہ اور جنوں سے ان کی کوئی خاص تعظیم کرائی جاوے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ اُن دونوں سے کامل اور مصداق ؎

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری [1]

کے ہیں، اور آدم علیہ السلام ان علومِ خاصہ میں ملائکہ اور جن ہر دو گروہ سے کامل اور دونوں کے علوم وقویٰ کو جامع ہیں، جیسا کہ مفصل طور پر مذکور ہوا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان غیر کاملوں سے اُس کامل کی کوئی ایسی تعظیم کرائی جاوے کہ عملاً بھی یہ اَمر ظاہر ہوجاوے کہ یہ اُن دونوں سے کامل اور جامع ہیں، جب تو یہ دونوں ان کی تعظیم کررہے ہیں، اور گویا بزبانِ حال کہہ رہے ہیں کہ جو اَوصاف ہم میں الگ الگ ہیں وہ ان کے اندر یکجا ہیں، اس لئے جو عملِ تعظیمی تجویز فرمایا گیا ہے اس کی حکایت ذِکر فرماتے ہیں کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں، سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر اِبلیس نے سجدے سے اِنکار کیا اور غرور میں آگیا۔

کیا سجدہ کا حکم جنات کو بھی تھا؟

اس آیت میں جو بات صراحۃً مذکور ہے وہ تو یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دِیا گیا، مگر آگے جب اِستثناء کرکے یہ بتلادیا گیا کہ سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر اِبلیس نے نہیں کیا تو اس سے ثابت ہوا کہ سجدۂ آدم کا حکم اُس وقت کی تمام ذَوی العقول مخلوقات کے لئے عام تھا، جن میں فرشتے اور جنات سب داخل ہیں، مگر حکم میں صرف فرشتوں کے ذِکر پر اس لئے اِکتفا کیا گیا کہ وہ سب سے افضل اور اَشرف تھے، جب آدم علیہ السلام کی تعظیم کا حکم ان کو دِیا گیا تو جنات کا بدرجۂ اَولیٰ اس حکم میں شامل ہونا معلوم ہوگیا۔

---

[1] ترجمہ:- جو خوبیاں ان سب (انبیاء) میں ہیں وہ تنہا آپ کی ذات میں موجود ہیں۔

سجدۂ تعظیمی پہلی اُمتوں میں جائز تھا، اِسلام میں ممنوع ہے

اس آیت میں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں، اور سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے والدین اور بھائیوں کا مصر پہنچنے کے بعد یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا مذکور ہے: وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا (یوسف:۱۰۰)

یہ تو ظاہر ہے کہ یہ سجدہ عبادت کے لئے نہیں ہوسکتا، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت شرک و کفر ہے، جس میں یہ اِحتمال ہی نہیں کہ کسی وقت کسی شریعت میں جائز ہو سکے، اس کے سوا کوئی اِحتمال نہیں کہ قدیم انبیاء کے زمانے میں سجدے کا بھی وہی درجہ ہوگا جو ہمارے زمانے میں سلام، مصافحہ، معانقہ اور دست بوسی یا تعظیم کے لئے کھڑے ہو جانے کا ہے۔

اِمام جصاصؒ نے ''اَحکام القرآن'' میں یہی فرمایا ہے کہ انبیائے سابقین کی شریعت میں بڑوں کی تعظیم اور تحیہ کے لئے سجدہ مباح تھا، شریعت محمدیہ میں منسوخ ہوگیا، اور بڑوں کی تعظیم کے لئے صرف سلام، مصافحہ کی اِجازت دی گئی، رُکوع، سجدہ اور بہ ہیئتِ نماز ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کو ناجائز قرار دیا گیا۔[1]

توضیح اس کی یہ ہے کہ اصل کفر و شرک اور غیر اللہ کی عبادت تو اُصولِ ایمان کے خلاف ہے، وہ کبھی کسی شریعت میں جائز نہیں ہو سکتے، لیکن کچھ افعال و اعمال ایسے ہیں جو اپنی ذات میں شرک و کفر نہیں، مگر لوگوں کی جہالت اور غفلت سے وہ اَفعال ذریعہ شرک و کفر کا بن سکتے ہیں، ایسے افعال کو اَنبیائے سابقین کی شریعتوں میں مطلقاً منع نہیں کیا گیا بلکہ ان کو ذریعۂ شرک بنانے سے روکا گیا، جیسے جانداروں کی تصویر بنانا اور اِستعمال کرنا اپنی ذات میں کفر و شرک نہیں، اس لئے پچھلی شریعتوں میں جائز تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں مذکور ہے:-

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ (سبا:۱۳)

''یعنی جنات اُن کے لئے بڑی محرابیں اور تصویریں بنایا کرتے تھے۔''

اِسی طرح سجدۂ تعظیمی پچھلی شریعتوں میں جائز تھا، لیکن آخرکار لوگوں کی جہالت سے یہی چیزیں شرک و بت پرستی کا ذریعہ بن گئیں، اور اسی راہ سے انبیاء علیہم السلام کے دِین و شریعت میں تحریف ہوگئی، اور پھر دُوسرے انبیاء اور دُوسری شریعتوں نے آکر اس کو مٹایا، شریعتِ محمدیہ چونکہ دائمی اور اَبدی شریعت ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوّت و رِسالت ختم اور آپ کی شریعت آخری شریعت ہے، اس لئے اس کو مسخ و تحریف سے بچانے کے لئے ہر ایسے سوراخ کو بند کر دیا گیا جہاں سے شرک و بت پرستی آسکتی تھی، اسی سلسلہ میں وہ تمام چیزیں اس شریعت میں حرام قرار دے دی گئیں جو کسی زمانے میں شرک و بت پرستی کا ذریعہ بنی تھیں۔

[1] احکام القرآن ج:۱ ص:۳۲

تصویر سازی اور اس کے استعمال کو اس وجہ سے حرام کیا گیا، سجدۂ تعظیمی اسی وجہ سے حرام ہوا، ایسے اوقات میں نماز پڑھنے کو حرام کر دیا گیا جن میں مشرکین اور کفار اپنے معبودوں کی عبادت کیا کرتے تھے، کہ یہ ظاہری مطابقت کسی وقت شرک کا ذریعہ نہ بن جائے۔

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آقاؤں کو یہ حکم دیا کہ اپنے غلام کو عبد یعنی اپنا بندہ کہہ کر نہ پکاریں، اور غلاموں کو یہ حکم دیا کہ وہ آقاؤں کو اپنا ربّ نہ کہیں[1]، حالانکہ لفظی معنی کے اعتبار سے بندہ کے معنی غلام کے اور ربّ کے معنی پالنے والے اور تربیت کرنے والے کے ہیں، ایسے الفاظ کا استعمال ممنوع نہ ہونا چاہئے تھا، مگر محض اس لئے کہ یہ الفاظ موہم شرک ہیں، کسی وقت جہالت سے یہی الفاظ آقاؤں کی پرستش کا دروازہ نہ کھول دیں، اس لئے ان الفاظ کے استعمال سے روک دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ اور یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین اور بھائیوں کا سجدہ جو قرآن میں مذکور ہے، یہ سجدۂ تعظیمی تھا، جو اُن کی شریعت میں سلام، مصافحہ اور دست بوسی کا درجہ رکھتا تھا، اور جائز تھا، شریعتِ محمدیہ کو کفر و شرک کے شائبہ سے بھی پاک رکھنا تھا، اس لئے اس شریعت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بقصدِ تعظیم بھی سجدہ یا رُکوع کرنا جائز نہیں رکھا گیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ نماز جو اَصل عبادت ہے، اس میں چار طرح کے افعال ہیں، کھڑا ہونا، بیٹھنا، رُکوع، سجدہ، ان میں سے پہلے دو یعنی کھڑا ہونا اور بیٹھنا تو ایسے کام ہیں جو عادۃً بھی اِنسان اپنی ضرورتوں کے لئے کرتا ہے اور عبادۃً بھی نماز میں کئے جاتے ہیں، مگر رُکوع اور سجدہ ایسے فعل ہیں جو اِنسان عادۃً نہیں کرتا، وہ عبادت ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لئے ان دونوں کو شریعتِ محمدیہ میں عبادت ہی کا حکم دے کر غیر اللہ کے لئے ممنوع کر دیا۔

اب یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ سجدۂ تعظیمی کا جواز تو قرآن کی مذکورہ آیات سے ثابت ہے، شریعتِ محمدیہ میں اس کا منسوخ ہونا کس دلیل سے ثابت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ متواترہ مشہورہ سے سجدۂ تعظیمی کا حرام ہونا ثابت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں غیر اللہ کے لئے سجدۂ تعظیمی کو جائز قرار دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ شوہر کو سجدہ کیا کرے[2]، (مگر اس شریعت میں سجدۂ تعظیم مطلقاً حرام ہے، اس لئے کسی کو کسی کے لئے جائز نہیں)۔

---

۱ صحیح مسلم، کتاب الألفاظ من الأدب وغيرها، باب حکم إطلاق لفظة العبد ...إلخ ج:۲ ص:۲۳۸

۲ مشکوٰۃ، کتاب النکاح، باب عشرۃ النساء ...إلخ ج:۲ ص:۲۸۲

یہ حدیث بیس صحابہ کرامؓ کی روایت سے ثابت ہے، اُصولِ حدیث کی معروف کتاب ''تدریب الراوی'' میں ہے کہ جس روایت کو دس صحابہ کرامؓ نقل فرمادیں تو وہ حدیث متواتر ہو جاتی ہے،[۱] جو قرآن کی طرح قطعی ہے، یہاں تو بیس صحابہ کرامؓ سے منقول ہے، یہ بیس صحابہؓ کی روایتیں حاشیہ ''بیان القرآن'' میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع فرمادی ہیں، ضرورت ہو تو وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔[۲]

اِبلیس کا کفر محض عملی نافرمانی کا نتیجہ نہیں

مسئلہ:- اِبلیس کا کفر محض عملی نافرمانی کا نتیجہ نہیں، کیونکہ کسی فرض کو عملاً ترک کردینا اُصولِ شریعت میں فسق و گناہ ہے، کفر نہیں۔ اِبلیس کے کفر کا اَصل سبب حکمِ ربانی سے معارضہ اور مقابلہ کرنا ہے کہ آپ نے جس کو سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کو سجدہ کروں، یہ معارضہ بلاشبہ کفر ہے۔

اِبلیس کو ''طاؤس الملائکہ'' کہا جاتا تھا

مسئلہ:- یہ بات قابلِ غور ہے کہ اِبلیس علم و معرفت میں یہ مقام رکھتا تھا کہ اس کو ''طاؤس الملائکہ'' کہا جاتا تھا، پھر اس سے یہ حرکت کیسے صادر ہوئی؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے تکبر کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنی دی ہوئی معرفت اور علم و فہم کی دولت سلب کرلی، اس لئے ایسی جہالت کا کام کر بیٹھا۔ بعض نے فرمایا کہ حبِ جاہ اور خود پسندی نے حقیقت شناسی کے باوجود اس بلا میں مبتلا کردیا۔ تفسیر ''رُوح المعانی'' میں اس جگہ ایک شعر نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض اوقات کسی گناہ کے وبال سے تائیدِ حق اِنسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، تو اس کی ہر کوشش اور عمل اس کو گمراہی کی طرف دھکیل دیتا ہے، شعر یہ ہے ؎

اِذَا لَمْ یَکُنْ عَوْنٌ مِّنَ اللّٰہِ لِلْفَتٰی
فَاَوَّلُ مَا یَجْنِیْ عَلَیْہِ اِجْتِہَادُہٗ[۳]

''رُوح المعانی'' میں اس سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اِنسان کا اِیمان وہی معتبر ہے جو آخرِ عمر اور اَوّلِ منازلِ آخرت تک ساتھ رہے، موجودہ اِیمان و عمل اور علم و معرفت پر غرہ نہ ہونا چاہئے۔ (رُوح)[۴]

---

[۱] تدریب الراوی، النوع الثلاثون ...إلخ ج:۲ ص:۷۵

[۲] تفصیل کے لئے دیکھئے: بیان القرآن تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۲۹، ۳۰

[۳] ترجمہ:- انسان کی جب اللہ کی طرف سے مدد نہ ہو تو اس کی کوشش ہی اسے گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔

[۴] رُوح المعانی ج:۱ ص:۲۳۱

وَقُلْنَا يَآٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪

اور ہم نے کہا: اے آدم! رہا کر تو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں جو چاہو، جہاں کہیں سے چاہو،

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا

اور پاس مت جانا اس درخت کے پھر تم ہوجاؤ گے ظالم۔ پھر ہلادیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ

پھر نکالا ان کو اس عزت وراحت سے کہ جس میں تھے، اور ہم نے کہا: تم سب اُترو، تم ایک دُوسرے کے دُشمن ہوگے

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اُٹھانا ایک وقت تک۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے کہا: ''آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو، اور اس میں سے جہاں سے چاہو جی بھر کے کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس بھی مت جانا، ورنہ تم ظالموں میں شمار ہوگے۔'' ﴿۳۵﴾ پھر ہوا یہ کہ شیطان نے ان دونوں کو وہاں سے ڈگمگادیا، اور جس (عیش) میں وہ تھے اس سے انہیں نکال کر رہا، اور ہم نے (آدم، ان کی بیوی اور ابلیس سے) کہا: ''اب تم سب یہاں سے اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے، اور تمہارے لئے ایک مدت تک زمین میں ٹھہرنا اور کسی قدر فائدہ اُٹھانا (طے کردیا گیا) ہے'' ﴿۳۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم! رہا کرو تم اور تمہاری بی بی (جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی مادّہ لے کر بنادیا تھا) بہشت میں پھر کھاؤ دونوں اس میں سے بافراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جائیو اس درخت کے ورنہ تم بھی انہی میں شمار ہوجاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھے ہیں (خدا جانے وہ کیا درخت تھا، مگر اس کے

کھانے سے منع فرمادیا، اور پھر آقا کو اختیار ہے کہ اپنے گھر کی چیزوں سے غلام کو جس چیز کے برتنے کی چاہے اجازت دیدے، اور جس چیز کو چاہے منع کردے) پس لغزش دے دی آدم وحواء کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے سو برطرف کر کے رہا ان کو اس عیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ نیچے اُترو، تم میں سے بعضے بعضوں کے دُشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک میعادِ معین تک (یعنی وہاں جا کر بھی دوام نہ ملے گا کچھ عرصے کے بعد وہ گھر بھی چھوڑنا پڑے گا)۔

معارف و مسائل

یہ آدم علیہ السلام کے قصہ کا تکملہ ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب آدم کی فضیلت اور خلافتِ ارضی کے لئے صلاحیت فرشتوں پر واضح کردی گئی، انہوں نے تسلیم کرلیا، اور ابلیس اپنے تکبر اور معارضہ کی وجہ سے کافر ہو کر نکال دیا گیا، تو آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ حواء کو یہ حکم ملا کہ تم دونوں جنت میں رہو، اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاؤ، مگر ایک معین درخت کے لئے یہ ہدایت کی کہ اس کے پاس نہ جانا، یعنی اس کے کھانے سے مکمل پرہیز کرنا۔ شیطان، جو آدم کی وجہ سے مردود ہوا وہ خار کھائے ہوئے تھا، اُس نے کسی طرح موقع پا کر اور مصلحتیں بتلا کر اُن دونوں کو اُس درخت کے کھانے پر آمادہ کردیا، اُن کی لغزش کی وجہ سے اُن کو بھی یہ حکم ملا کہ اب تم زمین پر جا کر رہو، اور یہ بھی بتلا دیا کہ زمین کی رہائش جنت کی طرح بے غل وغش نہ ہوگی، بلکہ وہاں آپس میں اختلافات اور دُشمنیاں بھی ہوں گی جس سے زندگی کا لطف پورا نہ رہے گا۔

وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ ''اور ہم نے کہا کہ اے آدم! ٹھہرو تم اور تمہاری زوجہ جنت میں'' یہ واقعہ حضرت آدم کی تخلیق اور ملائکہ کے سجدہ کے بعد کا ہے، بعض حضرات نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ تخلیق اور سجدہ کا واقعہ جنت سے باہر کہیں ہوا ہے، اس کے بعد جنت میں داخل کیا گیا، لیکن ان الفاظ میں یہ مفہوم یقینی نہیں، بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تخلیق بھی جنت میں ہوئی، اور سجدے کا واقعہ بھی جنت میں پیش آیا، مگر اس وقت تک اُن کو کوئی فیصلہ اس کے متعلق نہیں سنایا گیا تھا کہ آپ کا مسکن و مستقر کہاں ہوگا، اس واقعہ کے بعد یہ فیصلہ سنایا گیا۔

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ، رَغَدًا کے معنی عربی لغت میں اُس نعمت ورزق کے ہیں جس کے حاصل کرنے میں کوئی محنت ومشقت بھی نہ ہو، اور وہ اتنی کثیر اور وسیع ہو کہ اس کے کم یا ختم ہوجانے کا خطرہ نہ ہو، معنی یہ ہوئے کہ آدم وحوا علیہما السلام کو فرمایا کہ جنت کے پھل بافراغت استعمال کرتے رہو، نہ اُن کے حاصل کرنے میں تمہیں کسی محنت کی ضرورت ہوگی اور نہ یہ فکر کہ یہ غذا ختم یا کم ہوجائے گی۔

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ، کسی خاص درخت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ۔ اصل مقصد تو

یہ تھا کہ اس کا پھل نہ کھاؤ، مگر تاکید کے طور پر عنوان یہ اختیار کیا گیا کہ اس کے پاس بھی نہ جاؤ، اور مراد یہی ہے کہ کھانے کے لئے اس کے پاس نہ جاؤ۔ یہ درخت کونسا تھا، قرآنِ کریم نے متعین نہیں کیا، اور کسی مستند حدیث میں بھی اس کی تعیین مذکور نہیں، ائمہ تفسیر میں سے کسی نے گندم کا درخت قرار دیا، کسی نے انگور کا، کسی نے انجیر کا، مگر جس کو قرآن وحدیث نے مبہم چھوڑا ہے اس کو متعین کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ (قرطبی)[1]

فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ یعنی اگر آپ نے اس شجرِ ممنوعہ کو کھایا تو آپ ظالموں میں داخل ہو جائیں گے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا، "زَلَّـةٌ" کے معنی عربی لغت میں لغزش کے ہیں، "اِزْلَالٌ" کے معنی کسی کو لغزش دینا، معنی یہ ہیں کہ شیطان نے آدم وحوا کو لغزش دے دی، قرآن کے یہ الفاظ صاف اس کا اظہار کر رہے ہیں کہ حضرت آدم وحوا کی یہ خلاف ورزی اس طرح کی نہ تھی جو عام گناہگاروں کی طرف سے ہوا کرتی ہے، بلکہ شیطانی تلبیس سے کسی دھوکہ فریب میں مبتلا ہو کر ایسے اِقدام کی نوبت آ گئی کہ جس درخت کو ممنوع قرار دیا تھا اُس کا پھل وغیرہ کھا بیٹھے، عَنْهَا میں لفظ "عَنْ" بمعنی سبب ہے، یعنی اُس درخت کے سبب وذریعے سے شیطان نے آدم وحوا کو لغزش میں مبتلا کر دیا۔

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب شیطان کو سجدے سے انکار کی بنا پر پہلے ہی مردود کر کے جنت سے نکال دیا گیا تھا، تو یہ آدم وحوا کو بہکانے کے لئے جنت میں کیسے پہنچا؟ اس کا بے غبار جواب یہ ہے کہ شیطان کے بہکانے اور وہاں تک پہنچنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر ملاقات کے اُن کے دِل میں وسوسہ ڈالا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان جنات میں سے ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جنات کو بہت سے ایسے تصرفات پر قدرت دی ہے جو عام طور پر انسان نہیں کر سکتے، ان کو مختلف شکلوں میں متشکل ہو جانے کی بھی قدرت دی ہے، ہو سکتا ہے کہ اپنی قوتِ جنّیہ کے ذریعے مسمریزم کی صورت سے آدم وحوا کے ذہن کو متأثر کیا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دُوسری شکل میں مثلاً سانپ وغیرہ کی شکل میں متشکل ہو کر جنت میں داخل ہو گیا ہو، اور شاید یہی سبب ہوا کہ آدم علیہ السلام کو اس کی دُشمنی کی طرف دھیان نہ رہا، قرآن مجید کی آیت: وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ (الاعراف:۲۱) سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے صرف وسوسہ اور ذہنی اَثر ڈالنے سے کام نہیں لیا بلکہ آدم وحوا سے زبانی گفتگو کر کے اور قسمیں کھا کر متأثر کیا۔

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ یعنی شیطان نے اس دھوکہ اور لغزش کے ذریعہ آدم وحوا علیہما السلام کو ان نعمتوں سے نکال دیا جن میں وہ آرام سے گزر بسر کر رہے تھے، یہ نکالنا اگرچہ بحکمِ خداوندی ہوا، مگر سبب اس کا شیطان تھا، اس لئے نکالنے کی نسبت اُس کی طرف کر دی گئی۔

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ یعنی "ہم نے حکم دیا کہ نیچے اُتر جاؤ، اس طرح کہ تم میں بعضے بعضوں کے دُشمن

[1] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱ ص:۳۰۴، ۳۰۵

رہیں گے'' اس حکم کے مخاطب حضرت آدم وحوا ہیں، اور اگر شیطان کو اس وقت تک آسمانوں سے باہر نہیں کیا گیا تھا تو وہ بھی اسی خطاب میں شامل ہے، اس صورت میں باہم عداوت ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ شیطان کے ساتھ تمہاری عداوت کا سلسلہ دُنیا میں بھی جاری رہے گا، اور اگر بقولِ بعض اس واقعہ کے وقت سے پہلے ہی شیطان نکالا جاچکا تھا، تو پھر اس کلام کا رُخ آدم وحوا اور اُن کی اولاد کی طرف ہوگا، کہ ان کو بطورِ عتاب کے یہ جتلایا گیا کہ ایک سزا تو یہ ہے کہ جنت سے زمین پر اُتارا گیا، دُوسری سزا اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ کی اولاد کے درمیان باہم عداوتیں بھی ہوں گی، اور ظاہر ہے کہ اولاد کے باہم عداوت ہونے سے والدین کا لطفِ زندگی بھی رُخصت ہوجاتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی معنوی اور رُوحانی سزا ہوگی۔ (بیان القرآن) [1]

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٦﴾ یعنی آدم وحوا علیہما السلام کو یہ بھی اِرشاد ہوا کہ تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور ایک میعادِ معین تک کام چلانا ہے، یعنی زمین پر جاکر بھی دوام نہ ملے گا، کچھ مدّت کے بعد اس گھر کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔

آیاتِ مذکورہ سے متعلقہ مسائل واَحکامِ شرعیہ

اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ میں حضرت آدم وحوا علیہما السلام دونوں کے لئے جنت کو مسکن بنانے کا اِرشاد ہے، جس کو مختصر لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے: ''اُسْكُنَا الْجَنَّةَ'' یعنی آپ دونوں جنت میں میں رہیں، جیسا کہ اس کے بعد كُلَا اور لَا تَقْرَبَا میں دونوں کو ایک ہی صیغے میں جمع کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے خلاف اَنْتَ وَزَوْجُكَ کے الفاظ کو اِختیار کرنے میں مخاطب صرف حضرت آدم علیہ السلام کو قرار دِیا اور انہی سے فرمایا کہ آپ کی زوجہ بھی جنت میں رہے، اس میں دو مسئلوں کی طرف اِشارہ ہے:-

مسئلہ:- اوّل یہ کہ بیوی کے لئے رہائش کا اِنتظام شوہر کے ذمہ ہے، دُوسرے یہ کہ سکونت میں بیوی شوہر کے تابع ہے، جس مکان میں شوہر رہے اس میں اس کو رہنا چاہئے۔

مسئلہ:- لفظ اُسْكُنْ میں اس طرف بھی اِشارہ ہے کہ اس وقت ان دونوں حضرات کے لئے جنت کا قیام محض عارضی تھا، دائمی قیام جو شانِ ملکیت کی ہوتی ہے وہ نہ تھی، کیونکہ لفظ اُسْكُنْ کے معنی یہ ہیں کہ اس مکان میں رہا کرو، یہ نہیں فرمایا کہ یہ مکان تمہیں دے دیا گیا، یہ تمہارا مکان ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ آئندہ ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آدم وحوا علیہما السلام کو جنت کا مکان چھوڑنا پڑے گا، نیز جنت کا اِستحقاقِ ملکیت اِیمان اور عملِ صالح کرکے معاوضہ میں حاصل ہوتا ہے، جو قیامت کے بعد ہوگا، اسی سے حضراتِ فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کہے

[1] تفسیر بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۱ ص:۲۹

کہ ''میرے گھر میں رہا کرو''، یا یہ کہ ''میرا گھر تمہارا مسکن ہے'' اس سے مکان کی ملکیت اور دائمی اِستحقاق اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔ (قرطبی) [1]

غذا وخوراک میں بیوی شوہر کے تابع نہیں

وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا یعنی ''کھاؤ تم دونوں جنت سے بافراغت'' اس میں بطرز مذکور سابق خطاب صرف آدم علیہ السلام کو نہیں کیا گیا بلکہ دونوں کو ایک ہی لفظ میں شریک کر کے وَكُلَا مِنْهَا فرمایا، اس میں اِشارہ اس کی طرف ہوسکتا ہے کہ غذا اور خوراک میں بیوی شوہر کے تابع نہیں، وہ اپنی ضرورت وخواہش کے وقت اپنی مرضی کے مطابق اِستعمال کرے، اور یہ اپنی خواہش کے مطابق۔

ہر جگہ چلنے پھرنے کی آزادی اِنسان کا فطری حق ہے

رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ، لفظ رَغَدًا ماکولات میں وسعت وکثرت کی طرف اِشارہ ہے کہ جو چیز جتنی چاہیں کھا سکتے ہیں، بجز ایک درخت کے اور کسی چیز میں رُکاوٹ اور ممانعت نہیں، اور لفظ شِئْتُمَا میں مقامات کی وسعت کا بیان ہے کہ پوری جنت میں جہاں چاہیں جس طرح چاہیں کھائیں، کوئی خطہ ممنوع نہیں، اس مین اِشارہ ہے کہ چلنے پھرنے اور مختلف مقامات سے اپنی ضروریات حاصل کرنے کی آزادی اِنسان کا فطری حق ہے، ایک محدود ومعین مقام یا مکان میں اگرچہ ضرورت وخواہش کی ساری چیزیں مہیا کردی جائیں، مگر وہاں سے باہر جانا ممنوع ہو تو یہ بھی ایک قسم کی قید ہے اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کو کھانے پینے کی تمام چیزیں بکثرت وفراغت عطا کردینے پر اِکتفا نہیں کیا گیا بلکہ حَيْثُ شِئْتُمَا فرما کر ان کو چلنے پھرنے اور ہر جگہ جانے کی آزادی بھی دی گئی۔

سدِّ ذرائع کا مسئلہ

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ یعنی ''اس درخت کے قریب بھی نہ جاؤ۔'' ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس درخت یا اس کے پھل کو نہ کھاؤ، مگر اِحتیاطی حکم یہ دیا گیا کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ، اس سے اُصولِ فقہ کا مسئلہ سدِ ذرائع ثابت ہوا، یعنی بعض چیزیں اپنی ذات میں ناجائز یا ممنوع نہیں ہوتیں، لیکن جب یہ خطرہ ہو کہ ان چیزوں کے اِختیار کرنے سے کسی حرام ناجائز کام میں مبتلا ہوجائے گا تو اس جائز چیز کو بھی روک دیا جاتا ہے، جیسے درخت کے قریب جانا ذریعہ بن سکتا تھا اس کے پھل پھول کھانے کا، اُس ذریعے کو بھی منع فرمادیا گیا، اسی کا نام اُصولِ فقہ کی اِصطلاح میں ''سدِ ذرائع'' ہے۔

---

[1] تفسير القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۲۹۹

مسئلہ عصمتِ انبیاء

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کسی خاص درخت کے کھانے سے منع فرمایا گیا تھا، اور اس پر بھی متنبہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دُشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے، اس کے باوجود آدم علیہ السلام نے اُس درخت سے کھالیا جو بظاہر گناہ ہے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہورِ اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیرہ گناہ اُن سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، جمہورِ اُمت کے نزدیک صحیح نہیں۔ (قرطبی) [۱]

وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہِ کبیرہ ہو یا صغیرہ صادر ہو سکے تو انبیاء کے اقوال و افعال سے امن اُٹھ جائے گا، اور وہ قابلِ اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاء ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کا کہاں ٹھکانا ہے۔

البتہ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات میں متعدّد انبیاء کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر عتاب بھی ہوا، حضرت آدم علیہ السلام کا یہ قصہ بھی اسی میں داخل ہے۔

ایسے واقعات کا حاصل باتفاقِ اُمت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی یا خطا و نسیان کی وجہ سے اس کا صدور ہو جاتا ہے، کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا، غلطی اجتہادی ہوتی ہے، یا خطا و نسیان کے سبب، قابلِ معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاحِ شرع میں گناہ نہیں کہا جا سکتا، اور یہ سہو و نسیان کی غلطی اُن سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور تشریع سے ہو، بلکہ اُن سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا سہو و نسیان ہو سکتا ہے۔ (تفسیر بحرالمحیط) [۲]

مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے، اور بڑوں سے چھوٹی سی غلطی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے، اس لئے قرآنِ حکیم میں ایسے واقعات کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ گناہ ہی نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے اس واقعے کے متعلق علمائے تفسیر نے بہت سی توجیہات لکھی ہیں، ان میں چند یہ ہیں:-

اوّل یہ کہ جس وقت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، تو ایک خاص درخت کی طرف اشارہ کر کے منع کیا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اور مراد خاص یہی درخت نہیں تھا، بلکہ اس کی جنس کے سارے درخت مراد تھے، جیسے حدیث میں ہے کہ

[۱] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۳۰۷ تا ۳۰۹

[۲] تفسیر البحر المحیط باختصار تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۲۰۳، ۲۰۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ریشمی کپڑا اور ایک ٹکڑا سونے کا ہاتھ میں لے کر اِرشاد فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں میری اُمت کے مردوں پر حرام ہیں[1]۔ ظاہر ہے کہ حرمت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں تھے۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو یہ خیال ہوگیا کہ جس درخت کی طرف اِشارہ کر کے منع کیا گیا تھا ممانعت اسی کے ساتھ خاص ہے، شیطان نے یہی وسوسہ اُن کے دِل میں مزین اور مستحکم کر دیا، اور قسمیں کھا کر یہ باور کرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، تمہیں کسی ایسے کام کا مشورہ نہیں دے رہا جو تمہارے لئے ممنوع یا مضر ہو، جس درخت کی ممانعت کی گئی ہے وہ دُوسرا ہے، اس درخت کی ممانعت نہیں ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان نے یہ وسوسہ دِل میں ڈالا ہو کہ اس درخت کی ممانعت صرف آپ کی اِبتدائے پیدائش کے وقت کے ساتھ مخصوص تھی، جیسے چھوٹے بچوں کو اوّلِ عمر میں قوی غذا سے روکا جاتا ہے، ہلکی غذا دی جاتی ہے، اور قوت پیدا ہو جانے کے بعد ہر غذا کی اِجازت ہو جاتی ہے، تو اَب آپ قوی ہو چکے ہیں، اس لئے وہ ممانعت باقی نہیں رہی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت شیطان نے اس درخت کے کھانے کے منافع بتلائے کہ اس کے کھانے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت کی نعمتوں میں رہنے کا اِطمینان ہو جائے گا، اُس وقت اُن کو وہ ممانعت یاد نہ رہی ہو جو اِبتدائے آفرینش کے وقت اس درخت کے متعلق کی گئی تھی، قرآن مجید کی آیت: فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿١١٥﴾ (طٰہٰ:۱۱۵) یعنی ''آدم علیہ السلام بھول گئے اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی۔'' یہ اسی اِحتمال کی تائید کرتی ہے۔

بہرحال اس طرح کے متعدّد اِحتمالات ہو سکتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ جان بوجھ کر نافرمانی کا صدور حضرت آدم علیہ السلام سے نہیں ہوا، بھول ہوگئی، یا اِجتہادی لغزش جو درحقیقت گناہ نہیں۔ مگر آدم علیہ السلام کی شانِ نبوّت اور قربِ خداوندی کے مقامِ عالی کے اِعتبار سے یہ لغزش بھی بڑی سمجھی گئی، اور قرآن میں اس کو معصیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا، اور آدم علیہ السلام کی توبہ واستغفار کے بعد معاف کرنے کا ذِکر فرمایا گیا۔

اور یہ بحث فضول ہے کہ جب شیطان کو جنت سے مردود کر کے نکال دیا گیا تھا تو پھر وہ آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے وہاں کس طرح پہنچا؟ کیونکہ شیطان کے بہکانے اور وسوسہ ڈالنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جنت میں داخل ہو کر ہی وسوسہ ڈالے، جنات وشیاطین کو حق تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ دُور سے بھی دِل میں وسوسہ ڈال سکتے ہیں۔ اور اگر داخل ہو کر بالمشافہ گفتگو ہی کو تسلیم کیا جائے تو اس کے بھی مختلف اِحتمالات ہو سکتے ہیں جس کی تحقیق میں پڑنا بے فائدہ اور لایعنی بحث ہے۔

اسی طرح یہ سوال کہ آدم وحوا علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا: اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ

[1] سنن ابن ماجة، كتاب اللباس، باب لبس الحرير والذهب ... إلخ ج:۲ ص:۲۵٦، ۲۵۷

مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ (الاعراف) کہ "شیطان تمہارا دشمن ہے" ایسا نہ ہو کہ یہ کوئی ایسا کام کرادے جس کی وجہ سے تمہیں جنت سے نکلنا پڑے، پھر حضرت آدم علیہ السلام اس کے دھوکہ میں کس طرح آگئے؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات وشیاطین کو مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائی ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی صورت میں سامنے آیا ہو جس کی وجہ سے آدم علیہ السلام یہ نہ پہچان سکے کہ یہ شیطان ہے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۗ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے ربّ سے چند باتیں پھر متوجہ ہوگیا اللہ اس پر بے شک وہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ

ہم نے حکم دیا نیچے جاؤ یہاں سے تم سب، پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو چلا میری ہدایت پر

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ

نہ خوف ہوگا اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع

وہ ہیں دوزخ میں جانے والے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) کچھ الفاظ سیکھ لئے (جن کے ذریعے انہوں نے توبہ مانگی) چنانچہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کرلی۔ بیشک وہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے ﴿۳۷﴾ ہم نے کہا: "اب تم سب یہاں سے اُتر جاؤ۔ پھر اگر میری طرف سے کوئی ہدایت تمہیں پہنچے، تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کو نہ کوئی خوف ہوگا، اور نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوں گے۔ ﴿۳۸﴾ اور جو لوگ کفر کا ارتکاب کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" ﴿۳۹﴾

خلاصۂ تفسیر

بعد ازاں حاصل کرلئے آدم علیہ السلام نے اپنے رَبّ سے چند اَلفاظ (یعنی معذرت کے کلمات کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل ہوئے تھے، حضرت آدم علیہ السلام کی ندامت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی اور خود ہی معذرت کے الفاظ تلقین فرمادیئے) تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی اُن پر (یعنی توبہ قبول کرلی) بے شک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان (اور حضرت حوا کی توبہ کا بیان سورۂ اَعراف میں ہے: قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا، جس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی توبہ اور قبولِ توبہ میں آدم علیہ السلام کے ساتھ شریک رہیں، مگر معاف فرمانے کے بعد بھی زمین پر جانے کے حکم کو منسوخ نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر تھیں، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم زمین پر اُترنے کا حاکمانہ طور پر بطرزِ سزا تھا، اب یہ حکم حکیمانہ انداز سے اس طرح ارشاد ہوا: قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا الآیہ، یعنی) ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب، پھر اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت (یعنی اَحکامِ شرعیہ بذریعہ وحی) سو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے (یعنی اُن پر کوئی خوفناک واقعہ نہ پڑے گا، اور قیامت کے ہولناک واقعات سے اُن کا بھی خوف زدہ ہونا اس کے منافی نہیں، جیسا کہ احادیثِ صحیحہ میں سب پر ہول اور خوف کا عام ہونا معلوم ہوتا ہے، "حزن" وہ کیفیت ہے جو کسی مضرّت ومصیبت کے واقع ہوجانے کے بعد قلب میں پیدا ہوتی ہے، اور خوف ہمیشہ قبلِ وقوع ہوا کرتا ہے، یہاں حق تعالیٰ نے حزن وغم دونوں کی نفی فرمادی، کیونکہ اُن پر کوئی آفت وکلفت واقع نہ ہوگی جس سے حزن یا خوف ہو، آگے ان لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو اس ہدایت کی پیروی نہ کریں، فرمایا:) اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے اَحکام کی، یہ لوگ ہوں گے دوزخ والے، وہ اس میں ہمیشہ کو رہیں گے۔

معارف ومسائل

ربطِ آیات

پچھلی آیات میں شیطانی وسوسہ اور حضرت آدم کی لغزش اور اس کے نتیجہ میں جنت سے نکلنے اور زمین پر اُترنے کا حکم مذکور تھا، حضرت آدم علیہ السلام نے ایسے خطاب وعتاب کہاں سنے تھے، نہ ایسے سنگدل تھے کہ اس کی سہار کر جاتے، بے چین ہوگئے، اور فوراً ہی معافی کی اِلتجا کرنے لگے، مگر پیغمبرانہ معرفت اور اس کی وجہ سے اِنتہائی ہیبت سے کوئی بات زبان سے نہ نکلتی تھی، یا اس خوف سے کہ معافی کی اِلتجا کہیں خلافِ شان ہوکر مزید عتاب کا سبب نہ بن جائے، زبان

خاموش تھی، اللہ ربّ العزّت دِلوں کی بات سے واقف اور رحیم و کریم ہیں، یہ حالت دیکھ کر خود ہی معافی کے لئے کچھ کلمات ان کو سکھا دیئے، اس کا بیان ان آیات میں ہے کہ: ''آدم علیہ السلام نے حاصل کرلئے اپنے رَبّ سے چند اَلفاظ، تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی (یعنی اُن کی توبہ قبول کرلی) بے شک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے مہربان۔'' مگر چونکہ رُوئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر تھیں، مثلاً ان کی نسل سے فرشتوں اور جنات کے درمیان ایک نئی نوعِ اِنسان کا وجود میں آنا، اور ان کو ایک طرح کا اِختیار دے کر اَحکامِ شرعیہ کا مکلّف بنانا، پھر ان میں خلافتِ الٰہیہ قائم کرنا، حدود اور اَحکامِ شرعیہ نافذ کرنا، تاکہ یہ نئی مخلوق ترقی کر کے اس مقام پر پہنچ سکے جو بہت سے فرشتوں کو بھی نصیب نہیں، اور ان مقاصد کا ذِکر تخلیقِ آدم علیہ السلام سے پہلے یہ کردیا گیا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (البقرۃ:۳۰)

اس لئے خطا معاف کرنے کے بعد بھی زمین پر اُترنے کا حکم منسوخ نہیں فرمایا، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم حاکمانہ اور زمین پر اُترنا بطورِ سزا کے تھا، اب یہ اِرشاد حکیمانہ اور زمین پر آنا خلافتِ الٰہیہ کے اعزاز کے ساتھ ہوا، اس لئے بعد کی آیات میں اُن فرائضِ منصبی کا بیان ہے جو ایک خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اُن پر عائد کئے گئے تھے، اسی لئے زمین پر اُترنے کے حکم کو پھر مکرّر بیان کر کے فرمایا کہ: ''ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت، (یعنی اَحکامِ شرعیہ بذریعہ وحی کے) تو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی، تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔'' یعنی نہ کسی گزشتہ چیز کے فوت ہونے کا غم ہوگا، نہ آئندہ کسی تکلیف کا خطرہ۔

تَلَقّٰی، تلقی کے معنی ہیں شوق اور رغبت کے ساتھ کسی کا اِستقبال کرنا، اور اس کو قبول کرنا (رُوح، کشاف)[1]، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب اُن کو توبہ کے کلمات کی تلقین کی گئی تو آدم علیہ السلام نے اِہتمام کے ساتھ اُن کو قبول کیا۔

کَلِمٰتٍ، وہ کلمات جو حضرت آدم علیہ السلام کو بغرضِ توبہ بتلائے گئے کیا تھے، اس میں مفسرین صحابہؓ سے کئی روایات منقول ہیں، مشہور قول حضرت ابنِ عباسؓ کا ہے کہ وہ کلمات وہی ہیں جو قرآن مجید میں دُوسری جگہ منقول ہیں یعنی: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ (الاعراف)

تَابَ، توبہ کے اَصل معنی رُجوع کرنے کے ہیں، اور جب توبہ کی نسبت بندے کی طرف کی جاتی ہے تو اس کے معنی تین چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، اوّل اپنے کئے ہوئے گناہ کو گناہ سمجھنا اور اس پر نادم و شرمندہ ہونا، دُوسرے اس گناہ کو بالکل چھوڑ دینا، تیسرے آئندہ کے لئے دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم و اِرادہ کرنا۔ اگر ان تین چیزوں میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی

[1] رُوح المعانی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۲۸۱، وکشاف تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۸۳

تو وہ توبہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ محض زبان سے "اللہ توبہ" کے الفاظ بول دینا نجات کے لئے کافی نہیں، جب تک یہ تینوں چیزیں جمع نہ ہوں، یعنی گزشتہ پر ندامت اور حال میں اُس کا ترک، اور مستقبل میں اس کے نہ کرنے کا عزم و ارادہ۔ تَابَ عَلَيْهِ یہاں توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس کے معنی توبہ قبول کرنا۔ بعض سلف سے پوچھا گیا کہ جس شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے وہ کیا کرے؟ تو فرمایا: وہی کام کرے جو اس کے پہلے والدین آدم و حوا علیہما السلام نے کیا کہ اپنے کئے پر ندامت، اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کے لئے عرض کیا: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنْفُسَنَا (یعنی ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کرلیا ہے، اگر آپ معاف نہ کریں اور ہم پر رحم نہ کریں تو ہم سخت خسارے والوں میں داخل ہو جائیں گے)۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي (القصص:۱۶) یعنی "اے میرے پالنے والے! میں نے اپنی جان پر ظلم کرلیا ہے، تو آپ ہی میری مغفرت فرمایئے۔" اور حضرت یونس علیہ السلام سے جب لغزش ہوگئی تو عرض کیا: لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحٰنَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ (الانبیآء) یعنی "اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں، آپ ہر برائی سے پاک ہیں، میں ظلم کرنے والوں میں داخل ہو گیا ہوں" مطلب یہ ہے کہ مجھ پر رحم فرمایئے۔ (قرطبی) [1]

فائدہ:- حضرت آدم و حوا سے جو اجتہادی لغزش یا بھول صادر ہوئی ہے، اوّلاً تو قرآنِ کریم نے دونوں ہی کی طرف اس کی نسبت کی ہے: فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا، اور زمین پر اُترنے کے حکم میں بھی حضرت حوا کو شریک کرکے لفظ: اِهْبِطُوْا فرمایا ہے، مگر بعد میں توبہ اور قبولِ توبہ میں بہ لفظِ مفرد صرف آدم علیہ السلام کا ذِکر ہے، حضرت حوا کا نہیں، اس مقام کے علاوہ بھی اس لغزش کا ذِکر صرف آدم علیہ السلام کی طرف کرکے کیا گیا ہے: عَصٰٓى اٰدَمُ (طٰہٰ:۱۲۱) وغیرہ۔

ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ رعایت ہو کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مستور رکھا ہے، اس لئے بطور پردہ پوشی کے گناہ اور عتاب کے ذِکر میں اس کا ذِکر صراحۃً نہیں فرمایا، اور ایک جگہ: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنْفُسَنَا (الاعراف:۲۳) میں دونوں کی توبہ کا ذِکر کر بھی دیا گیا، تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ رہے کہ حضرت حوا کا قصور معاف نہیں ہوا، اس کے علاوہ عورت چونکہ اکثر احوال میں مرد کے تابع ہے، اس لئے اس کے مستقل ذِکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ (قرطبی) [2]

تَوَّابُ اور تَائِب میں فرق

اِمام قرطبیؒ نے فرمایا کہ لفظِ تَوَّابُ بندہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسے: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (البقرۃ:۲۲۲) اور اللہ تعالیٰ کے لئے بھی جیسے اس آیت میں: هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾۔ جب بندے کے لئے اِستعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۳۲۴

[2] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۳۲۵

ہیں گناہ سے اطاعت کی طرف رُجوع کرنے والا، اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے اِستعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں توبہ قبول کرنے والا، یہ صرف لفظ "تَوَّابٌ" کا حکم ہے، اسی معنی کا دُوسرا لفظ "تَـائِبٌ" ہے، اس کا اِستعمال اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں، اگرچہ لغوی معنی کے اِعتبار سے وہ بھی غلط نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی شان میں صرف وہی صفات اور اَلقاب اِستعمال کرنا جائز ہے جن کا ذِکر قرآن وسنت میں وارِد ہے، باقی دُوسرے الفاظ اگرچہ معنی کے اِعتبار سے صحیح ہوں، مگر اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا اِستعمال دُرست نہیں۔

گناہ سے توبہ قبول کرنے کا اِختیار خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ قبول کرنے اور گناہ معاف کرنے کا اِختیار سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں، یہود و نصاریٰ اس قاعدہ سے غفلت کی بنا پر سخت فتنے میں مبتلا ہوگئے، کہ پادریوں اور پیروں کے پاس جاتے، اور اُن کو کچھ ہدیہ دے کر اپنے گناہ معاف کرا لیتے، اور سمجھتے تھے کہ انہوں نے معاف کر دیا تو اللہ کے نزدیک بھی معاف ہوگیا۔ آج بھی بہت سے ناواقف مسلمان اس طرح کے غلط اور خام عقیدے رکھتے ہیں، جو سراسر غلط ہیں، کوئی عالم یا مرشد کسی کے گناہ کو معاف نہیں کر سکتا، زیادہ سے زیادہ دُعا کر سکتا ہے۔

آدم علیہ السلام کا زمین پر اُترنا سزا کے طور پر نہیں بلکہ ایک مقصد کی تکمیل کے لئے تھا

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ، جنت سے زمین پر اُترنے کا حکم اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے، اس جگہ پھر اس کو مکرّر لانے میں غالباً حکمت یہ ہے کہ پہلی آیت میں زمین پر اُتارنے کا ذِکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا، اسی لئے اس کے ساتھ انسانوں کی باہمی عداوت کا بھی ذِکر کیا گیا، اور یہاں زمین پر اُتارنے کا ذِکر ایک خاص مقصد خلافتِ اِلٰہیہ کی تکمیل کے لئے اِعزاز کے ساتھ ہے، اسی لئے اس کے ساتھ ہدایت بھیجنے کا ذِکر ہے جو خلافتِ اِلٰہیہ کے فرائضِ منصبی میں سے ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگرچہ زمین پر اُترنے کا اِبتدائی حکم بطور عتاب اور سزا کے تھا، مگر بعد میں جب خطا معاف کر دی گئی تو دُوسرے مصالح اور حکمتوں کے پیشِ نظر زمین پر بھیجنے کے حکم کو اس کی حیثیت بدل کر برقرار رکھا گیا، اور اَب ان کا نزول زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا، اور یہ وہی حکمت ہے جس کا ذِکر تخلیقِ آدم کے وقت ہی فرشتوں سے کیا جا چکا تھا کہ زمین کے لئے اُن کو خلیفہ بنانا ہے۔

رنج وغم سے نجات صرف اُن لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے فرمانبردار ہیں

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ اس آیت میں آسمانی ہدایات کی پیروی کرنے والوں کے

لئے دو اِنعام مذکور ہیں، ایک یہ کہ اُن پر کوئی خوف نہ ہوگا، دُوسرے وہ غمگین نہ ہوں گے۔

خَوف: آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف ومصیبت کے اندیشے کا نام ہے، اور حُزن: کسی مقصد ومراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش وراحت کی تمام اَنواع واَقسام کا ان دو لفظوں میں ایسا اِحاطہ کر دیا گیا ہے کہ آرام وآسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس سے باہر نہیں، پھر ان دونوں لفظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ "خوف" کی نفی تو عام انداز میں کر دی گئی، مگر "حزن" کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ "لَا حُزْنَ عَلَيْهِمْ" بلکہ بصیغۂ فعل لایا گیا، اور اُس کی ضمیر فاعل کو مقدم کر کے وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ فرمایا گیا، اس میں اِشارہ اس طرف ہے کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایات کی مکمل پیروی کرنے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا، خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو یا دُنیا کا بڑے سے بڑا مال دار، کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

دریں دُنیا کسے بے غم نباشد
وگر باشد بنی آدم نباشد [1]

بخلاف اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور اِرادے کو اللہ ربّ العزّت کی مرضی اور اِرادے میں فنا کر دیتے ہیں، اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، قرآن مجید میں دُوسری جگہ بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے کہ خاص اہلِ جنت ہی کا یہ حال ہوگا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا اس پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دُور کر دیا گیا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (فاطر: ۳۴) اس سے معلوم ہوا کہ اس دُنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، بجز اس شخص کے جس نے اپنا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ مکمل اور مضبوط کر لیا ہو، خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

جو بچنا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف وغم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دُنیا کی کسی تکلیف یا کسی خواہش ومراد پر اُن کو خوف وغم نہ ہوگا، آخرت کی فکر وغم اور اللہ جل شانہٗ کی ہیبت وجلال تو اُن پر اور سب سے زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر وغم کسی

[1] ترجمہ:- اس دُنیا میں کوئی بھی بے غم نہیں ہے، اگر کوئی بے غم ہے تو وہ آدم کی اولاد میں سے نہیں ہے۔

دُنیوی نعمت کے فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہٗ کی ہیبت وجلال سے اور اُمت کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دُنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء واولیاء کو بشری طور پر طبعی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاٹھی کا سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے: فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی ﴿۶۷﴾ (طٰہٰ) کیونکہ یہ فطری اور طبعی خوف ابتدائے حال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَاتَخَفْ تو یہ ڈر بالکل نکل گیا۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام اِنسانوں کی طرح اس بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اِسرائیل اس سے کہیں گمراہی میں نہ پڑ جائیں، تو یہ خوف ایک قسم کا اُخروی خوف تھا۔

آخری آیت وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے یہ بتلادیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے اُن کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے اِنکار کردیں، یعنی کفار، اور مؤمنین جو ہدایت کو ہدایت ماننے کا اِقرار کرتے ہیں، وہ عملاً کیسے بھی گناہگار ہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے، واللہ اعلم۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَوْفُوْا بِعَھْدِیْٓ

اے بنی اِسرائیل! یاد کرو میرے وہ اِحسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پورا کرو میرا اِقرار

اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ ۚ وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا

تو میں پورا کروں تمہارا اِقرار، اور مجھ ہی سے ڈرو۔ اور مان لو اس کتاب کو جو میں نے اُتاری ہے سچ بتلانے والی ہے

لِّمَا مَعَکُمْ وَلَا تَکُوْنُوْٓا اَوَّلَ کَافِرٍۢ بِہٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ز

اُس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے، اور مت ہو سب میں اوّل منکر اس کے، اور نہ لو میری آیتوں پر مول تھوڑا

وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ

اور مجھ ہی سے بچتے رہو۔ اور مت ملاؤ صحیح میں غلط اور مت چھپاؤ سچ کو

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

جان بوجھ کر۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی، اور تم مجھ سے کیا ہوا عہد پورا کرو، تا کہ میں بھی تم سے کیا ہوا عہد پورا کروں، اور تم (کسی اور سے نہیں، بلکہ) صرف مجھی سے ڈرو ﴿۴۰﴾ اور جو کلام میں نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ، جبکہ وہ اُس کتاب (یعنی تورات) کی تصدیق بھی کر رہا ہے جو تمہارے پاس ہے، اور تم ہی سب سے پہلے اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ اور میری آیتوں کو معمولی سی قیمت لے کر نہ بیچو، اور (کسی اور کے بجائے) صرف میرا خوف دِل میں رکھو ﴿۴۱﴾ اور حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ نہ کرو، اور نہ حق بات کو چھپاؤ جبکہ (اصل حقیقت) تم اچھی طرح جانتے ہو ﴿۴۲﴾

خلاصۂ تفسیر

اے بنی اِسرائیل! (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد) یاد کرو تم لوگ میرے اُن اِحسانوں کو جو کئے ہیں میں نے تم پر (تا کہ حقِ نعمت سمجھ کر ایمان لانا تمہارے لئے آسان ہو جائے، آگے اس یاد کرنے کی مراد بتلاتے ہیں) اور پورا کرو تم میرے عہد کو (یعنی تم نے جو توریت میں مجھ سے عہد کیا تھا جس کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے: وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ۭ (الآیہ) (المائدۃ:۱۲)) پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو (یعنی میں نے جو عہد تم سے کیا تھا اِیمان لانے پر جیسا کہ آیتِ مذکورہ میں ہے: لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ) اور صرف مجھ ہی سے ڈرو (اپنے عوام معتقدین سے نہ ڈرو کہ ان کا اِعتقاد نہ رہے گا اور ان سے آمدنی بند ہو جاوے گی) اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے، (یعنی توراۃ کے کتابِ اِلٰہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے، اور جو اس میں تحریفات کی گئی ہیں وہ خود توراۃ واِنجیل ہونے ہی سے خارج ہیں، ان کی تصدیق اس سے لازم نہیں آتی) اور مت بنو تم پہلے اِنکار کرنے والے اس قرآن کے (یعنی تمہیں دیکھ

کر جو دُوسرے لوگ اِنکار کریں گے اُن سب میں اوّل بانی اِنکار و کفر کے تم ہو گے اس لئے قیامت تک اُن کے کفر و انکار کا وَبال تمہارے نامۂ اَعمال میں ہی درج ہوتا رہے گا) اور مت لو بمقابلہ میرے اَحکام کے معاوضہ حقیر اور خاص مجھ ہی سے پورے طور پر ڈَرو (یعنی میرے اَحکام چھوڑ کر یا اُن کو بدل کر یا چھپا کر عوام الناس سے دُنیائے ذلیل و قلیل کو وصول مت کرو، جیسا کہ اُن کی عادت تھی جس کی تصریح آگے آتی ہے: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ) اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت کرو حق کو جس حالت میں کہ تم جانتے بھی ہو (کہ حق کو چھپانا بری بات ہے)۔

معارف و مسائل

ربطِ آیات

سورۂ بقرہ قرآن کے ذِکر سے شروع کی گئی، اور یہ بتلایا گیا کہ قرآن کی ہدایت اگرچہ ساری مخلوق کے لئے عام ہے مگر اس سے نفع صرف مؤمنین اُٹھائیں گے، اس کے بعد اُن لوگوں کے عذابِ شدید کا ذِکر فرمایا جو اس پر ایمان نہیں لائے، ان میں ایک طبقہ کھلے کافروں اور منکروں کا تھا، دُوسرا منافقین کا، دونوں کا مع ان کے کچھ حالات اور غلط کاریوں کے ذِکر کیا گیا، اس کے بعد مؤمنین، مشرکین، منافقین کے تینوں طبقوں کو خطاب کر کے سب کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تاکید کی گئی، اور قرآن مجید کے اِعجاز کا ذِکر کر کے سب کو دعوتِ ایمان دی گئی، پھر تخلیقِ آدم علیہ السلام کا ذِکر کر کے ان پر ان کی اصلیت اور حقیقت اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ واضح کی گئی تاکہ اللہ تعالیٰ کی اِطاعت و عبادت کی ترغیب اور نافرمانی سے بچنے کی فکر۔

پھر کفار کی دو جماعتیں جن کا ذِکر اُوپر آیا ہے کھلے کافر اور منافق، ان دونوں میں دو طرح کے لوگ تھے، ایک توبت پرست مشرکین جو محض باپ دادوں کی رُسوم کی پیروی کرتے تھے، کوئی علم قدیم یا جدید ان کے پاس نہ تھا، عام طور پر اَن پڑھ اُمی تھے، جیسے عام اہلِ مکہ، اسی لئے قرآن میں ان لوگوں کو اُمّیّین کہا گیا ہے۔

دُوسرے وہ لوگ تھے جو پچھلے انبیاء پر اِیمان لائے، اور پہلی آسمانی کتابوں تورات و اِنجیل وغیرہ کا علم اُن کے پاس تھا، لکھے پڑھے لوگ کہلاتے تھے، ان میں بعض حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اِیمان رکھتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام پر نہیں، ان کو ''یہود'' کہا جاتا تھا، اور بعض عیسیٰ علیہ السلام پر اِیمان رکھتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحیثیت نبیٔ معصوم نہیں مانتے تھے، یہ ''نصاریٰ'' کہلاتے تھے، ان دونوں کو قرآن میں اس بنا پر اہلِ کتاب کہا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتاب تورات یا اِنجیل پر اِیمان رکھتے تھے، یہ لوگ لکھے پڑھے اہلِ علم ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں معزّز اور قابلِ اِعتماد مانے

جاتے تھے، ان کی بات اُن پر اَثر انداز ہوتی تھی، یہ راستے پر آجائیں تو دُوسروں کے مسلمان ہونے کی توقع بڑی تھی، مدینہ طیبہ اور اس کے قرب و جوار میں اِن لوگوں کی کثرت تھی۔

سورۂ بقرہ چونکہ مدنی سورت ہے، اس لئے اس میں مشرکین و منافقین کے بیان کے بعد اہلِ کتاب کو خصوصیت اور اِہتمام کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، چالیسویں آیت سے شروع ہو کر ایک سو تئیس آیات آخر پارہ الٓمّٓ تک انہی لوگوں سے خطاب ہے، جس میں ان کو مانوس کرنے کے لئے اوّل ان کی خاندانی شرافت اور اس سے دُنیا میں حاصل ہونے والے اعزاز کا، پھر اللہ تعالیٰ کی مسلسل نعمتوں کا ذِکر کیا گیا ہے، پھر اُن کی بے راہی اور غلط کاری پر متنبہ کیا گیا، اور صحیح راستہ کی طرف دعوت دی گئی، ان میں سے پہلی سات آیتوں میں اِجمالی خطاب ہے، جن میں سے تین میں دعوتِ اِیمان اور چار میں اعمالِ صالحہ کی تلقین ہے، اس کے بعد بڑی تفصیل سے ان کو خطاب کیا گیا، تفصیلی خطاب کے شروع میں اور بالکل ختم پر، پھر اِہتمام کے لئے یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ فرما کر انہیں الفاظ کا اِعادہ کیا گیا ہے جن سے شروع کیا گیا تھا، جیسا کہ کلام کو مؤثر اور وقیع بنانے کے لئے ایسا کرنے کا دستور ہے۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ، ''اِسرائیل'' عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنیٰ ''عبداللہ'' ہیں، یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دُوسرا نام ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نبی کے نام متعدّد نہیں ہیں، صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو نام ہیں، یعقوب اور اِسرائیل۔ قرآن میں اس جگہ ان کو ''بنی یعقوب'' کہہ کر خطاب نہیں کیا، بلکہ دُوسرے نام ''اِسرائیل'' کا اِستعمال کیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ خود اپنے لقب اور نام ہی سے ان کو معلوم ہوجائے کہ ہم عبداللہ یعنی اللہ کے عبادت گزار بندے کی اولاد ہیں، ہمیں بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہئے، اس آیت میں بنی اِسرائیل کو خطاب کر کے اِرشاد فرمایا کہ:-

''اور پورا کرو تم میرے عہد کو'' یعنی تم نے مجھ سے عہد کیا تھا توریت میں جس کا بیان بقول قتادہؒ و مجاہدؒ اس آیت میں ہے: وَلَقَدۡ اَخَذَ اللّٰہُ مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۚ وَبَعَثۡنَا مِنۡہُمُ اثۡنَیۡ عَشَرَ نَقِیۡبًا ؕ (الیٰ) قَرۡضًا حَسَنًا (المائدۃ:۱۲) اس میں سب سے اہم معاہدہ تمام رسولوں پر اِیمان لانے کا شامل ہے، جن میں ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت سے داخل ہیں، نیز نماز، زکوٰۃ اور صدقات بھی اس عہد میں شامل ہیں، جس کا خلاصہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اِیمان اور آپ کا مکمل اِتباع ہے، اسی لئے حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اِتباع ہے۔ (ابن جریر بسند صحیح) [1]

''پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو'' یعنی اسی آیتِ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ جو لوگ اس عہد کو پورا کریں گے تو ان کے گناہ معاف کردیئے جائیں گے، اور جنت میں داخل کیا جائے گا، تو حسبِ وعدہ ان لوگوں کو جنت کی

---

[1] تفسیر الطبری رقم الحدیث:۸۰۵

نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اے بنی اِسرائیل! تم میرا عہد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِتباع کا پورا کرو، تو میں اپنا عہد تمہاری مغفرت اور جنت کا پورا کردُوں گا، اور صرف مجھ ہی سے ڈرو، اور عوام الناس معتقدین سے نہ ڈرو کہ ان کی منشا کے خلاف کلمۂ حق کہیں گے تو وہ معتقد نہ رہیں گے، آمدنی بند ہوجائے گی۔

۱- اُمتِ محمدیہ کی ایک خاص فضیلت

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اللہ جل شانہ نے بنی اِسرائیل کو اپنی نعمتیں اور اِحسانات یاد دِلا کر اپنی یاد اور اِطاعت کی طرف دعوت دی ہے، اور اُمتِ محمدیہ کو جب اسی کام کے لئے دعوت دی تو اِحسانات و اِنعامات کے ذِکر کے بغیر فرمایا: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرۃ:۱۵۲) یعنی ''تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا'' اس میں اُمتِ محمدیہ کی خاص فضیلت کی طرف اِشارہ ہے کہ ان کا تعلق محسن و منعم سے بلا واسطہ ہے، یہ محسن کو پہچان کر اِحسان کو پہچانتے ہیں، بخلاف دُوسری اُمتوں کے کہ وہ اِحسانات کے ذریعے محسن کو پہچانتے ہیں۔ [۱]

۲- ایفائے عہد واجب اور عہد شکنی حرام ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عہد و معاہدہ کو پورا کرنا ضروری ہے، اور عہد شکنی حرام ہے، سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ مضمون آیا ہے: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۬ (المائدۃ:۱)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عہد شکنی کرنے والوں کو جو سزا آخرت میں ملے گی اس سے پہلے ہی ایک سزا یہ دی جائے گی کہ محشر کے میدان میں جہاں تمام اَوّلین و آخرین کا اِجتماع ہوگا عہد شکنی کرنے والے پر ایک جھنڈا بطور علامت کے لگا دیا جائے گا، اور جیسی بڑی عہد شکنی کی ہے اُتنا ہی یہ جھنڈا بلند ہوگا، اس طرح ان کو میدانِ حشر میں رُسوا اور شرمندہ کیا جائے گا۔ (صحیح مسلم عن ابی سعید) [۲]

۳- جو شخص کسی گناہ یا ثواب کا سبب بنتا ہے، اس پر بھی کرنے والوں کا گناہ یا ثواب لکھا جاتا ہے

اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠، کافر ہونا خواہ سب سے پہلے ہو یا بعد میں بہرحال اِنتہائی ظلم اور جرم ہے، مگر اس آیت میں یہ فرمایا کہ پہلے کافر نہ بنو، اس میں اِشارہ اس طرف ہے کہ جو شخص اوّل کفر اِختیار کرے گا تو بعد میں اس کو دیکھ کر جو بھی کفر میں مبتلا

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۳۳۲

[۲] صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب تحريم الغدر ج:۲ ص:۸۳

ہوگا اس کا وَبال جو اس شخص پر پڑے گا، اس پہلے کافر پر بھی اس کا وَبال آئے گا، اس طرح یہ پہلا کافر اپنے کفر کے علاوہ بعد کے لوگوں کے کفر کا سبب بن کر اُن سب کے وبالِ کفر کا بھی ذمہ دار ٹھہرے گا، اور اس کا عذاب چند در چند ہو جائے گا۔

فائدہ:- اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دُنیا میں دُوسروں کے لئے کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب بنتا ہے تو جتنے آدمی اس کے سبب سے مبتلائے گناہ ہوں گے ان سب کا گناہ ان لوگوں کو بھی ہوگا اور اس شخص کو بھی۔ اسی طرح جو شخص دُوسروں کے لئے کسی نیکی کا سبب بن جائے تو جتنے آدمی اس کے سبب سے نیک عمل کریں گے، اس کا ثواب جیسا اُن لوگوں کو ملے گا ایسا ہی اس شخص کے نامۂ اَعمال میں بھی لکھا جائے گا، قرآن مجید کی متعدّد آیات اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدّد اَحادیث میں یہ مضمون بار بار آیا ہے۔

۴- وَلَا تَشْتَرُوا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے میں قیمت لینے کی ممانعت کا مطلب وہ ہی ہے جو آیت کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے، کہ لوگوں کی مرضی اور ان کی اَغراض کی خاطر اللہ تعالیٰ کی آیات کا مطلب غلط بتلا کر یا چھپا کر لوگوں سے پیسے لئے جائیں، یہ فعل باجماعِ اُمت حرام ہے۔

۵- تعلیمِ قرآن پر اُجرت لینا جائز ہے

رہا یہ معاملہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی آیات صحیح صحیح بتلا کر یا پڑھا کر اس کی اُجرت لینا کیسا ہے؟ اس کا تعلق آیتِ مذکورہ سے نہیں، خود یہ مسئلہ اپنی جگہ قابلِ غور و بحث ہے کہ تعلیمِ قرآن پر اُجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ فقہائے اُمت کا اس میں اِختلاف ہے، اِمام مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ جائز قرار دیتے ہیں، اور اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ اور بعض دُوسرے ائمہ منع فرماتے ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو ذریعہ کسبِ معاش کا بنانے سے منع فرمایا ہے۔

لیکن متأخرینِ حنفیہ نے بھی جب ان حالات کا مشاہدہ کیا کہ قرآن مجید کے معلّمین کو اِسلامی بیت المال سے گزارہ ملا کرتا تھا، اب ہر جگہ اِسلامی نظام میں فتور کے سبب ان معلّمین کو عموماً کچھ نہیں ملتا، یہ اگر اپنے معاش کے لئے کسی محنت مزدوری یا تجارت وغیرہ میں لگ جائیں تو بچوں کو تعلیمِ قرآن کا سلسلہ یکسر بند ہو جائے گا، کیونکہ وہ دن بھر کا مشغلہ چاہتا ہے، اس لئے تعلیمِ قرآن پر تنخواہ لینے کو بضرورت جائز قرار دیا، جیسا کہ صاحبِ ہدایہ نے فرمایا ہے کہ آج کل اسی پر فتویٰ دینا چاہئے کہ تعلیمِ قرآن پر اُجرت و تنخواہ لینا جائز ہے، صاحبِ ہدایہ کے بعد آنے والے دُوسرے فقہاء نے بعض ایسے ہی دُوسرے وظائف جن پر تعلیمِ قرآن کی طرح دِین کی بقا موقوف ہے، مثلاً اِمامت و اَذان اور تعلیمِ حدیث و فقہ وغیرہ کو تعلیمِ قرآن کے ساتھ ملحق کر کے ان کی بھی اِجازت دی۔ (درمختار، شامی) [1]

[1] الدر المختار، كتاب الإجارة ج:٦ ص:٥٥

۶- اِیصالِ ثواب کے لئے ختمِ قرآن پر اُجرت لینا باتفاق جائز نہیں

علامہ شامیؒ نے ''درمختار'' کی شرح میں اور اپنے رسالہ ''شفاء العلیل'' میں بڑی تفصیل اور قوی دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی ہے کہ تعلیمِ قرآن وغیرہ پر اُجرت لینے کو جن متاخرین فقہاء نے جائز قرار دِیا ہے اس کی علت ایک ایسی دِینی ضرورت ہے جس میں خلل آنے سے دِین کا پورا نظام مختل ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو ایسی ہی ضرورت کے مواقع میں محدود رکھنا ضروری ہے، اس لئے مُردوں کو اِیصالِ ثواب کے لئے ختمِ قرآن کرانا یا کوئی دُوسرا وظیفہ پڑھوانا اُجرت کے ساتھ حرام ہے، کیونکہ اُس پر کسی عام دِینی ضرورت کا مدار نہیں، اور اُجرت لے کر پڑھنا حرام ہوا تو اس طرح پڑھنے والا اور پڑھوانے والا دونوں گناہگار ہوئے، اور جب پڑھنے والے ہی کو کوئی ثواب نہ ملا تو میّت کو وہ کیا پہنچائے گا۔ علامہ شامیؒ نے اس بات پر فقہاء کی بہت سی تصریحات تاج الشریعۃ، عینی شرح ہدایہ، حاشیہ خیر الدین بر بحر الرائق وغیرہ سے نقل کی ہے، اور خیر الدین رملی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ایصالِ ثواب کے لئے قبر پر قرآن پڑھوانا یا اُجرت دے کر ختمِ قرآن کرانا صحابہؓ وتابعینؒ اور اَسلافِ اُمتؒ سے کہیں منقول نہیں، اس لئے بدعت ہے۔ [1]

۷- حق بات کو چھپانا یا اس میں خلط ملط کرنا حرام ہے

آیت: وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ الـخ سے ثابت ہوا کہ حق بات کو غلط باتوں کے ساتھ گڈمڈ کر کے اس طرح پیش کرنا جس سے مخاطب مغالطہ میں پڑ جائے جائز نہیں، اسی طرح کسی خوف یا طمع کی وجہ سے حق بات کا چھپانا بھی حرام ہے، مسئلہ واضح ہے، اس میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں، اِمام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں حق کو چھپانے سے پرہیز کرنے کا ایک واقعہ اور مفصل مکالمہ حضرت ابوحازمؒ تابعی اور خلیفہ سلیمان بن عبدالملکؒ کا نقل کیا ہے، جو بہت سے فوائد کی وجہ سے قابلِ ذِکر ہے۔

حضرت ابوحازمؒ تابعی، سلیمان بن عبدالملکؒ کے دربار میں

مسندِ دارمی [2] میں سند کے ساتھ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ سلیمان بن عبدالملکؒ مدینہ طیبہ پہنچے، اور چند روز قیام کیا تو لوگوں سے دریافت کیا کہ مدینہ طیبہ میں اب کوئی ایسا آدمی موجود ہے جس نے کسی صحابی کی صحبت پائی ہو؟ لوگوں نے بتلایا: ہاں ابوحازم ایسے شخص ہیں۔ سلیمان نے اپنا آدمی بھیج کر اُن کو بلوالیا، جب وہ تشریف لائے تو سلیمانؒ نے کہا کہ اے ابوحازم! یہ کیا بے مروّتی اور بیوفائی ہے؟ ابوحازمؒ نے کہا: آپ نے میری کیا بے مروّتی اور بے وفائی دیکھی ہے؟ سلیمانؒ

---

[1] شامی، کتاب الإجارۃ ج:۶ ص:۵۶، ۵۷

[2] مسند دارمی رقم الحدیث: ۶۷۲

نے کہا کہ مدینہ کے سب مشہور لوگ مجھ سے ملنے آئے، آپ نہیں آئے۔ ابو حازمؒ نے کہا: امیر المؤمنین! میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں اس سے کہ آپ کوئی ایسی بات کہیں جو واقعہ کے خلاف ہے، آج سے پہلے نہ آپ مجھ سے واقف تھے اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا، ایسے حالات میں خود ملاقات کے لئے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بیوفائی کیسی؟

سلیمانؒ نے جواب سن کر ابنِ شہاب زہریؒ اور حاضرینِ مجلس کی طرف اِلتفات کیا، تو اِمام زہریؒ نے فرمایا کہ ابوحازم نے صحیح فرمایا، آپ نے غلطی کی۔

اس کے بعد سلیمانؒ نے رُوئے سخن بدل کر کچھ سوالات شروع کئے اور کہا: اے ابوحازم! یہ کیا بات ہے کہ ہم موت سے گھبراتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی آخرت کو ویران اور دُنیا کو آباد کیا ہے، اس لئے آبادی سے ویرانے میں جانا پسند نہیں۔

سلیمان نے تسلیم کیا، اور پوچھا کہ کل اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کیسے ہوگی؟ فرمایا کہ نیک عمل کرنے والا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح جائے گا جیسا کوئی مسافر سفر سے واپس اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہے، اور برے عمل کرنے والا اس طرح پیش ہوگا جیسا کوئی بھاگا ہوا غلام پکڑ کر آقا کے پاس حاضر کیا جائے۔

سلیمانؒ یہ سن کر رو پڑے، اور کہنے لگے: کاش! ہمیں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے کیا صورت تجویز کر رکھی ہے؟ ابوحازمؒ نے فرمایا کہ اپنے اعمال کو اللہ کی کتاب پر پیش کرو تو پتہ لگ جائے گا۔

سلیمانؒ نے دریافت کیا کہ قرآن کی کس آیت سے یہ پتہ لگے گا؟ فرمایا: اس آیت سے: اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ﴿۱۳﴾ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ﴿۱۴﴾ (الانفطار) یعنی ”بلاشبہ نیک عمل کرنے والے جنت کی نعمتوں میں ہیں، اور نافرمان، گناہ شعار دوزخ میں۔“

سلیمانؒ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی ہے، وہ بدکاروں پر بھی حاوی ہے۔ فرمایا: اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۶﴾ (الاعراف) یعنی ”اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک عمل کرنے والوں سے قریب ہے۔“

سلیمانؒ نے پوچھا: اے ابوحازم! اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ کون عزّت والا ہے؟ فرمایا: وہ لوگ جو مروّت اور عقلِ سلیم رکھنے والے ہیں۔

پھر پوچھا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا کہ فرائض وواجبات کی ادائیگی، حرام چیزوں سے بچنے کے ساتھ۔

پھر دریافت کیا کہ کونسی دُعا زیادہ قابلِ قبول ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص پر اِحسان کیا گیا ہو اس کی دُعا اپنے محسن کے لئے اقرب اِلی القبول ہے۔

پھر دریافت کیا کہ صدقہ کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ مصیبت زدہ سائل کے لئے باوجود اپنے افلاس کے جو کچھ

ہو سکے، اس طرح خرچ کرنا کہ نہ اس سے پہلے اِحسان جتائے اور نہ ٹال مٹول کر کے اِیذا پہنچائے۔

پھر دریافت کیا کہ کلام کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص سے تم کو خوف ہو یا جس سے تمہاری کوئی حاجت ہو اور اُمید وابستہ ہو اس کے سامنے بغیر کسی رو رعایت کے حق بات کہہ دینا۔

پھر دریافت کیا کہ کونسا مسلمان سب سے زیادہ ہوشیار ہے؟ فرمایا: وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی اِطاعت کے تحت کام کیا ہو، اور دُوسروں کو بھی اس کی دعوت دی ہو۔

پھر پوچھا کہ مسلمانوں میں کون شخص احمق ہے؟ فرمایا: وہ آدمی جو اپنے کسی بھائی کی اس کے ظلم میں اِمداد کرے، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس نے دُوسرے کی دُنیا دُرست کرنے کے لئے اپنا دِین بیچ دیا۔ سلیمانؒ نے کہا کہ صحیح فرمایا۔

اس کے بعد سلیمانؒ نے اور واضح الفاظ میں دریافت کیا کہ ہمارے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ابوحازمؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سوال سے معاف رکھیں تو بہتر ہے۔ سلیمانؒ نے کہا کہ نہیں، آپ ضرور کوئی نصیحت کا کلمہ کہیں۔

ابوحازمؒ نے فرمایا: اے امیر المؤمنین! تمہارے آباء واَجداد نے بزورِ شمشیر لوگوں پر تسلط کیا، اور زبردستی ان کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت قائم کی، اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا، اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ اس دُنیا سے رُخصت ہوگئے، کاش! آپ کو معلوم ہوتا کہ اب وہ مرنے کے بعد کیا کہتے ہیں، اور ان کو کیا کہا جاتا ہے۔

حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص نے بادشاہ کے مزاج کے خلاف ابوحازمؒ کی اس صاف گوئی کو سن کر کہا کہ ابوحازم! تو نے یہ بہت بری بات کہی ہے، ابوحازمؒ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو، بری بات نہیں کہی، بلکہ وہ بات کہی جس کا ہم کو حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء سے اس کا عہد لیا ہے کہ حق بات لوگوں کو بتلائیں گے چھپائیں گے نہیں: لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ (آل عمران:۱۸۷)

یہی وہ بات ہے جس کے لئے یہ طویل حکایت اِمام قرطبیؒ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں درج فرمائی ہے۔

سلیمانؒ نے پھر سوال کیا کہ اچھا اب ہمارے دُرست ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا کہ تکبر چھوڑو، مروّت اِختیار کرو، اور حقوق والوں کو ان کے حقوق اِنصاف کے ساتھ تقسیم کرو۔

سلیمانؒ نے کہا کہ ابوحازم! کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں؟ فرمایا: خدا کی پناہ! سلیمانؒ نے پوچھا: یہ کیوں؟ فرمایا کہ اس لئے کہ مجھے خطرہ یہ ہے کہ میں تمہارے مال و دولت اور عزّت و جاہ کی طرف کچھ مائل ہو جاؤں جس کے نتیجہ میں مجھے عذاب بھگتنا پڑے۔

پھر سلیمانؒ نے کہا کہ اچھا آپ کی کوئی حاجت ہو تو بتلایئے کہ ہم اس کو پورا کریں؟ فرمایا: ہاں ایک حاجت ہے کہ جہنم سے نجات دِلا دو اور جنت میں داخل کر دو۔ سلیمانؒ نے کہا کہ یہ تو میرے اِختیار میں نہیں! فرمایا کہ پھر مجھے آپ سے

اور کوئی حاجت مطلوب نہیں۔

آخر میں سلیمانؒ نے کہا کہ اچھا میرے لئے دُعا کیجئے! تو ابو حازمؒ نے یہ دُعا کی: یا اللہ! اگر سلیمان آپ کا پسندیدہ ہے تو اس کے لئے دُنیا و آخرت کی بہتری کو آسان بنا دے، اور اگر وہ آپ کا دُشمن ہے تو اس کے بال پکڑ کر اپنی مرضی اور محبوب کاموں کی طرف لے آ۔

سلیمانؒ نے کہا کہ مجھے کچھ وصیت فرمادیں۔ اِرشاد فرمایا کہ مختصر یہ ہے کہ اپنے رَبّ کی عظمت وجلال اس درجہ میں رکھو کہ وہ تمہیں اس مقام پر نہ دیکھے جس سے منع کیا ہے، اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جس کی طرف آنے کا اس نے حکم دیا ہے۔

سلیمانؒ نے اس مجلس سے فارغ ہونے کے بعد سو گنیاں بطور ہدیہ کے ابو حازمؒ کے پاس بھیجیں، ابو حازمؒ نے ایک خط کے ساتھ اُن کو واپس کر دیا، خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ سو دِینار میرے کلمات کا معاوضہ ہیں تو میرے نزدیک خون اور خنزیر کا گوشت اس سے بہتر ہے، اور اگر اس لئے بھیجا ہے کہ بیت المال میں میرا حق ہے، تو مجھ جیسے ہزاروں علماء اور دِین کی خدمت کرنے والے ہیں، اگر سب کو آپ نے اتنا ہی دیا ہے تو میں بھی لے سکتا ہوں، ورنہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

ابو حازمؒ کے اس اِرشاد سے کہ اپنے کلماتِ نصیحت کا معاوضہ لینے کو خون اور خنزیر کی طرح قرار دیا ہے، اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کسی طاعت وعبادت کا معاوضہ لینا اُن کے نزدیک جائز نہیں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ

اور قائم رکھو نماز اور دِیا کرو زکوٰۃ اور جھکو نماز میں جھکنے والوں کے ساتھ۔ کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو

بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

نیک کام کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو اور تم تو پڑھتے ہو کتاب، پھر کیوں نہیں سوچتے ہو۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ لا

اور مدد چاہو صبر سے اور نماز سے اور البتہ وہ بھاری ہے مگر انہی عاجزوں پر

ۧ ۵
الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع

جن کو خیال ہے کہ وہ رُوبرو ہونے والے ہیں اپنے رَبّ کے اور یہ کہ اُن کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

آسان ترجمۂ قرآن

اور نماز قائم کرو، اور زکوۃ ادا کرو، اور رُکوع کرنے والوں کے ساتھ رُکوع کرو ﴿۴۳﴾ کیا تم (دوسرے) لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو، اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو! کیا تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں؟ ﴿۴۴﴾ اور صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ نماز بھاری ضرور معلوم ہوتی ہے، مگر اُن لوگوں کو نہیں جو خشوع (یعنی دھیان اور عاجزی) سے پڑھتے ہیں ﴿۴۵﴾ جو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں، اور ان کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۴۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور قائم کرو تم لوگ نماز کو (یعنی مسلمان ہوکر) اور دو زکوٰۃ کو اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ۔ (علمائے بنی اسرائیل کے بعض اقارب مسلمان ہوگئے تھے، جب ان سے گفتگو ہوتی تو خفیہ طور پر یہ علماء اُن سے کہتے تھے کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسولِ برحق ہیں، ہم لوگ تو کسی مصلحت سے مسلمان نہیں ہوتے، مگر تم اس مذہب اِسلام کو نہ چھوڑنا، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا) کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی اِطاعت کرنے کو) اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی (یعنی توریت کی جس میں جابجا ایسے عالمِ بے عمل کی مذمتیں مذکور ہیں) تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ اور مدد لو (یعنی اگر تم کو حبِ مال وحبِ جاہ کی وجہ سے اِیمان لانا دُشوار معلوم ہوتا ہو تو مدد لو) صبر اور نماز سے (یعنی اِیمان لاکر صبر اور نماز کا اِلتزام کرو تو یہ حبِ مال وجاہ دِل سے نکل جائے گی، اور اگر کوئی کہے کہ خود نماز اور صبر کا اِلتزام بہت دُشوار ہے تو سن لے کہ) اور بے شک وہ نماز دُشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو اُن پر کچھ بھی دُشوار نہیں، وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رَبّ سے اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رَبّ کی طرف واپس جانے والے ہیں (تو اس وقت اس کا حساب کتاب بھی دینا ہوگا، ان دونوں خیالوں سے رغبت بھی پیدا ہوگی، خوف بھی اور یہی دو چیزیں ہر عمل کی رُوح ہیں)۔

معارف ومسائل

ربطِ آیات

بنی اِسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور اِحسانات یاد دِلا کر ایمان اور عملِ صالح کی طرف دعوت دی ہے، پچھلی تین آیتوں میں اِیمان وعقائد سے متعلق ہدایات تھیں، اوران چار آیتوں میں اعمالِ صالحہ کی تلقین ہے، اوران میں جو اعمال سب سے زیادہ اہم ہیں ان کا ذِکر ہے، اور حاصلِ مطلب آیات کا یہ ہے کہ اور اگر تم کو حبِ مال وجاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دُشوار معلوم ہوتا ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ ''صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو'' صبر سے حبِ مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال اسی وجہ سے مطلوب ومحبوب ہے کہ وہ ذریعہ ہے لذّات وشہوات کے پورا کرنے کا، جب ان لذّات وشہوات کی مطلق العنانی چھوڑنے پر ہمت باندھ لوگے، تو پھر مال کی فراوانی کی نہ ضرورت رہے گی نہ اُس کی محبت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کردے، اور نماز سے حبِ جاہ کم ہوجائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پستی اور عاجزی ہی ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہوجائے گی تو حبِ جاہ ومنصب اور تکبر وغرور گھٹے گا، اصل مادّۂ فساد جس کے سبب ایمان لانا دُشوار تھا یہی مال وجاہ کی محبت تھی، جب یہ مادّۂ فساد گھٹ گیا تو اِیمان لانا آسان ہوجائے گا۔

اب سمجھئے کہ صبر میں تو صرف غیر ضروری خواہشات اور شہوات کا ترک کرنا ہے، اور نماز میں بہت سے افعال کا واقع کرنا بھی ہے، اور بہت سی جائز خواہشات کو بھی وقتی طور پر ترک کرنا ہے مثلاً کھانا، پینا، کلام کرنا، چلنا پھرنا، اور دُوسری اِنسانی ضروریات جو شرعاً جائز ومباح ہیں ان کو بھی نماز کے وقت ترک کرنا ہے، اور وہ بھی اوقات کی پابندی کے ساتھ دن رات میں پانچ مرتبہ، اس لئے نماز نام ہے کچھ افعالِ معینہ کا، اور معین اوقات میں تمام ناجائز وجائز چیزوں سے صبر کرنے کا۔

غیر ضروری خواہشات کے ترک کرنے پر اِنسان ہمت باندھ لے تو چند روز کے بعد طبعی تقاضا بھی ختم ہوجاتا ہے، کوئی دُشواری نہیں رہتی، لیکن نماز کے اوقات کی پابندی اور اس کے تمام شرائط کی پابندی اور ضروری خواہشات سے بھی ان اوقات میں پرہیز کرنا یہ انسانی طبیعت پر بہت بھاری اور دُشوار ہے، اس لئے یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ایمان کو آسان بنانے کا جو نسخہ تجویز کیا گیا کہ ''صبر اور نماز سے کام لو'' اس نسخہ کا اِستعمال خود ایک دُشوار چیز ہے، خصوصاً نماز کی پابندیوں کا، تو اس دُشواری کا کیا علاج ہوگا؟ اس کے لئے اِرشاد فرمایا: ''بے شک وہ نماز دُشوار ضرور ہے، مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دُشوار نہیں'' اس میں نماز کے آسان کرنے کی ترکیب بتلادی گئی۔

حاصل یہ ہے کہ نماز میں دُشواری کی وجہ اور سبب پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اِنسان کا قلب خوگر ہے میدانِ خیال

میں آزاد پھرنے کا، اور سب اعضائے اِنسانی قلب کے تابع ہیں، اس لئے قلب کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اس کے سب اعضاء بھی آزاد رہیں، اور نماز سراسر اس آزادی کے خلاف ہے کہ نہ ہنسو، نہ بولو، نہ کھاؤ، نہ پیو، نہ چلو، وغیرہ وغیرہ، اس لئے قلب ان تقیدات سے تنگ ہوتا ہے، اور اس کے تابع اعضائے اِنسانی بھی اس سے تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سبب اس دُشواری اور گرانی کا قلب کی حرکتِ فکریہ ہے، تو اس کا علاج سکون سے ہونا چاہئے، اس لئے خشوع کو نماز کے آسان ہونے کا ذریعہ بتایا گیا، کیونکہ خشوع کے معنی ہی سکونِ قلب کے ہیں، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سکونِ قلب یعنی خشوع کس طرح حاصل ہو؟ تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے قلب سے مختلف اَفکار وخیالات کو براہِ راست نکالنا چاہے تو اس میں کامیابی قریب بمحال ہے، بلکہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ نفسِ اِنسانی چونکہ ایک وقت میں دوطرف متوجہ نہیں ہوسکتا، اس لئے اگر اس کو کسی ایک خیال میں محو ومستغرق کردیا جائے تو دُوسرے خیالات اور اَفکار خود بخود دِل سے نکل جائیں گے، اس لئے تلقینِ خشوع کے بعد وہ خیال بتلاتے ہیں جس میں مستغرق ہوجانے سے دُوسرے خیالات دفع ہوں، اور اُن کے دفع ہونے سے حرکتِ فکریہ قلب کی منقطع ہوکر سکون حاصل ہو، اور سکون سے نماز میں آسانی ہوکر اس پر مداومت اور پابندی نصیب ہو، اور اس پابندی سے کبر وغرور اور حبِ جاہ کم ہو، تاکہ ایمان کے راستہ میں جو حائل ہے وہ دُور ہوکر ایمان کامل ہوجائے، سبحان اللہ کیا مرتب علاج اور مطب ہے۔

اب اس خیالِ مذکور کی تلقین وتعیین اس طرح فرمائی: ''وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رَبّ سے'' تو اس وقت اس خدمت کا خوب اِنعام ملے گا، اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ ''وہ اپنے رَبّ کی طرف واپس جانے والے ہیں'' تو اس وقت اس کا حساب وکتاب بھی دینا ہوگا، ان دونوں خیالات سے رغبت ورہبت یعنی اُمید اور خوف پیدا ہوں گے، اوّل تو ہر خیالِ محمود میں مستغرق ہوجانا قلب کو نیک کام پر جمادیتا ہے، خصوصاً اُمید وبیم کا خیال، اس کو تو خاص طور پر دخل ہے نیک کام میں مستعد کردینے کے لئے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ، صلوٰۃ کے لفظی معنی دُعا کے ہیں، اِصطلاحِ شرع میں وہ خاص عبادت ہے جس کو ''نماز'' کہا جاتا ہے، قرآنِ کریم میں عموماً نماز کی جتنی مرتبہ تاکید کی گئی ہے لفظِ ''اِقامت'' کے ساتھ آئی ہے، مطلق نماز پڑھنے کا ذِکر صرف ایک دوجگہ آیا ہے، اس لئے اِقامتِ صلوٰۃ کی حقیقت کو سمجھنا چاہئے۔ ''اِقامت'' کے لفظی معنی سیدھا کرنے اور ثابت رکھنے کے ہیں، اور عادۃً جو عمود یا دِیوار یا درخت وغیرہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے وہ قائم رہتا ہے، گرجانے کا خطرہ کم ہوتا ہے، اس لئے اِقامت کے معنی دائم اور قائم کرنے کے بھی آتے ہیں۔

قرآن وسنت کی اِصطلاح میں اِقامتِ صلوٰۃ کے معنی نماز کو اس کے وقت میں پابندی کے ساتھ اس کے پورے آداب وشرائط کی رعایت کرکے ادا کرنا ہیں، مطلق نماز پڑھ لینے کا نام اِقامتِ صلوٰۃ نہیں ہے، نماز کے جتنے فضائل اور آثار

وبرکات قرآن وحدیث میں آئے ہیں وہ سب اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ مقید ہیں، مثلاً قرآنِ کریم میں ہے:-

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ ؕ (العنکبوت: ۴۵)

''یعنی نماز انسان کو ہر بے حیائی اور ہر برے کام سے روک دیتی ہے۔''

نماز کا یہ اثر اسی وقت ظاہر ہوگا جبکہ نماز کی اقامت اس معنی سے کرے جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں، اس لئے بہت سے نمازیوں کو برائیوں اور بے حیائیوں میں مبتلا دیکھ کر اس آیت پر کوئی شبہ نہ کرنا چاہئے، کیونکہ ان لوگوں نے نماز پڑھی تو ہے مگر اس کو قائم نہیں کیا۔

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ، لفظ ''زکوٰۃ'' کے معنی لغت میں دو آتے ہیں، پاک کرنا اور بڑھنا، اِصطلاحِ شریعت میں مال کے اس حصے کو ''زکوٰۃ'' کہا جاتا ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق کسی مال میں سے نکالا جائے اور اس کے مطابق صرف کیا جائے۔

اگرچہ یہاں خطاب موجودہ بنی اسرائیل کو ہے جس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نماز اور زکوٰۃ اسلام سے پہلے بنی اسرائیل پر فرض تھی، مگر سورۂ مائدہ میں: وَلَقَدۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۚ وَبَعَثۡنَا مِنۡهُمُ اثۡنَىۡ عَشَرَ نَقِيۡبًا ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىۡ مَعَكُمۡ ؕ لَئِنۡ اَقَمۡتُمُ الصَّلٰوةَ الخ (المائدۃ: ۱۲) سے ثابت ہے کہ نماز اور زکوٰۃ بنی اسرائیل پر فرض تھی، اگرچہ اس کی کیفیت اور ہیئت وغیرہ میں فرق ہو۔

وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ۝۴۳ ''رُکوع'' کے لغوی معنی جھکنے کے ہیں، اور اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ ''سجدہ'' پر بھی بولا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ بھی جھکنے کا انتہائی درجہ ہے، مگر اِصطلاحِ شرع میں اس خاص جھکنے کو ''رُکوع'' کہتے ہیں جو نماز میں معروف ومشہور ہے۔

آیت کے معنی یہ ہیں کہ ''رُکوع کرو، رُکوع کرنے والوں کے ساتھ'' یہاں ایک بات قابلِ غور ہے کہ نماز کے تمام ارکان میں سے اس جگہ رُکوع کی تخصیص کیوں کی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نماز کا ایک جزء بول کر کل نماز مراد لی گئی ہے، جیسے قرآن مجید میں ایک جگہ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ (الاسراء: ۷۸) فرما کر پوری نمازِ فجر مراد ہے، اور بعض روایاتِ حدیث میں ''سجدہ'' کا لفظ بول کر پوری رکعت یا نماز مراد لی گئی ہے، اس لئے مراد آیت کی یہ ہوگئی کہ نماز پڑھو نماز پڑھنے والوں کے ساتھ، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ نماز کے بہت سے ارکان میں سے رُکوع کی تخصیص میں کیا حکمت ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہود کی نماز میں سجدہ وغیرہ تو تھا، مگر رُکوع نہیں تھا، رُکوع اسلامی نماز کی خصوصیات میں سے ہے، اس لئے ''رَاكِعِيۡنَ'' کے لفظ سے اُمتِ محمدیہ کے نمازی مراد ہوں گے، جن کی نماز میں رُکوع بھی ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم بھی اُمتِ محمدیہ کے نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کرو، یعنی اوّل ایمان قبول کرو پھر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرو۔

باجماعت نماز کے اَحکام

نماز کا حکم اور اس کا فرض ہونا تو لفظ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ سے معلوم ہو چکا تھا، اس جگہ مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ کے لفظ سے نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

یہ حکم کس درجہ کا ہے؟ اس میں علماء فقہاء کا اِختلاف ہے، ایک جماعت صحابہؓ وتابعینؒ اور فقہائے اُمت کی، جماعت کو واجب قرار دیتی ہے، اور اس کے چھوڑنے کو سخت گناہ، اور بعض صحابہ کرامؓ تو اس نماز ہی کو جائز قرار نہیں دیتے جو بلاعذرِ شرعی کے بدون جماعت پڑھی جائے، یہ آیت ظاہری الفاظ کے اِعتبار سے ان حضرات کی حجت ہے جو وجوبِ جماعت کے قائل ہیں۔

اس کے علاوہ چند روایاتِ حدیث سے بھی جماعت کا واجب ہونا سمجھا جاتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ:-

لَا صَلٰوۃَ لِجَارِ الۡمَسۡجِدِ اِلَّا فِی الۡمَسۡجِدِ۔ (رواہ ابوداؤد) [۱]

''یعنی مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز صرف مسجد ہی میں جائز ہے۔''

اور مسجد کی نماز سے ظاہر ہے کہ جماعت کی نماز مراد ہے، تو اَلفاظِ حدیث سے یہ مطلب نکلا کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے جائز نہیں۔

مسجد کے سوا کسی اور جگہ جماعت

اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ ایک نابینا صحابیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے ساتھ کوئی ایسا آدمی نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچادیا اور لے جایا کرے، اس لئے اگر آپ اِجازت دیں تو میں نماز گھر میں پڑھ لیا کروں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّل تو ان کو اِجازت دے دی، مگر جب وہ جانے لگے تو سوال کیا کہ کیا اَذان کی آواز تمہارے گھر تک پہنچتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ اَذان کی آواز تو میں سنتا ہوں، آپ نے فرمایا: پھر تو آپ کو مسجد میں آنا چاہئے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ پھر میں آپ کے لئے کوئی گنجائش اور رُخصت نہیں پاتا۔ (اخرجہ ابوداؤد) [۲]

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَنۡ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمۡ یُجِبۡ فَلَا صَلَاۃَ لَہٗ اِلَّا مِنۡ عُذۡرٍ۔ (صححہ القرطبی) [۳]

---

[۱] کنز العمال ج:۷ ص:۶۵۰ رقم الحدیث:۲۰۷۳۷

[۲] سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب التشدید فی ترک الجماعۃ ج:۱ ص:۸۱، وصحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب فضل صلاۃ المکتوبۃ ...الخ ج:۱ ص:۲۳۲

[۳] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۳۴۹

''یعنی جو شخص اذان کی آواز سنتا ہے اور جماعت مسجد میں نہیں آتا تو اس کی نماز نہیں ہوتی، مگر یہ کہ اس کو کوئی عذرِ شرعی ہو۔''

ان احادیث کی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ وغیرہ حضراتِ صحابہ نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ جو شخص مسجد سے اتنا قریب رہتا ہے کہ اذان کی آواز وہاں تک پہنچتی ہے تو اگر وہ بلا عذر کے جماعت میں حاضر نہ ہو تو اس کی نماز ہی نہیں ہوتی، (آواز سننے سے مراد یہ ہے کہ متوسط آواز والے آدمی کی آواز وہاں پہنچ سکے، آلہ مکبّر الصوت یا غیر معمولی بلند آواز کا اس میں اعتبار نہیں)۔ یہ سب روایات ان حضرات کی دلیل ہیں جو جماعت کو واجب قرار دیتے ہیں، مگر جمہورِ اُمت علماء و فقہائے صحابہؓ و تابعینؒ کے نزدیک جماعت سنتِ مؤکدہ ہے، مگر سننِ مؤکدہ میں سنتِ فجر کی طرح سب سے زیادہ مؤکد اور قریب بوجوب ہے، ان سب حضرات نے قرآنِ کریم کے اَمر: وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ کو دُوسری آیات اور روایات کی بنا پر تاکید کے لئے قرار دِیا ہے۔

اور جن احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے ہوتی ہی نہیں، اس کا یہ مطلب قرار دیتے ہیں کہ یہ نماز کامل اور مقبول نہیں، اس معاملے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان بہت واضح اور کافی ہے جس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:-

فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ کل (محشر میں) اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے تو اس کو چاہئے کہ ان (پانچ) نمازوں کے ادا کرنے کی پابندی اس جگہ کرے جہاں اذان دی جاتی ہے (یعنی مسجد)، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ ہدایت کے طریقے بتلائے ہیں، اور ان پانچ نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا انہی سننِ ہدیٰ میں ہے، اور اگر تم نے یہ نمازیں اپنے گھر میں پڑھ لیں، جیسے یہ جماعت سے الگ رہنے والا اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے (کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) تو تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ بیٹھو گے، اور اگر تم نے اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دیا تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ (اور جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح پاکی حاصل کرے) پھر کسی مسجد کا رُخ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم پر نیکی اس کے نامۂ اعمال میں درج فرماتے ہیں، اور اس کا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں، اور ایک گناہ معاف کر دیتے ہیں، اور ہم نے اپنے مجمع کو ایسا پایا ہے کہ منافق بین النّفاق کے سوا کوئی آدمی جماعت سے الگ نماز نہ پڑھتا تھا، یہاں تک کہ بعض حضرات کو عذر اور بیماری میں بھی دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔[1]

اس بیان میں جس طرح باجماعت نماز کی پوری تاکید اور اہمیت و ضرورت کا ذِکر ہے اسی کے ساتھ اس کا یہ درجہ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب فضل صلاۃ الجماعۃ ج:۱ ص:۲۳۲

بھی بیان فرمادیا کہ وہ سُننِ ہدیٰ میں سے ہے، جس کو فقہاء سنتِ مؤکدہ کہتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص عذرِ شرعی مثلاً مرض وغیرہ کے بغیر تنہا نماز پڑھ لے اور جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کی نماز تو ہو جائے گی، مگر سنتِ مؤکدہ کے ترک کی وجہ سے مستحقِ عتاب ہوگا، اور اگر ترکِ جماعت کی عادت بنالے تو سخت گناہگار ہے، خصوصاً اگر ایسی صورت ہو جائے کہ مسجد ویران رہے اور لوگ گھروں میں نماز پڑھیں تو یہ سب شرعاً مستحقِ سزا ہیں، اور قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ ایسے لوگ اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں تو ان سے قتال کیا جائے۔ (قرطبی ج:۱ ص:۲۹۸)

بے عمل واعظ کی مذمت

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ، اس آیت میں خطاب اگرچہ علمائے یہود سے ہے، ان کو ملامت کی جارہی ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے رہو، اور دینِ اسلام پر قائم رہو (جو علامت ہے اس بات کی کہ علمائے یہود دینِ اسلام کو یقینی طور پر حق سمجھتے تھے) مگر خود نفسانی خواہشات سے اتنے مغلوب تھے کہ اِسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، لیکن معنی کے اِعتبار سے یہ ہر اُس شخص کی مذمت ہے جو دُوسروں کو تو نیکی اور بھلائی کی ترغیب دے، مگر خود عمل نہ کرے، دُوسروں کو خدا سے ڈرائے، مگر خود نہ ڈرے، ایسے شخص کے بارے میں احادیث میں بڑی ہولناک وعیدیں آئی ہیں، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ شبِ معراج میں میرا گزر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی قینچیوں سے کترے جارہے تھے، میں نے جبریل سے پوچھا: یہ کون ہیں؟ جبریل نے بتایا کہ یہ آپ کی اُمت کے دُنیادار واعظ ہیں جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے تھے، مگر اپنی خبر نہ لیتے تھے۔ (ابن کثیر) [۱]

ابنِ عساکرؒ نے ذِکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ بعض جنتی بعض دوزخیوں کو آگ میں دیکھ کر پوچھیں گے کہ تم آگ میں کیونکر پہنچ گئے؟ حالانکہ ہم تو بخدا انہی نیک اَعمال کی بدولت جنت میں داخل ہوئے ہیں جو ہم نے تم سے سیکھے تھے، اہلِ دوزخ کہیں گے: ”ہم زبان سے کہتے ضرور تھے، لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے“۔ (ابنِ کثیر) [۲]

کیا فاسق وعظ و نصیحت نہیں کرسکتا؟

لیکن مذکورہ بیان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل یا فاسق کے لئے دُوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں، اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دُوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے، کیونکہ کوئی اچھا عمل الگ نیکی ہے اور اس

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۱ ص:۲۴۸ ومسند احمد رقم الحديث:۱۱۷۶۶

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۱ ص:۲۴۹ والمعجم الكبير للطبراني رقم الحديث:۱۷۸۲۰

اچھے عمل کی تبلیغ دُوسری مستقل نیکی ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک نیکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دُوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے۔ جیسے ایک شخص اگر نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ روزہ بھی ترک کردے، بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دُوسروں کو نماز پڑھنے کے لئے بھی نہ کہے، اسی طرح کسی ناجائز فعل کا اِرتکاب الگ گناہ ہے، اور اپنے زیرِ اَثر لوگوں کو اس ناجائز فعل سے نہ روکنا دُوسرا گناہ ہے، اور ایک گناہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دُوسرا گناہ بھی ضرور کیا جائے۔ (رُوح المعانی) [۱]

چنانچہ اِمام مالکؒ نے حضرت سعید بن جبیرؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ہر ایک شخص یہ سوچ کر اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے کہ میں خود گنہگار رہوں، جب گناہوں سے خود پاک ہوجاؤں گا تو لوگوں کو تبلیغ کروں گا، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا، کیونکہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے بالکل پاک ہو؟ حضرت حسنؒ کا اِرشاد ہے کہ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑ کر تبلیغ کا فریضہ چھوڑ بیٹھیں (قرطبی)۔ [۲] بلکہ حضرت سیّدی حکیم الامت تھانویؒ تو فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے اپنی کسی بری عادت کا علم ہوتا ہے تو میں اس عادت کی مذمت اپنے مواعظ میں خاص طور سے بیان کرتا ہوں، تاکہ وعظ کی برکت سے یہ عادت جاتی رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے عمل آدمی کو وعظ کہنا جائز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے، اور دونوں میں فرق واضح ہے۔ مگر یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ بے عمل ہونا نہ تو واعظ کے لئے جائز ہے نہ غیر واعظ کے لئے، پھر واعظ کی تخصیص کیوں؟ جواب یہ ہے کہ ناجائز تو دونوں کے لئے ہے، مگر واعظ کا جرم غیر واعظ کے جرم کے مقابلے میں زیادہ سنگین اور زیادہ قابلِ ملامت ہے، کیونکہ واعظ جرم کو جرم سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کرتا ہے، اس کے پاس یہ عذر نہیں ہوتا کہ مجھے اس کا جرم ہونا معلوم نہ تھا، برخلاف غیر واعظ کے اور اَن پڑھ جاہل کے کہ اس کو خواہ علم حاصل نہ کرنے کا الگ گناہ ہو، لیکن اِرتکابِ گناہ میں اس کے پاس کسی درجہ میں عذر موجود ہوتا ہے کہ مجھے معلوم نہ تھا۔ اس کے علاوہ عالم اور واعظ اگر کوئی جرم کرتا ہے تو یہ دِین کے ساتھ ایک قسم کا اِستہزاء ہے، چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جتنا اَن پڑھ لوگوں کو معاف کرے گا اتنا علماء کو معاف نہیں کرے گا۔ [۳]

---

[۱] رُوح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۲۹۸

[۲] تفسير ابن كثير ج:۱ ص:۴۲۸

[۳] كنز العمال رقم الحديث:۲۸۹۸۴

دو نفسیاتی بیماریاں اور اُن کا علاج

حبِ مال اور حبِ جاہ، یہ دونوں قلب کی ایسی بیماریاں ہیں جن کے باعث اِنسان کی دُنیاوی زندگی اور اُخروی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ اور غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اِنسانی تاریخ میں اب تک جتنی اِنسانیت سوز لڑائیاں لڑی گئیں اور جو فساد برپا ہوئے، ان میں سے اکثر و بیشتر کو انہی دو بیماریوں نے جنم دیا تھا۔

حبِ مال کے نتائج یہ نکلتے ہیں:-

۱- کنجوسی اور بخل پیدا ہوتا ہے، جس کا ایک قومی نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ اس کی دولت قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی، دُوسرا نقصان خود اس کی ذات کو پہنچتا ہے کہ معاشرہ میں کوئی ایسے شخص کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

۲- خود غرضی پیدا ہوتی ہے جو مال کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے اُسے اشیاء میں ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، رِشوت ستانی، مکر و فریب اور دَغا بازی کے نت نئے حیلے سجھاتی ہے، وہ اپنی تجوری پہلے سے زیادہ بھرنے کے لئے دُوسروں کا خون نچوڑ لینا چاہتا ہے، بالآخر سرمایہ دار اور مزدور کے جھگڑے جنم لیتے ہیں۔

۳- ایسے شخص کو کتنا ہی مال مل جائے لیکن مزید کمانے کی دُھن ایسی سوار ہوتی ہے کہ تفریح اور آرام کے وقت بھی یہی بے چینی اُسے کھائے جاتی ہے کہ کسی طرح اپنے سرمایہ میں زیادہ سے زیادہ اِضافہ کروں، بالآخر جو مال اس کے آرام و راحت کا ذریعہ بنتا وہ اس کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے۔

۴- حق بات خواہ کتنی ہی روشن ہو کر سامنے آجائے، مگر وہ ایسی کسی بات کو ماننے کی ہمت نہیں کرتا، جو اس کی ہوسِ مال سے متصادم ہو، یہ تمام چیزیں بالآخر پورے معاشرہ کا امن و چین برباد کر ڈالتی ہیں۔

غور کیا جائے تو قریب قریب یہی حال حبِ جاہ کا نظر آئے گا کہ اس کے نتیجہ میں تکبر، خود غرضی، حقوق کی پامالی، ہوسِ اقتدار اور اس کے لئے خوں ریز لڑائیاں، اور اسی طرح کی بے شمار اِنسانیت سوز خرابیاں جنم لیتی ہیں، جو بالآخر دُنیا کو دوزخ بنا کر چھوڑتی ہیں، ان دونوں بیماریوں کا علاج قرآنِ کریم نے یہ تجویز فرمایا: وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (اور مدد لو صبر اور نماز سے) یعنی صبر اِختیار کرو، یعنی اپنی لذّات و شہوات پر قابو حاصل کرلو، اس سے حبِ مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال کی محبت اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ مال لذّات و شہوات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے، جب ان لذّات و خواہشات کی اندھا دھند پیروی چھوڑنے پر ہمت باندھ لوگے تو شروع میں اگرچہ شاق گزرے گا، لیکن رفتہ رفتہ یہ خواہشات اِعتدال پر آجائیں گی، اور اِعتدال تمہاری عادت بن جائے گا، تو پھر مال کی فراوانی کی ضرورت نہ رہے گی، نہ اُس کی محبت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے۔

اور نماز سے حبِ جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی عاجزی اور پستی ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو ہر وقت اللہ کے سامنے اپنی عاجزی اور پستی کا تصوّر رہنے لگے گا، جس سے تکبر وغرور اور حبِ جاہ گھٹ جائے گی۔

خشوع کی حقیقت

اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ قرآن وسنت میں جہاں خشوع کی ترغیب مذکور ہے اس سے مراد وہ قلبی سکون و اِنکساری ہے جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں طاعت آسان ہو جاتی ہے، کبھی اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ وہ بااَدب، متواضع اور شکستہ قلب نظر آتا ہے، اگر دِل میں خوفِ خدا اور تواضع نہ ہو تو خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی بااَدب اور متواضع نظر آئے وہ خشوع کا حامل نہیں۔

بلکہ آثارِ خشوع کا قصداً اِظہار کرنا بھی پسندیدہ نہیں، حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر جھکائے بیٹھا ہے، فرمایا: سر اُٹھا، خشوع دِل میں ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ کا اِرشاد ہے کہ ''موٹا پہننے، موٹا کھانے اور سر جھکانے کا نام خشوع نہیں، خشوع تو یہ ہے کہ تم حق کے معاملہ میں شریف ورذیل کے ساتھ یکساں سلوک کرو، اور اللہ نے جو تم پر فرض کیا ہے اُسے ادا کرنے میں اللہ کے لئے قلب کو فارغ کرلو۔''

حضرت حسنؒ کا اِرشاد ہے کہ حضرت عمرؓ جب بات کرتے تو سنا کر کرتے تھے، جب چلتے تو تیز چلتے، اور جب مارتے تو زور سے مارتے تھے، حالانکہ بلاشبہ وہ خشوع رکھنے والے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اپنے قصد و اِختیار سے خاشعین کی سی صورت بنانا شیطان اور نفس کا دھوکہ ہے اور مذموم ہے، ہاں اگر بے اِختیار یہ کیفیت ظاہر ہو جائے تو معذور ہے۔ (قرطبی) [1]

فائدہ:- ''خشوع'' کے ساتھ ایک دُوسرا لفظ ''خضوع'' بھی اِستعمال ہوتا ہے، قرآنِ کریم میں بھی بار ہا آیا ہے، یہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنی ہیں، لیکن ''خشوع'' کا لفظ اصل کے اِعتبار سے آواز اور نگاہ کی پستی اور تذلل کے لئے بولا جاتا ہے، جبکہ وہ مصنوعی نہ ہو بلکہ قلبی خوف اور تواضع کا نتیجہ ہو، قرآنِ کریم میں ہے: وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ (طٰہٰ:۱۰۸) (آوازیں پست ہوگئیں) اور ''خضوع'' کا لفظ بدن کی تواضع اور اِنکساری کے لئے اِستعمال ہوتا ہے، قرآنِ حکیم میں ہے:-

فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴿۴﴾ (الشعراء) ''پس اُن کی گردنیں اس کے سامنے جھک گئیں۔''

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱ ص:۳۷۴

نماز میں خشوع کی فقہی حیثیت

نماز میں خشوع کی تاکید قرآن وسنت میں بار بار آئی ہے، قرآنِ حکیم کا اِرشاد ہے:-

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾ (طٰہٰ:۱۴) ''اور نماز قائم کر مجھے یاد کرنے کے لئے۔''

اور ظاہر ہے کہ غفلت یاد کرنے کی ضد ہے، جو نماز میں اللہ جل شانہٗ سے غافل ہے وہ اللہ کو یاد کرنے کا فریضہ ادا نہیں کر رہا۔

ایک اور آیت میں اِرشاد ہے:-

وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ (الاعراف) ''اور تو غافلوں میں سے نہ ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے: ''نماز تو صرف تمسکن اور تواضع ہی ہے۔'' جس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ جب تمسکن اور تواضع دِل میں نہ ہو تو وہ نماز نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ''جس کی نماز اسے بے حیائی اور برائیوں سے نہ روک سکے، وہ اللہ سے دُور ہی ہوتا جاتا ہے۔'' اور غافل کی نماز بے حیائی سے اور برائیوں سے نہیں روکتی، معلوم ہوا کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھنے والا اللہ سے دُور ہی ہوتا جاتا ہے۔ [1]

اِمام غزالیؒ نے مذکورہ آیات وروایات اور دُوسرے دلائل پیش کر کے فرمایا ہے کہ ان کا یہ تقاضا ہے کہ خشوع نماز کے لئے شرط ہو، اور نماز کی صحت اُس پر موقوف ہو، پھر فرمایا کہ سفیان ثوریؒ، حسن بصریؒ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا مذہب یہی تھا کہ خشوع کے بغیر نماز اَدا نہیں ہوتی، بلکہ فاسد ہے۔

لیکن اَئمۂ اَربعہ اور جمہور فقہاء نے خشوع کو شرطِ صلوٰۃ قرار نہیں دیا، بلکہ اُسے نماز کی رُوح قرار دینے کے باوجود صرف اتنا شرط کیا ہے کہ تکبیرِ تحریمہ کے وقت قلب کو حاضر کر کے اللہ کے لئے نماز کی نیت کرے، باقی نماز میں اگر خشوع حاصل نہ ہو تو اگرچہ اتنی نماز کا ثواب اُسے نہیں ملے گا جتنے حصے میں خشوع نہیں رہا، لیکن فقہ کی رُو سے وہ تارکِ صلوٰۃ نہیں کہلائے گا اور نہ اُس پر تعزیر وغیرہ کے وہ اَحکام مرتب ہوں گے جو تارکِ صلوٰۃ پر لگتے ہیں۔

اِمام غزالیؒ نے اس کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ فقہاء باطنی اَحوال اور قلبی کیفیات پر حکم نہیں لگاتے، بلکہ وہ تو صرف اَعضائے ظاہرہ کے اعمال پر ظاہری اَحکام بیان کرتے ہیں، یہ بات کہ فلاں عمل کا ثواب آخرت میں ملے گا یا نہیں، یہ فقہ کی حدود سے خارج ہے، تو چونکہ باطنی کیفیات پر حکم لگانا ان کی بحث سے خارج ہے، اور خشوع ایک باطنی کیفیت ہے، اس لئے

[1] یہ سب احادیث اِمام غزالیؒ کی ''اِحیاء العلوم'' سے مأخوذ ہیں۔ ۱۲ رف

انہوں نے خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہیں دیا، بلکہ خشوع کے ادنیٰ مرتبہ کو شرط کہا، اور وہ یہ کہ کم از کم تکبیرِ تحریمہ کے وقت محض اللہ کی عبادت و تعظیم کی نیت کرلے۔

خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہ دینے کی دُوسری وجہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی دُوسری آیات میں تشریعِ اَحکام کا یہ واضح اُصول بتادیا گیا ہے کہ اِنسانوں پر کوئی ایسی چیز فرض نہیں کی جاتی جو ان کی طاقت و اِمکان سے باہر ہو، اور پوری نماز میں خشوع برقرار رکھنے سے ماسوا چند خاص اَفراد کے اکثر لوگ عاجز ہوتے ہیں، اس لئے تکلیف مالایطاق سے بچنے کے لئے پوری نماز کی بجائے صرف اِبتدائے صلوٰۃ میں خشوع کو شرط قرار دے دیا گیا۔

نماز خشوع کے بغیر بھی بالکل بے فائدہ نہیں

اِمام غزالیؒ آخر میں اِرشاد فرماتے ہیں کہ خشوع کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود ہمیں اللہ سے یہی اُمید ہے کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھنے والا بھی بالکلیہ تارکِ صلوٰۃ کے درجہ میں نہیں، کیونکہ بہرحال اُس نے ادائے فرض کا اِقدام تو کیا ہے، اور تھوڑی سی دیر کے لئے قلب کو اللہ کے لئے فارغ بھی کیا کہ کم از کم نیت کے وقت تو صرف اللہ ہی کا دھیان تھا، ایسی نماز کا کم سے کم فائدہ یہ ضرور ہے کہ اس کا نام نافرمانوں اور بے نمازوں کی فہرست سے نکل گیا۔

مگر دُوسری حیثیت سے یہ خوف بھی ہے کہ کہیں غافل کی حالت تارک سے بھی زیادہ بری نہ ہو، کیونکہ جو غلام آقا کی خدمت میں حاضر ہوکر آقا سے بے توجہی برتتا اور تحقیر آمیز لہجے میں کلام کرتا ہے اس کی حالت اُس غلام سے زیادہ شدید ہے جو خدمت میں حاضر ہی نہیں ہوتا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ معاملہ بیم و رجاء کا ہے، عذاب کا خوف بھی ہے اور بخشش کی اُمید بھی، اس لئے غفلت و تساہل کو چھوڑنے کے لئے اپنی مقدور بھر کوشش کرتے رہنا چاہئے، وَمَا تَوْفِيْقُنَآ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ

اے بنی اِسرائیل! یاد کرو میرے اِحسان جو میں نے تم پر کئے اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا

تمام عالم پر۔ اور ڈرو اُس دِن سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی

وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور قبول نہ ہو اس کی طرف سے سفارش اور نہ لیا جائے اس کی طرف سے بدلہ اور نہ اُن کو مدد پہنچے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی، اور یہ بات (یاد کرو) کہ میں نے تم کو سارے جہانوں پر فضیلت دی تھی ﴿۴۷﴾ اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص بھی کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا، نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی، نہ کسی سے کسی قسم کا فدیہ لیا جائے گا، اور نہ ان کو کوئی مدد پہنچے گی ﴿۴۸﴾

خلاصۂ تفسیر

اے اولاد یعقوب (علیہ السلام) کی! تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو (تاکہ شکر اور اِطاعت کی تحریک ہو) جو میں نے تم کو اِنعام میں دی تھی، اور اس (بات) کو (یاد کرو) کہ میں نے تم کو (خاص خاص برتاؤ میں) تمام دُنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی، (اور ایک ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "میں نے تم کو ایک بڑے حصۂ مخلوق پر فوقیت دی تھی" مثلاً اس زمانے کے لوگوں پر)۔

فائدہ:- اس آیت میں خطاب چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو ہے اور عموماً ایسا ہوتا ہے کہ باپ دادا پر جو اِحسان و اِکرام کیا جائے اس سے اس کی اولاد بھی فائدہ حاصل کرتی ہے، جس کا عام طور پر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے ان کو بھی اس آیت میں مخاطب سمجھا جاسکتا ہے۔

اور ڈرو تم ایسے دِن سے کہ (جس میں) نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کرسکتا ہے، اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوسکتی ہے (جبکہ خود اس شخص میں اِیمان نہ ہو جس کی سفارش کرتا ہے) اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جاسکتا ہے، اور نہ اُن لوگوں کی طرف داری چل سکے گی۔

فائدہ:- آیت میں جس یوم کا ذِکر ہے اس سے قیامت کا دِن مراد ہے، مطالبہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کے ذمہ نماز روزے کا مطالبہ ہو، اور دُوسرا کہے کہ میرا نماز روزہ لے کر اس کا حساب بے باق کردیا جائے، اور معاوضہ یہ کہ کچھ مال وغیرہ داخل کرکے بچالاوے، سو دونوں باتیں نہ ہوں گی، اور بدون اِیمان کے سفارش قبول نہ ہونے کو جو فرمایا ہے تو اور آیتوں سے معلوم ہوا کہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایسوں کی خود سفارش ہی نہ ہوگی، جو قبول کی گنجائش ہو، اور

طرف داری کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی زوردار حمایت کر کے زبردستی نکال لاوے۔

غرض دُنیا میں مدد کرنے کے جتنے طریقے ہوتے ہیں بدون ایمان کے کوئی طریقہ بھی نہ ہوگا۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ

اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ رہائی دی ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے جو کرتے تھے تم کو بڑا عذاب، ذبح کرتے تھے

اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۴۹

تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رَبّ کی طرف سے بڑی۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی جو تمہیں بڑا عذاب دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے۔ اور اس ساری صورتِ حال میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا بڑا اِمتحان تھا ۴۹

خلاصۂ تفسیر

اُوپر جن خاص برتاؤوں کا حوالہ دیا ہے اب یہاں سے اُن کی تفصیل بیان کرنی شروع کی، پہلا معاملہ تو یہ ہے کہ: اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ رہائی دی ہم نے تم (لوگوں کے آباء واَجداد) کو متعلقینِ فرعون سے جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری دِل آزاری کے، گلے کاٹتے تھے تمہاری اولاد (ذُکور) کے اور زِندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو (لڑکیوں کو کہ زندہ رہ کر بڑی عورتیں ہوجائیں) اور اس (واقعہ) میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا ایک بڑا بھاری اِمتحان تھا۔

فائدہ:- کسی نے فرعون سے پیشین گوئی کردی تھی کہ بنی اِسرائیل میں ایک لڑکا ایسا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری سلطنت جاتی رہے گی، اس لئے اس نے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنا شروع کردیا، اور چونکہ لڑکیوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا اس لئے اُن سے کوئی تعرض نہیں کیا، دُوسرے اس میں اس کا اپنا ایک مطلب بھی تھا کہ اُن عورتوں سے ماما گری اور خدمت گاری کا کام لیتا تھا، سو یہ عنایت بھی اپنے مطلب کے لئے تھی۔

اور اس واقعہ سے یا تو یہ ذبح وقتلِ مذکور مراد ہے، اور مصیبت میں صبر کا اِمتحان ہوتا ہے، اور یا رہائی دینا مراد ہے جو

کہ ایک نعمت ہے، اور نعمت میں شکر کا اِمتحان ہوتا ہے، اور اس نجات دینے کی تفصیل آگے بیان فرمائی۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ

اور جب پھاڑ دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو پھر بچا دیا ہم نے تم کو اور ڈبو دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم

تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ

دیکھ رہے تھے۔ اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم نے بنالیا بچھڑا

مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

موسیٰ کے بعد اور تم ظالم تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (یاد کرو) جب ہم نے تمہاری خاطر سمندر کو پھاڑ ڈالا تھا، چنانچہ تم سب کو بچالیا تھا اور فرعون کے لوگوں کو (سمندر میں) غرق کرڈالا تھا، اور تم یہ سارا نظارہ دیکھ رہے تھے ﴿۵۰﴾ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا تھا، پھر تم نے ان کے پیچھے (اپنی جانوں پر) ظلم کرکے بچھڑے کو معبود بنالیا ﴿۵۱﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ شق کردیا ہم نے تمہارے (رستہ دینے کی) وجہ سے دریائے شور کو پھر ہم نے (ڈوبنے سے) بچالیا تم کو اور غرق کردیا متعلقین فرعون کو (مع فرعون کے) اور تم (اس کا) معائنہ کررہے تھے۔

فائدہ:- یہ قصہ اس وقت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو کر پیغمبر ہوگئے، اور مدتوں فرعون کو سمجھاتے رہے، جب وہ کسی طرح نہ مانا تو حکم ہوا کہ بنی اِسرائیل کو خفیہ طور پر لے کر یہاں سے چلے جاؤ، راستہ میں دریا حائل ہوا، اور اسی وقت پیچھے سے فرعون بھی مع لشکر آپہنچا، حق تعالیٰ کے حکم سے دریا شق ہوگیا اور بنی اِسرائیل کو گزرنے کا راستہ مل گیا، یہ تو پار ہوگئے، فرعون کے پہنچنے تک دریا اسی طرح رہا، وہ بھی تعاقب کی غرض سے اس میں گھس گیا، اس وقت سب طرف سے دریا سمٹ کر اپنی سابق حالت پر ہوگیا، اور فرعون اور اس کے ساتھی سب وہاں ہی غرق ہو کر ختم ہوگئے۔

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے (توریت دینے کا ایک مدّت گزرنے پر جس میں دس رات کا اِضافہ ہوکر) چالیس رات کا (زمانہ ہوگیا تھا) پھر تم لوگوں نے (پرستش کے لئے) تجویز کرلیا گوسالہ کو موسیٰ (علیہ السلام) کے (جانے کے) بعد اور تم نے (اس تجویز میں صریح) ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی (کہ ایسی بے جا بات کے قائل ہوگئے تھے)۔

فائدہ:- یہ قصہ اس وقت ہوا جب فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اِسرائیل بقول بعض، مصر میں واپس آکر رہنے لگے، یا بقول بعض کسی اور مقام پر ٹھہر گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے بنی اِسرائیل نے عرض کیا کہ اب ہم بالکل مطمئن ہوگئے، اگر کوئی شریعت ہمارے لئے مقرّر ہو تو اس کو اَپنا دستور العمل بنائیں، موسیٰ علیہ السلام کی عرض پر حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ تم کوہِ طور پر آکر ایک مہینہ ہماری عبادت میں مشغول رہو، ایک کتاب تم کو دیں گے، آپ نے ایسا ہی کیا، اور توراۃ آپ کو مل گئی، مگر دس روز مزید عبادت میں مشغول رہنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ روزہ رکھنے کے بعد اِفطار فرمالیا تھا، اللہ تعالیٰ کو روزہ دار کے منہ کا رائحہ (جو خلوئے معدہ کی تبخیر سے پیدا ہوجاتا ہے) پسند ہے، اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ دس روزے اور رکھیں تاکہ وہ رائحہ پھر پیدا ہوجائے، اس طرح یہ چالیس روزے پورے ہوگئے، موسیٰ علیہ السلام تو یہاں رہے اور وہاں ایک شخص "سامری" نامی تھا، اس نے چاندی یا سونے کا ایک بچھڑے کا قالب بناکر اس کے اندر وہ مٹی جو اس نے جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے اُٹھا کر اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھی ڈال دی، اُس بچھڑے میں جان پڑگئی، اور جہلائے بنی اِسرائیل نے اس کی پرستش شروع کردی۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر معاف کیا ہم نے تم کو اس پر بھی تاکہ تم اِحسان مانو۔

آسان ترجمۂ قرآن

پھر اس سب کے بعد بھی ہم نے تم کو معاف کردیا تاکہ تم شکر ادا کرو ﴿۵۲﴾

خلاصۂ تفسیر

پھر بھی ہم نے (تمہاری توبہ کرنے پر) درگزر کیا، تم سے اتنی بڑی بات ہوئے پیچھے اس توقع پر کہ تم اِحسان مانوگے۔

فائدہ:- اس توبہ کا بیان آگے تیسری آیت میں مذکور ہے، اللہ تعالیٰ کے اس توقع رکھنے کا مطلب نعوذ باللہ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کو شک تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ درگزر کرنا ایسی چیز ہے کہ دیکھنے والوں کو شکرگزاری کی توقع کا گمان ہوسکتا ہے۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو ناحق سے جدا کرنے والے اَحکام تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ

آسان ترجمۂ قرآن

اور (یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اور حق و باطل میں تمیز کا معیار (بخشا) تاکہ تم راہِ راست پر آؤ ﴿۵۳﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (توریت) دی، اور فیصلہ کی چیز، اس توقع پر کہ تم راہ چلتے رہو۔

فائدہ:- فیصلہ کی چیز یا تو اُن اَحکام شرعیہ کو کہا جو توریت میں لکھے ہیں، (کیونکہ) شرع سے تمام تر اعتقادی اور عملی اختلافات کا فیصلہ ہوجاتا ہے، یا معجزوں کو کہا کہ ان سے سچے، جھوٹے دعوے کا فیصلہ ہوتا ہے، یا خود توریت ہی کو کہہ دیا کہ اس میں کتاب ہونے کی صفت بھی ہے اور فیصل ہونے کی صفت بھی۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے: اے قوم! تم نے نقصان کیا اپنا یہ بچھڑا بناکر

فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۭ

سو اَب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک،

فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾

پھر متوجہ ہوا تم پر، بے شک وہی ہے معاف کرنے والا نہایت مہربان۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ: "اے میری قوم! حقیقت میں تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر خود اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، لہٰذا اب اپنے خالق سے توبہ کرو، اور اپنے آپ کو قتل کرو۔ تمہارے خالق کے نزدیک یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔" اس طرح اللہ نے تمہاری توبہ قبول کرلی۔ بیشک وہی ہے جو اِتنا معاف کرنے والا، اِتنا رحم کرنے والا ہے ﴿٥٤﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم! بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اس گوسالہ (پرستی) کی تجویز سے، سو تم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو، پھر بعض آدمی (جنہوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی) بعض آدمیوں کو (جنہوں نے گوسالہ پرستی کی) قتل کرو، یہ (عمل درآمد) تمہارے لئے بہتر ہوگا تمہارے خالق کے نزدیک، پھر (اُس عمل درآمد کرنے سے) حق تعالیٰ تمہارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے، بے شک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کرلیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔

فائدہ: - یہ اُس طریق کا بیان ہے جو اُن کی توبہ کے لئے تجویز ہوا، یعنی مجرم لوگ قتل کئے جائیں، جیسا ہماری شریعت میں بھی بعض گناہوں کی سزا باوجود توبہ کے بھی قتل وجان ستانی مقرّر ہے، مثلاً قتلِ عمد کے عوض قتل اور ثبوت زِنا بالشّہادۃ پر رَجم، کہ توبہ سے یہ سزا ساقط نہیں ہوتی، چنانچہ ان لوگوں نے اس پر عمل کیا، جس کی وجہ سے آخرت میں موردِ رحمت وعنایت ہوگئے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ

اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز یقین نہ کریں گے تیرا جب تک کہ نہ دیکھ لیں اللہ کو سامنے، پھر آلیا تم کو

الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

بجلی نے اور تم دیکھ رہے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب تم نے کہا تھا: ''اے موسیٰ! ہم اُس وقت تک ہرگز تمہارا یقین نہیں کریں گے جب تک اللہ کو ہم خود کھلی آنکھوں نہ دیکھ لیں'' نتیجہ یہ ہوا کہ کڑکے نے تمہیں اس طرح آ پکڑا کہ تم دیکھتے رہ گئے ﴿۵۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ! ہم تمہارے کہنے سے ہرگز نہ مانیں گے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے) یہاں تک کہ ہم (خود) اللہ تعالیٰ کو علانیہ طور پر دیکھ لیں، سو (اس گستاخی پر) تم پر کڑک بجلی کی آپڑی، اور تم (اس بجلی کا آنا) آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

فائدہ:- اس کا قصہ اس طرح ہوا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور سے توریت لا کر پیش کی، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، تو بعض گستاخ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ خود ہم سے کہہ دے کہ یہ ہماری کتاب ہے تو بے شک ہم کو یقین آجائے گا، موسیٰ علیہ السلام نے باذنِ الٰہی فرمایا کہ کوہِ طور پر چلو، یہ بات بھی ہو جائے گی، بنی اسرائیل نے اس کام کے لئے ستر آدمی منتخب کر کے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر روانہ کئے، وہاں پہنچنے پر اللہ تعالیٰ کا کلام اُن لوگوں نے خود سنا، تو اُس وقت اور رنگ لائے کہ ہم کو تو کلام سننے سے قناعت نہیں ہوتی، خدا جانے کون بول رہا ہوگا، اگر خدا کو دیکھ لیں تو بے شک مان لیں۔ چونکہ دُنیا میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی قوت نہیں رکھتا، اس لئے اس گستاخی پر اُن پر بجلی آپڑی، اور سب ہلاک ہوگئے (ہلاکت کے متعلق اگلی آیت میں بیان ہے)۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

پھر اُٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو مر گئے پیچھے تاکہ تم احسان مانو۔

آسان ترجمۂ قرآن

پھر ہم نے تمہیں تمہارے مرنے کے بعد دوسری زندگی دی تا کہ تم شکر گذار بنو۔ ﴿۵۶﴾

خلاصۂ تفسیر

پھر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے) تم کو زِندہ کر اُٹھایا تمہارے مرجانے کے بعد اس توقع پر کہ تم اِحسان مانو گے۔

فائدہ:- ''موت'' کے لفظ سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس بجلی سے مرگئے تھے، اُن کے دوبارہ زندہ کئے جانے کا قصہ یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ بنی اِسرائیل یوں ہی بدگمان رہتے ہیں، اب وہ یہ دیکھیں گے کہ میں نے اُن کو کہیں لے جا کر کسی تدبیر سے ان کا کام تمام کرادیا ہوگا، مجھ کو اس تہمت سے محفوظ رکھئے، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُن کو پھر زندہ کر دیا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۖ كُلُوْا

اور سایہ کیا ہم نے تم پر اَبر کا اور اُتارا تم پر من اور سلویٰ، کھاؤ

مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دِیں، اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہم نے تم کو بادل کا سایہ عطا کیا، اور تم پر من وسلویٰ نازل کیا (اور کہا کہ:) ''جو پاکیزہ رزق ہم نے تمہیں بخشا ہے (شوق سے) کھاؤ۔'' اور (یہ نافرمانیاں کرکے) انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ہی ظلم کرتے رہے ﴿۵۷﴾

خلاصۂ تفسیر

اور سایہ فگن کیا ہم نے تم پر اَبر کو (میدانِ تیہ میں) اور (خزانۂ غیب سے) پہنچایا ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور بٹیرین (اور تم کو اِجازت دی کہ) کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں (مگر وہ لوگ اس میں بھی خلاف بات کر بیٹھے) اور (اس سے) انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

فائدہ:- دونوں قصے وادئ تیہ میں واقع ہوئے، وادئ تیہ کی حقیقت یہ ہے کہ بنی اِسرائیل کا اصلی وطن ملکِ شام ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت میں مصر آئے تھے، اور یہاں ہی رہ پڑے، اور ملکِ شام میں عمالقہ نامی قوم کا تسلط ہوگیا، فرعون جب غرق ہوگیا اور یہ لوگ مطمئن ہوگئے، تو اللہ تعالیٰ کا ان کو حکم ہوا کہ عمالقہ سے جہاد کرو، اور اپنی اصلی جگہ کو اُن کے قبضے سے چھڑالو۔ بنی اِسرائیل اس اِرادہ پر مصر سے چلے، اور اُن کی حدود میں پہنچ کر جب عمالقہ کے زور وقوت کا حال معلوم ہوا تو ہمت ہار بیٹھے اور جہاد سے صاف اِنکار کردیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس اِنکار کی یہ سزا دی کہ چالیس برس تک ایک میدان میں سرگرداں و پریشاں پھرتے رہے گھر پہنچنا بھی نصیب نہ ہوا۔

یہ میدان کچھ بہت بڑا رقبہ نہ تھا، بلکہ مصر اور شام کے درمیان پانچ چھ کوس یعنی تقریباً دس میل کا رَقبہ تھا، روایت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے وطن مصر جانے کے لئے دن بھر سفر کرتے، اور رَات کو کسی منزل پر اُترتے، صبح کو دیکھتے کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں، اسی طرح چالیس سال سرگرداں و پریشاں اس میدان میں پھرتے رہے، اسی لئے اس میدان کو "وادئ تیہ" کہا جاتا ہے، "تیہ" کے معنی ہیں سرگردانی اور پریشانی کے۔

یہ وادئ تیہ ایک کھلا میدان تھا، نہ اس میں کوئی عمارت تھی نہ درخت، جس کے نیچے دُھوپ اور سردی گرمی سے بچا جاسکے، اور نہ یہاں ں کوئی کھانے پینے کا سامان تھا، نہ پہننے کے لئے لباس، مگر اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے اسی میدان میں اُن کی تمام ضروریات کا اِنتظام فرمادیا، بنی اِسرائیل نے دُھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے سفید رقیق اَبر کا سایہ کردیا، اور بھوک کا تقاضا ہوا تو من وسلویٰ نازل فرمادیا، یعنی درختوں پر ترنجبین جو ایک شیریں چیز ہے بکثرت پیدا کردی، یہ لوگ اس کو جمع کرلیتے، اسی کو "من" کہا گیا ہے، اور بٹیریں اُن کے پاس جمع ہوجاتیں، اُن سے بھاگتی نہ تھیں، یہ اُن کو پکڑ لیتے اور ذبح کرکے کھاتے، اسی کو "سلویٰ" کہا گیا ہے، یہ لوگ دونوں لطیف چیزوں سے پیٹ بھرلیتے، چونکہ ترنجبین کی کثرت معمول سے زائد تھی، اور بٹیروں کا وحشت نہ کرنا یہ بھی معمول کے خلاف ہے، لہٰذا اس حیثیت سے دونوں چیزیں خزانۂ غیب سے قرار دِی گئیں، اُن کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو موسیٰ علیہ السلام کو ایک پتھر پر لاٹھی مارنے کا حکم دیا گیا، اس پتھر سے چشمے پھوٹ پڑے، جیسا کہ دُوسری آیاتِ قرآنی میں مذکور ہے، ان

لوگوں نے رات کی اندھیری کا شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایک روشنی عمودی شکل میں ان کے محلّہ کے درمیان قائم فرمادی، کپڑے میلے ہوئے اور پھٹنے لگے اور لباس کی ضرورت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے بطورِ اعجاز یہ صورت کردی کہ اُن کے کپڑے نہ میلے ہوں نہ پھٹیں، اور بچوں کے بدن پر جو کپڑے ہیں وہ ان کے بدن کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اسی مقدار سے بڑھتے رہیں۔ (تفسیر قرطبی) [1]

اور اُن لوگوں کو یہ بھی حکم ہوا تھا کہ بقدرِ خرچ لے لیا کریں، آئندہ کے لئے جمع کر کے نہ رکھیں، مگر ان لوگوں نے حرص کے مارے اس میں بھی خلاف کیا، تو رکھا ہوا گوشت سڑنا شروع ہوگیا، اسی کو فرمایا ہے کہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا

اور جب ہم نے کہا داخل ہو اس شہر میں اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو فراغت سے اور داخل ہو

الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہتے جاؤ: بخش دے، تو معاف کردیں گے ہم تمہارے قصور اور زیادہ بھی دیں گے نیکی والوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے کہا تھا کہ: ''اِس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اِس میں جہاں سے چاہو جی بھر کر کھاؤ، اور (بستی کے) دروازے میں جھکے سروں کے ساتھ داخل ہونا، اور یہ کہتے جانا کہ (یا اللہ!) ہم آپ کی بخشش کے طلب گار ہیں، (اس طرح) ہم تمہاری خطائیں معاف کردیں گے، اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ (ثواب) بھی دیں گے۔'' ﴿۵۸﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو پھر کھاؤ اس (کی چیزوں میں) سے جس جگہ تم رغبت کرو بے تکلفی سے، اور (یہ بھی حکم دیا کہ جب اندر جانے لگو تو) دروازے میں داخل ہونا (عاجزی سے) جھکے جھکے اور (زبان سے یہ) کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) ہم معاف کردیں گے تمہاری (پچھلی) خطائیں (تو سب کی)

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۱ ص:۴۰۵، ۴۰۶

اور مزید برآں اور دیں گے دِل سے نیک کام کرنے والوں کو۔

فائدہ:- بقول شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قصہ بھی زمانہ وادیٔ تیہ کا ہے، کہ جب مَن وسلویٰ کھاتے کھاتے اُکتا گئے اور اپنے معمولی کھانے کی درخواست کی (جیسا کہ آگے کی چوتھی آیت میں آرہا ہے) تو ان کو ایک شہر میں جانے کا حکم ہوا تھا کہ وہاں کھانے پینے کی اور معمولی چیزیں ملیں گی، سو یہ حکم اس شہر کے اندر جانے کے متعلق ہے، اس میں قولی اور فعلی ادب داخل ہونے کے متعلق بیان کیا گیا، اور اندر جا کر کھانے پینے میں توسیع کی گئی، اس قول پر بہت سے بہت یہ کہا جا سکے گا کہ قصہ کے بیان میں تقدم وتأخر ہوگیا، کہ بعد کا قصہ پہلے بیان ہوا اور پہلے کا بعد میں، تو یہ اِشکال اُس وقت ہوتا جب قرآن مجید میں خود قصوں کا بیان کرنا مقصودِ اَصلی ہوتا، اور جب نظر نتائج پر ہے تو اگر ایک قصہ کے اَجزاء میں ہر جزو کا نتیجہ جدا ہو، اور اُن نتائج کے کسی اثر کا لحاظ کر کے جزوِ مقدم کو مؤخر، اور جزوِ مؤخر کو مقدم کر دیا جائے تو اس میں نہ کوئی مضائقہ ہے اور نہ کوئی اِشکال۔

دیگر مفسرین حضرات نے اس حکم کو اس شہر سے متعلق سمجھا ہے جس پر جہاد کرنے کا حکم ہوا تھا، اور بعد مدّت تیہ کے پھر اس پر جہاد ہوا، اور وہ فتح ہوا، اس وقت یوشع علیہ السلام نبی تھے، یہ حکم ان کی معرفت اس شہر کے بارے میں ہوا تھا۔

قولِ اوّل کی بنا پر پچھلی خطاؤں میں وہ درخواست بھی داخل کر لینا مناسب ہے جو مَن وسلویٰ چھوڑ کر معمولی کھانوں کے متعلق کی گئی تھی، مطلب یہ ہوگا کہ یہ درخواست تھی تو گستاخی، لیکن خیر، اب اگر اس اَدب اور حکم کو بجا لائیں تو اس کو معاف کر دیں گے، اور ہر قول پر یہ معافی تو سب کہنے والوں کے لئے عام ہوگی، اور جو اِخلاص سے اَعمالِ صالحہ کریں گے اُن کا اِنعام اس کے علاوہ ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى

پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاف اس کے کہ جو کہہ دی گئی تھی ان سے پھر اُتارا ہم نے

ع ۶ ۱۳ ۲ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

ظالموں پر عذاب آسمان سے اُن کی عدول حکمی پر۔

آسان ترجمۂ قرآن

مگر ہوا یہ کہ جو بات اُن سے کہی گئی تھی، ظالموں نے اُسے بدل کر ایک اور بات بنالی۔ نتیجہ یہ کہ جو نافرمانیاں وہ

کرتے آرہے تھے ہم نے اُن کی سزا میں اِن ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا ﴿۵۹﴾

خلاصۂ تفسیر

سو بدل ڈالا اُن ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمے کے جس (کے کہنے) کی اُن سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک سماوی آفت اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے۔

فائدہ:- یہ آیت آیتِ سابقہ کا تتمہ ہے، وہ کلمۂ خلاف یہ تھا کہ حِطَّةٌ بمعنی توبہ کی جگہ اَز راہِ تمسخر "حَبَّةٌ فِي شَعِيرَةٍ" (یعنی غلہ درمیان جو کے) کہنا شروع کیا۔ وہ آفتِ سماوی طاعون تھا، جو حدیث کی رُو سے بے حکموں کے لئے عذاب اور حکم برداروں کے لئے رحمت ہے، اس شرارت کی اُن کو یہ سزا ملی کہ ان میں طاعون پھوٹ پڑا اور بہت سے آدمی فنا ہو گئے (بعضوں نے ہلاک شدگان کی تعداد ستر ہزار تک بتائی ہے)۔ (قرطبی) [1]

معارف ومسائل

کلام میں لفظی تغیر وتبدل کا حکمِ شرعی

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں حِطَّةٌ یعنی "توبہ توبہ" کہتے ہوئے داخل ہوں، انہوں نے شرارت سے ان الفاظ کو بدل کر "حِنْطَةٌ" کہنا اختیار کیا، اس کی وجہ سے اُن پر آسمانی عذاب نازل ہوا، یہ الفاظ کی تبدیلی ایسی تھی کہ جس میں صرف الفاظ ہی نہیں بدلے، بلکہ معنی بھی بالکل اُلٹ گئے۔ حِطَّةٌ کے معنی توبہ یعنی گناہوں کو نظر انداز کرنے کے تھے، اور "حِنْطَةٌ" کے معنی گندم کے ہیں، جس کا کلمۂ مامور بہا سے کوئی تعلق نہیں، الفاظ کی ایسی تبدیلی خواہ قرآن میں ہو یا حدیث میں، یا اور کسی اَمرِ الٰہی میں بلاشبہ اور بالاتفاق حرام ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا استہزاء یا تحریف ہے، اسی پر یہ عذاب نازل ہوا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ معنی اور مقصود کو محفوظ رکھتے ہوئے صرف الفاظ کی تبدیلی کا کیا حکم ہے؟ امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ بعض کلمات اور اَقوال میں معنی کی طرح الفاظ بھی مقصود اور اَداءِ عبارت کے لئے ضرورت ہوتے ہیں، ایسے اقوال میں لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں، جیسے اَذان کے الفاظِ مقررہ کے بجائے اسی معنی کے دُوسرے الفاظ پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح نماز میں جو دُعائیں مثلاً سبحانك اللّٰهم، التحیات، دُعائے قنوت یا تسبیحاتِ رُکوع وسجود، جن الفاظ سے منقول ہیں انہی الفاظ میں ادا کرنا ضروری ہے، دُوسرے الفاظ میں اگرچہ معنی وہی محفوظ بھی رہیں مگر تبدیلی جائز

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۱ ص:۴۱۰

نہیں۔اسی طرح تمام قرآنِ کریم کے الفاظ کا یہی حکم ہے، کہ تلاوتِ قرآن سے جو احکام متعلق ہیں وہ صرف انہی الفاظ کے ساتھ ہیں جو قرآنِ کریم کے نازل ہوئے ہیں، اگر کوئی ان الفاظ کا ترجمہ دُوسرے لفظوں میں کرکے پڑھے جس میں معنی بالکل محفوظ رہیں اس کو اِصطلاحِ شریعت میں تلاوتِ قرآن نہ کہا جائے گا، اور نہ اُس پر وہ ثواب حاصل ہوگا جو قرآن پڑھنے پر مقرّر ہے کہ ایک حرف پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، کیونکہ قرآن صرف معنی کا نام نہیں بلکہ معنی اور الفاظ نازل شدہ کے مجموعے کو قرآن کہا جاتا ہے۔

آیتِ مذکورہ میں فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو توبہ کے لئے جو اَلفاظ حِطَّةٌ کے بتلائے گئے تھے، یہ الفاظ بھی مأمور بہ تھے، ان کا بدلنا خود بھی گناہ تھا، پھر تبدیلی ایسی کردی کہ معنی ہی اُلٹ گئے، اس لئے عذابِ آسمانی کے مستحق ہوگئے۔

لیکن جن اقوال اور کلمات میں اصل مقصود معنی ہی ہیں، الفاظ مقصود نہیں، ان میں اگر لفظی تبدیلی ایسی کی جائے کہ معنی پر کوئی اثر نہ پڑے، وہ پوری طرح محفوظ رہیں تو جمہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک یہ تبدیلی جائز ہے، بعض حضراتِ محدثین حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی لفظی تبدیلی کو بھی جائز نہیں کہتے۔قرطبیؒ نے امام مالکؒ، شافعیؒ، اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ سے نقل کیا ہے کہ حدیث میں روایت بالمعنی بھی جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ روایت کرنے والا عربی زبان کا ماہر اور مواقعِ خطاب اور جس ماحول میں حدیث وارِد ہوئی ہے اس سے پوری طرح واقف ہو تاکہ اس کی غلطی سے معنی میں فرق نہ آجائے۔

اور ائمۂ حدیث کی ایک جماعت جس طرح الفاظِ حدیث سنے ہیں اُسی طرح نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کوئی لفظی تغیر وتبدل جائز نہیں رکھتے، محمد بن سیرینؒ، قاسم بن محمدؒ وغیرہ حضرات کا بھی یہی مسلک ہے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض حضرات کا تعامل یہ ہے کہ اگر راویٔ حدیث نے کوئی لفظ نقل کرنے میں کوئی لغوی غلطی بھی کی ہے تو اس سے سننے والے کو اسی غلطی کے ساتھ روایت کرنا چاہئے، اپنی طرف سے تغیر نہ کرے، اس کے ساتھ یہ ظاہر کردے کہ میرے خیال میں صحیح لفظ اس طرح ہے مگر مجھے روایت اس طرح پہنچی ہے۔اِن حضرات کا اِستدلال اس حدیث سے ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ تلقین فرمائی تھی کہ جب سونے کے لئے بستر پر جائے تو یہ دُعا پڑھے: "اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْٓ اَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِيْٓ اَرْسَلْتَ" اس شخص نے "نَبِيِّكَ" کی جگہ "رَسُوْلِكَ" پڑھ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی ہدایت فرمائی کہ لفظ "نَبِيِّكَ" پڑھا کرے، [1] جس سے معلوم ہوا کہ لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے:-

[1] جامع الترمذي، ابواب الدعاء، باب ما جاء في الدعاء إذا آوىٰ إلى فراشه ج:٢ ص:١٧٧

نَضَّرَ اللّٰہُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَبَلَّغَھَا کَمَا سَمِعَھَا۔ [1]

''یعنی اللہ تعالیٰ اُس شخص کو سرسبز وشاداب رکھے جس نے میرا کوئی کلام سنا اور پھر اُمت کو اسی طرح پہنچادیا جس طرح سنا تھا۔''

اس سے بھی ظاہر ہے کہ جن الفاظ سے سنا تھا انہی لفظوں سے پہنچانا مراد ہے۔

مگر جمہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک اگرچہ اَولیٰ اور افضل تو یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے حدیث کی روایت میں ٹھیک وہی الفاظ نقل کرے جو سنے ہیں، اپنے قصد سے اُن میں تبدیلی نہ کرے، لیکن اگر وہ الفاظ پوری طرح یاد نہیں رہے تو ان کا مفہوم اپنے الفاظ میں نقل کر دینا بھی جائز ہے، اور حدیث ''بَلَّغَھَا کَمَا سَمِعَھَا'' کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جو مضمون سنا وہی بعینہٖ نقل کر دے، اس کے مفہوم میں کوئی فرق نہ آوے، الفاظ کی تبدیلی اس کے منافی نہیں، اِمام قرطبیؒ نے اس کی تائید میں فرمایا کہ خود یہی حدیث اس کی دلیل ہے کہ الفاظ کی تبدیلی بضرورت جائز ہے، کیونکہ خود اس حدیث کی روایت ہی ہم تک مختلف الفاظ سے پہنچی ہے۔

اور پہلی حدیث میں جو لفظ ''رسولك'' کے بجائے ''نبیّك'' ہی پڑھنے کا اَمر فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ لفظ ''نبی'' میں صفتِ مدح بہ نسبت ''رسول'' کے زیادہ ہے، کیونکہ ''رسول'' کا لفظ تو قاصد کے معنی میں دُوسروں کے لئے بھی بولا جاتا ہے، بخلاف لفظ ''نبی'' کے کہ وہ خاص اسی منصب کے لئے اِستعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں کو بذریعہ وحی خطاب کرنے کا عطا کیا جاتا ہے۔

اور دُوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دُعاؤں میں الفاظِ منقولہ کا اِتباع خواص وآثار کے اِعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، دُوسرے الفاظ میں وہ خاصیت نہیں رہتی (قرطبی) [2]، اسی لئے عامل حضرات جو تعویذ گنڈے کرتے ہیں وہ اس کی بڑی رعایت کرتے ہیں کہ جو اَلفاظ منقول ہیں ان میں تغیر وتبدل نہ کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اَدعیۂ ماثورہ بھی اسی قسمِ اوّل میں داخل ہیں، جن میں معنی کے ساتھ الفاظِ مخصوصہ کی حفاظت بھی مقصود ہے، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ

اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو ہم نے کہا: مار اپنے عصا کو پتھر پر، سو بہہ نکلے

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب العلم ج:۱ ص:۳۵

[2] تفسیر القرطبی، تحت ھٰذہ الآیات ج:۱ ص:۴۱۰ تا ۴۱۳

مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ ؕ كُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا

اس سے بارہ چشمے، پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ، کھاؤ اور پیو

مِنۡ رِّزۡقِ اللّٰهِ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ۝۶۰

اللہ کی روزی اور نہ پھرو ملک میں فساد مچاتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا: ''اپنی لاٹھی پتھر پر مارو'' چنانچہ اس (پتھر) سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر ایک قبیلے نے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کرلی۔ (ہم نے کہا:) اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو، اور زمین میں فساد مچاتے مت پھرنا ۝۶۰

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے پانی کی دُعا مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) حکم دیا کہ اپنے اس عصا کو فلاں پتھر پر مارو (اس سے پانی نکل آوے گا)، بس (عصا پتھر پر مارنے کی دیر تھی) فوراً اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، (اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ) ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کرلیا (اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو) کھاؤ اور (پینے کو) پیو، اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حد (اعتدال) سے مت نکلو، فساد (وفتنہ) کرتے ہوئے سرزمین میں۔

فائدہ:- یہ قصہ بھی وادیٔ تیہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرتِ خداوندی سے بارہ چشمے نکل پڑے۔ اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو اِنتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے افسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چشمے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد من وسلویٰ اور پینے سے مراد یہی پانی تھا، اور نافرمانی اور ترکِ اَحکام کو فتنہ وفساد سے تعبیر فرمایا۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا اِنکار بہت بڑی غلطی ہے، جب بعض

پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بعید از قیاس اور خلافِ عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ اجزاءِ زمین سے پانی کو جذب کر لے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔ [۱]

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق حاصل کرنا اور فائدہ اُٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظیر بھی محض سطحی نظر والوں کے لئے ہے، ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو بھی کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے اُمور کو محال کہتے ہیں تو واللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

معارف و مسائل

آیتِ مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے اِستسقاء کی دُعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کر دیا کہ پتھر پر لاٹھی مارنے سے چشمے اُبل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ استسقاء کی اصل دُعا ہی ہے، شریعتِ موسویہ میں بھی صرف دُعا پر اِکتفا کیا گیا، جیسا کہ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کا اِرشاد ہے کہ اِستسقاء کی اصل پانی کے لئے دُعا کرنا ہے، یہ دُعا کبھی خاص نمازِ اِستسقاء کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیثِ صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمازِ اِستسقاء کے لئے عیدگاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دُعا کرنا منقول ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دُعا پر اِکتفا کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت سے منقول ہے کہ خطبۂ جمعہ ہی میں آپ نے دُعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔ [۲]

اور یہ بات سب کے نزدیک مُسلّم ہے کہ اِستسقاء خواہ بصورت نماز کیا جائے یا صرف دُعا کی صورت میں، اس کے مؤثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ، اپنے فقر و مسکنت اور عبودیت کا اِظہار ضروری ہے، گناہوں پر اِصرار اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیرِ دُعا کے اِنتظار کا کسی کو حق نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول فرمالیں، ان کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے: اے موسیٰ! ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر، سو دُعا مانگ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے کہ

[۱] تفسیر البیضاوی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۹۷

[۲] صحیح البخاری، ابواب الإستسقاء، باب من اکتفی بصلوٰۃ الجمعۃ ...إلخ ج:۱ ص:۱۳۸، وصحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ الإستسقاء، فصل فی الکفایۃ بالدعاء ...إلخ ج:۱ ص:۲۹۳

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا

نکال دے ہمارے واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور

وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا

اور پیاز، کہا موسیٰ نے: کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو اَدنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو بہتر ہے، اُترو

مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ

کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو، اور ڈالی گئی اُن پر ذِلت اور محتاجی اور پھرے

بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ

اللہ کا غصہ لے کر، یہ اس لئے ہوا کہ نہیں مانتے تھے اَحکامِ خداوندی کو اور خون کرتے تھے

النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾ ع

پیغمبروں کا ناحق، یہ اس لئے کہ نافرمان تھے اور حد پر نہ رہتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (وہ وقت بھی) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم ایک ہی کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، لہٰذا ہماری خاطر اپنے پروردگار سے مانگئے کہ وہ ہمارے لئے کچھ وہ چیزیں پیدا کرے جو زمین اُگایا کرتی ہے، یعنی زمین کی ترکاریاں، اس کی ککڑیاں، اس کا گندم، اس کی دالیں اور اس کی پیاز۔ موسیٰ نے کہا: ”جو (غذا) بہتر تھی کیا تم اُس کو ایسی چیزوں سے بدلنا چاہتے ہو جو گھٹیا درجے کی ہیں؟ (خیر!) ایک شہر میں جا اُترو، تو وہاں تمہیں وہ چیزیں مل جائیں گی جو تم نے مانگی ہیں۔“ اور ان (یہودیوں) پر ذِلت اور بے کسی کا ٹھپہ لگا دیا گیا، اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا اِنکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے تھے۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی، اور وہ بیحد زیادتیاں کرتے تھے ﴿٦١﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے (یعنی من وسلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دُعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اُگا کرتی ہیں، ساگ (ہوا)، ککڑی (ہوئی)، گیہوں (ہوا)، مسور (ہوئی)، پیاز (ہوئی) آپ نے فرمایا: کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو اَدنیٰ درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اَعلیٰ درجہ کی ہے (اچھا اگر نہیں مانتے تو) کسی شہر میں (جاکر) اُترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو اور (ایسی ایسی گستاخیوں سے ایک زمانے میں جاکر نقش کی طرح) جم گئی اُن پر ذِلت (کہ دُوسروں کی نگاہ میں قدر نہ رہی) اور پستی (کہ خود اُن کی طبائع میں اُولوالعزمی نہ رہی) اور مستحق ہوگئے غضبِ اِلٰہی کے (اور) یہ (ذِلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ منکر ہوجاتے تھے اَحکامِ اِلٰہیہ کے اور قتل کردیا کرتے تھے پیغمبروں کا (کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) ناحق (ہوتا تھا) اور (نیز) یہ (ذِلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اِطاعت نہ کی، اور دائرۂ (اِطاعت) سے بھی نکل جاتے تھے۔

فائدہ:- یہ قصہ بھی وادیٔ تیہ کا ہے، من وسلویٰ سے اُکتا کر ان ترکاریوں اور غلوں کی درخواست کی، اس میدان کے داخلِ حدود کوئی شہر آباد تھا، وہاں جاکر رہنے کا حکم ہوا کہ بوؤ، جوتو، کھاؤ کماؤ۔

اور من جملہ ذِلت ومسکنت کے یہ بھی ہے کہ یہودیوں سے سلطنت قربِ قیامت تک کے لئے چھین لی گئی، البتہ بالکل قیامت کے قریب محض لٹیروں کا سا بے ضابطہ تھوڑا زور شورِ دَجال یہودی کا کل چالیس دِن کے لئے ہوجائے گا، اور اس کو کوئی عاقل سلطنت نہیں کہہ سکتا، اور ان کو یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی معرفت جتلادی گئی تھی کہ اگر بے حکمی کروگے تو ہمیشہ دُوسری قوموں کے محکوم رہوگے، جیسا کہ سورۂ اَعراف کی آیت: وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ [1] (الاعراف:١٦٧) میں مذکور ہے، (موجودہ اِسرائیلی حکومت کی حیثیت بھی امریکا اور برطانیہ کے غلام سے زیادہ کچھ نہیں)۔

اور بہت سے پیغمبر مختلف اوقات میں یہودیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، جس کو وہ لوگ بھی دِل میں سمجھتے تھے کہ ہمارا یہ فعل ناحق ہے، لیکن عناد اور ضد نے اندھا بنا رکھا تھا۔

---

[1] ترجمہ:- اور (یاد کرو وہ وقت) جب تمہارے رَبّ نے اعلان کیا کہ وہ ان پر قیامت کے دن تک کوئی نہ کوئی ایسا شخص مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بری بری تکلیفیں پہنچائے گا۔

معارف و مسائل

یہودیوں پر اَبدی ذلت کا مطلب اور اِسرائیل کی موجودہ حکومت سے شبہ اور اس کا جواب

آیاتِ مذکورہ میں یہود کی سزا دُنیا میں دائمی ذِلت و مسکنت اور دُنیا و آخرت میں غضبِ اِلٰہی کو بیان کیا گیا ہے۔

ان کی دائمی ذِلت و مسکنت کا مفہوم جو ائمہ تفسیر صحابہؓ و تابعینؒ سے منقول ہے، اس کا خلاصہ ابنِ کثیرؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ: "لَا یَزَالُوْنَ مُسْتَذِلِّیْنَ، مَنْ وَجَدَهُمْ اِسْتَذَلَّهُمْ وَضَرَبَ عَلَیْهِمُ الصِّغَارَ"، یعنی وہ کتنے ہی مال دار بھی ہو جائیں ہمیشہ تمام اقوام میں ذلیل و حقیر ہی سمجھے جائیں گے، جس کے ہاتھ لگیں گے ان کو ذلیل کرے گا، اور اُن پر غلامی کی علامتیں لگا دے گا۔

اِمامِ تفسیر ضحاک ابن مزاحمؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ان کی ذِلت و مسکنت کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ: "هُمْ اَهْلُ الْقَبَالَاتِ یَعْنِی الْجِزْیَةَ" مطلب یہ ہے کہ یہودی ہمیشہ دُوسروں کی غلامی میں رہیں گے، ان کو ٹیکس وغیرہ ادا کرتے رہیں گے، خود اُن کو کوئی قوت و اِقتدار حاصل نہ ہوگا۔

اس مضمون کی ایک آیت سورۂ آلِ عمران میں ایک زیادتی کے ساتھ اس طرح آئی ہے:-

ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (آل عمران:۱۱۲)

"جمادی گئی اُن پر بے قدری جہاں کہیں جائیں گے، مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعہ سے جو اللہ کی طرف سے ہو اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف سے ہو۔"

اللہ تعالیٰ کے ذریعہ کا مطلب تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے قانون میں امن دے دیا ہو، جیسے نابالغ بچے، عورتیں یا ایسے عبادت گزار جو مسلمانوں سے لڑتے نہیں پھرتے، وہ محفوظ و مامون رہیں گے۔ اور آدمیوں کے ذریعہ سے مراد معاہدۂ صلح ہے، جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے معاہدہ صلح کا یا جزیہ دے کر ان کے ملک میں رہنے کا ہو جائے، مگر الفاظِ قرآنی میں "مِنَ النَّاسِ" فرمایا ہے، "مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" نہیں، اس لئے یہ صورت بھی محتمل ہے کہ دُوسرے غیر مسلموں سے معاہدہ صلح کا کر کے اُن کی پشت پناہی میں آجائیں تو مامون رہ سکتے ہیں، پھر یہ اِستثناء "حَبْلٌ مِّنَ اللّٰهِ" اور "حَبْلٌ مِّنَ النَّاسِ" کا اگر بقول کشاف [1] اِستثناء متصل قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہود ہمیشہ ہر جگہ ذلیل

[1] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: کشاف تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۳۱۲

وخوار رہیں گے، بجز اُن دو صورتوں کے کہ یا تو اللہ کے عہد کے ذریعہ ان کے بچے، عورتیں وغیرہ اس ذِلت وخواری سے نکل جائیں، یا معاہدۂ صلح کے ذریعہ یہ اپنے آپ کو ذِلت وخواری سے بچالیں، اور جیسا کہ اُوپر لکھا گیا ہے معاہدۂ صلح کے ذریعہ ذِلت وخواری سے نکلنے کی صورت مسلمانوں سے معاہدۂ صلح کر کے بھی ہوسکتی ہے، اور یہ بھی اِحتمال ہے کہ دُوسری قوموں سے معاہدہ صلح کا کر کے اُن کے سہارے ذِلت وخواری سے محفوظ رہیں۔

یہ سب تقریر اِستثناءِ متصل کی تقدیر پر ہے، اور بہت سے حضراتِ مفسرین نے اس کو اِستثناءِ منقطع قرار دِیا ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ اپنی ذلت اور اپنی قومی حیثیت سے تو ذلیل وخوار ہی رہیں گے، گو قانونِ الٰہی کی وسعت میں آکر ان کے بعض اَفراد اس سے محفوظ ہوجائیں گے، یا دُوسرے لوگوں کا سہارا لے کر ذِلت وخواری پر پردہ ڈال دیں۔

اِس طرح سورۂ بقرہ کی آیت کی وضاحت سورۂ آلِ عمران کی آیت سے پوری ہوگئی، اور اسی سے وہ تمام شبہات بھی دُور ہوگئے جو آج کل فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہونے کی بنا پر بہت سے مسلمانوں کو پیش آتے ہیں کہ قرآن کے قطعی اِرشادات سے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیوں کی حکومت کبھی قائم نہ ہوگی، اور واقعہ یہ پایا جاتا ہے کہ فلسطین میں اُن کی حکومت قائم ہوگئی۔ جواب واضح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی موجودہ حکومت کی حقیقت سے جو لوگ باخبر ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ حکومت درحقیقت اِسرائیل کی نہیں بلکہ امریکا اور برطانیہ کی ایک چھاؤنی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، یہ اپنی ذاتی طاقت سے ایک مہینہ بھی زِندہ نہیں رہ سکتے، یورپین طاقتوں نے اِسلامی بلاک کو کمزور کرنے کے لئے اُن کے بیچ میں اِسرائیل کا نام دے کر ایک چھاؤنی بنائی ہوئی ہے، اور اِسرائیلی اُن کی نظروں میں بھی اُن کے فرمانبردار غلام سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، صرف قرآنِ کریم کے اِرشاد: وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کے سہارے ان کا اپنا وجود قائم ہے، وہ بھی ذِلت کے ساتھ، اس لئے موجودہ اِسرائیلی حکومت سے قرآنِ کریم کے کسی اِرشاد پر اَدنیٰ شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں میں سب سے پہلے یہود ہیں، ان کی شریعت، اُن کی تہذیب سب سے پہلی ہے، اگر پوری دُنیا میں فلسطین کے ایک چھوٹے سے قصبہ پر اُن کا تسلط کسی طرح ہو بھی گیا، تو پوری دُنیا کے نقشہ میں یہ حصہ ایک نقطہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے، اس کے بالمقابل نصاریٰ کی سلطنتیں اور مسلمانوں کے دورِ تنزل کے باوجود ان کی سلطنتیں، بت پرستوں کی سلطنتیں، لامذہبوں کی حکومتیں جو جگہ جگہ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہیں اُن کے مقابلہ میں فلسطین اور وہ بھی آدھا، اور اس پر بھی امریکا، برطانیہ کے زیرِ سایہ کوئی تسلط یہودیوں کا ہوجائے تو کیا اس سے پوری قوم یہود پر خدا تعالیٰ کی طرف سے لگائی ہوئی دائمی ذِلت کا کوئی جواب بن سکتا ہے؟

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین جو اِیمان لایا (ان میں سے) اللہ پر

وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ

اور روزِ قیامت پر اور کام کئے نیک تو اُن کے لئے ہے ان کا ثواب ان کے رَبّ کے پاس، اور نہیں اُن پر کچھ خوف

عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

حق تو یہ ہے کہ جو لوگ بھی، خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہودی یا نصرانی یا صابی، اللہ اور آخرت کے دن پر اِیمان لے آئیں گے اور نیک عمل کریں گے، وہ اپنے پروردگار کے پاس اپنے اجر کے مستحق ہوں گے، اور ان کو نہ کوئی خوف ہوگا، نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوں گے۔ ﴿۶۲﴾

خلاصۂ تفسیر

(اس مقام پر یہودیوں کی شرارت کا حال معلوم کر کے سامعین کو یا خود یہود کو یہ خیال گزر سکتا ہے کہ ان حالات میں اگر عذر پیش کر کے اِیمان لانا بھی چاہیں تو غالباً وہ اللہ کے نزدیک قبول نہ ہو، اس خیال کو دفع کرنے کے لئے اس آیت میں ایک قانون اور ضابطے کا ذِکر فرمایا کہ) یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان، یہودی اور نصاریٰ اور فرقۂ صابئین (ان میں سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ (کی ذات وصفات) پر اور قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے (موافق قانونِ شریعت کے) ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت بھی ہے اُن کے پروردگار کے پاس (پہنچ کر) اور (وہاں جا کر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر، اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

فائدہ:- قانون کا حاصل ظاہر ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں، جو شخص پوری اِطاعت اِعتقاد اور

اعمال میں اختیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو، ہمارے ہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے، اور ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد پوری اِطاعت، اِطاعتِ محمدی یعنی مسلمان ہونے میں منحصر ہے، مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہو جائے گا مستحقِ نجاتِ اُخروی ہوگا، اس میں اس خیال کا جواب ہوگیا، یعنی اِن شرارتوں کے بعد بھی اگر مسلمان ہو جائیں تو ہم سب معاف کر دیں گے۔

اور صابئین ایک فرقہ تھا جس کے معتقدات اور طرزِ عمل کے بارے میں چونکہ کسی کو پورا پتہ نہ چلا اس لئے مختلف اقوال ہیں، واللہ أعلم۔

اور اس قانون میں بظاہر تو مسلمانوں کے ذِکر کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ تو مسلمان ہیں ہی، لیکن اس سے کلام پاک میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہوگئی، اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے کوئی موافق ہو یا مخالف، جو شخص بھی اِطاعت کرے گا موردِ عنایت ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے، سنانا تو اصل میں مخالف کو ہے، لیکن اس میں نکتہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو جو موافقین پر عنایت ہے سو اس کی علت اُن سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان کی صفتِ موافقت پر مدار ہے ہماری عنایت کا، سو اگر مخالف بھی اختیار کرلے تو وہ بھی اس موافق کے برابر ہو جائے گا، اس لئے مخالف کے ساتھ موافق کو بھی ذِکر کر دیا گیا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ

اور جب لیا ہم نے تم سے اِقرار اور بلند کیا تمہارے اُوپر کوہِ طور کو کہ پکڑو جو کتاب ہم نے تم کو دی زور سے

وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾

اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم ڈرو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم سے (تورات پر عمل کرنے کا) عہد لیا تھا، اور کوہِ طور کو تمہارے اُوپر اُٹھا کھڑا کیا تھا (کہ) جو (کتاب) ہم نے تمہیں دی ہے اس کو مضبوطی سے تھامو، اور اس میں جو کچھ (لکھا) ہے اُس کو یاد رکھو، تاکہ تمہیں تقویٰ حاصل ہو ﴿٦٣﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول وقرار لیا (کہ توراۃ پر عمل کریں گے) اور (اس قول وقرار لینے کے لئے) ہم نے طور پہاڑ کو اُٹھا کر تمہارے اُوپر (محاذات میں) معلق کردیا (اور اس وقت کہا) کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی توراۃ) مضبوطی کے ساتھ، اور یاد رکھو جو اَحکام اس (کتاب) میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

فائدہ:- جب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر توریت عطا ہوئی اور آپ نے واپس تشریف لاکر قوم کو وہ دِکھائی اور سنائی تو اس میں اَحکام ذرا سخت تھے، مگر ان لوگوں کی حالت کے مطابق ایسے ہی اَحکام مناسب تھے، تو اَوّل تو انہوں نے یہی کہا تھا کہ جب ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں گے کہ یہ میری کتاب ہے، تب مانیں گے (جس کا قصہ اُوپر گزر چکا ہے)۔ غرض وہ ستر آدمی جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر گئے تھے واپس آکر انہوں نے گواہی دی، مگر اس شہادت میں (اپنی طرف سے) اتنی آمیزش بھی کردی کہ ''اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ فرمادیا تھا کہ تم سے جس قدر عمل ہوسکے کرنا، جو نہ ہوسکے معاف ہے۔'' تو کچھ تو جبلی شرارت، کچھ اَحکام کی مشقت اور کچھ اس آمیزش کا حیلہ ملا، غرض صاف کہہ دیا کہ ہم سے تو اس کتاب پر عمل نہیں ہوسکتا، حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ کوہِ طور کا ایک بڑا ٹکڑا اُٹھا کر اُن کے سروں پر معلق کردو، کہ یا تو مانو ورنہ ابھی گرا، آخر چارناچار ماننا پڑا۔

ایک شبہ کا اِزالہ

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ دِین میں تو اِکراہ نہیں ہے، یہاں کیوں اِکراہ کیا گیا؟

جواب یہ ہے کہ اِکراہ ایمان لانے پر نہیں، بلکہ اوّل اپنی خوشی سے ایمان واسلام قبول کرلینے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی وجہ سے ہے، باغیوں کی سزا تمام حکومتوں میں بھی عام مخالف اور دُشمن قوموں سے الگ ہوتی ہے، اُن کے لئے ہر حکومت میں دو ہی راستے ہوتے ہیں، یا اِطاعت قبول کریں، یا قتل کئے جائیں، اسی وجہ سے اِسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، کفر کی سزا قتل نہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ

پھر تم پھر گئے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی مہربانی

لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٤﴾

تو ضرور تم تباہ ہوتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اس سب کے باوجود تم دوبارہ (راہِ راست سے) پھر گئے۔ چنانچہ اگر اللہ کا فضل اور رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ضرور سخت نقصان اُٹھانے والوں میں شامل ہو جاتے ﴿٦٤﴾

خلاصۂ تفسیر

پھر تم اس قول و قرار کے بعد بھی (اس سے) پھر گئے، سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا (تو اس عہد شکنی کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ) ضرور تم (فوراً) تباہ (اور ہلاک) ہو جاتے، (مگر ہماری عنایت و رحمتِ عامہ ہے کہ حیاتِ مستعار کے ختم ہونے تک مہلت دے رکھی ہے، لیکن کب تک؟ آخر بعد اَز مرگ وبالِ اعمال میں مبتلا ہو گئے)۔

فائدہ:- حق تعالیٰ کی رحمتِ عامہ دُنیا میں مؤمن کافر سب پر ہے، جس کا اَثر عافیت اور دُنیوی راحت ہے، رحمتِ خاصہ کا ظہور آخرت میں ہوگا، جس کا اثر نجات اور قربِ خداوندی ہے۔

بظاہر اس آیت کے جزوِ آخر کے مخاطب وہ یہودی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اِیمان نہ لانا بھی عہد شکنی میں داخل ہے، اس لئے ان کو بھی عہد شکنوں میں شامل کر کے بطور مثال فرمایا گیا کہ اس پر بھی ہم نے تم پر دُنیا میں کوئی عذاب ایسا نازل نہیں کیا جیسا پہلے بے اِیمانوں اور عہد شکنوں پر ہوتا رہا، یہ محض خدا کی رحمت ہے۔

اور چونکہ اب اَز رُوئے اَحادیث ایسے عذابوں کا نہ آنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے، اس لئے بعض مفسرین نے فضل و رحمت کی تفسیر بعثتِ محمدیہ سے کی ہے۔

اس مضمون کی تائید کے لئے گزشتہ بے اِیمانوں کا ایک واقعہ اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے:-

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا

اور تم خوب جان چکے ہو جنہوں نے کہ تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دِن میں تو ہم نے کہا ان سے کہ ہو جاؤ

قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا

بندر ذلیل، پھر کیا ہم نے اس واقعے کو عبرت اُن لوگوں کے لئے جو وہاں تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

اور نصیحت ڈرنے والوں کے واسطے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اورتم اپنے ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو جو سنیچر (سبت) کے معاملے میں حد سے گذر گئے تھے، چنانچہ ہم نے اُن سے کہا تھا کہ تم دُھتکارے ہوئے بندر بن جاؤ ﴿۶۵﴾ پھر ہم نے اِس واقعے کو اُس زمانے کے اور اُس کے بعد کے لوگوں کے لئے عبرت، اور ڈرنے والوں کے لئے نصیحت کا سامان بنا دیا ﴿۶۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور تم جانتے ہی ہو اُن لوگوں کا حال جنہوں نے تم میں سے (حدِ شرع سے) تجاوز کیا تھا در بارہ (اس حکم کے جو) ہفتہ کے دن کے (متعلق تھا کہ اس روز مچھلی کا شکار نہ کریں) سو ہم نے اُن کو (اپنے حکمِ قہری تکوینی سے مسخ کرنے کے لئے) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ (چنانچہ وہ بندروں کے قالب میں مسخ ہو گئے) پھر ہم نے اس کو ایک (واقعہ) عبرت (انگیز) بنا دیا، اُن لوگوں کے لئے بھی جو اس قوم کے معاصر تھے، اور اُن لوگوں کے لئے بھی جو مابعد کے زمانے میں آتے رہے، اور (نیز اس واقعے کو) موجبِ نصیحت (بنایا، خدا سے) ڈرنے والوں کے لئے۔

فائدہ: - یہ واقعہ بھی بنی اِسرائیل کا حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوا، بنی اِسرائیل کے لئے ہفتہ کا دِن معظم اور عبادت کے لئے مقرّر تھا، اور مچھلی کا شکار بھی اس روز ممنوع تھا، یہ لوگ سمندر کے کنارے آباد تھے، اور مچھلی کے شوقین تھے، اُس حکم کو نہ مانا، اور شکار کیا، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسخِ صورت کا عذاب نازل ہوا، تین دن کے بعد وہ سب مر گئے۔

اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے دو قسم کے لوگ تھے، فرمانبردار و نافرمان، تو نافرمانوں کے لئے تو یہ واقعہ

نافرمانی سے توبہ کرانے والا تھا، اس لئے اس کو "نَکَالً" فرمایا، اور فرمانبرداروں کو یہ واقعہ فرمانبرداری پر قائم رکھنے والا تھا اس کو "مَوْعِظَةٌ" فرمایا۔

معارف و مسائل

دینی معاملات میں کوئی ایسا حیلہ جس سے اصل حکمِ شرعی باطل ہو جائے حرام ہے

اس آیت میں یہودیوں کے جس اِعتداء یعنی حدود سے تجاوز کا ذِکر کر کے اس کو سببِ عذاب بتلایا گیا ہے، روایات سے ثابت ہے کہ وہ صاف طور پر حکمِ شرعی کی خلاف ورزی نہ تھی، بلکہ ایسے حیلے تھے جن سے حکمِ شرعی کا ابطال لازم آتا تھا، مثلاً ہفتہ کے دن مچھلی کی دُم میں ایک ڈور کا پھندا لگا کر دریا میں چھوڑ دیا، اور یہ ڈور زمین پر کسی چیز سے باندھ دی، پھر اِتوار کے روز اس کو پکڑ کر کھالیا، تو یہ ایک ایسا حیلہ ہے جس میں حکمِ شرعی کا اِبطال بلکہ ایک قسم کا اِستہزاء ہے، اس لئے ایسا حیلہ کرنے والوں کو بڑا سرکش، نافرمان قرار دے کر اُن پر عذاب آیا۔

مگر اس سے اُن فقہی حیلوں کی حرمت ثابت نہیں ہوتی جن میں سے بعض خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں، مثلاً ایک سیر عمدہ کھجور کے بدلے میں دو سیر خراب کھجور خریدنا سود میں داخل ہے، مگر اس سے بچنے کا ایک حیلہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلایا کہ جنس کا تبادلہ جنس سے نہ کرو، قیمت کے ذریعہ خرید و فروخت کرلو،[1] مثلاً دو سیر خراب کھجوریں دو دِرہم میں فروخت کر دیں، پھر ان دو دِرہموں میں سے ایک سیر عمدہ کھجور خرید لی، تو یہاں حکمِ شرعی کی تعمیل مقصود ہے اِبطال نہ مقصود ہے نہ واقع ہے۔ اسی طرح بعض دُوسرے مسائل میں بھی فقہاء نے حرام سے بچنے کی بعض ایسی ہی تدبیریں بتلائی ہیں، اُن کو یہودیوں کے حیلوں کی طرح کہنا اور سمجھنا غلط ہے۔

واقعہ مسخِ صورتِ یہود

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہود نے اوّل اوّل تو اس طرح کے حیلے کر کے مچھلیاں پکڑیں، پھر ہوتے ہوتے عام طور پر شکار کھیلنے لگے، تو ان میں دو جماعتیں ہوگئیں، ایک جماعت علماء و صلحاء کی تھی، جنہوں نے ان کو ایسا کرنے سے روکا، یہ باز نہ آئے تو اُن سے برادرانہ تعلقات قطع کر کے بالکل الگ ہوگئے، اور بستی کے دو حصے کر لئے، ایک میں یہ نافرمان لوگ رہ گئے، دُوسرے میں علماء و صلحاء رہے، ایک روز اُن کو یہ محسوس ہوا کہ جس حصہ میں یہ نافرمان لوگ رہتے تھے اُدھر بالکل سناٹا ہے، تو وہاں جا کر دیکھا تو سب کے سب بندروں کی صورت میں مسخ ہوگئے تھے، اور حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ اُن کے جوان

[1] مشکوٰۃ، کتاب البیوع، باب المنهی عنها من البیوع ج:۱ ص:۲۴۵

بندر بنادیئے گئے تھے اور بوڑھے خنزیر کی شکل میں منتقل کردیئے گئے تھے، اور مسخ شدہ بندر اپنے رشتہ دار اور تعلق والے انسانوں کو پہچانتے تھے، اُن کے قریب آکر روتے تھے۔ [1]

ممسوخ قوم کی نسل نہیں چلتی

اس معاملہ میں صحیح بات وہ ہے جو خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ صحیح مسلم میں منقول ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے زمانے کے بندروں اور خنزیروں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا یہ وہی مسخ شدہ یہودی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں مسخِ صورت کا عذاب نازل کرتے ہیں تو اُن کی نسل نہیں چلتی (بلکہ چندروز میں ہلاک ہوکر ختم ہوجاتے ہیں)، اور پھر فرمایا کہ بندر اور خنزیر دُنیا میں پہلے سے بھی موجود تھے، [2] (اور آج بھی موجود ہیں، مگر مسخ شدہ بندروں اور خنزیروں سے اُن کا کوئی جوڑ نہیں)۔

اس موقع پر بعض مفسرین نے صحیح بخاری کے حوالہ سے بندروں میں زِنا کی سزا میں سنگساری کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، مگر یہ واقعہ نہ بخاری کے صحیح نسخوں میں موجود ہے، نہ روایۃً صحیح ہے، قرطبیؒ نے اس جگہ اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے: اللہ فرماتا ہے تم کو، ذبح کرو ایک گائے، وہ بولے:

اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾

کیا تو ہم سے ہنسی کرتا ہے؟ کہا: پناہ خدا کی کہ ہوں میں جاہلوں میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ وہ کہنے لگے کہ کیا آپ ہمارا مذاق بناتے ہیں؟ موسیٰ نے کہا: میں اِس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں (ایسے) نادانوں میں شامل ہوں (جو مذاق میں جھوٹ بولیں) ﴿٦٧﴾

---

[1] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۱ ص:۴۴۰

[2] صحیح مسلم، کتاب القدر، باب بیان ان الآجال والأرزاق ...الخ ج:۲ ص:۳۳۸

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ (اگر اس لاش کے قاتل کا پتہ لگانا چاہتے ہو تو) تم ایک بیل ذبح کرو، وہ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخرہ بناتے ہیں (کہاں قاتل کی تحقیق، کہاں جانور کا ذبح کرنا) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: نعوذ باللہ، جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں (کہ اَحکامِ خداوندی میں تمسخر کرنے لگوں)۔

فائدہ:- یہ قصہ اس طرح ہوا کہ بنی اِسرائیل میں ایک خون ہوگیا تھا، جس کی وجہ ''مرقاۃ شرح مشکوٰۃ'' میں یہ لکھی ہے کہ کسی شخص نے مقتول کی کسی لڑکی سے شادی کی درخواست کی تھی، مگر اس نے اِنکار کردیا، اور اس شخص نے اس کو قتل کردیا، قاتل لاپتہ تھا، اس کا پتہ نہ لگتا تھا۔

اور معالم نے کلبیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس وقت تک توریت میں اس کے متعلق کوئی شرعی قانون بھی نازل نہیں ہوا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ نزولِ توریت سے قبل کا ہے۔[1]

غرض بنی اِسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ قاتل کا پتہ چلے، آپ نے بحکمِ خداوندی ایک بیل ذبح کرنے کا حکم فرمایا، انہوں نے حسبِ عادت اور اپنی جبلت کے مطابق اس میں حجتیں نکالنا شروع کیں۔

آیاتِ آئندہ میں اسی کی تفصیل ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ

بولے کہ دُعا کر ہمارے واسطے اپنے ربّ سے کہ بتادے ہم کو کہ وہ گائے کیسی ہو؟ کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے

لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ ۖ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا

نہ بوڑھی اور نہ بن بیاہی درمیان میں ہے بڑھاپے اور جوانی کے، اب کرڈالو جو تم کو حکم ملا ہے۔ بولے کہ

ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ

دُعا کر ہمارے واسطے اپنے ربّ سے کہ بتادے ہم کو کہ کیسا ہے اس کا رنگ؟ کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے زرد

---

[1] تفسیر البغوی ج:۱ ص:۱۰۰

فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا

خوب گہری ہے اس کی زردی، خوش آتی ہے دیکھنے والوں کو۔ بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتادے ہم کو

مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ

کس قسم میں ہے وہ کیونکہ اس گائے میں شبہ پڑا ہے ہم کو اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور راہ پالیں گے۔ کہا:

اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ

وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے محنت کرنے والی نہیں کہ جوتتی ہو زمین کو یا پانی دیتی ہو کھیتی کو،

مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا

بے عیب ہے کوئی داغ اس میں نہیں، بولے: اب لایا تو ٹھیک بات، پھر اس کو ذبح کیا،

وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع

وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کرلیں گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

انہوں نے کہا کہ آپ ہماری خاطر اپنے رب سے درخواست کیجئے کہ ہمیں صاف صاف بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ اس نے کہا: "اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہو کہ نہ بہت بوڑھی ہو نہ بالکل بچی، (بلکہ) ان دونوں کے بیچ بیچ میں ہو۔ بس اب جو حکم تمہیں دیا گیا ہے اس پر عمل کرلو" ﴿۶۸﴾ کہنے لگے: آپ ہماری خاطر اپنے رب سے درخواست کیجئے کہ ہمیں صاف صاف بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ نے کہا: "اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسے تیز زرد رنگ کی گائے ہو جو دیکھنے والوں کا دل خوش کردے" ﴿۶۹﴾ انہوں نے (پھر) کہا کہ آپ ہماری خاطر اپنے رب سے درخواست کیجئے کہ ہمیں صاف صاف بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ اس گائے نے تو ہمیں شبہے میں ڈال دیا ہے۔ اور اللہ نے چاہا تو ہم ضرور اس کا پتہ لگالیں گے ﴿۷۰﴾ موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہو جو کام میں جت کر زمین میں ہل نہ چلاتی ہو، اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو، پوری

طرح صحیح سالم ہو جس میں کوئی داغ نہ ہو۔ انہوں نے کہا: ہاں! اب آپ ٹھیک پتہ لے کر آئے۔ اس کے بعد انہوں نے اُسے ذبح کیا، جبکہ لگتا نہیں تھا کہ وہ کر پائیں گے ﴿۷۱﴾

خلاصۂ تفسیر

وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لئے اپنے رَبّ سے ہم سے بیان کر دیں کہ اس (بیل) کے کیا اوصاف ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ (میری درخواست کے جواب میں) یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو، دونوں عمروں کے اوسط میں، سو اَب (زیادہ حجت مت کی جیو، بلکہ) کر ڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے۔ کہنے لگے کہ (اچھا یہ بھی) درخواست کر دیجئے ہمارے لئے اپنے رَبّ سے ہم سے یہ (بھی) بیان کر دیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ آپ نے فرمایا کہ (اس کے متعلق) حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رَنگ تیز زَرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو۔ کہنے لگے کہ (اب کی بار اور) ہماری خاطر اپنے رَبّ سے دریافت کر دیجئے کہ (اوّل بار کے سوال کا جواب ذرا اور واضح) ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں؟ کیونکہ ہم کو اس بیل میں (قدرے) اِشتباہ (یہ باقی) ہے (کہ وہ معمولی بیل ہوگا یا کوئی اور عجیب وغریب جس میں تحقیقِ قاتل کا خاص اثر ہو) اور ہم ضرور اِن شاء اللہ تعالیٰ (اب کی بار) ٹھیک سمجھ جاویں گے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ (کوئی عجیب وغریب جانور نہیں ہے، یہی معمولی بیل ہے، البتہ عمدہ ہونا چاہئے کہ اوصافِ مذکورہ کے ساتھ) نہ تو ہل میں چلا ہوا ہو، جس سے زمین جوتی جاوے، اور نہ (کنویں میں جوڑا گیا ہو کہ) اُس سے زراعت کی آبپاشی کی جاوے، (غرض ہر قسم کے عیب سے) سالم ہو اور اس میں (کسی طرح کا) کوئی داغ نہ ہو، (یہ سن کر) کہنے لگے کہ (ہاں) اب آپ نے پوری (اور صاف) بات فرمائی، (القصہ جانور تلاش کر کے خریدا) پھر اس کو ذبح کر دیا، حالانکہ بظاہر کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔

فائدہ:- حدیث شریف میں ہے کہ اگر وہ یہ حجتیں نہ کرتے تو اتنی قیدیں اُن کے ذمہ نہ ہوتیں، جو بھی بقرہ ذبح کر دیا جاتا کافی ہو جاتا۔[۱]

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ ج

اور جب مار ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر لگے ایک دُوسرے پر دَھرنے اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم چھپاتے تھے۔

---

[۱] رُوح المعانی تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۳۵۹، ومجمع الزوائد (بألفاظ مختلفة) رقم الحدیث:۱۰۸۳۴

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ

پھر ہم نے کہا: مارو اس مردے پر اس گائے کا ایک ٹکڑا، اسی طرح زندہ کرے گا اللہ مردوں کو اور دِکھاتا ہے تم کو اپنی قدرت کے نمونے

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

تا کہ تم غور کرو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (یاد کرو) جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، اور اُس کے بعد اُس کا اِلزام ایک دوسرے پر ڈال رہے تھے، اور اللہ کو وہ راز نکال باہر کرنا تھا جو تم چھپائے ہوئے تھے ﴿۷۲﴾ چنانچہ ہم نے کہا کہ اس (مقتول) کو اس (گائے) کے ایک حصے سے مارو۔ اِسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے، اور تمہیں (اپنی قدرت کی) نشانیاں دِکھاتا ہے تا کہ تم سمجھ سکو ﴿۷۳﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں (میں سے کسی) نے ایک آدمی کا خون کر دیا، پھر (اپنی براءت کے لئے) ایک دُوسرے پر ڈالنے لگے، اور اللہ تعالیٰ کو اس اَمر کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم (میں کے مجرم ومشتبہ لوگ) مخفی رکھنا چاہتے تھے، اس لئے (ذبح بقرہ کے بعد) ہم نے حکم دیا کہ اس (مقتول کی لاش) کو اس (بقرہ) کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوادو (چنانچہ چھوانے سے وہ زندہ ہوگیا، آگے اللہ تعالیٰ بمقابلۂ منکرینِ قیامت کے اس قصے سے اِستدلال اور نظیر کے طور پر فرماتے ہیں کہ) اسی طرح حق تعالیٰ (قیامت میں) مردوں کو زِندہ کردیں گے، اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائرِ (قدرت) تم کو دِکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو (اور ایک نظیر سے دُوسری نظیر کے اِنکار سے باز آؤ)۔

فائدہ:- جب اس مردہ کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا تو وہ زِندہ ہوگیا، اس نے قاتل کا نام بتایا اور پھر فوراً ہی مر گیا۔

اس جگہ صرف مقتول کا بیان اس لئے کافی سمجھا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہوگیا تھا کہ یہ مقتول سچ بولے گا، ورنہ صرف مقتول کے بیان سے بغیر شرعی شہادت کے کسی پر قتل کا ثبوت کافی نہیں ہوتا۔

یہاں یہ شبہ کرنا بھی دُرست نہیں کہ حق تعالیٰ کو تو مردہ زندہ کرنے کی ویسی ہی قدرت تھی، یا مقتول کو زندہ کئے بغیر قاتل کا نام بتایا جا سکتا تھا، پھر اس سامان کی کیا ضرورت تھی، تو بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی فعل ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے تو ہوتا نہیں، بلکہ مصلحت اور حکمت کے لئے ہوتا ہے، اور ہر واقعہ کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی کے احاطۂ علمی میں آ سکتی ہے، نہ ہم اس کے مکلّف ہیں کہ ہر واقعہ کی مصلحت معلوم کریں اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر واقعہ کی حکمت ہماری سمجھ میں آ جائے، اس لئے اس کے پیچھے پڑ کر اپنی عمرِ عزیز ضائع کرنے کے بجائے بہتر طریقہ تسلیم وسکوت کا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ

پھر تمہارے دِل سخت ہوگئے اس سب کے بعد سو وہ ہوگئے جیسے پتھر یا ان سے بھی سخت،

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ

اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے جاری ہوتی ہیں نہریں، اور ان میں ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں

فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ

اور نکلتا ہے ان سے پانی، اور ان میں ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ کے ڈر سے،

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اس سب کے بعد تمہارے دِل پھر سخت ہوگئے، یہاں تک کہ وہ ایسے ہوگئے جیسے پتھر! بلکہ سختی میں کچھ اُن سے بھی زیادہ۔ (کیونکہ) پتھروں میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ بہتی ہیں، اور انہی میں سے کچھ وہ ہوتے ہیں جو خود پھٹ پڑتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے، اور انہی میں وہ (پتھر) بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے لڑھک جاتے ہیں۔ اور (اس کے برخلاف) جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے ﴿۷۴﴾

خلاصۂ تفسیر

(گزشتہ واقعات سے متأثر نہ ہونے پر شکایت کے طور پر ارشاد ہوتا ہے) ایسے ایسے واقعات کے بعد (چاہئے تھا کہ تم لوگوں کے دِل بالکل نرم اور حق تعالیٰ کی عظمت سے پُر ہو جاتے، لیکن) تمہارے دِل پھر بھی سخت ہی رہے تو (یوں کہنا چاہئے کہ) ان کی مثال پتھر کی سی ہے، یا (یا یوں کہئے کہ وہ) سختی میں اُن سے (بھی) زیادہ (ہیں)، اور (زیادہ سخت اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ) بعضے پتھر تو ایسے ہیں جن سے (بڑی بڑی) نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں، اور انہی پتھروں میں بعض ایسے ہیں کہ جو شق ہو جاتے ہیں، پھر اُن سے (اگر زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی) پانی نکل آتا ہے، اور انہی پتھروں میں بعضے ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کے خوف سے اُوپر سے نیچے لڑھک آتے ہیں، (اور تمہارے قلوب میں کسی قسم کا اثر ہی نہیں ہوتا) اور (اس قساوت سے جو اعمال صادر ہوتے ہیں) حق تعالیٰ تمہارے (ان) اعمال سے بے خبر نہیں ہیں (بہت جلد تم کو سزا تک پہنچا دیں گے)۔

فائدہ:- اس جگہ پتھر کے تین اثرات بیان کئے گئے ہیں، اوّل ان سے زیادہ پانی نکلنا، دوم کم پانی نکلنا، ان دو میں تو کسی کو شبہ نہیں پڑتا، تیسری صورت یعنی خدا کے خوف سے پتھر کا نیچے آ گرنا، اس میں ممکن ہے کسی کو شبہ ہو، کیونکہ پتھر کو تو عقل اور حس نہیں ہے، سو یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ خوف کے لئے عقل کی تو ضرورت نہیں، کیونکہ حیوانات لایعقل میں خوف کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، البتہ حس کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جمادات میں اتنی حس بھی نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں، کیونکہ حس حیات پر موقوف ہے، اور بہت ممکن ہے کہ ان میں ایسی لطیف حیات ہو جس کا ہم کو اِدراک نہ ہوتا ہو، جیسا جوہر دِماغ کے اِحساس کا بہت سے عقلاء کو اِدراک نہیں ہوتا، وہ محض دلائل سے اس کے قائل ہوتے ہیں، تو دلائلِ طبیہ سے ظاہر نصِ قرآن کی دلالت اور قوّت کسی طرح بھی کم نہیں۔

پھر ہمارا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ ہمیشہ پتھر گرنے کی علت خوف ہی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ بعض پتھر اس وجہ سے گر جاتے ہیں، سو بہت ممکن ہے کہ گرنے کے اسباب مختلف ہوں، ان میں سے بعض طبعی ہوں اور ایک سبب خوفِ خدا بھی ہو۔

اس مقام پر تین قسم کے پتھروں کے ذِکر میں ترتیب نہایت لطیف اور اِفادۂ مقصود نہایت بلیغ انداز میں کیا گیا ہے، یعنی بعض پتھروں میں تأثر اِتنا قوی ہے جس سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں، جن سے مخلوقِ خدا فائدہ اُٹھاتی ہے، اور ان (یہودیوں) کے دِل ایسے بھی نہیں (کہ مخلوقِ خدا کی تکلیف و مصیبت میں پگھل جائیں) اور بعض پتھروں میں ان سے کم تأثر ہوتا ہے جس سے کم نفع پہنچتا ہے، تو یہ پتھر بہ نسبت اوّل کے کم نرم ہوئے، اور ان کے قلوب ان دو (درجہ دوم کے)

پتھروں سے بھی سخت ہیں۔

اور بعض پتھروں میں گو اس درجے کا اثر نہیں، مگر پھر بھی ایک اثر تو ہے (کہ خوفِ خدا سے نیچے گر آتے ہیں) گو درجے میں پہلی قسموں سے یہ ضعیف تر ہیں، مگر ان کے قلوب میں تو کم درجہ اور ضعیف ترین درجۂ انفعال بھی نہیں۔

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَ قَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ

اب کیا تم اے مسلمانو! توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات اور ان میں ایک فرقہ تھا کہ سنتا تھا اللہ کا کلام

ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡہُ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾

پھر بدل ڈالتے تھے اس کو جان بوجھ کر اور وہ جانتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(مسلمانو!) کیا اب بھی تمہیں یہ لالچ ہے کہ یہ لوگ تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ اللہ کا کلام سنتے تھے، پھر اس کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد بھی جانتے بوجھتے اس میں تحریف کر ڈالتے تھے ﴿۷۵﴾

خلاصۂ تفسیر

(مسلمان، یہودیوں کو مؤمن بنانے کی جو کوشش کر رہے تھے اور اس میں کلفت اُٹھاتے تھے تو یہود کے حالات وواقعات بتا اور سنا کر مسلمانوں کی اُمید کا انقطاع کر کے اُن کی کلفت اس آیت کے ذریعے دفع فرماتے ہیں)

(اے مسلمانو!) کیا (یہ سارے قصے سن کر) اب بھی تم توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی) تمہارے کہنے سے ایمان لے آویں گے، حالانکہ (ان سب مذکورہ قصوں سے بڑھ کر ایک اور بات بھی اُن سے ہو چکی ہے کہ) ان میں کچھ لوگ ایسے گزرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کو کچھ کا کچھ کر ڈالتے تھے (اور) اس کو سمجھنے کے بعد (ایسا کرتے) اور (لطف یہ کہ یہ بھی) جانتے تھے (کہ ہم برا کر رہے ہیں، محض اَغراضِ نفسانیہ اس کارروائی کا باعث ہوتیں)۔

فائدہ:- مطلب یہ کہ جو لوگ ایسے بیباک اور اَغراضِ نفسانی کے اسیر ہوں وہ کسی کے کہنے سننے سے کب باز آنے والے اور کسی کی کب سننے والے ہیں۔

اور ''کلام اللہ'' سے مراد یا تو توریت ہے، اور ''سماع'' سے مراد بواسطۂ انبیاء علیہم السلام کے ہے، اور ''تحریف''

سے مراد اس کے بعض کلمات یا تفاسیر یا دونوں بدل ڈالنا ہیں، اور یا "کلام" سے مراد وہ کلام ہے جو اُن ستر آدمیوں نے بطور تصدیقِ موسیٰ علیہ السلام کو ہِ طور پر سنا تھا، اور "سماع" سے مراد بلا واسطہ، اور "تحریف" سے مراد قوم سے یہ نقل کر دینا کہ "اَخیر میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ جو حکم تم سے ادا نہ ہو سکے وہ معاف ہے۔"

اُمورِ مذکورہ بالا میں سے کسی اَمر کا صدور گو ان یہودیوں سے نہ ہوا ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، لیکن چونکہ یہ لوگ بھی اپنے اسلاف کے اُن اعمال پر اِنکار و نفرت نہ رکھتے تھے، اس لئے حکماً یہ بھی ویسے ہی ہوئے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ

اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے کہتے ہیں: ہم مسلمان ہوئے، اور جب تنہا ہوتے ہیں ایک دُوسرے کے پاس

قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ

تو کہتے ہیں: تم کیوں کہہ دیتے ہو اُن سے جو ظاہر کیا اللہ نے تم پر تاکہ جھٹلائیں تم کو اس سے تمہارے رَبّ کے آگے،

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٧٦﴾

کیا تم نہیں سمجھتے؟

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب یہ لوگ ان (مسلمانوں) سے ملتے ہیں جو پہلے ایمان لا چکے ہیں تو (زبان سے) کہہ دیتے ہیں کہ ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں، اور جب یہ ایک دوسرے کے ساتھ تنہائی میں جاتے ہیں تو (آپس میں ایک دوسرے سے) کہتے ہیں کہ: "کیا تم اِن (مسلمانوں) کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ یہ (مسلمان) تمہارے پروردگار کے پاس جا کر انہیں تمہارے خلاف دلیل کے طور پر پیش کریں؟ کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں؟" ﴿٧٦﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جب ملتے ہیں (منافقین یہود) مسلمانوں سے تو (ان سے تو) کہتے ہیں کہ ہم (بھی) بھی ایمان لے آئے

ہیں اور جب تنہائی میں جاتے ہیں یہ بعضے (منافق یہودی) دُوسرے بعضے (علانیہ) یہودیوں کے پاس (تو ان سے اُن کی معیت وہم مشربی کے مدعی ہوتے ہیں، اس وقت) وہ (دُوسرے یہودی) اُن سے کہتے ہیں کہ تم (یہ) کیا (غضب کرتے ہو کہ) مسلمانوں کو (خوشامد میں) وہ باتیں بتلا دیتے ہو جو (اُن کے مفیدِ مذہب) اللہ تعالیٰ نے (توریت میں) تم پر منکشف کر دی ہیں (مگر ہم بہ مصلحت پوشیدہ رکھتے ہیں) نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم کو حجت میں مغلوب کر دیں گے کہ (دیکھو یہ مضمون اللہ کے پاس (سے تمہاری کتاب میں آیا) ہے، کیا تم (اتنی موٹی سی بات) نہیں سمجھتے۔

فائدہ:- منافقین کبھی ایک آدھ بات خوشامد میں اپنے ایمان کی سچائی جتلانے کے لئے مسلمانوں سے کہہ دیتے تھے کہ توریت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت آئی ہے، یا قرآن مجید کے متعلق خبر آئی ہے، وغیرہ وغیرہ، اس پر دُوسرے لوگ اُن کو ملامت کرتے تھے۔

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ

کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ اور بعض ان میں بے پڑھے ہیں

لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ

کہ خبر نہیں رکھتے کتاب کی سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور اُن کے پاس کچھ نہیں مگر خیالات۔ سو خرابی ہے اُن کو جو

يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے، پھر کہہ دیتے ہیں: یہ خدا کی طرف سے ہے

لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ

تاکہ لیویں اس پر تھوڑا سا مال، سو خرابی ہے اُن کو اپنے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ہے

لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

اُن کو اپنی اس کمائی سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

کیا یہ لوگ (جو ایسی باتیں کرتے ہیں) یہ نہیں جانتے کہ اللہ کو اُن ساری باتوں کا خوب علم ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں؟ ﴿۷۷﴾ اور اِن میں سے کچھ لوگ اَن پڑھ ہیں جو کتاب (توراۃ) کا علم تو رکھتے نہیں، البتہ کچھ آرزوئیں پکائے بیٹھے ہیں، اور اُن کا کام بس یہ ہے کہ وہم وگمان باندھتے رہتے ہیں ﴿۷۸﴾ لہٰذا تباہی ہے اُن لوگوں کی جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر (لوگوں سے) کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے ذریعے تھوڑی سی آمدنی کمالیں۔ پس تباہی ہے ان لوگوں پر اُس تحریر کی وجہ سے بھی جو ان کے ہاتھوں نے لکھی، اور تباہی ہے اُن پر اُس آمدنی کی وجہ سے بھی جو وہ کماتے ہیں ﴿۷۹﴾

خلاصۂ تفسیر

کیا ان کو علم نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کو سب خبر ہے اُن چیزوں کی بھی جن کو وہ مخفی رکھتے ہیں اور ان کی بھی جن کا وہ اِظہار کرتے ہیں (تو اگر منافقین نے مؤمنین سے اپنا کفر چھپایا تو کیا، اور ان ملامت گروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت وغیرہ کے مضامین چھپائے تو کیا، اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں مضامین سے مسلمانوں کو جابجا مطلع فرمادیا ہے)۔

اس آیت میں تو یہودیوں کے خواندہ لوگوں کا ذِکر تھا، آگے اُن کے ناخواندہ لوگوں کا ذِکر اس طرح فرماتے ہیں کہ:-

اور ان (یہودیوں) میں بہت سے ناخواندہ (بھی) ہیں جو کتابی علم نہیں رکھتے، لیکن (بلاسند) دِل خوش کن باتیں (بہت یاد ہیں) اور وہ لوگ کچھ اور نہیں (ویسے ہی بے بنیاد) خیالات پکالیتے ہیں (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ تو ان کے علماء کی تعلیم ناقص اور مخلوط ہے، اور پھر اُوپر سے اُن میں فہم کی کمی ہے، ایسی صورت میں بجز بے بنیاد خیالات کے حقائقِ واقعیہ کی تحقیق کہاں نصیب ہوسکتی ہے، بقول شخصے ''کریلا اور نیم چڑھا'' اس میں مٹھاس کہاں۔

اور چونکہ ان کی اس توہم پرستی میں ان کے علماء کی خیانت بڑا سبب ہے، اس لئے جرم میں بھی وہ اپنے عوام سے زیادہ ہوئے، اسی کا بیان اب یہاں کرتے ہیں:-

(جب عوامِ مذکورین قابلِ زجر وتوبیخ ہیں اور ان کے جہل کا اصلی سبب اُن کے علماء ہی ہیں) تو بڑی خرابی اُن کی ہوگی جو لکھتے ہیں (بدل سدل کر) کتاب (توریت) کو اپنے ہاتھوں سے (اور) پھر (عوام سے) کہہ دیتے ہیں کہ یہ (حکم) خدا کی طرف سے (یوں ہی آیا) ہے، (اور) غرض (صرف) یہ ہوتی ہے کہ اس ذریعے سے کچھ نقد قدرے قلیل وصول

کرلیں، سو بڑی خرابی (پیش) آوے گی ان کی اس (تحریفِ کتاب) کی بدولت (بھی) جس کو ان کے ہاتھوں نے لکھا تھا اور بڑی خرابی ہوگی ان کو اس (نقد) کی بدولت (بھی) جس کو وہ وصول کرلیا کرتے تھے۔

فائدہ:- عوام کی رضا جوئی کے لئے غلط سلط مسئلے بتلا دینے سے ان کو کچھ نقد وغیرہ بھی وصول ہو جاتا تھا، اور ان کی نظر میں وقعت اور وقار بھی رہتا تھا، اسی غرض سے توریت میں لفظی اور معنوی پھیر پھار بھی کرتے رہتے تھے، اس آیت میں اسی پر وعید سنائی گئی۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ

اور کہتے ہیں: ہم کو ہرگز آگ نہ لگے گی مگر چند روز گنے چنے، کہہ دو: کیا تم لے چکے ہو اللہ کے یہاں سے

عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰

قرار کہ اب ہرگز خلاف نہ کرے گا اللہ اپنے قرار کے یا جوڑتے ہو اللہ پر جو تم نہیں جانتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہودیوں نے کہا ہے کہ ہمیں گنتی کے چند دنوں کے علاوہ آگ ہرگز نہیں چھوئے گی۔ آپ اُن سے کہئے کہ کیا تم نے اللہ کی طرف سے کوئی عہد لے رکھا ہے جس کی بنا پر وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا، یا تم اللہ کے ذمے وہ بات لگا رہے ہو جس کا تمہیں کچھ پتہ نہیں؟ ۝۸۰

خلاصۂ تفسیر

اور یہودیوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہرگز ہم کو آتشِ (دوزخ) چھوئے گی (بھی تو) نہیں، (ہاں) مگر (بہت) تھوڑے روز جو (اُنگلیوں پر) شمار کرلئے جاسکیں (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے) یوں فرما دیجئے: کیا تم لوگوں نے حق تعالیٰ سے (اس کے متعلق) کوئی معاہدہ لے لیا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ اپنے معاہدہ کے خلاف نہ کریں گے، یا (معاہدہ نہیں لیا، بلکہ ویسے ہی) اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا رہے ہو جس کی کوئی علمی سند اپنے پاس نہیں رکھتے۔

فائدہ:- یہود کے اس قول کی مفسرین نے مختلف تقریریں کی ہیں، من جملہ اس کے یہ ہے کہ یہ امر محقق ہے کہ مؤمن اگر عاصی ہو تو گو بقدرِ گناہ دوزخ کے عذاب میں داخل ہو، لیکن ایمان کی وجہ سے دائمی عذابِ جہنم نہ ہوگا، بعد چندے نجات ہو جائے گی۔

پس یہود کے دعوے کا حاصل یہ تھا کہ چونکہ ان کے بزعم دِینِ موسوی منسوخ نہیں ہے، لہٰذا وہ مؤمن ہیں، انکارِ نبوّتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام و جناب حضورِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کافر نہیں ہوئے، پس اگر کسی عصیان کے سبب دوزخ میں چلے بھی گئے، پھر نکال لئے جائیں گے، اور چونکہ یہ دعویٰ بناء الفاسد علی الفاسد ہے، کیونکہ دِینِ موسوی کی ابدیت کا دعویٰ خود غلط ہے، لہٰذا انکارِ نبوّتِ مسیحیہ ومحمدیہ کے سبب وہ لوگ کافر ہوں گے، اور کفار کے لئے بعد چندے دوزخ سے نجات پا جانا کسی بھی آسمانی کتاب میں نہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے ''عہد'' سے تعبیر فرمایا، پس ثابت ہوا کہ دعویٰ بلا دلیل بلکہ خلافِ دلیل ہے۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ

کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے سو وہی ہیں دوزخ کے رہنے والے،

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ

وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو ایمان لائے اور عمل کئے نیک وہی ہیں

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

جنت کے رہنے والے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(آگ تمہیں) کیوں نہیں (چھوئے گی)؟ جو لوگ بھی بدی کماتے ہیں اور ان کی بدی انہیں گھیر لیتی ہے تو ایسے لوگ ہی دوزخ کے باسی ہیں۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے ﴿۸۱﴾ اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، تو وہ جنت کے باسی ہیں۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے ﴿۸۲﴾

خلاصۂ تفسیر

خلود فی النار کا ضابطہ[1]

(بجز چند روز کے تم کو آتشِ دوزخ) کیوں نہیں (لگے گی، بلکہ ابدالآباد تک اس میں رہنا ضروری ہے، کیونکہ ہمارا ضابطہ یہ ہے کہ) جو شخص قصداً بری باتیں کرتا رہے اور اس کو اس کی خطا (وقصور اس طرح) اِحاطہ کرلے (کہ کہیں نیکی کا اثر تک نہ رہے) سو ایسے لوگ اہلِ دوزخ ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے، اور جو لوگ (اللہ و رسول پر) اِیمان لاویں اور نیک کام کریں، ایسے لوگ اہلِ بہشت ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔

فائدہ:- خطاؤں کے اِحاطہ کے جو معنی اُوپر ذِکر کئے گئے ہیں، اس قسم کا اِحاطہ اس معنی کے ساتھ کفار کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ کفر کی وجہ سے کوئی بھی عملِ صالح مقبول نہیں ہوتا، بلکہ کفر کے قبل اگر کچھ نیک اعمال کئے بھی ہوں تو وہ بھی ضائع اور ضبط ہوجاتے ہیں، اسی وجہ سے کفار میں سرتاپا بدی ہی بدی ہوگی، جس کی جزا اَبدی جہنم ہوگی، بخلاف اہلِ اِیمان کے کہ اوّل تو ان کا اِیمان خود بہت بڑا عملِ صالح ہے، دُوسرے اعمالِ فرعیہ بھی ان کے نامۂ اَعمال میں درج ہوتے ہیں، اس لئے وہ نیکی کے اثر سے خالی نہیں، پس اِحاطۂ مذکور اُن کی حالت پر صادق نہیں آتا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جب اس ضابطہ کی رُو سے کافر کا اَبدی جہنمی ہونا ثابت ہوگیا، تو چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خاتم الانبیاء نہیں ہیں، آپ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبی ہیں، تو یہود ان کا اِنکار کرکے کافروں میں شامل ہوگئے، اس لئے اس ضابطہ کی رُو سے وہ بھی خالد فی النار ہوں گے، تو ان کا دعویٰ مذکور دلیلِ قطعی سے باطل ٹھہرا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ

اور جب ہم نے لیا قرار بنی اِسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی اور ماں باپ سے

اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا

سلوک نیک کرنا اور کنبہ والوں سے اور یتیموں اور محتاجوں سے اور کہیو سب لوگوں سے نیک بات اور قائم رکھیو

[1] ترجمہ:- جہنم میں ہمیشہ رہنے کا ضابطہ۔

الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ، پھر تم پھر گئے مگر تھوڑے سے تم میں، اور تم ہی ہو پھرنے والے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے پکا عہد لیا تھا کہ: ''تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے، اور والدین سے اچھا سلوک کرو گے، اور رشتہ داروں سے بھی اور یتیموں اور مسکینوں سے بھی۔ اور لوگوں سے بھلی بات کہنا، اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا۔'' (مگر) پھر تم میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا باقی سب (اس عہد سے) منہ موڑ کر پھر گئے ﴿۸۳﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب لیا ہم نے (توریت میں) قول وقرار بنی اِسرائیل سے کہ عبادت مت کرنا (کسی کی) بجز اللہ کے، اور ماں باپ کی اچھی طرح خدمت گزاری کرنا، اور اہلِ قرابت کی بھی، اور بے باپ کے بچوں کی بھی، اور غریب محتاجوں کی بھی، اور عام لوگوں سے (جب کوئی) بات (کہنا ہو تو) اچھی طرح (خوش خلقی سے) کہنا اور پابندی رکھنا نماز کی اور اَدا کرتے رہنا زکوٰۃ، پھر تم (قول وقرار کرکے) اس سے پھر گئے بجز معدودے چند کے، اور تمہاری تو معمولی عادت ہے اِقرار کرکے ہٹ جانا۔

فائدہ:- یہ معدودے چند وہ لوگ ہیں جو توریت کے پورے پابند رہے، توریت کے منسوخ ہونے سے قبل شریعتِ موسویہ کے پابند رہے، جب توریت منسوخ ہوگئی تو شریعتِ محمدیہ کے متبع ہوگئے۔

مسئلہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ اَحکام اِسلام اور سابقہ شریعتوں میں مشترک ہیں، جن میں توحید، والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کی خدمت، اور تمام اِنسانوں کے ساتھ گفتگو میں نرمی و خوش خلقی کرنا اور نماز اور زکوٰۃ سب داخل ہیں۔

تعلیم و تبلیغ میں سخت کلامی کافر سے بھی دُرست نہیں

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا سے مراد ''قولًا ذا حسن'' ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جب لوگوں سے خطاب کرے تو

بات نرم کرے، خوش رُوئی اور کشادہ دِلی سے کرے، چاہے مخاطب نیک ہو یا بد، سنی ہو یا بدعتی، ہاں دِین کے معاملہ میں مداہنت اور اس کی خاطر سے حق پوشی نہ کرے، وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو یہ ہدایت نامہ دیا کہ: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ: ۴۴) تو آج جو کلام کرنے والا ہے وہ حضرت موسیٰ سے افضل نہیں، اور مخاطب کتنا ہی برا ہو فرعون سے زیادہ برا خبیث نہیں۔

طلحہ بن عمرؒ کہتے ہیں کہ میں نے اِمامِ تفسیر وحدیث عطاءؒ سے کہا کہ آپ کے پاس فاسد عقیدے والے لوگ بھی جمع رہتے ہیں، مگر میرے مزاج میں تیزی ہے، میرے پاس ایسے لوگ آتے ہیں تو میں ان کو سخت باتیں کہہ دیتا ہوں۔ حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ ایسا نہ کیا کرو، کیونکہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ: قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا، اس میں تو یہودی و نصرانی بھی داخل ہیں، مسلمان خواہ کیسا ہی ہو وہ کیوں نہ داخل ہوگا۔ (قرطبی) [1]

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ

اور جب لیا ہم نے وعدہ تمہارا کہ نہ کروگے خون آپس میں اور نہ نکال دوگے اپنوں کو

مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾

اپنے وطن سے پھر تم نے اِقرار کرلیا اور تم مانتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے پکا عہد لیا تھا کہ: ’’تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے، اور اپنے آدمیوں کو اپنے گھروں سے نہیں نکالو گے‘‘ پھر تم نے اِقرار کیا تھا، اور تم خود اس کے گواہ ہو ﴿۸۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اُوپر جو عہدِ میثاق لیا گیا تھا اس آیت میں اس کا تتمہ بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:-

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے یہ قول وقرار (بھی) لیا کہ (خانہ جنگی کرکے) باہم خونریزی مت کرنا اور ایک دُوسرے کو ترکِ وطن مت کرانا، پھر (ہمارے اس اِقرار لینے پر) تم نے اِقرار بھی کرلیا اور اِقرار بھی (ضمناً نہیں،

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۲ ص:۱٦

بلکہ) ایسا جیسے تم (اس پر) شہادت (بھی) دیتے ہو۔

فائدہ:- بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی تقریر سے کسی اَمر کا اِقرار مترشح ہوتا ہے گو صاف اِقرار نہیں ہوتا، مگر عرفاً اور عقلاً اس کو اِقرار ہی سمجھا جاتا ہے، لیکن یہاں تو ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ سے اس شبہ کو بھی رفع کر دیا، اور بتادیا کہ یہ اِقرار اتنا صریح اور واضح تھا جیسے شہادت صاف اور واضح ہوا کرتی ہے۔

ترکِ وطن کرانے کی ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو آزار پہنچا کر اتنا تنگ مت کرنا کہ بیچارہ ترکِ وطن پر مجبور ہو جائے۔

ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ

پھر تم وہ لوگ ہو کہ ویسے ہی خون کرتے ہو آپس میں اور نکال دیتے ہو اپنے ایک فرقہ کو

مِّنۡ دِيَارِهِمۡ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ؕ وَاِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ

ان کے وطن سے چڑھائی کرتے ہوئے اُن پر گناہ اور ظلم سے اور اگر وہ آویں تمہارے پاس

اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ ؕ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ

کسی کے قیدی ہو کر تو ان کا بدلہ دے کر چھڑاتے ہو، حالانکہ حرام ہے تم پر ان کا نکال دینا بھی، تو کیا مانتے ہو بعض

الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ

کتاب کو اور نہیں مانتے بعض کو، سو کوئی سزا نہیں اس کی جو تم میں یہ کام کرتا ہے مگر رُسوائی

فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ

دُنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دِن پہنچائے جاویں سخت سے سخت عذاب میں،

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾

اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اس کے بعد (آج) تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے ہی آدمیوں کو قتل کرتے ہو، اور اپنے ہی میں سے کچھ لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے ہو، اور اُن کے خلاف گناہ اور زیادتی کا ارتکاب کرکے (ان کے دُشمنوں کی) مدد کرتے ہو، اور اگر وہ (دُشمنوں کے) قیدی بن کر تمہارے پاس آجاتے ہیں تو تم ان کو فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو، حالانکہ ان کو (گھر سے) نکالنا ہی تمہارے لئے حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب (توراۃ) کے کچھ حصے پر تو اِیمان رکھتے ہو اور کچھ کا اِنکار کرتے ہو؟ اب بتاؤ کہ جو شخص ایسا کرے اُس کی سزا اِس کے سوا کیا ہے کہ دُنیوی زندگی میں اُس کی رُسوائی ہو؟ اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو سخت ترین عذاب کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے ﴿۸۵﴾

خلاصۂ تفسیر

تتمہ میثاق میں جو حکم ان کو دِیا گیا ہے اس کے متعلق عہد شکنی کا بیان اس آیت میں فرمایا ہے۔

پھر (اس اِقرارِ صریح کے بعد) تم (جیسے ہو) یہ (آنکھوں کے سامنے) موجود (ہی) ہو کہ باہم قتل وقتال بھی کرتے ہو، اور ایک دُوسرے کو ترکِ وطن بھی کراتے ہو، (اس طور پر کہ) ان اپنوں کے مقابلہ میں (ان کی مخالف قوموں کی) اِمداد کرتے ہو، گناہ اور ظلم کے ساتھ (سو ان دونوں حکموں کو تو یوں غارت کیا) اور (ایک تیسرا حکم جو سہل سا سمجھا اس پر عمل کرنے کو خوب تیار رہتے ہو کہ) اگر ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسوں کو کچھ خرچ کرا کر رہا کرا دیتے ہو، حالانکہ یہ بات (بھی معلوم) ہے کہ تم کو اُن کا ترکِ وطن کرا دینا (اور قتل تو اور بھی بدرجۂ اَولیٰ) نیز ممنوع ہے۔

معارف ومسائل

فائدہ:- اس باب میں ان پر تین حکم لازم تھے، اوّل قتل نہ کرنا، دوم اِخراج یعنی ترکِ وطن نہ کرانا، سوم اپنی قوم میں سے کسی کو قید وبند میں گرفتار دیکھیں تو روپیہ خرچ کر کے چھڑا دینا، تو ان لوگوں نے اوّل کے دو حکم کو تو چھوڑ دیا اور تیسرے حکم کا اِہتمام کرنے لگے، اور صورت اس کی یہ ہوئی تھی کہ اہلِ مدینہ میں دو قومیں تھیں، اوس وخزرج، اور ان میں باہم عداوت رہتی تھی، اور کبھی کبھی قتال کی نوبت بھی آجاتی تھی، اور مدینہ کے گردونواح میں یہودیوں کی دو قومیں بنی قریظہ اور بنی نضیر آباد تھیں، اوس وبنی قریظہ کی باہم دوستی تھی، اور خزرج وبنی نضیر میں باہم یارانہ تھا، جب اوس وخزرج میں باہم لڑائی ہوتی تو دوستی کی بنا پر بنوقریظہ تو اوس کے مددگار ہوتے، اور بنونضیر خزرج کی طرف داری کرتے، تو جہاں اوس وخزرج مارے

جاتے اور خانماں آوارہ ہوتے تو ان کے دوستوں اور حامیوں کو بھی یہ مصیبت پیش آتی، اور ظاہر ہے کہ بنوقریظہ کے قتل واخراج میں بنونضیر کا بھی ہاتھ ہوتا، اور ایسا ہی بالعکس، البتہ یہود کی دونوں جماعتوں میں سے اگر کوئی جنگ میں قید ہو جاتا تو ہر جماعت اپنے دوستوں کو مال پر راضی کر کے اس قیدی کو رہائی دِلا دیتے، اور کوئی پوچھتا کہ ایسا کیوں کرتے ہو، تو اس کو جواب دیتے کہ اسیر کو رہا کرا دینا ہم پر واجب ہے، اور اگر کوئی قتل وقتال میں معین ومددگار بننے پر اعتراض کرتا تو کہتے کہ کیا کریں، دوستوں کا ساتھ نہ دینے سے عار آتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے، اور ان کی حیلہ سازیوں کا پردہ چاک فرمایا ہے۔

اس آیت میں جن مخالف قوموں کی اِمداد کا ذِکر ہے اس سے اوس وخزرج مراد ہیں، کہ اوس، بنی قریظہ کی موافقت میں بنی نضیر کے مخالف تھے، اور خزرج، بنی نضیر کی موافقت میں بنی قریظہ کے مخالف تھے۔

''اِثم'' و ''عدوان'' (ظلم اور گناہ) دو لفظ لانے اس طرف اِشارہ ہوسکتا ہے کہ اس میں دو حق ضائع ہوتے ہیں، حکمِ اِلٰہی کی تعمیل نہ کر کے حق اللہ ضائع کیا، اور دُوسرے کو آزار پہنچا کر حق العباد بھی ضائع کر دیا۔

آگے اس عہد شکنی پر ملامت وشکایت کے ساتھ ساتھ سزا کو بھی بالتصریح بیان فرمایا ہے، اِرشاد ہے:-

کیا تو (بس یوں کہو کہ) کتاب (توریت) کے بعض (اَحکام) پر تم اِیمان رکھتے ہو اور بعض (اَحکام) پر اِیمان نہیں رکھتے تو اور کیا سزا ہو (نا چاہئے) ایسے شخص کی جو تم لوگوں میں سے ایسی حرکت کرے بجز رُسوائی کے دُنیوی زندگانی میں اور روزِ قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دیئے جاویں گے، اور اللہ تعالیٰ (کچھ) بے خبر نہیں ہیں تمہارے اعمال (زشت) سے۔

فائدہ:- ہر چند کہ وہ یہودی جن کا قصہ میں ذِکر ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا اِنکار کرنے کی بنا پر کافی ہی تھے، مگر یہاں ان کا کفر مذکور نہیں، بلکہ بعض اَحکام پر عمل نہ کرنے کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے، حالانکہ جب تک حرام کو حرام سمجھے آدمی کافر نہیں ہوتا، سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جو گناہ بہت شدید ہوتا ہے اس پر محاوراتِ شرعیہ میں اس کی شدّت کے پیشِ نظر کفر کا اِطلاق کر دیا جاتا ہے۔ ہم اپنے محاوراتِ عرفیہ میں اس کی مثالیں دِن رات دیکھتے ہیں، جیسے کسی ذلیل حرکت کرنے والے کو کہہ دیتے ہیں کہ تو تو بالکل چمار ہے، حالانکہ مخاطب چمار یقیناً نہیں ہے، اس سے مقصود شدّتِ نفرت اور اُس کام کی قباحت ظاہر کرنا ہوتا ہے، اور یہی معنی ہیں اس حدیث[1]: "مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ" وغیرہ کے۔

اس مقام پر جن دو سزاؤں کا ذِکر ہے ان میں سے پہلی سزا یعنی دُنیا میں ذِلت ورُسوائی تو اس کا وقوع اس طرح ہوا

---

[1] جامع الترمذی، ابواب الإیمان، باب ما جاء فی ترك الصلاۃ ج:٢ ص:٩٠

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کے سبب بنی قریظہ قتل وقید کئے گئے اور بنی نضیر ملکِ شام کی طرف بہزار ذلت وخواری نکال دیئے گئے۔

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ

یہ وہی ہیں جنہوں نے مول لی دُنیا کی زندگی آخرت کے بدلے، سو نہ ہلکا ہوگا اُن پر

الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿٨٦﴾

عذاب اور نہ اُن کو مدد پہنچے گی۔

آسان ترجمۂ قرآن

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دُنیوی زندگی کو آخرت کے بدلے خرید لیا ہے، لہٰذا نہ اُن کے عذاب میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ اُن کی مدد کی جائے گی ﴿٨٦﴾

خلاصۂ تفسیر

(اور وجۂ سزا اُن کے لئے یہ ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے (احکام کی مخالفت کر کے) دُنیاوی زندگانی (کے مزوں) کو لے لیا ہے، بعوض (نجات) آخرت کے (جس کا ذریعہ اطاعت ہے) سو نہ تو (سزا دینے والے کی طرف سے) ان کی سزا میں (کچھ) تخفیف دی جاوے گی اور نہ کوئی (وکیل، مختار یا دوست، رشتہ دار) اُن کی طرف داری (پیروی) کرنے پاوے گا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۖ وَاٰتَيْنَا عِيسَى

اور بے شک دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور پے درپے بھیجے اس کے پیچھے رسول اور دیئے ہم نے عیسیٰ

ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُولٌۢ

مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور قوت دِی اس کو رُوحِ پاک سے، پھر بھلا کیا جب تمہارے پاس لایا کوئی رسول

بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۚ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

وہ حکم جو نہ بھایا تمہارے جی کو تو تم تکبر کرنے لگے، پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو تم نے قتل کر دیا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابنِ مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں، اور رُوح القدس سے ان کی تائید کی۔ پھر یہ آخر کیا معاملہ ہے کہ جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس کوئی ایسی بات لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہشات کو پسند نہیں تھی تو تم اکڑ گئے؟ چنانچہ بعض (انبیاء) کو تم نے جھٹلایا، اور بعض کو قتل کرتے رہے ﴿۸۷﴾

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے (اے بنی اِسرائیل! تمہاری ہدایت کے لئے ہمیشہ سے بڑے بڑے سامان کئے، سب سے اوّل) موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توراۃ) دی اور (پھر) ان کے بعد (درمیان میں) یکے بعد دیگرے (برابر مختلف) پیغمبروں کو بھیجتے رہے، اور (پھر اس خاندان کے سلسلے کے اَخیر میں) ہم نے (حضرت) عیسیٰ بن مریم کو (نبوّت کے) واضح دلائل (اِنجیل اور معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کو رُوح القدس (جبریل علیہ السلام) سے (جو) تائید دی (سوا الگ، جو بجائے خود ایک دلیل واضح تھی تو) کیا (تعجب کی بات نہیں کہ اس پر بھی تم سرکشی کرتے رہے اور) جب کبھی (بھی) کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے اَحکام لائے جن کو تمہارا دِل نہ چاہتا تھا (جب ہی) تم نے (ان پیغمبروں کی اِطاعت سے) تکبر کرنا شروع کر دیا، سو (ان پیغمبروں میں سے) بعضوں کو تو (نعوذ باللہ) تم نے جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو (بے دھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے۔

فائدہ:- قرآن وحدیث میں جا بجا حضرت جبریل علیہ السلام کو رُوح القدس کہا گیا ہے، جیسے قرآن کی اس آیت میں، نیز: قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ (النحل:۱۰۲) میں، اور حدیث میں حضرت حسان بن ثابتؓ کا یہ شعر ؎

وَجِبْرِيْلُ رَسُوْلُ اللهِ فِيْنَا
وَرُوْحُ الْقُدُسِ لَيْسَ لَهٗ كِفَاءٌ [1]

[1] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضائل حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ ج:۲ ص:۳۰۱۔ ترجمہ:- اللہ کے قاصد جبریل ہمارے ہاں آتے ہیں اور رُوح القدس (یعنی جبریل) کا کوئی ہمسر نہیں۔

اور جبریل علیہ السلام کے واسطے سے عیسیٰ علیہ السلام کی کئی طریقوں سے تائید ہوئی، اوّل تو ولادت کے وقت مسِ شیطان سے حفاظت کی گئی، پھر ان کے دَم کرنے سے حملِ عیسوی قرار پایا، پھر یہود چونکہ کثرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخالف تھے، اس لئے جبریل علیہ السلام حفاظت کے لئے ساتھ رہتے تھے، حتیٰ کہ آخر میں اُن کے ذریعہ سے آسمان پر اُٹھوالئے گئے، یہود نے بہت سے پیغمبروں کی تکذیب کی حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی تکذیب کی، اور حضرت زکریا و حضرت یحییٰ علیہما السلام کو قتل بھی کیا۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور کہتے ہیں: ہمارے دِلوں پر غلاف ہے، بلکہ لعنت کی ہے اللہ نے اُن کے کفر کے سبب سو بہت کم ایمان لاتے ہیں

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ: ''ہمارے دِل غلاف میں ہیں۔'' نہیں! بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر پھٹکار ڈال رکھی ہے، اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ﴿۸۸﴾

خلاصۂ تفسیر

اور وہ (یہود طنزیہ طور پر) کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب (ایسے) محفوظ ہیں (کہ اس میں مخالف مذہب کا جو اسلام ہے، اثر ہی نہیں ہوتا، تو مذہب پر ہم خوب پختہ ہیں، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ محفوظی اور پختگی نہیں ہے) بلکہ اُن کے کفر کے سبب اُن پر خدا کی مار ہے (کہ اِسلام جو مذہبِ حق ہے اس سے نفور اور منسوخ مذہب پر مصر ہیں) سو بہت ہی تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں (اور تھوڑا ایمان مقبول نہیں، پس وہ کافر ہی ٹھہرے)۔

فائدہ:- یہ تھوڑا سا اِیمان ان اُمور کی بابت ہے جو اُن کے مذہب اور اِسلام میں مشترک ہیں، مثلاً خدا کا قائل ہونا، قیامت کا قائل ہونا کہ ان اُمور کے وہ بھی قائل تھے، لیکن خود نبوّتِ محمدیہ اور قرآن کے کلامِ اِلٰہی ہونے کے منکر تھے، اس لئے پورا ایمان نہ تھا۔

اور اس تھوڑے اِیمان کو باعتبارِ لغت اِیمان کہا، جس کے معنی مطلق یقین کے ہیں، گو وہ بعض اشیاء کے ساتھ ہی متعلق ہو، شرعاً اس کو اِیمان نہیں کہتے، شرعاً وہ ایمان معتبر ہے جو کل اُمور وارِدفی الشرع [1] کے یقین کے ساتھ ہو۔

[1] وارِدفی الشرع: شریعت میں بیان کئے گئے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ

اور جب پہنچی اُن کے پاس کتاب اللہ کی طرف سے جو سچا بتاتی ہے اس کتاب کو جو ان کے پاس ہے اور پہلے سے

يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫

فتح مانگتے تھے کافروں پر، پھر جب پہنچا ان کو جس کو پہچان رکھا تھا تو اس سے منکر ہو گئے،

فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

سو لعنت ہے اللہ کی منکروں پر۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آئی (یعنی قرآن) جو اُس (توراۃ) کی تصدیق بھی کرتی ہے جو پہلے سے اِن کے پاس ہے، (تو ان کا طرزِ عمل دیکھو!) باوجودیکہ یہ خود شروع میں کافروں (یعنی بت پرستوں) کے خلاف (اس کتاب کے حوالے سے) اللہ سے فتح کی دُعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہ چیز ان کے پاس آگئی جسے انہوں نے پہچان بھی لیا، تو اس کا انکار کر بیٹھے۔ پس پھٹکار ہے اللہ کی ایسے کافروں پر! ﴿۸۹﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جب اُن کو (ایک) ایسی کتاب پہنچی (یعنی قرآن مجید) جو منجانب اللہ ہے، (اور) اس (کتاب) کی (بھی) تصدیق کرنے والی ہے جو (پہلے سے) اُن کے پاس ہے، (یعنی توراۃ) حالانکہ اس کے قبل (خود) بیان کرتے تھے (اور) کفار سے (یعنی مشرکینِ عرب سے کہ ایک نبی آنے والے ہیں، اور ایک کتاب لانے والے ہیں، مگر) پھر جب وہ چیز آپہنچی جس کو وہ (خوب جانتے) پہچانتے ہیں تو اس کا (صاف) اِنکار کر بیٹھے، سو (بس) خدا کی مار ہو ایسے منکروں پر (کہ جان بوجھ کر محض تعصب کے سبب اِنکار کریں)۔

فائدہ: - قرآن کو جو مصدقِ توراۃ فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ توراۃ میں بعثتِ محمدیہ اور نزولِ قرآن کی جو پیشین گوئیاں تھیں اسے ان کا صدق ظاہر ہو گیا، سو توراۃ کا ماننے والا تو قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب

کر ہی نہیں سکتا ورنہ توراۃ کی تکذیب لازم آئے گی۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب وہ حق کو حق جانتے تھے تو پھر ان کو "مؤمن" کہنا چاہئے، کافر کیسے کہا گیا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان صرف جاننے کا نام نہیں، بلکہ ماننے کا نام ہے، ورنہ یوں تو شیطان سب سے زیادہ حق کو حق جانتا ہے، مگر جاننے کے باوجود اِنکار کرنے کی وجہ سے اور بھی کفر میں شدّت بڑھ گئی، اسی لئے اگلی آیت میں اُن کے کفر کا عناد بتلایا گیا ہے، چنانچہ اِرشاد ہوتا ہے:-

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ

بری چیز ہے وہ جس کے بدلے بیچا اُنہوں نے اپنے آپ کو کہ منکر ہوئے اس چیز کے جو اُتاری اللہ نے اس ضد پر کہ اُتارے

اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ

اللہ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے، سو کما لائے غصّے پر غصہ

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

اور کافروں کے واسطے عذاب ہے ذِلت کا۔

آسان ترجمۂ قرآن

بُری ہے وہ قیمت جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے، کہ یہ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کا صرف اس جلن کی بناپر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ اپنے فضل کا کوئی حصہ (یعنی وحی) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہ رہا ہے (کیوں) اُتار رہا ہے؟ چنانچہ یہ (اپنی اس جلن کی وجہ سے) غضب بالائے غضب لے کر لوٹے ہیں۔ اور کافر لوگ ذِلت آمیز سزا کے مستحق ہیں۔ ﴿۹۰﴾

خلاصۂ تفسیر

وہ حالت (بہت ہی) بری ہے جس کو اِختیار کر کے (وہ بزعمِ خود) اپنی جانوں کو (عقوبتِ آخرت سے) چھڑانا

چاہتے ہیں، (اور وہ حالت) یہ (ہے) کہ کفر (اِنکار) کرتے ہیں ایسی چیز کا جو حق تعالیٰ نے (ایک سچے پیغمبر پر) نازل فرمائی (یعنی قرآن، اور وہ اِنکار بھی) محض (اس) ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس بندہ پر اس کو منظور ہو، (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر، کیوں) نازل فرماوے سو (اس حسد بالائے کفر سے) وہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہوگئے، اور (آخرت میں) ان کفر کرنے والوں کو ایسی سزا ہوگی جس میں (تکلیف کے علاوہ) ذِلت (بھی) ہے۔

فائدہ:- ایک غضب کفر پر، دُوسرا حسد پر، یوں غضب بالائے غضب فرمایا۔ عذاب کے ساتھ ''مہین'' کی قید سے بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ عذاب کفار کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ گناہگار مؤمن کو عذاب اس کو پاک کرنے کے لئے ہوگا، ذِلت کے لئے نہیں۔

آگے کی آیت میں جو اُن کا قول نقل کیا ہے اس سے ان کا کفر ثابت ہوتا ہے، اور حسد بھی مترشح[1] ہوتا ہے:-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا

اور جب کہا جاتا ہے ان سے: مانو اس کو جو اللہ نے بھیجا ہے، تو کہتے ہیں: ہم مانتے ہیں جو اُترا ہے ہم پر،

وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ

اور نہیں مانتے اس کو جو سوا اس کے ہے، حالانکہ وہ کتاب سچی ہے جو تصدیق کرتی ہے اس کتاب کی جو اُن کے پاس ہے، کہہ دو:

فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾

پھر کیوں قتل کرتے رہے ہو اللہ کے پیغمبروں کو پہلے سے اگر تم ایمان رکھتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کلام اُتارا ہے اس پر ایمان لے آؤ، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو (صرف) اُسی کلام پر ایمان رکھیں گے جو ہم پر نازل کیا گیا، (یعنی توراۃ) اور وہ اس کے سوا (دوسری آسمانی کتابوں) کا اِنکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ بھی حق ہیں، (اور) جو کتاب اِن کے پاس ہے وہ اُس کی تصدیق بھی کرتی ہیں۔ (اے پیغمبر!) تم ان سے کہو کہ اگر تم واقعی (توراۃ پر) ایمان رکھتے تھے تو اللہ کے نبیوں کو پہلے زمانے میں کیوں قتل کرتے رہے؟ ﴿۹۱﴾

---

[1] مترشح: ظاہر۔

خلاصۂ تفسیر

اور جب ان (یہودیوں) سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ اُن تمام کتابوں پر جو اللہ تعالیٰ نے (متعدّد پیغمبروں پر) نازل فرمائی ہیں (اور ان تمام کتابوں میں قرآن بھی ہے) تو (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (تو صرف) اس (ہی) کتاب پر ایمان لاویں گے جو ہم (لوگوں) پر (بواسطہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے) نازل کی گئی ہے (یعنی توراۃ) اور (باقی) جتنی (کتابیں) اس کے علاوہ ہیں (جیسے انجیل اور قرآن) ان (سب) کا وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ (توراۃ کے ماسوا کتابیں) بھی (فی نفسہٖ) حق (اور واقعی) ہیں، اور (فی نفسہٖ حق ہونے کے علاوہ) تصدیق کرنے والی بھی ہیں اس (کتاب) کی جو اُن کے پاس ہے (یعنی توراۃ کی) آپ (یہ بھی) کہئے کہ (اچھا تو) پھر کیوں قتل کیا کرتے تھے اللہ کے پیغمبروں کو اس کے پہلے زمانہ میں اگر تم (توراۃ پر) ایمان رکھنے والے تھے۔

فائدہ:- یہود نے جو یہ کہا کہ ''ہم صرف توراۃ پر ایمان لاویں گے، دُوسری کتب پر ایمان نہ لاویں گے'' تو ان کا یہ قول صریح کفر ہے، اور اس کے ساتھ جو یہ کہا کہ (توراۃ) ''جو ہم پر نازل کی گئی ہے'' اس سے حسد مترشح ہوتا ہے، اس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ اور کتابیں چونکہ ہم پر نازل نہیں کی گئیں، اس لئے اُن پر ایمان نہیں لائیں گے، اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس قول کو تین طرح رَدّ فرمایا ہے:-

اوّل یہ کہ جب اور کتابوں کی حقیت اور واقعیت بھی دلیلِ قطعی سے ثابت ہے تو پھر اس اِنکار کی کیا وجہ ہے؟ ہاں اگر اس دلیل میں کوئی کلام تھا تو اس کو پیش کر کے تشفی کر لیتے، اِنکارِ محض کی آخر کیا وجہ؟

دُوسرے اور کتابیں مثلاً قرآن مجید جو توراۃ کا مصدق ہے تو اس کے اِنکار سے تو خود توراۃ کی تکذیب و اِنکار لازم آتا ہے۔

تیسرے یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا تمام آسمانی کتابوں کی رُو سے کفر ہے، پھر تمہارے گروہ کے لوگوں نے جو کئی نبیوں کو قتل کیا، جن کی تعلیم بھی توراۃ ہی کے اَحکام کے ساتھ خاص تھی، اور تم ان قاتلین کو اپنا پیشوا اور مقتدا سمجھتے ہو، تو براہِ راست توراۃ کے ساتھ کفر کرتے ہو، اس سے تو تمہارا توراۃ پر اِیمان کا دعویٰ بھی غلط ٹھہرتا ہے، غرض کسی بھی پہلو سے تمہارا قول و فعل صحیح اور دُرست نہیں۔

آگے بعض اور وجوہ و دلائل سے ان یہودیوں کا رَدّ فرمایا گیا ہے، چنانچہ اِرشاد ہوتا ہے:-

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

اور آچکا تمہارے پاس موسیٰ صریح معجزے لے کر پھر بنالیا تم نے بچھڑا اس کے گئے پیچھے،

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٩٢﴾

اور تم ظالم ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور خود موسیٰ تمہارے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے، پھر تم نے ان کے پیٹھ پیچھے یہ ستم ڈھایا کہ گائے کے بچھڑے کو معبود بنالیا ﴿٩٢﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) تم لوگوں کے پاس صاف صاف دلیلیں (توحید و رسالت کی) لائے (مگر) اس پر بھی تم لوگوں نے گوسالہ کو (معبود) بنالیا، موسیٰ (علیہ السلام) کے (طور پر جانے کے) بعد اور تم (اس تجویز میں) ستم ڈھا رہے تھے۔

فائدہ:- "بیّنات" سے وہ دلائل مراد ہیں جو اس قصے سے پہلے جبکہ توراۃ نہ ملی تھی، موسیٰ علیہ السلام کے نبی برحق ہونے پر قائم ہو چکی تھیں، مثلاً عصا اور ید بیضا، دریا کا پھٹنا وغیرہ۔

رَدّ کی تقریر کا حاصل ظاہر ہے کہ تم دعویٰ تو ایمان کا کرتے ہو اور صریح شرک میں مبتلا ہو، جس سے موسیٰ علیہ السلام بلکہ خدا تعالیٰ کی صریح تکذیب بھی لازم آتی ہے، گوسالہ کو معبود بنانے کا معاملہ اگرچہ ان یہودیوں کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نزولِ قرآن کے وقت موجود تھے، مگر چونکہ یہ لوگ اپنے اجداد کے حامی اور طرف دار رہتے تھے، اس لئے فی الجملہ یہ بھی رَدّ میں شامل ہیں۔

اور اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن کے اَسلاف نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کر کے کفر کیا، وہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اِنکار کے مرتکب ہوں تو چنداں عجیب نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ

اور جب ہم نے لیا قرار تمہارا اور بلند کیا تمہارے اُوپر کوہِ طور کو، پکڑو جو ہم نے تم کو دِیا زور سے

وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ

اور سنو، بولے: سنا ہم نے اور نہ مانا، اور پلائی گئی ان کے دِلوں میں محبت اسی بچھڑے کی

بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩٣﴾

بسبب اُن کے کفر کے، کہہ دے کہ بری باتیں سکھاتا ہے تم کو اِیمان تمہارا اگر تم اِیمان والے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے اُوپر طور کو بلند کر دیا (اور یہ کہا کہ) ''جو کچھ ہم نے تم کو دِیا ہے اس کو مضبوطی سے تھامو اور (جو کچھ کہا جائے اسے ہوش سے) سنو۔'' کہنے لگے: ''ہم نے (پہلے بھی) سن لیا تھا، مگر عمل نہیں کیا تھا (اب بھی ایسا ہی کریں گے)'' اور (دراصل) اُن کے کفر کی نحوست سے اُن کے دِلوں میں بچھڑا بسا ہوا تھا۔ آپ (اُن سے) کہئے کہ اگر تم مؤمن ہو تو کتنی بُری ہیں وہ باتیں جو تمہارا ایمان تمہیں تلقین کر رہا ہے! ﴿٩٣﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تمہارا قول وقرار لیا تھا، اور (اس قول وقرار لینے کے لئے) طور کو تمہارے (سروں کے) اُوپر لا کھڑا کیا تھا (اور اس وقت حکم دیا تھا کہ) لو جو کچھ (اَحکام) ہم تم کو دیتے ہیں ہمت (اور پختگی) کے ساتھ لو اور (ان اَحکام کو دِل سے) سنو، (اس وقت) انہوں نے (ڈر کے مارے زبان سے تو) کہہ دیا کہ ہم نے (قبول کرلیا اور) سن لیا، اور (چونکہ واقع میں یہ بات دِل سے نہ تھی، اس لئے گویا بزبانِ حال یوں بھی کہہ رہے تھے کہ) ہم سے عمل نہ ہوگا، اور (وجہ اُن کی اِس بد دِلی کی یہ تھی کہ) ان کے قلوب (کے ریشے ریشے) میں وہی گوسالہ پیوست ہوگیا تھا، ان کے کفر (سابق) کی وجہ سے (جبکہ دریائے شور سے اُتر کر اُنہوں نے ایک بت پرست قوم کو دیکھ کر درخواست کی تھی کہ

ہمارے لئے کوئی ایسا ہی مجسم معبود تجویز کر دیا جائے)، آپ فرما دیجئے کہ (دیکھ لیا تم نے اپنے ایمانِ مزعوم کے افعال کو، سو) یہ افعال تو بہت برے ہیں، جن کی تعلیم تمہارا ایمان تم کو کر رہا ہے، اگر تم (بزعمِ خود اَب بھی) اہلِ ایمان ہو (یعنی یہ ایمان نہیں ہے)۔

فائدہ: - اس آیت میں جو اَسباب اور مسبّبات مذکور ہیں، اُن کی ترتیب کا حاصل یہ ہے کہ دریائے شور سے پار ہو کر ان سے ایک کلمۂ کفر کا صدور ہوا، ہر چند موسیٰ علیہ السلام کی ڈانٹ ڈپٹ سے توبہ کر لی، لیکن توبہ کے مراتب بھی مختلف ہوتے ہیں، اعلیٰ درجہ کی توبہ نہ ہونے کے سبب اس کی ظلمت قلب میں کچھ باقی رہ گئی تھی، وہ ترقی پا کر گوسالہ پرستی کا سبب بن گئی، پھر اس کی توبہ میں بعضوں کو قتل ہونا پڑا، اور بعض کو غالباً بلا قتل معافی ہوگئی ہو، جیسا کہ بعض مفسرین نے ذکر بھی کیا ہے، اُن کی توبہ بھی کچھ ضعیف ہوئی ہوگی، اور جو گوسالہ پرستی سے محفوظ رہے تھے ان کو بھی گوسالہ پرستوں سے جس قدر نفرت واجب تھی اس میں کوتاہی ہونے سے ایک گونہ اثر اس معصیتِ شرکیہ کا ان کے قلب میں باقی تھا، بہر حال ضعفِ توبہ یا کفر سے نفرت نہ ہونے کے آثار باقی رہنے نے دِلوں میں دِین سے سستی پیدا کر دی، جس سے اَخذِ میثاق میں کوہِ طور کو ان پر معلق کرنے کی نوبت آئی۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ

کہہ دے کہ اگر ہے تمہارے واسطے آخرت کا گھر اللہ کے ہاں تنہا سوا اور لوگوں کے،

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ

تو تم مرنے کی آرزو کرو اگر تم سچ کہتے ہو۔ اور ہر گز آرزو نہ کریں گے موت کی کبھی بسبب اُن گناہوں کے کہ بھیج چکے ہیں

اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٥﴾

ان کے ہاتھ اور اللہ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

آپ (اُن سے) کہئے کہ: "اگر اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے

مخصوص ہے (جیسا کہ تمہارا کہنا ہے) تو موت کی تمنا تو کر کے دِکھاؤ، اگر واقعی سچے ہو" ﴿۹۴﴾ اور (ہم بتائے دیتے ہیں کہ) انہوں نے اپنے جو کرتوت آگے بھیج رکھے ہیں، ان کی وجہ سے یہ کبھی ایسی تمنا نہیں کریں گے۔ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے ﴿۹۵﴾

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہودی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ آخرت کی نعمتیں خالص ہمارا ہی حق ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس دعوے کو باطل کرنے کے لئے فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ اگر (بقول تمہارے) عالمِ آخرت محض تمہارے ہی لئے نافع ہے بلا شرکتِ غیرے تو تم (اس کی تصدیق کے لئے ذرا) موت کی تمنا کر کے دِکھلا دو اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو، اور (ہم ساتھ ہی یہ بھی کہے دیتے ہیں کہ) یہ لوگ ہرگز کبھی اس (موت) کی تمنا نہ کریں گے، بوجہ (خوفِ سزا) ان اعمالِ (کفریہ) کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو خوب اِطلاع ہے ان ظالموں (کے حال) کی (جب مقدمہ کی تاریخ آئے گی فردِ قرار دادِ جرم سنا کر سزا کا حکم کر دیا جائے گا)۔

فائدہ:- قرآن کی بعض اور آیات سے بھی اُن کے اس دعویٰ کا مفہوم نکلتا ہے جیسا کہ: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ (البقرة:۸۰) [۱]، وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ (البقرة:۱۱۱) [۲]، وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ (المائدة:۱۸) [۳] وغیرہا۔

ان سب دعووں کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دِینِ حق پر ہیں، لہٰذا آخرت میں ہم کو تو ضرور نجات ملے گی، ہم میں سے جو تائب یا مرحوم ہیں اُن کو تو ابتدا ہی سے جنت میں داخلہ مل جائے گا، اور جو گنہگار ہیں وہ چند روزہ عذاب بھگت کر نجات پا جائیں گے، اور جو مطیع ہیں وہ بمثل اَبناء و اَحبا محبوب و مقرب ہیں۔

بعض عنوانات کے قبح سے قطعِ نظر، یہ دعوے دِینِ حق پر قائم ہونے کی صورت میں فی نفسہٖ تو دُرست وصادق ہیں، لیکن چونکہ وہ لوگ اپنے دِین کے منسوخ ہو جانے کی بنا پر حق پر نہ رہے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جابجا مختلف عنوانات اور طریقوں سے ان کی تکذیب فرمائی، یہاں ایک خاص طریقہ ذِکر کیا گیا کہ اگر عام عادت کے مطابق بحث اور دلائل سے فیصلہ نہیں کرتے تو آؤ مافوق العادۃ طریقہ یعنی معجزے کے ذریعے اس میں نہ زیادہ علم وفہم کی ضرورت ہے نہ غائر نظر درکار،

---

[۱] ترجمہ:- اور یہودیوں نے کہا ہے کہ ہمیں گنتی کے چند دنوں کے علاوہ آگ ہرگز نہیں چھوئے گی۔

[۲] ترجمہ:- اور یہ (یعنی یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ: "جنت میں سوائے یہودیوں یا عیسائیوں کے کوئی بھی ہرگز داخل نہیں ہوگا"

[۳] ترجمہ:- یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ "ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔"

صرف زبان ہلانے کی ضرورت ہے، مگر ہم پیشین گوئی کرتے ہیں کہ تم زبان سے یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ "ہم موت کی تمنا کرتے ہیں۔"

اس پیشین گوئی کے بعد ہم کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے دعووں میں سچے ہو تو یہ کلمہ کہہ دو، نہ کہا تو پھر تمہارا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے گا۔

چونکہ اُن کو اپنا باطل اور کفر پر ہونا اور جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کا حق پر ہونا اُن پر خوب واضح وروشن تھا، اس لئے یا تو ایسی ہیبت چھائی کہ زبان ہی نہ اُٹھی، یا وہ ڈر گئے کہ تم نے یہ کلمہ منہ سے نکالا اور موت نے آدبوچا، اور پھر سیدھے جہنم رسید ہوئے، ورنہ اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عداوت ودُشمنی تھی اس کے پیشِ نظر تو ان کو یہ سن کر جوش میں آجانا چاہئے تھا، اور یہ کلمات ضرور کہہ دینے چاہئے تھے۔

درحقیقت اِسلام کی حقانیت کے ثبوت کے لئے یہ واقعہ بہت کافی ہے۔

یہاں دو باتیں اور قابلِ ذکر ہیں:-

اوّل تو یہ کہ یہ اِستدلال ان یہودیوں کے ساتھ تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، اور جنہوں نے آپ کو نبی پہچاننے کے بعد عناد وعداوت کی بناپر آپ کا اِنکار کیا، ہر زمانے کے یہود سے یہ خطاب نہیں۔

دُوسرے یہ شبہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ تمنا کرنا دِل اور زبان دونوں سے ہوتا ہے، ممکن ہے انہوں نے دِل سے تمنا کی ہو۔ اوّل تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اس کی صاف تردید کر رہا ہے، دُوسرے اگر وہ دِل سے تمنا کرتے تو زبان سے ضرور اس کا اِظہار کرتے، کیونکہ اس میں تو اُن کی جیت تھی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کا اچھا موقع تھا۔

اور یہ شبہ بھی نہ کرنا چاہئے کہ انہوں نے تمنا کی ہو، مگر اس کی شہرت نہ ہوئی ہو۔ یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اِسلام کے ہمدردومعاونین کی تعداد کے مقابلہ میں معاندین ومخالفین کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی، اگر ایسی بات ہوئی ہوتی تو وہ خود اس کو خوب خوب اُچھالتے کہ دیکھ لو تم نے جو معیارِ حق وصداقت مقرّر کیا تھا اس پر بھی ہم پورے اُترے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ معانقة ۲

اور تو دیکھے گا اُن کو سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر، اور زیادہ حریص مشرکوں سے بھی،

يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ

چاہتا ہے ہر ایک ایک ان میں کا کہ عمر پاوے ہزار برس، اور نہیں اس کو بچانے والا عذاب سے

اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

اس قدر جینا، اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

(بلکہ) یقیناً تم اِن لوگوں کو پاؤ گے کہ انہیں زندہ رہنے کی حرص دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ ہے، یہاں تک کہ مشرکین سے بھی زیادہ۔ ان میں کا ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ ایک ہزار سال عمر پائے، حالانکہ کسی کا بڑی عمر پالینا اسے عذاب سے دُور نہیں کرسکتا۔ اور یہ جو عمل بھی کرتے ہیں اللہ اسے اچھی طرح دیکھ رہا ہے ﴿۹۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ لوگ موت کی تمنا کیا خاک کرتے) آپ (تو) ان کو حیاتِ (دُنیویہ) کا حریص (اور عام) آدمیوں سے (بھی) بڑھ کر پائیں گے، اور (اوروں کا تو کیا ذِکر، حیرت تو یہ ہے کہ بعض) مشرکین سے بھی (بڑھ کر آپ ان کو حیات کا حریص دیکھیں گے، اور ان کی یہ کیفیت ہے کہ) ان میں کا ایک ایک (شخص) اس ہوس میں ہے کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہوجائے اور (بھلا بالفرض اگر اتنی عمر ہو بھی گئی تو کیا) یہ اَمر عذاب سے تو بچا نہیں سکتا، کہ (کسی کی) بڑی عمر ہوجائے اور حق تعالیٰ کے سب پیشِ نظر ہیں ان کے اعمالِ (بد جس پر ان کو عذاب ہونے والا ہے)۔

فائدہ:- اس میں حیرت و اِستبعاد کی وجہ یہ ہے کہ مشرکینِ عرب تو آخرت کے منکر تھے، ان کی بہار اور عیش تو جو کچھ ہے دُنیا ہی ہے، اس لئے وہ اگر طولِ عمر کی تمنا کریں تو چنداں عجب نہیں، مگر یہود تو آخرت کے قائل اور بزعمِ خود آخرت کی نعمتوں کا اپنے آپ ہی کو مستحق کہتے تھے، پھر بھی وہ دُنیا میں رہنے کی تمنا کریں، یہ ہے حیرت و تعجب کی بات۔

پس باوجود اِعتقادِ آخرت کے طولِ عمر کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نعمتِ اُخروی کا اپنے آپ کو مستحق سمجھنے کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی ہے، حقیقت جو ہے اس کو یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہاں پہنچ کر جہنم ہی ٹھکانا بنے گا، اس لئے جب تک بچے رہیں تب تک ہی سہی۔

قُلۡ مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِيۡلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلۡبِكَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا

تو کہہ دے: جو کوئی ہووے دُشمن جبریل کا، سو اس نے تو اُتارا ہے یہ کلام تیرے دِل پر اللہ کے حکم سے کہ سچا بتانے والا ہے

لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَهُدًى وَّبُشۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۹۷﴾ مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ

اس کلام کو جو اس کے پہلے ہے اور راہ دِکھاتا ہے اور خوش خبری سناتا ہے ایمان والوں کو، جو کوئی ہووے دُشمن اللہ

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبۡرِيۡلَ وَمِيۡكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۹۸﴾

کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دُشمن ہے ان کافروں کا۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) کہہ دو کہ اگر کوئی شخص جبرئیل کا دُشمن ہے تو (ہوا کرے) انہوں نے تو یہ کلام اللہ کی اجازت سے تمہارے دِل پر اُتارا ہے جو اپنے سے پہلے کی کتابوں کی تصدیق کر رہا ہے، اور ایمان والوں کے لئے مجسم ہدایت اور خوشخبری ہے ﴿۹۷﴾ اگر کوئی شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں اور رسولوں کا، اور جبرئیل اور میکائیل کا دُشمن ہے تو (وہ سن رکھے کہ) اللہ کافروں کا دُشمن ہے ﴿۹۸﴾

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سن کر کہ جبریل علیہ السلام وحی لاتے ہیں کہا کہ ان سے تو ہماری عداوت ہے، ہماری قوم پر واقعاتِ ہائلہ اور اَحکاماتِ شاقہ انہی کے ذریعے آتے رہے ہیں، میکائیل خوب ہیں کہ بارش اور رحمت ان کے متعلق ہے، اگر وہ وحی لایا کرتے تو ہم مان لیتے، اس پر حق تعالیٰ رَدّ فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے) یہ کہئے کہ جو شخص جبریل سے عداوت رکھے (وہ جانے، لیکن اس اَمر کو قرآن کے نہ ماننے میں کیا دخل؟ کیونکہ اس میں تو وہ سفیرِ محض ہیں) سو (سفارت کے طور پر) انہوں نے یہ قرآن پاک آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے خداوندی حکم سے (تو لانے والے کی خصوصیت کیوں دیکھی جاتی ہے؟ البتہ خود قرآن کو دیکھو کہ کیسا ہے، سو) اس کی (خود) یہ حالت ہے کہ تصدیق کر رہا ہے اپنے سے قبل والی (آسمانی) کتابوں کی اور رہنمائی کر رہا ہے (مصالحِ ضروریہ کی) اور

خوشخبری سنا رہا ہے ایمان والوں کو (اور کتبِ سماویہ کی یہی شان ہوتی ہے، پس قرآن ہر حال میں کتاب سماوی اور قابلِ اتباع ٹھہرا، پھر جبریل علیہ السلام کی عداوت سے اس کو نہ ماننا نری حماقت ہے، اب رہا خود مسئلہ عداوتِ جبریل کا، سو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک خود اللہ تعالیٰ سے عداوت رکھنا یا اس کے دُوسرے ملائکہ سے یا اس کے رسولوں سے، یا خود میکائیل سے، جن کی دوستی کا دَم بھرتے ہیں، ان سب سے عداوت رکھنا اور جبریل سے عداوت رکھنا، یہ سب ہم پلہ شمار کئے جاتے ہیں، اور ان سب عداوتوں کا قانون یہ ہے کہ) جو (کوئی) شخص خدا تعالیٰ کا دُشمن ہو (تو) اور فرشتوں کا ہو (تو) اور پیغمبروں کا ہو (تو) اور جبریل کا (ہوتو) اور میکائیل کا (ہو) تو (ان سب کا وبال یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ دُشمن ہے ایسے کافروں کا۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

اور ہم نے اُتاریں تیری طرف آیتیں روشن اور اِنکار نہ کریں گے اُن کا مگر وہی جو نافرمان ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور بیشک ہم نے آپ پر ایسی آیتیں اُتاری ہیں جو حق کو آشکار کرنے والی ہیں، اور اُن کا اِنکار وہی لوگ کرتے ہیں جو نافرمان ہیں ﴿۹۹﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (بعض یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ آپ پر کوئی ایسی دلیل واضح نازل نہ ہوئی جس کو ہم بھی جانتے پہچانتے، اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ وہ تو ایک ہی واضح دلیل کو لئے پھرتے ہیں) ہم نے تو آپ کے پاس بہت سے دلائلِ واضحہ نازل کئے ہیں، (جن کو وہ بھی خوب جانتے پہچانتے ہیں، سو ان کا اِنکار نہ جاننے کی بنا پر نہیں، بلکہ یہ اِنکار عدول حکمی کی عادت کی وجہ سے ہے) اور (قاعدۂ کلیہ ہے کہ) کوئی اِنکار نہیں کیا کرتا (ایسے دلائل کا) مگر صرف وہی لوگ جو عدول حکمی کے عادی ہیں۔

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

کیا جب کبھی باندھیں گے کوئی قرار تو پھینک دے گی اس کو ایک جماعت اُن میں سے بلکہ ان میں اکثر یقین نہیں کرتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

یہ آخر کیا معاملہ ہے کہ ان لوگوں نے جب کوئی عہد کیا، ان کے ایک گروہ نے اسے ہمیشہ توڑ پھینکا؟ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان لاتے ہی نہیں ﴿۱۰۰﴾

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہود کو جو وہ عہد یاد دِلایا گیا جو اُن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے باب میں توراۃ میں لیا گیا تھا، تو انہوں نے خود عہد لینے ہی سے صاف اِنکار کر دیا، اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ) کیا (اس عہد لینے سے اُن کو اِنکار ہے) اور (ان کی تو یہ حالت ہے کہ انہوں نے اپنے مُسلّم عہدوں کو بھی کبھی پورا نہیں کیا، بلکہ) جب کبھی بھی ان لوگوں نے (دِین کے متعلق) کوئی عہد کیا ہوگا (ضرور) اس کو ان میں سے کسی نہ کسی فریق نے نظر انداز کر دیا ہوگا، بلکہ ان (تعمیلِ عہد نہ کرنے والوں) میں زیادہ تو ایسے ہی نکلیں گے جو (سرے سے اس عہد کا) یقین ہی نہیں رکھتے (سو تعمیل نہ کرنا تو فسق تھا ہی، یہ یقین نہ کرنا اس سے بڑھ کر کفر ہے)۔

فائدہ:- اور ایک جماعت کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ بعضے اُن میں کے ان عہود کو پورا بھی کرتے تھے، حتیٰ کہ اَخیر میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اِیمان لے آئے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ

اور جب پہنچا ان کے پاس رسول، اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس کتاب کی جو اُن کے پاس ہے تو پھینک دیا

فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ

ایک جماعت نے اہلِ کتاب سے کتاب اللہ کو اپنی پیٹھ کے پیچھے گویا کہ وہ

لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

جانتے ہی نہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب اِن کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول آئے جو اُس (توراۃ) کی تصدیق کررہے تھے جو ان کے پاس ہے، تو اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب (توراۃ و اِنجیل) کو اس طرح پسِ پشت ڈال دیا گویا وہ کچھ جانتے ہی نہ تھے (کہ اس میں نبیِ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا ہدایات دی گئی تھیں) ﴿۱۰۱﴾

خلاصۂ تفسیر

(اس آیت میں ایک خاص عہد شکنی کا ذِکر فرماتے ہیں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے میں کلام تھا، اِرشاد ہوتا ہے) اور جب ان کے پاس ایک (عظیم الشان) پیغمبر آئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو (رسول ہونے کے ساتھ) تصدیق بھی کررہے ہیں اُس کتاب کی جو اُن لوگوں کے پاس ہے (یعنی توراۃ کی، کیونکہ اس میں آپ کی نبوّت کی خبر ہے، تو اس حالت میں آپ پر ایمان لانا عین توراۃ پر عمل تھا، جس کو وہ بھی کتابُ اللہ جانتے ہیں، مگر باوجود اس کے بھی) ان اہلِ کتاب میں کے ایک فریق نے خود اس کتابُ اللہ ہی کو اس طرح پسِ پشت ڈال دیا جیسے ان کو (اس کے مضمون کا یا کتابُ اللہ ہونے کا) گویا اصلاً علم ہی نہیں۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ

اور پیچھے ہولئے اُس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی بادشاہت کے وقت اور کفر نہیں کیا سلیمان نے لیکن

الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ

شیطانوں نے کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو، اور اس علم کے پیچھے ہولئے جو اُترا دو فرشتوں پر شہرِ بابل میں

هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ

جن کا نام ہاروت اور ماروت ہے، اور نہیں سکھاتے تھے وہ دونوں فرشتے کسی کو جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو

فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ

آزمائش کے لئے ہیں سو تو کافر مت ہو، پھر ان سے سیکھتے وہ جادو جس سے جدائی ڈالتے ہیں مرد میں

وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ

اور اس کی عورت میں، اور وہ اس سے نقصان نہیں کرسکتے کسی کا بغیر حکم اللہ کے، اور سیکھتے ہیں

مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ

وہ چیز جو نقصان کرے ان کا اور فائدہ نہ کرے، اور خوب جان چکے ہیں کہ جس نے اختیار کیا جادو کو نہیں اس کے لئے آخرت میں

مِنْ خَلَاقٍ ۛ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ

کچھ حصہ، اور بہت ہی بری چیز ہے جس کے بدلے بیچا انہوں نے اپنے آپ کو اگر ان کو سمجھ ہوتی۔ اور اگر

اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۲

وہ ایمان لاتے اور تقویٰ کرتے تو بدلہ پاتے اللہ کے ہاں سے بہتر، اگر ان کو سمجھ ہوتی۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ (بنی اسرائیل) اُن (منتروں) کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان (علیہ السلام) کی سلطنت کے زمانے میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ اور سلیمان (علیہ السلام) نے کوئی کفر نہیں کیا تھا، البتہ شیاطین لوگوں کو جادو کی تعلیم دے کر کفر کا ارتکاب کرتے تھے۔ نیز (یہ بنی اسرائیل) اُس چیز کے پیچھے لگ گئے جو شہرِ بابل میں ہاروت اور ماروت نامی دو فرشتوں پر نازل کی گئی تھی۔ یہ دو فرشتے کسی کو اس وقت تک کوئی تعلیم نہیں دیتے تھے جب تک اس سے یہ نہ کہہ دیں کہ: ”ہم محض آزمائش کے لئے (بھیجے گئے) ہیں، لہٰذا تم (جادو کے پیچھے لگ کر) کفر اختیار نہ کرنا۔“ پھر بھی یہ لوگ اُن سے وہ چیزیں سیکھتے تھے جس کے ذریعے مرد اور اس کی بیوی میں جدائی پیدا کردیں۔ (ویسے یہ واضح رہے کہ) وہ اس کے ذریعے کسی کو اللہ کی مشیت کے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ (مگر) وہ ایسی باتیں سیکھتے تھے جو اُن کے لئے نقصان دہ تھیں، اور

فائدہ مند نہ تھیں۔ اور وہ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ جو شخص اِن چیزوں کا خریدار بنے گا، آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ چیز بہت بُری تھی جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بیچ ڈالیں۔ کاش کہ ان کو (اِس بات کا حقیقی) علم ہوتا۔ ﴿۱۰۲﴾ اور (اِس کے برعکس) اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے پاس سے ملنے والا ثواب یقیناً کہیں زیادہ بہتر ہوتا۔ کاش کہ اُن کو (اِس بات کا بھی حقیقی) علم ہوتا۔ ﴿۱۰۳﴾

خلاصہ تفسیر

اور (یہودی ایسے بے عقل ہیں کہ) انہوں نے (کتابُ اللہ کا تو اِتباع نہ کیا اور) ایسی چیز کا (یعنی سحر و جادو کا) اِتباع (اختیار) کیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے شیاطین، (یعنی خبیث جن) حضرت سلیمان علیہ السلام کے (عہد) سلطنت میں اور (بعضے بیوقوف جو حضرت سلیمان علیہ السلام پر گمانِ سحر رکھتے ہیں بالکل ہی لغو بات ہے، کیونکہ سحر تو اعتقاداً یا عملاً کفر ہے اور) حضرت سلیمان علیہ السلام نے (نعوذ باللہ کبھی) کفر نہیں کیا، مگر (ہاں) شیاطین (یعنی خبیث جن بے شک) کفر (کی باتیں اور کام یعنی سحر) کیا کرتے تھے، اور حالت یہ تھی کہ (خود تو کرتے ہی اور) آدمیوں کو بھی (اس) سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے (سو وہی سحر متواتر چلا آرہا ہے اس کا اِتباع یہ یہودی کرتے ہیں) اور (اسی طرح) اس (سحر) کا بھی (یہ لوگ اِتباع کرتے ہیں) جو کہ اُن دونوں فرشتوں پر (ایک خاص حکمت کے واسطے) نازل کیا گیا تھا (جو شہر) بابل میں (رہتے تھے) جن کا نام ہاروت و ماروت تھا، اور وہ دونوں (وہ سحر) کسی کو نہ بتلاتے جب تک (احتیاطاً پہلے) یہ (نہ) کہہ دیتے کہ ہمارا وجود بھی (لوگوں کے لئے) ایک اِمتحانِ (خداوندی) ہے (کہ ہماری زبان سے سحر پر مطلع ہو کر کون پھنستا ہے اور کون بچتا ہے) سو تو (اس پر مطلع ہو کر) کہیں کافر مت بن جائیو (کہ اس میں پھنس جاؤ) سو (بعضے) لوگ ان دونوں (فرشتوں) سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعے سے (عمل کر کے) کسی مرد اور اس کی بیوی میں تفریق پیدا کر دیتے تھے اور (اس سے کوئی وہم اور خوف میں نہ پھنس جاوے کہ جادوگر جو چاہے کر سکتا ہے کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ) یہ (ساحر) لوگ اس (سحر) کے ذریعے سے کسی کو (ذرّہ برابر) بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر خدا ہی کے (تقدیری) حکم سے اور (ایسا سحر حاصل کر کے بس) ایسی چیزیں سیکھ لیتے ہیں جو (خود) ان کو (بوجہ گناہ کے) ضرر رَساں ہیں اور (کسی معتد بہ درجہ میں) اُن کو نافع نہیں ہیں (تو یہودی بھی اِتباعِ سحر سے بڑے ضرر میں ہوں گے) اور (یہ بات کچھ ہمارے ہی کہنے کی نہیں بلکہ) ضرور یہ (یہودی) بھی اتنا جانتے ہیں کہ جو شخص اس (سحر) کو (کتابُ اللہ کے عوض) اِختیار کرے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ (باقی) نہیں، اور بے شک بری ہے وہ چیز (یعنی جادو و کفر) جس میں وہ لوگ اپنی جان دے رہے ہیں، کاش! ان کو (اتنی) عقل ہوتی، اور اگر وہ لوگ (بجائے اس کفر و بدعملی کے) ایمان اور تقویٰ (اِختیار) کرتے تو خدا تعالیٰ کے یہاں کا

معاوضہ (اس کفر و بدعملی سے ہزار درجے) بہتر تھا، کاش! (اتنی) عقل ہوتی۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ کی تفسیر اور شانِ نزول میں نقل کی ہوئی اِسرائیلی روایات سے بہت سے لوگوں کو مختلف قسم کے شبہات پیش آتے ہیں، ان شبہات کا حل سیّدی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے نہایت واضح اور سہل انداز میں فرمایا ہے، اس جگہ اس کو بعینہٖ نقل کر دینا کافی ہے، وہ یہ ہے:-

۱- یہ بیوقوف لوگ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کرتے تھے، یہودی تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے درمیانِ آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی براءت بھی ظاہر فرمادی۔

۲- ان آیتوں سے یہودیوں کی برائی کرنا مقصود ہے، کیونکہ ان میں جادو کا چرچا تھا، ان آیتوں کے متعلق زہرہ کا ایک لمبا چوڑا قصہ بھی مشہور ہے، جو کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں، جن علماء نے اس قصہ کو قواعدِ شرعیہ کے خلاف سمجھا ہے، رَدّ کر دیا ہے، اور جنہوں نے اس میں تاویل کو خلافِ شرع نہیں سمجھا ہے، رَدّ نہیں کیا، ہمیں یہاں فی الوقت اس کے صحیح یا غلط ہونے سے بحث نہیں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان آیات کی تفسیر اس قصہ پر موقوف نہیں، جیسے کہ ناظرین کو معارف و مسائل کے اس زیرِ عنوان مضمون سے اندازہ ہو جائے گا۔

۳- اور یہودی سب باتوں کے جاننے کے باوجود چونکہ عمل علم کے خلاف کرتے تھے، اور تدبر سے کام نہ لیتے تھے، اس لئے اوّل تو ان کے جاننے کی خبر دی، اور پھر آخر میں یہ کہہ کر اس کی نفی بھی کر دی کہ ”کاش! ان کو علم و عقل ہوتی“ کیونکہ جس علم پر عمل اور تدبر نہ ہو وہ جہل کی مانند ہے۔

۴- ایک زمانے میں جس کی پوری تعیین میں کوئی محققانہ رائے اس وقت سامنے نہیں، دُنیا میں اور خصوصاً ”بابل“ میں جادو کا بہت چرچا تھا، اور اس کے عجیب اثرات کو دیکھ کر جاہلوں کو اس کی حقیقت اور انبیائے کرام کے معجزات کی حقیقت میں اِختلاط و اِشتباہ ہونے لگا، اور بعض لوگ جادوگروں کو مقدس اور قابلِ اِتباع سمجھنے لگے، اور بعض لوگ جادو کو نیک کام سمجھ کر اس کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے لگے، جیسا موجودہ دور میں مسمریزم کے ساتھ لوگوں کا معاملہ ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اِشتباہ اور غلطی کے رفع کرنے کے لئے بابل میں دو فرشتے ہاروت و ماروت نامی اس کام کے لئے بھیجے کہ لوگوں کو سحر کی حقیقت اور اس کے شعبوں سے مطلع کر دیں تاکہ اِشتباہ جاتا رہے، اور جادو پر عمل کرنے، نیز جادوگروں کے اِتباع کرنے سے اِجتناب کر سکیں، اور جس طرح انبیاء علیہم السلام کی نبوّت کو معجزات و دلائل سے ثابت کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ہاروت و ماروت کے فرشتہ ہونے پر دلائل قائم کر دیئے گئے، تاکہ ان اَحکامات و اِرشادات کی تعمیل و اِطاعت ممکن ہو۔

اور یہ کام انبیائے کرام سے اس لئے نہیں لیا گیا کہ اوّل تو انبیاء اور جادوگروں میں امتیاز وفصل کرنا مقصود تھا، ایک حیثیت سے گویا انبیائے کرام ایک فریق کا درجہ رکھتے تھے، اس لئے حَکم فریقین کے علاوہ کوئی اور ثالث ہونا مناسب تھا۔

دُوسرے اس کام کی تکمیل بغیر جادو کے الفاظ کی نقل وحکایت کے عادۃً ہو نہ سکتی تھی، اگرچہ نقل کفر کفر نباشد کے عقلی ونقلی مُسلّمہ قاعدہ کے مطابق ایسا ہوسکتا تھا، مگر چونکہ حضرات انبیائے کرام مظہر ہدایت ہوتے تھے، اس لئے ان سے یہ کام لینا مناسب نہ سمجھا گیا، لہٰذا فرشتوں کو اس کام کے لئے تجویز کیا گیا، کیونکہ کارخانۂ تکوین میں جو خیر وشرسب پر مشتمل ہوتا ہے، ان فرشتوں سے ایسے کام بھی لئے جاتے ہیں جو مجموعۂ عالم کے اعتبار سے تو بوجہ مصالح عامہ خیر ہوں، لیکن لزوم مفسدہ کے سبب فی ذاتہ شر ہوں، جیسے کسی ظالم وجابر یا موذی جانور وغیرہ کی نشو ونما اور غور وپرداخت کہ تکوینی اعتبار سے دُرست ومحمود ہے، اور تشریعی لحاظ سے نادُرست ومذموم، بخلاف انبیائے کرام علیہم السلام کے کہ ان سے خاص تشریعیات کا کام ہی لیا جاتا ہے جو خصوصاً وعموماً خیر ہی خیر ہوتا ہے، اور گو کہ یہ نقل وحکایت مذکورہ غرض کے لحاظ سے ایک تشریعی کام ہی تھا، لیکن پھر بھی بوجہ اِحتمال قریب اس اَمر کے کہ کہیں یہ نقل وحکایت بھی جادو پر عمل کا سبب نہ بن جائے، جیسا کہ واقع میں ہوا، تو حضرات انبیاء کو اس کا سبب بواسطہ نقل بنانا بھی پسند نہیں کیا گیا۔

البتہ کلیات شرعیہ سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بھی اس مقصود کی تکمیل کردی گئی، ان کلیات کے جزئیات کی تفصیلات بوجہ احتمالِ فتنہ انبیائے کرام کے ذریعہ بیان نہیں کی گئیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً انبیائے کرام نے یہ بتایا ہے کہ رِشوت لینا حرام ہے، اور اس کی حقیقت بھی بتلادی، لیکن یہ جزئیات نہیں بتلائے کہ ایک طریقہ رِشوت کا یہ ہے کہ صاحبِ معاملہ سے یوں چال کر کے فلاں بات کہے، وغیرہ وغیرہ، کیونکہ اس طرح کی تفصیلات بیان کرنے سے تو لوگ اور ترکیبیں سیکھ سکتے ہیں، یا مثلاً اَقسام سحر ہی میں مثال فرض کیجئے کہ قواعدِ کلیہ سے یہ بتلادیا گیا ہے کہ دست غیب کا عمل جس میں تکیے کے نیچے یا جیب میں رکھے ہوئے روپے مل جائیں ناجائز ہے، لیکن یہ نہیں بتلایا کہ فلاں عمل پڑھنے سے اس طرح روپیہ ملنے لگتے ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ فرشتوں نے بابل میں آکر اپنا کام شروع کردیا، کہ سحر کے اُصول وفروع ظاہر کر کے لوگوں کو اس کے عملِ بد سے بچنے کی اور ساحرین سے نفرت ودُوری رکھنے کی تنبیہ اور تائید کی، جیسے کوئی عالم دیکھے کہ جاہل لوگ اکثر نادانی سے کفریہ کلمات بک جاتے ہیں، اس لئے وہ تقریراً یا تحریراً ان کلمات کو جو اس وقت شائع ہیں جمع کر کے عوام کو مطلع کردے کہ دیکھو یہ کلمات بچنے کے لائق ہیں، ان سے احتیاط رکھنا۔

جب فرشتوں نے کام شروع کیا تو وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں کی آمد ورفت ان کے پاس شروع ہوئی، اور وہ

درخواست کرنے لگے کہ ہم کو بھی ان اُصول وفروع سے مطلع کردیجئے، تاکہ ناواقفی سے کسی اِعتقادی یا عملی فساد میں مبتلا نہ ہوجائیں، اس وقت فرشتوں نے بطورِ اِحتیاط وتبلیغ اور بنظرِ اِصلاح یہ اِلتزام کیا کہ اُصول وفروع بتانے سے قبل یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ دیکھو ہمارے یہ بتانے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی آزمائش بھی مقصود ہے کہ دیکھیں ان چیزوں پر مطلع ہوکر کون شخص اپنے دِین کی حفاظت واِصلاح کرتا ہے، کہ شر سے آگاہ ہوکر اس سے بچے، اور کون اپنا دِین خراب کرتا ہے کہ اس شر پر مطلع ہوکر وہی شر خود اِختیار کرلے، جس کا انجام کفر ہے، خواہ کفرِ عملی ہو یا اِعتقادی، دیکھو ہم تم کو نصیحت کئے دیتے ہیں کہ اچھی نیت سے اِطلاع حاصل کرنا اور پھر اسی نیت پر ثابت قدم رہنا، ایسا نہ ہو کہ ہم سے تو یہ کہہ کر سیکھ لو کہ میں بچنے کے لئے پوچھ رہا ہوں، اور پھر اس کی خرابی میں خود ہی مبتلا ہوجاؤ، اور اِیمان برباد کرلو۔

اب ظاہر ہے کہ وہ اس سے زیادہ خیرخواہی اور کیا کرسکتے تھے، غرض جو کوئی ان سے اس طرح عہد وپیمان کرلیتا وہ اس کے رُوبرو جادو کے سب اُصول وفروع بیان کردیتے تھے، کیونکہ ان کا کام ہی یہ تھا، اب اگر کوئی عہد شکنی کرکے اپنے اِرادہ واِختیار سے کافر وفاجر بنے وہ جانے۔ چنانچہ بعضے اس عہد پر قائم نہ رہے، اور اس جادو کو مخلوق کی ایذا رسانی کا ذریعہ بنالیا، جو فسق تو یقیناً ہے، اور بعضے طریقے اس کے اِستعمال کے کفر بھی ہیں، اس طرح سے فاجر کافر بن گئے۔

اس اِرشادِ اِصلاحی اور پھر مخاطب کے خلاف کرنے کی مثال اس طرح ہوسکتی ہے کہ کوئی شخص کسی جامع معقول ومنقول، عالم باعمل کے پاس جائے کہ مجھ کو قدیم یا جدید فلسفہ پڑھا دیجئے، تاکہ خود بھی ان شبہات سے محفوظ رہوں جو فلسفہ میں اِسلام کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی جواب دے سکوں، اور اس عالم کو یہ اِحتمال ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ کو دھوکہ دے کر پڑھ لے، اور پھر خود ہی خلافِ شرع عقائدِ باطلہ کو تقویت دینے میں اس کو اِستعمال کرنے لگے، اس اِحتمال کی وجہ سے اس کو نصیحت کرے کہ ایسا مت کرنا اور وہ وعدہ کرلے، اور اس لئے اس کو پڑھا دیا جاوے، لیکن وہ شخص فلسفہ کے خلافِ اِسلام نظریات وعقائد ہی کو صحیح سمجھنے لگے تو ظاہر ہے کہ اس کی اس حرکت سے اس معلم پر کوئی ملامت یا برائی عائد نہیں ہوسکتی، اسی طرح اس اِطلاعِ سحر سے ان فرشتوں پر بھی نہ کسی شبہ کی گنجائش ہے نہ وسوسے کی۔

اور اس فرض کی تکمیل کے بعد غالباً وہ فرشتے آسمان پر بلالئے گئے ہوں گے، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ (بیان القرآن) [۱]

سِحر کی حقیقت

"سِحر" [۲] بالکسر لغت میں ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب ظاہر نہ ہو (قاموس)، خواہ وہ سبب معنوی ہو جیسے خاص

---

[۱] تفسیر بیان القرآن تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۶۳ [۲] القاموس المحیط ج:۱ ص:۴۲۱

خاص کلمات کا اثر، یا غیر محسوس چیزوں کا ہو، جیسے جنات وشیاطین کا اثر، یا مسمریزم میں قوتِ خیالیہ کا اثر، یا محسوسات کا ہو مگر وہ محسوسات مخفی ہوں، جیسے مقناطیس کی کشش لوہے کے لئے جبکہ مقناطیس نظروں سے پوشیدہ ہو، یا دواؤں کا اثر جبکہ وہ دوائیں مخفی ہوں، یا نجوم وسیارات کا اثر۔

اسی لئے جادو کی اقسام بہت ہیں، مگر عرفِ عام میں عموماً جادو ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں جنات وشیاطین کے عمل کا دخل ہو، یا قوّتِ خیالیہ مسمریزم کا، یا کچھ الفاظ وکلمات کا، کیونکہ یہ بات عقلاً بھی ثابت ہے اور تجربہ ومشاہدہ سے بھی، اور قدیم وجدید فلاسفہ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حروف وکلمات میں بھی بالخاصہ کچھ تأثیرات ہوتی ہیں، کسی خاص حرف یا کلمہ کو کسی خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے وغیرہ سے خاص خاص تأثرات کا مشاہدہ ہوتا ہے، یا ایسی تأثیرات جو کسی اِنسانی بالوں یا ناخنوں وغیرہ اعضاء یا اس کے اِستعمالی کپڑوں کے ساتھ کچھ دُوسری چیزیں شامل کرکے پیدا کی جاتی ہیں جن کو عرفِ عام میں ٹوناٹوٹکا کہا جاتا ہے، اور جادو میں شامل سمجھا جاتا ہے۔

اور اِصطلاحِ قرآن وسنت میں ''سحر'' ہر ایسے اَمرِ عجیب کو کہا جاتا ہے جس میں شیاطین کو خوش کرکے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو، پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، کبھی ایسے منتر اِختیار کئے جاتے ہیں جن میں کفر وشرک کے کلمات ہوں اور شیاطین کی مدح کی گئی ہو، یا کواکب ونجوم کی عبادت اِختیار کی گئی ہو، جس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔

کبھی ایسے اعمال اِختیار کئے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کرکے اس کا خون اِستعمال کرنا، یا جنابت ونجاست کی حالت میں رہنا، طہارت سے اِجتناب کرنا وغیرہ۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کی مدد، ان اقوال وافعال سے حاصل کی جاتی ہے جن کو فرشتے پسند کرتے ہیں، مثلاً تقویٰ، طہارت اور پاکیزگی، بدبو اور نجاست سے اِجتناب، ذِکر اللہ اور اَعمالِ خیر۔

اسی طرح شیاطین کی اِمداد ایسے اقوال وافعال سے حاصل ہوتی ہے جو شیطان کو پسند ہیں، اسی لئے سحر صرف ایسے ہی لوگوں کا کامیاب ہوتا ہے جو گندے اور نجس رہیں، پاکی اور اللہ کے نام سے دُور رہیں، خبیث کاموں کے عادی ہوں، عورتیں بھی اَیامِ حیض میں یہ کام کرتی ہیں تو مؤثر ہوتا ہے، باقی شعبدے اور ٹوٹکے یا ہاتھ چالاکی کے کام یا مسمریزم وغیرہ ان کو مجازاً سحر کہہ دیا جاتا ہے۔ (رُوح المعانی) [1]

سحر کے اَقسام

اِمام راغب اصفہانی ''مفردات القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ سحر کی مختلف قسمیں ہیں۔

---

[1] رُوح المعانی تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۳۳۶

ایک قسم تو محض نظر بندی اور تخییل ہوتی ہے، جس کی کوئی حقیقتِ واقعیہ نہیں، جیسے بعض شعبدہ باز اپنی ہاتھ چالاکی سے ایسے کام کر لیتے ہیں کہ عام لوگوں کی نظریں اس کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں، یا قوتِ خیالیہ مسمریزم وغیرہ کے ذریعہ کسی کے دِماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے کہ وہ ایک چیز کو آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے مگر اس کی کوئی حقیقتِ واقعیہ نہیں ہوتی، کبھی یہ کام شیاطین کے اثر سے بھی ہوسکتا ہے کہ مسحور کی آنکھوں اور دِماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے جس سے وہ ایک غیر واقعی چیز کو حقیقت سمجھنے لگے، قرآن مجید میں فرعونی ساحروں کے جس سحر کا ذِکر ہے وہ پہلی قسم کا سحر تھا، جیسا کہ اِرشاد ہے:-

سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ (الاعراف:١١٦) ''انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کردیا۔''

اور اِرشاد ہے:-

يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾ (طٰہٰ)

''اُن کے سحر سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یہ آنے لگا کہ یہ رسیوں کے سانپ دوڑ رہے ہیں۔''

اس میں يُخَيَّلُ کے لفظ سے یہ بتلا دیا گیا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں جو ساحروں نے ڈالی تھیں نہ درحقیقت سانپ بنیں، اور نہ انہوں نے کوئی حرکت کی، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوتِ متخیلہ متأثر ہوکر ان کو دوڑنے والے سانپ سمجھنے لگی۔

دُوسری قسم اس طرح کی تخییل اور نظر بندی ہے جو بعض اوقات شیاطین کے اثر سے ہوتی ہے، جو قرآنِ کریم کے اس اِرشاد سے معلوم ہوئی:-

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿٢٢١﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٢٢﴾ (الشعراء)

''میں تمہیں بتلاتا ہوں کہ کن لوگوں پر شیطان اُترتے ہیں، ہر بہتان باندھنے والے گنہگار پر اُترتے ہیں۔''

نیز دُوسری جگہ اِرشاد ہے:-

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (البقرة:١٠٢)

''یعنی شیاطین نے کفر اِختیار کیا، لوگوں کو جادو سکھانے لگے۔''

تیسری قسم یہ ہے کہ سحر کے ذریعے ایک شے کی حقیقت ہی بدل جائے، جیسے کسی اِنسان یا جاندار کو پتھر یا کوئی جانور بنا دیں۔ اِمام راغب اصفہانیؒ، ابوبکر جصاصؒ وغیرہ حضرات نے اس سے اِنکار کیا ہے کہ سحر کے ذریعے کسی چیز کی حقیقت بدل جائے، بلکہ سحر کا اثر صرف تخییل اور نظر بندی ہی تک ہوسکتا ہے،[1] معتزلہ کا بھی یہی قول ہے، مگر جمہور علماء کی تحقیق یہ ہے کہ اِنقلابِ اعیان میں نہ کوئی عقلی اِمتناع نہ شرعی، مثلاً کوئی جسم پتھر بن جائے، یا ایک نوع سے دُوسری نوع کی طرف منقلب ہوجائے۔

[1] مفردات القرآن للأصفهانیؒ ج:١ ص:٢٢٦

اور فلاسفہ کا جو یہ قول مشہور ہے کہ اِنقلابِ حقائق ممکن نہیں، اُن کی مراد حقائق سے محال، ممکن، واجب کی حقیقتیں ہیں کہ ان میں اِنقلاب عقلاً ممکن نہیں، کہ کوئی محال ممکن بن جائے، یا کوئی ممکن محال بن جائے۔

اور قرآنِ عزیز میں فرعونی ساحروں کے سحر کو جو تخییل قرار دِیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر سحر تخییل ہی ہو، اس سے زائد کچھ نہ ہو، اور بعض حضرات نے سحر کے ذریعہ اِنقلابِ حقیقت کے جواز پر حضرت کعب احبارؓ کی اس حدیث سے بھی اِستدلال کیا ہے جو مؤطا اِمام مالکؒ میں بروایت قعقاع بن حکیم منقول ہے:-

لَوْ لَا كَلِمَاتٌ اَقُوْلُهُنَّ لَجَعَلَتْنِى الْيَهُوْدُ حِمَارًا۔ [1]

''اگر یہ چند کلمات نہ ہوتے جن کو میں پابندی سے پڑھتا ہوں تو یہودی مجھے گدھا بنادیتے۔''

''گدھا بنادینے'' کا لفظ مجازی طور پر بیوقوف بنانے کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے، مگر بلاضرورت حقیقت کو چھوڑ کر مجاز مراد لینا صحیح نہیں، اس لئے حقیقی اور ظاہری مفہوم اس کا یہی ہے کہ اگر میں یہ کلمات روزانہ پابندی سے نہ پڑھتا تو یہودی جادوگر مجھے گدھا بنادیتے۔

اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں، اوّل یہ کہ سحر کے ذریعے اِنسان کو گدھا بنادینے کا اِمکان ہے، دُوسرے یہ کہ جو کلمات وہ پڑھا کرتے تھے ان کی تاثیر یہ ہے کہ کوئی جادو اثر نہیں کرتا، حضرت کعب احبارؓ سے جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ کلمات کیا تھے تو آپ نے یہ کلمات بتلائے:-

اَعُوْذُ بِوَجْهِ اللهِ الْعَظِيْمِ الَّذِىْ لَيْسَ شَىْءٌ اَعْظَمَ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ الَّتِىْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَّبِاَسْمَاءِ اللهِ الْحُسْنٰى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَبَرَاَ وَذَرَاَ۔ (اخرجه فى المؤطا باب التّعوّذ عند النوم)

''میں اللہ عظیم کی پناہ پکڑتا ہوں جس سے بڑا کوئی نہیں، اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے کلماتِ تامات کی جن سے کوئی نیک و بد اِنسان آگے نہیں نکل سکتا، اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے تمام اسمائے حسنیٰ کی جن کو میں جانتا ہوں، اور جن کو نہیں جانتا، ہر اس چیز کے شر سے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، اور وجود دِیا اور پھیلایا ہے۔''

خلاصہ یہ ہے کہ سحر کی یہ تینوں قسمیں ممکن الوقوع ہیں۔

---

[1] مؤطا، باب التعوّذ عند النوم ص:۷۲۳

سحراور معجزے میں فرق

جس طرح انبیاء علیہم السلام کے معجزات یا اولیاء کی کرامات سے ایسے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں جو عادۃً نہیں ہوسکتے، اسی لئے ان کو "خرقِ عادت" کہا جاتا ہے، بظاہر سحر اور جادو سے بھی ایسے ہی آثار مشاہدے میں آتے ہیں، اس لئے بعض جاہلوں کو ان دونوں میں اِلتباس بھی ہوجاتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ جادوگروں کی تعظیم وتکریم کرنے لگتے ہیں، اس لئے دونوں کا فرق بیان کرنا ضروری ہے۔

سو یہ فرق ایک تو اَصل حقیقت کے اِعتبار سے ہے اور ایک ظاہری آثار کے اِعتبار سے، حقیقت کا فرق تو یہ ہے کہ سحر اور جادو سے جو چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں، یہ دائرۂ اسباب سے الگ کوئی چیز نہیں، فرق صرف اسباب کے ظہور وخفاء کا ہے، جہاں اسباب ظاہر ہوتے ہیں وہ آثار ان اسباب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں اور کوئی تعجب کی چیز نہیں سمجھی جاتی، لیکن جہاں اسباب مخفی ہوں تو وہ تعجب کی چیز ہوتی ہے، اور عوام اسباب کے نہ جاننے کی وجہ سے اس کو خرقِ عادت سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ درحقیقت تمام عادی اُمور کی طرح کسی جن شیطان کے اثر سے ہوتی ہے۔ ایک خط مشرقِ بعید سے آج کا لکھا ہوا اچانک سامنے آکر گر گیا، تو دیکھنے والے اس کو خرقِ عادت کہیں گے، حالانکہ جنات وشیاطین کو ایسے اعمال وافعال کی قوّت دی گئی ہے، ان کا ذریعہ معلوم ہو تو پھر کوئی خرقِ عادت نہیں رہتا، خلاصہ یہ ہے کہ سحر سے ظاہر ہونے والے تمام آثار اسبابِ طبعیّہ کے ماتحت ہوتے ہیں، مگر اَسباب کے مخفی ہونے کے سبب لوگوں کو مغالطہ خرقِ عادت کا ہوجاتا ہے۔

بخلاف معجزہ کے کہ وہ بلاواسطہ فعل حق تعالیٰ کا ہوتا ہے، اس میں اسبابِ طبعیّہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، حضرت اِبراہیم علیہ السلام کے لئے نمرود کی آگ کو حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ اِبراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہوجائے، مگر ٹھنڈک بھی اتنی نہ ہو جس سے تکلیف پہنچے، بلکہ جس سے سلامتی حاصل ہو، اس حکمِ اِلٰہی سے آگ ٹھنڈی ہوگئی۔

آج بھی بعض لوگ بدن پر کچھ دوائیں اِستعمال کرکے آگ کے اندر چلے جاتے ہیں، وہ معجزہ نہیں، بلکہ دواؤں کا اثر ہے، دوائیں مخفی ہونے سے لوگوں کو دھوکا خرقِ عادت کا ہوجاتا ہے۔

یہ بات کہ معجزہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، خود قرآنِ عزیز کی تصریح سے ثابت ہے، اِرشاد فرمایا:-

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ (الانفال:۱۷)

"کنکریوں کی مٹھی جو آپ نے پھینکی، درحقیقت آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی ہے۔"

مراد یہ ہے کہ ایک مٹھی خاک اور کنکر کی سارے مجمع کی آنکھوں تک پہنچ جانا اس میں آپ کے عمل کو کوئی دخل نہیں، یہ خالص حق تعالیٰ کا فعل ہے، یہ معجزہ غزوۂ بدر میں پیش آیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی خاک اور سنگریزوں کی

کفار کے لشکر پر پھینکی (جو سب کی آنکھوں میں پڑ گئی)۔

معجزہ اور سحر کی حقیقتوں کا یہ فرق کہ معجزہ بلاواسطہ اسبابِ طبعیّہ کے براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، اور جادو اَسبابِ طبعیّہ مخفیہ کا اثر ہوتا ہے، حقیقت سمجھنے کے لئے تو کافی وافی ہے، مگر یہاں ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ عوام الناس اس فرق کو کیسے پہچانیں، کیونکہ ظاہری صورت دونوں کی ایک سی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ عوام کے پہچاننے کے لئے بھی حق تعالیٰ نے کئی فرق ظاہر کردیئے ہیں:-

اوّل یہ کہ معجزہ یا کرامت ایسے حضرات سے ظاہر ہوتی ہے جن کا تقویٰ، طہارت و پاکیزگی اَخلاق و اعمال کا سب مشاہدہ کرتے ہیں، اس کے برعکس جادو کا اثر صرف ایسے لوگوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے جو گندے، ناپاک، اللہ کے نام سے اور اس کی عبادت سے دُور رہتے ہیں، یہ چیز ہر اِنسان آنکھوں سے دیکھ کر معجزہ اور سحر میں فرق پہچان سکتا ہے۔

دُوسرے یہ کہ عادۃ اللہ یہ بھی جاری ہے کہ جو شخص معجزے اور نبوّت کا دعویٰ کر کے کوئی جادو کرنا چاہے اس کا جادو نہیں چلتا، ہاں نبوّت کے دعوے کے بغیر کرے تو چل جاتا ہے۔

کیا انبیاء پر بھی جادو کا اثر ہوسکتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے، وجہ وہی ہے جو اُوپر بتلائی گئی کہ سحر درحقیقت اسبابِ طبعیّہ ہی کا اثر ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام اسبابِ طبعیّہ کے اثرات سے متأثر ہوتے ہیں، یہ تأثر شانِ نبوّت کے خلاف نہیں، جیسے ان کا بھوک پیاس سے متأثر ہونا، بیماری میں مبتلا ہونا اور شفا پانا ظاہری اسباب سے سب جانتے ہیں، اسی طرح جادو کے باطنی اسباب سے بھی انبیاء علیہم السلام متأثر ہوسکتے ہیں، اور یہ تأثر شانِ نبوّت کے منافی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہودیوں کا سحر کرنا اور اس کی وجہ سے آپ پر بعض آثار کا ظاہر ہونا اور بذریعہ وحی اس جادو کا پتہ لگنا اور اس کا اِزالہ کرنا اَحادیثِ صحیحہ میں ثابت ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سحر سے متأثر ہونا خود قرآن میں مذکور ہے، آیات: يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾ اور فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿٦٧﴾ (طٰهٰ) موسیٰ علیہ السلام پر خوف طاری ہونا اسی جادو ہی کا تو اَثر تھا۔

سحر کے اَحکامِ شرعیہ

جیسا کہ اُوپر بیان ہوچکا ہے، قرآن وحدیث کی اِصطلاح میں ''سحر'' صرف ایسے عمل کو کہا گیا ہے جس میں کفر وشرک اور فسق وفجور اِختیار کر کے جنات وشیاطین کو راضی کیا گیا ہو، اور ان سے مدد لی گئی ہو، ان کی امداد سے کچھ عجیب

واقعات ظاہر ہوگئے ہوں، سحرِ بابل جس کا قرآن میں ذِکر ہے وہ یہی تھا (جصّاص)، [1] اور اسی سحر کو قرآن میں کفر قرار دِیا ہے۔ ابو منصورؒ نے فرمایا کہ صحیح یہی ہے کہ مطلقاً سحر کی سب اَقسام کفر نہیں، بلکہ صرف وہ سحر کفر ہے جس میں اِیمان کے خلاف اقوال و اعمال اِختیار کئے گئے ہوں۔ (رُوح المعانی) [2]

اور یہ ظاہر ہے کہ شیاطین پر لعنت کرنے اور ان سے عداوت و مخالفت کرنے کے اَحکام قرآن وحدیث میں بار بار آئے ہیں، اس کے خلاف ان سے دوستی اور ان کو راضی کرنے کی فکر خود ہی ایک گناہ ہے، پھر وہ راضی جب ہی ہوتے ہیں جب اِنسان کفر و شرک میں مبتلا ہو جس سے اِیمان ہی سلب ہو جائے، یا کم از کم فسق و فجور میں مبتلا ہو، اور اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی مرضیات کے خلاف گندہ اور نجس رہے، یہ مزید گناہ ہے، اور اگر جادو کے ذریعے کسی کو ناحق نقصان پہنچایا تو یہ اور گناہ ہے۔

غرض اِصطلاحِ قرآن وسنت میں جس کو ''سحر'' کہا گیا ہے وہ کفرِ اِعتقادی یا کم از کم کفرِ عملی سے خالی نہیں ہوتا، اگر شیاطین کو راضی کرنے کے لئے کچھ اقوال یا اعمال کفر و شرک کے اِختیار کئے تو کفرِ حقیقی اِعتقادی ہوگا، اور اگر کفر و شرک کے اقوال و افعال سے بچ بھی گیا مگر دُوسرے گناہوں کا اِرتکاب کیا تو کفرِ عملی سے خالی نہ رہا، قرآنِ عزیز کی آیاتِ مذکورہ میں جو سحر کو کفر کہا گیا ہے وہ اسی اِعتبار سے ہے کہ یہ سحر کفرِ حقیقی اِعتقادی یا کفرِ عملی سے خالی نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس سحر میں کوئی عملِ کفر اِختیار کیا گیا ہو جیسے شیاطین سے اِستغاثہ و اِستمداد یا کواکب کی تاثیر کو مستقل ماننا، یا سحر کو معجزہ قرار دے کر اپنی نبوّت کا دعویٰ کرنا وغیرہ تو یہ سحر باجماع کفر ہے، اور جس میں یہ افعالِ کفر نہ ہوں مگر معاصی کا اِرتکاب ہو وہ گناہِ کبیرہ ہے۔

مسئلہ:- جب یہ معلوم ہوگیا کہ یہ سحر کفرِ اِعتقادی یا عملی سے خالی نہیں تو اس کا سیکھنا اور سکھانا بھی حرام ہوا، اس پر عمل کرنا بھی حرام ہوا، البتہ اگر مسلمانوں سے دفعِ ضرر کے لئے بقدرِ ضرورت سیکھا جائے تو بعض فقہاء نے اِجازت دی ہے۔ (شامی، عالمگیری) [3]

مسئلہ:- تعویذ گنڈے وغیرہ جو عامل کرتے ہیں ان میں بھی اگر جنات و شیاطین سے اِستمداد ہو تو بحکم سحر ہیں، اور حرام ہیں، اور اگر اَلفاظ مشتبہ ہوں معنی معلوم نہ ہوں، اور شیاطین اور بتوں سے اِستمداد کا اِحتمال ہو تو بھی حرام ہے۔

مسئلہ:- قرآن وسنت کے اِصطلاحی سحرِ بابل کے علاوہ باقی قسمیں سحر کی ان میں بھی اگر کفر و شرک کا اِرتکاب کیا

---

[1] احکام القرآن للجصّاص، باب الإختلاف في حكم السحر ج:۱ ص:۱۲۳

[2] رُوح المعاني تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۳۳۷

[3] شامي، مطلب السحر انواع ج:۱ ص:۴۵، عالمگیری، کتاب الکراهية، الباب الثلاثون في المتفرقات ج:۵ ص:۳۷۸

جائے تو وہ بھی حرام ہیں۔

مسئلہ:- اور خالی مباح اور جائز اُمور سے کام لیا جاتا ہو تو اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اس کو کسی ناجائز مقصد کے لئے اِستعمال نہ کیا جائے۔

مسئلہ:- اگر قرآن وحدیث کے کلمات ہی سے کام لیا جائے مگر ناجائز مقصد کے لئے اِستعمال کریں تو وہ بھی جائز نہیں، مثلاً کسی کو ناحق ضرر پہنچانے کے لئے کوئی تعویذ کیا جائے یا وظیفہ پڑھا جائے، اگرچہ وظیفہ اسمائے الٰہیہ یا آیاتِ قرآنیہ ہی کا ہو، وہ بھی حرام ہے۔ (فتاویٰ قاضی خان وشامی)

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقُولُوا۟ رَٰعِنَا وَقُولُوا۟ ٱنظُرْنَا وَٱسْمَعُوا۟ ۗ

اے ایمان والو! تم نہ کہو رَاعِنَا اور کہو اُنْظُرْنَا اور سنتے رہو،

وَلِلْكَٰفِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾

اور کافروں کو عذاب ہے دردناک۔

آسان ترجمۂ قرآن

ایمان والو! (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہوکر) "رَاعِنَا" نہ کہا کرو، اور "اُنْظُرْنَا" کہہ دیا کرو۔ اور سنا کرو۔ اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿١٠٤﴾

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہودیوں نے ایک شرارت ایجاد کی کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آکر لفظ رَاعِنَا سے آپ کو خطاب کرتے، جس کے معنی ان کی عبرانی زبان میں ایک بددُعا کے ہیں، اور وہ اسی نیت سے کہتے تھے، مگر عربی زبان میں اس کے معنی "ہماری مصلحت کی رعایت فرمایئے" کے ہیں، اس لئے عربی داں اس شرارت کو نہ سمجھ سکتے تھے، اور اس اچھے معنی کے قصد سے بعضے مسلمان بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کلمہ سے خطاب کرنے لگے، اس سے ان شریروں کو اور گنجائش ملی، آپس میں بیٹھ کر ہنستے تھے کہ اب تک تو ہم ان کو خفیہ ہی برا کہتے تھے، اب علانیہ کہنے کی تدبیر ایسی ہاتھ آگئی کہ مسلمان بھی اس میں شریک ہوگئے، حق تعالیٰ نے اس گنجائش کے قطع کرنے کو مسلمانوں کو حکم دیا کہ) اے ایمان والو! تم

(لفظ) رَاعِنَا مت کہا کرو اور (اس کی جگہ لفظ) اُنْظُرْنَا کہہ دیا کرو (کیونکہ اس لفظ کے معنی اور رَاعِنَا کے معنی عربی زبان میں ایک ہی ہیں، رَاعِنَا کہنے میں یہودیوں کی شرارت چلتی ہے، اس لئے اس کو ترک کر کے دُوسرا لفظ استعمال کرو) اور (اس حکم کو اچھی طرح) سن لی جیو (اور یاد رکھیو) اور (ان) کافروں کو (تو) سزائے دردناک ہو (ہی) گی (جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایسی گستاخی اور وہ بھی چالاکی کے ساتھ کرتے ہیں)۔

مسئلہ:- اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر اپنے کسی جائز فعل سے دُوسروں کو ناجائز کاموں کی گنجائش ملتی معلوم ہو تو یہ جائز فعل بھی اس کے لئے جائز نہیں رہتا، جیسے اگر کسی عالم کے جائز فعل سے جاہلوں کو مغالطہ میں پڑنے اور ناجائز کاموں میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو اس عالم کے لئے یہ جائز فعل بھی ممنوع ہو جائے گا، بشرطیکہ یہ فعل شرعاً ضروری اور مقاصدِ شرعیہ میں سے نہ ہو، اس کی مثالیں قرآن وسنت میں بہت ہیں، اسی کی ایک دلیل وہ حدیث ہے جس میں اِرشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''بیت اللہ کی تعمیر جو قریش نے زمانۂ جاہلیت میں کی تھی، اس میں کئی چیزیں بناءِ ابراہیمی کے خلاف کر دی ہیں، میرا دِل چاہتا ہے کہ اس کو منہدم کر کے اَز سرِ نو بناءِ ابراہیمی کے مطابق بنا دوں، لیکن اس سے ناواقف عوام کے فتنے میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے اس لئے بالفعل ایسا نہیں کرتا۔''[1] ایسے اَحکام کو اُصولِ فقہ کی اِصطلاح میں ''سدِ ذرائع'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو سبھی فقہاء کے نزدیک معتبر ہے، خصوصاً حضراتِ حنابلہ اس کا زیادہ اِہتمام کرتے ہیں۔ (قرطبی)

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ

دِل نہیں چاہتا اُن لوگوں کا جو کافر ہیں اہلِ کتاب میں اور نہ مشرکوں میں اس بات کو کہ اُترے

عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

تم پر کوئی نیک بات تمہارے رَبّ کی طرف سے اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہے

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۱۰۵

اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب المناسک، باب فضل مکة وبنیانها ج:۱ ص:۲۱۵

آسان ترجمۂ قرآن

کافر لوگ، خواہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی تم پر نازل ہو، حالانکہ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے مخصوص فرمالیتا ہے۔ اور اللہ فضلِ عظیم کا مالک ہے۔ ﴿۱۰۵﴾

خلاصۂ تفسیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہود کا جو برتاؤ تھا، وہ اُوپر کی آیت میں بیان کیا گیا، اب اس آیت میں یہود کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ بیان کیا جارہا ہے کہ (بعضے یہودی بعض مسلمانوں سے کہنے لگے کہ بخدا ہم دِل سے تمہارے خیر خواہ ہیں، اور ہزار جان سے پسند کرتے ہیں کہ تم کو دِینی اَحکام ہمارے دِینی اَحکام سے بہتر عنایت ہوں تو ہم بھی ان کو قبول کریں گے، مگر کیا کیا جائے کہ تمہارا دِین ہمارے دِین سے اچھا ثابت نہیں ہوا، حق تعالیٰ اس دعوئ خیر خواہی کی تکذیب فرماتے ہیں کہ) ذرا بھی پسند نہیں کرتے کافر لوگ (خواہ) ان اہلِ کتاب میں سے (ہوں) اور (خواہ) مشرکین میں سے، اس اَمر کو کہ تم کو تمہارے پروردگار کی طرف سے کسی طرح کی بہتری (بھی) نصیب ہو (اور ان کے حسد سے کچھ بھی نہیں ہوتا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (وعنایت) کے ساتھ جس کو منظور ہوتا ہے مخصوص فرمالیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل (کرنے) والے ہیں۔

فائدہ:- ان یہودیوں کے دو دعوے تھے، اوّل یہودیت کا بہتر ہونا اِسلام سے، دُوسرے ان کا خیر خواہ ہونا، تو اَوّل دعوے کو تو یہ ثابت نہیں کرسکے، نرے دعوے سے کیا ہوتا ہے، اور پھر یہ دعویٰ ہے بھی فضول سی بات، کیونکہ جب ناسخ آتا ہے تو منسوخ ترک کردیا جاتا ہے، اَفضل غیر اَفضل کے فرق پر موقوف نہیں، لہٰذا بوجہ ظاہر اور کھلی ہوئی بات ہونے کے اس کا جواب یہاں ذِکر نہیں کیا گیا۔

صرف دُوسرے دعوئ خیر خواہی ہی پر کلام کیا گیا ہے، اور اہلِ کتاب کے ساتھ مشرکین کا ذِکر مضمون کو قوی اور مؤکد کرنے کے لئے کیا گیا کہ جس طرح مشرکین یقیناً تمہارے خیر خواہ نہیں، اسی طرح ان کو بھی سمجھو۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ

جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلادیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ

عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ

ہر چیز پر قادر ہے، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمان اور زمین کی

وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۰۷﴾

اور نہیں تمہارے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔

آسان ترجمۂ قرآن

ہم جب بھی کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں تو اُس سے بہتر یا اُسی جیسی (آیت) لے آتے ہیں۔ کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟ ﴿۱۰۶﴾ کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ وہ ذات ہے کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت تنہا اُسی کی ہے، اور اللہ کے سوا نہ کوئی تمہارا رکھوالا ہے نہ مددگار؟ ﴿۱۰۷﴾

خلاصۂ تفسیر

(تبدیلِ قبلہ کا واقعہ جب ہوا تو یہود نے اس پر طعن کیا، اور مشرکین بھی بعض اَحکام کی منسوخی پر زبانِ طعن دراز کرتے تھے، حق تعالیٰ اُن کے طعن اور اِعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ) ہم کسی آیت کو جو حکم موقوف کر دیتے ہیں (گو آیت قرآن میں یا ذہنوں میں باقی رہے) یا اس آیت (ہی) کو (ذہنوں سے) فراموش کر دیتے ہیں تو (یہ کوئی اِعتراض کی بات نہیں، کیونکہ اس میں بھی مصلحت ہوتی ہے، چنانچہ) ہم اس آیت سے بہتر یا اس آیت ہی کے مثل (بجائے اس کے دُوسری چیز) لے آتے ہیں، (اے معترض!) کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتے ہیں (پس ایسے قادر کو مصالح کی رعایت کیا مشکل ہے اور) کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ایسے ہیں کہ خاص انہی کی سلطنت آسمانوں اور زمین پر ہے (جب ان کی اس قدرت وسلطنت میں کوئی شریک وسہیم نہیں ہے تو ان مصلحتوں کی رعایت کر کے دُوسرا حکم دے دینے میں کون مزاحمت کر سکتا ہے، غرض حکمِ ثانی کی تجویز سے بھی کوئی مانع نہیں، اور اس حکم کے جاری کر دینے میں بھی کوئی مانع نہیں) اور (یہ بھی سمجھ رکھو کہ) تمہارا حق تعالیٰ کے سوا کوئی یار ومددگار بھی نہیں (پس جب وہ یار ہیں تو اَحکام میں مصلحت کی ضرور رعایت کریں گے، اور جب مددگار ہیں تو ان اَحکام پر عمل کرنے کے وقت تمہارے مخالفین کی مزاحمت سے بھی ضرور محفوظ رکھیں گے، البتہ اگر اس ضرر سے بڑھ کر کوئی نفعِ اُخروی ملنے والا ہو تو ظاہراً مخالف کا مسلط ہو جانا اور بات ہے)۔

معارف و مسائل

مَانَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا، اس آیت میں کسی آیتِ قرآن کے منسوخ ہونے کی جتنی صورتیں ہوسکتی ہیں سب کو جمع کردیا ہے۔ ''نسخ'' کے معنی لغت میں زائل کرنے اور لکھنے کے آتے ہیں، اس پر تمام مفسرینِ اُمت کا اِتفاق ہے کہ اس آیت میں ''نسخ'' سے مراد کسی حکم کا زائل کرنا یعنی منسوخ کرنا ہے، اور اسی لئے اِصطلاحِ کتاب وسنت میں ''نسخ'' ایک حکم کے بجائے کوئی دُوسرا حکم جاری کرنے کو کہا جاتا ہے، خواہ وہ دُوسرا حکم یہی ہو کہ سابق حکم بالکل ختم کردیا جائے، یا یہ ہو کہ اس کی جگہ دُوسرا عمل بتلایا جائے۔

اَحکامِ اِلٰہیہ میں نسخ کی حقیقت

دُنیا کی حکومتوں اور اِداروں میں کسی حکم کو منسوخ کرکے دُوسرا حکم جاری کردینا مشہور ومعروف ہے، لیکن اِنسانوں کے اَحکام میں نسخ کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ پہلے کسی غلط فہمی سے ایک حکم جاری کردیا، بعد میں حقیقت معلوم ہوئی تو حکم بدل دیا، کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ جس وقت یہ حکم جاری کیا گیا اس وقت کے حالات کے مناسب تھا، اور آگے آنے والے واقعات وحالات کا اندازہ نہ تھا، جب حالات بدلے تو حکم بھی بدلنا پڑا، یہ دونوں صورتیں اَحکامِ خداوندی میں نہیں ہوسکتیں۔

ایک تیسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ حکم دینے والے کو اوّل ہی سے یہ بھی معلوم تھا کہ حالات بدلیں گے اور اُس وقت یہ حکم مناسب نہیں ہوگا، دُوسرا حکم دینا ہوگا، یہ جانتے ہوئے آج ایک حکم دے دیا، اور جب اپنے علم کے مطابق حالات بدلے تو اپنی قراردادِ سابق کے مطابق حکم بھی بدل دیا، اس کی مثال ایسی ہے کہ مریض کے موجودہ حالات کو دیکھ کر حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا تجویز کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ دو روز اِس دوا کے اِستعمال کرنے کے بعد مریض کا حال بدلے گا، اس وقت مجھے دُوسری دوا تجویز کرنا ہوگی، یہ سب کچھ جانتے ہوئے وہ پہلے دن ایک دوا تجویز کرتا ہے جو اُس دن کے مناسب ہے، دو دن کے بعد حالات بدلنے پر دُوسری دوا تجویز کرتا ہے۔

ماہر حکیم ڈاکٹر یہ بھی کرسکتا ہے کہ پہلے ہی دن پورے علاج کا نظام لکھ کر دیدے کہ دو روز تک یہ دوا اِستعمال کرو، پھر تین روز فلاں دوا، پھر ایک ہفتہ فلاں دوا، لیکن یہ مریض کی طبیعت پر بے وجہ کا ایک بار بھی ڈالنا ہے، اس میں غلط فہمی کی وجہ سے عملی خلل کا بھی خطرہ ہے، اس لئے وہ پہلے ہی سے سب تفصیلات نہیں بتلاتا۔

اللہ جل شانہٗ کے اَحکام میں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں صرف یہی آخرت صورت نسخ کی ہوسکتی ہے، اور ہوتی رہی ہے، ہر آنے والی نبوّت اور ہر نازل ہونے والی کتاب نے پچھلی نبوّت اور کتاب کے بہت سے اَحکام کو منسوخ

کر کے نئے اَحکام جاری کیے، اور اسی طرح ایک ہی نبوّت وشریعت میں ایسا ہوتا رہا کہ کچھ عرصہ تک ایک حکم جاری رہا، پھر بتقاضائے حکمتِ خداوندی اس کو بدل کر دُوسرا حکم نافذ کر دیا گیا، صحیح مسلم کی حدیث میں ہے:-

لَمْ تَكُنْ نُبُوَّةٌ قَطُّ اِلَّا تَنَاسَخَتْ۔ [1] (مسلم)

''یعنی کبھی کوئی نبوّت نہیں آئی جس نے اَحکام میں نسخ اور ردّ و بدل نہ کیا ہو'' (قرطبی)

جاہلانہ شبہات

البتہ کچھ جاہل یہودیوں نے اپنی جہالت سے اَحکامِ اِلٰہیہ کے نسخ کو دُنیوی اَحکام کے نسخ کی پہلی دونوں صورتوں پر قیاس کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر زبانِ طعن دراز کی، اسی کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ (ابنِ جریر، ابنِ کثیر وغیرہ)

مسلمانوں میں سے فرقۂ معتزلہ کے بعض لوگوں نے شاید ان مخالفین کے طعن سے بچنے کی یہ راہ نکالی کہ اَحکامِ اِلٰہیہ میں نسخ ہونے کا اِمکان تو ہے، کوئی اَمر اس اِمکان کے لئے مانع نہیں، لیکن پورے قرآن میں نسخ کا وقوع کہیں نہیں ہوا، نہ کوئی آیت ناسخ ہے، نہ منسوخ۔ یہ قول ابومسلم اصفہانی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جس پر علمائے اُمت نے ہمیشہ ردّ و نکیر فرمایا ہے، تفسیر رُوح المعانی میں ہے:-

وَاتَّفَقَتْ اَهْلُ الشَّرَائِعِ عَلٰى جَوَازِ النَّسْخِ وَوُقُوْعِهٖ وَخَالَفَتِ الْيَهُوْدُ غَيْرَ الْعِيْسَوِيَّةِ فِيْ جَوَازِهٖ وَقَالُوْا يَمْتَنِعُ عَقْلًا وَاَبُوْ مُسْلِمٍ الْاَصْفَهَانِيُّ فِيْ وُقُوْعِهٖ فَقَالَ اِنَّهٗ وَاِنْ جَازَ عَقْلًا لٰكِنَّهٗ لَمْ يَقَعْ۔

(رُوح المعانی ج:۱ ص:۳۵۲)

''تمام اہلِ شرائع کا نسخ کے جواز اور وقوع دونوں پر اِتفاق ہے، صرف یہودیوں نے بجز عیسویہ کے اِمکانِ نسخ کا اِنکار کیا ہے، اور ابومسلم اصفہانی نے وقوع کا اِنکار کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ نسخ اَحکامِ اِلٰہیہ میں ممکن تو ہے مگر کہیں واقع ہوا نہیں۔''

اور اِمام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں فرمایا:-

مَعْرِفَةُ هٰذَا الْبَابِ اَكِيْدَةٌ وَفَائِدَتُهٗ عَظِيْمَةٌ لَّا تَسْتَغْنِيْ عَنْ مَعْرِفَتِهِ الْعُلَمَاءُ وَلَا يُنْكِرُهٗ اِلَّا الْجَهَلَةُ الْاَغْبِيَاءُ۔ (قرطبی ج:۱ ص:۵۵)

''بابِ نسخ کی معرفت بہت ضروری ہے، اور فائدہ اس کا بہت بڑا ہے، اس کی معرفت سے علماء مستغنی نہیں ہو سکتے، اور جاہلوں بیوقوفوں کے سوا اس کا کوئی اِنکار نہیں کرسکتا۔''

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الزهد ج:۲ ص:۴۰۹

قرطبیؒ نے اس جگہ ایک واقعہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کا بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ مسجد میں تشریف لائے تو کوئی آدمی وعظ کہہ رہا تھا، آپ نے لوگوں سے پوچھا یہ کیا کرتا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ وعظ ونصیحت کر رہا ہے، آپ نے فرمایا: نہیں، یہ کوئی وعظ ونصیحت نہیں کرتا، بلکہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں، سو پہچانو۔ پھر اس شخص کو بلوا کر پوچھا کہ کیا تم قرآن وحدیث کے ناسخ ومنسوخ اَحکام کو جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں میں نہیں جانتا، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ہماری مسجد سے نکل جاؤ، آئندہ کبھی یہاں وعظ نہ کہو۔

قرآن وسنت میں نسخ کے وجود ووقوع کے متعلق صحابہؓ وتابعینؒ کے اتنے آثار واقوال موجود ہیں جن کو نقل کرنا مشکل ہے، تفسیر ابنِ جریر، ابنِ کثیر، درمنثور وغیرہ میں اسانیدِ قویہ صحیحہ کے ساتھ بھی بہت سی روایات مذکور ہیں، اور روایاتِ ضعیفہ کا تو شمار نہیں۔[1]

اسی لئے اُمت میں یہ مسئلہ ہمیشہ اِجماعی رہا ہے، صرف ابومسلم اصفہانی اور چند معتزلہ نے وقوعِ نسخ کا اِنکار کیا ہے، جن پر اِمام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں شرح وبسط کے ساتھ رَدّ کیا ہے۔

نسخ کے مفہوم میں متقدمین ومتأخرین کی اِصطلاحوں میں فرق

چونکہ نسخ کے اِصطلاحی معنی تبدیلِ حکم کے ہیں، اور یہ تبدیلی جس طرح ایک حکم کو بالکلیہ منسوخ کرکے اس کی جگہ دُوسرا حکم لانے میں ہے، جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنادینا، اسی طرح کسی مطلق یا عام حکم میں کسی قید وشرط کو بڑھادینا بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے، اَسلافِ اُمت نے نسخ کو اسی عام معنی میں اِستعمال فرمایا ہے، جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے، اور جزوی تبدیلی قید وشرط یا اِستثناء وغیرہ کی بھی اس میں شامل ہے، اسی لئے متقدمین حضرات کے نزدیک قرآن میں آیاتِ منسوخہ پانچ سو تک شمار کی گئی ہیں۔

حضراتِ متأخرین نے صرف اُس تبدیلی کا نام "نسخ" رکھا ہے جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہوسکے، ظاہر ہے کہ اس اِصطلاح کے مطابق آیاتِ منسوخہ کی تعداد بہت گھٹ جائے گی، اسی کا لازمی اثر یہ تھا کہ متقدمین نے تقریباً پانچ سو آیاتِ قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا، جس میں معمولی سی تبدیلی قید وشرط یا اِستثناء وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا، اور حضراتِ متأخرین میں علامہ سیوطیؒ نے صرف بیس آیتوں کو منسوخ قرار دیا، ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کرکے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ فرمایا ہے، جن میں کوئی تطبیق بغیر تأویلِ بعید کے نہیں ہوسکتی، یہ اَمر اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ اَحکام میں اصل بقاءِ حکم ہے، نسخ خلافِ اصل ہے، اس لئے جہاں آیت کے معمول بہا ہونے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۱ ص:۳۷۸ وتفسیر الطبری ج:۲ ص:۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۴

کی کوئی توجیہ ہوسکتی ہے، اس میں بلاضرورت نسخ ماننا دُرست نہیں۔

لیکن اس تقلیل کا یہ منشا ہرگز نہیں ہوسکتا ہے کہ مسئلۂ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا، جس کے اِزالے کی کوشش چودہ سو برس تک چلتی رہی، آخری اِنکشاف حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ہوا، جس میں گھٹتے گھٹتے پانچ رہ گئی، اور اَب اس کا اِنتظار ہے کہ کوئی جدید محقق ان پانچ کا بھی خاتمہ کرکے بالکل صفر تک پہنچادے۔

مسئلۂ نسخ کی تحقیق میں ایسا رُخ اِختیار کرنا نہ اِسلام اور قرآن کی کوئی صحیح خدمت ہے، اور نہ ایسا کرنے سے صحابہؓ وتابعینؒ اور پھر چودہ سو برس کے علمائے متقدمین ومتأخرین کے مقالات وتحقیقات کو دھویا جاسکتا ہے، اور نہ مخالفین کی زبانِ طعن اس سے بند ہوسکتی ہے، بلکہ اس زمانے کے ملحدین کے ہاتھ میں یہ ہتھیار دینا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چودہ سو برس تک تمام علمائے اُمت کچھ کہتے رہے ہوں اور آخر میں اس کا غلط ہونا ثابت ہوجائے، معاذ اللہ! اگر یہ دروازہ کھلے گا تو قرآن اور شریعت سے امن اُٹھ جائے گا، اس کی کیا ضمانت ہے کہ آج جو کسی نے تحقیق کی وہ کل کو غلط ثابت نہیں ہوجائے گی۔

عصرِ حاضر میں بعض علماء کی ایسی تحریریں نظر سے گزری ہیں، جنہوں نے آیتِ مذکورہ: مَا نَنْسَخْ کو متضمن معنی شرط پر ہونے کی وجہ سے ایک قضیۂ فرضیہ مثل لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ (الانبیاء:۲۲) اور لَوْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ قرار دے کر صرف اِمکانِ نسخ کی دلیل بنایا اور وقوع سے اِنکار کیا، حالانکہ تضمن معنی شرط اور قضیۂ شرطیہ بحرف "لَوْ" میں بڑا فرق ہے، اور یہ وہی اِستدلال ہے جو اَبو مسلم اصفہانی اور معتزلہ پیش کرتے ہیں۔

لیکن صحابہؓ وتابعینؒ کی تفسیریں اور پوری اُمت کے تراجم دیکھنے کے بعد اس کو مدلولِ قرآنی کہنا کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہوسکتا، صحابہ کرامؓ نے اسی آیت سے وقوعِ نسخ پر اِستدلال کیا ہے، اور متعدّد واقعات شمار کرائے ہیں۔ (ابنِ کثیر، ابنِ جریر وغیرہ) [۱]

یہی وجہ ہے کہ اُمت کے متقدمین ومتأخرین میں کسی نے بھی وقوعِ نسخ کا مطلقاً اِنکار نہیں کیا، خود حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تطبیق کرکے تعداد تو کم بتلائی مگر مطلقاً وقوعِ نسخ کا اِنکار نہیں فرمایا، ان کے بعد بھی اکابر علمائے دیوبند بلا اِستثناء سبھی وقوعِ نسخ کے قائل چلے آئے ہیں، جن میں سے متعدّد حضرات کی مستقل یا جزوی تفسیریں بھی موجود ہیں، کسی نے بھی نسخ کے وقوع کا مطلقاً اِنکار نہیں کیا، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ أعلم۔

اَوْ نُنْسِهَا، یہ مشہور قراءت کے مطابق "اِنْسَاء" اور "نِسْيَان" سے مأخوذ ہے، معنی یہ ہیں کہ کبھی نسخِ آیت کی یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ وہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہؓ کے ذہنوں سے بالکل بھلادی جائے، جیسا کہ اس

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۳۷۸

کی تفسیر میں کئی واقعے اس طرح کے حضرات مفسرین نے ذکر کئے ہیں، اس بھلا دینے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ آئندہ اس پر عمل کرانا مقصود نہیں۔

نسخ کے متعلق بقیہ احکام کی تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں، اس کا اصل محل اصولِ فقہ کی کتابیں ہیں۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ

کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو کہ سوال کرو اپنے رسول سے جیسے سوال ہو چکے ہیں موسیٰ سے اس سے پہلے، اور جو کوئی

يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

کفر لیوے بدلے ایمان کے تو وہ بہکا سیدھی راہ سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اُسی قسم کے سوال کرو جیسے پہلے موسیٰ سے کئے جا چکے ہیں؟ اور جو شخص ایمان کے بدلے کفر اختیار کرے وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا ﴿۱۰۸﴾

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عناداً عرض کیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام پر ایک ہی دفعہ توراۃ نازل ہوئی، اسی طرح آپ قرآن مجموعی طور پر لائیے، اس پر ارشاد ہوتا ہے کہ) ہاں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسولِ (وقت) سے (بے جا، بے جا) درخواستیں کرو جیسا کہ اس کے قبل (تمہارے بزرگوں کی طرف سے حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) سے بھی (ایسی ایسی) درخواستیں کی جا چکی ہیں (مثلاً خدا تعالیٰ کو علانیہ دیکھنے کی درخواست کی تھی، اور ایسی درخواستیں جن سے صرف رسول پر اعتراض کرنا اور مصالح الٰہیہ میں مزاحمت کرنا ہی مقصود ہو، اور ایمان لانے کا پھر بھی ارادہ نہ ہو نری کفر کی باتیں ہیں، اور) جو شخص ایمان لانے کی بجائے کفر (کی باتیں) کرے، بلاشک وہ راہِ راست سے دُور جا پڑا۔

فائدہ:- اس درخواست کو بے جا اس لئے فرمایا کہ ہر فعل میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں اور مصلحتیں جدا جدا ہوتی ہیں، بندے کو اس میں تعیینِ طریق کا کیا حق ہے کہ وہ کہے کہ یہ بات اس طرح ہو، یہ اس طرح ہو، اس کام تو بس یہ ہونا چاہئے:

زباں تازہ کردن باقرارِ تو
نینگیختن علت از کارِ تو [1]

ترجمہ شیخ الہندؒ میں یہ خطاب مسلمانوں سے قرار دیا ہے، اس کا حاصل مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کرنا ہوگا کہ رسول سے بے جا سوال نہ کیا کریں۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُم مِّنْ بَعْدِ إِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ

دِل چاہتا ہے بہت سے اہلِ کتاب کا کہ کسی طرح تم کو پھیر کر مسلمان ہوئے پیچھے کافر بنادیں

حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِم مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا

بسبب اپنے دِلی حسد کے بعد اس کے کہ ظاہر ہوچکا اُن پر حق، سو تم درگزر کرو اور خیال میں نہ لاؤ

حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ ؕ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ

جب تک بھیجے اللہ اپنا حکم، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور قائم رکھو نماز

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِأَنْفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ إِنَّ

اور دیتے رہو زکوٰۃ اور جو کچھ آگے بھیج دوگے اپنے واسطے بھلائی پاؤگے اس کو اللہ کے پاس، بے شک

اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

اللہ جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(مسلمانو!) بہت سے اہلِ کتاب اپنے دِلوں کے حسد کی بنا پر یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں پلٹا کر پھر کافر بنادیں، باوجودیکہ حق اُن پر واضح ہوچکا ہے۔ چنانچہ تم معاف کرو اور درگذر سے کام لو یہاں تک کہ

[1] ترجمہ:- آپ کے اِقرار کے ساتھ زبان کو تازہ کرنا ہے نہ کہ آپ کے کام میں کوئی علت نکالنا۔

اللہ خود اپنا فیصلہ بھیج دے۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ﴿۱۰۹﴾ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، اور (یاد رکھو کہ) جو بھلائی کا عمل بھی تم خود اپنے فائدے کے لئے آگے بھیج دو گے اُس کو اللہ کے پاس پاؤ گے۔ بیشک جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اُسے دیکھ رہا ہے ﴿۱۱۰﴾

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہود شب و روز مختلف تدبیروں سے دوستی اور خیر خواہی کے پیرایہ میں مسلمانوں کو اِسلام سے پھیرنے کی کوشش کیا کرتے تھے، اور باوجود ناکامی کے اپنی دُھن سے باز نہ آتے تھے، حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس پر متنبہ فرمادیا کہ) ان اہلِ کتاب (یعنی یہود) میں سے بہتیرے دِل سے یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر کافر کر ڈالیں، (اور یہ چاہنا کچھ خیر خواہی سے نہیں، جیسا کہ وہ اِظہار کرتے ہیں، بلکہ) محض حسد کی وجہ سے جو کہ (تمہاری جانب سے کسی اَمر کے سبب پیدا نہیں ہوا، بلکہ) خود ان کے دِلوں ہی سے (جوش مارتا) ہے، (اور یہ بھی نہیں کہ ان کو حق واضح نہ ہوا ہو، بلکہ) حق واضح ہوئے پیچھے (یہ حالت ہے، اب اس پر مسلمانوں کو ان پر غصہ آنے کا محل تھا، اس لئے اِرشاد ہوتا ہے کہ) خیر (اب تو) معاف کرو اور درگزر کرو جب تک حق تعالیٰ (اس معاملے کے متعلق) اپنا حکم (قانونِ جدید) بھیجیں، (اِشارۃً بتلادیا کہ ان کی شرارتوں کا علاج قانونِ اِنتظامِ امنِ عام یعنی قتال و جزیہ سے ہم جلد کرنے والے ہیں، اس پر مسلمانوں کو اپنا ضعف اور ان کی قوّت دیکھ کر اس قانون کے اِجراء کے متعلق تعجب ہوسکتا تھا، اس لئے اِرشاد ہوتا ہے کہ تم تعجب کیوں کرتے ہو) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر (خواہ وہ معمولی ہو خواہ عجیب ہو) قادر ہیں، اور (سرِ دست صرف) نمازیں پابندی سے پڑھے جاؤ اور (جن پر زکوٰۃ فرض ہے) زکوٰۃ دیئے جاؤ (اور جب وہ قانون آجائے گا ان اعمالِ صالحہ کے ساتھ اس کا بھی اِضافہ کرلینا) اور (یہ نہ سمجھو کہ جب تک جہاد کا حکم نہ آوے صرف نماز روزہ سے کچھ ثواب میں کمی رہے گی، نہیں، بلکہ) جو نیک کام بھی اپنی بھلائی کے واسطے جمع کرتے رہو گے، حق تعالیٰ کے پاس (پہنچ کر) اس کو (پورا پورا مع صلہ کے) پالوگے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کئے ہوئے کاموں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں (ان میں کا ایک ذرّہ بھی ضائع نہ ہونے پائے گا)۔

فائدہ:- اُس وقت کی حالت کا یہی مقتضیٰ تھا، پھر حق تعالیٰ نے اس وعدے کو پورا فرمایا اور جہاد کی آیات نازل ہوئیں، جس کے بعد یہود کے ساتھ بھی وہ قانون برتا گیا، اور ناشائستہ لوگوں کے ساتھ حسبِ حیثیت ان کے فساد کے بدلے قتل یا جلاوطنی یا جزیہ پر عمل درآمد کیا گیا۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ

اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ جاویں گے جنت میں مگر جو ہوں گے یہودی یا نصرانی، یہ آرزوئیں باندھ لی ہیں انہوں نے،

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ

کہہ دے: لے آؤ سند اپنی اگر تم سچے ہو۔ کیوں نہیں جس نے تابع کردیا منہ اپنا اللہ کے

وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

اور وہ نیک کام کرنے والا ہے تو اُسی کے لئے ہے ثواب اس کا اپنے رَبّ کے پاس اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ وہ

يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى (۱۳ ع ۹ ۱۳)

غمگین ہوں گے۔ اور یہود تو کہتے ہیں کہ نصاریٰ نہیں کسی راہ پر، اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ

لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ

یہودی نہیں کسی راہ پر، باوجودیکہ سب پڑھتے ہیں کتاب، اسی طرح کہا اُن لوگوں نے

لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

جو جاہل ہیں انہی کی سی بات، اب اللہ حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن

فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

جس بات میں جھگڑتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ (یعنی یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ:'' جنت میں سوائے یہودیوں یا عیسائیوں کے کوئی بھی ہرگز داخل نہیں

ہوگا،'' یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں۔ آپ اِن سے کہئے کہ اگر تم (اپنے اس دعوے میں) سچے ہو تو اپنی کوئی دلیل لے کر آؤ (۱۱۱) کیوں نہیں؟ (قاعدہ یہ ہے کہ) جو شخص بھی اپنا رُخ اللہ کے آگے جھکا دے، اور وہ نیک عمل کرنے والا ہو، اُسے اپنا اَجر اپنے پروردگار کے پاس ملے گا۔ اور ایسے لوگوں کو نہ کوئی خوف ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے (۱۱۲) اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں (کے مذہب) کی کوئی بنیاد نہیں، اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں (کے مذہب) کی کوئی بنیاد نہیں، حالانکہ یہ سب (آسمانی) کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح وہ (مشرکین) جن کے پاس کوئی (آسمانی) علم ہی سرے سے نہیں ہے، انہوں نے بھی اِن (اہلِ کتاب) کی جیسی باتیں کہنی شروع کردی ہیں۔ چنانچہ اللہ ہی قیامت کے دن اِن کے درمیان اُن باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں یہ اِختلاف کرتے رہے ہیں۔ (۱۱۳)

خلاصۂ تفسیر

اور یہود ونصاریٰ (یوں) کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پاوے گا بجز اُن لوگوں کے جو یہودی ہوں (یہ تو یہود کا قول ہے) یا اُن لوگوں کے جو نصرانی ہوں (یہ نصاریٰ کا قول ہے، حق تعالیٰ اُن کی تردید فرماتے ہوئے اِرشاد فرماتے ہیں کہ) یہ (خالی) دِل بہلانے کی باتیں ہیں (اور حقیقت کچھ بھی نہیں) آپ (ان سے یہ تو) کہئے کہ (اچھا) اپنی دلیل لاؤ اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو، (سو وہ تو کیا دلیل لاویں گے، کیونکہ کوئی دلیل ہے ہی نہیں، اب ہم اس کے خلاف پہلے تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ) ضرور دُوسرے لوگ (بھی جنت میں) جاویں گے (پھر اس پر دلیل لاتے ہیں کہ ہمارا قانون جو باتفاقِ سماوی ملتوں کے ماننے والوں کے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے یہ ہے کہ) جو کوئی شخص بھی اپنا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے (یعنی اعمال وعقائد میں فرمانبرداری اِختیار کرے) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو (کہ فرمانبرداری دِلی طور پر اِختیار کی ہو، محض مصلحت سے ظاہرداری نہ ہو) تو ایسے شخص کو اس (کی فرمانبرداری) کا عوض ملتا ہے پروردگار کے پاس پہنچ کر، اور ایسے لوگوں پر (قیامت میں) نہ کوئی اندیشہ (ناک واقعہ پڑنے والا) ہے، اور نہ ایسے لوگ (اس روز) مغموم ہونے والے ہیں (کیونکہ فرشتے ان کو بشارتیں سنا کر بے فکر کردیں گے)۔

(حاصل اِستدلال کا یہ ہوا کہ جب یہ قانون مُسلّم ہے تو اَب صرف یہ دیکھ لو کہ یہ بات کس پر صادق آتی ہے؟ سو ظاہر ہے کہ کسی حکمِ سابق کے منسوخ ہوجانے کے بعد اس پر عمل کرنے والا کسی بھی طور پر فرمانبردار نہیں کہلا سکتا، لہٰذا یہود ونصاریٰ فرمانبردار نہ ہوئے، بلکہ حکمِ ثانی پر عمل کرنا فرمانبرداری سمجھی جائے گی، اور یہ شان مسلمانوں کی ہے، کہ نبوّت وشریعتِ محمدیہ کو قبول کرلیا، چنانچہ یہی جنت میں داخل ہونے والے شمار ہوئے۔

اور مخلصین کی قید سے منافقین نکل گئے) (کیونکہ وہ بھی شرعاً کفار ہی میں داخل اور مستحقِ جہنم ہیں) اور (ایک بار

کچھ یہودی اور کچھ نصرانی جمع ہو کر مذہبی مباحثہ کرنے لگے، تو یہود تو اپنے عقیدہ کے موافق نصاریٰ کے دِین کو باطل بتاتے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوّت اور اِنجیل کے کتابُ اللہ ہونے کا اِنکار کرتے تھے، مگر نصاریٰ بھی ضد وتعصب میں آ کر دِینِ یہود کو بے اصل و باطل کہنے لگے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رِسالت اور توریت کے کتابُ اللہ ہونے کا اِنکار کرنے لگے، اللہ تعالیٰ اس قصہ کو نقل فرما کر بطورِ تردید فرماتے ہیں کہ) یہود کہنے لگے کہ نصاریٰ (کا مذہب) کسی بنیاد پر (قائم) نہیں، (یعنی سرے سے غلط ہے) اور اسی طرح نصاریٰ کہنے لگے کہ یہود (کا مذہب) کسی بنیاد پر قائم نہیں، (یعنی سرے سے غلط ہے) حالانکہ یہ سب (فریقین کے لوگ آسمانی) کتابیں (بھی) پڑھتے (پڑھاتے) ہیں (یعنی یہودی توریت کو اور عیسائی اِنجیل کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں اور دونوں کتابوں میں دونوں رسولوں اور دونوں کتابوں کی تصدیق موجود ہے، جو کہ دونوں مذہبوں کی اصل بنیاد ہے، گو منسوخ ہو جانے کی بنا پر قابلِ عمل نہ ہو، یہ اور بات ہے)۔

(اور اہلِ کتاب تو ایسے دعوے کرتے ہی تھے، ان کی دیکھا دیکھی مشرکین کو بھی جوش آیا اور) اسی طرح سے یہ لوگ (بھی) جو کہ (محض) بے علم ہیں، ان (ہی اہلِ کتاب) کا سا قول دُہرانے لگے، (کہ ان یہود ونصاریٰ سب کا دِین بے بنیاد ہے، حق پر بس ہم ہی ہیں) سو (یہاں سب اپنی اپنی ہانک لیں) اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان (عملی) فیصلہ کر دیں گے، قیامت کے دن ان تمام مقدمات میں جن میں وہ باہم اِختلاف کر رہے تھے، (اور وہ عملی فیصلہ یہ ہوگا کہ اہلِ حق کو جنت میں اور اہلِ باطل کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا، عملی فیصلہ کی قید اس لئے لگائی کہ قولی اور برہانی فیصلہ تو عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعہ دُنیا میں بھی ہو چکا ہے)۔

معارف ومسائل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کے باہمی اِختلافات اور ایک دُوسرے پر رَدّ کا ذِکر فرما کر ان کی نادانی اور اس اِختلاف کے مضر اَثرات کا بیان، پھر اَصل حقیقت کا اِظہار فرمایا ہے، ان تمام واقعات میں مسلمانوں کے لئے بڑی اہم ہدایات ہیں جن کا بیان آگے آتا ہے۔

یہود ونصاریٰ دونوں نے دِین کی اصل حقیقت کو فراموش کر کے مذہب کے نام پر ایک قومیت بنالی تھی، اور ان میں سے ہر ایک اپنی ہی قوم کے جنتی اور مقبول ہونے، اور اپنے سوا تمام اقوامِ عالم کے دوزخی اور گمراہ ہونے کا معتقد تھا۔

اس نامعقول اِختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ عیسائیت بھی بے بنیاد اور یہودیت بھی بے اصل، حق وصحیح بس ہماری بت پرستی ہے۔

حق تعالیٰ نے ان دونوں قوموں کی جہالت وگمراہی کے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں قومیں جنت میں جانے کے اصل

سب سے غافل ہیں، محض مذہب کے نام کی قومیت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مذہبِ یہود ہو یا نصاریٰ یا اِسلام ان سب کی اصل رُوح دو چیزیں ہیں:-

ایک یہ کہ بندہ دِل وجان سے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کردے، اس کی اِطاعت وفرمانبرداری کو اپنا عقیدہ ومذہب سمجھے، چاہے یہ کسی مذہب میں حاصل ہو، حقیقتِ دِین ومذہب کو فراموش کرکے یا پسِ پشت ڈال کر یہودی یا نصرانی قومیت کو اَپنا مقصد بنالینا دِین ومذہب سے ناواقفیت اور گمراہی ہے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ جنت میں جانے کے لئے صرف یہ بھی کافی نہیں کہ کوئی آدمی اپنے دِل سے خدا کی فرمانبرداری کا قصد تو دُرست کرلے، مگر اِطاعت، فرمانبرداری اور عبادت کے طریقے اپنے ذہن وخیال کے مطابق خود گھڑلے، بلکہ یہ ضروری ہے کہ عبادت واِطاعت اور اِمتثالِ اَمر کے طریقے بھی وہی اختیار کرے جو خدا تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے بتائے اور متعین کئے ہوں۔

پہلی بات بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ الخ کے ذریعے اور دُوسری وَهُوَ مُحْسِنٌ الخ کے ذریعے واضح کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ نجاتِ اُخروی اور دُخولِ جنت کے لئے صرف قصدِ اِطاعت کافی نہیں، بلکہ حسنِ عمل بھی ضروری ہے، اور حسنِ عمل کا مصداق وہی تعلیم وطریقہ ہے جو قرآن اور سنت رسول خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو۔

نسلی مسلمان ہو یا یہودی ونصرانی، اللہ کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہیں، اصل چیز اِیمان اور عملِ صالح ہے

جو شخص ان بنیادی اُصولوں میں سے کسی بھی اُصول کو چھوڑ دے، خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی یا مسلمان اور پھر محض نام کی قومیت کے زعم میں اپنے آپ کو جنت کا ٹھیکہ دار سمجھ لے تو یہ صرف اس کی خودفریبی ہے، جس کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی بھی ان ناموں کا سہارا لے کر قریب نہیں ہوسکتا، نہ مقبول بن سکتا ہے، جب تک اس میں اِیمان وعملِ صالح کی رُوح موجود نہ ہو۔

پھر اُصولِ اِیمان تو ہر رسول اور ہر شریعت کے زمانے میں مشترک ویکساں رہے ہیں، البتہ عملِ صالح ومقبول کی شکلیں کچھ ادلتی بدلتی رہی ہیں، توراۃ کے زمانے میں عملِ صالح وہ سمجھا گیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توریت کی تعلیم کے مطابق تھا، اِنجیل کے دور میں عملِ صالح یقیناً وہی عمل تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اِنجیل کی تعلیم سے مطابقت رکھتا تھا، اور اَب قرآن کے زمانے میں وہی عمل عملِ صالح کہے جانے کا مستحق ہوگا جو نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور ان کی لائی ہوئی اللہ کی کتاب ''قرآن مجید'' کی ہدایت کے مطابق ہوگا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہود و نصاریٰ کے اس اختلاف کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں قومیں جہالت کی باتیں کر رہی ہیں، دونوں میں سے کوئی بھی جنت کا ٹھیکہ دار نہیں، اور نہ ہی دونوں کے مذہب بے بنیاد اور بے اصل ہیں، بلکہ دونوں مذہبوں کی صحیح بنیاد موجود ہے، غلط فہمی کا سببِ اصلی یہ ہے کہ انہوں نے مذہب و ملت کی اصل رُوح یعنی عقائد و اعمال اور نظریات کو چھوڑ کر نسلی یا وطنی بنیاد پر کسی قوم کو یہود ٹھہرا لیا اور کسی کو نصرانی سمجھ لیا۔

جو یہود کی نسل سے ہو، یا یہود کے شہر میں بستا ہو، یا مردم شماری میں اپنے آپ کو یہودی بتاتا ہو، اس کو یہود سمجھ لیا گیا، اسی طرح نصرانیوں کی تشخیص و تعیین کی گئی، حالانکہ اُصولِ ایمان کو توڑ کر اور اَعمالِ صالحہ سے منہ موڑ کر نہ کوئی یہودی، یہودی رہتا ہے، نہ نصرانی، نصرانی۔

قرآنِ کریم میں اس اِختلاف اور اس فیصلہ کا ذِکر مسلمانوں کو سنانے اور متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ کہیں وہ بھی اس قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں، کہ ہم تو پشتی مسلمان ہیں، ہر دفتر و رجسٹر میں ہمارا نام مسلمان کے خانے میں درج ہے، اور ہم زبان سے بھی اپنے کو مسلمان ہی کہتے ہیں، اس لئے جنت کے نیز ان تمام اِنعامی وعدوں کے ہم ہی مستحق ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مسلمانوں سے کئے گئے۔

اس فیصلہ سے اُن پر واضح ہو جانا چاہئے کہ کوئی شخص نہ محض دعوے سے حقیقی مسلمان بنتا ہے، نہ کہیں مسلمان نام درج کرانے یا مسلمان کی صلب سے، یا ان کے شہر میں پیدائش ہونے کی وجہ سے، بلکہ مسلمان ہونے کے لئے اوّل اِسلام ضروری ہے، اور اِسلام کے معنی ہی اپنے آپ کو سپرد کرنے اور سونپ دینے کے ہیں، دُوسرے اِحسانِ عمل یعنی سنت کے مطابق عمل کو دُرست کرنا۔

لیکن قرآنِ کریم کی اس تنبیہ کے باوجود بہت سے مسلمان، اسی یہودی اور نصرانی غلطی کا شکار ہو گئے، کہ خدا و رسول اور آخرت و قیامت سے بالکل غافل رہ کر اپنا نسلی مسلمان ہونا مسلمان ہونے کے لئے کافی سمجھنے لگے، اور قرآن و حدیث میں جو وعدے فلاحِ دُنیا و آخرت کے مسلمانوں سے کئے گئے ہیں اپنے آپ کو ان کا مستحق سمجھ کر ان کے پورے ہونے کا اِنتظار کرنے لگے، اور جب وہ پورے ہوتے نظر نہیں آتے تو قرآن و حدیث کے وعدوں میں شک کرنے لگے، اس کو نہیں دیکھتے کہ قرآن نے محض نسلی مسلمانوں سے کوئی وعدہ نہیں کیا، جب تک وہ اپنے تمام اِرادوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع نہ کر دیں، اور ان کے بتلائے ہوئے طریقوں پر عملِ صالح کے پابند نہ ہوں، یہی خلاصہ ہے آیتِ مذکورہ: بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ کا۔

آج کل پوری دُنیا کے مسلمان طرح طرح کے مصائب و آفات کا شکار ہیں، اس کو دیکھ کر بہت سے ناواقف لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ان تمام آفات و مصائب کا سبب ہمارا اِسلام ہی ہے، لیکن مذکورہ تحریر سے واضح ہو گیا کہ

اس کا اصلی سبب ہمارا اِسلام نہیں بلکہ ترکِ اِسلام ہے، کہ ہم نے اِسلام کا صرف نام باقی رکھا ہے، نہ اس کے عقائد ہمارے اندر ہیں، نہ اخلاق، نہ اعمال، گویا ۔

وضع میں ہم ہیں نصاریٰ تو تمدن میں ہنود

پھر ہمیں کیا حق ہے کہ اسلام اور مسلم کے لئے کئے ہوئے وعدوں اور اِنعاموں کا ہم اِنتظار کریں۔

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ہم کچھ بھی سہی نام تو اِسلام کا لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا تو ہیں، اور جو کفار کھلے طور پر اللہ و رسول کی مخالفت کرتے ہیں، اِسلام کا نام لینا بھی پسند نہیں کرتے، وہ تو آج دُنیا میں ہر طرح کی ترقی کررہے ہیں، بڑی بڑی حکومتوں کے مالک بنے ہوئے ہیں، دُنیا کی صنعتوں اور تجارتوں کے ٹھیکہ دار بنے ہوئے ہیں، اگر ہماری بدعملی کی ہمیں یہ سزا مل رہی ہے کہ ہم ہر جگہ پامال و پریشان ہیں تو کفار و فجار کو اس سے زیادہ سزا ملنی چاہئے لیکن اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ شبہ خود بخود رفع ہوجائے گا۔

اوّل تو اس لئے کہ دوست اور دُشمن کے ساتھ معاملہ یکساں نہیں ہوا کرتا، دوست کو قدم قدم اور بات بات پر ٹوکا جاتا ہے، اولاد اور شاگرد کو ذَرا ذَرا سی بات پر سزا دی جاتی ہے، لیکن دُشمن کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوتا، اس کو ڈھیل دی جاتی ہے، اور وقت آنے پر دفعۃً پکڑ لیا جاتا ہے۔

مسلمان جب تک اِیمان و اِسلام کا نام لیتا ہے، اور اللہ کی عظمت و محبت کا دَم بھرتا ہے، وہ دوستوں کی فہرست میں داخل ہے، اُس کے برے اعمال کی سزا عموماً دُنیا ہی میں دے دی جاتی ہے، تاکہ آخرت کا بار ہلکا ہوجائے، بخلاف کافر کے کہ اس پر باغیوں اور دُشمنوں کا قانون جاری ہے، دُنیا کی ہلکی ہلکی سزاؤں سے ان کا بارِ عذاب ہلکا نہیں کیا جاتا، اُن کو یک لخت عذاب میں پکڑا جائے گا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اِرشادِ گرامی کا یہی مطلب ہے کہ ''دُنیا مؤمن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے''۔ [۱]

دُوسری اہم بات مسلمانوں کے تنزل اور پریشانی اور کفار کی ترقی و آرام کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کا جداگانہ خاصہ رکھا ہے، ایک عمل کرنے سے دُوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہوسکتے، مثلاً تجارت کا خاصہ ہے مال میں زیادتی، دواء کا خاصہ ہے بدن کی صحت، اب اگر کوئی شخص تجارت میں تو دِن رات لگا رہے بیماری اور اس کے علاج کی طرف توجہ نہ دے تو محض تجارت کے سبب وہ بیماری سے نجات نہیں پاسکتا، اسی طرح دوا دَارو کا اِستعمال کرکے تجارت کا خاصہ یعنی مال کی زیادتی حاصل نہیں کرسکتا، کفار کی دُنیوی ترقی اور مال و دولت کی فراوانی ان کے کفر کا نتیجہ نہیں، جیسے مسلمان کا افلاس

[۱] مشکوٰۃ، کتاب الرقاق ج:۲ ص:۴۳۹

و پریشانی اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ کفار نے جب آخرت کی فکر چھوڑ دی اور پوری طرح دُنیا کے مال و دولت اور عیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صنعت، زراعت اور حکومت و سیاست کے مفید راستوں کو اِختیار کیا، مضر طریقوں سے بچے، تو دُنیا میں ترقی حاصل کرلی، اگر وہ بھی ہماری طرح صرف اپنے مذہب کا نام لے کر بیٹھ جاتے اور دُنیوی ترقی کے لئے اس کے اُصول کے مطابق جد و جہد نہ کرتے تو ان کا کفر اُن کو مال و دولت یا حکومت کا مالک نہ بنا دیتا، پھر ہم یہ کیسے سمجھ لیں کہ ہمارا اِسلام اور وہ بھی صرف نام کا، ہماری ساری فتوحات کے دروازے کھول دے گا؟ اِسلام و اِیمان اگر بالکل صحیح اُصول پر بھی ہو تو اس کا اصلی خاصہ اور نتیجہ نجاتِ آخرت اور جنت کی دائمی راحت ہے، دُنیا میں مال و دولت کی فراوانی یا عیش و آرام کی وسعت اس کے نتیجے میں حاصل کرنا ضروری نہیں جب تک اس کے لئے مناسب جد و جہد نہ کی جائے۔

اور یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ جہاں کہیں اور جب کوئی مسلمان تجارت و صنعت، حکومت و سیاست کے اُصولِ صحیحہ کو سیکھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ بھی ان دُنیوی ثمرات و نتائج سے محروم نہیں رہتا جو کسی کافر کو حاصل ہو رہے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ دُنیا میں ہمارا اِفلاس و اِحتیاج اور مصائب و آفات ہمارے اِسلام کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طرف اِسلامی اخلاق و اعمال چھوڑنے کا اور دُوسری طرف ان تمام کاموں سے منہ موڑنے کا نتیجہ ہے، جن کے عمل میں لانے سے مال و دولت میں زیادتی ہوا کرتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں جب یورپ والوں کے ساتھ اِختلاط کا اِتفاق پیش آیا تو ہم نے ان سے صرف ان کا کفر اور آخرت سے غفلت اور بے حیائی و بداَخلاقی تو سب سیکھ لی، لیکن ان کے وہ اعمال نہ سیکھے جن کی وجہ سے وہ دُنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں، جس مقصد کے لئے کھڑے ہوں اس کے پیچھے اَن تھک کوشش، معاملہ کی سچائی، بات کی سچائی اور دُنیا میں اثر و رُسوخ حاصل کرنے کے نئے نئے طریقے جو درحقیقت اِسلام ہی کی اصلی تعلیمات ہیں ہم نے ان کو دیکھ کر بھی اس کی نقل اُتارنے کی کوشش نہ کی تو یہ قصور ہمارے اِسلام کا ہے یا ہمارا اپنا قصور ہے۔

الغرض قرآن کی ان آیات نے واضح کر دیا کہ محض نسلی طور پر اِسلام کا نام رکھ لینا کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا سکتا، جب تک اِیمان اور عملِ صالح کو مکمل طور پر اِختیار نہ کیا جائے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى

اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ لیا جاوے وہاں نام اس کا اور کوشش کی

فِیْ خَرَابِهَاؕ اُولٰٓىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآىِٕفِیْنَ۬ؕ لَهُمْ

ان کے اُجاڑنے میں، ایسوں کو لائق نہیں کہ داخل ہوں اُن میں مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لئے

فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ

دُنیا میں ذلت ہے اور اُن کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ اور اللہ ہی کا ہے مشرق

وَ الْمَغْرِبُۗ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور مغرب سو جس طرف تم منہ کرو وہاں ہی متوجہ ہے اللہ، بے شک اللہ بے انتہا بخشش کرنے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں پر اس بات کی بندش لگادے کہ ان میں اللہ کا نام لیا جائے، اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کرے۔ ایسے لوگوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان (مسجدوں) میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے۔ ایسے لوگوں کے لئے دُنیا میں رُسوائی ہے، اور انہی کو آخرت میں زبردست عذاب ہوگا۔ ﴿۱۱۴﴾ اور مشرق ومغرب سب اللہ ہی کی ہیں۔ لہٰذا جس طرف بھی تم رُخ کروگے، وہیں اللہ کا رُخ ہے۔ بیشک اللہ بہت وسعت والا، بڑا علم رکھنے والا ہے ﴿۱۱۵﴾

خلاصہ تفسیر

(یہود تو قبلہ کا حکم بدلنے کے وقت طرح طرح کے اِعتراض کر کے کم سمجھ لوگوں کے دِلوں میں شبہات پیدا کرتے تھے، اگر وہ شبہات عام طور پر قلوب میں اثر کرتے تو اُن کا لازمی نتیجہ اِنکارِ رسالت اور ترکِ نماز نکلتا، اور ترکِ نماز سے مسجد کی ویرانی لازم ہے، تو گویا یہ یہودی اس طور سے ترکِ نماز اور ویرانیٔ مساجد خصوصاً مسجدِ نبوی میں بھی کوشاں تھے، اور رُوم کے بعض سلاطین جو نصاریٰ کے اسلاف تھے، اور نصاریٰ ان کے افعال کا اِنکار بھی نہ کرتے تھے، گو وہ نصرانی نہ ہوں، کسی زمانے میں یہودِ شام پر چڑھ آئے تھے، قتل وقتال بھی ہوا، اور اس وقت بعض جہلاء کے ہاتھ سے مسجدِ بیت المقدس کی

بے حرمتی بھی ہوئی، اور بدامنی کی وجہ سے اس میں نماز وغیرہ کا اہتمام بھی نہ ہوا، اس طور پر نصاریٰ کے اسلاف ترکِ نماز اور ویرانیٔ مسجد کے بانی ہوئے، اور نصاریٰ پر بوجہ عدمِ انکار اس کا الزام دیا گیا، اس بادشاہ کا نام ''طیطس'' تھا، اور نصاریٰ کو یہ قصہ اس لئے ناگوار نہ تھا کہ اس میں یہودیوں کی تذلیل ہوئی تھی، اور یہ یہود سے عداوت رکھتے تھے، اور جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتحِ مکہ سے پہلے جب مکہ معظّمہ میں داخل ہوکر مسجد الحرام کا طواف اور نماز ادا فرمانی چاہی تو مشرکینِ مکہ نے آپ کو نہ جانے دیا، یہاں تک کہ آپ اس سال واپس تشریف لے آئے، تو اس طرح یہ مشرکین بھی مسجدِ حرام کی ویرانی میں کوشاں ہوئے، اس لئے حق تعالیٰ نے صیغۂ عموم سے اس کی قباحت اور برائی ظاہر فرمائی، یعنی) اور اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں (جس میں مکہ کی مسجدِ حرام، مدینہ کی مسجد، بیت المقدس کی مسجد اور سب مسجدیں آگئیں) ان کا ذِکر (اور عبادت) کئے جانے سے بندش کرے، اور ان (مساجد) کے ویران (اور معطل) ہونے (کے بارے) میں کوشش کرے، ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت (اور بے باک) ہوکر ان (مساجد) میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا، (بلکہ جب جاتے تو نہایت عظمت وحرمت وادب سے جاتے، جب بے باک ہوکر اندر جانے تک کا استحقاق نہیں تو اس کی ہتکِ حرمت کا حق کب حاصل ہے، اسی کو ظلم فرمایا گیا) ان لوگوں کو دُنیا میں بھی رُسوائی (نصیب) ہوگی، اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی۔

(یہود نے تبدیلِ قبلہ کے حکم پر اعتراض کیا تھا کہ مسلمان اس جہت سے دُوسری جہت کی طرف کیوں پھر گئے، اس کا جواب حق تعالیٰ دیتے ہوئے فرماتے ہیں، یعنی) اور اللہ ہی کی مملوک ہیں (سب جہتیں) مشرق بھی اور مغرب بھی (اور وہ اس کا مکان نہیں)۔

(پس جب وہ مالک ہیں جس جہت کو چاہیں قبلہ مقرّر کردیں، کیونکہ حکمتِ تعیینِ قبلہ میں مثلاً عابدین کا اتفاقِ ہیئت اور اجتماعِ خاطر ہے، اور یہ حکمت ہر جہت سے حاصل ہوسکتی ہے، جس کا حکم دے دیں وہی متعین ہوجائے گی، ہاں البتہ اگر معبود کی ذات نعوذ باللہ کسی جہتِ خاص کے ساتھ مقید ہوتی تو ضرورت کی وجہ سے اسی جہت میں قبلۂ عبادت بننے کا انحصار زیبا تھا، لیکن وہ ذاتِ پاک کسی جہت کے ساتھ مقید ومحدود نہیں جب یہ بات ہے) تو تم لوگ جس طرف بھی منہ کرو اُدھر (ہی) اللہ تعالیٰ (کی ذاتِ پاک) کا رُخ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ (خود تمام جہات اور اشیاء کو) محیط ہیں (جس طرح کا احاطہ اُن کی شان کے لائق ہے، لیکن باوجود محیط وغیر محدود ہونے کے پھر بھی جہتِ عبادت کو متعین اس لئے فرمایا کہ وہ) کامل العلم ہیں (کہ ہر شے کے مصالح کو خوب جانتے ہیں، چونکہ ان کے علم میں یہ تعیین بعض مصالح سے تھی، اس لئے اس کا حکم دے دیا)۔

فوائد از "بیان القرآن"

۱- ویرانیٔ مساجد میں کوشاں گروہ کی دُنیا میں تو یہ رُسوائی ہوئی کہ یہ ساری قومیں اسلامی سلطنت کی رعایا اور باج گزار ہوئیں، اور عذابِ آخرت تو کافر ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے ہی، اور ویرانیٔ مساجد میں کوشش کے سبب یہ عذاب اور بھی سخت وشدید ہوجائے گا، اور اُوپر کی آیت میں جو ان تینوں فرقوں کے حق پر ہونے کا دعویٰ مذکور ہوا تھا اس قصہ سے اس کی تردید کا ایک گونہ مفہوم بھی نکل آیا کہ ایسے ایسے افعال کر کے صاحبِ حق ہونے کا دعویٰ بڑے شرم کی بات ہے۔

۲- تعیینِ قبلہ کی جو ایک حکمت بطورِ مثال اُوپر بیان کی گئی، اس سے بعض مخالفینِ اسلام کا یہ اعتراض کہ "مسلمان کعبہ پرست ہیں" بالکل اُٹھ گیا۔

جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ عبادت و پرستش تو خدا تعالیٰ کی ہے، لیکن عبادت کے وقت یکسوئی قلب کی ضرورت ہے، نیز عابدین کی ہیئتِ اجتماعیہ کو بھی اس یکسوئی میں دخل ہے، چنانچہ یہ دونوں باتیں تجربہ ومشاہدہ سے ثابت ہیں، اس لئے یکسوئی اور اجتماعی ہیئت حاصل کرنے کے لئے تعیینِ جہت مشروع ہوئی، لہٰذا اس اعتراض وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

اور اگر اس پر کوئی اپنی براءت کے لئے یہ دعویٰ کرے کہ ہم بھی بتوں کو سامنے اسی قصد وغرض سے رکھتے ہیں، تو اوّل تو اپنی براءت کے دعوے سے مسلمانوں پر مذکورہ اعتراض نہیں لوٹتا، وہ بدستور مرتفع رہا، جو اس مقام پر مقصودِ اصلی ہے۔

ثانیاً، عام مسلمانوں اور عام کافروں کی حالت تفتیش کرنے سے عدمِ پرستش کے دعوے میں مسلمانوں کا راست گو ہونا اور دُوسروں کا دروغ گو ہونا ہر وقت، ہر شخص کو معلوم ہوسکتا ہے۔

تیسرے، علی السبیل التنزل کہا جاتا ہے کہ اگر اس دعوے کی سچائی مان بھی لی جائے پھر بھی اس تعیین اور تقیید کے لئے کسی غیر منسوخ شریعت کا حکم پیش کرنا لازم ہے، اور یہ بجز اہلِ اسلام کے دُوسروں کے پاس مفقود ہے۔

اور ترجمہ وتفسیر کے ضمن میں بیانِ حکمت کے لئے جو لفظ مثلاً اضافہ کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اَحکامِ خداوندی کی حکمتیں اور مصلحتیں انحصار اور استیعاب کے ساتھ کسی کے اِدراک میں نہیں آسکتیں، سو اس حکم میں بھی ہزاروں حکمتیں ہوں گی، ایک دو کے سمجھ جانے سے ان میں انحصار اور دُوسروں کی نفی نہیں ہوسکتی۔

۳- اور یہ جو فرمایا ہے کہ "اُدھر ہی اللہ کا رُخ ہے" اور اسی طرح یہ جو فرمایا ہے کہ "وہ محیط ہے" اور ایسے ہی جو مضامین ہوں ان سب میں زیادہ کھود کرید نہ کرنی چاہئے، کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا پورا اِدراک کسی بندہ سے ممکن نہیں، اسی طرح اس کی صفات کی حقیقت بھی فہم سے خارج ہے، اِجمالاً سب پر ایمان لے آوے، اس سے زیادہ کا اِنسان مکلّف نہیں۔

عنقا شکار کس نشود دام باز چین
کاینجا ہمیشہ باد بدست است دام را [۱]

معارف ومسائل

ان دو آیتوں میں دو اہم مسئلوں کا بیان ہے، پہلی آیت ایک خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ زمانۂ اسلام سے پہلے جب یہودیوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالا تو رُوم کے نصاریٰ نے ان سے انتقام لینے کی خاطر عراق کے ایک مجوسی [۲] بادشاہ کے ساتھ مل کر اپنے بادشاہ طیطوس کی سرکردگی میں شام کے بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کو قتل و غارت کیا اور توراۃ کے نسخے جلا ڈالے، بیت المقدس میں نجاسات اور خنزیر ڈال دیئے، اس کی عمارت کو خراب و ویران کر دیا، بنی اسرائیل کی قوت و شوکت کو بالکل پامال اور ختم کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک تک بیت المقدس اسی طرح ویران و منہدم پڑا تھا۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب شام و عراق فتح ہوئے تو آپ کے حکم سے بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر کرائی گئی، زمانۂ دراز تک پورا ملکِ شام و بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں رہا، پھر ایک عرصے کے بعد بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا، اور تقریباً سو سال یورپ کے عیسائیوں کا اس پر قبضہ رہا، تا آنکہ چھٹی صدی ہجری میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے پھر اس کو فتح کیا۔

رُومی نصاریٰ کی اس گستاخانہ حرکت پر کہ توراۃ کو جلایا اور بیت المقدس کو خراب و ویران کر کے اس کی بے حرمتی کی، یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ قول مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ہے، اور حضرت ابن زیدؒ وغیرہ دُوسرے مفسرین نے آیت کا شانِ نزول یہ بتلایا ہے کہ جب مشرکینِ مکہ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعۂ حدیبیہ کے وقت مسجدِ حرام میں داخل ہونے اور طواف کرنے سے روک دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن جریرؒ نے پہلی روایت کو اور ابنِ کثیرؒ نے دُوسری کو ترجیح دی ہے۔ [۳]

---

[۱] ترجمہ:- عنقا پرندہ کسی کے شکار میں نہیں آسکتا، اپنا جال اُٹھالو، یہاں جال میں ہمیشہ ہوا ہی آیا کرتی ہے۔

[۲] بعض مفسرین نے اس مجوسی بادشاہ کا نام ''بخت نصر'' بتلایا، اس سے معروف بخت نصر تو اس لئے مراد نہیں ہوسکتا کہ اس کا زمانہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے بہت پہلے ہے، یہ ممکن ہے کہ بعد میں کسی دُوسرے بادشاہ کو ''بخت نصر ثانی'' کہنے لگے ہوں۔ ۱۲ (محمد شفیع)

[۳] تفسیر الطبری تحت هٰذه الآیة ج:۲ ص:۵۲۰ وتفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۳۸۸

بہرحال آیت کا شانِ نزول تو مفسرین کے نزدیک ان دونوں واقعوں میں سے کوئی خاص واقعہ ہے، مگر اس کا بیان عام لفظوں میں ایک مستقل ضابطہ اور قانون کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے، تاکہ یہ حکم انہی نصاریٰ یا مشرکین وغیرہ کے لئے مخصوص نہ سمجھا جائے بلکہ تمام اقوامِ عالم کے لئے عام رہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں خاص بیت المقدس کا نام لینے کے بجائے مَسٰجِدَ اللّٰهِ فرما کر تمام مساجد پر اس حکم کو عام کر دیا گیا، اور آیت کا مضمون یہ ہو گیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی کسی مسجد میں لوگوں کو اللہ کا ذِکر کرنے سے روکے، یا کوئی ایسا کام کرے جس سے مسجد ویران ہو جائے تو وہ بہت بڑا ظالم ہے۔

مساجد اللہ کی عظمت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان میں جو شخص داخل ہو، ہیبت و عظمت اور خشوع و خضوع کے ساتھ داخل ہو، جیسے کسی شاہی دربار میں داخل ہوتے ہیں۔

اس آیت سے جو چند ضروری مسائل واَحکام نکلے ان کی تفصیل یہ ہے:-

اوّل یہ کہ دُنیا کی تمام مساجد آدابِ مسجد کے لحاظ سے مساوی ہیں، جیسے بیت المقدس، مسجدِ حرام یا مسجدِ نبوی کی بے حرمتی ظلمِ عظیم ہے، اسی طرح دُوسری تمام مساجد کے متعلق بھی یہی حکم ہے، اگرچہ ان تینوں مساجد کی خاص بزرگی وعظمت اپنی جگہ مُسلّم ہے کہ مسجدِ حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر، اور مسجدِ نبوی و نیز بیت المقدس میں پچاس ہزار نمازوں کے برابر ملتا ہے، ان تینوں مساجد میں نماز پڑھنے کی خاطر دُور دَراز ملکوں سے سفر کر کے پہنچنا موجبِ ثوابِ عظیم اور باعثِ برکات ہے، بخلاف دُوسری مساجد کے کہ ان تینوں کے علاوہ کسی دُوسری مسجد میں نماز پڑھنے کو اَفضل جان کر اس کے لئے دُور سے سفر کر کے آنے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔[1]

دُوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد میں ذِکر و نماز سے روکنے کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ سب ناجائز و حرام ہیں، ان میں سے ایک صورت تو یہ کھلی ہوئی ہے ہی کہ کسی کو مسجد میں جانے سے یا وہاں نماز و تلاوت سے صراحۃً روکا جائے، دُوسری صورت یہ ہے کہ مسجد میں شور و شغب کر کے یا اس کے قرب و جوار میں باجے گاجے بجا کر لوگوں کی نماز و ذِکر وغیرہ میں خلل ڈالے، یہ بھی ذِکر اللہ سے روکنے میں داخل ہے۔

اسی طرح اوقاتِ نماز میں جبکہ لوگ اپنی نوافل یا تسبیح و تلاوت وغیرہ میں مشغول ہوں، مسجد میں کوئی بلند آواز سے تلاوت یا ذِکر بالجہر کرنے لگے، تو یہ بھی نمازیوں کی نماز و تسبیح میں خلل ڈالنے اور ایک حیثیت سے ذِکر اللہ کو روکنے کی صورت ہے، اسی لئے حضراتِ فقہاء نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، ہاں جب مسجد عام نمازیوں سے خالی ہو، اس وقت ذِکر یا تلاوتِ جہر کا مضائقہ نہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس وقت لوگ نماز و تسبیح وغیرہ میں مشغول ہوں مسجد میں اپنے لئے سوال کرنا یا کسی

---

[1] صحیح البخاری، کتاب التہجد، باب فضل الصلاۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ ج:۱ ص:۱۵۸

دینی کام کے لئے چندہ کرنا بھی ایسے وقت ممنوع ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد کی ویرانی کی جتنی بھی صورتیں ہیں سب حرام ہیں، اس میں جس طرح کھلے طور پر مسجد کو منہدم اور ویران کرنا داخل ہے، اسی طرح ایسے اسباب پیدا کرنا بھی اس میں داخل ہے جن کی وجہ سے مسجد ویران ہوجائے، اور مسجد کی ویرانی یہ ہے کہ وہاں نماز کے لئے لوگ نہ آئیں، یا کم ہوجائیں، کیونکہ مسجد کی تعمیر وآبادی دراصل دَرودیوار یا ان کے نقش ونگار سے نہیں، بلکہ ان میں اللہ کا ذِکر کرنے والوں سے ہے، اسی لئے قرآن شریف میں ایک جگہ اِرشاد ہے:-

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (التوبہ:۱۸)

"یعنی اصل میں مسجد کی آبادی ان لوگوں سے ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں اور روزِ قیامت پر، اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔"

اسی لئے حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قربِ قیامت میں مسلمانوں کی مسجدیں بظاہر آباد اور مزین وخوب صورت ہوں گی، مگر حقیقۃً ویران ہوں گی کہ ان میں حاضر ہونے والے نمازی کم ہوجائیں گے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اِرشاد ہے کہ شرافت وانسانیت کے چھ کام ہیں، تین حضر کے اور تین سفر کے، حضر کے تین یہ ہیں: تلاوتِ قرآن کرنا، مسجدوں کو آباد کرنا، ایسے دوستوں کی جمعیت بنانا جو اللہ تعالیٰ اور دِین کے کاموں میں اِمداد کریں، اور سفر کے تین کام یہ ہیں: اپنے توشے سے غریب ساتھیوں پر خرچ کرنا، حسنِ خلق سے پیش آنا، اور رُفقائے سفر کے ساتھ ہنسی خوشی، تفریح وخوش طبعی کا طرزِ عمل رکھنا، بشرطیکہ یہ خوش طبعی گناہ کی حد میں داخل نہ ہوجائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اِرشاد میں مسجدوں کے آباد کرنے کا مطلب یہی ہے کہ وہاں خشوع خضوع کے ساتھ حاضر بھی ہوں، اور وہاں حاضر ہوکر ذِکر وتلاوت میں مشغول رہیں، اب اس کے مقابلہ میں مسجد کی ویرانی یہ ہوگی کہ وہاں نمازی نہ رہیں یا کم ہوجائیں، یا ایسے اسباب جمع ہوں جن سے خشوع وخضوع میں خلل آئے۔

اور اگر آیت کا شانِ نزول واقعۂ حدیبیہ اور مشرکینِ مکہ کا مسلمانوں کو مسجدِ حرام سے روکنا ہے تو اسی آیت سے یہ بھی واضح ہوجائے گا کہ مساجد کی ویرانی صرف یہی نہیں کہ انہیں منہدم کردیا جائے، بلکہ مساجد جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہیں یعنی نماز اور ذِکر اللہ، جب وہ نہ رہے یا کم ہوجائے تو مساجد ویران کہلائیں گی۔

تحویلِ قبلہ کی بحث

دُوسری آیت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تسلی دی گئی ہے کہ مشرکینِ مکہ نے اگرچہ

آپ کو مکہ اور بیت اللہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا، اور مدینہ پہنچ کر ابتدائی زمانے میں سولہ سترہ مہینے تک آپ کو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا، لیکن اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں، نہ آپ کے لئے غمگین ہونے کی کوئی وجہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کسی خاص سمت میں نہیں، وہ ہر جگہ ہے، اس کے لئے مشرق و مغرب یکساں ہیں، کعبہ کو قبلۂ نماز بنائیں، یا بیت المقدس کو، دونوں میں کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ اَمرِ الٰہی کی تعمیل ہی دونوں جگہ سببِ فضیلت ہے ۔

دادِ حق را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرطِ قابلیت داد ہست [1]

اس لئے جب کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم تھا اُس میں فضیلت تھی، اور جب بیت المقدس کا اِستقبال کرنے کا حکم ہو گیا تو اس میں فضیلت ہے، آپ دلگیر نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کی توجہ دونوں حالتوں میں یکساں ہے، جبکہ بندہ اس کے حکم کی تعمیل کر رہا ہو۔

چند مہینوں کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دینے کا حکم دے کر عملاً اور آپ نے قولاً اس بات کو واضح کر دیا کہ کسی خاص مکان یا سمت کو قبلہ قرار دینا اس وجہ سے نہیں کہ معاذ اللہ خدا تعالیٰ اس مکان یا اس سمت میں ہے، دُوسری جگہ میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ، ہر سمت میں یکساں توجہ کے ساتھ موجود ہے، کسی خاص سمت کو قبلۂ عالم قرار دینا دُوسری حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کی توجہ کسی خاص سمت یا جگہ کے ساتھ مقید نہیں تو اَب عمل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ہر شخص کو اِختیار دے دیا جائے کہ جس طرف چاہے رُخ کر کے نماز پڑھے، دُوسرے یہ کہ سب کے لئے کوئی خاص سمت و جہت معین کر دی جائے، ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں ایک تشتّت و اِفتراق کا منظر سامنے آئے گا، کہ دس آدمی نماز پڑھ رہے ہیں، اور ہر ایک کا رُخ الگ الگ اور ہر ایک کا قبلہ جدا جدا ہے، اور دُوسری صورت میں تنظیم و اتحاد کا عملی سبق ملتا ہے، ان حکمتوں کی بنا پر سارے عالم کا قبلہ ایک ہی چیز کو بنانا زیادہ مناسب ہے، اب وہ بیت المقدس ہو یا کعبہ، دونوں مقدس اور متبرک مقامات ہیں، ہر قوم اور ہر زمانے کے مناسب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اَحکام آتے ہیں، ایک زمانے تک بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی دِلی خواہش کے مطابق اس حکم کو منسوخ کر کے کعبہ کو قبلۂ عالم بنا دیا گیا، اِرشاد ہوا:-

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ (البقرۃ: ۱۴۴)

---

[1] ترجمہ:- اللہ تعالیٰ کی عنایت کے لئے قابلیت شرط نہیں ہے بلکہ قابلیت کے لئے اللہ تعالیٰ کی عنایت شرط ہے۔

’’(یعنی کعبہ کو قبلہ بنا دینے کی دِلی رغبت کی وجہ سے) بار بار آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر دیکھتے ہیں (کہ شاید فرشتہ حکم لے آئے) ہم یہ سب دیکھ رہے ہیں، اس لئے اب ہم آپ کو اسی قبلے کی طرف متوجہ کر دیں گے جس کو آپ چاہتے ہیں، اس لئے اب سے آپ اپنا چہرہ نماز میں مسجدِ حرام کی طرف کیا کریں، اور (یہ حکم کچھ آپ ہی کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ تمام اُمت کے لئے یہی حکم دے دیا گیا کہ) تم جہاں کہیں بھی موجود ہو (یہاں تک کہ خود بیت المقدس کے اندر بھی ہو) تو نماز میں اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف کیا کرو۔‘‘

الغرض آیت مذکورہ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ نے اِستقبالِ قبلہ کی پوری حقیقت کو واضح کر دیا کہ اس کا منشا بیت اللہ یا بیت المقدس کی معاذ اللہ پرستش نہیں، اور نہ اُن دونوں مکانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک مخصوص ہے، بلکہ اس کی ذات سارے عالم پر محیط اور ہر سمت میں اس کی توجہ یکساں ہے، پھر جو کسی خاص مکان یا سمت کو مخصوص کیا جاتا ہے اس میں دُوسری حکمتیں ہیں۔

آیتِ مذکورہ کے اس مضمون کو واضح اور دِل نشین کرنے ہی کے لئے شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو ہجرت کے اوائل میں سولہ سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز اَدا کرنے کا حکم دے کر عملی طور پر بتلا دیا گیا کہ ہماری توجہ ہر طرف ہے، اور نوافل میں اس حکم کو ہمیشہ کے لئے جاری رکھا کہ سفر میں کوئی شخص کسی سواری مثلاً اُونٹ، گھوڑے وغیرہ پر سوار ہو تو اس کو اِجازت ہے کہ سواری پر بیٹھے ہوئے اِشارہ سے نفلی نماز پڑھ لے، اور اس کے لئے قبلہ کی طرف رُخ کرنا بھی ضروری نہیں، جس طرف اس کی سواری چل رہی ہے اسی طرف رُخ کر لینا کافی ہے۔

بعض مفسرین نے آیت فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کو اِسی نفلی نماز کا حکم قرار دِیا ہے، مگر یاد رہے کہ یہ حکم صرف اُن سواریوں کا ہے جن پر سوار ہو کر چلتے ہوئے قبلہ کی طرف رُخ کرنا دُشوار ہے، اور جن سواریوں میں سوار کو قبلہ کی طرف رُخ کر لینا دُشوار نہیں، جیسے ریل، پانی کا جہاز، ہوائی جہاز، ان کا وہی حکم ہے جو حالتِ حضر میں رُخِ قبلہ کا ہے، کہ اگر نفل نماز بھی ان میں پڑھی جائے تو قبلہ رُخ ہو کر پڑھی جائے، (البتہ نماز کی حالت میں ریل کا یا جہاز کا رُخ مڑ جائے اور نمازی کے لئے گنجائش نہ ہو کہ وہ بھی قبلہ رُخ پھر جائے، تو اسی حالت میں نماز پوری کر لے)۔

اسی طرح جہاں نمازی کو سمتِ قبلہ معلوم نہ ہو، اور رات کی اندھیری وغیرہ کی وجہ سے سمتیں متعین کرنا بھی دُشوار ہو، اور کوئی بتلانے والا بھی نہ ہو تو وہاں بھی یہی حکم ہے کہ وہ اپنا اندازہ اور تخمینہ لگا کر جس طرف کو بھی متعین کر لے گا وہی سمت اس کا قبلہ قرار دِی جائے گی، نماز اَدا کرنے کے بعد اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ اس نے غلط سمت میں نماز اَدا کی ہے، تب بھی نماز صحیح ہے، اِعادہ کی ضرورت نہیں۔

آیت کے اس بیان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل اور جزئیاتِ مذکورہ سے اِستقبالِ قبلہ کے حکمِ شرعی کی پوری حقیقت واضح ہوگئی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

اور کہتے ہیں کہ اللہ رکھتا ہے اولاد، وہ تو سب باتوں سے پاک ہے، بلکہ اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں،

كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا

سب اسی کے تابعدار ہیں۔ نیا پیدا کرنے والا ہے آسمان اور زمین کا اور جب حکم کرتا ہے کسی کام کو

فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

تو یہی فرماتا ہے اس کو کہ ہوجا، پس وہ ہوجاتا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے کوئی بیٹا بنایا ہوا ہے، (حالانکہ) اس کی ذات (اس قسم کی چیزوں سے) پاک ہے، بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے۔ سب کے سب اس کے فرماں بردار ہیں ﴿۱۱۶﴾ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اور جب وہ کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے بارے میں بس اتنا کہتا ہے کہ: ''ہوجا'' چنانچہ وہ ہوجاتی ہے۔ ﴿۱۱۷﴾

خلاصۂ تفسیر

(بعض یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اور مشرکینِ عرب ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں، جیسا مختلف آیات میں ان اقوال کی خبر دی گئی ہے، حق تعالیٰ اس قول کی قباحت اور بطلان کا بیان فرماتے ہیں، یعنی) اور یہ لوگ (مختلف عنوان سے) کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اولاد رکھتا ہے، سبحان اللہ (کیا مہمل بات ہے) بلکہ (ان کے تو اولاد ہونا عقلاً ممکن نہیں، کیونکہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو اولاد غیر جنس ہوگی اور یا ہم جنس ہوگی، اگر غیر جنس ہو تب تو ناجنس اولاد ہونا عیب ہے، اور حق تعالیٰ عیب سے پاک ہے، عقلاً بھی جیسا مُسلّم ہے، اور نقلاً بھی جیسا سبحانہٗ مذکور کا بھی مدلول ہے، اور اگر ہم جنس ہو تو اس لئے باطل ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی ہم جنس نہیں، کیونکہ جو صفات کمال لوازمِ

ذاتِ واجبہ سے ہیں وہ اللہ کے ساتھ مخصوص اور غیر اللہ میں معدوم ہیں، اور لازم کی نفی ملزوم کی نفی کی دلیل ہے، اس لئے غیر اللہ ذات واجب نہ ہوگا، اور وجوب خود عین حقیقت یا لازمِ حقیقت ہے، پس کوئی غیر اللہ، اللہ کے ساتھ حقیقت میں شریک نہ ہوا، لہٰذا ہم جنس ہونا بھی باطل ہوگیا، اب صفاتِ کمال صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ مختص ہونے کی دلیلیں مذکور ہوتی ہیں، اوّل یہ کہ) خاص اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں (موجودات) ہیں (اور دُوسرے یہ کہ مملوک ہونے کے ساتھ) سب ان کے محکوم (بھی) ہیں (بایں معنی کہ ان کے تصرفاتِ قدرت جیسے مارنا، جلانا وغیرہ کو کوئی نہیں ہٹا سکتا، گو اَحکامِ شرعیہ کو کوئی ٹال دے اور تیسرے یہ کہ حق تعالیٰ) موجد (بھی) ہیں آسمانوں اور زمین کے اور (چوتھے یہ کہ ایجاد کی بھی قدرت ایسی عظیم وعجیب ہے کہ) جب کسی کام کا (مثلاً پیدا ہی کرنا ہے) پورا کرنا چاہتے ہیں تو بس (اتنی بات ہے کہ) اس کو (اتنا) فرما دیتے ہیں کہ ہو جا، بس وہ (اسی طرح) ہو جاتا ہے، (ان کو آلات واسباب اور صناعوں اور معینوں کی ضرورت نہیں پڑتی، اور یہ چاروں اَمر بجز حق تعالیٰ کے کسی میں نہیں پائے جاتے، اور یہ مدعیانِ اولاد کے بھی مُسلّمات سے تھا، پس دلیل سے مقدمۂ اختصاص بھی ثابت ہو کر حجت تمام ہوگئی)۔

فوائد

۱- خاص خاص کاموں پر خاص خاص ملائکہ کو مقرّر کرنا، مثلاً بارش، رِزق وغیرہ، اور اسی طرح اسباب اور مواد اور قویٰ سے کام لینا، یہ سب کسی حکمتِ خداوندی پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے نہیں کہ لوگ انہیں اسباب وقوات کو حاجت رَوا مان کر اِستعانت ومدد کے طلب گار ہوں۔

۲- بیضاویؒ نے کہا ہے کہ پہلی شرائع میں اللہ تعالیٰ کو سببِ اوّل ہونے کی وجہ سے باپ کہا کرتے تھے، جاہلوں نے ولادت کے معنی سمجھ لئے، اس لئے یہ عقیدہ رکھنا یا ایسا کہنا کفر قرار دِیا گیا، دفعِ فساد کی مصلحت سے اب ایسے لفظ کے اِستعمال کی بالکل اِجازت نہیں۔[1]

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ

اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے: کیوں نہیں بات کرتا ہے ہم سے اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی آیت،

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ

اسی طرح کہہ چکے ہیں وہ لوگ جو اُن سے پہلے تھے انہی کی سی بات، ایک سے ہیں دِل ان کے،

[1] تفسیر البیضاوی تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۱۵۶

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

بے شک ہم نے بیان کردیں نشانیاں اُن لوگوں کے واسطے جو یقین لاتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ: اللہ ہم سے (براہِ راست) کیوں بات نہیں کرتا؟ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ جو لوگ اِن سے پہلے گذرے ہیں وہ بھی اسی طرح کی باتیں کہتے تھے جیسی یہ کہتے ہیں۔ ان سب کے دِل ایک جیسے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ یقین کرنا چاہیں اُن کے لئے ہم نشانیاں پہلے ہی واضح کر چکے ہیں۔ ﴿۱۱۸﴾

خلاصہ تفسیر

اور (بعضے) جاہل (یہود و نصاریٰ اور مشرکین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں) یوں کہتے ہیں کہ (خود) اللہ تعالیٰ ہم سے کلام کیوں نہیں فرماتے (خواہ فرشتوں کے بغیر، جیسے خود فرشتوں سے کلام فرماتے ہیں، یا فرشتوں کے واسطے سے، جیسے پیغمبروں سے بطور وحی بات کرتے ہیں، اور اس کلام میں یا تو خود ہم کو اَحکام بتادیں کہ دُوسرے رسول کی ہم کو ضرورت ہی نہ رہے، یا کم از کم اتنا ہی کہہ دیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسول ہیں، تو ہم ان کی ہی رسالت کے قائل ہوکر ان کی اِطاعت کرنے لگیں) یا (کلام نہیں کرتے تو) ہمارے پاس کوئی اور ہی دلیل (ثبوتِ رِسالت کی) آجائے (حق تعالیٰ اوّلاً اس بات کا جاہلانہ رسم ہونا بتلاتے ہیں کہ) اس طرح وہ (جاہل) لوگ بھی کہتے چلے آئے ہیں جو اُن سے پہلے ہوگزرے ہیں، ان ہی کا سا (جاہلانہ) قول (سو معلوم ہوا کہ یہ قول کوئی باوقعت اور باریک بینی پر مبنی نہیں، یوں ہی ہانک دیا جاتا ہے، پھر ثانیاً اس قول کا منشا اور سبب بیان فرماتے ہیں کہ) ان سب (اگلے پچھلے جاہلوں) کے قلوب (کج فہمی میں) باہم ایک دُوسرے کے مشابہ ہیں (اس لئے سب سے بات بھی ایک ہی سی پیدا ہوئی، پھر ثالثاً اس قول کا جواب دیتے ہیں، اور چونکہ اس قول کا جزوِ اَوّل حماقتِ محض تھا، کہ اپنے کو اس لیاقت پر ہم پلہ ملائکہ اور انبیاء کا بنانا چاہتے تھے، جو بالکل ہی بدیہی البطلان ہے، اس لئے اس احمقانہ بات کو نظر اَنداز کر کے صرف دُوسرے جز کا جواب اِرشاد ہوتا ہے کہ تم تو ایک دلیل کو لئے پھرتے ہو) ہم نے تو بہت سی دلیلیں (رِسالتِ محمدیہ کے ثبوت میں) صاف صاف بیان کردی ہیں (مگر وہ) ان لوگوں کے لئے (نافع و کافی ہوسکتی ہیں) جو یقین (اور اِطمینان حاصل کرنا) چاہتے ہیں (اور چونکہ معترضین کو محض ضد اور کد ہی مقصود ہے اس لئے حق طلبی کی نظر سے اُن کو تحقیق ہی منظور نہیں، سو ایسوں کی تسلی و تشفی کا کون ذمہ دار بنے)۔

فائدہ:- یہود و نصاریٰ تو اہلِ کتاب تھے، ان میں اہلِ علم بھی تھے، اس کے باوجود جو اُن کو اللہ تعالیٰ نے جاہل فرمایا تو اس لئے کہ باوجودیکہ قطعی اور قوی دلائل کثرت سے قائم کردیئے گئے تھے پھر بھی جو اِنکار کئے جارہے تھے تو جہالت نہیں تو اور کیا تھا، اور یہ جاہلوں ہی کی سی بات کہلائے گی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کو جاہل فرمایا۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَٰبِ ٱلْجَحِيمِ ﴿١١٩﴾

بے شک ہم نے تجھ کو بھیجا ہے سچا دِین دے کر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا، اور تجھ سے پوچھ نہیں دوزخ میں رہنے والوں کی۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) بے شک ہم نے تمہیں کو حق دے کر اس طرح بھیجا ہے کہ تم (جنت کی) خوشخبری دو اور (جہنم سے) ڈراؤ۔ اور جو لوگ (اپنی مرضی سے) جہنم (کا راستہ) اختیار کرچکے ہیں ان کے بارے میں آپ سے کوئی باز پُرس نہیں ہوگی۔ ﴿۱۱۹﴾

خلاصۂ تفسیر

(چونکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمۃ للعالمین کا تقاضا یہ ہوسکتا تھا کہ آپ کو اس جہالت اور عناد کی بدولت دِل تنگی پیش آتی، اور ان کے اِیمان نہ لانے کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آنے کے سبب آپ ملول وآزردہ خاطر ہوجاتے، اس لئے اللہ تعالیٰ آپ کی تسلی کے لئے اِرشاد فرماتے ہیں کہ اے رسول) ہم نے آپ کو ایک سچا دِین دے کر (خلق کی طرف) بھیجا ہے کہ (ماننے والوں کو) خوش خبری سناتے رہئے اور (نہ ماننے والوں کو سزا سے) ڈراتے رہئے، اور آپ سے دوزخ میں جانے والوں کی باز پرس نہ ہوگی (کہ ان لوگوں نے کیوں نہیں قبول کیا اور کیوں دوزخ میں گئے، آپ اپنا کام کرتے رہئے، آپ کو کسی کے ماننے یا نہ ماننے کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہئے)۔

وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ ٱلْيَهُودُ وَلَا ٱلنَّصَٰرَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ

اور ہرگز راضی نہ ہوں گے تجھ سے یہود اور نہ نصاریٰ جب تک تو تابع نہ ہو ان کے دِین کا، تو کہہ دے

إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ

جو راہ اللہ بتادے وہی راہ سیدھی ہے، اور اگر بالفرض تو تابعداری کرے ان کی خواہشوں کی بعد

الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١٢٠﴾

اس علم کے جو تجھ کو پہنچا، تو تیرا کوئی نہیں اللہ کے ہاتھ سے حمایت کرنے والا اور نہ مددگار۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہود و نصاریٰ تم سے اس وقت تک ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک تم اُن کے مذہب کی پیروی نہیں کرو گے۔ کہہ دو کہ حقیقی ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے۔ اور تمہارے پاس (وحی کے ذریعے) جو علم آگیا ہے، اگر کہیں تم نے اس کے بعد بھی ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرلی تو تمہیں اللہ سے بچانے کے لئے نہ کوئی حمایتی ملے گا نہ کوئی مددگار۔ ﴿١٢٠﴾

خلاصۂ تفسیر

اور کبھی خوش نہ ہوں گے آپ سے یہ یہود اور نہ یہ نصاریٰ، جب تک کہ آپ (خدانخواستہ) ان کے مذہب کے (بالکل) پیرو نہ ہو جائیں (اور یہ محال ہے، پس ان کا راضی ہونا محال ہے، اور اگر کبھی اس قسم کی بات ان کی زبان یا حال سے مترشح ہو تو) آپ (صاف) کہہ دیجئے کہ (بھائی) حقیقت میں ہدایت کا تو وہی راستہ ہے جس کو خدا نے (ہدایت کا راستہ) بتلایا ہے، (اور دلائل سے ایسا راستہ صرف اسلام ہونا ثابت ہو چکا ہے، پس راہِ ہدایت وہی رہا) اور (یہ امر کہ آپ نعوذ باللہ ان کے مذہب کے پیرو ہو جائیں محال اس لئے ہے کہ اس سے ایک محال لازم آتا ہے، کیونکہ) اگر آپ ان کے غلط خیالات کا اِتباع کرنے لگیں (جس کو وہ اپنا مذہب سمجھتے ہیں مگر کچھ تحریف سے اور کچھ منسوخ ہو جانے سے اب وہ محض چند غلط خیالات کا مجموعہ رہ گیا ہے، اور پھر اِتباع بھی کیسی حالت میں کہ) علم (قطعی ثابت بالوحی) آچکنے کے بعد تو (ایسی حالت میں تو) آپ کا کوئی خدا سے بچانے والا نہ یار نکلے نہ مددگار (بلکہ تو بہ توبہ پنجۂ قہر میں گرفتار ہو جانا لازم آوے، اور یہ لازم محال ہے، کیونکہ دلائلِ قطعیہ سے دوامِ رضائے حق تعالیٰ آپ سے ثابت ہے، پس غضب محال ہے، اور اِتباعِ مذکور سے یہ لازم آیا تھا، اس لئے اِتباعِ مذکور بھی محال، اور بدون اِتباع کے ان کا راضی ہونا غیر ممکن، تو ایسے اَمر کی اُمید کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، اس لئے اس سے دِل کو خالی کرلینا چاہئے)۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ

وہ لوگ جن کو دِی ہم نے کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں جو حق ہے اس کے پڑھنے کا، وہی اس پر یقین لاتے ہیں،

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

اور جو کوئی منکر ہوگا اس سے تو وہی لوگ نقصان پانے والے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی، جبکہ وہ اس کی تلاوت اس طرح کرتے ہوں جیسا اس کی تلاوت کا حق ہے، تو وہ لوگ ہی (درحقیقت) اس پر اِیمان رکھتے ہیں۔ اور جو اس کا اِنکار کرتے ہوں، تو ایسے لوگ ہی نقصان اُٹھانے والے ہیں ﴿۱۲۱﴾

خلاصۂ تفسیر

(اس آیت سے پہلے کی آیت میں معاندین اہلِ کتاب کا ذِکر اور مخالفین کے اِیمان سے کلی مایوسی کا بیان تھا، اس کے بعد حسب عادتِ قرآن اِنصاف پسند اہلِ کتاب کا بیان ہے، جنھوں نے حق واضح ہوجانے کے بعد جناب رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی، اور آپ کا اِتباع اِختیار کرلیا، پس اِرشاد ہے) جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراۃ و اِنجیل) دی بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت (اس طرح) کرتے رہے جس طرح تلاوت کا حق ہے (کہ قوتِ علمیہ کو فہمِ مضامین میں صرف کیا، اور قوتِ اِرادیہ کو عزمِ اِتباع میں اِستعمال کیا) ایسے لوگ (البتہ آپ کے) اس (دِینِ حق اور علمِ وحی) پر اِیمان لے آتے ہیں، اور جو شخص نہ مانے گا (کس کا نقصان کرے گا) خود ہی ایسے لوگ خسارہ میں رہیں گے (کہ اِیمان پر جو ثمرات عطا ہوتے ہیں ان سے محروم رہیں گے)۔

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ

اے بنی اِسرائیل! یاد کرو اِحسان ہمارے جو ہم نے تم پر کئے اور اس کو کہ ہم نے تم کو بڑائی دی

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا

اہلِ عالم پر، اور ڈرو اس دِن سے کہ نہ کام آوے کوئی شخص کسی کی طرف سے ذرا بھی

وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور نہ قبول کیا جاوے گا اس کی طرف سے بدلہ اور نہ کام آوے اس کو سفارش اور نہ اُن کی مدد پہنچے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی، اور یہ بات (یاد کرو) کہ میں نے تم کو سارے جہانوں پر فضیلت دی تھی ﴿۱۲۲﴾ اور اُس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص بھی کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا، نہ کسی سے کسی قسم کا فدیہ قبول کیا جائے گا، نہ اُس کو کوئی سفارش فائدہ دے گی، اور نہ ان کو کوئی مدد پہنچے گی۔ ﴿۱۲۳﴾

خلاصۂ تفسیر

(اُوپر کی آیت تک بنی اسرائیل کے متعلق جن خاص مضامین کا بیان کرنا مقصود تھا وہ تو ختم ہوئے، اب ان مضامین کی اِبتدائی تمہید جس کے اِجمال کے یہ سارے مضامین تفصیل تھے، اس کو دوبارہ پھر بیان کرتے ہیں، جس کا مقصد یہ ہے کہ تمہید کا مضمونِ خاص یعنی ترغیب کے لئے اِنعامِ عام وخاص کا یاد دِلانا، اور ترہیب کے لئے قیامت کو پیشِ نظر کر دینا بوجہ تکرار خوب ذہن نشین ہو جائے، کیونکہ مقصودِ اعظم کلیات ہوتے ہیں جن کا خود اِستحضار ان کے اِختصار کی وجہ سے سہل اور آسان ہوتا ہے، اور بوجہ جامعیت اور اِنطباق کے ان کے ذریعے سے ان کے جزئیات کا محفوظ رکھنا آسان ہوتا ہے، اور محاورات میں یہ طرزِ بلیغ بھی اعلیٰ درجے کا سمجھا جاتا ہے، کہ مفصل اور مطوّل بات کرنے سے پہلے ایک مجمل عنوان سے اس کی تقریر کر دی جائے، جس کا قدرِ مشترک تمام تفصیل کے سمجھنے میں معین ومددگار ہو، اور آخر میں بطورِ خلاصہ اور نتیجۂ تفصیل اسی مجمل عنوان کا پھر اعادہ کر دیا جائے، مثلاً یہ کہا جائے کہ ''تکبر بڑی مضر خصلت ہے، اس میں ایک ضرر یہ، دُوسرا یہ، تیسرا یہ'' دس بیس مضرتیں گنوا کر پھر آخر میں کہہ دیا جائے کہ ''غرض تکبر بڑی مضر خصلت ہے'' اسی طور پر اس آیت يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کا اِعادہ فرمایا گیا ہے۔)

اے اولادِ یعقوب (علیہ السلام) میری ان نعمتوں کو یاد کرو جن کا میں نے تم پر (وقتاً فوقتاً) اِنعام کیا، اور اس کو (بھی یاد کرو) کہ میں نے تم کو بہت لوگوں پر (بہت سی باتوں میں) فوقیت دی، اور تم ڈرو ایسے دِن سے (یعنی روزِ قیامت سے) جس میں کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ کوئی مطالبہ (اور حقِ واجب) ادا کر پاوے گا، اور نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ (بجائے حقِ واجب کے) قبول کیا جاوے گا اور نہ کسی کی کوئی سفارش (جبکہ ایمان نہ ہو) مفید ہوگی اور نہ ان لوگوں کو کوئی (بزور) بچا سکے گا۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ

اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رَبّ نے کئی باتوں میں، پھر اس نے وہ پوری کیں، تب فرمایا: میں تجھ کو کروں گا سب لوگوں کا

اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

پیشوا، بولا: اور میری اولاد میں سے بھی، فرمایا: نہیں پہنچے گا میرا اقرار ظالموں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے کئی باتوں سے آزمایا، اور انہوں نے وہ ساری باتیں پوری کیں۔ اللہ نے (اُن سے) کہا: ''میں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔'' ابراہیم نے پوچھا: ''اور میری اولاد میں سے؟'' اللہ نے فرمایا: ''میرا (یہ) عہد ظالموں کو شامل نہیں ہے۔'' ﴿۱۲۴﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جس وقت اِمتحان کیا حضرت اِبراہیم کا اُن کے پروردگار نے چند باتوں میں (اپنے اَحکام میں سے) اور وہ ان کو پورے طور سے بجالائے، (اس وقت) حق تعالیٰ نے (ان سے) فرمایا کہ میں تم کو (اس کے صلہ میں نبوّت دے کر یا اُمت بڑھا کر) لوگوں کا مقتدا بناؤں گا، انہوں نے عرض کیا: اور میری اولاد میں سے بھی کسی کو (نبوّت دیجئے)، اِرشاد ہوا کہ (آپ کی درخواست منظور ہے، مگر اس کا ضابطہ سن لیجئے کہ) میرا (یہ) عہدہ (نبوّت) خلاف ورزی (قانون) کرنے والوں کو نہ ملے گا، (سو ایسے لوگوں کو تو صاف جواب ہے، البتہ اِطاعت کرنے والوں میں سے بعض کو نبوّت دی جائے گی)۔

معارف ومسائل

اس آیت میں حق تعالیٰ کے خاص پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختلف اِمتحانات اور ان میں ان کی کامیابی، پھر اس کے اِنعام وصلہ کا بیان ہے، اور پھر جب حضرت خلیل اللہ نے اَزراہِ شفقت اپنی اولاد کے لئے بھی اسی اِنعام کی درخواست کی، تو اِنعام پانے کا ایک ضابطہ اِرشاد فرمادیا گیا، جس میں حضرت خلیل اللہ کی درخواست کی منظوری مشروط صورت میں دی گئی، کہ یہ اِنعام آپ کی ذُرّیت کو بھی ملے گا، مگر جو لوگ ذُرّیت میں سے نافرمان اور ظالم ہوں گے وہ یہ اِنعام نہ پاسکیں گے۔

حضرت خلیل اللہ کے عظیم اِمتحانات اور مضامینِ اِمتحان

یہاں چند باتیں غور طلب ہیں:-

اوّل یہ کہ اِمتحان کسی شخص کی قابلیت معلوم کرنے کے لئے لیا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہیں، کسی بھی شخص کا کوئی حال یا کمال اُن پر مخفی نہیں، پھر اس اِمتحان کا مقصد کیا تھا؟

دُوسرے یہ کہ اِمتحان کس کس عنوان سے لیا گیا؟

تیسرے یہ کہ کامیابی کس صورت اور کس نوعیت کی رہی؟

چوتھے یہ کہ اِنعام کیا دِیا گیا اور اس کی حیثیت کیا ہے؟

پانچویں یہ کہ اس اِنعام کے لئے جو ضابطہ مقرّر کیا گیا ہے اس کی کچھ توضیح وتفصیل۔

ان پانچوں سوالات کے جوابات بالتفصیل ملاحظہ فرمایئے:-

پہلی بات کہ اِمتحان کا مقصد کیا تھا؟ قرآن کے ایک لفظ رَبُّهٗ نے اس کو حل کردیا ہے، جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس اِمتحان کے ممتحن خود اللہ جل شانہٗ ہیں، اور ان کے اسمائے حسنیٰ میں سے اس جگہ لفظِ ''رَبّ'' لاکر شانِ رُبوبیت کی طرف اِشارہ کردیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کو آہستہ آہستہ درجۂ کمال تک پہنچانا۔

مطلب یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ اِبتلا واِمتحان کسی جرم کی پاداش میں یا نامعلوم قابلیت کا علم حاصل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ شانِ تربیت ورُبوبیت اس کا منشا ہے، ان آزمائشوں کے ذریعے اپنے خلیل کی تربیت کرکے ان کے درجات ومقامات تک پہنچانا مقصود ہے، پھر اس جملے میں مفعول کو مقدم اور فاعل کو مؤخر کرکے یوں اِرشاد ہوا: وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ اس میں اِبراہیم علیہ السلام کی جلالتِ شان کو اور نمایاں فرمایا گیا۔

دُوسرا سوال کہ امتحان کس عنوان سے لیا گیا؟ اس کے متعلق قرآن شریف میں تو صرف ''کلمات'' کا لفظ آیا ہے، اور اس لفظ کی تفسیر وتشریح میں حضراتِ صحابہؓ وتابعینؒ کے مختلف اقوال ہیں، کسی نے اَحکامِ الٰہیہ میں سے دس چیزیں شمار کیں، کسی نے تیس بتلائی ہیں، اور کسی نے اور کچھ کم وبیش دُوسری چیزیں بتائیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں کچھ اِختلاف نہیں، وہ چیزیں سب کی سب ہی حضرت خلیل اللہ کے مضامینِ امتحان تھے، ائمۂ تفسیر ابن جریرؒ اور ابنِ کثیرؒ کی یہی رائے ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک علمی موشگافیوں سے زیادہ قابلِ قدر اخلاق وکردار کی عملی ثابت قدمی ہے

یہی مضامینِ امتحان جن کی تفصیل آگے بیان ہوگی، مدارس کے اِمتحانات کی طرح فنی مسائل اور اُن کی تحقیقات نہیں، بلکہ اَخلاقی قدروں اور عملی ثابت قدمی کی جانچ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بارگاہِ عزوجلال میں جس چیز کی قیمت ہے وہ علمی موشگافیاں نہیں، بلکہ عملی اور اَخلاقی برتری ہے۔

اب ان مضامینِ امتحان میں سے چند اہم چیزیں سنئے:-

حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی خلت کا خلعتِ خاص عطا فرمایا جائے، اس لئے ان کو سخت اِمتحانات سے گزارا گیا، پوری قوم کی قوم حتیٰ کہ اپنا خاندان سب کے سب بت پرستی میں مبتلا تھے، سب کے عقائد ورُسوم سے مختلف ایک دِینِ حنیف ان کو عطا کیا گیا، اور اس کی تبلیغ اور قوم کو اس کی طرف دعوت دینے کا بارِگراں آپ پر ڈالا گیا، آپ نے پیغمبرانہ جرأت وہمت کے ساتھ بے خوف وخطر قوم کو خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی طرف بلایا، بت پرستی کی شرمناک رسم کی خرابیاں مختلف عنوانات سے بیان کیں، عملی طور پر بتوں کے خلاف جہاد کیا، پوری قوم کی قوم آمادۂ جنگ وجدال ہوگئی، بادشاہِ وقت نمرود اور اس کی قوم نے آپ کو آگ میں ڈال کر زِندہ جلادینے کا فیصلہ کرلیا، اللہ کے خلیل نے اپنے مولا کی رضامندی کے لئے ان سب بلاؤں پر راضی ہوکر اپنے آپ کو آگ میں ڈال دینے کے لئے پیش کردیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کو اِمتحان میں کامیاب پایا تو آگ کو حکم دیا:-

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ (الانبیاء)

''ہم نے حکم دے دیا کہ اے آگ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور ذریعۂ سلامتی بن جا۔''

جس وقت یہ حکمِ خداوندی آتشِ نمرود کے متعلق آیا تو حکم کے الفاظ عام تھے، کسی خاص آگ کی تعیین کرکے حکم نہیں دیا گیا تھا، اس لئے پوری دُنیا میں جہاں کہیں آگ موجود تھی اس حکمِ خداوندی کے آتے ہی اپنی اپنی جگہ ہر آگ ٹھنڈی ہوگئی، اور نارِ نمرود بھی اس زُمرہ کا فرد بن کر ٹھنڈی پڑگئی۔

قرآن میں لفظ بَرْدًا کے ساتھ سَلٰمًا کا اِضافہ اس لئے فرمایا گیا کہ کسی چیز کی ٹھنڈک حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو وہ بھی برف کی طرح تکلیف دہ بلکہ مہلک ہو جاتی ہے، اگر لفظ سَلٰمًا ارشاد نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ آگ برف کی طرح ایسی ٹھنڈی ہو جاتی جو بجائے خود ایک عذاب بن جاتی جیسے جہنم میں ایک عذاب زمہریر کا بھی ہے۔

اس اِمتحان سے فارغ ہو کر دُوسرا اِمتحان یہ لیا گیا کہ اپنے اصلی وطن کو چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کر جائیں، حضرت اِبراہیم علیہ السلام نے رضائے خداوندی کی تڑپ میں قوم و وطن کو بھی خیر باد کہہ دیا، اور مع اہل و عیال ہجرت کر کے شام میں چلے آئے!

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند

فرزند و عیال و خانماں را چہ کند [۱]

اب قوم و وطن کو چھوڑ کر ملکِ شام میں قیام کیا ہی تھا کہ یہ حکم ملا کہ بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور اُن کے شیر خوار بچے حضرت اِسماعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر یہاں سے بھی کوچ کریں۔ (ابن کثیر)

جبریلِ امین آئے اور دونوں کو ساتھ لے کر چلے، راستہ میں جہاں کوئی سرسبز جگہ آتی تو حضرت خلیل فرماتے کہ یہاں ٹھہرا دِیا جائے، جبریل فرماتے کہ یہاں کا حکم نہیں، منزل آگے ہے۔ جب وہ خشک پہاڑ اور گرم ریگستان آجاتا ہے جہاں آگے کسی وقت بیت اللہ کی تعمیر اور شہرِ مکہ کی بستی بسانا مقدّر تھا، اس ریگستان میں آپ کو اُتار دِیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے خلیل اپنے پروردگار کی محبت میں مسرور و مگن اسی چٹیل میدان اور بے آب و گیاہ جنگل میں بی بی کو لے کر ٹھہر جاتے ہیں، لیکن یہ اِمتحان اسی پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اب حضرت اِبراہیم علیہ السلام کو حکم ملتا ہے کہ بی بی اور بچے کو یہیں چھوڑ دیں، اور خود ملکِ شام کو واپس ہو جائیں، اللہ کا خلیل حکم پاتے ہی اس کی تعمیل میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور شام کی طرف روانہ ہو جاتا ہے، تعمیلِ حکم میں اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کہ بیوی کو یہ اطلاع ہی دیدے کہ مجھے چونکہ خدا کا یہ حکم ملا ہے اس لئے میں جارہا ہوں، حضرت ہاجرہ علیہا السلام جب آپ کو جاتے ہوئے دیکھتی ہیں تو پکارتی ہیں، مگر آپ جواب نہیں دیتے، پھر پکارتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس لق و دق میدان میں ہمیں چھوڑ کر کہاں جارہے ہو؟ اس کا بھی جواب نہیں دیتے، مگر وہ بی بی بھی خلیل اللہ کی بی بی تھیں سمجھ گئیں کہ ماجرا کیا ہے، اور کہنے لگیں کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ملا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں، حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو بھی جب حکمِ خداوندی کا علم ہو گیا، تو نہایت اِطمینان کے ساتھ فرمایا کہ جایئے، جس مالک نے آپ کو چلے جانے کا حکم فرمایا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہیں کرے گا۔

اب حضرت ہاجرہ اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ اس لق و دق جنگل میں وقت گزارنے لگتی ہیں، پیاس کی شدّت پانی

---

[۱] ترجمہ:- جس نے تجھے پہچان لیا وہ جان (کی حفاظت کر کے) کیا کرے گا، اہل و عیال اور خادم کی اسے کیا ضرورت ہے۔

کی تلاش پر مجبور کرتی ہے، بچے کو کھلے میدان میں چھوڑ کر، صفا و مروہ کی پہاڑیوں پر بار بار چڑھتی اُترتی ہیں کہ کہیں پانی کے آثار نظر آئیں، یا کوئی اِنسان نظر آجائے جس سے کچھ معلومات حاصل کریں، سات مرتبہ کی دوڑ دُھوپ کے بعد مایوس ہوکر بچے کے پاس لوٹ آتی ہیں۔ صفا و مروہ کے درمیان سات مرتبہ دوڑنا اسی کی یادگار کے طور پر قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے اَحکامِ حج میں ضروری قرار دِیا گیا ہے۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام اپنی دوڑ دُھوپ ختم کرنے اور مایوس ہونے کے بعد جب بچے کے پاس آتی ہیں تو رحمتِ خداوندی نازل ہوتی ہے، جبریلِ امین آتے ہیں اور اس خشک ریگستان کی زمین سے پانی کا ایک چشمہ نکال دیتے ہیں، جس کا نام آج ''زمزم'' ہے، پانی کو دیکھ کر اوّل جانور آجاتے ہیں، پھر جانوروں کو دیکھ کر اِنسان پہنچتے ہیں، اور مکہ کی آبادی کا سامان ہوجاتا ہے، ضروریاتِ زندگی کی کچھ آسانیاں مہیا ہوجاتی ہیں۔

نومولود بچہ جن کو آج حضرت اِسماعیل علیہ السلام کہا جاتا ہے، نشو ونما پاتے ہیں اور کام کاج کے قابل ہوجاتے ہین، حضرت اِبراہیم علیہ السلام باشاراتِ ربانی گاہ گاہ تشریف لاتے ہیں، اور بی بی و بچے کو دیکھ جاتے ہیں، اس وقت پھر اللہ تعالیٰ اپنے خلیل کا تیسرا اِمتحان لیتے ہیں، یہ بچہ اس بے کسی اور بے سروسامانی میں پروان چڑھا، اور بظاہر اَسباب باپ کی تربیت اور شفقت سے بھی محروم رہا، اب والدِ ماجد کو بظاہر یہ حکم ملتا ہے اس بچے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کردو، اِرشادِ قرآنی ہے:-

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۰۲ (الصّٰفّٰت)

''جب بچہ اس قابل ہوگیا کہ باپ کے ساتھ کام کاج میں کچھ مدد دے سکے تو اِبراہیم علیہ السلام نے اس سے کہا کہ اے بیٹے! میں خواب میں یہ دیکھتا ہوں کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تو بتلا کہ تیرا کیا خیال ہے؟ فرزندِ سعید نے عرض کیا کہ ابا جان! آپ کو جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کیجئے، آپ مجھے بھی اس کی تعمیل میں اِن شاء اللہ ثابت قدم پائیں گے۔''

اس کے بعد کا واقعہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام صاحبزادے کو ذبح کرنے کے لئے منیٰ کے جنگل میں لے گئے، اور اپنی طرف سے حکمِ حق جل وعلا شانہ' کی پوری تعمیل کردی، مگر وہاں مقصود بچے کو ذبح کرانا نہیں بلکہ شفیق باپ کا اِمتحان کرنا تھا، واقعۂ خواب کے الفاظ میں غور کیا جائے کہ اس میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ ذبح کردیا، بلکہ ذبح کا عمل کرتے دیکھا، جو حضرت اِبراہیم علیہ السلام نے کر دِکھایا، اور اس عمل کو بذریعہ وحی منام دِکھلانے میں بھی شاید یہی مصلحت ہو کہ بذریعہ کلام حکمِ ذبح دینا منظور نہ تھا، اسی وجہ سے اِرشاد یہ ہوا کہ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ (الصّٰفّٰت:۱۰۵) کہ خواب میں جو کچھ دیکھا تھا آپ نے اس کو پورا کردیا، جب اس میں وہ پورے اُترے، تو اللہ تعالیٰ نے جنت سے اس کا فدیہ نازل فرما کر

اس کی قربانی کا حکم دے دیا، اور یہ سنت اِبراہیمی آنے والی دُنیا کے لئے دائمی سنت بن گئی۔

یہ کڑے اور سخت اِمتحانات تھے جن میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو گزارا گیا، اس کے ساتھ ہی دُوسرے بہت سے اعمال واَحکام کی پابندیاں آپ پر عائد کی گئیں، جن میں سے دس ''خصائلِ فطرت'' کے نام سے موسوم ہیں، جن کا تعلق بدن کی صفائی، ستھرائی اور پاکی سے ہے، اور یہ خصائلِ فطرت آنے والی تمام اُمتوں کے لئے بھی مستقل اَحکام بن گئے، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو ان تمام اُمور کے لئے تاکیدی اَحکام دیئے۔

اور ابنِ کثیرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ پورا اِسلام تیس حصوں میں دائر ہے، جس میں سے دس سورۂ براءت میں مذکور ہیں، اور دس سورۂ اَحزاب میں اور دس سورۂ مؤمنون میں، حضرت اِبراہیم علیہ السلام نے ان تمام چیزوں کا پورا حق ادا کیا، اور ان سب اِمتحانات میں پورے اُترے، اور کامیاب رہے۔

سورۂ براءت میں مؤمنین کی صفات بیان کرتے ہوئے مسلمان کی دس مخصوص علامات وصفات کا اس طرح بیان کیا گیا ہے:-

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ (التوبہ)

''وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رُکوع وسجدہ کرنے والے، نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے، اور بری باتوں سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کا خیال رکھنے والے، اور ایسے مؤمنین کو آپ خوش خبری سنا دیجئے۔''

اور سورۂ مؤمنون کی دس صفات یہ ہیں:-

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ﴿۴﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ﴿۶﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ﴿۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ
لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ﴿۹﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ﴿۱۰﴾
الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱﴾ (المؤمنون)

''یقیناً ان مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع کرنے والے ہیں، اور جو لغو باتوں سے برکنار رہنے والے ہیں، اور جو اپنے آپ کو پاک کرنے والے ہیں، اور جو اپنی شرم گاہوں کی

حفاظت کرنے والے ہیں، لیکن اپنی بیویوں سے یا اپنی لونڈیوں سے کیونکہ ان پر کوئی الزام نہیں، ہاں جو اس کے علاوہ طلب گار ہوں ایسے لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں، اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

اور سورۂ اَحزاب میں مذکورہ دس صفات یہ ہیں:-

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۳۵﴾ (الاحزاب)

"بے شک اِسلام کے کام کرنے والے مرد اور اِسلام کے کام کرنے والی عورتیں، اور اِیمان لانے والے مرد اور اِیمان لانے والی عورتیں، اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں، اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں، اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں، اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے مرد اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والی عورتیں، ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اَجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔"

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس اِرشاد سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے لئے جتنی علمی، عملی، اخلاقی صفات مطلوب ہیں وہ ان تینوں سورتوں کی چند آیات میں جمع کردی گئی ہیں، اور یہی وہ صفات وہ کلمات ہیں جن میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کا اِمتحان لیا گیا، اور آیت وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ میں انہی صفات کی طرف اِشارہ ہے۔

ان آیات کے متعلق قابلِ غور سوالات میں سے دو سوالوں کا جواب یہاں تک ہوگیا۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ اس اِمتحان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کامیابی کا درجہ اور مقام کیا رہا؟ تو خود قرآنِ کریم نے اپنے مخصوص انداز میں ان کو سندِ کامیابی عطا فرمائی، اِرشاد ہوا:-

وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤى ﴿۳۷﴾ (النجم)　　(وہ ابراہیم جس نے پورا کر دِکھایا)

اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر اِمتحان کی مکمل اور سو فیصد کامیابی کا اِعلان فرما دیا۔

چوتھا سوال کہ اس اِمتحان پر اِنعام کیا ملا؟ اس کا ذِکر خود اسی آیت میں آچکا ہے، یعنی:-

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرۃ:۱۲۴)

"(امتحان کے بعد) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں آپ کو لوگوں کا امام اور پیشوا بنانے والا ہوں۔"

اس سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو اس کامیابی کے صلہ میں امامتِ خلق اور پیشوائی کا انعام دیا گیا، دُوسری طرف یہ بھی معلوم ہوا کہ خلقِ خدا کے امام ومقتدا اور پیشوا بننے کے لئے جو امتحان درکار ہے وہ دُنیا کے مدارس اور یونیورسٹیوں جیسا امتحان نہیں جس میں چند مسائل کی فنی تحقیق اور علمی موشگافی کو کامیابی کا اعلیٰ درجہ سمجھا جاتا ہے، اس عہدے کے حاصل کرنے کے لئے ان تیس اخلاقی اور عملی صفات میں کامل اور مکمل ہونا شرط ہے، جن کا ذکر ابھی بحوالہ آیات آچکا ہے، قرآن کریم نے ایک دُوسری جگہ بھی یہی مضمون اس طرح بیان فرمایا ہے:-

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ (السجدۃ)

"یعنی ہم نے اُن میں سے امام اور پیشوا بنائے کہ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کریں جب انہوں نے اپنے نفس کو خلافِ شرع سے روکا اور ہماری آیتوں پر یقین کیا۔"

اس آیت میں امامت وپیشوائی کے لئے ان تیس صفات کا خلاصہ دو لفظوں میں کر دیا گیا ہے، یعنی صبر ویقین، یقین علمی اور اعتقادی کمال اور صبر عملی اور اخلاقی کمال ہے، اور وہ تیس صفات جن کا ذکر ابھی اُوپر گزر چکا ہے سب کی سب انہی دو صفوں میں سموئی ہوئی ہیں۔

پانچواں سوال یہ تھا کہ آئندہ آنے والی نسلوں کو منصبِ امامت وپیشوائی دینے کے لئے جو یہ ضابطہ ارشاد ہوا ہے کہ فاسق اور ظالم لوگوں کو یہ منصب نہ ملے گا، اس کا کیا مطلب ہے؟

اس کی توضیح یہ ہے کہ امامت وپیشوائی ایک حیثیت سے اللہ جل شانہٗ کی خلافت ہے، یہ کسی ایسے شخص کو نہیں دی جاسکتی جو اس کا باغی اور نافرمان ہو، اسی لئے مسلمانوں پر لازم ہے کہ اپنے اختیار سے اپنا نمائندہ یا امیر کسی ایسے شخص کو مقرّر نہ کریں جو اللہ تعالیٰ کا باغی یا نافرمان ہو۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ

اور جب مقرّر کیا ہم نے خانۂ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کے واسطے اور جگہ امن کی، اور بناؤ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو

مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ

نماز کی جگہ اور حکم کیا ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو کہ پاک رکھو میرے گھر کو واسطے طواف کرنے والوں کے

وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿١٢٥﴾

اور اعتکاف کرنے والوں کے اور رُکوع اور سجدہ کرنے والوں کے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے ایسی جگہ بنایا جس کی طرف وہ لوٹ لوٹ کر جائیں اور جو سراپا امن ہو۔ اور تم مقامِ ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو یہ تاکید کی کہ: "تم دونوں میرے گھر کو اُن لوگوں کے لئے پاک کرو جو (یہاں) طواف کریں اور اعتکاف میں بیٹھیں اور رُکوع اور سجدہ بجالائیں۔" ﴿١٢٥﴾

حلِ لغات

مَثَابَۃً یہ لفظ "ثَابَ يَثُوْبُ ثَوْبًا وَمَثَابًا" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اس لئے مثابہ کے معنی مرجع کے ہوگئے جہاں آدمی بار بار لوٹ کر جائے۔

خلاصۂ تفسیر

(اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے کہ) جس وقت ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کا معبد اور (مقام) امن (ہمیشہ سے) مقرّر کر رکھا اور (آخر میں اُمتِ محمدیہ کو حکم دیا کہ برکت حاصل کرنے کے لئے) مقامِ ابراہیم کو (کبھی کبھی) نماز پڑھنے کی جگہ بنالیا کرو، اور ہم نے (بناءِ کعبہ کے وقت حضرت) ابراہیم و (حضرت) اسماعیل (علیہما السلام) کی طرف حکم بھیجا کہ میرے (اس) گھر کو خوب پاک (صاف) رکھا کرو، بیرونی اور مقامی لوگوں (کی عبادت) کے واسطے اور رُکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے۔

معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہ کی ہجرتِ مکہ اور بناءِ بیت اللہ کا تفصیلی واقعہ

اس آیت میں بیت اللہ کعبہ کی تاریخ کی طرف اشارہ ہے اور حضرت خلیل اللہ اور اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں اس کی تعمیرِ جدید، نیز بیت اللہ اور مکہ مکرمہ کی چند خصوصیات کا ذکر اور بیت اللہ کے احترام سے متعلقہ احکام مذکور ہیں، یہ

مضمون قرآن کی بہت سی آیات میں مختلف سورتوں میں پھیلا ہوا ہے، اس جگہ مختصر طور پر اس کو بیان کیا جاتا ہے، جس سے مذکورہ آیات کا پورا مضمون واضح ہو جائے گا، یہ مضمون سورۂ حج کی آیت نمبر ۲۶ میں اس طرح مذکور ہے:-

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿۲۷﴾

”یعنی وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے کہ جبکہ ہم نے اِبراہیم کو خانۂ کعبہ کی جگہ بتلا دی کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرنا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے اور قیام و رُکوع و سجود کرنے والوں کے واسطے پاک رکھنا، اور لوگوں میں حج کا اِعلان کر دو، لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے، پیادہ بھی اور دُبلی اُونٹنیوں پر بھی جو دُور دَراز کے راستوں سے پہنچی ہوں گی۔“

تفسیر ابنِ کثیر میں ائمۂ تفسیر حضرت مجاہدؒ وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت اِبراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ملکِ شام میں مقیم تھے، اور حضرت اِسماعیل علیہ السلام شیرخوار بچے تھے، جس وقت حق تعالیٰ کا ان کو یہ حکم ملا کہ ہم خانۂ کعبہ کی جگہ آپ کو بتلاتے ہیں، آپ اس کو پاک صاف کر کے طواف و نماز سے آباد رکھیں، اس حکم کی تعمیل کے لئے جبریلِ امین براق لے کر حاضر ہوئے، اور حضرت اِبراہیم علیہ السلام کو اور اِسماعیل علیہ السلام کو مع ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کے ساتھ لے کر سفر کیا، راستے میں جب کسی بستی پر نظر پڑتی اور حضرت اِبراہیم علیہ السلام جبریلِ امین سے دریافت کرتے کہ کیا ہمیں یہاں اُترنے کا حکم ملا ہے، تو حضرت جبریل علیہ السلام فرماتے کہ نہیں آپ کی منزل آگے ہے، یہاں تک کہ مکہ مکرمہ کی جگہ سامنے آئی، جس میں کانٹے دار جھاڑیاں اور ببول کے درختوں کے سوا کچھ نہ تھا، اس خطۂ زمین کے آس پاس کچھ لوگ بستے تھے جن کو ”عمالین“ کہا جاتا تھا، بیت اللہ اس وقت ایک ٹیلے کی شکل میں تھا، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے اس جگہ پہنچ کر جبریلِ امین سے دریافت کیا کہ کیا ہماری منزل یہ ہے؟ تو فرمایا کہ ہاں۔

حضرت اِبراہیم علیہ السلام مع اپنے صاحبزادے اور حضرت ہاجرہ کے یہاں اُتر گئے، اور بیت اللہ کے پاس ایک معمولی چھپر ڈال کر حضرت اِسماعیل اور ہاجرہ علیہما السلام کو یہاں ٹھہرا دیا، ان کے پاس ایک توشہ دان میں کچھ کھجوریں اور ایک مشکیزہ میں پانی رکھ دیا، اور اِبراہیم علیہ السلام کو اس وقت یہاں ٹھہرنے کا حکم نہ تھا، وہ اس شیرخوار بچے اور ان کی والدہ کو حوالہ بخدا کر کے واپس ہونے لگے، جانے کی تیاری دیکھ کر حضرت ہاجرہ نے عرض کیا کہ ہمیں اس لق و دق میدان میں چھوڑ کر آپ کہاں جاتے ہیں، جس میں نہ کوئی مونس و مددگار ہے، نہ زندگی کی ضروریات۔

حضرت خلیل اللہ صلوات اللہ علیہ وسلامہٗ نے کوئی جواب نہ دیا، اور چلنے لگے، حضرت ہاجرہ ساتھ اُٹھیں، پھر بار بار یہی سوال دُہرایا، حضرت خلیل اللہ کی طرف سے کوئی جواب نہ تھا، یہاں تک کہ خود ان کے دِل میں بات پڑی، اور

عرض کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہاں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم دیا ہے؟ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا ہے۔

اس کو سن کر حضرت ہاجرہ نے فرمایا کہ پھر آپ شوق سے جائیں، جس نے آپ کو یہ حکم دیا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہ کرے گا۔ ابراہیم علیہ السلام حکمِ خداوندی کی تعمیل میں یہاں سے چل کھڑے ہوئے، مگر شیر خوار بچہ اور اس کی والدہ کا خیال لگا ہوا تھا، جب راستے کے موڑ پر پہنچے جہاں سے حضرت ہاجرہ نہ دیکھ سکیں تو ٹھہر گئے اور اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا فرمائی جو سورۂ ابراہیم کی آیت نمبر ۳۵ و ۳۷ میں اس طرح مذکور ہے [۱]:-

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ (ابراہیم)

"اے میرے پروردگار! اس شہر کو اَمن والا بنا دیجئے اور مجھ کو اور میرے خاص فرزندوں کو بتوں کی عبادت سے بچائے رکھئے۔"

پھر دُعا میں عرض کیا:-

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾ (ابراہیم)

"یعنی اے ہمارے رَبّ! میں اپنی اولاد کو آپ کے محترم گھر کے قریب ایک میدان میں جو زراعت کے قابل نہیں آباد کرتا ہوں، اے ہمارے رَبّ! تاکہ وہ نماز کا اہتمام رکھیں، تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے، اور ان کو پھل کھانے کو دیجئے تاکہ یہ لوگ شکر کریں۔"

سابقہ حکم جس کی بنا پر شام سے ہجرت کرا کر حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو یہاں لایا گیا تھا اس میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ میرے گھر کو پاک رکھنا، حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام جانتے تھے کہ پاک رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ظاہری نجاسات اور گندگی سے بھی پاک رکھا جائے، اور باطنی نجاست کفر و شرک سے پاکی بھی فرمانِ الٰہی میں مقصود ہے، اس لئے یہاں ٹھہر کر جو دُعائیں فرمائیں ان میں اوّل تو اس بستی کے محفوظ و مامون رہنے اور جائے امن ہونے کی دُعا فرمائی، پھر یہ دُعا کی کہ مجھے اور میری اولاد کو شرک و بت پرستی سے بچایئے، کیونکہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو معرفتِ حق تعالیٰ کا وہ مقام حاصل تھا جس میں انسان کو اَپنا وجود ہی نابود نظر آتا ہے، اپنے تمام افعال و اعمال اور ارادوں کو

[۱] آگے سورۂ بقرہ آیت: ۱۲۸ کے تحت نیز سورۂ ابراہیم کی آیت: ۳۵ و ۳۷ کے تحت حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے خود اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ اس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ دُعا فرمائی تھی جو سورۂ بقرہ کی آیت: ۱۲۶ میں مذکور ہے، اور سورۂ ابراہیم والی دُعا بعد میں کی گئی تھی، لہٰذا بظاہر یہاں سورۂ ابراہیم کی آیات کا اندراج مرجوح قول پر مبنی ہے، واللہ اعلم۔ محمد تقی عثمانی ۲۰/۱/۱۴۳۰ھ

یہ محسوس کرتا ہے کہ سب کچھ حق تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، اسی کی مشیت و ارادے سے سب کام ہوتے ہیں، اس لئے کفر وشرک سے بیت اللہ کو پاک رکھنے کا جو حکم ملا تھا، اس میں حق تعالیٰ ہی سے اِمداد طلب کی، اس دُعا کے اندر کفر وشرک سے محفوظ رہنے کی اِلتجا میں ایک خاص راز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب بیت اللہ کی تعظیم وتکریم کا حکم ہوا تو یہ اِحتمال بھی تھا کہ آئندہ چل کر کوئی ناواقف اس بیت اللہ ہی کو معبود نہ بنالے، اور اس طرح شرک میں مبتلا ہوجائے، اس لئے یہ دُعا فرمائی کہ مجھ کو اور میری اولاد کو شرک سے محفوظ رکھا جائے۔

اس کے بعد شیر خوار بچہ اور اس کی والدہ پر شفقت کے پیشِ نظر یہ دُعا فرمائی کہ میں نے ان کو آپ کے حکم کے مطابق آپ کے محترم گھر کے پاس ٹھہرا تو دِیا ہے، لیکن یہ جگہ زراعت کے قابل بھی نہیں، جہاں کوئی اپنی محنت سے ضروریاتِ زندگی حاصل کرسکے، اس لئے آپ ہی اپنے فضل سے ان کو پھلوں کا رزق عطا فرمادیں۔

یہ دُعا کر کے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام تو اپنے وطن شام کی طرف روانہ ہوگئے، اِدھر حضرت ہاجرہ کا کچھ وقت تو اس توشۂ کھجور اور پانی کے ساتھ کٹ گیا، جو حضرت خلیل اللہ چھوڑ گئے تھے، پانی ختم ہونے کے بعد خود بھی پیاس سے بے چین اور شیر خوار بچہ بھی، اس وقت پانی کی تلاش میں ان کا نکلنا اور کبھی کوہِ صفا پر، کبھی کوہِ مروہ پر چڑھنا اور ان دونوں کے درمیان دوڑ دوڑ کر راستہ طے کرنا، تاکہ حضرت اِسماعیل آنکھوں کے سامنے آجائیں، عام مسلمانوں میں معروف ہے اور حج میں صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا آج تک اسی کی یادگار ہے۔

اس قصہ کے آخر میں حضرت جبریلِ امین کا بحکمِ خداوندی وہاں پہنچنا اور چشمۂ زمزم کا جاری کرنا اور پھر قبیلۂ جرہم کے کچھ لوگوں کا یہاں آکر مقیم ہوجانا اور حضرت اِسماعیل علیہ السلام کے جوان ہونے کے بعد قبیلۂ جرہم کی ایک بی بی سے شادی ہوجانا، یہ سب صحیح بخاری کی روایت میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ روایتِ حدیث کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اِبتداء سورۂ حج کی آیت میں جو بیت اللہ کو آباد کرنے اور پاک صاف رکھنے کا حکم حضرت خلیل اللہ کو ملا تھا اس وقت اتنا ہی عمل مقصود تھا کہ اس جگہ کو حضرت اِسماعیل اور ہاجرہ علیہما السلام کے ذریعہ آباد کردیا جائے، اس کے مخاطب صرف حضرت اِبراہیم علیہ السلام تھے، کیونکہ اِسماعیل علیہ السلام ابھی شیر خواری کے عالم میں تھے، اس وقت بیت اللہ کی تعمیرِ جدید کا حکم نہ ملا تھا، سورۂ بقرہ کی یہ آیت جو اس وقت زیرِ نظر ہے وَعَهِدْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَـٰعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ اس میں حضرت اِبراہیم کے ساتھ حضرت اِسماعیل علیہ السلام کو بھی شریک کرلیا گیا ہے، یہ حکم اس وقت کا ہے جبکہ حضرت اِسماعیل علیہ السلام جوان اور متأہل ہوچکے تھے، اُس وقت دونوں کو بناء بیت اللہ کا حکم دیا گیا۔

صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ ایک روز حضرت اِبراہیم علیہ السلام حسبِ عادت حضرت ہاجرہ اور اِسماعیل کی ملاقات کے لئے مکہ مکرمہ پہنچے، تو دیکھا کہ اِسماعیل علیہ السلام ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تیر بنارہے ہیں، والدِ ماجد کو

دیکھ کر کھڑے ہوگئے، ملاقات کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک کام کا حکم دیا ہے، کیا تم اس میں میری مدد کرو گے؟ لائق فرزند نے عرض کیا کہ بسر و چشم کروں گا، اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس ٹیلہ کی طرف اشارہ کیا جہاں بیت اللہ تھا کہ مجھے اس کی تعمیر کا حکم ہوا ہے، بیت اللہ کے حدود اربعہ حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو بتلا دیئے تھے، دونوں بزرگوار اس کام میں لگے تو بیت اللہ کی قدیم بنیادیں نکل آئیں، انہی پر دونوں نے تعمیر شروع کردی، [1]

اگلی آیت میں اسی کا بیان ہے وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ بانی بیت اللہ اصل میں حضرت خلیل علیہ السلام ہیں اور اسماعیل علیہ السلام مددگار کی حیثیت سے شریک ہیں۔

ان تمام آیات پر غور کرنے سے وہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے جو بعض روایاتِ حدیث اور تاریخ میں مذکور ہے کہ بیت اللہ پہلے سے دُنیا میں موجود تھا، کیونکہ تمام آیات میں کہیں بیت اللہ کی جگہ بتلا دینے کا ذکر ہے، کہیں اس کو پاک صاف رکھنے کا ذکر ہے، یہ کہیں مذکور نہیں کہ آج کوئی نیا گھر تعمیر کرانا ہے اس کی تعمیر کریں، اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ کا وجود اس واقعہ سے پہلے موجود تھا، پھر طوفانِ نوح کے وقت منہدم ہوگیا یا اُٹھالیا گیا تھا، صرف بنیادیں موجود تھیں، حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کعبہ کے پہلے بانی نہیں، بلکہ بناء سابق کی بنیادوں پر جدید تعمیر ان کے ہاتھوں ہوئی ہے۔

اب رہا یہ معاملہ کہ پہلی تعمیر کس نے کی اور کس وقت کی؟ اس میں کوئی صحیح اور قوی روایت حدیث کی منقول نہیں، اہلِ کتاب کی روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس کی تعمیر آدم علیہ السلام کے اس دُنیا میں آنے سے پہلے ہی فرشتوں نے کی تھی، پھر آدم علیہ السلام نے اس کی تجدید فرمائی، یہ تعمیر طوفانِ نوح تک باقی رہی، طوفانِ نوح میں منہدم ہوجانے کے بعد سے ابراہیم علیہ السلام کے زمانے تک یہ ایک ٹیلہ کی صورت میں باقی رہی، حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے ازسرِ نو تعمیر فرمائی، اس کے بعد اس تعمیر میں شکست و ریخت تو ہمیشہ ہوتی رہی مگر منہدم نہیں ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل قریشِ مکہ نے اس کو منہدم کرکے ازسرِ نو تعمیر کیا، جس کی تعمیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خاص شرکت فرمائی۔

اَحکام و مسائل متعلقہ حرمِ محترم

۱- لفظ "مَثَابَۃ" سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو یہ خاص فضیلت بخشی ہے کہ وہ ہمیشہ مرجعِ خلائق بنا رہے گا، اور لوگ بار بار اس کی طرف جانے اور لوٹنے کے آرزومند رہیں گے۔ امامِ تفسیر حضرت مجاہدؒ نے فرمایا: "لَا یَقْضِیْ اَحَدٌ

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الأنبياء، باب يزفّون النسلان في المشي ج: ١ ص: ٤٧٦

مِّنۡهَا وَطَرًا" (قرطبی)۔[۱] یعنی کوئی آدمی اس کی زیارت سے کبھی سیر نہیں ہوتا، بلکہ ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ زیارت وطواف کا شوق لے کر لوٹتا ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ قبولِ حج کی علامات میں سے ہے کہ وہاں سے لوٹنے کے بعد پھر وہاں جانے کا شوق دِل میں پائے، چنانچہ عام طور پر اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ جتنا شوقِ زیارت بیت اللہ کا ہوتا ہے، دُوسری مرتبہ کے لئے اس شوق میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور جوں جوں بار بار زیارت کرتا رہتا ہے یہ شوق اور بڑھتا جاتا ہے۔

یہ معجزہ بیت اللہ ہی کی خصوصیت ہوسکتی ہے، ورنہ دُنیا کے بہتر سے بہتر مناظر کو اِنسان ایک دومرتبہ دیکھ لینے کے بعد سیر ہوجاتا ہے، اور پانچ سات مرتبہ دیکھنے کے بعد تو دیکھنے کا دھیان بھی نہیں آتا، اور یہاں تو نہ کوئی خوش منظر سینری، نہ وہاں پہنچنا کچھ آسان ہے، نہ وہاں دُنیا کے کاروبار ہی کی کوئی اہمیت ہے، اس کے باوجود لوگوں کے دِل میں اس کی تڑپ ہمیشہ موجزن رہتی ہے، ہزاروں روپیہ خرچ کر کے سینکڑوں مشقتیں جھیل کر وہاں پہنچنے کے مشتاق رہتے ہیں۔

۲- لفظ "اَمۡنًا" اس جگہ "مَـاۡمَن" یعنی جائے امن کے معنی میں ہے، اور لفظ "بَیۡت" سے مراد صرف بیت اللہ یعنی خانۂ کعبہ نہیں بلکہ پورا حرم مراد ہے، قرآنِ کریم میں بیت اللہ اور کعبہ کا لفظ بول کر پورا حرام مراد لینے کے اور بھی شواہد موجود ہیں جیسے اِرشاد ہے: هَدۡيًۢا بٰلِغَ الۡكَعۡبَةِ (المائدۃ:۹۵) اس میں لفظ "کعبہ" بول کر پورا حرم مراد لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں ذِکر قربانی کا ہے اور بیتِ کعبہ کے اندر تو قربانی نہیں ہوتی، اور نہ وہاں قربانی کرنا جائز ہے، اس لئے معنی آیت کے یہ ہوئے کہ ہم نے حرم مکہ کو جائے امن بنادیا ہے، اور جائے امن بنادینے سے مراد لوگوں کو یہ حکم دینا ہے کہ حرمِ محترم کو عام قتل وقتال اور اِنتقام سے بالاتر رکھیں۔ (ابن عربی)[۲]

چنانچہ زمانۂ جاہلیت میں بھی عربوں کے ہاتھ میں ملتِ اِبراہیمی کے جو کچھ آثار باقی رہ گئے تھے، ان میں یہ بھی تھا کہ حرم میں اپنے باپ اور بھائی کا قاتل بھی کسی کو ملتا تو اِنتقام نہیں لیتے تھے، اور عام جنگ وقتال کو بھی حرم میں حرام سمجھتے تھے، شریعتِ اِسلام میں بھی یہ حکم اسی طرح باقی رکھا گیا، فتحِ مکہ کے وقت صرف چند گھنٹوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ارضِ حرم میں قتال کو جائز کیا گیا تھا، مگر اسی وقت پھر ہمیشہ کے لئے حرام کردیا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتحِ مکہ کے خطبے میں اس کا اِعلان فرمادیا۔ (صحیح بخاری)[۳]

اب رہا یہ مسئلہ کہ کوئی شخص حرم کے اندر ہی کوئی ایسا جرم کرے جس پر حدوقصاص اِسلامی شریعت کی رُو سے عائد ہوتا ہے تو حرم اس کو اَمن نہیں دے گا، بلکہ اس پر باجماعِ اُمت حدود وقصاص جاری کئے جائیں گے (اَحکام القرآن جصّاص

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۲ ص:۱۱۰

[۲] احکام القرآن لابن العربی تحت هذه الآیة ج:۱ ص:۶۸

[۳] صحیح البخاری، کتاب المناسک، باب لا یحل القتال بمکة ...الخ ج:۱ ص:۲۴۷

وقرطبی) کیونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:-

فَإِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ (البقرۃ:۱۹۱)

''یعنی اگر تم سے لوگ حرم میں قتال کرنے لگیں تو تم بھی وہیں اُن کو قتل کردو۔''

البتہ یہاں ایک مسئلہ ائمۂ مجتہدین میں مختلف فیہ ہے، وہ یہ کہ کوئی شخص باہر سے جرم کرکے حرم میں پناہ لے لے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا؟ اس میں بعض ائمہ اس پر بھی حرم میں حدود وقصاص کی سزائیں جاری کرنے کا حکم دیتے ہیں، اور اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کو سزا سے چھوڑنا تو نہیں، کیونکہ اگر ایسا کیا گیا تو جرائم کرکے سزا سے بچنے کا راستہ کھل جائے گا اور عالم میں فساد برپا ہو جائے گا، اور حرم مجرموں کا ٹھکانا بن جائے گا، لیکن اِحترامِ حرم کے سبب حرم کے اندر سزا نہ دی جائے گی، بلکہ اس کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ حرم سے باہر نکلے، وہاں سے نکلنے کے بعد سزا جاری کی جائے گی۔

۳- وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۗ اس میں مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت اِبراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدمِ مبارک کا بطورِ معجزہ نشان پڑ گیا تھا، اور جس کو تعمیرِ بیت اللہ کے وقت آپ نے اِستعمال کیا تھا۔ (صحیح بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اس پتھر میں حضرت اِبراہیم علیہ السلام کے قدمِ مبارک کا نقشہ دیکھا ہے، مگر لوگوں کے بکثرت چھونے اور ہاتھ لگانے سے اب وہ نشان ہلکا پڑ گیا ہے (قرطبی)۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مقامِ اِبراہیم کی تفسیر میں یہ بھی منقول ہے کہ پورا حرم مقامِ اِبراہیم ہے، ممکن ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ طواف کے بعد کی دو رکعتیں جن کو مقامِ اِبراہیم پر پڑھنے کا حکم اس آیت میں ہے، اس حکم کی تعمیل پورے حرم میں کسی جگہ بھی یہ رکعتیں پڑھنے سے ہو جائے گی، اس پر اکثر فقہائے اُمت متفق ہیں۔

۴- آیتِ مذکورہ میں مقامِ اِبراہیم کو مصلّٰی بنانے کا حکم ہے، اس کی وضاحت خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اپنے قول وعمل سے اس طرح فرمادی کہ آپ طواف کے بعد مقامِ اِبراہیم کے پاس پہنچے جو بیت اللہ کے سامنے تھوڑے فاصلے سے رکھا ہوا ہے، وہاں پہنچ کر یہ آیت تلاوت فرمائی وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۗ اور پھر مقامِ اِبراہیم کے پیچھے اس طرح دو رکعت نماز پڑھی کہ مقامِ اِبراہیم کو درمیان میں رکھتے ہوئے بیت اللہ کا اِستقبال ہو جائے (صحیح مسلم)[۱]، اسی لئے فقہائے اُمت نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو مقامِ اِبراہیم کے پیچھے متصلاً جگہ نہ ملے، وہ کتنے ہی فاصلے پر بھی جب اس طرح کھڑا ہو کہ مقامِ اِبراہیم بھی اس کے سامنے رہے اور بیت اللہ بھی تو اس حکم کی پوری تعمیل ہو جائے گی۔

۵- اس آیت سے ثابت ہوا کہ طواف کے بعد کی دو رکعتیں واجب ہیں۔ (جصّاص ومناسک مُلّا علی قاریؒ)[۲]

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج:۱ ص:۳۹۵

[۲] مناسک مُلّا علی القاریؒ ص:۱۵۵ واحکام القرآن للجصّاصؒ ج:۱ ص:۷۴

البتہ ان دو رکعتوں کا خاص مقامِ ابراہیم کے پیچھے ادا کرنا سنت ہے، اور حرم میں کسی دُوسری جگہ بھی ادا کرے تو کافی ہوگا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان رکعتوں کا بیت اللہ کے دروازے سے متصل پڑھنا بھی ثابت ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اس جگہ پڑھنا منقول ہے (جصّاص)۔ [1] اور مُلّا علی قاریؒ نے مناسک میں فرمایا ہے کہ یہ دو رکعت طواف تو واجب ہیں، اور سنت یہ ہے کہ مقامِ ابراہیم کے پیچھے ادا کی جائیں، لیکن اگر کسی وجہ سے وہاں ادا نہ کر سکا تو پھر حرم میں یا حرم سے باہر جہاں کہیں ممکن ہوا ادا کرنے سے واجب ادا ہو جائے گا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع میں حضرت اُمّ سلمہؓ کو ایسا ہی اِتفاق ہوا کہ ان کو واجب طواف نماز پڑھنے کا وہاں موقع نہ ملا تو مسجدِ حرام بلکہ مکہ مکرمہ سے نکلنے کے بعد ادا کی، اور بضرورت حرم سے باہر ادا کرنے پر جمہور علماء کے نزدیک کوئی دَم بھی واجب نہیں ہوتا، صرف اِمام مالکؒ وجوبِ دَم کے قائل ہیں۔ (مناسک مُلّا علی قاریؒ) [2]

۲- طَهِّرَا بَيْتِيَ اس میں بیت اللہ کو پاک کرنے کا حکم ہے، جس میں ظاہری نجاسات اور گندگی سے طہارت بھی داخل ہے، اور باطنی نجاسات کفر و شرک اور اَخلاقِ رذیلہ بغض وحسد، حرص وہوا، تکبر وغرور، رِیا ونام ونمود سے پاکی بھی شامل ہے، اور اس حکمِ طہارت کے لئے لفظ بَيْتِيَ میں اس طرف بھی اِشارہ ہے کہ یہ حکم تمام مساجد کے لئے عام ہے، کیونکہ ساری مساجد بیوتُ اللہ ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ۔ (النور:۳۶)

حضرت فاروقِ اعظمؓ نے مسجد میں ایک شخص کی آواز سنی، تو فرمایا: تمہیں خبر نہیں کہ تم کہاں کھڑے ہو (قرطبی)، [3] یعنی مسجد کا ادب واِحترام چاہئے، اس میں غیر مشروع آواز بلند نہیں کرنا چاہئے۔ حاصل یہ ہے کہ اس آیت سے جس طرح بیت اللہ کا تمام ظاہری اور باطنی نجاسات سے پاک رکھنا ضروری ہے، اسی طرح تمام مساجد کو بھی پاک رکھنا واجب ہے، یعنی مساجد میں داخل ہونے والوں پر لازم ہے کہ اپنے بدن اور کپڑوں کو بھی تمام نجاسات اور بدبو کی چیزوں سے پاک صاف رکھیں، اور اپنے دِلوں کو شرک ونفاق اور تمام اَخلاقِ رذیلہ، تکبر، حسد، بغض، حرص و رِیا وغیرہ کی نجاسات سے پاک کر کے داخل ہوں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا ہے کہ کوئی شخص پیاز، لہسن وغیرہ بدبودار چیزیں کھا کر مسجد میں نہ جائے، [4] اور چھوٹے بچوں اور دِیوانوں کو مسجدوں میں داخل ہونے سے منع فرمایا ہے، [5] کیونکہ ان سے نجاست کا خطرہ رہتا ہے۔

---

[1] احکام القرآن ج:۱ ص:۷۴، ۷۵

[2] ص:۱۵۷

[3] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۱۱۴، ۱۱۵

[4] صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب نهی من اکل ثومًا ... إلخ ج:۱ ص:۲۰۹

[5] سنن ابن ماجۃ، ابواب المساجد، باب ما یکرہ فی المساجد ج:۱ ص:۵۴

٧- لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿١٢٥﴾ آیت کے ان کلمات سے چند اَحکام وفوائد حاصل ہوئے، اوّل یہ کہ بناء بیت اللہ کا مقصد طواف، اِعتکاف اور نماز ہے، دُوسرے یہ کہ طواف نماز سے مقدم ہے (کما روی عن ابن عباس)، تیسرے یہ کہ اَطرافِ عالم سے جانے والے حجاج کے لئے طواف بہ نسبت نماز کے افضل ہے، چوتھے یہ کہ بیت اللہ کے اندر نماز علی الاطلاق جائز ہے فرض ہو یا نفل۔ (جصّاص) [١]

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ

اور جب کہا اِبراہیم نے: اے میرے رَبّ! بنا اس کو شہر اَمن کا اور روزی دے اس کے رہنے والوں کو میوے

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا

جو کوئی ان میں سے اِیمان لاوے اللہ پر اور قیامت کے دِن پر، فرمایا: اور جو کفر کرے اس کو بھی نفع پہنچاؤں گا تھوڑے دِنوں

ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٢٦﴾ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ

پھر اس کو جبراً بلاؤں گا دوزخ کے عذاب میں اور وہ بری جگہ ہے رہنے کی۔ اور یاد کرو جب اُٹھاتے تھے اِبراہیم

الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ

بنیادیں خانۂ کعبہ کی اور اِسماعیل، دُعا کرتے تھے: اے پروردگار ہمارے! قبول کر ہم سے بے شک تو ہی ہے سننے والا

الْعَلِيْمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً

جاننے والا۔ اے پروردگار ہمارے! اور کر ہم کو حکم بردار اپنا، اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرمانبردار

لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٢٨﴾

اپنی، اور بتلا ہم کو قاعدے حج کرنے کے اور ہم کو معاف کر، بے شک تو ہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان۔

[١] احکام القرآن ج:١ ص:٧٦

آسان ترجمۂ قرآن

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا تھا کہ: ''اے میرے پروردگار! اس کو ایک پُرامن شہر بنادیجئے، اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں اُنہیں قسم قسم کے پھلوں سے رزق عطا فرمایئے۔'' اللہ نے کہا: ''اور جو کفر اختیار کرے گا اس کو بھی میں کچھ عرصے کے لئے لطف اُٹھانے کا موقع دوں گا، (مگر) پھر اُسے دوزخ کے عذاب کی طرف کھینچ لے جاؤں گا۔ اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔'' ﴿۱۲۶﴾ اور اُس وقت کا تصور کرو جب ابراہیم بیت اللہ کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے، اور اسماعیل بھی (ان کے ساتھ شریک تھے، اور دونوں یہ کہتے جاتے تھے کہ:) ''اے ہمارے پروردگار! ہم سے (یہ خدمت) قبول فرمالے۔ بیشک تو، اور صرف تو ہی، ہر ایک کی سننے والا، ہر ایک کو جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾ اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا مکمل فرماں بردار بنالے، اور ہماری نسل سے بھی ایسی اُمت پیدا کر جو تیری پوری تابع دار ہو۔ اور ہم کو ہماری عبادتوں کے طریقے سکھا دے، اور ہماری توبہ قبول فرمالے۔ بیشک تو، اور صرف تو ہی، معاف کردینے کا خوگر (اور) بڑی رحمت کا مالک ہے ﴿۱۲۸﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جس وقت ابراہیم (علیہ السلام) نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! اس (موقع) کو ایک (آباد) شہر بنادیجئے (اور شہر بھی کیسا) امن (وامان) والا اور اس کے بسنے والوں کو پھلوں (کی قسم) سے بھی عنایت کیجئے (اور میں سب بسنے والوں کو نہیں کہتا بلکہ خاص) اُن کو (کہتا ہوں) جو اُن میں اللہ تعالیٰ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہوں (باقیوں کو آپ جانیں)، حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (کہ چونکہ رزق ہمارا خاص نہیں ہے، اس لئے ثمرات سب کو دُوں گا مؤمن کو بھی) اور اس شخص کو بھی جو کافر رہے (البتہ نجاتِ آخرت چونکہ اہلِ ایمان کے ساتھ خاص ہے) سو (اس واسطے) ایسے شخص کو (جو کہ کافر رہے) تھوڑے روز (یعنی دُنیا میں) تو خوب آرام برتاؤں گا (لیکن) پھر (بعد مرگ) اس کو کشاں کشاں عذابِ دوزخ میں پہنچادُوں گا اور ایسی پہنچنے کی جگہ تو بہت بری ہے (اللہ بچاوے۔ اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ اُٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام دیواریں خانۂ کعبہ کی اور (ان کے ساتھ) اسماعیل علیہ السلام بھی (اور یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار! (یہ خدمت) ہم سے قبول فرمایئے، بلاشبہ آپ خوب سننے والے، جاننے والے ہیں (ہماری دُعا کو سنتے ہیں، ہماری نیتوں کو جانتے ہیں)۔ اے ہمارے پروردگار! اور (ہم دونوں یہ بھی دُعا کرتے ہیں کہ) ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع بنالیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی

جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی مطیع ہو، اور (نیز) ہم کو ہمارے حج (وغیرہ) کے اَحکام بھی بتلا دیجئے اور ہمارے حال پر (مہربانی کے ساتھ) توجہ رکھئے اور فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمانے والے، مہربانی کرنے والے۔

معارف ومسائل

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کی راہ میں قربانیاں دیں، مال ومنال، اہل وعیال اور خود اپنے نفس کی خواہشات کو نظر اَنداز کر کے تعمیلِ اَحکامِ ربانی میں مسارعت کے جو کارنامے پیش کئے وہ عجائبِ روزگار میں سے ہیں۔

اس کے ساتھ اہل وعیال پر شفقت ومحبت ایک طبعی اور فطری اَمر ہونے کے ساتھ حکمِ ربانی بھی ہے، مذکور الصدر آیات اس کا مظہر ہیں، انہوں نے اپنے اہل وعیال کے لئے دِین ودُنیا کی آسائش وراحت کے لئے دُعائیں مانگی ہیں۔

حضرت اِبراہیم علیہ السلام کی دُعائیں

دُعا کو شروع لفظ رَبِّ سے کیا ہے، جس کے معنی ہیں ''اے میرے پالنے والے!'' ان الفاظ میں دُعا مانگنے کا سلیقہ سکھایا ہے، کہ خود یہ الفاظ حق تعالیٰ کی رحمت اور لطف وکرم کو متوجہ کرنے پر مؤثر دواعی ہیں، پھر سب سے پہلی دُعا یہ فرمائی کہ اس چٹیل میدان کو جس میں آپ کے حکم کے مطابق میں نے اپنے اہل وعیال کو لا ڈالا ہے آپ ایک شہر بنادیں، تاکہ یہاں کی سکونت میں اُن کو وحشت نہ ہو، اور ضروریاتِ زندگی بآسانی میسر آجائیں، یہی دُعا سورۂ اِبراہیم میں: هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا (اِبراہیم:۳۵) کے الفاظ سے آئی ہے، جس میں ''اَلْبَلَدَ'' کو الف لام کے ساتھ ذِکر کیا ہے، جو عربی زبان کی اِصطلاح میں ''معرفہ'' کہلاتا ہے، فرق کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی دُعا جو آیت سورۂ بقرہ میں ''بَلَدًا'' کے لفظ سے آئی ہے یہ اس وقت کی ہے جب یہ جگہ جنگل تھی، شہر بنا نہیں تھا، اس وقت ''بلد'' کو بغیر الف لام کے نکرہ اِستعمال کیا، اور دُوسری دُعا بظاہر اس وقت کی ہے جب مکہ کی بستی بس گئی اور وہ شہر معروف بن گیا، اس کا قرینہ یہ ہے کہ سورۂ اِبراہیم کی آخری آیات میں ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ (اِبراہیم:۳۹) جس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دُعا حضرت اِسحاق کی پیدائش کے بعد کی ہے، اور حضرت اِسحاق حضرت اِسماعیل سے تیرہ سال بعد میں پیدا ہوئے۔ (ابن کثیر) [1]

دُوسری دُعا اس میں یہ ہے کہ اس شہر کو اَمن والا شہر بنادیجئے، یعنی جو قتل وغارت گری سے، کفار کے تسلط سے اور آفات سے مأمون ومحفوظ رہے۔

حضرت خلیل اللہ کی یہ دُعا قبول ہوئی، اور مکہ مکرمہ ایک ایسا آباد شہر ہوگیا کہ اس کی اپنی آبادی کے علاوہ ساری دُنیا

---

[1] تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورة إبراهيم آيت:۳۷ ج:۴ ص:۵۱۳

کا مرجع بن گیا، اطرافِ عالم سے مسلمان وہاں پہنچنے کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں، اور مأمون ومحفوظ بھی ہوگیا، کہ بیت اللہ کے مخالف کسی قوم اور کسی بادشاہ کا اس پر تسلط نہیں ہوسکا، اَصحابِ فیل کا واقعہ خود قرآن میں مذکور ہے، کہ انہوں نے بیت اللہ پر حملے کا قصد کیا تو پورے لشکر کو تباہ و برباد کردیا گیا۔

یہ شہر قتل وغارت گری سے بھی برابر محفوظ چلا آرہا ہے، اِسلام سے پہلے بھی زمانۂ جاہلیت والے کتنی ہی خرابیوں اور کفر وشرک کی رسموں میں مبتلا ہونے کے باوجود بیت اللہ اور اس کے ماحول حرم کی تعظیم وتکریم کو ایسا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے کہ کیسا ہی دُشمن وہاں کسی کو مل جائے حرم میں اس سے قصاص یا اِنتقام نہ لیتے تھے، بلکہ سکانِ حرم کی تعظیم وتکریم بھی پورے عرب میں عام تھی، اسی لئے مکہ والے ملکِ شام اور یمن سے تجارتی درآمد وبرآمد کا سلسلہ رکھتے تھے اور کوئی ان کی راہ میں حائل نہ ہوتا تھا۔

حدودِ حرم میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو بھی امن دیا ہے، اس میں شکار جائز نہیں، ایسا ہی جانوروں میں بھی یہ قدرتی اِحساس پیدا فرمادیا ہے کہ حدودِ حرم میں آکر جانور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے، کسی شکاری آدمی سے نہیں گھبراتا۔

حرمِ محترم کے مأمون ہونے کے یہ اَحکام جو دُعائے اِبراہیمی کا نتیجہ ہیں زمانۂ جاہلیت سے قائم چلے آتے تھے، اِسلام اور قرآن نے ان کو اور زیادہ نکھارا، اور تقویت پہنچائی۔ حجاج ابنِ یوسف اور پھر قرامطہ کے ظلم وستم اور بدکاریوں سے جو قتل وقتال حرم میں ہوا، اوّل تو وہ خود اِسلام کا نام لینے والوں کے ہاتھوں ہوا، کوئی کافر قوم حملہ آور نہ تھی، اور کوئی شخص خود اپنے گھر کو آگ لگائے تو وہ امن کے منافی نہیں، اس کے علاوہ یہ واقعات شاذہ ہیں جو حضرت اِبراہیم علیہ السلام سے لے کر آج تک ہزاروں سال کی مدّت میں گنے چنے ہیں، اور قتل وقتال کے بعد ایسا کرنے والوں کا اَنجامِ بد بھی سب کے سامنے آگیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دُعائے اِبراہیمی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو ایک مأمون شہر اور تمام دُنیا کے لئے امن کی جگہ قدرتی طور پر بھی بنادی ہے، یہاں تک کہ دجال کو بھی حرم میں داخل ہونے کی قدرت نہ ہوگی، اور شرعی طور پر بھی یہ اَحکام جاری فرمادیئے کہ حرم میں باہمی قتل وقتال تو کیا جانوروں کا شکار بھی حرام کردیا گیا۔

تیسری دُعا یہ فرمائی کہ اس شہر کے باشندوں کو پھلوں کا رزق عطا فرمایئے، مکہ مکرمہ اور اس کے آس پاس کی زمین نہ کسی باغ وچمن کی متحمل تھی، نہ وہاں دُور دُور تک پانی کا نام ونشان تھا، مگر حق تعالیٰ نے دُعائے اِبراہیمی کو قبول فرمایا، اور مکہ کے قریب ہی طائف کا ایک ایسا خطہ بنادیا جس میں ہر طرح کے بہترین پھل بکثرت پیدا ہوتے اور مکہ مکرمہ آکر فروخت ہوتے ہیں، بعض اِسرائیلی روایات میں ہے کہ طائف دراصل ملکِ شام کا خطہ تھا، جس کو بحکمِ خداوندی جبریلِ امین نے یہاں منتقل کردیا۔

حکمتِ ابراہیمی

حضرت اِبراہیم علیہ السلام نے اپنی دُعا میں یہ نہیں فرمایا کہ مکہ اور اس کے ماحول کو گلزار اور پھلوں کی زمین یا قابلِ کاشت بنا دیجئے، بلکہ دُعا یہ فرمائی کہ یہ چیزیں پیدا کہیں اور ہوں مگر مکہ میں پہنچا کریں، اس میں شاید یہ راز ہو کہ حضرت خلیل یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد کاشتکاری یا باغبانی کے کاموں میں مشغول ہو جائے، کیونکہ ان کو اس جگہ آباد کرنے کا منشا تو حضرت اِبراہیم علیہ السلام نے خود یہ فرمادیا: رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ (ابراہیم: ۳۷) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خلیل علیہ السلام اپنی اولاد کا اصل مشغلہ بیت اللہ کی حفاظت اور نماز کو رکھنا چاہتے تھے، ورنہ کیا مشکل تھا کہ خود مکہ مکرمہ کو ایسا گلزار بنا دیا جاتا کہ دمشق و بیروت اس پر رشک کرتے۔

رزق ثمرات تمام ضروریاتِ زندگی کو شامل ہے

لفظ ''ثمرات'' جو ثمرہ کی جمع ہے، اس کے معنی پھل کے ہیں، اور بظاہر اس سے مراد درختوں کے پھل ہیں، لیکن سورۂ قصص آیت نمبر: ۵۷ میں اس دُعا کی قبولیت کا اِظہار ان الفاظ میں فرمادیا ہے: يُجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ ان الفاظ میں ایک تو اس کی تصریح ہے کہ خود مکہ میں یہ پھل پیدا کرنے کا وعدہ نہیں، بلکہ دُوسرے مقامات سے یہاں لائے جایا کریں گے، کیونکہ لفظ يُجْبٰٓى کا یہی مفہوم ہے، دُوسرے ''ثمرات کل شجر'' نہیں فرمایا، بلکہ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ فرمایا، اس تغیر لفظی سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہاں ثمرات کو عام کرنا مقصود ہے، کیونکہ ''ثمرہ'' عرف میں ہر چیز سے حاصل ہونے والی پیداوار کو کہا جاتا ہے، درختوں سے پیدا ہونے والے پھل جس طرح اس میں داخل ہیں اسی طرح مشینوں سے حاصل ہونے والا کل سامان بھی مشینوں کے ثمرات ہیں، اسی طرح مختلف دستکاریوں سے بننے والا سامان اُن دستکاریوں کے ثمرات ہیں، اس طرح ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ میں تمام ضروریاتِ زندگی داخل ہو جاتی ہیں، اور حالات و واقعات کا مشاہدہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اگرچہ ارضِ حرم کو نہ کاشت کی زمین بنایا ہے نہ صنعت کاری کی، لیکن دُنیا بھر میں پیدا ہونے والی اور بننے والی چیزیں یہاں عام طور پر مل جاتی ہیں، اور یہ بات شاید آج بھی کسی بڑے سے بڑے تجارتی یا صنعتی شہر کو حاصل نہ ہو کہ دُنیا بھر کی مصنوعات بکثرت و بآسانی وہاں مل جاتی ہیں۔

حضرت خلیل اللہ کی اِحتیاط

اس آیت میں جبکہ اہلِ مکہ کے لئے امن اور فراخیٔ عیش کی دُعا کی گئی، تو ان میں مؤمن و کافر سب داخل تھے، اور اس سے پہلے حضرت خلیل اللہ نے جب ایک دُعا میں اپنی پوری ذُرّیت کو بغیر اِمتیازِ مؤمن و کافر جمع کیا تھا، تو حق تعالیٰ کی

طرف سے یہ اِرشاد آیا تھا کہ یہ دُعا مؤمنوں کے حق میں قبول ہے، ظالم مشرکوں کے حق میں قابلِ قبول نہیں، وہ دُعا تھی اِمامت واِقتدار کی، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو، جو مقامِ خلت پر فائز اور خشیۃ اللہ سے لبریز تھے، اس جگہ بھی وہ بات یاد آئی تو اپنی دُعا میں یہ قید لگادی کہ یہ معاشی خوش حالی اور اَمن وامان کی دُعا صرف مؤمنین کے لئے کرتا ہوں، حق تعالیٰ کی طرف سے اس خشیت واِحتیاط کی قدر کی گئی اور فرمایا: وَمَنْ كَفَرَ یعنی یہ دُنیوی خوش حالی اور اِقتصادی فراخی ہم سبھی اہلِ مکہ کو عطا کریں گے، اگرچہ وہ ظالم مشرک وکافر ہی ہوں، البتہ مؤمنین کو یہ خوش حالی جس طرح دُنیا میں دی جائے گی اسی طرح آخرت میں بھی عطا ہوگی، اور کافروں کو آخرت میں عذاب کے سوا کچھ نہیں۔

اپنے نیک عمل پر بھروسہ اور قناعت نہ کرنے کی تعلیم

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکمِ ربانی کی تعمیل میں ملکِ شام کے ہر بھرے خوش منظر خطہ کو چھوڑ کر مکہ مکرمہ کے خشک پہاڑوں کے درمیان اپنے اہل وعیال کو لا ڈالا، اور بیت اللہ کی تعمیر میں اپنی پوری توانائی خرچ کی، یہ موقع ایسا تھا کہ ایسے مجاہدے کرنے والے کے دِل میں عجب پیدا ہوتا تو وہ اپنے عمل کو بہت کچھ قابلِ قدر سمجھتا، لیکن یہاں حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، رَبّ العزّت کی بارگاہِ عزّت وجلال کو پہچاننے والے ہیں کہ کسی اِنسان سے اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان عبادت واِطاعت ممکن نہیں، ہر شخص اپنی قوّت وہمت کی مقدار سے کام کرتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی بھی بڑے سے بڑا عمل کرے تو اس پر ناز نہ کرے، بلکہ اِلحاح وزاری کے ساتھ دُعا کرے کہ میرا یہ عمل قبول ہوجائے، جیسا کہ حضرت اِبراہیم علیہ السلام نے بناء بیت اللہ کے عمل کے متعلق یہ دُعا فرمائی کہ ''اے ہمارے پروردگار! آپ ہمارے اس عمل کو قبول فرمالیں، کیونکہ آپ تو سننے والے اور جاننے والے ہیں، ہماری دُعا کو سنتے ہیں اور ہماری نیتوں کو جانتے ہیں۔''

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ، یہ دُعا بھی اسی معرفت وخشیت کا نتیجہ ہے، جو حضرت خلیل کو حاصل تھی، کہ اِطاعت وفرمانبرداری کے بے مثال کارنامے بجالانے کے بعد بھی یہ دُعا کرتے ہیں کہ ''ہم دونوں کو اَپنا فرمانبردار بنالیجئے'' وجہ یہ ہے کہ جتنی کسی کو حق تعالیٰ کی معرفت بڑھتی جاتی ہے، اتنا ہی اس کا یہ اِحساس بڑھتا جاتا ہے کہ ہم حقِ وفاداری اور حقِ فرمانبرداری پورا اَدا نہیں کررہے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ، اس دُعا میں بھی اپنی اولاد کو شریک فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ والے جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور اولاد کی قربانی پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے، ان کو اپنی اولاد سے کس قدر محبت ہوتی ہے، مگر اس محبت کے صحیح تقاضوں کو پورا کرتے ہیں جہاں تک عوام کی رسائی نہیں، عوام تو اولاد کی صرف جسمانی صحت وراحت کو جانتے ہیں، اُن

کی ساری شفقت وراحت اُسی کے گرد گھومتی ہے، مگر اللہ کے مقبول بندے جسمانی سے زیادہ رُوحانی اور دُنیوی سے زیادہ اُخروی راحت کی فکر کرتے ہیں، اس لئے دُعا فرمائی کہ میری اولاد میں سے ایک جماعت کو پورا فرمانبردار بنادیجئے۔ اپنی ذُرّیت کے لئے دُعا میں ایک حکمت اور بھی ہے کہ تجربہ شاہد ہے کہ جو لوگ قوم میں بڑے مانے جاتے ہیں ان کی اولاد اگر ان کے راستہ پر قائم رہے تو عوام میں اُن کی مقبولیت فطری ہوتی ہے، ان کی صلاحیت صلاحِ عوام کا ذریعہ بنتی ہے۔ (بحرمحیط) [۱]

حضرت خلیل اللہ کی یہ دُعا بھی قبول ہوئی کہ آپ کی ذُرّیت میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو دینِ حق پر قائم اور اللہ کے فرمانبردار بندے تھے، جاہلیتِ عرب میں جبکہ پوری دُنیا کو خصوصاً عرب کو شرک وبت پرستی نے گھیر لیا تھا، اس وقت اولادِ ابراہیم میں ہمیشہ کچھ لوگ عقیدۂ توحید وآخرت کے سچے معتقد اور اطاعت شعار رہے ہیں، جیسے اہلِ جاہلیت میں زید بن عمرو بن نفیل اور قس بن ساعدہ تھے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد عبدالمطلب بن ہاشم کے متعلق بھی یہی روایت ہے کہ وہ شرک وبت پرستی سے بیزار تھے۔ (بحرمحیط) [۲]

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا، مناسک منسک کی جمع ہے، اعمالِ حج کو بھی مناسک کہا جاتا ہے، اور مقاماتِ حج، عرفات، منیٰ، مزدلفہ کو بھی، یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں، اور دُعا کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں اعمالِ حج اور مقاماتِ حج پوری طرح سمجھا دیجئے، اسی لئے لفظ اَرِنَا استعمال فرمایا، جس کے معنی ہیں ''ہمیں دِکھلا دیجئے'' وہ دیکھنا آنکھوں سے بھی ہوسکتا ہے اور قلب سے بھی، چنانچہ مقاماتِ حج کو بذریعہ جبریلِ امین دِکھلا کر متعین کر دیا گیا اور احکامِ حج کی واضح تلقین وتعلیم فرما دی گئی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ

اے پروردگار ہمارے! اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں کا کہ پڑھے اُن پر تیری آیتیں اور سکھلائے ان کو کتاب

وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵/۸ ۱۵

اور تہ کی باتیں اور پاک کرے ان کو، بے شک تو ہی ہے بہت زبردست بڑی حکمت والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہمارے پروردگار! اِن میں ایک ایسا رسول بھی بھیجنا جو اِنہی میں سے ہو، جو اِن کے سامنے تیری آیتوں کی

---

۱ تفسير البحر المحيط تحت هذه الآية ج:۲ ص:۹

۲ بحوالۂ بالا۔

تلاوت کرے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، اور ان کو پاکیزہ بنائے۔ بیشک تیری، اور صرف تیری، ذات وہ ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کی حکمت بھی کامل۔'' (۱۲۹)

خلاصۂ تفسیر

اے ہمارے پروردگار! اور (یہ بھی دُعا ہے کہ) اس جماعت کے اندر (جس کے پیدا ہونے کی دُعا اپنی اولاد میں سے کر رہے ہیں) انہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرّر کیجئے جو اُن لوگوں کو آپ کی آیات پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو (آسمانی) کتاب (کے مضامین) کی اور (اس میں) خوش فہمی (کا سلیقہ حاصل کرنے) کی تعلیم دیا کریں اور ان کو (اس تعلیم و تلاوت کے ذریعہ جہالت کے خیالات اور اَعمال سے) پاک کریں، بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب القدرت کامل الانتظام۔

تشریحِ لغات

یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ، مصدر تلاوۃ سے مشتق ہے، تلاوت کے اصلی معنی اِتباع اور پیروی کے ہیں، اِصطلاحِ قرآن وحدیث میں یہ لفظ قرآنِ کریم اور دُوسری آسمانی کتابوں اور کلامِ اِلٰہی کے پڑھنے کے لئے اِستعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کلام کے پڑھنے والے کو اس کا پورا اِتباع کرنا لازم ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ٹھیک اسی طرح پڑھنا ضروری ہے، اپنی طرف سے کسی لفظ یا اس کی حرکات میں کمی بیشی یا تبدیلی کی اِجازت نہیں۔ اِمام راغب اصفہانیؒ نے ''مفردات القرآن'' میں فرمایا ہے کہ کلامِ اِلٰہی کے سوا کسی دُوسری کتاب یا کلام کے پڑھنے کو عرفاً تلاوت نہیں کہا جاسکتا۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، اس میں ''کتاب'' سے مراد کتابُ اللہ ہے، اور ''اَلْحِكْمَةَ'' کا لفظ عربی لغت میں کئی معنی کے لئے آتا ہے، حق بات پر پہنچنا، عدل و اِنصاف، علم و حلم وغیرہ (قاموس)۔ اِمام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں کہ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی تمام اشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کے لئے بولا جائے تو موجودات کی صحیح معرفت اور نیک اعمال کے، لئے جاتے ہیں، ترجمہ شیخ الہندؒ میں اس کا ترجمہ ''تہہ کی باتیں'' اسی مفہوم کو اَدا کرتا ہے، اور لفظِ ''حکمت'' عربی زبان میں کئی معنی کے لئے بولا جاتا ہے، علمِ صحیح، نیک عمل، عدل و اِنصاف، قولِ صادق وغیرہ۔ (قاموس و راغب) [1]

اس لئے دیکھنا ہے کہ اس آیت میں لفظِ ''حکمت'' سے کیا مراد ہے، مفسرین صحابہؓ و تابعینؒ جو معانیٔ قرآن کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر کرتے ہیں، اس جگہ لفظ حکمت کے معنی بیان کرنے میں اگرچہ ان کے الفاظ

---

[1] مفردات القرآن للأصفهانیؒ ج:۱ ص:۱۲۷

مختلف ہیں، لیکن خلاصہ سب کا ایک ہی ہے، یعنی سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اِمامِ تفسیر ابنِ کثیرؒ وابنِ جریرؒ نے حضرت قتادہؒ سے یہی تفسیر نقل کی ہے، کسی نے تفسیرِ قرآن اور کسی نے تفقّہ فی الدین فرمایا ہے، اور کسی نے علم اَحکامِ شرعیہ کہا، اور کسی نے کہا کہ ایسے اَحکامِ اِلٰہیہ کا علم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی بیان سے معلوم ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان سب کا حاصل وہی حدیث وسنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ [۱]

لفظ یُزَکِّیْھِمْ زکوٰۃ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں طہارت اور پاکی، اور یہ لفظ ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پاکی کے لئے بولا جاتا ہے۔

معارف ومسائل

تشریحِ مذکور سے آیت کا مفہوم واضح ہوگیا کہ حضرت اِبراہیم علیہ السلام نے اپنی آئندہ نسل کی فلاحِ دُنیا وآخرت کے واسطے حق تعالیٰ سے یہ دُعا کی کہ میری اولاد میں ایک رسول بھیج دیجئے جو اُن کو آپ کی آیات تلاوت کر کے سنائے اور قرآن وسنت کی تعلیم دے، اور ان کو ظاہری وباطنی گندگیوں سے پاک کرے۔ اس میں حضرت خلیل اللہ نے اس رسول کے لئے اپنی اولاد میں ہونے کی اس لئے دُعا فرمائی کہ اوّل تو یہ اپنی اولاد کے لئے سعادت وشرف ہے، دُوسرے ان لوگوں کے لئے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ رسول جب انہی کی قوم اور برادری کے اندر ہوگا، تو اس کے چال، چلن سیرت وحالات سے یہ لوگ بخوبی واقف ہوں گے، کسی دھوکا فریب میں مبتلا نہ ہوں گے، حدیث میں ہے کہ حضرت اِبراہیم علیہ السلام کو اس دُعا کا جواب حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ملا کہ آپ کی دُعا قبول کر لی گئی، اور یہ رسول آخری زمانہ میں بھیجے جائیں گے۔ (ابنِ جریر وابنِ کثیر) [۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خصوصیات

مسندِ احمد [۳] کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کے نزدیک خاتم النّبیین اس وقت تھا جبکہ آدم علیہ السلام پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، بلکہ ان کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا، اور میں آپ لوگوں کو اپنے معاملہ کی اِبتدا بتلاتا ہوں کہ میں اپنے باپ حضرت اِبراہیم علیہ السلام کی دُعا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ ماجدہ کے

---

[۱] تفسیر الطبری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۳ ص:۸۶، ۸۷ و تفسیر ابن کثیر تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۴۴۴، ۴۴۵

[۲] تفسیر ابن کثیر ج:۱ ص:۴۴۴

[۳] مسند احمد رقم الحدیث:۲۷۳

خواب کا مظہر ہوں، عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت سے مراد ان کا یہ قول ہے: وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ (الصّف:٦)، اور والدہ ماجدہ نے حالتِ حمل میں یہ خواب دیکھا تھا کہ میرے بطن سے ایک نور نکلا جس سے ملک شام کے محلات جگمگا اُٹھے، پھر قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تذکرہ کرتے ہوئے دو جگہ سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۶۴ اور سورۂ جمعہ آیت نمبر ۲ میں انہی الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا میں یہاں مذکور ہیں، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسول کے بھیجنے کی دُعا فرمائی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، آیت کے الفاظ کی تشریح اور اس کا مفہوم واضح ہوجانے کے بعد اس پر غور کیجئے۔

بعثتِ رسول کے تین مقاصد

سورۂ بقرہ کی اس آیت میں اور سورۂ آل عمران اور سورۂ جمعہ کی آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک ہی مضمون ایک ہی طرح کے الفاظ میں آیا ہے، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دُنیا میں تشریف لانے کے مقاصد یا آپ کے عہدۂ نبوّت و رِسالت کے فرائضِ منصبی تین بیان کئے گئے ہیں، ایک تلاوتِ آیات، دُوسرے تعلیم کتاب وحکمت، تیسرے لوگوں کا تزکیۂ اخلاق وغیرہ۔

پہلا مقصد تلاوتِ آیات

یہاں پہلی بات قابلِ غور ہے کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے، اور تعلیم کا معانی سے، یہاں تلاوت و تعلیم کو الگ الگ بیان کرنے سے یہ حاصل ہوا کہ قرآنِ کریم میں جس طرح معانی مقصود ہیں، اس کے الفاظ بھی مستقل مقصود ہیں، ان کی تلاوت و حفاظت فرض اور اہم عبادت ہے، یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلاواسطہ شاگرد اور مخاطب خاص وہ حضرات تھے جو عربی زبان کے نہ صرف جاننے والے بلکہ اس کے فصیح و بلیغ خطیب اور شاعر بھی تھے، ان کے سامنے قرآن عربی کا پڑھ دینا بھی بظاہر ان کی تعلیم کے لئے کافی تھا، ان کو الگ سے ترجمہ و تفسیر کی ضرورت نہ تھی، تو پھر تلاوتِ آیات کو ایک علیحدہ مقصد اور تعلیم کتاب کو جداگانہ دُوسرا مقصدِ رِسالت قرار دینے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ عمل کے اعتبار سے یہ دونوں مقصد ایک ہی ہوجاتے ہیں، اس میں غور کیا جائے تو دو اہم نتیجے آپ کے سامنے آئیں گے، اوّل یہ کہ قرآنِ کریم دُوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب نہیں جس میں صرف معانی مقصود ہوتے ہیں، الفاظ ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں اگر معمولی تغیر و تبدل بھی ہوجائے تو کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا، ان کے الفاظ بغیر معنی سمجھے ہوئے پڑھتے رہنا بالکل لغو و فضول ہے، بلکہ قرآنِ کریم کے جس طرح معانی مقصود ہیں اسی طرح الفاظ بھی مقصود ہیں، اور الفاظِ

قرآن کے ساتھ خاص خاص اَحکامِ شرعیہ بھی متعلق ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُصولِ فقہ میں قرآنِ کریم کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ "هُوَ النَّظْمُ وَالْمَعْنٰى جَمِيْعًا"، یعنی قرآن نام ہے الفاظ اور معنی دونوں کا، جس سے معلوم ہوا کہ اگر معانیٔ قرآن کو اَلفاظِ قرآن کے علاوہ دُوسرے الفاظ یا دُوسری زبان میں لکھا جائے تو وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں، اگرچہ مضامین بالکل صحیح دُرست ہی ہوں، ان مضامینِ قرآنیہ کو بدلے ہوئے الفاظ میں اگر کوئی شخص نماز میں پڑھ لے، تو نماز اَدا نہ ہوگی، اسی طرح وہ تمام اَحکام جو قرآن سے متعلق ہیں اس پر عائد نہیں ہوں گے، قرآنِ کریم کی تلاوت کا جو ثواب اَحادیثِ صحیحہ میں وارِد ہے وہ بدلی ہوئی زبان یا بدلے ہوئے الفاظ پر مرتب نہیں ہوگا، اور اسی لئے فقہائے اُمت نے قرآنِ کریم کا صرف ترجمہ بلا متنِ قرآن کے لکھنے اور چھاپنے کو ممنوع فرمایا ہے، جس کو عرف میں اُردو کا قرآن یا انگریزی کا قرآن کہہ دیا جاتا ہے، کیونکہ درحقیقت جو قرآن اُردو یا انگریزی میں نقل کیا گیا وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تعلیمِ کتاب سے علیحدہ تلاوتِ آیات کو جداگانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اِشارہ کر دیا کہ قرآنِ کریم میں جس طرح اس کے معانی مقصود ہیں، اسی طرح اس کے الفاظ بھی مقصود ہیں، کیونکہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے، معانی کی نہیں، اسی لئے جس طرح رسول کے فرائض میں معانی کی تعلیم داخل ہے، اسی طرح الفاظ کی تلاوت اور حفاظت بھی ایک مستقل فرض ہے، اس میں شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم کے نزول کا اصل مقصد اس کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی پر عمل کرنا اور اس کی تعلیمات کو سمجھنا اور سمجھانا ہے، محض اس کے الفاظ رَٹ لینے پر قناعت کر کے بیٹھ جانا قرآنِ کریم کی حقیقت سے بے خبری اور اس کی بے قدری ہے۔

قرآنِ کریم کے الفاظ اگر بے سمجھے بھی پڑھے جائیں تو بیکار نہیں، بلکہ موجبِ ثوابِ عظیم ہیں

لیکن اس کے ساتھ یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ "جب تک قرآنِ کریم کے الفاظ کے معانی نہ سمجھے، طوطے کی طرح اس کے الفاظ پڑھنا فضول ہے۔" یہ میں اس لئے واضح کر رہا ہوں کہ آج کل بہت سے حضرات قرآنِ کریم کو دُوسری کتابوں پر قیاس کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک کسی کتاب کے معنی نہ سمجھیں تو اس کے الفاظ کا پڑھنا پڑھانا وقت ضائع کرنا ہے، مگر قرآنِ کریم میں ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ قرآن الفاظ اور معنی دونوں کا نام ہے، جس طرح ان کے معانی کا سمجھنا اور اس کے دیئے ہوئے اَحکام پر عمل کرنا فرض اور اعلیٰ عبادت ہے، اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی ایک مستقل عبادت اور ثوابِ عظیم ہے۔

دُوسرا مقصد تعلیمِ کتاب

یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ جو معانیٔ قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے اور سمجھنے والے تھے، انہوں نے محض معنی سمجھ لینے اور عمل کر لینے کو کافی نہ سمجھا، سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے تو ایک مرتبہ پڑھ لینا کافی ہوتا، انہوں نے ساری عمر تلاوتِ قرآن کو حرزِ جان بنائے رکھا، بعض صحابہؓ روزانہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے، بعض دو دِن میں اور اکثر حضرات تین دِن میں ختمِ قرآن کے عادی تھے، اور ہر ہفتے میں قرآن ختم کرنے کا تو پوری اُمت کا معمول رہا ہے، قرآنِ کریم کی سات منزلیں اسی ہفتہ واری معمول کی علامت ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا یہ عمل بتلا رہا ہے کہ جس طرح قرآن کے معانی کا سمجھنا اور عمل کرنا اصلی عبادت ہے، اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی بجائے خود ایک اعلیٰ عبادت اور موجبِ انوار و برکات اور سرمایۂ سعادت و نجات ہے، اس لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تلاوتِ آیات کو ایک مستقل حیثیت دی گئی، مقصد یہ ہے کہ جو مسلمان فی الحال معانیٔ قرآن کو نہیں سمجھتے وہ اس بدنصیبی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ الفاظ کو فضول سمجھ کر اس سے بھی محروم ہو جائیں، کوشش کرتے رہنا ضروری ہے کہ وہ قرآن کے معانی کو سمجھیں تاکہ قرآنِ کریم کے حقیقی انوار و برکات کا مشاہدہ کریں، اور نزولِ قرآن کا اصلی مقصد پورا ہو، قرآن کو معاذ اللہ جنتر منتر کی طرح صرف جھاڑ پھونک میں اِستعمال کی چیز نہ بنائیں، اور بقول اقبال مرحوم سورۂ یٰسٓ کو صرف اس کام کے لئے نہ سمجھیں کہ اس کے پڑھنے سے مرنے والے کی جان سہولت سے نکل جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں فرائضِ رسول بیان کرتے ہوئے تلاوتِ آیات کو مستقل فرض کی حیثیت دے کر اس پر تنبیہ کر دی گئی ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کی تلاوت اور ان کی حفاظت اور ان کو ٹھیک اس لب و لہجے میں پڑھنا جس پر وہ نازل ہوئے ہیں، ایک مستقل فرض ہے۔ اسی طرح تلاوتِ آیات کے فرض کے ساتھ تعلیمِ کتاب کو جداگانہ فرض قرار دینے سے ایک دُوسرا اہم نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فہمی کے لئے صرف عربی زبان کا جان لینا کافی نہیں، بلکہ تعلیمِ رسول کی ضرورت ہے جیسے کہ تمام علوم فنون میں یہ بات معلوم و مشاہد ہے کہ کسی فن کی کتاب کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے محض اس کتاب کی زبان جاننا بلکہ زبان کا ماہر ہونا بھی کافی نہیں، جب تک کہ اس فن کو کسی ماہر اُستاذ سے حاصل نہ کیا جائے، مثلاً آج کل ڈاکٹری، ہومیو پیتھک اور ایلو پیتھک کی کتابیں عموماً انگریزی زبان میں ہیں، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ محض انگریزی زبان میں مہارت پیدا کر لینے اور ڈاکٹری کی کتابوں کا مطالعہ کر لینے سے کوئی شخص ڈاکٹر نہیں بن سکتا، انجینئرنگ کی کتابیں پڑھنے سے کوئی انجینئر نہیں بن سکتا، بڑے فنون تو اپنی جگہ پر ہیں، معمولی روزمرہ کے کام محض کتاب کے مطالعہ سے بغیر اُستاد سے سیکھے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتے، آج تو ہر صنعت و حرفت پر سینکڑوں کتابیں لکھی ہوئی ہیں، فوٹو دے کر کام سکھانے کے

طریقے بتائے ہیں، لیکن ان کتابوں کو دیکھ کر نہ کوئی درزی بنتا ہے نہ باورچی یا لوہار، اگر محض زبان جان لینا کسی فن کے حاصل کرنے اور اس کی کتاب سمجھنے کے لئے کافی ہوتا تو دُنیا کے سب فنون اس شخص کو حاصل ہو جاتے جو ان کتابوں کی زبان جانتا ہے، اب ہر شخص غور کرسکتا ہے کہ معمولی فنون اور اُن کے سمجھنے کے لئے جب محض زبان دانی کافی نہیں، تعلیم اُستاد کی ضرورت ہے تو مضامینِ قرآن جو علوم اِلٰہیہ سے لے کر طبعیات وفلسفہ تک تمام گہرے دقیق علوم پر مشتمل ہے وہ محض عربی زبان جان لینے سے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں، اور اگر یہی ہوتا تو جو شخص عربی زبان سیکھ لے وہ معارفِ قرآن کا ماہر سمجھا جائے تو آج بھی ہزاروں یہودی اور نصرانی عرب ممالک میں عربی زبان کے بڑے ماہر اَدیب ہیں، وہ سب سے بڑے مفسرِ قرآن مانے جاتے، اور عہدِ رسالت میں ابوجہل، ابولہب قرآن کے ماہر سمجھے جاتے۔

غرض یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ایک طرف تو رسول کے فرائض میں تلاوتِ آیات کو ایک مستقل فرض قرار دِیا، دُوسری طرف تعلیمِ کتاب کو جداگانہ فرض قرار دے کر بتلا دیا کہ محض تلاوتِ آیات کا سن لینا فہمِ قرآن کے لئے عربی زبان جاننے والوں کے واسطے بھی کافی نہیں، بلکہ تعلیمِ رسول ہی کے ذریعے قرآنی تعلیم کا صحیح علم حاصل ہوسکتا ہے، قرآن کو تعلیماتِ رسول سے جدا کر کے خود سمجھنے کی فکر خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، اگر مضامینِ قرآنی کو بتلانے سکھانے کی ضرورت نہ ہوتی تو رسول کو بھیجنے ہی کی کوئی حاجت نہ تھی، اللہ کی کتاب کسی دُوسری طرح بھی انسانوں تک پہنچائی جاسکتی تھی، مگر اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مضامینِ قرآنی کی تعلیم وتفہیم کے لئے دُنیا کے دُوسرے علوم وفنون سے زیادہ تعلیمِ اُستاد کی ضرورت ہے، اور یہاں پر عام اُستاد بھی کافی نہیں، بلکہ ان مضامین کا اُستاد صرف وہ شخص ہوسکتا ہے جس کو حق تعالیٰ سے بذریعہ وحی شرفِ ہم کلامی حاصل ہو، جس کو اِسلام کی اِصطلاح میں "نبی ورسول" کہا جاتا ہے، اس لئے قرآنِ کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دُنیا میں بھیجنے کا مقصد یہ قرار دِیا کہ وہ قرآنِ کریم کے معانی واَحکام کی شرح کر کے بیان فرمائیں، اِرشاد ہے: لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل:۴۴) یعنی "ہم نے آپ کو اس لئے بھیجا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اللہ کی نازل کردہ آیات کے مطالب بیان فرمائیں۔" تعلیمِ کتاب کے ساتھ آپ کے فرائض میں دُوسری چیز تعلیمِ حکمت بھی رکھی گئی ہے، اور میں نے اُوپر بتلایا ہے کہ "حکمت" کے عربی زبان کے اِعتبار سے اگرچہ کئی معنی ہوسکتے ہیں، لیکن اس آیت میں اور اس کے ہم معنی دُوسری آیات میں صحابہؓ وتابعینؒ نے حکمت کی تفسیر سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے، جس سے واضح ہوا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے جس طرح معانیٔ قرآن کا سمجھانا و بتلانا فرض ہے، اسی طرح پیغمبرانہ تربیت کے اُصول وآداب جن کا نام "سنت" ہے، ان کی تعلیم بھی آپ کے فرائضِ منصبی میں داخل ہے، اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" "میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں[۱]۔" اور یہ ظاہر

[۱] سنن ابن ماجة، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم ج:۱ ص:۲۱

ہے کہ جب آپ کا مقصدِ وجود معلم ہونا ہے، تو آپ کی اُمت کا مقصدِ وجود متعلّم اور طالب علم ہونا لازم ہوگیا، اس لئے ہر مسلمان مرد عورت بحیثیت مسلمان ہونے کے ایک طالب علم ہونا چاہئے جس کو تعلیماتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لگن ہو، اگر علومِ قرآن وسنت کی مکمل تحصیل اور اس میں مہارت کے لئے ہمت وفرصت نہیں ہے، تو کم از کم بقدرِ ضرورت علم حاصل کرنے کی فکر چاہئے۔

تیسرا مقصد تزکیہ

تیسرا فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تزکیہ ہے، جس کے معنی ہیں ظاہری و باطنی نجاسات سے پاک کرنا۔ ظاہری نجاسات سے تو عام مسلمان واقف ہیں، باطنی نجاسات کفر اور شرک، غیر اللہ پر اعتمادِ کلی اور اِعتقادِ فاسد، نیز تکبر وحسد، بغض، حبِ دُنیا وغیرہ ہیں، اگرچہ علمی طور پر قرآن وسنت کی تعلیم میں ان سب چیزوں کا بیان آ گیا ہے، لیکن تزکیہ کو آپ کا جداگانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اِشارہ کردیا گیا کہ جس طرح محض الفاظ کے سمجھنے سے کوئی فن حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح نظری وعلمی طور پر فن حاصل ہوجانے سے اس کا اِستعمال اور کمال حاصل نہیں ہوتا جب تک کسی مربی کے زیرِ نظر اس کی مشق کرکے عادت نہ ڈالے، سلوک وتصوف میں کسی شیخِ کامل کی تربیت کا یہی مقام ہے کہ قرآن وسنت میں جن اَحکام کو عملی طور پر بتلایا گیا ہے اُن کی عملی طور پر عادت ڈالی جائے۔

ہدایت واِصلاح کے دو سلسلے، کتابُ اللہ اور رِجالُ اللہ

اب اس سلسلے کی دو باتیں اور قابلِ نظر ہیں:-

اوّل یہ کہ اللہ جل شانہ نے اِبتدائے آفرینش سے اِنسانوں کی ہدایت واِصلاح کے لئے ہمیشہ ہر زمانے میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک دو سلسلے جاری رکھے ہیں، ایک آسمانی کتابوں کا، دُوسرے اس کی تعلیم دینے والے رسولوں کا۔ جس طرح محض کتاب نازل فرمادینے کو کافی نہیں سمجھا، اسی طرح محض رسولوں کے بھیجنے پر بھی اِکتفا نہیں فرمایا، بلکہ دونوں سلسلے برابر جاری رکھے، اللہ جل شانہٗ کی اس عادت اور قرآنِ کریم کی شہادت نے قوموں کی صلاح وفلاح کے لئے ان دونوں سلسلوں کو یکساں طور پر جاری فرماکر ایک بڑے علم کا دروازہ کھول دیا کہ اِنسان کی صحیح تعلیم وتربیت کے لئے نہ صرف کتاب کافی ہے، نہ کوئی مربی انسان، بلکہ ایک طرف آسمانی ہدایات اور اِلٰہی قانون کی ضرورت ہے جس کا نام کتاب یا قرآن ہے، دُوسری طرف ایک معلم اور مربی اِنسان کی ضرورت ہے جو اپنی تعلیم وتربیت سے عام اِنسان کو آسمانی ہدایات سے رُوشناس کرکے ان کا خوگر بنائے، کیونکہ اِنسان کا اصلی معلم اِنسان ہی ہوسکتا ہے، کتاب معلم یا مربی نہیں ہوسکتی، ہاں

تعلیم وتربیت میں معین ومددگار ضرور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح اسلام کی ابتدا ایک کتاب اور ایک رسول سے ہوئی، اور ان دونوں کے امتزاج نے ایک صحیح اور اعلیٰ مثالی معاشرہ دُنیا میں پیدا کر دیا، اسی طرح آگے آنے والی نسلوں کے لئے بھی ایک طرف شریعتِ مطہرہ اور دُوسری طرف رِجال اللہ کا سلسلہ رہا، قرآنِ کریم نے جگہ جگہ اس کی ہدایتیں دی ہیں، ایک جگہ اِرشاد ہوا:-

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ (التوبہ)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہو۔''

دُوسری جگہ ''صادقین'' کی تعریف اور اوصاف بیان کر کے فرمایا:-

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ (البقرۃ)

''اور یہی لوگ سچے ہیں، اور یہی ہیں پرہیزگار۔''

پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے، اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ صراطِ مستقیم کی ہدایت ہے، یہاں بھی صراطِ مستقیم کا پتہ دینے کے لئے بجائے اس کے کہ صراط القرآن یا صراط الرسول یا صراط السنۃ فرمایا جاتا، کچھ اللہ والے لوگوں کا پتہ دیا گیا کہ اُن سے صراطِ مستقیم حاصل کی جائے، اِرشاد ہوا:-

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ڏ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّاۗلِّیْنَ ﴿۷﴾

''یعنی صراطِ مستقیم اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا اِنعام ہوا ہے نہ کہ اُن لوگوں کا جو گمراہ ہوگئے۔''

دُوسری جگہ ان کی مزید تعیین اور توضیح قرآن میں وارِد ہوئی جن پر اللہ تعالیٰ کا اِنعام ہے: فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِیْنَ (النساء:۶۹)[۱]۔ اسی طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد کے لئے کچھ حضرات کے نام متعین کر کے دِینی معاملات میں آپ کا اتباع کرنے کی ہدایت فرمائی، ترمذی کی صحیح حدیث میں ہے:-

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ مَا اِنْ اَخَذْتُمْ بِہٖ لَنْ تَضِلُّوْا کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ۔ (ترمذی)[۲]

''اے لوگو! میں تمہارے لئے اپنے بعد میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں، ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے

[۱] ترجمہ:- تو وہ اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اِنعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

[۲] ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب اھل البیت ج:۲ ص:۲۱۹

رہنا، تو تم گمراہ نہ ہوگے، ایک کتابُ اللہ دُوسری میری اولاد اور اہلِ بیت۔''

اور جامع الترمذی کی حدیث میں ہے:-

اِقْتَدُوْا بِالَّذَیْنِ مِنْ بَعْدِیْ اَبِیْ بَکْرٍ وَّعُمَرَ۔ [1]

''یعنی میرے بعد ابوبکر اور عمر کا اِتباع کرو۔''

اور ایک حدیث میں اِرشاد فرمایا:-

عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ۔ [2]

''میرے طریقے کو اِختیار کرو، اور خلفائے راشدین کے طریقے کو۔''

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی ان ہدایات اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ قوموں کی اِصلاح وتربیت کے لئے ہر قرن، ہر زمانے میں دو چیزیں ضروری ہیں، قرآنی ہدایات اور ان کے سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے کا سلیقہ حاصل کرنے کے لئے ماہرینِ شریعت اور اللہ والوں کی تعلیم وتربیت، اور اگر مختلف علوم وفنون اور اُن کے سیکھنے سکھانے کے طریقوں پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اُصولِ تعلیم وتربیت کچھ دِین اور دِینیات ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام علوم وفنون کی صحیح تحصیل اسی پر دائر ہے کہ ایک طرف ہر فن کی بہترین کتابیں ہوں تو دُوسری طرف ماہرین کی تعلیم وتربیت، ہر علم وفن کی ترقی وتکمیل کے یہی دو بازو ہیں، لیکن دِین اور دِینیات میں ان دونوں بازوؤں سے فائدہ اُٹھانے میں بہت سے لوگ اِفراط وتفریط کی غلط رَوِش میں پڑ جاتے ہیں، جس کا نتیجہ بجائے فائدہ اُٹھانے کے نقصان، اور بجائے اِصلاح کے فساد ہوتا ہے۔

بعض لوگ کتابُ اللہ کو نظر انداز کر کے صرف علماء ومشائخ ہی کو قبلۂ مقصود بنالیتے ہیں، اور ان کے متبعِ شریعت ہونے کی تحقیق نہیں کرتے، اور یہ اصلی مرض یہود ونصاریٰ کا ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ:۳۱) یعنی ''ان لوگوں نے اپنے علماء ومشائخ کو اللہ کے سوا اپنا معبود اور قبلۂ مقصود بنالیا'' ظاہر ہے کہ یہ راستہ شرک وکفر کا ہے، اور لاکھوں اِنسان اس راستے میں برباد ہوئے، اور ہورہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں بعض وہ لوگ بھی ہیں جو علومِ قرآن وحدیث کے حاصل کرنے میں کسی معلم ومربی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف اللہ کی کتاب کافی ہے، نہ ماہر علماء کی ضرورت، نہ تربیت یافتہ مشائخ کی حاجت، یہ دُوسری گمراہی ہے، جس کا نتیجہ دِین وملت سے نکل کر نفسانی اَغراض کا شکار ہونا ہے، کیونکہ ماہرین کی اِمداد واِعانت کے بغیر کسی فن کا صحیح حاصل ہوجانا اِنسانی فطرت

[1] مشکوٰۃ، باب مناقب ابی بکر وعمر رضی اللہ عنہما ج:۲ ص:۵۶۰

[2] مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسُّنَّۃ ج:۱ ص:۳۰

کے خلاف ہے، ایسا کرنے والا یقیناً غلط فہمیوں کا شکار ہوتا ہے، اور یہ غلط فہمی بعض اوقات اس کو دِین وملت سے بالکل نکال دیتی ہے۔

اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ان دو چیزوں کو اپنے اپنے مقامات اور حدود میں رکھ کر ان سے فائدہ اُٹھایا جائے، یہ سمجھا جائے کہ حکمِ اصلی صرف ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ہے، اور اِطاعت اصل میں اسی کی ہے، رسول بھی اس پر عمل کرنے اور کرانے کا ایک ذریعہ ہے، رسول کی اِطاعت بھی محض اسی نظر سے کی جاتی ہے کہ وہ بعینہٖ اللہ جل شانہٗ کی اِطاعت ہے، ہاں اس کے ساتھ قرآن وحدیث کے سمجھنے میں اور ان کے اَحکام پر عمل کرنے میں جو علمی یا عملی مشکلات سامنے آئیں اس کے لئے ماہرین کے قول وفعل سے اِمداد لینے کو سرمایۂ سعادت ونجات سمجھنا ضروری ہے۔ آیتِ مذکورہ میں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں تعلیمِ کتاب کو داخل فرمانے سے ایک دُوسرا فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ جب قرآن فہمی کے لئے تعلیمِ رسول ضروری ہے اور اس کے بغیر قرآن پر صحیح عمل ناممکن ہے تو جس طرح قرآن قیامت تک محفوظ ہے اس کا ایک ایک زیروزبر محفوظ ہے، ضروری ہے کہ تعلیماتِ رسول بھی مجموعی حیثیت سے قیامت تک باقی اور محفوظ رہیں، ورنہ محض الفاظِ قرآن کے محفوظ رہنے سے نزولِ قرآن کا اصلی مقصد پورا نہ ہوگا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ تعلیماتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہی ہیں جن کو سنت یا حدیثِ رسول کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا وعدہ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے اگرچہ اس درجہ میں نہیں ہے جس درجہ کی حفاظت قرآن کے لئے موعود ہے:-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر)

''ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

جس کا یہ نتیجہ ہے کہ اس کے الفاظ اور زیرزبر تک بالکل محفوظ چلے آئے ہیں، اور قیامت تک اسی طرح محفوظ رہیں گے، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ اگرچہ اس طرح محفوظ نہیں لیکن مجموعی حیثیت سے آپ کی تعلیمات کا محفوظ رہنا آیتِ مذکورہ کی رُو سے لازمی ہے، اور بحمد اللہ آج تک وہ محفوظ چلی آتی ہیں، جب کسی طرف سے اس میں رخنہ اندازی یا غلط روایات کی آمیزش کی گئی، ماہرینِ سنت نے دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی الگ نکھار کر رکھ دیا، اور قیامت تک یہ سلسلہ بھی اسی طرح رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت میں قیامت تک ایسی جماعتِ اہلِ حق اور اہلِ علم قائم رہے گی جو قرآن وحدیث کو صحیح طور پر محفوظ رکھے گی، اور اُن میں ڈالے گئے ہر رخنے کی اِصلاح کرتی رہے گی۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ جب قرآن پر عمل کرنے کے لئے تعلیمِ رسول ضروری ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن پر عمل قیامت تک فرض ہے، تو لازم ہے کہ قیامت تک تعلیماتِ رسول بھی باقی اور محفوظ رہیں، اس لئے آیت میں تعلیماتِ

[1] صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب قوله صلی الله علیه وسلم لا تزال طائفة ...إلخ ج:۲ ص:۱۴۳، ۱۴۴

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامت تک باقی اور محفوظ رہنے کی بھی پیشین گوئی موجود ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک علم حدیث کے ماہر علماء اور مستند کتابوں کے ذریعے محفوظ رکھا ہے۔ اس سے اس دجل و الحاد کی حقیقت کھل جاتی ہے جو آج کل بعض لوگوں نے اَحکامِ اِسلام سے جان بچانے کے لئے یہ بہانہ تراشا ہے کہ موجودہ ذخیرۂ حدیث محفوظ اور قابلِ اِطمینان نہیں ہے، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ذخیرۂ حدیث سے اِعتماد اُٹھ جائے تو قرآن پر بھی اِعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔

آیتِ مذکورہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا فرضِ منصبی تزکیہ قرار دِیا ہے، تزکیہ کے معنی باطنی نجاسات اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے، یعنی شرک و کفر اور عقائدِ فاسدہ سے، نیز برے اخلاق، تکبر، حرص و طمع، بغض و حسد، حبِ مال وجاہ وغیرہ سے پاک کرنا۔

اِصلاحِ انسان کے لئے صرف تعلیمِ صحیح بھی کافی نہیں، اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے

تزکیہ کو تعلیم سے جدا کر کے مستقل مقصدِ رِسالت اور رسول کا فرضِ منصبی قرار دینے میں اس طرف اِشارہ ہے کہ تعلیم کتنی ہی صحیح ہو محض تعلیم سے عادۃً اِصلاحِ اخلاق نہیں ہوتی جب تک کسی تربیت یافتہ مربی کے زیرِ نظر عملی تربیت حاصل نہ کرے، کیونکہ تعلیم کا کام درحقیقت سیدھا اور صحیح راستہ دِکھلا دینا ہے، مگر ظاہر ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے محض راستہ جان لینا تو کافی نہیں، جب تک ہمت کر کے قدم نہ اُٹھائے اور راستہ نہ چلے، اور ہمت کا نسخہ بجز اہلِ ہمت کی صحبت اور اِطاعت کے اور کچھ نہیں، ورنہ سب کچھ جاننے سمجھنے کے بعد بھی حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

عمل کی ہمت و توفیق کسی کتاب کے پڑھنے یا سمجھنے سے پیدا نہیں ہوتی، اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اور ان سے ہمت کی تربیت حاصل کرنا، اسی کا نام تزکیہ ہے، قرآنِ کریم نے تزکیہ کو مقاصدِ رِسالت میں ایک مستقل مقصد قرار دے کر تعلیماتِ اِسلام کی نمایاں خصوصیت کو بتلایا ہے، کیونکہ محض تعلیم اور ظاہری تہذیب تو ہر قوم اور ہر ملت میں کسی نہ کسی صورت سے کامل یا ناقص طریق پر ضروری سمجھی جاتی ہے، ہر مذہب و ملت اور ہر سوسائٹی میں اس کو اِنسانی ضروریات میں داخل سمجھا جاتا ہے، اس میں اِسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے صحیح اور مکمل تعلیم پیش کی جو اِنسان کی اِنفرادی زندگی سے لے کر عائلی، پھر قبائلی زندگی اور اس سے آگے بڑھ کر سیاسی و ملکی زندگی پر حاوی اور بہترین نظام کی حامل ہے، جس کی نظیر دُوسری اقوام و ملل میں نہیں پائی جاتی، اس کے ساتھ تزکیۂ اخلاق اور باطنی طہارت ایک ایسا

کام ہے جس کو عام اقوام اور سوسائٹیوں نے سرے سے نظر انداز کر رکھا ہے، اِنسانی لیاقت و اِستعداد کا معیار اس کی تعلیمی ڈگریاں سمجھی جاتی ہیں، انہی ڈگریوں کے وزن کے ساتھ اِنسانوں کا وَزن گھٹتا بڑھتا ہے، اِسلام نے تعلیم کے ساتھ تزکیہ کا ضمیمہ لگا کر تعلیم کے اصل مقصد کو پورا کر دِکھایا۔

جو خوش نصیب حضرات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زیرِ تعلیم رہے، تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کا باطنی تزکیہ بھی ہوتا گیا، اور جو جماعتِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین آپ کی زیرِ تربیت تیار ہوئی، ایک طرف اُن کی عقل و دانش اور علم و حکمت کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ ساری دُنیا کے فلسفے اس کے سامنے گرد ہوگئے، تو دُوسری طرف ان کے تزکیۂ باطنی اور تعلق مع اللہ اور اِعتماد علی اللہ کا یہ درجہ تھا جو خود قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:-

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (الفتح:۲۹)

''اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحم دِل ہیں، تم انہیں رُکوع سجدہ کرتے ہوئے دیکھوگے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی تلاش کرتے ہیں۔''

یہی وجہ تھی کہ وہ جس طرف چلتے تھے فتح و نصرت اُن کے قدم لیتی تھی، تائیدِ ربانی ان کے ساتھ ہوتی تھی، اُن کے محیر العقول کارنامے جو آج بھی ہر قوم و ملت کے ذہنوں کو مرعوب کئے ہوئے ہیں، وہ اسی تعلیم و تزکیہ کے اعلیٰ نتائج ہیں۔

آج دُنیا میں تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تبدیل و ترمیم پر تو سب لوگ غور کرتے ہیں، لیکن تعلیم کی رُوح کو دُرست کرنے کی طرف عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی کہ مدرّس اور معلم کی اخلاقی حالت اور مصلحانہ تربیت کو دیکھا جائے، اس پر زور دیا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہزار کوششوں کے بعد بھی ایسے مکمل اِنسان پیدا نہیں ہوتے جن کے عمدہ اخلاق دُوسروں پر اَثر انداز ہوں، اور دُوسروں کی تربیت کرسکیں۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اساتذہ جس علم و عمل اور اخلاق و کردار کے مالک ہوں گے ان سے پڑھنے والے طلبہ زیادہ سے زیادہ انہی جیسے پیدا ہوسکیں گے، اس لئے تعلیم کو مفید اور بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تدوین و ترمیم سے زیادہ اس نصاب کے پڑھانے والوں کی علمی و عملی و اخلاقی حالات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

یہاں تک رِسالت و نبوّت کے تین مقاصد کا بیان تھا، آخر میں مختصر طور پر یہ بھی سن لیجئے کہ سردارِ دوعالم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تین فرائضِ منصبی سپرد کئے گئے تھے، ان کو آپ نے کس حد تک پورا فرمایا، آپ کو ان کے پورا کرنے میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دُنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے پہلے تلاوتِ آیات کا یہ درجہ ہوگیا تھا کہ تقریباً پورے جزیرۃ العرب میں قرآن پڑھا جارہا تھا،

ہزاروں اس کے حافظ تھے، سینکڑوں ایسے حضرات تھے جو روزانہ یا تیسرے روز پورا قرآن ختم کرتے تھے، تعلیمِ کتاب وحکمت کا یہ مقام تھا ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست

کتب خانۂ چند ملت بشست [۱]

دُنیا کے سارے فلسفے قرآن کے سامنے ماند ہو چکے تھے، توراۃ و اِنجیل کے تحریف شدہ صحائف افسانہ بن چکے تھے، قرآنی اُصول کو عزّت وشرف کا معیار مانا جاتا تھا، تزکیہ کا یہ عالم تھا کہ ساری بداَخلاقیوں کے مرتکب افراد تہذیبِ اخلاق کے معلم بن گئے، بداَخلاقیوں کے مریض نہ صرف صحت یاب بلکہ کامیاب معالج اور مسیحا بن گئے، جو رہزن تھے رہبر بن گئے، غرض بت پرست لوگ اِیثار و ہمدردی کے مجسّمے بن گئے، تندخوئی اور جنگ جوئی کی جگہ نرمی اور صلح جوئی نظر آنے لگی، چور اور ڈاکو، لوگوں کے اموال کے محافظ بن گئے۔

الغرض حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جن مقاصد کے لئے دُعا فرمائی، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا تھا، وہ تینوں مقصد آپ کے عہدِ مبارک ہی میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئے، پھر آپ کے بعد آپ کے صحابہ کرامؓ نے تو ان کو مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک ساری دُنیا میں عام کر دیا، فَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا بِعَدَدِ مَنْ صَلّٰى وَصَامَ وَقَعَدَ وَقَامَ۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ

اور کون ہے جو پھرے اِبراہیم کے مذہب سے مگر وہی جس نے احمق بنایا اپنے آپ کو اور بے شک ہم نے ان کو منتخب کیا

فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ

دُنیا میں اور وہ آخرت میں نیکوں میں ہیں۔ یاد کرو جب اس کو کہا اس کے رَبّ نے کہ حکم برداری کر!

قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ

تو بولا کہ میں حکم بردار ہوں تمام عالم کے پروردگار کا۔ اور یہی وصیت کر گیا اِبراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب بھی

[۱] ترجمہ: - ایسا یتیم کہ جس نے کسی مدرسے میں رہ کر قرآن بھی نہیں پڑھا، اس نے کتنے نبیوں کے کتب خانے دھوڈالے۔

يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

کہ اے بیٹو! بے شک اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو دِین، سو تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور کون ہے جو اِبراہیم کے طریقے سے اِنحراف کرے؟ سوائے اُس شخص کے جو خود اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کر چکا ہو! حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے دُنیا میں اُنہیں (اپنے لئے) چن لیا تھا، اور آخرت میں اُن کا شمار صالحین میں ہوگا ﴿۱۳۰﴾ جب ان کے پروردگار نے ان سے کہا کہ: ''سرِتسلیم خم کردو!'' تو وہ (فوراً) بولے: ''میں نے رَبّ العالمین کے (ہرحکم کے) آگے سر جھکا دیا۔'' ﴿۱۳۱﴾ اور اسی بات کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی، اور یعقوب نے بھی (اپنے بیٹوں کو) کہ: ''اے میرے بیٹو! اللہ نے یہ دِین تمہارے لئے منتخب فرمالیا ہے، لہٰذا تمہیں موت بھی آئے تو اس حالت میں آئے کہ تم مسلم ہو۔'' ﴿۱۳۲﴾

حلِ لغات

سَفِهَ نَفْسَهٗ ، سَفِهَ بمعنى جهل، وانتصاب نفسه على أنه تمييز على قول الفرّاء أو شبّه بالمفعول على قول بعض الكوفيين أو مفعول به إما لكون سفه متعديًا بنفسه كسَفَّه المضعف أو لكونه ضمن معنى ما يتعدى أى جهل وهو قول الزجاج۔ ترجمہ شیخ الہندؒ اسی پر مبنی ہے، اس لئے سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنی پہلی توجیہ کے اِعتبار سے وہ ہیں جو خلاصۂ تفسیر میں لئے گئے کہ اپنی ذات ہی سے احمق ہو، اور دُوسری توجیہ پر معنی یہ ہوں گے کہ ملتِ اِبراہیمی سے رُوگردانی وہی کرے گا جو اپنے نفس سے بھی جاہل ہو، یعنی اس کو خود اپنی ذات کی بھی خبر نہ ہو کہ میں کیا ہوں۔

خلاصۂ تفسیر

اور ملتِ اِبراہیمی سے تو وہی رُوگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو، اور (ایسی ملت کے تارک کو کیونکر احمق نہ کہا جائے جس کی یہ شان ہو کہ اسی کی بدولت) ہم نے ان (اِبراہیم علیہ السلام) کو (عہدۂ رِسالت کے لئے) دُنیا میں منتخب کیا اور (اسی کی بدولت) وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں (جن کے لئے سب ہی کچھ ہے، اور یہ اِنتخاب عہدۂ رِسالت کے لئے اس وقت ہوا تھا) جبکہ ان سے ان کے پروردگار نے (بطور اِلہام کے) فرمایا کہ تم

(حق تعالیٰ کی) اِطاعت اِختیار کرو، انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اِطاعت اِختیار کی رَبّ العالمین کی (پس اسی اِطاعت کے اِختیار کرنے پر ہم نے اُن کو شرفِ نبوّت دے دیا، خواہ اسی وقت ہو یا بعد چندے) اور اسی (ملتِ موصوفہ پر قائم رہنے) کا حکم کر گئے ہیں اِبراہیم علیہ السلام اپنے بیٹوں کو اور (اسی طرح) یعقوب علیہ السلام بھی (اپنے بیٹوں کو، جس کا مضمون یہ تھا کہ) میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دِین (اِسلام و اِطاعتِ حق) کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے، سوتم (دَمِ مرگ تک اسی کو مت چھوڑنا اور) بجز اِسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں ملتِ اِبراہیمی کے بنیادی اُصول اور ان کے اِتباع کی تاکید اور ان سے اِنحراف کی خرابی کا بیان ہے، جس میں یہود و نصاریٰ کے اِتباعِ ملتِ اِبراہیمی کے متعلق دعووں کی تردید اور صرف ملتِ اِسلام کا ملتِ اِبراہیمی ہونا اور دِینِ اِسلام کی حقیقت اور یہ کہ وہ تمام انبیاء کا مشترکہ دِین ہے، ذِکر کیا گیا ہے۔

مذکورہ آیات میں انبیاء علیہم السلام کا اپنی اولاد کی دِینی اور رُوحانی تربیت کی طرف خاص توجہ اور اہتمام کرنا مذکور ہے، پہلی آیت میں ملتِ اِبراہیمی کی فضیلت اور اسی کی وجہ سے حضرت اِبراہیم علیہ السلام کا دُنیا و آخرت میں شرف اور بزرگی بتلا کر ان کی ملت سے اِنحراف کرنے کو اَحمقانہ کام بتلایا گیا ہے، اِرشاد ہے: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ یعنی ''ملتِ اِبراہیمی سے رُوگردانی صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس میں ذرا عقل نہ ہو'' کیونکہ یہ ملت عین دِینِ فطرت ہے، کوئی سلیم الفطرت اِنسان اس سے اِنکار نہیں کر سکتا۔ آگے اس کی وجہ سے بیان فرمائی کہ اس ملت کا شرف اور فضیلت اس سے ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے اسی ملت کی وجہ سے حضرت اِبراہیم علیہ السلام کو دُنیا میں عزّت و بزرگی عطا فرمائی اور آخرت میں بھی، دُنیا کی عزّت و بزرگی کا مشاہدہ تو ساری دُنیا نے کر لیا کہ نمرود جیسا صاحبِ اِقتدار بادشاہ اور اس کی قوم اس اکیلے بزرگ کے خلاف کھڑی ہوئی، اور اپنے اِقتدار کے سارے عوامل ان کے خلاف اِستعمال کر لئے، آخر میں آگ کے ایک بڑے انبار میں اُن کو ڈال دیا گیا، مگر دُنیا کے سارے عناصر اور ان کی طاقتیں جس قدرت والے کے تابعِ فرمان ہیں، اس نے سارے نمرودی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا، آگ ہی کو اپنے خلیل کے لئے گلزار بنا دیا، اور دُنیا کی ساری قومیں ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہوگئیں۔ دُنیا کے سارے مؤمن اور کافر یہاں تک کہ بت پرست بھی اس بت شکن کی عزّت کرتے چلے آئے، مشرکینِ عرب بہرحال اولادِ اِبراہیم تھے، بت پرستی کے باوجود حضرت اِبراہیم علیہ السلام کی عزّت و عظمت پر جان دیتے تھے، اور انہی کی ملت کے اِتباع کا دعویٰ کرتے تھے، اور ملتِ اِبراہیمی کے مٹے مٹے کچھ آثار ان کے عمل میں بھی موجود تھے، حج و عمرہ و قربانی، مہمان نوازی انہی کے باقیاتِ صالحات تھے، اگرچہ جہالت نے اُن کو بھی مسخ کر دیا تھا، اور یہ نتیجہ اس

خداوندی اِنعام کا ہے جس کی رُو سے خلیل اللہ کو اِمام الناس کا خطاب دیا گیا تھا: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا [1] (البقرۃ: ۱۲۴)

اِبراہیم اور ملتِ اِبراہیم علیہ السلام کے اس قہری غلبہ کے علاوہ اس کی مقبولیت اور فطرتِ اِنسانی کے عین مطابق ہونا بھی دُنیا کے سامنے آچکا تھا، اور جس میں کچھ بھی عقل وفہم تھی وہ اس ملت کے سامنے جھک گیا تھا۔

یہ تو اِبراہیم علیہ السلام کے دُنیاوی شرف و بزرگی کا ذِکر تھا، آخرت کا معاملہ جو اَبھی سامنے نہیں، اس میں حضرت اِبراہیم علیہ السلام کا مقام قرآن کی اس آیت نے واضح کردیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو دُنیا میں عزّت وفضیلت عطا فرمائی اسی طرح آخرت میں بھی ان کے درجاتِ عالیہ مقرّر ہیں۔

ملتِ اِبراہیمی کا بنیادی اُصول اِسلام، یعنی اِطاعتِ حق ہے وہ صرف اِسلام میں منحصر ہے

اس کے بعد دُوسری آیت میں ملتِ اِبراہیمی کے بنیادی اُصول بتلائے گئے، اِرشاد ہوا: اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ یعنی ''جب فرمایا اِبراہیم سے اُن کے رَبّ نے کہ اِطاعت اِختیار کرو، تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اِطاعت اِختیار کی رَبّ العالمین کی۔'' اِس طرزِ بیان میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے خطاب اَسْلِمْ ۙ کا جواب بظاہر خطاب ہی کے انداز میں یہ ہونا چاہیے کہ ''اَسْلَمْتُ لَكَ''، یعنی میں نے آپ کی اِطاعت اِختیار کرلی، مگر حضرت خلیل علیہ السلام نے اس طرزِ خطاب کو چھوڑ کر یوں عرض کیا کہ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ یعنی میں نے پروردگارِ عالم کی اِطاعت اِختیار کرلی، ایک تو اس میں رعایتِ ادب کے ساتھ اور حق جل وعلا شانہٗ کی حمد وثنا شامل ہوگئی جس کا مقام تھا، دُوسرے اس کا اِظہار ہوگیا کہ میں نے جو طاعت اِختیار کی وہ کسی پر اِحسان نہیں کیا، بلکہ میرے لئے اس کا کرنا ہی ناگزیر تھا، کیونکہ وہ رَبّ العالمین یعنی سارے جہان کا پروردگار ہے، سارے جہان اور جہان والوں کو اس کی اِطاعت کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں، جس نے اِطاعت اِختیار کی اس نے اپنا فرض ادا کرکے اپنا نفع حاصل کیا، اس میں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ملتِ اِبراہیمی کا بنیادی اُصول اور پوری حقیقت ایک لفظ ''اِسلام'' میں مضمر ہے، جس کے معنی ہیں اِطاعتِ حق، اور یہی خلاصہ ہے اِبراہیم علیہ السلام کے مذہب ومسلک کا، اور یہی حاصل ہے ان اِمتحانات کا جن سے گزر کر اللہ تعالیٰ کا یہ خلیل اپنے مقامِ عالی تک پہنچا ہے، اور اِسلام یعنی اِطاعتِ حق ہی وہ چیز ہے جس کے لئے یہ سارا جہان بنایا گیا، اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، آسمانی کتابیں نازل کی گئیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اِسلام ہی تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترک دِین اور نقطۂ وحدت ہے، حضرت آدم

---

[1] ترجمہ:- میں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔

سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر آنے والے رسول اور نبی نے اسی کی طرف دعوت دی، اسی پر اپنی اپنی اُمت کو چلایا، قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں فرمایا:-

۱- اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:۱۹)

''دِین تو اللہ کے نزدیک اِسلام ہی ہے''

۲- وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران:۸۵)

''اور جو شخص اِسلام کے سوا کوئی دُوسرا دِین و مذہب اِختیار کرے وہ مقبول نہیں۔''

اور ظاہر ہے کہ جتنے دِین و مذہب مختلف انبیاء علیہم السلام لائے ہیں وہ سب اپنے اپنے وقت میں اللہ کے نزدیک مقبول تھے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ سب دِین دِینِ اِسلام ہی ہوں، اگرچہ نام ان کا کچھ بھی رکھ دیا جائے، دِینِ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کہا جائے یا یہودیت ونصرانیت وغیرہ، مگر حقیقت سب کی اِسلام ہے، جس کا حاصل اِطاعتِ حق ہے، البتہ اس میں ایک خصوصیت ملتِ اِبراہیمی کو حاصل ہے، کہ حضرت اِبراہیم علیہ السلام نے اپنی ملت کا نام بھی اِسلام تجویز کیا، اور اپنی اُمت کو بھی اُمتِ مسلمہ کا نام دیا، دُعا میں عرض کیا:-

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ (البقرة:۱۲۸)

''اے ہمارے پروردگار! بنادیجئے ہم دونوں (اِبراہیم واسماعیل) کو مسلم (یعنی اپنا فرمانبردار) اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو اپنا فرمانبردار بنا۔''

اولاد کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:-

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ (البقرة) ''تم بجز مسلم ہونے کے کسی مذہب پر جان نہ دینا''

حضرت اِبراہیم علیہ السلام کے بعد یہ خصوصی اِمتیاز حضرت اِبراہیم ہی کی تجویز کے مطابق اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰة والسلام) کو حاصل ہوا، کہ اس کا نام اُمتِ مسلمہ رکھا گیا، اور اس کی ملت بھی ملتِ اِسلامیہ کے نام سے معروف ہوئی، قرآنِ کریم کا اِرشاد ہے:-

مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا (الحج:۷۸)

''تم اپنے باپ اِبراہیم کے دِین پر قائم رہو، اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے، پہلے بھی اور اس میں بھی (یعنی قرآن میں)۔''

کہنے کو تو یہود بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم ملتِ اِبراہیم پر ہیں، نصاریٰ بھی اور مشرکینِ عرب بھی لیکن یہ سب غلط فہمی یا جھوٹے دعوے تھے، حقیقت میں ملتِ محمدیہ ہی آخری دور میں ملتِ اِبراہیمی اور دِینِ فطرت کے مطابق تھی۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے اور جتنی کتابیں اور شرائع نازل ہوئے ان سب کی رُوح اِسلام یعنی اِطاعتِ حق ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کے مقابلہ میں فرمانِ حق کی اِطاعت اور اِتباعِ ہویٰ کو چھوڑ کر اِتباعِ ہدیٰ کی پابندی۔

افسوس ہے کہ آج اِسلام کا نام لینے والے لاکھوں مسلمان بھی اس حقیقت سے بیگانہ ہوگئے اور دِین ومذہب کے نام پر بھی اپنی خواہشات کا اِتباع کرنا چاہتے ہیں، انہیں قرآن وحدیث کی صرف وہ تفسیر وتعبیر بھلی معلوم ہوتی ہے جو اُن کی خواہش کے مطابق ہو، ورنہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ جامۂ شریعت کو کھینچ تان کر بلکہ چیر پھاڑ کر اپنی اَغراض اور اَہواءِ نفسانی کے بتوں کا لباس بنادیں کہ دیکھنے میں دِین ومذہب کا اِتباع نظر آئے، اگرچہ وہ حقیقت میں خالص اِتباعِ ہویٰ اور خواہشات کی پیروی ہے ؎

سودہ شد از سجدۂ راہِ بتاں پیشانیم
چند برخود تہمتِ دینِ مسلمانی نہم [۱]

غافل اِنسان یہ نہیں جانتا کہ یہ حیلے اور تأویلیں مخلوق کے سامنے تو چل سکتی ہیں، مگر خالق کے سامنے جس کا علم ذرّے ذرّے کو محیط ہے، جو دِلوں کے چھپے ہوئے اِرادوں، بھیدوں کو دیکھتا اور جانتا ہے، اس کے آگے بجز خالص اِطاعت کے کوئی چیز کارگر نہیں ؎

کارہا باخلق آری جملہ راست
باخدا تزویر وحیلہ کے رواست [۲]

حقیقی اِسلام یہ ہے کہ اپنی اَغراض اور خواہشات سے بالکل خالی الذہن ہوکر اِنسان کو اس کی تلاش ہو کہ حضرتِ حق جل شانہٗ کی رضا کس کام میں ہے، اور اس کا فرمان میرے لئے کیا ہے، وہ ایک فرمانبردار غلام کی طرح گوش برآواز رہے کہ کس طرف جانے کا اور کس کام کا حکم ہوتا ہے، اور اس کام کو کس انداز سے کیا جائے، جس سے وہ مقبول ہو اور میرا مالک راضی ہو، اسی کا نام عبادت وبندگی ہے ؎

در راہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسے ست
ہشدار وگوش را بہ پیامِ سروش دار [۳]

اسی جذبۂ اِطاعت ومحبت کا کمال اِنسان کی ترقی کا آخری مقام ہے، جس کو مقامِ عبدیت کہا جاتا ہے، یہی وہ مقام

[۱] ترجمہ:- بتوں کے سامنے سجدہ کرکر کے میری پیشانی پر نشان پڑ گئے ہیں، آخر کب تک میں دِینِ اِسلام کی تہمت اپنے اُوپر لگائے رکھوں گا۔

[۲] ترجمہ:- مخلوق کے ساتھ تو جو کچھ بھی کیا جائے چل جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ دھوکا وفریب کہاں چل سکتا ہے۔

[۳] ترجمہ:- عشق کے راستے میں باطل کے وسوسے بہت ہیں، خبردار! وحی کے پیغام کی طرف کان لگائے رکھو۔

ہے جہاں پہنچ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کا خطاب پاتے ہیں، اور سیّد الرسل خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو عَبۡدَنَا کا خطاب ملتا ہے، اسی عبدیت اور اطاعت کے ذیلی درجات پر اُمت کے اولیاء، اقطاب وابدال کے درجات دائر ہوتے ہیں، اور یہی حقیقی توحید ہے جس کے حاصل ہونے پر انسان کے خوف واُمید صرف ایک اللہ جل شانہٗ کے ساتھ وابستہ ہوجاتے ہیں۔

اُمید وہراسش نباشد زکس
ہمیں ست بنیادِ توحید وبس [1]

غرض اسلام کے معنی اور حقیقت اطاعتِ حق ہے، اور اس کا راستہ صرف اتباعِ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں منحصر ہے، جس کو قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں اس طرح ارشاد فرمایا:-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوۡكَ فِيۡمَا شَجَرَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ لَا يَجِدُوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيۡتَ وَيُسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا ﴿۶۵﴾ (النساء)

"تیرے رَبّ کی قسم! وہ کبھی مؤمن نہ ہوں گے جب تک وہ آپ کو اپنے تمام اختلافی معاملات میں حَکَم تسلیم نہ کرلیں، اور پھر آپ کے فیصلے سے کوئی دِل تنگی محسوس نہ کریں، اور فیصلے کو ٹھنڈے دِل سے تسلیم نہ کریں۔"

مسئلہ:- آیتِ مذکورہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی، اور ان سے عہد لیا، وہ یہ تھا کہ اسلام کے سوا اور کسی حالت اور کسی ملت پر نہ مرنا، مراد اس کی یہ ہے کہ اپنی زندگی میں اسلام اور اسلامی تعلیمات پر پختگی سے عمل کرتے رہو تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارا خاتمہ بھی اسلام ہی پر فرمادے، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ تم اپنی زندگی میں جس حالت کے پابند رہوگے، اُسی حالت پر تمہاری موت بھی ہوگی، اور اسی حالت میں محشر میں قائم ہوگے، اللہ جل شانہٗ کی عادت یہی ہے کہ جو بندہ نیکی کا قصد کرتا ہے اور اس کے لئے اپنے مقدور کے مطابق کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کی توفیق دے دیتے ہیں، اور یہ کام اس کے لئے آسان کردیتے ہیں۔

اس معاملہ میں اُس حدیث سے شبہ نہ کیا جائے جس میں یہ ارشاد ہے کہ بعض آدمی جنت کے کام اور اہلِ جنت کے عمل ہمیشہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس شخص اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، مگر پھر اس کی تقدیر غالب آجاتی ہے، اور اہلِ دوزخ کے سے کام کرنے لگتا ہے، اور انجامِ کار دوزخ میں جاتا ہے، اسی طرح بعض آدمی

[1] ترجمہ:- انسان کو کسی سے اُمید وخوف نہ ہو، توحید کی بنیاد بس یہی ہے۔

دوزخ کے کام میں مشغول رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر تقدیر غالب آتی ہے اور آخر عمر میں اہلِ جنت کے کام کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔ [۱]

وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے بعض الفاظ میں یہ قید بھی لگی ہوئی ہے کہ "فِيْمَا يَبْدُوْ لِلنَّاسِ" [۲] یعنی جس نے عمر بھر جنت کے کام کئے اور آخر میں دوزخ کے کام میں لگا، درحقیقت اس کے پہلے کام بھی دوزخ ہی کے عمل تھے، مگر لوگوں کے ظاہر میں اور دیکھنے میں وہ اہلِ جنت کے عمل معلوم ہوتے تھے، اسی طرح جو دوزخ کے اعمال میں مشغول رہا آخر میں جنت کے کام کرنے لگا، درحقیقت وہ اوّل ہی سے جنت کے کام میں تھا، مگر ظاہر نظر میں لوگ اس کو گناہگار سمجھتے تھے۔ (ابنِ کثیر) [۳]

خلاصہ یہ ہے کہ جو آدمی نیک کام میں مشغول رہے اس کو اللہ تعالیٰ کے وعدے اور عادت کی بنا پر یہی اُمید رکھنا چاہئے کہ اس کا خاتمہ بھی نیکی پر ہوگا۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ

کیا تم موجود تھے جس وقت قریب آئی یعقوب کے موت جب کہا اپنے بیٹوں کو: تم کس کی عبادت کروگے

مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ

میرے بعد؟ بولے: ہم بندگی کریں گے تیرے رَبّ کی اور تیرے باپ دادوں کے رَبّ کی جو کہ ابراہیم اور اِسماعیل

وَاِسْحٰقَ اِلٰــهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۳ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا

اور اِسحاق ہیں، وہی ایک معبود ہے اور ہم سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔ وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی اُن کے واسطے ہے

مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔــلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۳۴

جو انہوں نے کیا، اور تمہارے واسطے ہے جو تم نے کیا، اور تم سے پوچھ نہیں اُن کے کاموں کی۔

---

۱ صحیح البخاری، کتاب القدر ج:۲ ص:۹۷۵، ۹۷۶، صحیح مسلم، کتاب القدر، باب کیفیة الخلق الآدمی ...إلخ ج:۲ ص:۳۳۲

۲ صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر ج:۲ ص:۶۰۴

۳ تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۴۴۶، ۴۴۷

آسان ترجمۂ قرآن

کیا اُس وقت تم خود موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا تھا، جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ اُن سب نے کہا تھا کہ ہم اُسی ایک خدا کی عبادت کریں گے جو آپ کا معبود ہے اور آپ کے باپ دادوں اِبراہیم، اِسماعیل اور اِسحاق کا معبود ہے۔ اور ہم صرف اُسی کے فرماں بردار ہیں ﴿۱۳۳﴾ وہ ایک اُمت تھی جو گذرگئی۔ جو کچھ اُنہوں نے کمایا وہ اُن کا ہے، اور جو کچھ تم نے کمایا وہ تمہارا ہے، اور تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا عمل کرتے تھے ﴿۱۳۴﴾

خلاصۂ تفسیر

کیا (تم لوگ کسی معتبر صحیح نقل سے دعویٰ مذکورہ کرتے ہو) یا تم خود (اس وقت) موجود تھے جس وقت یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا (اور) جس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے (تجدید معاہدہ کے لئے) پوچھا کہ تم لوگ میرے (مرنے کے) بعد کس چیز کی پرستش کروگے؟ انہوں نے (بالاتفاق) جواب دیا کہ ہم اس (ذاتِ پاک) کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ (حضرات) اِبراہیم واِسماعیل واِسحاق (علیہم السلام) پرستش کرتے آئے ہیں، یعنی وہی معبود جو وحدہٗ لاشریک ہے، اور ہم (اَحکام میں) اسی کی اِطاعت پر (قائم) رہیں گے، یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانے میں) گزر چکی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا، اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آئے گا، اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی (اور خالی تذکرہ بھی تو نہ ہوگا، اس سے تم کو نفع پہنچنا یہ تو بڑی دُور ہے)۔

معارف ومسائل

سابقہ آیات میں ملتِ اِبراہیم اور اِسلام کی حقیقت کا بیان تھا، اب آیاتِ مذکورہ میں ایک اور اُصولی بات قابلِ نظر ہے کہ ملتِ اِبراہیم کہئے یا اِسلام، یہ پوری قوم بلکہ ساری دُنیا کے لئے ہدایت نامہ ہے، پھر اس میں اولادِ اِبراہیم ویعقوب علیہم السلام کی کیا خصوصیت ہے کہ آیاتِ مذکورہ میں ان کو خاص خطاب فرمایا گیا، اور اللہ تعالیٰ کے ان دونوں برگزیدہ پیغمبروں نے اپنی اولاد کو بطورِ وصیت خاص اس کی ہدایت فرمائی۔

اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اولاد کی محبت اور ان کی بھلائی کی فکر مقامِ رِسالت ونبوّت بلکہ مقامِ خلت کے بھی منافی نہیں، اللہ تعالیٰ کا وہ خلیل جو ایک وقت اپنے رَبّ کا اِشارہ پاکر اپنے چہیتے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے کمربستہ نظر آتا

ہے، وہی دُوسرے وقت اپنی اولاد کی دِینی اور دُنیوی آسائش اور بھلائی کے لئے اپنے رَبّ سے دُعائیں بھی کرتا ہے، دُنیا سے رُخصت ہونے کے وقت اپنی اولاد کو وہ چیز دے کر جانا چاہتا ہے جو اس کی نظر میں سب سے بڑی نعمت ہے، یعنی اِسلام۔

آیتِ مذکورہ: وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ (البقرۃ:۱۳۲) کا یہی مطلب ہے، اور آیت: اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ (البقرۃ:۱۳۳) کا یہی حاصل ہے، فرق اتنا ہے کہ عام اِنسانوں کی نظروں میں نعمت و دولت دُنیا کی فانی اور ذلیل چیزیں ہیں، ان کی نظر اور حوصلہ بلند ہے، ان کے نزدیک اصلی دولت ایمان اور عملِ صالح یا اِسلام ہے۔

جس طرح عام اِنسان اپنی موت کے وقت یہ چاہتے ہیں کہ جو بڑی سے بڑی دولت ان کے پاس ہے وہ اولاد کو دے جائیں، ایک سرمایہ دار تاجر کی آج کل یہ خواہش ہوتی ہے کہ میری اولاد ملوں اور فیکٹریوں کی مالک ہو، ان کو اِمپورٹ اور ایکسپورٹ کے بڑے بڑے لائسنس ملیں، لاکھوں اور کروڑوں کا بینک بیلنس ہو، یا ایک سروس والا اِنسان یہ چاہتا ہے کہ میری اولاد کو اُونچے عہدے اور بڑی تنخواہیں ملیں، یا ایک صنعت پیشہ آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد اس کی صنعت میں کمال حاصل کرے، اس کو اس کے اپنی عمر بھر کے گر بتلا دے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین اولیاء کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جس چیز کو وہ اصلی اور دائمی لازوال دولت سمجھتے ہیں وہ ان کی اولاد کو پوری پوری مل جائے، اس کے لئے دُعائیں کرتے ہیں، اور کوششیں بھی، آخر وقت میں وصیت اسی کی کرتے ہیں جیسا کہ آیاتِ مذکورہ سے واضح ہے۔

اولاد کے لئے کوئی دولت دِین و اخلاق سکھانے کے برابر نہیں

انبیاء علیہم السلام کے اس طرزِ خاص میں عام اِنسانوں کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ وہ جس طرح ان کی دُنیوی پرورِش اور ان کے دُنیوی آرام و راحت کا اِنتظام کرتے ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ ان پر لازم ہے کہ اولاد کی نظری، عملی اور اَخلاقی تربیت کریں، برے راستوں اور برے اعمال و اخلاق سے ان کو بچانے میں سعیٔ بلیغ کریں، کہ اولاد کی سچی محبت اور اصلی خیر خواہی یہی ہے۔ یہ کوئی عقل کی بات نہیں کہ ایک اِنسان اپنے بچے کو دُھوپ کی گرمی سے بچانے کے لئے تو ساری توانائی خرچ کرے اور دائمی آگ سے اور عذاب سے بچانے کے لئے کوئی دھیان نہ دے، اس کے بدن سے پھانس نکالنے میں تو سارے ذرائع اور وسائل اِستعمال کرے، اور بندوق کی گولی کا نشانہ بننے سے اس کو نہ بچائے۔

انبیاء علیہم السلام کے اس طرزِ عمل سے ایک اُصولی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ والدین کا فرض اور اولاد کا حق ہے کہ سب سے پہلے ان کی صلاح و فلاح کی فکر کی جائے، ان کے بعد دُوسروں کی طرف توجہ کی جائے، جس میں دو حکمتیں ہیں:-

اوّل یہ کہ طبعی اور جسمی تعلق کی بنا پر وہ نصیحت کا اثر زیادہ جلد اور آسانی سے قبول کرسکیں گے، اور پھر وہ ان کی تحریک

اور اِصلاحی کوشش میں اُن کے دست و بازو بن کر اِشاعتِ حق میں اُن کے معین ہوں گے۔

دُوسرے اِشاعتِ حق کا اس سے زیادہ سہل اور مفید راستہ کوئی نہیں کہ ہر گھر کا ذمہ دار آدمی اپنے اہل و عیال کو حق بات سکھانے اور اس پر عمل کرانے کی سعی میں دِل و جان سے لگ جائے کہ اس طرح تبلیغ و تعلیم اور اِصلاح و تربیت کا دائرۂ عمل سمٹ کر صرف گھروں کے ذمہ داروں تک آجاتا ہے، ان کو سکھلانا پوری قوم کو سکھانے کے ہم معنی ہو جاتا ہے، قرآنِ کریم نے اسی تنظیمی اُصول کے پیشِ نظر ارشاد فرمایا ہے:-

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم:۶)

''اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو بڑی آگ سے۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری دُنیا کے رسول ہیں، اور جن کی ہدایت قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے عام ہے آپ کو بھی سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ:-

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ (الشعراء)

''اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایئے۔''

اور اِرشاد ہوا:-

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طٰہٰ:۱۳۲)

''یعنی اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم کیجئے اور خود بھی اس کے پابند رہئے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اس کی تعمیل فرمائی۔

ایک تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ جب تک کسی شخص کے اہل و عیال اور قریبی خاندان اس کے نظریات اور عملی پروگرام میں اس کا ساتھی اور ہم رنگ نہیں ہوتا تو اس کی تعلیم و تبلیغ دُوسروں پر اتنی مؤثر نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کے جواب میں اِبتدائے اِسلام کے وقت عام لوگوں کا یہ جواب ہوتا تھا کہ پہلے اپنے خاندان قریش کو تو آپ دُرست کرلیں، پھر ہماری خبر لیں، اور جب خاندان میں اِسلام پھیل گیا اور فتحِ مکہ کے وقت اس کی تکمیل ہوئی تو اس کا نتیجہ قرآن کے الفاظ میں یہ ظاہر ہوا کہ:-

يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ﴿۲﴾ (النصر)

''یعنی لوگ اللہ کے دِین میں فوج در فوج ہو کر داخل ہوں گے۔''

آج کل مسلمانوں میں بے علمی اور بے دِینی پھیلنے کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اگر خود دِین سے واقف اور دِین دار بھی ہیں تو اس کی فکر نہیں کرتے کہ ہماری اولاد بھی دِین دار ہو کر دائمی راحت کی مستحق ہو، عام طور پر ہماری نظریں

صرف اولاد کی دُنیوی اور چند روزہ راحت پر رہتی ہیں اسی کے اِنتظامات کرتے رہتے ہیں، دولتِ لازوال کی طرف توجہ نہیں دیتے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرماویں کہ آخرت کی فکر میں لگ جائیں، اور اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے سب سے بڑا سرمایہ اِیمان اور عملِ صالح کو سمجھ کر اس کی کوشش کریں۔

بعض مسائل متعلقہ مسئلۂ توریث الجد

اس آیت میں حضرت یعقوب کی اولاد کی طرف سے جو جواب نقل کیا گیا ہے اس میں: اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ فرما کر اس طرف اِشارہ کر دیا گیا ہے کہ دادا بھی باپ ہی کہلاتا ہے، اور باپ ہی کے حکم میں ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس آیت سے اِستدلال کر کے فرمایا کہ میراث میں دادا کا بھی وہی حکم ہے جو باپ کا ہے۔

آباء واَجداد کے اعمال کی جزا وسزا اولاد پر نہیں ہوگی

لَهَا مَا كَسَبَتْ الآیہ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ باپ دادا کے نیک اعمال اولاد کے لئے کافی نہیں ہوں گے، جب تک وہ خود اپنے اعمال کو دُرست نہ کریں، اسی طرح باپ دادا کے برے اعمال کا عذاب بھی اولاد پر نہ پڑے گا جبکہ یہ اعمالِ صالحہ کے پابند ہوں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مشرکین کی اولاد جو بلوغ سے پہلے مر جائے اُن کو اپنے ماں باپ کے کفر وشرک کی وجہ سے عذاب نہیں ہوگا، اور اس سے یہود کے اس عقیدے کی بھی تردید ہوگئی کہ ہم جو چاہیں عمل کرتے رہیں ہماری مغفرت تو ہمارے آباء واَجداد کے اعمال سے ہو جائے گی۔ اسی طرح آج کل کے بعض سیّد خاندان کے لوگ اس خیال میں رہتے ہیں کہ ہم اولادِ رسول ہیں، ہم جو چاہیں گناہ کرتے رہے ہیں، ہماری مغفرت ہی ہوگی۔

قرآنِ کریم نے اس مضمون کو بار بار مختلف عنوانات سے بیان فرمایا ہے: وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا [۱] اور وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى [۲] (الانعام: ۱۶۴) وغیرہ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

> ”اے بنی ہاشم! ایسا نہ ہو کہ قیامت کے روز اور لوگ تو اپنے اپنے اعمالِ صالحہ لے کر آئیں اور تم اعمالِ صالحہ سے غفلت برتو اور صرف میرے نسب کا بھروسہ لے کر آؤ اور میں اس روز تم سے یہ کہوں کہ میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔“

اور دُوسری حدیث میں اِرشاد ہے:-

[۱] ترجمہ:- ہر ایک نفس جو عمل کرتا ہے اس کی ذمہ داری اسی پر ہے۔ ۱۲ منہ
[۲] ترجمہ:- کسی کا بوجھ قیامت کے روز کوئی دُوسرا نہیں اُٹھا سکے گا۔ ۱۲ منہ

مَنْ بَطَّأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ۔ [1]

''یعنی جس شخص کو اس کے عمل نے پیچھے ڈالا، اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔''

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ

اور کہتے ہیں کہ ہو جاؤ یہودی یا نصرانی تو تم پالو گے راہِ راست، کہہ دے کہ ہرگز نہیں، بلکہ ہم نے اختیار کی راہ ابراہیم کی

حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا

جو ایک ہی طرف کا تھا اور نہ تھا شرک کرنے والوں میں۔ تم کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو اُترا ہم پر

وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ

اور جو اُترا ابراہیم پر اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر

وَ مَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰى وَ عِیْسٰى وَ مَاۤ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ

اور جو ملا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملا دُوسرے پیغمبروں کو ان کے ربّ کی طرف سے، ہم فرق نہیں کرتے

بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ٘ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

اُن سب میں سے ایک میں بھی اور ہم اسی پروردگار کے فرمانبردار ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور یہ (یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ: ''تم یہودی یا عیسائی ہو جاؤ، راہِ راست پر آ جاؤ گے۔'' کہہ دو کہ: ''نہیں، بلکہ (ہم تو) ابراہیم کے دِین کی پیروی کریں گے جو ٹھیک ٹھیک سیدھی راہ پر تھے، اور وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں۔'' ﴿۱۳۵﴾ (مسلمانو!) کہہ دو کہ: ''ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، اور اُس

[1] صحیح مسلم، کتاب الذکر، باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن وعلی الذکر ج:۲ ص:۳۴۵

کلام پر بھی جو ہم پر اُتارا گیا اور اُس پر بھی جو اِبراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اُتارا گیا، اور اُس پر بھی جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دِیا گیا اور اُس پر بھی جو دوسرے پیغمبروں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے عطا ہوا۔ ہم ان پیغمبروں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے، اور ہم اُسی (ایک خدا) کے تابعِ فرمان ہیں۔'' ﴿۱۳۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (یہودی ونصرانی) لوگ (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم لوگ یہودی ہوجاؤ (یہ تو یہود نے کہا تھا)، یا نصرانی ہوجاؤ (یہ نصاریٰ نے کہا تھا) تم بھی راہِ (حق) پر پڑ جاؤ گے، (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ ہم تو (یہودی یا نصرانی کبھی نہ ہوں گے، بلکہ) ملتِ ابراہیم (یعنی اِسلام) پر رہیں گے، جس میں کجی کا نام نہیں، (بخلاف یہودیت ونصرانیت کے، جس میں علاوہ محرف ہونے کے اس کے منسوخ ہوچکے کے سبب اب اس میں کجی آگئی) اور اِبراہیم علیہ السلام مشرک بھی نہ تھے، (مسلمانو! یہود ونصاریٰ کے جواب میں جو تم نے اِجمالاً کہا ہے کہ ہم ملتِ اِبراہیمی پر رہیں گے، اس ملت کی تفصیل بیان کرنے کے لئے) کہہ دو کہ (اس ملت پر رہنے کا حاصل یہ ہے کہ) ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر بھی جو ہمارے پاس (بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) بھیجا گیا اور اس (حکم) پر بھی جو حضرت اِبراہیم اور حضرت اِسماعیل اور حضرت اِسحاق اور حضرت یعقوب (علیہم السلام) اور اولادِ یعقوب (میں جو نبی گزرے ہیں ان) کی طرف (بواسطہ وحی کے) بھیجا گیا، اور اس (حکم اور معجزہ) پر بھی جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو دِیا گیا، اور اس پر بھی جو کچھ اور انبیاء (علیہم السلام) کو دِیا گیا، ان کے پروردگار کی طرف سے (سو ہم ان سب پر اِیمان رکھتے ہیں، اور اِیمان بھی) اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی (دُوسرے سے اِیمان لانے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر اِیمان رکھیں، کسی پر نہ رکھیں) اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں (انہوں نے ہم کو یہ دِین بتلایا ہم نے اِختیار کرلیا پس یہ حاصل ہے اس ملت کا جس پر ہم قائم ہیں، جس میں کسی کو اَصلاً اِنکار وسرتابی کی گنجائش نہیں)۔

معارف ومسائل

اولادِ یعقوب علیہ السلام کو قرآنِ کریم نے لفظ ''اَسباط'' سے تعبیر فرمایا ہے، یہ جمع ہے ''سبط'' کی جس کے معنی قبیلہ اور جماعت کے ہیں۔ ان کو سبط کہنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے صلبی لڑکے بارہ تھے، پھر ہر لڑکے کی اولاد ایک مستقل قبیلہ بن گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نسل میں یہ برکت دی کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس

مصر گئے تو بارہ بھائی تھے، اور جب فرعون کے مقابلے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی اولاد بنی اسرائیل نکلے تو ہر بھائی کی اولاد ہزاروں اَفراد پر مشتمل قبیلے تھے، اور دُوسری برکت اولادِ یعقوب علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ نے یہ عطا فرمائی کہ دس انبیاء کے علاوہ باقی سب انبیاء ورُسل ان کی اولاد میں پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے علاوہ باقی انبیاء حضرت آدم علیہ السلام کے بعد نوح، شیث، ہود، صالح، لوط، ابراہیم، اِسحاق، یعقوب، اِسماعیل اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ

سو اگر وہ بھی اِیمان لاویں جس طرح پر تم اِیمان لائے تو ہدایت پائی انہوں نے بھی اور اگر پھر جاویں تو پھر وہی ہیں

فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ

ضد پر، سو اَب کافی ہے تیری طرف سے ان کو اللہ اور وہی ہے سننے والا جاننے والا۔ ہم نے قبول کرلیا رَنگ اللہ کا،

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اور کس کا رَنگ بہتر ہے اللہ کے رَنگ سے، اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اس کے بعد اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو یہ راہِ راست پر آجائیں گے۔ اور اگر یہ منہ موڑلیں تو درحقیقت وہ دُشمنی میں پڑگئے ہیں۔ اب اللہ تمہاری حمایت میں عنقریب ان سے نمٹ لے گا، اور وہ ہر بات سننے والا، ہر بات جاننے والا ہے ﴿۱۳۷﴾ (اے مسلمانو! کہہ دو کہ:) ''ہم پر تو اللہ نے اپنا رنگ چڑھادیا ہے، اور کون ہے جو اللہ سے بہتر رنگ چڑھائے؟ اور ہم صرف اُسی کی عبادت کرتے ہیں۔'' ﴿۱۳۸﴾

اللغات والبلاغة

"اَلشِّقَاقُ" قال البيضاوي هو المناواة والمخالفة فإنّ كلّ واحد من المتخالفين في شق غير شق الآخر۔ [1] "اَلصِّبْغَةُ" بالكسر فعلة من صبغ وهي الحالة التي يقع عليها الصبغ۔

---

[1] تفسير البيضاوي تحت هذه الآية ج:۱ ص:۱۷۵

خلاصۂ تفسیر

(یعنی جب اُوپر طریق اِسلام میں دِینِ حق کا منحصر ہونا ثابت ہو چکا) سو اگر وہ (یہود و نصاریٰ) بھی اسی طریق سے ایمان لے آویں جس طریق سے تم (اہلِ اِسلام) اِیمان لائے ہو تب تو وہ بھی راہِ (حق) پر لگ جاویں گے، اور اگر وہ (اس سے) رُوگردانی کریں تو (تم ان کی رُوگردانی سے کچھ تعجب نہ کرو کیونکہ) وہ لوگ تو (ہمیشہ سے) برسرِ مخالفت ہیں ہی (اور اگر ان کی مخالفت سے کچھ اندیشہ ہو) تو (سمجھ لیجئے کہ) آپ کی طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے ان سے اللہ تعالیٰ، اور اللہ تعالیٰ (تمہاری اور ان کی باتیں) سنتے ہیں (اور تمہارے اور ان کے برتاوے) جانتے ہیں، (تمہارے فکر وغم کی ضرورت نہیں)۔

(اے مسلمانو! کہہ دو کہ ہم نے جو اُوپر تم لوگوں کے جواب میں کہا ہے کہ ہم ملتِ اِبراہیم پر رہیں گے، اس کلام کی حقیقت یہ ہے کہ) ہم (دِین کی) اس حالت پر رہیں گے جس میں (ہم کو) اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے (اور رَنگ کی طرح ہمارے رگ و ریشے میں بھر دِیا ہے) اور (دُوسرا) کون ہے جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ (کے رنگ دینے کی حالت) سے خوب تر ہو (جب اور کوئی دُوسرا ایسا نہیں تو ہم نے اور کسی کا دِین بھی اِختیار نہیں کیا) اور (اس لئے) ہم اس کی غلامی اِختیار کئے ہوئے ہیں۔

معارف ومسائل

اِیمان کی مختصر اور جامع تفسیر

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ، شروع سورۂ بقرہ سے یہاں تک اِیمان کی حقیقت کہیں مجمل، کہیں مفصل بیان کی گئی ہے، اس آیت میں ایک ایسا اِجمال ہے جو تمام تفصیلات اور تشریحات پر حاوی ہے، کیونکہ اٰمَنْتُمْ کے مخاطب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ ہیں، اس آیت میں ان کے اِیمان کو ایک مثالی نمونہ قرار دے کر حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول و معتبر صرف اس طرح کا اِیمان ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے اِختیار فرمایا، جو اِعتقاد اس سے سرِمو مختلف ہو، اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ جتنی چیزوں پر یہ حضرات اِیمان لائے ان میں کوئی کمی زیادتی نہ ہو، اور جس طرح اِخلاص کے ساتھ اِیمان لائے اس میں کوئی فرق نہ آئے کہ وہ نفاق میں داخل ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، فرشتے اور انبیاء

ورُسل، آسمانی کتابیں اور ان کی تعلیمات کے مطابق جو اِیمان و اِعتقاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِختیار کیا وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے، اس کے خلاف اس میں کوئی تاویل کرنا یا کوئی دُوسرے معنی مراد لینا اللہ کے نزدیک مردُود ہے، فرشتوں اور اَنبیاء ورُسل کے لئے جو مقام آپ کے قول وعمل سے واضح ہوا، اس سے ان کو گھٹانا یا بڑھانا اِیمان کے منافی ہے۔

اس توضیح سے ان تمام باطل فرقوں کے اِیمان کا خلل واضح ہوگیا جو اِیمان کے دعوے دار ہیں مگر حقیقتِ اِیمان سے بے بہرہ ہیں، کیونکہ زبانی دعویٰ اِیمان کا تو بت پرست مشرکین بھی کرتے تھے، اور یہود ونصاریٰ بھی اور ہر زمانے میں زِندیق وملحد بھی، مگر چونکہ ان کا اِیمان اللہ پر اور رسولوں پر اور فرشتوں پر اور یومِ قیامت وغیرہ پر اس طرح کا نہیں تھا، جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اس لئے وہ اللہ کے نزدیک مردُود و نامقبول ہوا۔

فرشتہ اور رسول کی عظمت ومحبت میں اِعتدال مطلوب ہے، غلوّ گمراہی ہے

مشرکین میں سے بعض نے تو فرشتوں کے وجود ہی کا اِنکار کیا، بعض نے ان کو خدا کی بیٹیاں بنادیا، دونوں کی تردید بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ سے ہوگئی۔ یہود ونصاریٰ کے بعض گروہوں نے اپنے پیغمبروں کی مخالفت اور نافرمانی کی، یہاں تک کہ بعض کو قتل بھی کردیا، اور بعض گروہوں نے ان کی عزّت وعظمت کو اتنا بڑھایا کہ خدا، یا خدا کا بیٹا، یا خدا کا مثل بنادیا، یہ دونوں قسم کی اِفراط وتفریط ضلالت وگمراہی قرار دی گئی۔

شریعتِ اِسلام میں ''رسول'' کی عظمت ومحبت فرض ہے، اس کے بغیر اِیمان ہی نہیں ہوتا، مگر رسول کو کسی صفت علم یا قدرت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے برابر کردینا گمراہی اور شرک ہے، قرآنِ کریم نے شرک کی حقیقت یہی بیان فرمائی ہے، کہ غیر اللہ کو کسی صفت میں اللہ کے برابر کریں: اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾ (الشعراء) کا یہی مفہوم ہے۔ آج بھی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب اور خدا تعالیٰ کی طرح ہر جگہ موجود وحاضر وناظر کہتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت کا حق ادا کر رہے ہیں، حالانکہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اور عمر بھر کی کوششوں کی صریح مخالفت کر رہے ہیں۔ اس آیت میں اُن کے لئے بھی سبق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت اللہ کے نزدیک ایسی ہی مطلوب ہے جیسی صحابہ کرامؓ کے دِل میں آپ کی تھی، اس سے کمی بھی جرم ہے اور اس میں زیادتی بھی غلوّ اور گمراہی ہے۔

نبی ورسول کی اِختراعی قسمیں، ظِلّی، بروزی، لغوی سب گمراہی ہے

اسی طرح جن فرقوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختمِ نبوّت کا اِنکار کر کے نئے نبی کے لئے دروازہ کھولنا چاہا،

اور قرآنِ کریم کی واضح تصریح خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (الاحزاب: ۴۰) کو اپنے مقصد میں حائل پایا تو اُنہوں نے رسول و نبی کی بہت سی قسمیں اپنی طرف سے اِختراع کرلیں، جن کا نام نبی ظِلّی، نبی بروزی وغیرہ رکھ دیا، اور ان کے لئے گنجائش نکالنے کی کوشش کی۔ مذکور الصدر آیت نے ان کے دجل و گمراہی کو بھی واضح کر دیا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے ایمان بالرسل میں کسی ظِلّی و بروزی کا کہیں نام ونشان نہیں، یہ کھلا ہوا زَندقہ اور اِلحاد ہے۔

ایمان بالآخرۃ کی تأویلاتِ باطلہ مردود ہیں

اِسی طرح وہ لوگ جن کے قلب و دِماغ صرف مادّے اور مادّیات میں کھوئے ہوئے ہیں، عالمِ غیب اور عالمِ آخرت کی چیزیں جب انہیں مستبعد نظر آتی ہیں تو طرح طرح کی تأویلوں میں پڑ جاتے ہیں، اور اپنے نزدیک اس کو دِین کی خدمت سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس کو اَقرب الی الفہم کر دیا، مگر چونکہ وہ تأویلیں بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ کے خلاف ہیں، اس لئے سب مرُدود و باطل ہیں، آخرت کے تمام حالات وواقعات جس طرح قرآن وسنت میں وارِد ہوئے ہیں اُن پر بغیر کسی جھجک اور تأویل کے اِیمان لانا ہی درحقیقت اِیمان ہے، حشرِ اَجساد کے بجائے حشرِ رُوحانی اور عذاب وثوابِ جسمانی ورُوحانی، اسی طرح وزنِ اعمال میں تأویلیں کرنا سب اللہ کے نزدیک مرُدود، باطل اور گمراہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لے لی

فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ میں واضح فرمادیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخالفوں کی زیادہ فکر نہ فرماویں، ہم خود ان سے نمٹ لیں گے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا دُوسری ایک آیت: وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ (المائدۃ: ۶۷) میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمادیا کہ آپ مخالفین کی فکر نہ کریں، اللہ تعالیٰ ان سے آپ کی حفاظت خود کریں گے۔

دِین واِیمان ایک گہرا رَنگ ہے جو اِنسان کے چہرہ بشرہ سے نظر آنا چاہئے

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ اس سے پہلی آیت میں دِینِ اِسلام کو حضرت اِبراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا تھا، مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ (البقرۃ: ۱۳۵) اس جگہ اس کو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرکے بتلادیا کہ دِین درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ہے، کسی پیغمبر کی طرف اس کی نسبت مجازی کر دی جاتی ہے۔ اور اس جگہ ملت کو "صِبْغَتْ" کے لفظ سے تعبیر کرکے دو باتوں کی طرف اِشارہ ہوگیا، اوّل تو نصاریٰ کی ایک رسم کی تردید ہوگئی، ان کی یہ عادت تھی کہ جو بچہ پیدا ہو، اس کو ساتویں روز ایک رنگین پانی میں نہلاتے تھے، اور بجائے ختنہ کے اسی نہلانے کو بچے کی طہارت اور دِینِ نصرانیت کا پختہ رنگ سمجھتے

تھے۔ اس آیت نے بتلایا کہ یہ پانی کا رَنگ تو دُھل کر ختم ہو جاتا ہے، اس کا بعد میں کوئی اثر نہیں رہتا، نیز ختنہ نہ کرنے کی وجہ سے جو گندگی اور ناپاکی جسم میں رہتی ہے اس سے بھی یہ رنگ نجات نہیں دیتا، اصل رنگ دِین واِیمان کا رَنگ ہے جو ظاہری اور باطنی پاکی کی ضمانت بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی۔

دُوسرے دِین واِیمان کو رَنگ فرما کر اس کی طرف بھی اِشارہ ہوگیا کہ جس طرح رنگ آنکھوں سے محسوس ہوتا ہے مؤمن کے اِیمان کی علامات اس کے چہرہ بشرہ اور تمام حرکات وسکنات، معاملات وعادات میں ظاہر ہونا چاہئیں، واللہ اعلم۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا

کہہ دے: کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہم سے اللہ کی نسبت حالانکہ وہی ہے ربّ ہمارا اور ربّ تمہارا اور ہمارے لئے ہیں عمل ہمارے

وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ

اور تمہارے لئے ہیں عمل تمہارے، اور ہم تو خالص اُسی کے ہیں۔ کیا تم کہتے ہو کہ اِبراہیم

وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ

اور اِسماعیل اور اِسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد تو یہودی تھے یا نصرانی، کہہ دے کہ

ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ

تم کو زیادہ خبر ہے یا اللہ کو، اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے چھپائی وہ گواہی جو ثابت ہو چکی اس کو اللہ کی طرف سے،

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ

اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔ وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، ان کے واسطے ہے جو اُنہوں نے کیا

۱۶ ۱۲ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع

اور تمہارے واسطے ہے جو تم نے کیا، اور تم سے کچھ پوچھ نہیں اُن کے کاموں کی۔

آسان ترجمۂ قرآن

کہہ دو کہ: ''کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو؟ حالانکہ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار۔ (یہ) اور (بات ہے کہ) ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں، اور تمہارے عمل تمہارے لئے۔ اور ہم نے تو اپنی بندگی اُسی کے لئے خالص کرلی ہے'' ⁽¹³⁹⁾ بھلا کیا تم یہ کہتے ہو کہ اِبراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولادیں یہودی یا نصرانی تھیں؟ (اے پیغمبر! ان سے) کہو: کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اور اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو ایسی شہادت کو چھپائے جو اُس کے پاس اللہ کی طرف سے پہنچی ہو؟ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے ⁽¹⁴⁰⁾ (بہرحال!) وہ ایک اُمت تھی جو گذر گئی۔ جو کچھ اُنہوں نے کمایا وہ اُن کا ہے، اور جو کچھ تم نے کمایا وہ تمہارا ہے، اور تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا عمل کرتے تھے؟ ⁽¹⁴¹⁾

خلاصۂ تفسیر

آپ (ان یہود و نصاریٰ سے) فرما دیجئے کہ کیا تم لوگ (اب بھی) ہم سے حجت کئے جاتے ہو حق تعالیٰ کے معاملہ میں (کہ وہ ہم کو قیامت میں نہ بخشیں گے) حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا (سب کا) رَبّ (اور مالک) ہے، (سو رُبوبیت میں تو تمہارے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں، جیسا تمہارے بعض دعووں سے اِختصاص مفہوم ہوتا ہے، مثل نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ (المائدۃ:۱۸)) اور ہم کو ہمارا کیا ہوا ملے گا اور تم کو تمہارا کیا ہوا ملے گا (یہاں تک تو تمہارے نزدیک بھی مُسلّم ہے) اور (اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ) ہم نے صرف حق تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لئے اپنے (دِین) کو (شرک وغیرہ سے) خالص کر رکھا ہے (بخلاف تمہارے طریقۂ موجودہ کے کہ علاوہ منسوخ ہونے کے خود شرک سے بھی مخلوط ہے، جیسا ان کے اقوال ''عُزَيۡرُ ابۡنُ اللّٰهِ'' اور ''اَلۡمَسِيۡحُ ابۡنُ اللّٰهِ'' (التوبۃ:۳۰) سے ظاہر ہے، اور اس میں ہم کو اللہ تعالیٰ نے ترجیح دی ہے پھر ہم کو نجات نہ ہونے کے کیا معنی) یا (اب بھی اپنے حق پر ہونے کے ثابت کرنے کو یہی) کہے جاتے ہو کہ اِبراہیم اور اِسماعیل اور اِسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب (میں جو اَنبیاء گزرے ہیں، یہ سب حضرات) یہود یا نصاریٰ تھے (اور اس سے بواسطۂ موافقتِ طریق اپنا حق پر ہونا ثابت کرتے ہو، سو اِس کے جواب میں) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم (ایک اتنی مختصر سی بات ان سے) کہہ دیجئے کہ (اچھا یہ بتلاؤ کہ) تم زیادہ واقف ہو یا حق تعالیٰ (اور ظاہر ہے کہ خدا ہی زیادہ واقف ہے، اور وہ ان انبیاء کا ملتِ اِسلام پر ہونا ثابت کرچکے ہیں، جیسا ابھی اُوپر گزر چکا ہے) اور (جانتے ہیں یہ کافر بھی مگر چھپاتے ہیں، سو) ایسے شخص سے زیادہ ظالم کونا ہوگا جو ایسی شہادت کا اِخفا کرے جو اس کے پاس مِن جانب اللہ پہنچی ہو اور (اے اہلِ

کتاب) اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے سے بے خبر نہیں ہیں (پس جب یہ حضرات یہود و نصاریٰ نہ تھے، سو تم طریقِ دین میں اُن کے موافق کب ہوئے، پھر تمہارا حق پر ہونا ثابت نہ ہوا) یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانے میں) گزر گئی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آوے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آوے گا، اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی (اور جب خالی تذکرہ بھی نہ ہوگا تو اس سے تم کو کچھ نفع پہنچنا تو درکنار)۔

معارف و مسائل

اِخلاص کی حقیقت

وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اس میں اُمتِ مسلمہ کی ایک خصوصیت یہ بتلائی ہے کہ وہ اللہ کے لئے مخلص ہے، اِخلاص کے معنی حضرت سعید بن جبیرؒ نے یہ بتلائے ہیں کہ اِنسان اپنے دِین میں مخلص ہو کہ اللہ کے سوا کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اور اپنے عمل کو خالص اللہ کے لئے کرے، لوگوں کے دِکھلانے یا ان کی مدح و شکر کی طرف نظر نہ ہو۔

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ اِخلاص ایک ایسا عمل ہے جس کو نہ تو فرشتے پہچان سکتے ہیں اور نہ شیطان، وہ صرف بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک راز ہے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ

اب کہیں گے بیوقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دِیا مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر وہ تھے،

قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

تو کہہ اللہ ہی کا ہے مشرق اور مغرب، چلائے جس کو چاہے سیدھی راہ۔

آسان ترجمۂ قرآن

اب یہ بے وقوف لوگ کہیں گے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس نے اِن (مسلمانوں) کو اپنے اُس قبلے سے رُخ پھیرنے پر آمادہ کر دیا جس کی طرف وہ منہ کرتے چلے آرہے تھے؟ آپ کہہ دیجئے کہ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کی ہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت کر دیتا ہے ﴿۱۴۲﴾

خلاصۂ تفسیر

(جب کعبہ قبلۂ نماز مقرّر ہوکر یہود کا قبلہ متروک ہوگیا تو بوجہ ناگواری کے) اب تو (یہ) بیوقوف لوگ ضرور ہی کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمت) قبلہ سے (کہ بیت المقدس تھا) جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس بات نے (دُوسری سمت کی طرف) بدل دیا آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ سب (سمتیں خواہ) مشرق (ہو) اور (خواہ) مغرب (ہو) اللہ ہی کے ملک ہیں (خدا تعالیٰ کو مالکانہ اِختیار ہے جس سمت کو چاہیں مقرّر فرمادیں، کسی کو منصب علت دریافت کرنے کا نہیں ہے، اور سیدھا طریق اَحکامِ شرعیہ کے باب میں یہی اِعتقاد ہے، لیکن بعضوں کو اس راہ کے اِختیار کرنے کی توفیق نہیں ہوتی خواہ مخواہ علّتیں ڈھونڈتے پھرا کرتے ہیں، البتہ) جس کو خدا ہی (اپنے فضل سے) چاہیں (یہ) سیدھا طریق بتلادیتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں مخالفین کا اِعتراض دربارۂ تحویلِ قبلہ نقل کرکے اس کا جواب دیا گیا ہے، اس اِعتراض اور جواب سے پہلے قبلہ کی حقیقت اور اس کی مختصر تاریخ سن لیجئے، جس سے سوال و جواب کا سمجھنا آسان ہوجائے۔

''قبلہ'' کے لفظی معنی ہیں سمتِ توجہ، یعنی جس طرف رُخ کیا جائے، یہ ظاہر ہے کہ مؤمن کا رُخ ہر عبادت میں صرف ایک اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی طرف ہوتا ہے، اور اس کی ذاتِ پاک مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی قیدوں اور سمتوں سے بالاتر ہے، وہ کسی خاص سمت میں نہیں، اس کا اَثرِ طبعی خاص طور پر یہ ہونا تھا کہ کوئی عبادت کرنے والا کسی خاص رُخ کا پابند نہ ہوتا، جس کا جس طرف جی چاہتا نماز میں اپنا رُخ اس طرف کرلیتا، اور ایک ہی آدمی کسی وقت ایک طرف اور کسی وقت کئی طرف رُخ کرتا تو وہ بھی بے جا نہ ہوتا۔

لیکن ایک دُوسری حکمتِ اِلٰہیہ اس کی مقتضی ہوئی کہ تمام عبادت گزاروں کا رُخ ایک ہی طرف ہونا چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ عبادت کی مختلف قسمیں ہیں، بعض اِنفرادی ہیں، بعض اِجتماعی، ذکر اللہ اور روزہ وغیرہ اِنفرادی عبادات ہیں، جن کو خلوَت میں اور اِخفا کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے، اور نماز اور حج اِجتماعی عبادات ہیں، جن کو جماعت و اِجتماع و اِعلان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے، ان میں عبادت کے ساتھ مسلمانوں کو اِجتماعی زندگی کے آداب کا بتلانا اور سکھانا بھی پیشِ نظر ہے، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ اِجتماعی نظام کا سب سے بڑا بنیادی اُصول اَفرادِ کثیرہ کی وحدت اور یک جہتی ہے، یہ وحدت جتنی زیادہ قوی ہوگی اتنا ہی اِجتماعی نظام مستحکم اور مضبوط ہوگا، اِنفرادیت اور تشتّت اِجتماعی نظام کے لئے سمِ قاتل

ہے، پھر نقطۂ وحدت متعین کرنے میں ہر قرن، ہر زمانے کے لوگوں کی مختلف راہیں رہی ہیں، کسی قوم نے نسل اور نسب کو نقطۂ وحدت قرار دِیا، کسی نے وطن اور جغرافیائی خصوصیات کو، کسی نے رنگ اور زبان کو۔

لیکن دِینِ اِلٰہی اور شرائع انبیاء علیہم السلام نے ان غیر اِختیاری چیزوں کو نقطۂ وحدت بنانے کے قابل نہیں سمجھا، اور نہ در حقیقت یہ چیزیں ایسی ہیں جو پورے اَفرادِ اِنسانی کو کسی ایک مرکز پر جمع کر سکیں، بلکہ جتنا غور کیا جائے یہ وحدتیں در حقیقت افرادِ اِنسانی کو بہت سی کثرتوں میں تقسیم کر ڈالنے اور آپس میں ٹکراؤ اور اِختلافات کے اسباب ہیں۔

دِینِ اسلام نے جو در حقیقت تمام انبیاء علیہم السلام کا دِین ہے وحدت کا اصلی نقطہ فکر و خیال اور عقیدے کی وحدت کو قرار دِیا، اور کروڑوں خداؤں کی پرستش میں بٹی ہوئی دُنیا کو ایک ذاتِ حق وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت اور اِطاعت کی دعوت دی جس پر مشرق و مغرب اور ماضی و مستقبل کے تمام اَفرادِ اِنسانی جمع ہو سکتے ہیں، پھر اس حقیقی فکری اور نظری وحدت کو عملی صورت اور قوت دینے کے لئے کچھ ظاہری وحدتیں بھی ساتھ لگائی گئیں، مگر ان ظاہری وحدتوں میں بھی اُصول یہ رکھا گیا کہ وہ عملی اور اِختیاری ہوں، تاکہ تمام اَفرادِ اِنسانی ان کو اِختیار کر کے ایک رشتۂ اُخوت میں منسلک ہو سکیں، نسب، وطن، زبان، رنگ وغیرہ اِختیار چیزیں نہیں ہیں، جو شخص ایک خاندان کے اندر پیدا ہو چکا ہے وہ کسی طرح دُوسرے خاندان میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو پاکستان میں پیدا ہو چکا وہ انگلستان یا افریقہ میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو کالا ہے وہ اپنے اِختیار سے گورا، اور جو گورا ہے وہ اپنے اِختیار سے کالا نہیں ہو سکتا۔

اب اگر ان چیزوں کو مرکزِ وحدت بنایا جائے تو اِنسانیت کا سیکڑوں بلکہ ہزاروں ٹکروں اور گروہوں میں تقسیم ہو جانا ناگزیر ہوگا، اس لئے دِینِ اِسلام نے ان چیزوں سے جن سے تمدنی مفاد وابستہ ہیں ان کا پورا اِحترام رکھتے ہوئے ان کو وحدتِ انسانی کا مرکز نہیں بننے دیا، کہ یہ وحدتیں اَفرادِ اِنسانی کو مختلف کثرتوں میں بانٹنے والی ہیں، ہاں اِختیاری اُمور میں اس کی پوری رعایت رکھی کہ فکری وحدت کے ساتھ عملی اور صوری وحدت بھی قائم ہو جائے، مگر اس میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ مرکزِ وحدت ایسی چیزیں بنائی جائیں جن کا اِختیار کرنا ہر مرد و عورت، لکھے پڑھے اور اَن پڑھ، شہری اور دیہاتی، امیر و غریب کو یکساں طور پر آسان ہو، یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اِسلام نے تمام دُنیا کے لوگوں کو لباس اور مسکن، کھانے اور پینے کے کسی ایک طریقے کا پابند نہیں کیا، کہ ہر جگہ کے موسم اور طبائع مختلف اور ان کی ضروریات مختلفہ ہیں، سب کو ایک ہی طرح کے لباس یا شعار (یونیفارم) کا پابند کر دیا جائے تو بہت سی مشکلات پیش آئیں گی، پھر اگر یہ یونیفارم کم سے کم تجویز کر دیا جائے تو یہ اِعتدالِ اِنسانی پر ظلم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے عمدہ لباس اور عمدہ کپڑوں کی بے حرمتی ہوگی، اور اگر اس سے زائد کسی لباس کا پابند کیا جائے تو غریب مفلس لوگوں کو مشکلات پیش آئیں گی۔

اس لئے شریعتِ اِسلام نے مسلمانوں کا کوئی ایک شعار (یونیفارم) مقرّر نہیں کیا، بلکہ مختلف قوموں میں جو طریقہ

اور اَوضاعِ لباس کی رائج تھیں ان سب پر نظر کر کے ان میں سے جو صورتیں اِسرافِ بے جا، یا فخر وغیرہ، یا کسی غیر مسلم قوم کی نقالی پر مبنی تھیں، صرف ان کو ممنوع قرار دے کر باقی چیزوں میں ہر فرد اور ہر قوم کو آزاد اور خود مختار رکھا، مرکزِ وحدت ایسی چیزوں کو بنایا گیا جو اختیاری بھی ہوں اور آسان اور سستی بھی، ان چیزوں میں جیسے جماعتِ نماز کی صف بندی، ایک اِمام کی نقل و حرکت کی مکمل پابندی، حج میں لباس اور مسکن کا اِشتراک وغیرہ ہیں۔

اسی طرح ایک اہم چیز سمتِ قبلہ کی وحدت بھی ہے، کہ اگرچہ اللہ جل شانہٗ کی ذاتِ پاک ہر سمت و جہت سے بالاتر ہے، اس کے لئے شش جہت یکساں ہیں، لیکن نماز میں اِجتماعی صورت اور وحدت پیدا کرنے کے لئے تمام دُنیا کے اِنسانوں کا رُخ کسی ایک ہی جہت و سمت کی طرف ہونا ایک بہترین اور آسان اور بے قیمت وحدت کا ذریعہ ہے، جس پر سارے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کے انسان آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں، اب وہ ایک سمت و جہت کونسی ہو جس کی طرف ساری دُنیا کا رُخ پھیرا جائے، اس کا فیصلہ اگر انسانوں پر چھوڑا جائے تو یہی ایک سب سے بڑی بناءِ اِختلاف و نزاع بن جاتی ہے، اس لئے ضرور تھا کہ اس کا تعین خود حضرت حق جل و علا شانہٗ کی طرف سے ہوتا، حضرت آدم علیہ السلام کو دُنیا میں اُتارا گیا تو فرشتوں کے ذریعے بیت اللہ کعبہ کی بنیاد پہلے ہی رکھ دی گئی تھی، حضرت آدم اور اولادِ آدم علیہ السلام کا سب سے پہلا قبلہ یہی بیت اللہ اور خانۂ کعبہ بنایا گیا:-

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٦﴾ (آل عمران)

''سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے برکت والا، ہدایت والا جہان والوں کے لئے۔''

نوح علیہ السلام تک سب کا قبلہ یہی بیت اللہ تھا، طوفانِ نوح کے وقت پوری دُنیا غرق ہو کر تباہ ہوگئی، بیت اللہ کی عمارت بھی منہدم ہوگئی، اور ان کے بعد حضرت خلیل اللہ اور اِسماعیل علیہ السلام نے دوبارہ بحکمِ خداوندی بیت اللہ کی تعمیر کی، اور یہی ان کا اور ان کی اُمت کا قبلہ رہا، اس کے بعد انبیائے بنی اِسرائیل کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دِیا گیا اور بقول ابوالعالیہ انبیائے سابقین جو بیت المقدس میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی عمل ایسا کرتے تھے کہ صخرۂ بیت المقدس بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی۔ [1] (ذکرہ القرطبی)

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نماز فرض کی گئی تو بقول بعض علماء ابتداءً آپ کا قبلہ آپ کے جدِ اَمجد حضرت اِبراہیم علیہ السلام کا قبلہ یعنی خانۂ کعبہ ہی قرار دِیا گیا، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے اور مدینہ طیبہ میں قیام کرنے کے بعد، اور بعض روایات کے اِعتبار سے ہجرتِ مدینہ سے کچھ پہلے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ آپ بیت المقدس

---

[1] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج:۲ ص:۱۵۱

کو اپنا قبلہ بنائیے، صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز اَدا فرمائی، مسجدِ نبوی میں آج تک اس کی علامات موجود ہیں، جہاں کھڑے ہوکر آپ نے بیت المقدس کی طرف نمازیں اَدا فرمائی تھیں۔ (قرطبی) [۱]

حکمِ خداوندی کی تعمیل کے لئے تو سیّد الرسل سرتاپا اِطاعت تھے، اور حکمِ خداوندی کے مطابق نمازیں بیت المقدس کی طرف ادا فرما رہے تھے، لیکن آپ کی طبعی رغبت اور دِلی خواہش یہ تھی کہ آپ کا قبلہ پھر وہی آدم علیہ السلام اور اِبراہیم علیہ السلام کا قبلہ قرار دے دیا جائے، اور چونکہ عادۃ اللہ یہی ہے کہ وہ اپنے مقبول بندوں کی مراد اور خواہش و رغبت کو پورا فرماتے ہیں ؎

تو چناں خواہی خدا خواہد چنیں
می دہد یزداں مرادِ متقین [۲]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ اُمید تھی کہ آپ کی تمنا پوری کی جائے گی، اور اس لئے اِنتظارِ وحی میں آپ بار بار آسمان کی طرف نظریں اُٹھا کر دیکھتے تھے، اسی کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے:-

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ

(البقرۃ: ۱۴۴)

"ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کا بارہا آسمان کی طرف نظر اُٹھانا، سو ہم آپ کا قبلہ وہی بدل دیں گے جو آپ کو پسند ہے، اس لئے آئندہ آپ نماز میں اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف کیا کریں۔"

اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کا اِظہار فرما کر اس کو پورا کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے کہ آئندہ آپ مسجدِ حرام کی طرف رُخ کیا کریں۔

نماز میں خاص بیت اللہ کا اِستقبال ضروری نہیں اس کی سمت کا اِستقبال بھی بیرونی دُنیا کے لئے کافی ہے

یہاں ایک فقہی نکتہ یہ بھی قابلِ ذِکر ہے کہ اس آیت میں کعبہ یا بیت اللہ کے بجائے لفظ مسجدِ حرام کا اِستعمال فرمایا گیا ہے، جس میں اِشارہ ہے کہ بلادِ بعیدہ کے رہنے والوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عین بیت اللہ کی محاذات پائی جائے، بلکہ سمتِ بیت اللہ کی طرف رُخ کرلینا کافی ہے، ہاں جو شخص مسجدِ حرام میں موجود ہے، یا کسی قریبی پہاڑ پر بیت اللہ کو سامنے

[۱] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۲ ص:۱۴۸ وصحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب الصلاۃ من الإیمان ج:۱ ص:۱۱

[۲] ترجمہ:- تم جس طرح چاہتے ہو خدا اس طرح چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کی مراد پوری کردیتا ہے۔

دیکھ رہا ہے، اس کے لئے خاص بیت اللہ ہی کی طرف رُخ کرنا ضروری ہے، اگر بیت اللہ کی کوئی چیز بھی اُس کے چہرے کے محاذات میں نہ آئی تو اس کی نماز نہیں ہوتی، بخلاف ان لوگوں کے جن کے سامنے بیت اللہ نہیں کہ ان کے واسطے سمتِ بیت اللہ یا سمتِ مسجدِ حرام کی طرف رُخ کر لینا کافی ہے۔

بہرحال ہجرتِ مدینہ سے سولہ سترہ مہینے بعد پھر آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ کو بنایا گیا، اس پر یہود اور بعض مشرکین و منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ ان کے دِین کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں، ان کا قبلہ بھی روز روز بدلتا رہتا ہے۔

قرآنِ کریم نے ان کا یہ اعتراض آیتِ مذکورہ میں نقل فرمایا، مگر ساتھ ہی عنوان یہ رہا کہ بیوقوف لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، اور ان کی بیوقوفی اس جواب سے واضح ہوگئی جو اس کے بعد ذِکر فرمایا گیا ہے، اِرشاد ہے: قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ یعنی ”آپ فرمادیجئے کہ اللہ ہی کے ہیں مشرق اور مغرب، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلاتا ہے۔“

اس میں اِستقبالِ قبلہ کی حقیقت کو واضح فرمادیا کہ کعبہ اور بیت المقدس کی کوئی خصوصیت بجز اس کے نہیں کہ حکمِ ربانی نے ان کو کوئی اِمتیاز دے کر قبلہ بنادیا، وہ اگر چاہیں تو ان دونوں کے علاوہ کسی تیسری چوتھی چیز کو بھی قبلہ بنا سکتے ہیں، پھر جس کو قبلہ بنادیا گیا اس کی طرف رُخ کرنے میں جو کچھ فضیلت اور ثواب ہے اس کی رُوح حکمِ حق جل شانہٗ کی اِطاعت کے سوا کچھ نہیں، جو بانیٔ کعبہ حضرت اِبراہیم علیہ السلام کی ملت کا بنیادی اُصول ہے، اور اسی لئے دُوسری آیت میں اور زیادہ واضح فرمایا کہ:-

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (البقرة:۱۷۷)

”اس میں ذاتی کوئی نیکی اور ثواب نہیں کہ تم مشرق کی طرف رُخ کرو یا مغرب کی طرف، لیکن نیکی اللہ پر ایمان لانے اور اس کی اِطاعت کرنے میں ہے۔“

اور ایک آیت میں فرمایا:-

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ (البقرة:۱۱۵)

”یعنی تم اللہ کے فرمان کے مطابق جس طرف بھی رُخ کرو، اللہ تعالیٰ کی توجہ اسی طرف پاؤ گے۔“

ان آیات نے قبلہ اور اِستقبالِ قبلہ کی حقیقت کو بھی واضح فرمادیا، کہ اس میں ان مقامات کی کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان میں فضیلت پیدا ہونے کا سبب ہی یہ ہے کہ ان کو حق تعالیٰ نے قبلہ بنانے کے لئے اِختیار فرمالیا، اور اس کی طرف رُخ کرنے میں ثواب کی وجہ بھی صرف یہی ہے کہ حکمِ ربانی کی اِطاعت ہے، اور شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

لئے قبلہ میں تغیر وتبدل فرمانے کی یہ بھی حکمت ہو کہ عملی طور سے لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ قبلہ کوئی بت نہیں، جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اصل چیز حکمِ خداوندی ہے، وہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا آ گیا تو اس کی تعمیل کی، پھر جب کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم مل گیا تو اسی کی طرف رُخ کرنا عبادت ہو گیا، اس کے بعد والی آیت میں خود قرآنِ کریم نے بھی اس حکمت کی طرف اِشارہ کیا ہے جس میں فرمایا ہے:-

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ (البقرة:۱۴۳)

''یعنی جس قبلے پر آپ پہلے رہ چکے ہیں، اس کو قبلہ بنانا تو محض اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے تھا کہ کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِتباع کرتا ہے اور کون پیچھے ہٹ جاتا ہے۔''

اس حقیقتِ قبلہ کے بیان سے ان بیوقوف مخالفین کا بھی پورا جواب ہو گیا جو قبلہ کے بارے میں تغییر وتحویل کو اُصولِ اِسلام کے منافی سمجھتے اور مسلمانوں کو طعنے دیتے تھے۔ آخر میں اِرشاد فرمایا: يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ اس میں بتلادیا ہے کہ سیدھی راہ یہی ہے کہ اِنسان حکمِ حق جل شانہٗ کے لئے کمر بستہ منتظر رہے، جو حکم مل جائے اس پر بے چون وچرا عمل کرے اور یہ سیدھی راہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

مسندِ احمد کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کو مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑا حسد تین چیزوں پر ہے، ایک یہ کہ ہفتہ میں ایک دن عبادت کے لئے مخصوص کرنے کا حکم ساری اُمتوں کو ملا تھا، یہود نے سنیچر کا دِن مقرّر کر لیا، اور نصاریٰ نے اتوار کا، اور حقیقت میں عند اللہ وہ جمعہ کا روز تھا، جو مسلمانوں کے اِنتخاب میں آیا، دُوسرے وہ قبلہ جو تحویل کے بعد مسلمانوں کے لئے مقرّر کیا گیا، اور کسی اُمت کو اس کی توفیق نہیں ہوئی، تیسرے اِمام کے پیچھے آمین کہنا کہ یہ تینوں خصلتیں صرف مسلمانوں کو میسر ہوئیں، اہلِ کتاب ان سے محروم ہیں۔ [1]

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو اُمتِ معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔

---

[1] مسند احمد رقم الحديث: ۲۳۸۸۰

آسان ترجمۂ قرآن

اور (مسلمانو!) اِسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل اُمت بنایا ہے تا کہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو، اور رسول تم پر گواہ بنے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اے متبعانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے، جو (ہر پہلو سے) نہایت اِعتدال پر ہے، تا کہ (دُنیا میں شرف و اِمتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی تمہارا بڑا اشرف ظاہر ہو کہ) تم (ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضراتِ انبیاء علیہم السلام ہوں گے، اور فریقِ ثانی ان کی مخالف قومیں ہوں گی، ان مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ (تجویز) ہو، اور (شرف بالاشرف یہ ہوا کہ) تمہارے (قابلِ شہادت اور معتبر ہونے کے) لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہوں، (اور اس شہادت سے تمہاری شہادت معتبر ہونے کی تصدیق ہو، پھر تمہاری شہادت سے اس مقدمہ کا حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہو اور مخالفین مجرم قرار پا کر سزایاب ہوں، اور اس اَمر کا اعلیٰ درجہ کی عزّت ہونا ظاہر ہے)۔

معارف و مسائل

اُمتِ محمدیہ کا خاص اِعتدال

لفظ "وَسَط" بفتح السین بمعنی اوسط ہے، اور خیر الامور اور اَفضل الاشیاء کو "وَسَط" کہا جاتا ہے۔ ترمذی[1] میں بروایت ابو سعید خدریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظ "وسط" کی تفسیر "عدل" سے کی گئی ہے، جو بہترین کے معنی میں آیا ہے (قرطبی)۔ اس آیت میں اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ایک اِمتیازی فضیلت وخصوصیت کا ذِکر ہے، کہ وہ ایک معتدل اُمت بنائی گئی، اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے مسلمانوں کو وہ قبلہ عطا کیا، جو سب سے اشرف و افضل ہے، اسی طرح ہم نے اُمتِ اسلامیہ کو ایک خاص اِمتیازی فضیلت یہ عطا کی ہے کہ اس کو ایک معتدل اُمت بنایا ہے، جس کے نتیجہ میں ان کو میدانِ حشر میں یہ اِمتیاز حاصل ہوگا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی اُمتیں جب اپنے انبیاء کی ہدایت و تبلیغ سے مکر جائیں گی، اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی، نہ کسی نبی نے ہمیں کوئی ہدایت کی، اُس وقت

---

[1] ج:۲ ص:۱۲۵ ابواب التفسیر ومن سورۃ البقرۃ۔

اُمت محمدیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے گواہی میں پیش ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہنچائیں، اور ان کو صحیح راستہ پر لانے کی مقدور بھر پوری کوشش کی۔ مدعا علیہم اُمتیں اُمت محمدیہ کی گواہی پر یہ جرح کریں گی کہ اس اُمت محمدیہ کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا، اس کو ہمارے معاملات کی کیا خبر، اس کی گواہی ہمارے مقابلے میں کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

اُمت محمدیہ اس جرح کا یہ جواب دے گی کہ بے شک ہم اس وقت موجود نہ تھے، مگر ان کے واقعات وحالات کی خبر ہمیں ایک صادق مصدوق رسول نے اور اللہ کی کتاب نے دی ہے، جس پر ہم ایمان لائے اور ان کی خبر کو اپنے معائنے سے زیادہ وقیع اور سچا جانتے ہیں، اس لئے ہم اپنی شہادت میں حق بجانب اور سچے ہیں۔ اس وقت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش ہوں گے، اور ان گواہوں کا تزکیہ وتوثیق کریں گے کہ بے شک انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری تعلیم کے ذریعے ان کو یہ صحیح حالات معلوم ہوئے۔

محشر کے اس واقعے کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی، نسائی اور مسندِ احمد کی متعدّد احادیث میں مجملاً ومفصلاً مذکور ہے۔ [1]

الغرض آیت مذکورہ میں اُمت محمدیہ کی اعلیٰ فضیلت وشرف کا راز یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ اُمت معتدل اُمت بنائی گئی ہے، اس لئے یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں:-

اِعتدالِ اُمت کی حقیقت، اہمیت اور اس کی کچھ تفصیل

۱- اِعتدال کے معنی اور حقیقت کیا ہیں؟ ۲- وصفِ اِعتدال کی یہ اہمیت کیوں ہے کہ اس پر مدارِ فضیلت رکھا گیا؟ ۳- اس اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معتدل ہونے کا واقعات کی رُو سے کیا ثبوت ہے؟ ترتیب وار ان تینوں سوالوں کا جواب یہ ہے:-

۱- اِعتدال کے لفظی معنی ہیں برابر ہونا، یہ لفظ عدل سے مشتق ہے، اس کے معنی بھی برابر ہونے کے ہیں۔

۲- وصفِ اِعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو اِنسانی شرف وفضیلت کا معیار قرار دیا گیا، ذرا تفصیل طلب ہے، اس کو پہلے ایک محسوس مثال سے دیکھئے، دُنیا کے جتنے نئے اور پُرانے طریقے جسمانی صحت وعلاج کے لئے جاری ہیں، طبِ یونانی، ویدک، ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک وغیرہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ بدنِ اِنسانی کی صحت اِعتدالِ مزاج سے ہے، اور جہاں یہ اِعتدال کسی جانب سے خلل پذیر ہو، وہی بدنِ انسانی کا مرض ہے۔ خصوصاً طبِ یونانی کا تو بنیادی اُصول ہی مزاج کی پہچان پر موقوف ہے، اِنسان کا بدن چار خلط: خون، بلغم، سوداء، صفراء کے مرکب اور انہی چاروں اَخلاط سے پیدا شدہ

---

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب قوله كذلك جعلناكم الآية ج:۲ ص:۶۴۵ وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، ومن سورة البقرة ج:۲ ص:۱۲۵ ومسند احمد رقم الحديث:۱۱۱۳۲

چار کیفیات اِنسان کے بدن میں ضروری ہیں: گرمی، ٹھنڈک، خشکی اور تری، جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاجِ انسانی کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں، وہ بدنِ اِنسانی کی صحت وتندرستی کہلاتی ہے، اور جہاں اُن میں سے کوئی کیفیت مزاجِ انسانی کی حد سے زیادہ ہوجائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے، اور اگر اس کی اِصلاح وعلاج نہ کیا جائے، تو ایک حد میں پہنچ کر وہی موت کا پیام ہوجاتا ہے۔

اس محسوس مثال کے بعد اب رُوحانیت اور اَخلاقیات کی طرف آیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی اِعتدال اور بے اِعتدالی کا یہی طریقہ جاری ہے، اس کے اِعتدال کا نام رُوحانی صحت اور بے اِعتدالی کا نام رُوحانی اور اَخلاقی مرض ہے، اور اس مرض کا اگر علاج کرکے اِعتدال پر نہ لایا جائے تو اس کا نتیجہ رُوحانی موت ہے، اور یہ بھی کسی صاحبِ بصیرت اِنسان پر مخفی نہیں کہ جوہرِ انسانیت جس کی وجہ سے اِنسان ساری مخلوقات کا حاکم اور مخدوم قرار دِیا گیا ہے، وہ اس کا بدن یا بدن کے اجزاء واَخلاط یا ان کی کیفیات حرارت وبرودت نہیں، کیونکہ ان اجزاء وکیفیات میں تو دُنیا کے سارے جانور بھی اِنسانیت کے ساتھ شریک بلکہ اِنسانیت سے زیادہ حصہ رکھنے والے ہیں۔

جوہرِ اِنسانیت جس کی وجہ سے اِنسان اَشرف المخلوقات اور آقائے کائنات مانا گیا ہے، وہ اس کے گوشت پوست اور حرارت وبرودت وغیرہ سے بالاتر کوئی چیز ہے، جو اِنسان میں کامل اور اکمل طور پر موجود ہے، دُوسری مخلوقات کو اس کا وہ درجہ حاصل نہیں، اور اس کا معین کرلینا بھی کوئی باریک اور مشکل کام نہیں، کہ وہ اِنسان کا رُوحانی اور اَخلاقی کمال ہے، جس نے اس کو مخدومِ کائنات بنایا ہے، مولانا رُومیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎

آدمیّت لحم وشحم وپوست نیست
آدمیّت جز رضائے دوست نیست [۱]

اور اسی وجہ سے وہ اِنسان جو اپنے جوہرِ شرافت وفضیلت کی بے قدری کرکے اس کو ضائع کرتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا ؎

اینکہ می بینی خلافِ آدم اند
نیستند آدم غلافِ آدم اند [۲]

اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ اِنسان کا جوہرِ شرافت اور مدارِ فضیلت اس کے رُوحانی اور اَخلاقی کمالات ہیں، اور یہ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ بدنِ اِنسانی کی طرح رُوحِ انسانی بھی اِعتدال وبے اِعتدالی کا شکار ہوتی ہے، اور جس طرح بدنِ اِنسانی کی صحت، اس کے مزاج اور اَخلاط کا اِعتدال ہے، اسی طرح رُوح کی صحت رُوح اور اس کے اَخلاق کا اِعتدال ہے،

[۱] ترجمہ:- آدمیت گوشت، چربی اور کھال کا نام نہیں ہے، آدمیت اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا اور کسی چیز کا نام نہیں ہے۔
[۲] ترجمہ:- یہ جن کو تم دیکھ رہے ہو آدم کے خلاف ہیں، یہ آدم نہیں ہیں بلکہ یہ آدم کا صرف غلاف ہیں۔

اس لئے اِنسانِ کامل کہلانے کا مستحق صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ رُوحانی اور اَخلاقی اِعتدال بھی رکھتا ہو، یہ کمال تمام انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوتا ہے، اور ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اَنبیاء علیہم السلام میں بھی سب سے زیادہ یہ کمال حاصل تھا، اس لئے اِنسانِ کامل کے اوّلین مصداق آپ ہی ہیں، اور جس طرح جسمانی علاج معالجے کے لئے ہر زمانہ اور ہر جگہ، ہر بستی میں طبیب اور ڈاکٹر اور دواؤں اور آلات کا ایک محکم نظام حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے، اسی طرح رُوحانی علاج اور قوموں میں اَخلاقی اِعتدال پیدا کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، ان کے ساتھ آسمانی ہدایات بھیجی گئیں اور بقدرِ ضرورت مادّی طاقتیں بھی عطا کی گئیں، جن کے ذریعہ وہ یہ قانونِ اِعتدال دُنیا میں نافذ کرسکیں، اسی مضمون کو قرآنِ کریم نے سورۂ حدید میں اس طرح بیان فرمایا ہے:-

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید:۲۵)

''یعنی ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اُتاری اُن کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ عدل و اِنصاف پر قائم ہوجائیں، اور ہم نے اُتارا لوہا اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے کام چلتے ہیں۔''

اس میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں میں اَخلاقی اور عملی اِعتدال پیدا کریں، کتاب، اَخلاق اور رُوحانی اِعتدال پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی، اور ترازو معاملات لین دین میں عملی اِعتدال پیدا کرنے کے لئے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترازو سے مراد ہر پیغمبر کی شریعت ہو، جس کے ذریعہ اِعتدالِ حقیقی معلوم ہوتا ہے اور عدل و اِنصاف قائم کیا جاسکتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور اُن پر کتابیں نازل کرنے کی اصلی غرض وحکمت یہی ہے کہ قوموں کو اَخلاقی اور عملی اِعتدال پر قائم کیا جائے، اور یہی قوموں کی صحت مندی اور تندرستی ہے۔

اُمتِ محمدیہ میں ہر قسم کا اِعتدال

اِس بیان سے آپ نے یہ بھی معلوم کرلیا ہوگا کہ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جو فضیلت آیتِ مذکورہ میں بتلائی گئی: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا یعنی ''ہم نے تمہیں ایک معتدل اُمت بنایا ہے'' یہ بولنے اور لکھنے میں تو ایک لفظ ہے، لیکن حقیقت کے اِعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دُنیا میں ہوسکتے ہیں ان سب کے لئے حاوی اور جامع ہے۔

اس میں اُمتِ محمدیہ کو اُمتِ وسط یعنی معتدل اُمت فرما کر یہ بتلا دیا کہ اِنسان کا جوہرِ شرافت وفضیلت ان میں بدرجۂ کمال موجود ہے، اور جس غرض کے لئے یہ آسمان وزمین کا سارا نظام ہے، اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، یہ اُمت اس میں ساری اُمتوں سے ممتاز اور افضل ہے۔

قرآنِ کریم نے اس اُمت کے متعلق اس خاص وصف فضیلت کا بیان مختلف آیات میں مختلف عنوانات سے کیا ہے، سورۂ اَعراف کے آخر میں اُمتِ محمدیہ کے لئے اِرشاد ہوا:-

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿١٨١﴾ (الاعراف)

''یعنی اُن لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہے، ایک ایسی اُمت ہے جو سچی راہ بتلاتے ہیں اور اس کے موافق اِنصاف کرتے ہیں۔''

اس میں اُمتِ محمدیہ کے اِعتدالِ رُوحانی واَخلاقی کو واضح فرمایا ہے، کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں، اور دُوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کسی معاملہ میں نزاع واِختلاف ہوجائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی بے لاگ آسمانی قانون کے ذریعہ کرتے ہیں جس میں کسی قوم یا شخص کے ناجائز مفاد کا کوئی خطرہ نہیں۔

اور سورۂ آلِ عمران میں اُمتِ محمدیہ کے اسی اِعتدالِ مزاج اور اِعتدالِ رُوحانی کے آثار کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ (آل عمران:۱۱۰)

''یعنی تم سب اُمتوں میں بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی ہو، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔''

یعنی جس طرح ان کو رسول سب رسولوں میں افضل نصیب ہوئے، کتاب سب کتابوں میں جامع اور اکمل نصیب ہوئی، اسی طرح ان کو قوموں کا صحت مندانہ مزاج اور اِعتدال بھی اس اعلیٰ پیمانے پر نصیب ہوا کہ وہ سب اُمتوں میں بہتر اُمت قرار پائی، اس پر علوم ومعارف کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، اِیمان وعمل وتقویٰ کی تمام شاخیں ان کی قربانیوں سے سرسبز وشاداب ہوں گی، وہ کسی مخصوص ملک واِقلیم میں محصور نہ ہوگی، بلکہ اس کا دائرۂ عمل سارے عالم اور اِنسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہوگا، گویا اس کا وجود ہی اس لئے ہوگا کہ دُوسروں کی خیرخواہی کرے، اور جس طرح ممکن ہو انہیں جنت کے دروازوں پر لا کھڑا کردے۔ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران:۱۱۰) میں اس کی طرف اِشارہ ہے کہ یہ اُمت دُوسروں

کی خیر خواہی اور فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے، اس کا فرضِ منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے، برے کاموں سے روکے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشاد: "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ"[1] کا یہی مطلب ہے کہ دِین اس کا نام ہے کہ سب مسلمانوں کی خیر خواہی کرے۔ پھر برے کاموں میں کفر، شرک، بدعات، رُسومِ قبیحہ، فسق و فجور اور ہر قسم کی بداَخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں، اُن سے روکنا بھی کئی طرح ہوگا، کبھی زبان سے، کبھی ہاتھ سے، کبھی قلم سے، کبھی تلوار سے، غرض ہر قسم کا جہاد اس میں داخل ہوگیا یہ صفت جس قدر عموم و اہتمام سے اُمتِ محمدیہ میں پائی گئی پہلی اُمتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۳- اب تیسری بات غور طلب یہ رہ گئی کہ اس اُمت کے توسط و اِعتدال کا واقعات سے ثبوت کیا ہے، اس کی تفصیل طویل اور تمام اُمتوں کے اِعتقادات، اعمال و اخلاق اور کارناموں کا موازنہ کرکے بتلانے پر موقوف ہے، اس میں سے چند چیزیں بطورِ مثال ذِکر کی جاتی ہیں۔

اِعتقادی اِعتدال

سب سے پہلے اِعتقادی اور نظری اِعتدال کو لے لیجئے، تو پچھلی اُمتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ کے رسولوں کو اس کا بیٹا بنالیا، اوران کی عبادت اور پرستش کرنے لگے: وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللہِ وَقَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللہِ (التوبہ:۳۰)۔ اور دُوسری طرف انہی قوموں کے دُوسرے اَفراد کا یہ عالم بھی مشاہدہ میں آئے گا کہ رسول کے مسلسل معجزات دیکھنے اور برتنے کے باوجود جب اُن کا رسول ان کو کسی جنگ و جہاد کی دعوت دیتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں: فَاذْھَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا ھٰھُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ (المائدۃ) (یعنی جایئے آپ اور آپ کا پروردگار وہی مخالفین سے قتال کریں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں)۔ کہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اپنے انبیاء کو خود ان کے ماننے والے طرح طرح کی اِیذائیں پہنچاتے ہیں۔

بخلاف اُمتِ محمدیہ کے کہ وہ ہر قرن، ہر زمانے میں ایک طرف تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ عشق و محبت رکھتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی جان و مال اور اولاد و آبرو سب کو قربان کردیتے ہیں ؎

سلام اُس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں

اور دُوسری طرف یہ اِعتدال کہ رسول کو رسول اور خدا کو خدا سمجھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو باایں ہمہ کمالات و فضائل "عَبْدُ اللہِ وَرَسُوْلُہٗ" مانتے اور کہتے ہیں، وہ آپ کے مدائح و مناقب میں بھی یہ پیمانہ رکھتے ہیں جو

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان ان الدین النصیحۃ ج:۱ ص:۵۴

قصیدۂ بردہ میں فرمایا ۔

دَعْ مَا ادَّعَتْہُ النَّصَارٰی فِیْ نَبِیِّھِمْ
وَاحْکُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِیْہِ وَاحْتَکِمْ

"یعنی اس کلمۂ کفر کو تو چھوڑ دو جو نصاریٰ نے اپنے نبی کے بارے میں کہہ دیا (کہ وہ معاذ اللہ خود خدا، یا خدا کے بیٹے ہیں) اس کے سوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثنا میں جو کچھ کہو وہ سب حق وصحیح ہے۔"

جس کا خلاصہ کسی نے ایک مصرع میں اس طرح بیان کر دیا ۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر [۱]

عمل اور عبادت میں اِعتدال

اِعتقاد کے بعد عمل اور عبادت کا نمبر ہے، اس میں ملاحظہ فرمایئے پچھلی اُمتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اپنی شریعت کے اَحکام کو چند ٹکوں کے بدلے فروخت کیا جاتا ہے، رِشوتیں لے کر آسمانی کتاب میں ترمیم کی جاتی ہے، یا غلط فتوے دیئے جاتے ہیں، اور طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے شرعی اَحکام کو بدلا جاتا ہے، عبادت سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے، اور دُوسری طرف عبادت خانوں میں آپ کو ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جنھوں نے ترکِ دُنیا کر کے رَہبانیت اِختیار کر لی، وہ خدا کی دی ہوئی حلال نعمتوں سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھتے اور سختیاں جھیلنے ہی کو عبادت وثواب سمجھتے ہیں۔

اُمتِ محمدیہ نے اس کے خلاف ایک طرف رَہبانیت کو اِنسانیت پر ظلم قرار دِیا، اور دُوسری طرف اَحکامِ خدا ورسول پر مرمٹنے کا جذبہ پیدا کیا، اور قیصر وکسریٰ کے تخت وتاج کے مالک بن کر دُنیا کو یہ دِکھلا دِیا کہ دیانت وسیاست میں یا دِین ودُنیا میں بیر نہیں، مذہب صرف مسجدوں یا خانقاہوں کے گوشوں کے لئے نہیں آیا بلکہ اس کی حکمرانی بازاروں اور دفتروں پر بھی ہے، اور وزارتوں اور اِمارتوں پر بھی، اس نے بادشاہی میں فقیری اور فقیری میں بادشاہی سکھلائی ۔

چو فقر اندر لباسِ شاہی آمد
ز تدبیرِ عبید اللّٰہی آمد [۲]

معاشرتی اور تمدنی اِعتدال

اس کے بعد معاشرت اور تمدن کو دیکھئے، تو پچھلی اُمتوں میں آپ ایک طرف یہ بے اِعتدالی دیکھیں گے کہ اِنسانی

---

[۱] ترجمہ:- قصہ مختصر یہ ہے کہ خدا کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی بڑے ہیں۔

[۲] ترجمہ:- فقیر شاہانہ انداز میں رہے یہ چیز اللہ تعالیٰ کی عبادت سے پیدا ہوتی ہے۔

حقوق کی کوئی پروا نہیں، حق ناحق کی کوئی بحث نہیں، اپنی اَغراض کے خلاف جس کو دیکھا اس کو کچل ڈالنا، قتل کر دینا، لوٹ لینا سب سے بڑا کمال ہے، ایک رئیس کی چراگاہ میں کسی دُوسرے کا اُونٹ گھس گیا، اور وہاں کچھ نقصان کر دیا تو عرب کی مشہور جنگ حرب بسوس مسلسل سو برس جاری رہی، ہزاروں اِنسانوں کا خون ہوا، عورتوں کو اِنسانی حقوق دینا تو کجا زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی، کہیں بچپن ہی میں ان کو زِندہ درگور کر دینے کی رسم تھی، کہیں مردہ شوہروں کے ساتھ ستی کر کے جلا ڈالنے کا رِواج تھا، اس کے بالمقابل دُوسری طرف یہ سفیہانہ رحم دلی کہ کیڑے مکوڑوں کی ہتھیا کو حرام سمجھیں، جانوروں کے ذبیحہ کو حرام قرار دیں، خدا کے حلال کئے ہوئے جانوروں کے گوشت و پوست سے نفع اُٹھانے کو ظلم سمجھیں، اُمتِ محمدیہ اور اس کی شریعت نے ان سب بے اِعتدالیوں کا خاتمہ کیا، ایک طرف اِنسان کو اِنسان کے حقوق بتلائے، اور نہ صرف صلح و دوستی کے وقت بلکہ عین میدانِ جنگ میں مخالفین کے حقوق کی حفاظت سکھلائی، عورتوں کو مردوں کی طرح حقوق عطا فرمائے، اور دُوسری طرف ہر چیز کی حد مقرّر فرمائی، جس سے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کو جرم قرار دِیا، اور اپنے حقوق کے معاملہ میں درگزر اور عفو و چشم پوشی کا سبق سکھلایا، دُوسروں کے حقوق کا پورا اہتمام کرنے کے آداب سکھلائے۔

اِقتصادی اور مالی اِعتدال

اس کے بعد دُنیا کی ہر قوم و ملت میں سب سے اہم مسئلہ معاشیات اور اِقتصادیات کا ہے، اس میں بھی دُوسری قوموں اور اُمتوں میں طرح طرح کی بے اِعتدالیاں نظر آئیں گی، ایک طرف نظامِ سرمایہ داری ہے جس میں حلال و حرام کی قیود سے اور دُوسرے لوگوں کی خوش حالی یا بدحالی سے آنکھیں بند کر کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لینا سب سے بڑی اِنسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے، تو دُوسری طرف شخصی اور اِنفرادی ملکیت ہی کو سرے سے جرم قرار دِیا جاتا ہے، اور غور کرنے سے دونوں اِقتصادی نظاموں کا حاصل مال و دولت کی پرستش اور اس کو مقصدِ زندگی سمجھنا اور اس کے لئے دوڑ دُھوپ ہے۔

اُمتِ محمدیہ اور اس کی شریعت نے اس میں بھی اِعتدال کی عجیب و غریب صورت پیدا کی، کہ ایک طرف تو دولت کو مقصدِ زندگی بنانے سے منع فرمایا، اور اِنسانی عزّت و شرافت یا کسی منصب و عہدہ کا مدار اس پر نہیں رکھا، اور دُوسری طرف تقسیمِ دولت کے ایسے پاکیزہ اُصول مقرّر کئے جن سے کوئی اِنسان ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے، اور کوئی فرد ساری دولت کو نہ سمیٹ لے، قابلِ اِشتراک چیزوں کو مشترک اور وقفِ عام رکھا، مخصوص چیزوں میں اِنفرادی ملکیت کا مکمل اِحترام کیا، حلال مال کی فضیلت، اس کے رکھنے اور اِستعمال کرنے کے صحیح طریقے بتلائے، اس کی تفصیل اس قدر طویل ہے کہ ایک مستقل بیان کو چاہتی ہے، اس وقت بطورِ مثال چند نمونے اِعتدال اور بے اِعتدالی کے پیش کرنے تھے، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے جس سے آیتِ مذکورہ کا مضمون واضح ہوگیا کہ اُمتِ محمدیہ کو ایک معتدل اور بہترین اُمت بنایا گیا ہے۔

شہادت کے لئے عدل وثقہ ہونا شرط ہے

لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ، یعنی اُمتِ محمدیہ کو وسط اور عدل وثقہ اس لئے بنایا گیا کہ یہ شہادت دینے کے قابل ہوجائیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص عدل نہیں وہ قابلِ شہادت نہیں، عدل کا ترجمہ ثقہ یعنی قابلِ اِعتماد کیا جاتا ہے، اس کی پوری شرائط کتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔

اِجماع کا حجت ہونا

قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ آیت اِجماعِ اُمت کے حجت ہونے پر ایک دلیل ہے کیونکہ جب اس اُمت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء قرار دے کر دُوسری اُمتوں کے بالمقابل ان کی بات کو حجت بنادیا، تو ثابت ہوا کہ اس اُمت کا اِجماع حجت ہے، اور عمل اس پر واجب ہے، اس طرح کہ صحابہ کرامؓ کا اِجماع تابعینؒ پر، اور تابعینؒ کا اِجماع تبع تابعینؒ پر حجت ہے۔ [۱]

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اس اُمت کے جو افعال واعمال متفق علیہ ہیں وہ سب محمود ومقبول ہیں، کیونکہ اگر سب کا اِتفاق کسی خطا پر تسلیم کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ یہ اُمت وسط اور عدل ہے۔ [۲]

اور اِمام جصّاصؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ ہر زمانے کے مسلمانوں کا اِجماع معتبر ہے، اِجماع کا حجت ہونا صرف قرنِ اوّل یا کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، کیونکہ آیت میں پوری اُمت کو خطاب ہے، اور اُمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف وہ نہ تھے جو اُس زمانے میں موجود تھے، بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپ کی اُمت ہیں، تو ہر زمانے کے مسلمان شہداء اللہ ہوگئے، جن کا قول حجت ہے، وہ سب کسی خطا اور غلط پر متفق نہیں ہوسکتے۔ [۳]

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ

اور نہیں مقرّر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ کہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع رہے گا رسول کا

---

[۱] تفسير القرطبي تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۵۶

[۲] تفسير المظهري تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۱۳۹

[۳] احكام القرآن للجصّاصؒ، باب القول في صحة الإجماع ج:۱ ص:۸۸، ۸۹

مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۚ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۗ

اور کون پھر جائے گا اُلٹے پاؤں، اور بے شک یہ بات بھاری ہوئی مگر اُن پر جن کو راہ دِکھائی اللہ نے،

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا ایمان بے شک اللہ لوگوں پر بہت شفیق نہایت مہربان ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جس قبلے پر تم پہلے کاربند تھے، اُسے ہم نے کسی اور وجہ سے نہیں، بلکہ صرف یہ دیکھنے کے لئے مقرّر کیا تھا کہ کون رسول کا حکم مانتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے؟ اور اِس میں شک نہیں کہ یہ بات تھی بڑی مشکل، لیکن اُن لوگوں کے لئے (ذرا بھی مشکل نہ ہوئی) جن کو اللہ نے ہدایت دے دی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردے۔ درحقیقت اللہ لوگوں پر بہت شفقت کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۴۳﴾

خلاصۂ تفسیر

(اور اصل میں تو شریعتِ محمدیہ کے لئے ہم نے کعبہ ہی قبلہ تجویز کر رکھا تھا) اور جس سمتِ قبلہ پر آپ (چند روز قائم) رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس) وہ تو محض اس (مصلحت کے) لئے تھا کہ ہم کو (ظاہری طور پر بھی) معلوم ہو جاوے کہ (اس کے مقرّر ہونے سے یا بدلنے سے یہود اور غیر یہود میں سے) کون تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِتباع اِختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے (اور نفرت اور مخالفت کرتا ہے، اس اِمتحان کے لئے اس عارضی قبلہ کو مقرّر کیا تھا، پھر اصلی قبلہ سے اس کو منسوخ کر دیا) اور یہ قبلہ کا بدلنا (منحرف لوگوں پر) ہوا بڑا ثقیل (ہاں) مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے (سیدھے طریق کی) ہدایت فرمائی ہے (جس کا بیان اُوپر آچکا ہے کہ اَحکامِ اِلٰہیہ کو بے چون وچرا قبول کر لینا اُن کو کچھ بھی گراں نہیں ہوا، جیسا پہلے اس کو خدا کا حکم سمجھتے تھے، اب اس کو سمجھنے لگے) اور (ہم نے جو کہا ہے کہ بیت المقدس قبلۂ غیر اَصلی تھا، اس سے کوئی شخص یہ وسوسہ نہ لاوے بس تو جتنی نمازیں اُدھر پڑی ہیں ان میں ثواب بھی کم ملا ہوگا، کیونکہ اصلی قبلہ کی طرف نہ تھیں، سو اس وسوسے کو دِل میں نہ لانا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے نہیں کہ تمہارے اِیمان (کے متعلق اعمال مثلاً نماز کے ثواب) کو ضائع (اور ناقص) کر دیں (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (ایسے) لوگوں پر بہت ہی شفیق (اور) مہربان ہیں (تو ایسے شفیق

مہربان پر یہ گمان کب ہوسکتا ہے، کیونکہ کسی قبلہ کا اصلی یا غیرِ اصلی ہونا تو ہم ہی جانتے ہیں، تم نے تو دونوں کو ہمارا حکم سمجھ کر قبول کیا، اس لئے ثواب بھی کسی کا کم نہ ہوگا)

معارف ومسائل

کعبہ کے قبلۂ نماز ہونے کی اِبتدا کب ہوئی

اس میں صحابہؓ وتابعینؒ کا اختلاف ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں جب نماز فرض ہوئی اس وقت قبلہ بیت اللہ تھا یا بیت المقدس، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول یہ ہے کہ اوّل ہی سے قبلہ بیت المقدس تھا، جو ہجرت کے بعد بھی سولہ سترہ مہینے تک باقی رہا، اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے اَحکام نازل ہوگئے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مکہ مکرمہ میں یہ رہا کہ آپ حجرِ اَسوَد اور رُکنِ یمانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے، تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس کا بھی اِستقبال ہوجائے، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ رہا، اس لئے تحویلِ قبلہ کا اشتیاق پیدا ہوا۔ (ابنِ کثیر) [1]

اور دُوسرے حضرات نے فرمایا کہ جب نماز فرض ہوئی مکہ مکرمہ میں تو مسلمانوں کا ابتدائی قبلہ بیت اللہ ہی تھا، کیونکہ حضرت اِبراہیم واِسماعیل علیہما السلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی رہا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، بیت اللہ ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے، پھر ہجرت کے بعد آپ کا قبلہ بیت المقدس قرار دے دیا گیا، اور مدینہ منورہ میں سولہ سترہ مہینے آپ نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، اس کے بعد پھر آپ کا جو پہلا قبلہ تھا یعنی بیت اللہ اسی کی طرف نماز میں توجہ کرنے کا حکم آ گیا۔ تفسیر قرطبی میں بحوالۂ ابو عمرو اسی کو اَصح القولین قرار دِیا ہے، اور حکمت اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد چونکہ قبائل یہود سے سابقہ پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مانوس کرنے کے لئے انہی کا قبلہ باذنِ خداوندی اختیار کرلیا، مگر پھر تجربے سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی سے باز آنے والے نہیں، تو پھر آپ کو اپنے اصلی قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم مل گیا، جو آپ کو اپنے آباءِ اِبراہیم واِسماعیل کا قبلہ ہونے کی وجہ سے طبعاً محبوب تھا۔

اور قرطبیؒ نے ابوالعالیہ ریاحیؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کا قبلہ بھی بیت اللہ کی طرف تھا، اور پھر ابوالعالیہؒ نے نقل کیا ہے کہ ان کا ایک یہودی سے مناظرہ ہوگیا، یہودی نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کا قبلہ صخرۂ بیت المقدس تھا، ابوالعالیہؒ نے کہا کہ نہیں، موسیٰ علیہ السلام صخرۂ بیت المقدس کے پاس نماز پڑھتے تھے مگر آپ کا رُخ بیت اللہ ہی کی طرف ہوتا تھا، یہودی نے اِنکار کیا تو ابوالعالیہؒ نے کہا کہ اچھا میرے تمہارے جھگڑے کا فیصلہ حضرت صالح علیہ السلام

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۴۵۳

کی مسجد کردے گی جو بیت المقدس کے نیچے ایک پہاڑ پر ہے، دیکھا گیا تو اس کا قبلہ بیت اللہ کی طرف تھا۔ [1]

اور جن حضرات نے پہلا قول اختیار کیا ہے ان کے نزدیک حکمت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں تو مشرکین سے اِمتیاز اور اُن سے مخالفت کا اِظہار کرنا تھا، اس لئے ان کا قبلہ چھوڑ کر بیت المقدس کو قبلہ بنادیا گیا، پھر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں یہود و نصاریٰ سے اِمتیاز اور ان کی مخالفت کا اِظہار مقصود ہوا تو اُن کا قبلہ بدل کر بیت اللہ کو قبلہ بنادیا گیا، اسی اِختلافِ اقوال کی بنا پر آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں بھی اِختلاف ہوگیا کہ اَلْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ سے کیا مراد ہے؟ قولِ اوّل کی بنا پر اس سے مراد بیت المقدس ہے، جو آپ کا قبلۂ اُولیٰ تھا، اور قولِ ثانی کی بنا پر اس سے مراد کعبہ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ وہی آپ کا پہلا قبلہ تھا۔

اور مفہوم آیت کا دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ ہم نے تحویلِ قبلہ کو آپ کا اِتباع کرنے والے مسلمانوں کے لئے ایک اِمتحان قرار دِیا ہے، تاکہ ظاہر طور پر معلوم ہوجائے کہ کون آپ کا صحیح فرمانبردار ہے اور کون اپنی رائے کے پیچھے چلتا ہے، چنانچہ تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد بعض ضعیف الایمان، یا وہ جن کے دِلوں میں کچھ نفاق تھا، اِسلام سے پھر گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اِلزام لگایا کہ یہ تو اپنی قوم کے دِین کی طرف پھر گئے۔

بعض اَحکام متعلقہ

کبھی سنت کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جاتا ہے

جصّاصؒ نے ''احکام القرآن [2]'' میں فرمایا کہ قرآنِ کریم میں کہیں اس کی تصریح نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل از ہجرت یا بعدِ ہجرت بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ اس کا ثبوت صرف اَحادیث اور سنتِ نبویہ ہی سے ہے، تو جو چیز سنت کے ذریعہ ثابت ہوئی تھی اس آیتِ قرآنی نے اس کو منسوخ کرکے آپ کا قبلہ بیت اللہ کو بنادیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ حدیثِ رسول بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی ہے، اور یہ کہ کچھ اَحکام وہ بھی ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں، صرف حدیث سے ثابت ہیں، اور قرآن ان کی شرعی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، کیونکہ اسی آیت کے اَخیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو نمازیں بامرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف پڑھی گئیں وہ بھی معتبر اور مقبول عند اللہ ہیں۔

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۲ ص:۱۵۱

[2] احکام القرآن للجصّاصؒ ج:۱ ص:۸۶

خبرِ واحد جبکہ قرائنِ قویہ اس کے ثبوت پر موجود ہوں اس سے قرآنی حکم منسوخ سمجھا جاسکتا ہے

بخاری و مسلم اور تمام معتبر کتبِ حدیث میں متعدّد صحابہ کرامؓ کی روایت سے منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہوا، اور آپ نے عصر کی نماز جانب بیت اللہ پڑھی، [۱] (اور بعض روایات میں اس جگہ عصر کے بجائے ظہر مذکور ہے) (ابن کثیر) [۲] تو بعض صحابہ کرامؓ یہاں سے نماز پڑھ کر باہر گئے، اور دیکھا کہ قبیلہ بنی سلمہ کے لوگ اپنی مسجد میں حسبِ سابق بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں تو انہوں نے آواز دے کر کہا کہ اب قبلہ بیت اللہ کی طرف ہوگیا ہے، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بجانب بیت اللہ نماز پڑھ کر آئے ہیں، ان لوگوں نے درمیانِ نماز ہی اپنا رُخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیرلیا۔ نویلہ بنت مسلم کی روایت میں ہے کہ اس وقت عورتیں جو پچھلی صفوں میں تھیں آگے آگئیں اور مرد جو اگلی صفوں میں تھے پیچھے آگئے، اور جب رُخ بیت اللہ کی طرف بدلا گیا تو مردوں کی صفیں آگے اور عورتوں کی پیچھے ہوگئیں۔ (ابنِ کثیر) [۳]

بنو سلمہ کے لوگوں نے تو ظہر یا عصر ہی سے تحویلِ قبلہ کے حکم پر عمل کرلیا، مگر قباء میں یہ خبر اگلے دِن صبح کی نماز میں پہنچی، جیسا کہ بخاری و مسلم میں بروایت ابنِ عمرؓ مذکور ہے، [۴] اہلِ قباء نے بھی نماز ہی کے اندر اپنا رُخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیرلیا۔ (ابنِ کثیر و جصّاص) [۵]

اِمام جصّاصؒ نے یہ متعدد روایاتِ حدیث نقل کرکے فرمایا:-

هٰذَا خَبَرٌ صَحِيْحٌ مُّسْتَفِيْضٌ فِيْ اَيْدِيْ اَهْلِ الْعِلْمِ قَدْ تَلَقَّوْهُ بِالْقُبُوْلِ فَصَارَ فِيْ حَيِّزِ التَّوَاتُرِ الْمُوْجِبِ لِلْعِلْمِ۔ [۶]

"یعنی یہ حدیث اگرچہ اصل سے خبرِ واحد ہے، مگر قرائنِ قویہ کی وجہ سے اس نے درجہ تواتر کا حاصل کرلیا ہے، جو علمِ یقین کا موجب ہوتا ہے۔"

مگر حنفیہ اور ان کے متفق فقہاء جن کا ضابطہ یہ ہے کہ خبرِ واحد سے کوئی قطعی حکم منسوخ نہیں ہوسکتا، اُن پر یہ سوال اب بھی باقی رہتا ہے کہ اس حدیث کی شہرت اور تلقی بالقبول تو بعد میں ہوئی، بنو سلمہ اور اہلِ قباء کو تو اچانک ایک ہی آدمی نے

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب الصلوٰة، باب التوجه نحو القبلة ...إلخ ج:۱ ص:۵۷ وصحیح مسلم، کتاب الصلوٰة، باب تحویل القبلة ...إلخ ج:۱ ص:۲۰۰

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۴۵۳ وسنن النسائی الکبریٰ رقم الحدیث:۱۱۰۰۴

[۳] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۴۶۰ [۴] بحوالۂ بالا۔

[۵] احکام القرآن للجصّاصؒ ج:۱ ص:۸۷ [۶] بحوالۂ بالا۔

خبر دی تھی، اس وقت اس حدیث کو درجۂ شہرت وتواتر حاصل نہیں تھا، انہوں نے اس پر کیسے عمل کرلیا۔ جصّاصؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات اور سب صحابہؓ کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رغبت یہ ہے کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ کردیا جائے، اور آپ اس کے لئے دُعا بھی کررہے ہیں، اس رغبت ودُعا کی وجہ سے ان حضرات کی نظر میں اِستقبالِ بیت المقدس کا حکم آئندہ باقی نہ رہنے کا اِحتمال ضرور پیدا ہوگیا تھا، اس اِحتمال کی وجہ سے بقاءِ قبلہ بیت المقدس ظنی ہوگیا تھا، اس کے منسوخ کرنے کے لئے یہ خبرِ واحد کافی ہوگئی، ورنہ محض خبرِ واحد سے کوئی قرآنی قطعی فیصلہ منسوخ ہوجانا معقول نہیں۔

آلۂ مکبّر الصوت کی آواز پر نماز میں نقل وحرکت کے مفسدِ نماز نہ ہونے پر اِستدلال

صحیح بخاری، باب ما جاء فی القبلۃ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں جو قباء میں تحویلِ قبلہ کا حکم پہنچنے اور ان لوگوں کے بحالتِ نماز بیت اللہ کی طرف پھر جانے کا واقعہ ذِکر کیا، اس پر علامہ عینی حنفی نے تحریر فرمایا ہے:-

فِيْهِ جَوَازُ تَعْلِيْمِ مَنْ لَّيْسَ فِي الصَّلٰوةِ مَنْ هُوَ فِيْهَا۔ (عمدۃ القاری ج:۴ ص:۱۴۸)

''یعنی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو شخص نماز میں شریک نہیں وہ کسی نماز پڑھنے والے کو تعلیم وتلقین کرسکتا ہے۔''

نیز علامہ عینی نے دُوسری جگہ اس حدیث کے ذیل میں یہ الفاظ لکھے ہیں: ''وَفِيْهِ اِسْتِمَاعُ الْمُصَلِّي لِكَلَامِ مَنْ لَّيْسَ فِي الصَّلٰوةِ فَلَا يَضُرُّ صَلٰوتَهٗ (اِلٰی) هٰكَذَا اسْتَنْبَطَهُ الطَّحَاوِيُّ۔'' (عمدۃ القاری ج:۱ ص:۲۴۲)

اور عام فقہائے حنفیہ نے جو خارجِ صلوٰۃ کسی شخص کی اِقتدا اور اِتباع کو مفسدِ نماز کہا ہے جو عام متون وشروحِ حنفیہ میں منقول ہے، اس کا منشا یہ ہے کہ نماز میں غیر اللہ کے اَمر کا اِتباع موجبِ فسادِ نماز ہے، لیکن اگر کوئی شخص اِتباع اَمرِ الٰہی کا کرے مگر اس اِتباع میں کوئی دُوسرا شخص واسطہ بن جائے وہ موجبِ فساد نہیں۔

فقہاءؒ نے جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کوئی شخص جماعت میں شریک ہونے کے لئے ایسے وقت پہنچے کہ اگلی صف پوری ہوچکی ہے، اب پچھلی صف میں تنہا رہ جاتا ہے تو اس کو چاہئے کہ اگلی صف میں سے کسی آدمی کو پیچھے کھینچ کر اپنے ساتھ ملالے، اس میں یہی سوال آتا ہے کہ اس کے کہنے سے جو پیچھے آجائے گا وہ نماز میں اِتباع اَمرِ غیر اللہ کا کرے گا، اس لئے اس کی نماز فاسد ہوجانی چاہئے، لیکن درمختار، باب الامامۃ میں اس مسئلے کے متعلق تحریر فرمایا: ''ثُمَّ نُقِلَ تَصْحِيْحُ عَدَمِ الْفَسَادِ فِيْ مَسْئَلَةِ مَنْ جُذِبَ مِنَ الصَّفِّ فَتَاَخَّرَ فَهَلْ ثَمَّ فَرْقٌ فَلْيُحَرَّرْ'' اس پر علامہ طحطاویؒ نے تحریر فرمایا: ''لِاَنَّهٗ امْتَثَلَ اَمْرَ اللهِ'' یعنی اس صورت میں نماز فاسد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت اس شخص نے آنے والے کے حکم کا

اِتباع نہیں کیا، بلکہ اَمرِ الٰہی کا اِتباع کیا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کو پہنچا ہے، کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو اگلی صف والے کو پیچھے آجانا چاہئے۔

اسی طرح شرنبلالیؒ نے شرح وہبانیہ میں اس مسئلہ کا ذِکر کر کے پہلے فسادِ نماز کا قول نقل کیا پھر اس کی تردید کی، اس کے الفاظ یہ ہیں: "اِذَا قِیْلَ لِمُصَلٍّ تَقَدَّمْ، فَتَقَدَّمَ (اِلٰی) فَسَدَتْ صَلٰوتُهٗ لِاَنَّهٗ امْتَثَلَ اَمْرَ غَیْرِ اللّٰهِ فِی الصَّلٰوةِ، لِاَنَّ امْتِثَالَهٗ اِنَّمَا هُوَ لِاَمْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَا یَضُرُّ اھ"۔ [1]

ان تمام روایات سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی نمازی ایسے شخص کی آواز پر عمل کرے جو اس کے ساتھ نماز میں شریک نہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ خود اس شخص کی دِلداری اور اِتباع مقصود ہو تو یہ مفسدِ نماز ہے، لیکن اگر اس نے کوئی حکم شرعی بتلایا اور اس کا اِتباع نمازی نے کرلیا تو وہ درحقیقت اَمرِ الٰہی کا اِتباع ہے، اس لئے مفسدِ نماز نہیں ہوگا، اسی لئے طحطاویؒ نے فیصلہ یہی کیا ہے کہ: "اَقُوْلُ لَوْ قِیْلَ بِالتَّفْصِیْلِ بَیْنَ کَوْنِهٖ امْتَثَلَ اَمْرَ الشَّارِعِ فَلَا تَفْسُدُ وَبَیْنَ کَوْنِهٖ امْتَثَلَ اَمْرَ الدَّاخِلِ مُرَاعَاةً لِّخَاطِرِهٖ مِنْ غَیْرِ نَظَرٍ لِاَمْرِ الشَّارِعِ فَتَفْسُدُ لَکَانَ حَسَنًا۔" (طحطاوی علی الدر ج:۱ ص:۲۴۶)

اب مسئلہ زیرِ بحث یعنی آلۂ مکبّر الصوت کا فیصلہ کرلینا آسان ہوگیا، کیونکہ وہاں اس آلے کے اِتباع کا دُور دُور بھی وہم نہیں ہوسکتا، ظاہر ہے کہ اِتباع رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کا ہوتا ہے کہ جب اِمام رُکوع کرے تو رُکوع کرو، جب سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو، اس آلے سے صرف یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اب اِمام رُکوع میں گیا، یا سجدہ میں جارہا ہے، اس علم کے بعد اِتباع اِمام کا کرتا ہے نہ کہ اس آلے کے حکم کا، اور اِتباعِ اِمام ایک حکمِ اِلٰہی ہے۔ اور یہ کلام اس بنیاد پر ہے کہ آلہ مکبّر الصوت کی آواز کو عین اِمام کی آواز نہ مانی جائے بلکہ اس کی نقل وحکایت قرار دِیا جائے، اور اہلِ فن اس کی آواز کو عین آوازِ اِمام کہتے ہیں، ان کی تحقیق پر تو کوئی اِشکال جوازِ صلوٰۃ میں نہیں ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر احقر کا ایک مستقل مفصل رسالہ بھی شائع شدہ ہے اس کو دیکھ لیا جائے، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ أعلم۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ یہاں اگر اِیمان سے مراد اس کے معروف معنی لئے جائیں تو مطلب آیت کا یہ ہے کہ تحویلِ قبلہ پر جو بعض بیوقوف لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ دِین سے منحرف ہوگئے اور ان کا اِیمان ہی ضائع ہوگیا، اس کا جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اِیمان کو ضائع کرنے والے نہیں، بے وقوف لوگوں کے کہنے پر کان نہ دھریں۔

اور بعض روایاتِ حدیث اور اَقوالِ سلف میں اس جگہ اِیمان کی تفسیر نماز سے کی گئی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جو نمازیں سابقہ قبلہ بیت المقدس کی طرف پڑھی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ضائع کرنے والا نہیں، وہ تو صحیح ومقبول ہوچکیں، تحویلِ قبلہ کے حکم کا پچھلی نمازوں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

---

[1] الشامیة، باب الإمامة ج:۱ ص:۵۷۰، ۵۷۱

صحیح بخاری میں بروایت ابنِ عازبؓ، اور ترمذی میں بروایت ابنِ عباسؓ منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا گیا تو لوگوں نے سوال کیا کہ جو مسلمان اس عرصے میں انتقال کر گئے جبکہ نماز بیت المقدس کی طرف ہوا کرتی تھی، اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنا ان کو نصیب نہیں ہوا، اُن کا کیا حال ہوگا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں نماز کو ایمان کے لفظ سے تعبیر کر کے واضح کر دیا کہ ان کی نمازیں سب صحیح و مقبول ہو چکی ہیں، ان کے معاملہ میں تحویلِ قبلہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ [1]

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠

بے شک ہم دیکھتے ہیں بار بار اُٹھنا تیرے منہ کا آسمان کی طرف، سو البتہ پھیریں گے ہم تجھ کو جس قبلے کی طرف تو راضی ہے،

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْھَكُمْ

اب پھیر منہ اپنا طرف مسجدالحرام کے اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو منہ

شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ

اسی کی طرف، اور جن کو ملی ہے کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے ان کے ربّ کی طرف سے،

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

اور اللہ بے خبر نہیں اُن کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

(اے پیغمبر!) ہم تمہارے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اُٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ ہم تمہارا رُخ ضرور اُس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جو تمہیں پسند ہے۔ لو اَب اپنا رُخ مسجدِ حرام کی سمت کر لو۔ اور (آئندہ) جہاں کہیں تم ہو اپنے چہروں کا رُخ (نماز پڑھتے ہوئے) اُسی کی طرف رکھا کرو۔ اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہی بات حق ہے جو ان کے پروردگار کی طرف سے آئی ہے۔ اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس سے غافل نہیں ہے۔ ﴿۱۴۴﴾

[1] صحیح البخاری، کتاب الإیمان، بابٌ الصلوة من الإیمان ...إلخ ج:۱ ص:۱۰، ۱۱

خلاصۂ تفسیر

(آپ جو دِل سے کعبہ کے قبلہ ہونے کی خواہش رکھتے ہیں، اور اُمیدِ وحی میں بار بار آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر بھی دیکھتے ہیں کہ شاید فرشتہ حکم لے آوے، سو) آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں (اور چونکہ ہمیں آپ کی خوشی پورا کرنا منظور ہے) اس لئے (ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) آپ کو اسی قبلہ کی طرف متوجہ کردیں گے جو آپ کو پسند ہے (لو پھر ہم حکم ہی دیئے دیتے ہیں کہ) اب سے اپنا چہرہ نماز میں مسجدِ حرام کی طرف کیا کیجئے اور (یہ حکم صرف آپ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ سب لوگ پیغمبر بھی اور اُمتی بھی) جہاں کہیں موجود ہو (خواہ مدینہ منورہ میں یا اور جگہ، یہاں تک کہ خود بیت المقدس میں بھی) اپنے چہروں کو اسی (مسجدِ حرام) کی طرف کیا کرو (اور اس قبلے کے مقرّر ہونے کے متعلق) یہ اہلِ کتاب بھی (بالعموم اپنی کتابوں کی پیشین گوئی کی وجہ سے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ اس طرح ہوگا) یقیناً جانتے ہیں کہ یہ حکم بالکل ٹھیک ہے (اور) ان کے پروردگار ہی کی طرف سے ہے (مگر عناداً مانتے نہیں) اور اللہ تعالیٰ ان کی کارروائیوں سے کچھ بے خبر نہیں ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت کے پہلے جملہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِشتیاقِ کعبہ کا ذِکر ہے، اس اِشتیاق کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں اور سب میں کوئی تعارض نہیں وہ سب وجوہ ہوسکتی ہیں، مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی اور عطاءِ نبوّت سے پہلے اپنی طبیعت وفطرت سے ملتِ اِبراہیمی کے تابع کام کرتے تھے، اور نزولِ وحی کے بعد قرآن نے بھی آپ کی شریعت کو ملتِ اِبراہیم کے مطابق قرار دِیا، اور حضرت اِبراہیم وحضرت اِسماعیل علیہما السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا، اس لئے آپ کی دِلی خواہش یہی تھی کہ آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بھی وہی کعبہ بیت اللہ قرار دے دیا جائے۔

یہ وجہ بھی تھی کہ قبائلِ عرب بھی چونکہ ملتِ اِبراہیمی کو کم از کم زبان سے مانتے تھے اور اس کی پیروی کے مدعی تھے، کعبہ کے قبلۂ مسلمین ہوجانے سے ان کے اِسلام کی طرف مائل ہوجانے کی توقع تھی، اور سابق قبلہ بیت المقدس میں جو موافقت اہلِ کتاب کی توقع کی جاسکتی تھی وہ سولہ سترہ مہینے کے عمل کے بعد منقطع ہوچکی تھی، کیونکہ یہودِ مدینہ منورہ کو اس کی وجہ سے کوئی اِسلام سے قرب ہونے کے بجائے بعد ہی بڑھا تھا۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ یعنی کعبہ کو قرار دے دیا جائے، اور چونکہ مقربانِ بارگاہِ الٰہی انبیاء علیہم السلام اپنی کوئی خواہش اور کوئی درخواست حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس وقت تک پیش نہیں

کرتے جب تک اُن کو یہ درخواست پیش کرنے کی اجازت کا علم نہ ہو جائے، اس سے سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا کرنے کی اجازت پہلے مل چکی تھی، اور آپ اس کی دُعا کر رہے تھے اور اس کی قبولیت کے اُمیدوار تھے، اس لئے بار بار آسمان کی طرف نظر اُٹھاتے تھے کہ شاید کوئی فرشتہ حکم لے کر آ جائے، آیتِ مذکورہ میں اس کیفیت کا بیان فرما کر پہلے تو قبولیتِ دُعا کا وعدہ فرمایا، فَلَنُوَلِّيَنَّكَ یعنی ہم آپ کا رُخ اُسی کی طرف پھیر دیں گے جو سمت آپ کو پسند ہے، اس کے فوراً بعد ہی یہ رُخ پھیرنے کا حکم بھی نازل فرما دیا، فَوَلِّ وَجْهَكَ، اس طرزِ عمل میں ایک خاص لطف تھا کہ پہلے وعدہ کی خوشی حاصل ہو، پھر ایفائے وعدہ کی خوشی قندِ مکرّر ہو جائے۔ (یہ سب مضمون قرطبی، بصّاص، مظہری سے لیا گیا ہے) [1]

مسئلہ اِستقبالِ قبلہ

یہ تحقیق پہلے آچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے اعتبار سے تو ساری سمتیں اور ساری جہات برابر ہیں، قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (البقرۃ: ۱۴۲) لیکن مصالحِ اُمت کے لئے بتقاضائے حکمت کسی ایک جہت کو تمام دُنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے لئے قبلہ بنا کر سب میں ایک دینی وحدت کا عملی مظاہرہ مقصود تھا، وہ جہت بیت المقدس بھی ہوسکتی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنانا تجویز کر لیا گیا، اور اسی کا حکم اس آیت میں دیا گیا، اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس جگہ "فَوَلِّ وَجْهَكَ اِلَى الْكَعْبَةِ اَوْ اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ" فرمایا جاتا، مگر قرآنِ حکیم نے یہ عنوان بدل کر شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے الفاظ اختیار فرمائے، اس سے کئی اہم مسائل اِستقبالِ قبلہ کے بارے میں واضح ہو گئے۔

اوّل یہ کہ اگرچہ اصل قبلہ بیت اللہ ہے جس کو "کعبہ" کہا جاتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اصل بیت اللہ کا اِستقبال اسی جگہ تک ہوسکتا ہے جہاں تک بیت اللہ نظر آتا ہے، جو لوگ وہاں سے دُور ہیں، اور بیت اللہ اُن کی نظروں سے غائب ہے اگر ان پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ عین بیت اللہ کی طرف رُخ کرو تو اس کی تعمیل بہت دُشوار ہو جائے، خاص آلات و حسابات کے ذریعے بھی صحیح سمت کا استخراج دُور کے شہروں میں مشکل اور غیر یقینی ہو جائے، اور شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مدار سہولت و آسانی پر رکھا گیا ہے، اس لئے بجائے بیت اللہ یا کعبہ کے مسجدِ حرام کا لفظ رکھا گیا، جو بہ نسبت بیت اللہ کے بہت زیادہ وسیع رقبے پر مشتمل ہے، اس کی طرف رُخ پھیر لینا دُور دُور تک لوگوں کے لئے آسان ہے۔

پھر ایک دُوسری سہولت لفظ شَطْرَ اختیار کر کے دے دی گئی، ورنہ اس سے مختصر لفظ "اِلَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" تھا، اس کو چھوڑ کر شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرمایا گیا۔ "شطر" دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک نصفِ شے، دُوسرے

---

[1] التفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۱۴۲، ۱۴۳ والقرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۱۵۸

سمتِ شے، باتفاقِ مفسرین اس جگہ ''شطر'' سے مراد سمت ہے، تو اس لفظ نے یہ بتلا دیا کہ بلادِ بعیدہ میں یہ بھی ضروری نہیں کہ خاص مسجدِ حرام ہی کی طرف ہر ایک کا رُخ ہو جائے تو نماز دُرست ہو بلکہ سمتِ مسجدِ حرام کافی ہے۔ (بحرمحیط)

مثلاً مشرقی ممالک ہندوستان و پاکستان وغیرہ کے لئے جانبِ مغرب مسجدِ حرام کی سمت ہے، تو مغرب کی جانب رُخ کر لینے سے اِستقبالِ قبلہ کا فرض ادا ہو جائے گا، اور چونکہ گرمی، سردی کے موسموں میں سمتِ مغرب میں بھی اِختلاف ہوتا رہتا ہے، اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے اس سمت کو سمتِ مغرب وقبلہ قرار دِیا ہے جو موسم گرما و سرما کی دونوں مغربوں کے درمیان ہے، اور قواعدِ ریاضی کے حساب سے یہ صورت ہوگی کہ مغربِ صیف اور مغربِ شتا کے درمیان ۴۸ ڈگری تک سمتِ قبلہ قرار دی جائے گی، یعنی ۲۴ ڈگری تک بھی اگر دائیں یا بائیں مائل ہو جائے تو سمتِ قبلہ فوت نہیں ہوگی، نماز دُرست ہو جائے گی، ریاضی کی قدیم اور مشہور کتاب شرح چغمنی باب رابع صفحہ ٦٦ مین دونوں مغربین کا فاصلہ یہی ۴۸ ڈگری قرار دِیا ہے۔ [۱]

سمتِ قبلہ معلوم کرنے کے لئے شرعاً آلاتِ رصدیہ اور حساباتِ ریاضیہ پر مدار نہیں

اس سے اُن لوگوں کی جہالت بھی واضح ہوگئی جنہوں نے ہندوستان و پاکستان کی بہت سی مسجدوں کی سمتِ قبلہ میں معمولی سا فرق دو چار ڈگری کا دیکھ کر یہ فیصلہ کر دیا کہ ان میں نماز نہیں ہوتی، یہ سراسر جہالت ہے، اور بلاوجہ مسلمانوں میں تفریق و اِنتشار پیدا کرنا ہے۔

شریعتِ اِسلامیہ چونکہ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے اور پوری دُنیا کے ممالک کے لئے ہے، اس لئے اَحکامِ شرعیہ کو ہر شعبے میں اتنا آسان رکھا گیا ہے کہ ہر گاؤں، جنگل، پہاڑ، جزیرہ میں بسنے والے مسلمان اس پر اپنے مشاہدہ سے عمل کر سکیں، کسی مرحلے میں حسابات، ریاضی، یا اصطرلاب وغیرہ آلات کی ضرورت نہ پڑے، ۴۸ ڈگری تک کی وسیع سمتِ مغرب اہلِ مشرق کا قبلہ ہے، اس میں پانچ دس ڈگری کا فرق ہو بھی جائے تو اس سے نمازوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے اس کی اور وضاحت ہو جاتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ''مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ'' (رواہ الترمذی عن ابی ہریرة) [۲] یعنی مشرق ومغرب کے درمیان قبلہ ہے، آپ کا یہ اِرشاد مدینہ طیبہ والوں کے لئے تھا، کیونکہ ان کا قبلہ مشرق ومغرب کے درمیان جانبِ جنوب واقع تھا، اس حدیث نے گویا شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے لفظ کی تشریح کر دی کہ مسجدِ حرام کی سمت کافی ہے۔ البتہ بناءِ مسجد کے وقت اس کی کوشش بہتر ہے کہ ٹھیک بیت اللہ کے رُخ سے جتنا قریب ہو سکے وہ کر لیا جائے۔ صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحینؒ کا طریقہ تو اس دریافت کے لئے سیدھا

---

[۱] حضرت والد صاحبؒ نے ''جواہر الفقہ'' میں فقہاء کا دُوسرا قول ذِکر کیا ہے کہ ۴۵ درجے دائیں یا بائیں مائل ہونے سے سمتِ قبلہ فوت نہیں ہوگی۔ محمد تقی

[۲] جامع الترمذی، ابواب الصلوٰة، باب ما جاء أن بین المشرق والمغرب قبلة ج:۱ ص:۷۹

سادہ یہ تھا کہ جس جگہ صحابہ کرامؓ کی بنائی ہوئی کوئی مسجد ہوتی اس سے اس کے قرب و جوار کی مسجدوں کا رُخ سیدھا کرلیا، پھر اُن کے قرب و جوار کا ان کے ذریعہ، اسی طرح تمام عالم میں مساجد کا رُخ تجویز کیا گیا ہے، اس لئے بلادِ بعیدہ میں سمت قبلہ معلوم کرنے کا صحیح طریقہ جو سلف سے چلا آتا ہے یہ ہے کہ جن بلاد میں مساجدِ قدیمہ موجود ہیں ان کا اتباع کیا جائے، کیونکہ اکثر بلاد میں تو حضراتِ صحابہؓ و تابعینؒ نے مساجد کی بنیادیں ڈالی ہیں، اور سمتِ قبلہ متعین فرمائی ہے، اور پھر انہیں دیکھ کر دُوسری بستیوں میں مسلمانوں نے اپنی اپنی مساجد بنائی ہیں۔

اس لئے یہ سب مساجدِ مسلمین سمتِ قبلہ معلوم کرنے کے لئے کافی ووافی ہیں، ان میں بلاوجہ شبہاتِ فلسفیہ نکالنا شرعاً محمود نہیں، بلکہ مذموم اور موجبِ تشویش ہے، بلکہ بسا اوقات ان تشویشات میں پڑنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ حضراتِ صحابہؓ و تابعینؒ اور عامۃ المسلمین پر بدگمانی ہو جاتی ہے کہ ان کی نمازیں اور قبلہ دُرست نہیں، حالانکہ یہ باطلِ محض اور سخت جسارت ہے، آٹھویں صدی ہجری کے مشہور و معروف عالم ابن رجب حنبلیؒ اسی بنا پر سمتِ قبلہ میں آلاتِ رصدیہ اور تدقیقاتِ ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں، ولفظہ[1]:-

وَاَمَّا عِلْمُ التَّسْيِيْرِ فَإِذَا تَعَلَّمَ مِنْهُ مَا يَحْتَاجُ إِلَيْهِ لِلْاِسْتِهْدَاءِ وَمَعْرِفَةِ الْقِبْلَةِ وَالطُّرُقِ كَانَ جَائِزًا عِنْدَ الْجُمْهُوْرِ وَمَا زَادَ عَلَيْهِ فَلَا حَاجَةَ إِلَيْهِ وَهُوَ يُشْغِلُ عَمَّا هُوَ اَهَمُّ مِنْهُ وَرُبَمَا اَدّى التَّدْقِيْقُ فِيْهِ إِلٰى إِسَاءَةِ الظَّنِّ بِمَحَارِيْبِ الْمُسْلِمِيْنَ فِيْ اَمْصَارِهِمْ كَمَا وَقَعَ فِيْ ذٰلِكَ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ هٰذَا الْعَمَلِ قَدِيْمًا وَّحَدِيْثًا وَّذٰلِكَ يُفْضِيْ إِلَى اعْتِقَادِ خَطَاءِ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ فِيْ صَلَوَاتِهِمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْصَارِ وَهُوَ بَاطِلٌ وَقَدْ اَنْكَرَ الْإِمَامُ اَحْمَدُ الْإِسْتِدْلَالَ بِالْجُدَيِّ وَقَالَ إِنَّمَا وَرَدَ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ۔

"لیکن علم تسییر سو اس کو اس قدر حاصل کرنا جمہور کے نزدیک جائز ہے جس سے راہ یابی اور قبلہ اور راستوں کی شناخت ہو سکے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کہ وہ (یعنی زیادہ سیکھنا) اُمورِ ضروریہ سے غافل کردے گا، اور بعض مرتبہ تدقیقاتِ فلکیہ میں پڑنا عامۂ بلادِ اسلامیہ میں جو مسلمانوں کی مسجدیں ہیں ان کے متعلق بدگمانی پیدا کردیتا ہے، اس فن میں مشغول ہونے والوں کو ہمیشہ اس قسم کے شبہات پیش آتے ہیں، اس سے یہ بھی اعتقاد پیدا ہوگا کہ بہت سے شہروں میں صحابہؓ و تابعینؒ کی نمازیں غلط طریقے پر تھیں، اور یہ بالکل لغو و باطل ہے، امام احمدؒ نے (ستارۂ) جدی (جس کو ہمارے بلاد میں "قطب" کہتے ہیں) سمتِ قبلہ میں اس سے استدلال کرنے کو منع کیا، اور فرمایا کہ حدیث شریف میں

[1] ولفظہ: یعنی ان کے الفاظ یہ ہیں۔

(صرف) مابین المشرق والمغرب قبلہ آیا ہے، یعنی مشرق ومغرب کے درمیان پوری جہت قبلہ ہے۔"

اور جن جنگلات یا نوآبادیات وغیرہ میں مساجدِ قدیمہ موجود نہ ہوں وہاں شرعی طریقہ جو سنتِ صحابہؓ وتابعینؒ سے ثابت ہے یہ ہے کہ شمس وقمر اور قطب وغیرہ کے مشہور ومعروف ذرائع سے اندازہ قائم کر کے سمتِ قبلہ متعین کرلی جاوے، اگر اس میں معمولی انحراف ومیلان بھی رہے تو اس کو نظر انداز کیا جاوے کیونکہ حسبِ تصریح صاحبِ بدائع ان بلادِ بعیدہ میں تحری اور اندازہ سے قائم کردہ جہت ہی قائم مقام کعبہ کے ہے، اور اسی پر احکام دائر ہیں، جیسے شریعت نے نیند کو قائم مقام خروجِ ریح کا قرار دے کر اسی پر نقضِ وضو کا حکم کردیا، یا سفر کو قائم مقام مشقت کا قرار دے کر مطلقاً سفر پر رُخصتیں مرتب کردیں، حقیقۃً مشقت ہو یا نہ ہو، اسی طرح بلادِ بعیدہ میں مشہور ومعروف نشانات وعلامات کے ذریعے جو سمتِ قبلہ تحری واندازہ سے قائم کی جائے گی وہی شرعاً قائم مقام کعبہ کے ہوگی، علامہ بحر العلوم نے "رسائل الارکان" میں اسی مضمون کو بالفاظِ ذیل بیان کیا ہے:-

وَالشَّرْطُ وُقُوْعُ الْمُسَامَتَةِ عَلٰى حَسْبِ مَا يَرَى الْمُصَلِّيْ وَنَحْنُ غَيْرُ مَاْمُوْرِيْنَ بِالْمُسَامَتَةِ عَلٰى مَا يَحْكُمُ بِهِ الْاٰلَاتُ الرَّصْدِيَّةُ وَلِهٰذَا اَفْتَوْا اَنَّ الْاِنْحِرَافَ الْمُفْسِدَ اَنْ يَّتَجَاوَزَ الْمَشَارِقَ وَالْمَغَارِبَ۔ (رسائل الأركان ص:۵۳)

"اور استقبالِ قبلہ میں شرط وضروری صرف یہ ہے کہ نمازی کی رائے اور اندازے کے موافق کعبہ کے ساتھ مسامتت (محاذات) واقع ہوجاوے، اور ہم اس کے مکلّف نہیں کہ وہ درجہ مسامتت ومحاذات کا پیدا کریں جو آلاتِ رصدیہ کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے، اس لئے عام علماء کا فتویٰ یہ ہے کہ انحراف مفسد (صلوٰۃ) وہ ہے جس میں مشرق ومغرب کا تفاوت ہوجاوے۔"

اس مسئلہ کی مکمل تشریح اور حسابات کے ذریعہ استخراجِ قبلہ کے مختلف طریقے اور ان کی شرعی حیثیت پر مفصل کلام میرے رسالے "سمتِ قبلہ" میں دیکھا جاسکتا ہے۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ

اور اگر تو لائے اہلِ کتاب کے پاس ساری نشانیاں تو بھی نہ مانیں گے تیرے قبلہ کو، اور نہ تو

بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ

مانے اُن کا قبلہ، اور نہ اُن میں ایک مانتا ہے دُوسرے کا قبلہ، اور اگر تو چلا

وقف لازم

أَهْوَآءَهُم مِّنۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّٰلِمِينَ ﴿١٤٥﴾

ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بے شک تو بھی ہوا ان بے انصافوں میں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی اگر تم ان کے پاس ہر قسم کی نشانیاں لے آؤ تب بھی یہ تمہارے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے۔ اور نہ تم ان کے قبلے پر عمل کرنے والے ہو، نہ یہ ایک دوسرے کے قبلے پر عمل کرنے والے ہیں۔ اور جو علم تمہارے پاس آچکا ہے اس کے بعد اگر کہیں تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کرلی تو اس صورت میں یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا ﴿۱۴۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (باوجود ان لوگوں کے سب کچھ سمجھنے کے ان کی ضد کی یہ حالت تھی کہ) اگر آپ (ان) اہلِ کتاب کے سامنے تمام (دُنیا بھر کی) دلیلیں (جمع کرکے) پیش کردیں جب بھی یہ (کبھی) آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں اور (ان کی موافقت کی اُمید اس لئے نہ رکھنی چاہئے کہ آپ کا قبلہ بھی منسوخ ہونے والا نہیں، اس لئے) آپ بھی اُن کے قبلہ کو قبول نہیں کرسکتے، (پس کوئی صورت موافقت کی باقی نہیں رہی) اور (جیسا ان اہلِ کتاب کو آپ سے ضد ہے، ان میں باہم بھی موافقت نہیں کیونکہ) ان کا کوئی (فریق) بھی دُوسرے (فریق) کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا، (مثلاً یہود نے بیت المقدس لے رکھا تھا اور نصاریٰ نے مشرق کی سمت کو قبلہ بنا رکھا تھا) اور (خدانخواستہ آپ تو کسی طرح اُن کے قبلۂ منسوخہ غیر مشروعہ کو لے ہی نہیں سکتے، کیونکہ) اگر آپ ان کے (ان) نفسانی خیالات کو (گو وہ اصل میں حکمِ آسمانی رہے ہوں لیکن اب بوجہ منسوخ ہونے کے ان پر عمل کرنا محض نفسانی تعصب ہے، سو اگر آپ ایسے خیالات کو) اختیار کرلیں (اور وہ بھی) آپ کے پاس علم (قطعی یعنی وحی) آئے پیچھے، تو یقیناً آپ (نعوذ باللہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں، (جو کہ تارکینِ حکم ہیں، اور آپ کا ظالم ہونا بوجہ معصوم ہونے کے محال ہے، اس لئے یہ بھی محال ہے کہ آپ ان کے خیالات کو جن میں سے ان کا قبلہ بھی ہے قبول کرلیں)۔

معارف و مسائل

وَمَآ أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ میں یہ اعلان کردیا گیا کہ اب قیامت تک کے لئے آپ کا قبلہ بیت اللہ ہی رہے گا، اس

سے یہود و نصاریٰ کے ان خیالات کا قطع کرنا مقصود تھا کہ مسلمانوں کے قبلہ کو تو کوئی قرار نہیں، پہلے بیت اللہ تھا، پھر بیت المقدس ہو گیا، پھر بیت اللہ ہو گیا، اب بھی ممکن ہے کہ پھر دوبارہ بیت المقدس ہی کو قبلہ بنالیں۔ (بحرِ محیط)

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور فرضِ محال کے ہے جس کے وقوع کا کوئی احتمال نہیں، اور دراصل سنانا اُمتِ محمدیہ کو ہے کہ اس کی خلاف ورزی ایسی چیز ہے کہ خود رسول بھی بفرضِ محال ایسا کریں تو وہ بھی ظالم قرار پائیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا

جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو، اور بے شک ایک فرقہ

مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا

اُن میں سے چھپاتے ہیں حق کو جان کر۔ حق وہی ہے جو تیرا ربّ کہے پھر

تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع

تو نہ ہو شک لانے والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو اتنی اچھی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور یقین جانو کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے حق کو جان بوجھ کر چھپا رکھا ہے۔ ﴿۱۴۶﴾ اور حق وہی ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے آیا ہے، لہٰذا شک کرنے والوں میں ہرگز شامل نہ ہو جانا۔ ﴿۱۴۷﴾

خلاصۂ تفسیر

(اس سے پہلی آیت میں اہلِ کتاب کا قبلۂ مسلمین کو دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا ذکر تھا، اس آیت میں انہی اہلِ کتاب کا صاحبِ قبلہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا بیان ہے۔)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراۃ و انجیل) دی ہے، وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (توراۃ و انجیل میں آئی ہوئی بشارت کی بنا پر بحیثیت رسالت) ایسا (بے شک وشبہ) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (ان کی صورت سے) پہچانتے ہیں (کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر کبھی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، مگر پہچان کر بھی سب مسلمان نہیں ہوتے، بلکہ بعض تو ایمان لے آئے) اور بعضے ان میں سے (ایسے ہیں کہ اس) امرِ واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اخفا کرتے ہیں (حالانکہ) یہ امرِ واقعی من جانب اللہ (ثابت ہو چکا) ہے سو (ایسے امرِ واقعی ثابت من اللہ میں ہر ہر فرد کو کہا جاسکتا ہے کہ) ہرگز شک وشبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا۔

معارف ومسائل

اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول پہچاننے کی تشبیہ اپنے بیٹوں کو پہچاننے کے ساتھ دی گئی ہے کہ یہ لوگ جس طرح اپنے بیٹوں کو پوری طرح پہچانتے ہیں، ان میں کبھی شبہ واشتباہ نہیں ہوتا، اسی طرح توراۃ وانجیل میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور آپ کی واضح علامات ونشانات کا ذکر آیا ہے، اس کے ذریعہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یقینی طور سے جانتے پہچانتے ہیں، ان کا انکار محض عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ پوری طرح پہچاننے کے لئے بیٹوں کی مثال دی گئی ہے، ماں باپ کی مثال نہیں دی، حالانکہ آدمی اپنے ماں باپ کو بھی عادۃً خوب پہچانتا ہے، وجہ یہ ہے کہ بیٹوں کی پہچان ماں باپ کی پہچان کی نسبت بہت زیادہ ہے، کیونکہ انسان اپنے بیٹوں کو ابتداءِ پیدائش سے اپنے ہاتھوں میں پالتا ہے، اس کے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہوتا جو ماں باپ کی نظر سے اوجھل رہا ہو، بخلاف ماں باپ کے کہ ان کے اعضاءِ مستورہ پر اولاد کی کبھی نظر نہیں ہوتی۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ یہاں بیٹوں کو بیٹا ہونے کی حیثیت سے پہچاننا مراد نہیں، کیونکہ اس کی نسبت تو انسان پر مشتبہ ہوسکتی ہے کہ ممکن ہے کہ بیوی نے خیانت کی ہو اور یہ بیٹا اپنا نہ ہو، بلکہ مراد ان کی شکل وصورت وغیرہ کا پہچاننا ہے کہ بیٹا فی الواقع اپنا ہو یا نہ ہو، مگر جس کو بحیثیت بیٹے کے انسان پالتا ہے اس کی شکل وصورت کے پہچاننے میں کبھی اشتباہ نہیں ہوتا۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۛ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا

اور ہر کسی کے واسطے ایک جانب ہے یعنی قبلہ کہ وہ منہ کرتا ہے اس طرف، سو تم سبقت کرو نیکیوں میں، جہاں کہیں تم ہوگے

يَأْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ

کرلائے گا تم کو اِکٹھا، بے شک اللہ ہر چیز کرسکتا ہے۔ اور جس جگہ سے

خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ

تو نکلے سو منہ کر اپنا مسجدِ حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے

مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ

تیرے رَبّ کی طرف سے، اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔ اور جہاں سے تو نکلے

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ

منہ کر اپنا مسجدِ حرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہوا کرو منہ کرو

شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ق

اسی کی طرف تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع مگر جو اُن میں بے انصاف ہیں،

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ق وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ معانقة ۳

سواُن سے (یعنی اُن کے اِعتراضوں سے) نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس واسطے کہ کامل کروں تم پر فضل اپنا اور تاکہ تم پاؤ راہ سیدھی۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور ہر گروہ کی ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رُخ کرتا ہے۔ لہٰذا تم نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم جہاں بھی ہوگے، اللہ تم سب کو (اپنے پاس) لے آئے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے ﴿۱۴۸﴾ اور تم جہاں سے بھی (سفر کے لئے) نکلو، اپنا منہ (نماز کے وقت) مسجدِ حرام کی طرف کرو۔ اور یقیناً یہی بات حق ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے آئی ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے۔ ﴿۱۴۹﴾ اور جہاں سے بھی تم نکلو، اپنا منہ

مسجدِ حرام کی طرف کرو۔ اور تم جہاں کہیں ہو، اپنے چہرے اُسی کی طرف رکھو، تا کہ لوگوں کو تمہارے خلاف حجت بازی کا موقع نہ ملے۔ البتہ اُن میں جو لوگ ظلم کے خوگر ہیں، (وہ کبھی خاموش نہ ہوں گے) سو اُن کا کچھ خوف نہ رکھو، ہاں میرا خوف رکھو، اور تا کہ میں تم پر اپنا اِنعام مکمل کر دوں، اور تا کہ تم ہدایت حاصل کر لو ﴿۱۵۰﴾

خلاصۂ تفسیر

اور (دُوسری حکمت تحویلِ قبلہ میں یہ ہے کہ عادۃ اللہ جاری ہے کہ) ہر (مذہب والے) شخص کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے، جس کی طرف وہ (عبادت میں) منہ کرتا رہا ہے (چونکہ شریعتِ محمدیہ بھی ایک مستقل دِین ہے، اس کا قبلہ بھی ایک خاص ہوگیا، جب حکمت سب پر ظاہر ہوچکی) سو (مسلمانو) تم (اب اس بحث کو چھوڑ کر اپنے دِین کے) نیک کاموں میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو (کیونکہ ایک روز اپنے مالک سے سابقہ پڑنا ہے، چنانچہ) تم خواہ کہیں ہوگے (لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو (اپنے اِجلاس میں) حاضر کر دیں گے (اس وقت نیکیوں پر جزا اور اَعمالِ بد پر سزا ہوگی اور) بالیقین اللہ تعالیٰ ہر اَمر پر پوری قدرت رکھتے ہیں، اور (اس حکمت کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ جس طرح حضر میں کعبہ کی طرف رُخ ہوتا ہے، اسی طرح اگر مدینہ سے یا اور کہیں سے) جس جگہ سے بھی (کہیں سفر میں) آپ باہر جاویں تو (بھی) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجدِ حرام کی طرف رکھا کیجئے، (غرض حضر وسفر سب حالتوں کا یہی قبلہ ہے) اور (حکم عام قبلہ کا) بالکل حق (اور صحیح) ہے (اور) من جانب اللہ (ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے ذرا بے خبر نہیں۔

تحویلِ قبلہ کی تیسری حکمت

اور (مکرّر پھر کہا جاتا ہے کہ) آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جاویں (اور حضر میں بدرجۂ اَولیٰ) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجدِ حرام کی طرف رکھئے، اور (اسی طرح سب مسلمان بھی سن لیں کہ) تم لوگ جہاں کہیں (موجود) ہو اپنا چہرہ (نماز میں) اُسی (مسجدِ حرام) کی طرف رکھا کرو (اور یہ حکم اس لئے مقرّر کیا جاتا ہے) تا کہ (ان مخالف) لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں (اس) گفتگو (کی مجال) نہ رہے، (کہ اگر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبیٔ موعود آخر الزماں ہوتے تو ان کی علامات میں تو یہ بھی ہے کہ ان کا اصلی قبلہ کعبہ ہوگا، اور یہ تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں، یہ تیسری حکمت ہے تحویلِ قبلہ کی، ہاں) مگر ان میں جو (بالکل ہی) بے اِنصاف ہیں (وہ اب بھی کٹ حجتی نکالیں گے، کہ یہ کیسے نبی ہیں جو اتنے نبیوں کے خلاف کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، لیکن جب ایسے مہمل اِعتراضوں سے دِینِ حق کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکا) تو ایسے لوگوں سے (ذرا) اندیشہ نہ کرو (اور ان کے اِعتراضوں کے جواب کی فکر میں مت پڑو) اور مجھ سے ڈرتے رہو (کہ میرے اَحکام

کی مخالفت نہ ہونے پاوے کہ یہی مخالفت البتہ تم کو مضر ہے) اور (ہم نے ان سب اَحکامِ مذکورہ پر عمل کرنے کی توفیق بھی دی) تا کہ تم پر جو (کچھ) میرا انعام (اکرام متوجہ) ہے (تم کو آخرت میں داخلِ بہشت کر کے) اس کی تکمیل کر دُوں اور تا کہ (دُنیا میں) تم راہ (حق) پر (یعنی اِسلام پر قائم رہنے والوں میں) رہو (جس پر وہ تکمیلِ نعمت مرتب ہوتی ہے)۔

معارف و مسائل

تحویلِ قبلہ کی حکمتیں

مذکورہ آیات میں تحویلِ قبلہ کے لئے الفاظ: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تین مرتبہ آئے ہیں، اور وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ دو مرتبہ، اس تکرار کی ایک عام وجہ تو یہ ہے کہ تحویلِ قبلہ کا حکم مخالفین کے لئے تو شور شغب کا ذریعہ تھا ہی، خود مسلمانوں کے لئے بھی عبادات کا ایک عظیم اِنقلاب تھا، اگر یہ حکم تاکیدات کے ساتھ بہ تکرار نہ لایا جاتا تو قلوب کا اِطمینان وسکون آسان نہ ہوتا، اس لئے اس حکم کو بار بار دُہرایا گیا، جس میں اس کی طرف بھی اِشارہ کیا گیا کہ یہ تحویل آخری اور قطعی ہے، اب اس کی تبدیلی کا کوئی اِمکان نہیں۔

''بیان القرآن'' کے خلاصۂ تفسیر میں جو تطبیق کی صورت لکھی گئی ہے قرطبی نے بھی اس کی ایک ایسی تقریر نقل کی ہے جس سے تکرارِ محض نہ رہے مثلاً فرمایا کہ پہلی مرتبہ جو حکم آیا: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ یہ حکم حالتِ حضر کا ہے کہ جب آپ اپنی جگہ مقیم ہیں تو آپ مسجدِ حرام کی طرف رُخ کیا کریں، اور پھر پوری اُمت کو اسی کا حکم دیا گیا، اور وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ کا مفہوم اس تقریر پر یہ ہوگا کہ اپنے وطن اور شہر میں جس جگہ بھی ہوں اِستقبال بیت اللہ ہی کا کرنا ہے، یہ حکم صرف مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

پھر دُوسری مرتبہ جو انہی الفاظ کے ساتھ حکم آیا اس سے پہلے وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ کے الفاظ نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حکم وطن سے نکلنے اور سفر کی حالت کے لئے ہے، اور چونکہ سفر کے حالات بھی مختلف ہوتے ہیں، کبھی چند روز کے لئے کسی بستی میں قیام کیا جاتا ہے، کبھی سفر قطع کرنے کا سلسلہ ہوتا ہے، ان دونوں حالتوں کو عام کرنے کے لئے تیسری مرتبہ پھر ان الفاظ کے ساتھ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ کا اِضافہ کر کے بتلا دیا کہ سفر کی کوئی بھی حالت ہو ہر حال میں اِستقبال مسجدِ حرام ہی کا کرنا ہے، اس تیسری مرتبہ کے اِعادے کے ساتھ تحویلِ قبلہ کی ایک حکمت کا بھی جوڑ لگا دیا گیا کہ مخالفین کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ تو توراۃ واِنجیل کی تصریحات کے مطابق کعبہ ہونا چاہئے، اور یہ رسول کعبہ کے بجائے بیت المقدس کا اِستقبال کرتے ہیں۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا۔ وِّجْهَةٌ [1] بکسر الواؤ کے معنیٔ لغوی جس چیز کی طرف رُخ کیا جائے۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد قبلہ ہے، اور حضرت اُبیؓ بن کعب کی قراءت میں اس جگہ وِّجْهَةٌ کی بجائے "قِبْلَةٌ" بھی منقول ہے، مراد آیت کی جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ ہر قوم کا قبلہ جس کی طرف وہ عبادت میں رُخ کرتے ہیں مختلف ہے، خواہ من جانب اللہ ان کو ایسا ہی حکم ملا ہے یا انہوں نے خود کوئی جانب مقرّر کرلی ہے، بہرحال یہ اَمرِ واقعہ ہے کہ مختلف قوموں کے قبلے مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، تو اسی حالت میں اگر نبیٔ اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی خاص قبلہ مقرّر کردیا گیا تو اِنکار و تعجب کی کیا بات ہے۔

مذہبی مسائل میں فضول بحثوں سے اِجتناب کی ہدایت

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ اس سے پہلے جملہ میں یہ فرمایا تھا کہ مختلف قوموں کے مختلف قبلے ہیں، کوئی ایک دُوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے اپنے قبلہ کے حق ہونے پر ان لوگوں سے بحث فضول ہے، اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہے کہ اس بحث سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، تو پھر اس فضول بحث کو چھوڑ کر اپنے اصلی کام میں لگ جانا چاہئے، اور وہ کام ہے نیک کاموں میں دوڑ دُھوپ اور آگے بڑھنے کی کوشش، اور چونکہ فضول بحثوں میں وقت ضائع کرنا اور مسابقت الی الخیرات میں سستی کرنا، عموماً آخرت سے غفلت کے سبب ہوتے ہیں، جس کو اپنی آخرت اور اَنجام کی فکر درپیش ہو وہ کبھی فضول بحثوں میں نہیں اُلجھتا، اپنی منزل طے کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اس لئے اگلے جملے میں آخرت کی یاد دِلانے کے لئے اِرشاد فرمایا: أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا جس کا مطلب یہ ہے کہ بحثوں میں ہار جیت اور لوگوں کے اِعتراضات سے بچنے کی فکر سب چندروزہ دُنیا کے لئے ہے، اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمام اَقوامِ عالم کو ایک جگہ جمع کرکے حساب لیں گے، عقل مند کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات اس کی فکر میں صرف کرے۔

عبادات اور نیک اعمال میں بلاوجہ تأخیر کرنا مناسب نہیں، مسارعت کرنا چاہئے

لفظ فَاسْتَبِقُوا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اِنسان کو چاہئے کہ کسی نیک عمل کا جب موقع مل جائے تو اس کے کرنے میں دیر نہ کرے، کیونکہ بعض اوقات اس کے ٹلانے اور تأخیر کرنے سے توفیق سلب ہوجاتی ہے، پھر آدمی کام کر ہی نہیں سکتا، خواہ وہ نماز روزہ ہو یا حج وصدقہ وغیرہ، قرآنِ کریم میں یہی مضمون سورۂ اَنفال کی آیت میں زیادہ وضاحت سے آیا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ (الانفال:۲۴)

---

[1] واؤ کے نیچے زیر ہے۔

''یعنی اے ایمان والو! تم اللہ و رسول کے کہنے کو بجا لایا کرو جبکہ رسول تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہوں، اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی کے اور اس کے قلب کے درمیان میں۔''

کیا ہر نماز کا اوّل وقت میں پڑھنا افضل ہے؟

اس مسابقت فی الخیرات سے بعض فقہاء نے اس پر اِستدلال کیا ہے کہ ہر نماز کو اَوّل وقت میں پڑھنا افضل ہے، اور وہ روایاتِ حدیث اس کی تائید میں پیش کی ہیں جن میں اوّل وقت نماز اَدا کرنے کی فضیلت آئی ہے۔ اِمام شافعیؒ کا یہی مذہب ہے، مگر اِمام اعظم ابوحنیفہ و مالک رحمہما اللہ نے دُوسری روایاتِ حدیث کی بنا پر اس معاملے میں تفصیل کی ہے کہ جن نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاخیر کر کے پڑھنے کی تعلیم اپنے قول و عمل سے دی ہے، ان کا اوّل اور اَفضل وقت وہی ہے جو اُن احادیث میں بیان ہوا ہے، باقی اپنی اصل پر اوّل وقت میں پڑھی جائیں، مثلاً صحیح بخاری میں بروایت انسؓ عشاء کی نماز کو مؤخر کر کے پڑھنے کی فضیلت مذکور ہے،[1] اور حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عشاء کی تاخیر پسند تھی۔ (قرطبی)[2]

اسی طرح صحیح بخاری و ترمذی میں بروایت ابوذرؓ منقول ہے کہ ایک سفر میں حضرت بلالؓ نے ظہر کی اَذان اوّل وقت میں دینا چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا، اور فرمایا کہ جب وقت ذرا ٹھنڈا ہو جائے اس وقت اَذان کہی جائے کیونکہ گرمی کی شدّت جہنم کے آگ سے ہے،[3] مطلب یہ ہے کہ گرمی کے زمانے میں نمازِ ظہر کو تاخیر سے پڑھنا پسند فرمایا۔

ان روایات کی بنا پر اِمام ابوحنیفہؒ اور اِمام مالکؒ نے فرمایا کہ ان نمازوں میں اوّل وقت پر عمل کرنے کی صورت یہی ہے کہ جب وقتِ مستحب ہو جائے تو پھر تاخیر نہ کریں، اور جہاں کوئی تاخیر کا حکم نہیں آیا وہاں بالکل اِبتدائے وقت ہی میں نماز پڑھنا افضل ہے جیسے نمازِ مغرب۔

بہرحال آیتِ مذکورہ سے یہ بات باتفاق ثابت ہوگئی کہ جب نماز کا وقت آجائے تو بغیر ضرورتِ شرعیہ یا طبعیّہ کے تاخیر کرنا اچھا نہیں، ضرورتِ شرعیہ تو وہی ہے جو اُوپر لکھی گئی کہ بعض نمازوں کی تاخیر کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، اور ضرورتِ طبعیّہ اپنے ذاتی عوارض بیماری و محتاجی کے سبب تاخیر کرنا، واللہ أعلم۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب مواقيت الصلوة، باب وقت العشاء ...إلخ ج:١ ص:٨١

[2] تفسير القرطبي تحت هٰذه الآية ج:٢ ص:١٦٦

[3] صحيح البخاري، كتاب مواقيت الصلاة، باب الإبراد بالظهر في شدة الحر ج:١ ص:٧٦ وجامع الترمذي، ابواب الصلوة، باب ما جاء في تأخير الظهر ...إلخ ج:١ ص:٤١

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ

جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں رسول تم ہی میں کا پڑھتا ہے تمہارے آگے آیتیں ہماری اور پاک کرتا ہے تم کو

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ ؕ

اور سکھلاتا ہے تم کو کتاب اور اس اسرار اور سکھاتا ہے تم کو جو تم نہ جانتے تھے۔

۱۸ ع ۵ ۲ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ ع

سو تم یاد رکھو مجھ کو، میں یاد رکھوں تم کو، اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو۔

آسان ترجمۂ قرآن

(یہ انعام ایسا ہی ہے) جیسے ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہارے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کرتا ہے، اور تمہیں پاکیزہ بناتا ہے، اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۱۵۱﴾ لہٰذا مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ اور میرا شکر ادا کرو، اور میری ناشکری نہ کرو۔ ﴿۱۵۲﴾

خلاصۂ تفسیر

(یعنی ہم نے کعبہ کو قبلہ مقرر کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک دُعا جو درباب مقبولیت بناء کعبہ تھی اس طرح قبول کی) جس طرح (ان کی دُوسری دُعا جو درباب بعثتِ محمدیہ کے تھی قبول کی کہ) تم لوگوں میں ہم نے ایک (عظیم الشان) رسول کو بھیجا (جو کہ) تم ہی میں سے (ہیں اور وہ) ہماری آیات (واَحکام) پڑھ پڑھ کر تم کو سناتے ہیں اور (خیالات ورُسومِ جہالت سے) تمہاری صفائی کرتے رہتے ہیں، اور تم کو کتاب (الٰہی) اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور تم کو ایسی (مفید) باتیں تعلیم کرتے ہیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی، (اور نہ کتبِ سابقہ یا عقل ان کے لئے کافی تھی، اور اس شان کے رسول کے مبعوث ہونے کی ابراہیم علیہ السلام کی دُعا تھی، سو اس کا ظہور ہو گیا) ان (مذکورہ) نعمتوں پر مجھ کو (منعم ہونے کی حیثیت سے) یاد کرو، میں تم کو (عنایت سے) یاد رکھوں گا، اور میری (نعمت کی) شکر گزاری کرو اور (انکارِ نعمت یا ترکِ اطاعت سے) میری ناسپاسی مت کرو۔

معارف و مسائل

یہاں تک قبلہ کی بحث چلی آ رہی تھی، اب اس بحث کو ایسے مضمون پر ختم فرمایا گیا ہے جو اس بحث کی تمہید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بانیٔ کعبہ کی دُعا میں ضمناً آیا تھا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اولادِ ابراہیم میں ایک خاص شان کے ساتھ مبعوث ہونا، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں بانیٔ کعبہ کی دُعا کو بھی دخل ہے، اس لئے اگر ان کا قبلہ کعبہ کو بنا دیا گیا تو اس میں کوئی تعجب یا اِنکار کی بات نہیں ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا میں حرفِ کاف جو تشبیہ کے لئے آتا ہے اس کی ایک توجیہ تو وہ ہے جو خلاصۂ تفسیر سے معلوم ہو چکی ہے، دُوسری ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے جس کو قرطبی نے اختیار کیا ہے کہ اس حرفِ کاف کا تعلق بعد کی آیت فَاذْكُرُوْنِيْٓ سے ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جیسا ہم نے تم پر ایک نعمت قبلہ کی پھر دُوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مبذول فرمائی ہے، ایسی ہی نعمت ذِکر اللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر اَدا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہو جائیں۔ قرطبیؒ نے فرمایا کہ كَمَآ اَرْسَلْنَا کا ''کاف'' یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورۂ انفال میں كَمَآ اَخْرَجَكَ (الانفال:۵) اور سورۂ حجر کے آخر میں كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ۝ (الحجر) آیا ہے۔ [۱]

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ ذِکر کے اصلی معنی یاد کرنے کے ہیں جس کا تعلق قلب سے ہے، زبان سے ذِکر کرنے کو بھی ذِکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان ترجمانِ قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذِکرِ زبانی وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دِل میں بھی اللہ کی یاد ہو، مولانا رُومیؒ نے اسی کے متعلق فرمایا ہے ؎

بر زباں تسبیح در دِل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر [۲]

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذِکر و تسبیح میں مشغول ہو مگر اس کا دِل حاضر نہ ہو اور ذِکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابوعثمانؒ سے کسی نے ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذِکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس نہیں کرتے، آپ نے فرمایا: اس پر بھی اللہ کا شکر کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان کو تو اپنی طاعت میں لگالیا۔ (قرطبی) [۳]

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هٰذہ الآیة ج:۲ ص:۱۷۱

[۲] ترجمہ:- زبان پر تسبیح اور دِل میں گائے اور گدھے کا خیال، ایسی تسبیح کیا اثر رکھتی ہے؟

[۳] تفسیر القرطبی تحت هٰذہ الآیة ج:۲ ص:۱۷۱

ذِکر اللہ کے فضائل

بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابو عثمان نہدیؒ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟ فرمایا: اس لئے کہ قرآنِ کریم کے وعدے کے مطابق جب کوئی بندۂ مؤمن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اُسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اِطاعتِ اَحکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا۔ حضرت سعید بن جبیرؒ نے ذِکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت وفرمانبرداری سے کی ہے، وہ فرماتے ہیں:-

فَمَنْ لَّمْ یُطِعْہُ لَمْ یَذْکُرْہُ وَاِنْ کَثُرَ صَلٰوتُہٗ وَتَسْبِیْحُہٗ۔

''یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی پیروی نہ کی، اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو۔''

ذِکر اللہ کی اصل حقیقت

قرطبی نے بحوالہ اَحکام القرآن ابن خویز منداذ ایک حدیث بھی اس مضمون کی نقل کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی اس کے اَحکامِ حلال وحرام کا اِتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی (نفل) نماز روزہ وغیرہ کم ہوں، اور جس نے اَحکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر) اس کی نماز، روزہ، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذُوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کردیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ اِنسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے عذاب سے نجات دِلانے میں ذِکر اللہ کے برابر نہیں۔ اور ایک حدیثِ قدسی بروایت ابوہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں، جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذِکر میں اس کے ہونٹ ہلتے رہیں۔ [1] ذِکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالے ''ذِکر اللہ'' میں جمع کردیا ہے۔

[1] مشکوٰۃ، کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ عزّ وجلّ ج:۱ ص:۱۹۹ وتفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۱۷۱

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۵۳﴾

اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۱۵۳﴾

ربط

تحویلِ قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اِعتراض تھا، اس کے دو اَثر تھے، ایک مذہبِ اِسلام پر کہ اِعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جایا کرتا ہے، اُوپر کی آیتوں میں اس اِعتراض کا جواب دے کر اس کا اَثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دُوسرا اَثر طبائعِ اہلِ اِسلام پر کہ اِعتراض سے بالخصوص جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اِصرار کرنے سے قلب میں رنج اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیتِ آئندہ میں تخفیفِ حزن کا طریقہ کہ صبر وصلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دُوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! (طبیعتوں میں غم ہلکا کرنے کے بارے میں) صبر اور نماز سے سہارا (اور مدد) حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں، (اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجۂ اَولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبادت ہے، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجۂ اَولیٰ یہ بشارت ہوگی)۔

معارف ومسائل

صبر اور نماز ہر مشکل کا حل اور ہر تکلیف کا علاج ہیں

اِسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اس آیت میں یہ ہدایت ہے کہ اِنسان کی تمام حوائج وضروریات کے پورا کرنے اور تمام آفات ومصائب اور تکالیف کو دُور کرنے کا نسخۂ اکسیر دو جز سے مرکب ہے، ایک صبر، دُوسرے نماز، اور اس نسخہ کے تمام حوائج اور تمام مصائب کے لئے عام ہونے کی طرف قرآنِ عظیم نے اس طرح اِشارہ کر دیا ہے کہ اِسۡتَعِيۡنُوۡا کو عام چھوڑا

ہے، کوئی خاص چیز ذِکر نہیں فرمائی کہ فلاں کام میں ان دونوں چیزوں سے مدد حاصل کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے اِنسان کی ہر ضرورت میں مدد حاصل کی جاسکتی ہے، تفسیر مظہری میں اس عموم کو واضح کردیا ہے۔ اب اس دوجزئی نسخے کے دونوں اجزا کو سمجھ لیجئے۔

صبر کی اصل حقیقت

صبر کے اصلی معنی اپنے نفس کو روکنے اور اس پر قابو پانے کے ہیں، قرآن وسنت کی اِصطلاح میں صبر کے تین شعبے ہیں، ایک اپنے نفس کو حرام وناجائز چیزوں سے روکنا، دُوسرے طاعات وعبادات کی پابندی پر مجبور کرنا، تیسرے مصائب وآفات پر صبر کرنا، یعنی جو مصیبت آگئی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنا، اور اس کے ثواب کا اُمیدوار ہونا، اس کے ساتھ اگر تکلیف وپریشانی کے اِظہار کا کوئی کلمہ بھی منہ سے نکل جائے تو وہ صبر کے منافی نہیں۔ (ذکرہ ابن کثیر عن سعید بن جبیرؒ) [1]

یہ تینوں شعبے صبر کے فرائض میں داخل ہیں، ہر مسلمان پر یہ پابندی عائد ہے کہ تینوں طرح کے صبر کا پابند ہو، عوام کے نزدیک صرف تیسرے شعبے کو تو صبر کہا جاتا ہے، دو شعبے جو صبر کی اصل اور بنیاد ہیں، عام طور پر اُن کو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھا جاتا۔

قرآن وحدیث کی اِصطلاح میں "صابرین" انہیں لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر میں ثابت قدم ہوں۔ بعض روایات میں ہے کہ محشر میں ندا کی جائے گی کہ صابرین کہاں ہیں؟ تو وہ لوگ جو تینوں طرح کے صبر پر قائم رہ کر زندگی سے گزرے ہیں وہ کھڑے ہوجائیں گے، اور ان کو بلاحساب جنت میں داخلے کی اِجازت دے دی جائے گی، ابنِ کثیر نے اس روایت کو نقل کرکے فرمایا کہ آیتِ قرآن: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ⑩ (الزمر) سے بھی اس طرف اِشارہ ہوتا ہے۔

نماز، دُوسرا جز اس نسخے کا جو تمام اِنسانی ضروریات کو پورا کرنے اور تمام پریشانیوں اور آفتوں سے نجات دِلانے میں اکسیر ہے، نماز ہے، صبر کی جو تفسیر ابھی لکھی گئی ہے اس سے معلوم ہوگیا کہ درحقیقت نماز اور تمام عبادات صبر ہی کے جزئیات ہیں، مگر نماز کو جداگانہ بیان اس لئے کردیا کہ تمام عبادت میں سے نماز ایک ایسی عبادت ہے جو صبر کا مکمل نمونہ ہے، کیونکہ نماز کی حالت میں نفس کو عبادت وطاعت پر محبوس بھی کیا جاتا ہے، اور تمام معاصی ومکروہات سے بلکہ بہت سے مباحات سے بھی نفس کو بحالتِ نماز روکا جاتا ہے، اس لئے صبر جس کے معنی نفس کو اپنے قابو میں رکھ کر تمام طاعات کا پیرو اور تمام معاصی سے مجتنب وبیزار بنانا ہے، نماز اس کی ایک عملی تمثیل ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۲۵۲

اس کے علاوہ نماز کو اِنسان کی تمام حاجات کے پورا کرنے اور تمام آفتوں مصیبتوں سے نجات دِلانے میں ایک خاص تأثیر بھی ہے، گو اس کی وجہ اور سبب معلوم نہ ہو، جیسے دواؤں میں بہت سی ادویات کو مؤثر بالخاصہ تسلیم کیا جاتا ہے، یعنی کیفیاتِ حرارت و برودت کے حساب سے جیسے کسی خاص مرض کے اِزالہ کے لئے بعض دوائیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہیں، جیسے دردِ گردہ کے لئے فرنگی دانہ کو ہاتھ یا منہ میں رکھنا، اور بہت سے امراض کے لئے عودِ صلیب وغیرہ کو گلے میں ڈالنا مؤثر بالخاصہ ہے، سبب نامعلوم ہے، لوہے کو کھینچنے میں مقناطیس مؤثر بالخاصہ ہے، وجہ معلوم نہیں، اسی طرح نماز تمام اِنسانی ضروریات کی کفالت اور تمام مصائب سے نجات دِلانے میں مؤثر بالخاصہ ہے بشرطیکہ نماز کو نماز کی طرح آداب اور خشوع خضوع کے ساتھ پڑھا جائے۔ ہماری جو نمازیں غیر مؤثر نظر آتی ہیں، اس کا سبب ہمارا قصور ہے کہ نماز کے آداب اور خشوع و خضوع میں کوتاہی ہوتی ہے، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب کوئی مہم پیش آتی تو نماز کی طرف رُجوع فرماتے تھے، اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس مہم کو پورا فرمادیتے تھے، حدیث میں ہے:-

إِذَا حَزَبَهٗ أَمْرٌ فَزِعَ إِلَى الصَّلٰوةِ۔ [1]

”یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی ضرورت پیش آتی تو نماز کی طرف رُجوع فرمایا کرتے تھے۔“

صبر اور نماز تمام مشکلات و مصائب سے نجات کا سبب اس لئے ہے کہ صبر سے اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ اس کلمے میں اس کا راز بتلادیا گیا ہے کہ صبر حلِ مشکلات اور دفعِ مصائب کا سبب کیسے بنتا ہے، اِرشاد کا حاصل یہ ہے کہ صبر کے نتیجے میں اِنسان کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے ساتھ رَبّ العزّت کی طاقت ہو اس کا کونسا کام رُک سکتا ہے اور کونسی مصیبت اس کو عاجز کرسکتی ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ

اور نہ کہو اُن کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مردے ہیں، بلکہ وہ زندے ہیں لیکن

لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ

تم کو خبر نہیں۔ اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو تھوڑے سے ڈر سے اور بھوک سے اور نقصانوں سے

[1] فتح الباری، کتاب العلم، باب العلم والعظة باللیل ج:۱ ص:۱۸۴ وسنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب وقت قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج:۱ ص:۱۸۶

مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ

مالوں کے اور جانوں کے اور میووں کے، اور خوش خبری دے صبر کرنے والوں کو۔ کہ جب

اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ ؕ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ

پہنچے اُن کو مصیبت تو کہیں: ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں پر

صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۫ قف وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

عنایتیں ہیں اپنے ربّ کی اور مہربانی اور وہی ہیں سیدھی راہ پر۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوں ان کو مردہ نہ کہو۔ دراصل وہ زندہ ہیں، مگر تم کو (ان کی زندگی کا) احساس نہیں ہوتا ﴿۱۵۴﴾ اور دیکھو ہم تمہیں آزمائیں گے ضرور، (کبھی) خوف سے، اور (کبھی) بھوک سے، اور (کبھی) مال و جان اور پھلوں میں کمی کر کے۔ اور جو لوگ (ایسے حالات میں) صبر سے کام لیں اُن کو خوشخبری سنادو ﴿۱۵۵﴾ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ "ہم سب اللہ ہی کے ہیں، اور ہم کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے" ﴿۱۵۶﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے خصوصی عنایتیں ہیں، اور رحمت ہے۔ اور یہی لوگ ہیں جو ہدایت پر ہیں ﴿۱۵۷﴾

ربط

اُوپر ایک خاص ناگوار واقعہ میں صبر کی تعلیم اور صابرین کی فضیلت بیان فرمائی تھی، آیاتِ آئندہ میں اور بھی بعض واقعات خلافِ طبع کی تفصیل اور اس میں صبر کی ترغیب اور فضیلت بیان فرماتے ہیں، جن میں قتل وقتال مع الکفار کا مضمون مقدم فرماتے ہیں، دو وجہ سے، اوّل بوجہ اعظم ہونے کے، کہ اعظم پر صبر کرنے والا اصغر پر بدرجۂ اَولیٰ صبر کرے گا، دُوسرے خاص طور پر مناسب مقام ہونے کی وجہ سے، کیونکہ معترضین مذکورین کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا تھا۔

خلاصۂ تفسیر

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی دِین کے واسطے) قتل کیے جاتے ہیں ان (کی ایسی فضیلت ہے کہ ان) کی نسبت

یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولی مردوں کی طرح) مردے ہیں، بلکہ وہ لوگ (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں، لیکن تم (اپنے موجودہ) حواس سے (اس حیات کا) اِدراک نہیں کر سکتے، اور (دیکھو) ہم (صفت رضا وتسلیم میں جو کہ مقتضیٰ ایمان کا ہے) تمہارا اِمتحان کریں گے کسی قدر خوف سے (جو کہ ہجوم مخالفین یا نزولِ حوادث وشدائد سے پیش آوے) اور (کسی قدر فقرو) فاقہ سے اور (کسی قدر) مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے (مثلاً مواشی مر گئے یا کوئی آدمی مر گیا، یا بیمار ہو گیا، یا پھل اور کھیتی کی پیداوار تلف ہوگئی، پس تم صبر کرنا) اور (جو لوگ ان اِمتحانوں میں پورے اُتر آویں اور مستقل رہیں تو) آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے (جن کی یہ عادت ہے) کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ (دِل سے سمجھ کر یوں) کہتے ہیں کہ ہم تو (مع مال واولاد حقیقۃً) اللہ تعالیٰ ہی کی مِلک ہیں (اور مالک حقیقی کو اپنی مِلک میں ہر طرح کے تصرف کا اِختیار حاصل ہے، اس سے مملوک کا تنگ ہونا کیا معنی) اور ہم سب (دُنیا سے) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں (سو یہاں کے نقصانوں کا بدلہ وہاں جا کر مل رہے گا، اور جو مضمون بشارت کا ان کو سنایا جاوے گا وہ یہ ہے کہ) ان لوگوں پر (جدا جدا) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے (مبذول) ہوں گی اور (سب پر بالاشتراک) عام رحمت بھی ہوگی، اور یہی لوگ ہیں جن کی (حقیقتِ حال تک) رسائی ہوگئی (کہ حق تعالیٰ کو ہر چیز کا مالک اور نقصان کا تدارک کر دینے والا سمجھ گئے)۔

معارف ومسائل

شہداء اور اَنبیاء کی حیاتِ برزخی اور اس کے درجات میں تفاضل

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اِسلامی روایات کی رُو سے ہر مرنے والے کو برزخ میں ایک خاص قسم کی حیات ملتی ہے جس سے وہ قبر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے، اس میں مؤمن وکافر یا صالح وفاسق میں کوئی تفریق نہیں، لیکن اس حیاتِ برزخی کے مختلف درجات ہیں، ایک درجہ تو سب کو عام اور شامل ہے، کچھ مخصوص درجے انبیاء وصالحین کے لئے مخصوص ہیں، اور ان میں بھی باہمی تفاضل ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر علماء کے مقالات وتحقیقات بے شمار ہیں، لیکن ان میں سے جو بات اقرب الی الکتاب والسنّت ہے اور شبہات سے پاک ہے، اس کو سیّدی حکیم الامت تھانویؒ نے ''بیان القرآن'' میں واضح فرما دیا ہے، اس جگہ اسی کو نقل کرنا کافی معلوم ہوا۔

ف:- ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے ''شہید'' کہتے ہیں، اور اس کی نسبت گو یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے، لیکن اس کی موت کو دُوسرے مردوں کی سی موت سمجھنے کی ممانعت کی گئی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو

برزخی حیات ہر شخص کی رُوح کو حاصل ہے، اور اسی سے جزا و سزا کا اِدراک ہوتا ہے، لیکن شہید کو اس حیات میں اور مردوں سے ایک گونہ اِمتیاز ہے، اور وہ اِمتیاز یہ ہے کہ اس کی یہ حیات آثار میں اوروں سے قوی ہے، جیسے اُنگلیوں کے اگلے پوروے اور ایڑی، اگرچہ دونوں میں حیات ہے، اور حیات کے آثار بھی دونوں میں موجود ہیں، لیکن اُنگلیوں کے پوروؤں میں حیات کے آثار اِحساس وغیرہ بہ نسبت ایڑی کے زیادہ ہیں، اسی طرح شہداء میں آثارِ حیات عام مردوں سے بہت زیادہ ہیں، حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوّت کا ایک اثر برخلاف معمولی مردوں کے اس کے جسدِ ظاہری تک بھی پہنچا ہے کہ اس کا جسم باوجود مجموعۂ گوشت و پوست ہونے کے خاک سے متأثر نہیں ہوتا، اور مثل جسمِ زندہ کے صحیح سالم رہتا ہے، جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں، پس اس اِمتیاز کی وجہ سے شہداء کو اُحیاء کہا گیا، اور ان کو دُوسرے اموات کے برابر اَموات کہنے کی ممانعت کی گئی، مگر اَحکامِ ظاہرہ میں وہ عام مردوں کی طرح ہیں، اُن کی میراث تقسیم ہوتی ہے، اور ان کی بیویاں دُوسروں سے نکاح کرسکتی ہیں، اور یہی حیات ہے جس میں حضراتِ انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ اِمتیاز اور قوّت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ سلامتِ جسم کے علاوہ اس حیاتِ برزخی کے کچھ آثار ظاہری اَحکام پر بھی پڑتے ہیں، مثلاً ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، اُن کی اَزواج دُوسروں کے نکاح میں نہیں آسکتیں۔

پس اس حیات میں سب سے قوی تر اَنبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء، پھر اور معمولی مردے، البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء و صالحین بھی اس فضیلت میں شہداء کے شریک ہیں، سو مجاہدۂ نفس میں مرنے کو بھی معنیً شہادت میں داخل سمجھیں گے، اس طور پر وہ بھی شہداء ہوگئے، یا یوں کہا جاوے کہ آیت میں شہداء کی تخصیص عام قرون کے اِعتبار سے ہے، شہداء کے ہم رُتبہ دُوسرے لوگ صالحین وصدیقین کے اِعتبار سے نہیں۔

اور اگر کسی شخص نے کسی شہید کی لاش کو خاک خوردہ پایا ہو تو سمجھ لے کہ ممکن ہے کہ اس کی نیت خالص نہ ہو، جس پر مدار ہے قتل کے شہادت ہونے کا، اور صرف قتل شہادت نہیں ہے، اور اگر فرضاً ایسا شہید خاک خوردہ پایا جاوے جس کا قتل فی سبیل اللہ اور اس کا جامع شرائطِ شہادت ہونا دلیلِ قطعی، تواتر وغیرہ سے ثابت ہو (جس کا شبہ صاحبِ رُوح المعانی کو ہوگیا ہے) تو اس کی وجہ میں کہا جاوے گا کہ حدیث میں جس چیز کی تصریح ہے وہ یہ کہ انبیاء و شہداء کے جسم کو زمین نہیں کھاتی، یعنی مٹی ان کے جسم کو خراب نہیں کرسکتی، اَجزاء ارضیہ مٹی وغیرہ کے علاوہ کسی دُوسری چیز سے ان کے جسم کا متأثر ہوکر فنا ہوجانا پھر بھی ممکن ہے، کیونکہ زمین میں اور بھی بہت سی اقسام اور اَنواع کی دھاتیں اور ان کے اجزاء اللہ تعالیٰ نے رکھ دیئے ہیں، اگر ان کی وجہ سے کسی شہید کا جسم متأثر ہوجائے تو اس آیت کے منافی نہیں۔

چنانچہ دُوسرے اَجسامِ مرکّبہ مثل اسلحہ و ادویہ واغذیہ واخلاط واجسامِ بسیطہ مثل آب وآتش وباد کی تاثیر انبیاء علیہم السلام کے اجساد میں بھی ثابت ہے، اور شہداء کی حیات بعد الممات انبیاء کی حیات قبل الممات سے اقویٰ نہیں، اور بعض

حصۂ ارض میں بعض اجزاء غیر ارضیہ بھی شامل ہو جاتے ہیں، جس طرح دُوسرے عناصر میں بھی مختلف عناصر شامل ہو جاتے ہیں، سو اگر ان اجزائے غیر ارضیہ سے ان کے اَجساد متأثر ہو جاویں تو اس سے ان احادیث پر اِشکال نہیں ہوتا، جن میں حرمتِ اَجساد علی الارض وارِد ہے۔

اور ایک جواب یہ ہے کہ اِمتیازِ اَجسادِ شہداء کے لئے یہ کافی ہے کہ دُوسری اموات سے زیادہ مدّت تک ان کے اَجساد خاک سے متأثر نہ ہوں، گو کسی وقت میں ہو جاویں، اور اَحادیث سے یہی امر مقصود کہا جاوے کہ ان کی محفوظیت اجساد کی خارقِ عادت ہے، اور خرقِ عادت کی دونوں صورتیں ہیں، حفظِ مؤبد اور حفظِ طویل، اور چونکہ عالمِ برزخ حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ وغیرہ سے مدرک نہیں ہوتا اس لئے لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿١٥٤﴾ فرمایا گیا کہ تم اُن کی حیات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

مصائب پر صبر کے آسان کرنے کی خاص تدبیر

ف:- اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بندوں کا اِمتحان ہوتا ہے، اس کی حقیقت آیت وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ (البقرۃ: ۱۲۴) کی تفسیر میں گزر چکی ہے، اور حوادث کے واقع ہونے سے پہلے ان کی خبر دے دینے میں یہ فائدہ ہوا کہ صبر آسان ہو جاتا ہے، ورنہ دفعۃً کوئی صدمہ پڑنے سے زیادہ پریشانی ہوتی ہے، اور یہ خطاب ساری اُمت کو ہے تو سب کو سمجھ لینا چاہئے کہ دُنیا دارُ المحن ہے (یعنی محنتوں اور تکلیفوں کی جگہ ہے) اس لئے یہاں کے حوادث کو عجیب اور بعید نہ سمجھا جاوے تو بے صبری نہ ہوگی، اور چونکہ یہ لوگ نفسِ عملِ صبر میں سب مشترک ہیں، اس لئے اس کا صلۂ مشترکہ تو عام رحمت ہے، جو نفسِ صبر پر موعود ہے، اور چونکہ مقدار اور شان اور خصوصیت ہر صابر کے صبر کی جدا ہے، اس لئے ان خصوصیات کا صلہ جدا جدا خاص عنایتوں سے ہوگا، جو ان خاص خصوصیات پر موعود ہیں، جیسے دُنیا میں مواقع اِنعام پر دعوتِ طعام تو عام ہوتی ہے، پھر روپے اور جوڑے ہر ایک کو علیٰ قدر الحیثیت والخدمت دیئے جاتے ہیں۔[1]

مصیبت میں اِنَّا لِلّٰهِ کو سمجھ کر پڑھا جائے تو تسکینِ قلب کا بہترین علاج ہے

صابرین کی طرف نسبت کر کے جو یہ فرمایا ہے کہ وہ مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿١٥٦﴾ کہا کرتے ہیں، حقیقت میں مقصود اس کی تعلیم سے یہ ہے کہ مصیبت والوں کو ایسا کہنا چاہئے، کیونکہ ایسا کہنے میں ثواب بھی بڑا ہے، اور اگر دِل سے سمجھ کر یہ الفاظ کہے جائیں تو غم و رنج کے دُور کرنے اور قلب کو تسلی دینے کے معاملے میں بھی اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔

---

[1] تفسیر بیان القرآن تحت هٰذه الآیة ج: ۱ ص: ۹۸

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ

بے شک صفا اور مروہ نشانیوں میں سے ہیں اللہ کی، سو جو کوئی حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ تو کچھ گناہ نہیں

عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں، اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ قدر دان ہے سب کچھ جاننے والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ لہٰذا جو شخص بھی بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس کے لئے اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ ان کے درمیان چکر لگائے۔ اور جو شخص خوشی سے کوئی بھلائی کا کام کرے تو اللہ یقیناً قدر دان (اور) جاننے والا ہے ﴿۱۵۸﴾

ربط

آیاتِ متقدمہ میں وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ (البقرۃ: ۱۲۴) سے دور تک خانۂ کعبہ کا مفصل ذِکر ہوا ہے جس کے اوّل میں خانۂ کعبہ کے جائے عبادت ہونے کا بیان تھا، اور اس کے آگے دُعائے اِبراہیمی کی حکایت تھی کہ انہوں نے یہ درخواست کی تھی کہ ہمیں اَحکامِ مناسک سکھلا دیئے جاویں، اور مناسک میں حج وعمرہ بھی داخل ہے، پس بیت اللہ کا معبد ہونا جیسے اس کے قبلۂ نماز بنانے سے ظاہر کیا گیا اسی طرح حج وعمرہ میں بیت اللہ کو مقصد بنا کر اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔

اب آیتِ آئندہ میں اس کے مقصدِ حج وعمرہ بننے کے متعلق ایک مضمون کا بیان ہے، وہ یہ کہ صفا ومروہ دو پہاڑیاں مکہ میں ہیں، حج وعمرہ میں کعبہ کا طواف کر کے ان کے درمیان دوڑتے چلتے ہیں، جس کو ''سعی'' کہتے ہیں، چونکہ زمانۂ جاہلیت میں بھی یہ سعی ہوتی تھی، اور اس وقت صفا ومروہ پر کچھ مورتیاں رکھی تھیں، اس لئے بعض مسلمانوں کو شبہ پڑ گیا کہ شاید یہ رُسوم جاہلیت سے ہو، اور موجب گناہ ہو، اور بعض جاہلیت میں بھی اس کو گناہ سمجھتے تھے، ان کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اسلام میں بھی گناہ ہو، اللہ تعالیٰ کو یہ شبہ دفع فرمانا مقصود ہے، پس مضمونِ سابق میں کعبہ کے قبلۂ نماز ہونے پر اِعتراضِ کفار کا دفع کرنا مقصود تھا، اور مضمونِ لاحق میں کعبہ کے مقصدِ حج وعمرہ ہونے کے متعلق ایک امر یعنی صفا ومروہ کی سعی پر خود مسلمانوں کے شبہ کا ازالہ فرمانا مقصود ہے، یہ وجہ دونوں مضمونوں میں ربط کی ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(صفا و مروہ کی سعی میں کوئی شبہ نہ کرو، کیونکہ) تحقیقاً صفا اور مروہ (اور ان کے درمیان میں سعی کرنا) من جملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا (اس کا) عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں (جیسا تم کو شبہ ہو گیا) ان دونوں کے درمیان (سعی کے معروف طریقے کے مطابق) آمد و رفت کرنے میں (جس کا نام "سعی" ہے، اور گناہ کیا بلکہ ثواب ہوتا ہے، کیونکہ یہ سعی تو شرعاً اَمرِ خیر ہے) اور (ہمارے یہاں کا ضابطہ ہے کہ) جو شخص خوشی سے کوئی اَمرِ خیر کرے تو حق تعالیٰ (اس کی بڑی) قدر دانی کرتے ہیں (اور اس خیر کرنے والے کی نیت و خلوص) خوب جانتے ہیں (پس اس ضابطے کی رُو سے سعی کرنے والے کو بمقدارِ اخلاص ثواب عنایت ہوگا)۔

معارف و مسائل

بعض لغات کی تحقیق

شَعَآئِرِ اللّٰهِ شعائر جمع ہے شعیرہ کی، جس کے معنی علامت کے ہیں، "شعائر اللہ" سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دِین کی علامتیں قرار دیا ہے۔ "حج" کے لغوی معنی قصد کرنے کے ہیں، اور اصطلاحِ قرآن و سنت میں خاص خانۂ کعبہ کا قصد کرنے اور وہاں افعالِ مخصوصہ کے ادا کرنے کو "حج" کہا جاتا ہے۔ "عمرہ" کے لفظی معنی زیارت کے ہیں، اور اِصطلاحِ شرع میں مسجدِ حرام کی حاضری اور طواف و سعی کو کہا جاتا ہے۔

صفا و مروہ کے درمیان سعی واجب ہے

حج اور عمرہ اور سعی کا طریقہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اور یہ سعی اِمام احمدؒ کے نزدیک سنتِ مستحبہ ہے، اور مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے، اور اِمام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے کہ ترک سے ایک بکری ذبح کرنا پڑتی ہے۔

آیتِ مذکورہ کے الفاظ سے یہ شبہ نہ کرنا چاہئے کہ اس آیت میں تو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کے متعلق صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ وہ گناہ نہیں، اس سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوا کہ سعی مباحات میں سے ایک مباح ہے، وجہ یہ ہے کہ اس جگہ عنوان فَلَا جُنَاحَ کا سوال کی مناسبت سے رکھا گیا ہے، سوال اسی کا تھا کہ صفا و مروہ پر بتوں کی مورتیں رکھی تھیں اور اہلِ جاہلیت انہی کی پوجا پاٹ کے لئے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے، اس لئے یہ عمل حرام ہونا چاہئے، اس

کے جواب میں فرمایا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، چونکہ یہ دراصل سنتِ ابراہیمی ہے کسی کے جاہلانہ عمل سے کوئی گناہ نہیں ہو جاتا، یہ فرمانا اس کے واجب ہونے کے منافی نہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اُتارے صاف حکم اور ہدایت کی باتیں بعد اس کے کہ ہم ان کو کھول چکے

لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا

لوگوں کے واسطے کتاب میں، اُن پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں اُن پر لعنت کرنے والے۔ مگر

الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ۚ وَاَنَا

جنہوں نے توبہ کی اور دُرست کیا اپنے کلام کو اور بیان کر دیا حق بات کو تو اُن کو معاف کرتا ہوں اور میں ہوں

التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ کُفَّارٌ

بڑا معاف کرنے والا نہایت مہربان۔ بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور مرگئے کافر ہی

اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۙ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ

انہی پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی۔ ہمیشہ رہیں گے اسی لعنت میں،

لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

نہ ہلکا ہوگا اُن پر سے عذاب اور نہ اُن کو مہلت ملے گی۔

آسان ترجمۂ قرآن

بیشک وہ لوگ جو ہماری نازل کی ہوئی روشن دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں، باوجودیکہ ہم انہیں کتاب میں کھول کھول کر لوگوں کے لئے بیان کر چکے ہیں، تو ایسے لوگوں پر اللہ بھی لعنت بھیجتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی

لعنت بھیجتے ہیں ﴿۱۵۹﴾ ہاں وہ لوگ جنہوں نے توبہ کر لی ہو اور اپنی اصلاح کر لی ہو اور (چھپائی ہوئی باتوں کو) کھول کھول کر بیان کر دیا ہو تو میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول کر لیتا ہوں۔ اور میں تو بہ قبول کرنے کا خوگر ہوں، بڑا رحمت والا ﴿۱۶۰﴾ بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور کافر ہونے کی حالت ہی میں مرے، ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور سارے انسانوں کی لعنت ہے ﴿۱۶۱﴾ وہ ہمیشہ اسی پھٹکار میں رہیں گے۔ نہ ان پر سے عذاب کو ہلکا کیا جائے گا، اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی ﴿۱۶۲﴾

ربط

اُوپر بحثِ قبلہ کے ضمن میں صاحبِ قبلہ کی نبوّت کے متعلق اہلِ کتاب کی حق پوشی کا مضمون مذکور تھا، اس آیت میں اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ ...الی قولہ... لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ (البقرۃ:۱۴۶) آگے اس مضمون کی تکمیل کے واسطے حق کو چھپانے والوں کی اور کتمانِ حق پر اِصرار کرنے والوں کی وعید اور توبہ کرنے پر معافی کا وعدہ اِرشاد فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ اِخفا کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دُوسروں کے لئے) ہادی ہیں (اور اِخفا بھی) اس (حالت) کے بعد کہ ہم ان (مضامین) کو کتاب (اِلٰہی توراۃ و انجیل) میں (نازل فرما کر) عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں (کہ اپنی رحمتِ خاصہ سے اُن کو بعید کر دیتے ہیں) اور (دُوسرے بہتیرے) لعنت کرنے والے بھی (جن کو اس فعل سے نفرت ہے) اُن پر لعنت بھیجتے ہیں (کہ ان پر بددُعا کرتے ہیں، ہاں) مگر جو لوگ (ان اِخفا کرنے والوں میں اپنی اس حرکت سے) توبہ (یعنی حق تعالیٰ کے رُوبرو گزشتہ سے معذرت) کر لیں اور (جو کچھ ان کے اس فعل سے خرابی ہوگئی تھی، آئندہ کے لئے اس کی) اِصلاح کر دیں (اور اس اِصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ان اِخفا کئے ہوئے مضامین کو عام طور پر) ظاہر کر دیں (تاکہ سب کو اِطلاع ہو جائے اور ان پر لوگوں کو گمراہ کرنے کا بار نہ رہے اور اِظہارِ معتبر عند الشرع یہ ہے کہ اِسلام کو قبول کر لیں، کیونکہ اِسلام نہ لانے میں نبوّتِ محمدیہ کے متعلق عوام پر بھی حق مخفی رہے گا، وہ یہی سمجھیں گے کہ اگر نبوّت حق ہوتی تو یہ کتاب جاننے والے لوگ کیوں نہ ایمان لاتے، خلاصہ یہ کہ یہ لوگ مسلمان ہو جاویں) تو ایسے لوگوں (کے حال) پر میں (عنایت سے) متوجہ ہو جاتا ہوں (اور ان کی خطا معاف کر دیتا ہوں) اور میری تو بکثرت عادت ہے توبہ قبول کر لینا، اور مہربانی فرمانا (کوئی توبہ کرنے والا ہونا چاہئے)، البتہ جو لوگ (ان میں سے) اِسلام نہ لاویں، اور اسی حالتِ غیر اِسلام پر مر جاویں ایسے لوگوں پر (وہ) لعنت (مذکورہ) اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور آدمیوں کی بھی سب کی (ایسے طور پر برسا کرے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی (لعنت) میں رہیں گے (حاصل یہ کہ وہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے داخل ہوں گے، اور ہمیشہ کا جہنم میں رہنے والا ہمیشہ ہی خدا کی خاص

رحمت سے دُور بھی رہے گا، اور ہمیشہ ملعون رہنا یہی ہے، اور ہمیشگی لعنت کے ساتھ یہ بھی ہے کہ داخل ہونے کے بعد کسی وقت) ان (پر) سے (جہنم کا) عذاب ہلکا (بھی) نہ ہونے پاوے گا اور نہ (داخل ہونے کے قبل) ان کو (کسی میعاد تک) مہلت دی جاوے گی (کیونکہ میعاد اس وقت دی جاتی ہے جبکہ مقدمے میں گنجائش ہو، اور گنجائش نہ ہونے پر اوّل ہی پیشی میں حکمِ سزا ہو جاتا ہے)۔

معارف ومسائل

علمِ دِین کا اِظہار اور پھیلانا واجب اور اس کا چھپانا سخت حرام ہے

آیتِ مذکورہ میں اِرشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایاتِ بینات نازل کی گئی ہیں ان کا لوگوں سے چھپانا اتنا بڑا جرمِ عظیم ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت کرتے ہیں اور تمام مخلوق لعنت بھیجتی ہے، اس سے چند اَحکام حاصل ہوئے:-

اوّل یہ کہ جس علم کے اِظہار اور پھیلانے کی ضرورت ہے اس کا چھپانا حرام ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ يَعْلَمُهٗ فَكَتَمَهٗ اَلْجَمَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنَ النَّارِ۔ [1]

(رواه ابو هريرةؓ وعمرو بن العاصؓ، اخرجه ابن ماجة- از قرطبی)

"یعنی جو شخص دِین کے کسی حکم کا علم رکھتا ہے اور اس سے وہ حکم دریافت کیا جائے، اگر وہ اس کو چھپائے گا تو قیامت کے روز اس کے منہ میں اللہ تعالیٰ آگ کا لگام ڈالیں گے۔"

حضراتِ فقہاء نے فرمایا کہ یہ وعید اس صورت میں ہے جبکہ اس کے سوا کوئی دُوسرا آدمی مسئلہ کا بیان کرنے والا وہاں موجود نہ ہو، اور اگر دُوسرے علماء بھی موجود ہوں تو گنجائش ہے کہ یہ کہہ دے کہ دُوسرے علماء سے دریافت کرلو۔ (قرطبی، جصّاص)

دُوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ جس کو خود صحیح علم حاصل نہیں اس کو مسائل واَحکام بتانے کی جرأت نہیں کرنا چاہئے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ علم کو چھپانے کی یہ سخت وعید انہیں علوم ومسائل کے متعلق ہے جو قرآن وسنت میں واضح بیان کئے گئے ہیں اور جن کے ظاہر کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہے وہ باریک اور دقیق مسائل جو عوام نہ سمجھ سکیں بلکہ خطرہ ہو کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے تو ایسے مسائل واَحکام کا عوام کے سامنے بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے، اور وہ کتمانِ علم

---

[1] سنن ابن ماجة، المقدمة، باب من سئل عن علم فكتمه ج:۱ ص:۲۳

کے حکم میں نہیں ہے، آیتِ مذکورہ میں لفظ مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى سے اسی کی طرف اِشارہ پایا جاتا ہے، ایسے ہی مسائل کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ تم اگر عوام کو ایسی حدیثیں سناؤ گے جن کو وہ پوری طرح نہ سمجھ سکیں تو ان کو فتنہ میں مبتلا کر دو گے۔ (قرطبی) [1]

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ عام لوگوں کے سامنے صرف اتنے ہی علم کا اِظہار کرو جس کو ان کی عقل و فہم برداشت کر سکے، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کریں، [2] کیونکہ جو بات ان کی سمجھ سے باہر ہوگی، ان کے دِلوں میں اس سے شبہات وخدشات پیدا ہوں گے، اور ممکن ہے کہ اس سے اِنکار کر بیٹھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مخاطب کے حالات کا اندازہ لگا کر کلام کرے، جس شخص کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اُس کے سامنے ایسے مسائل بیان ہی نہ کرے، اسی لئے حضراتِ فقہاء بہت سے مسائل کے بیان کے بعد لکھ دیتے ہیں: "هٰذَا مِمَّا يُعْرَفُ وَلَا يُعَرَّفُ" یعنی یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اہلِ علم کو خود تو سمجھ لینا چاہئے مگر عوام میں پھیلانا نہیں چاہئے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَا تَمْنَعُوا الْحِكْمَةَ اَهْلَهَا فَتَظْلِمُوْهُمْ وَلَا تَضَعُوْهَا فِيْ غَيْرِ اَهْلِهَا فَتَظْلِمُوْهَا۔

"یعنی حکمت کی بات کو ایسے لوگوں سے نہ روکو جو اس بات کے اہل ہوں، اگر تم نے ایسا کیا تو ان لوگوں پر ظلم ہوگا، اور جو اہل نہیں ہیں ان کے سامنے حکمت کی باتیں نہ رکھو، کیونکہ اس صورت میں اس حکمت پر ظلم ہوگا۔"

اِمام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کسی کافر کو جو مسلمانوں کے مقابلہ میں مناظرے کرتا ہو، یا کوئی متبدع گمراہ جو لوگوں کو اپنے غلط خیالات کی طرف دعوت دیتا ہو اس کو علمِ دِین سکھانا اُس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ ظن غالب نہ ہو جائے کہ علم سکھانے سے اس کے خیالات دُرست ہو جائیں گے۔

اسی طرح کسی بادشاہ یا حاکمِ وقت کو ایسے مسائل بتلانا جن کے ذریعے وہ رعیت پر ظلم کرنے کا راستہ نکال لیں جائز نہیں، اسی طرح عوام کے سامنے اَحکامِ دِین میں رُخصتیں اور حیلوں کی صورتیں بلاضرورت بیان نہ کرنا چاہئے، جس کی وجہ سے وہ اَحکامِ دِین پر عمل کرنے میں حیلہ جوئی کے عادی بن جائیں۔ (قرطبی)

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۸۴

[2] صحيح البخاری، کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوما دون قوم...إلخ ج:۱ ص:۲۴

حدیثِ رسول بھی قرآن کے حکم میں ہے

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر قرآن کی یہ آیت نہ ہوتی تو میں تم سے کوئی حدیث بیان نہ کرتا۔[۱] آیت سے مراد یہی آیت ہے جس میں کتمانِ علم پر لعنت کی وعیدِ شدید مذکور ہے، ایسے ہی بعض دُوسرے صحابہؓ نے بھی بعض روایاتِ حدیث کے ذِکر کرنے کے ساتھ ایسے ہی الفاظ فرمائے کہ اگر قرآنِ کریم کی یہ آیت کتمانِ علم کے بارے میں نہ ہوتی تو میں یہ حدیث بیان نہ کرتا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآن ہی کے حکم میں ہے، کیونکہ آیت میں تو کتمان کی وعید اُن لوگوں کے لئے آئی ہے جو قرآن میں نازل شدہ ہدایات و بینات کو چھپائیں، اس میں حدیث کا صراحۃً ذِکر نہیں، لیکن صحابہ کرامؓ نے حدیثِ رسول کو بھی قرآن ہی کے حکم میں سمجھ کر اس کے اِخفا کرنے کو اس وعید کا سبب سمجھا۔

بعض گناہوں کا وبال ایسا ہوتا ہے کہ اس پر ساری مخلوق لعنت کرتی ہے

وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ میں قرآنِ کریم نے لعنت کرنے والوں کو متعین نہیں کیا کہ کون لوگ لعنت کرتے ہیں، امامِ تفسیر مجاہدؒ اور عکرمہؒ نے فرمایا کہ اس عدمِ تعیین سے اِشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دُنیا کی ہر چیز اور ہر مخلوق ان پر لعنت کرتی ہے، یہاں تک کہ تمام جانور اور حشرات الارض بھی اُن پر لعنت کرتے ہیں، کیونکہ ان کی بداعمالی سے ان سب مخلوقات کو نقصان پہنچتا ہے، حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللّٰعِنُوْنَ سے مراد تمام زمین پر چلنے والے جانور ہیں۔[۲] (قرطبی بحوالۂ ابنِ ماجہ باسناد حسن)

کسی معین شخص پر لعنت اس وقت تک جائز نہیں جب تک اس کے کفر پر مرنے کا یقین نہ ہو

وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ کے لفظ سے جصّاصؒ اور قرطبیؒ وغیرہ نے یہ اِستنباط کیا ہے کہ جس کافر کے کفر کی حالت میں مرنے کا یقین نہ ہو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں، اور چونکہ ہمیں کسی شخص کے خاتمے کا یقینی علم ہونے کا اب کوئی ذریعہ نہیں، اس لئے کسی کافر کا نام لے کر اس پر لعنت کرنا جائز نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کافروں پر نام لے کر لعنت کی ہے آپ کو ان کی موت علی الکفر کا منجانب اللہ علم ہو گیا تھا، البتہ عام کافروں، ظالموں پر بغیر تعیین کے لعنت کرنا دُرست ہے۔

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم ج:۱ ص:۲۲

[۲] سنن ابن ماجة، ابواب الفتن، باب العقوبات ج:۲ ص:۲۹۰

اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ جب لعنت کا معاملہ اتنا شدید ہے کہ کسی کافر پر بھی اُس وقت تک جائز نہیں جب تک اس کا یقین نہ ہو جائے کہ اس کی موت کفر ہی پر ہوگی، تو کسی مسلمان پر یا کسی جانور پر لعنت کیسے جائز ہو سکتی ہے، اور عوام اس سے بالکل غفلت میں ہیں، خصوصاً عورتیں کہ بات بات پر لعنت کے الفاظ اپنے متعلقین کے متعلق استعمال کرتی رہتی ہیں، اور لعنت صرف لفظ ''لعنت'' ہی کے کہنے سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ہم معنی جو الفاظ ہیں وہ بھی لعنت ہی کے حکم میں ہیں۔ لعنت کے اصلی معنی خدا تعالیٰ کی رحمت سے دُور کرنے کے ہیں، اس لئے کسی کو مردُود، راندۂ درگاہ، اللہ مارا وغیرہ کے الفاظ کہنا بھی لعنت ہی کے حکم میں ہے۔

ع ۱۹ / ۱۱ / ۳

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٣﴾ اِنَّ

اور معبود تم سب کا ایک ہی معبود ہے، کوئی معبود نہیں اس کے سوا، بڑا مہربان ہے نہایت رحم والا۔ بے شک

فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ

آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دِن کے بدلتے رہنے میں اور کشتیوں میں جو کہ لے کر

تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ

چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے کام کی چیزیں اور پانی میں جس کو کہ اُتارا اللہ نے آسمان سے

فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠

پھر جلایا اس سے زمین کو اس کے مرگئے پیچھے اور پھیلائے اس میں سب قسم کے جانور

وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو کہ تابعدار ہے اس کے حکم کا درمیان آسمان وزمین کے،

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿١٦٤﴾

بے شک اُن سب چیزوں میں نشانیاں ہیں عقل مندوں کے لئے۔

آسان ترجمۂ قرآن

تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے۔ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں جو سب پر مہربان، بہت مہربان ہے۔ ۞۱۶۳ بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، رات دن کے لگا تار آنے جانے میں، اُن کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لے کر سمندر میں تیرتی ہیں، اُس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اُتارا اور اس کے ذریعے زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے، اور ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع دار بن کر کام میں لگے ہوئے ہیں، اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۞۱۶۴

ربط

مشرکینِ عرب نے جو آیت وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ اپنے عقیدہ کے خلاف سنی تو تعجب سے کہنے لگے کہ کہیں سارے جہان کا ایک معبود بھی ہو سکتا ہے، اور اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو کوئی دلیل پیش کرنا چاہئے، حق تعالیٰ آگے دلیل بیان فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (ایسا معبود) جو تم سب کے معبود بننے کا مستحق وہ تو ایک ہی معبود (حقیقی) ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی رحمٰن ہے، رحیم ہے، (اور کوئی ان صفات میں کامل نہیں، اور بدونِ کمالِ صفات معبودیت کا اِستحقاق باطل ہے، پس بجز معبودِ حقیقی کے کوئی اور مستحقِ عبادت نہ ہوا) بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دِن کے آنے میں اور جہازوں (کے چلنے) میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں (اور اَسباب) لے کر، اور (بارش کے) پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا، پھر اس (پانی) سے زمین کو تر و تازہ کیا، اس کے خشک ہوئے پیچھے (یعنی اس میں نباتات پیدا کئے) اور (ان نباتات سے) ہر قسم کے حیوانات اس (زمین) میں پھیلا دیئے (کیونکہ حیوانات کی زندگی اور توالد و تناسل اسی غذائے نباتی کی بدولت ہے) اور ہواؤں کی (سمتیں اور کیفیتیں) بدلنے میں (کہ کبھی پروا ہے، کبھی پچھوا ہوا، کبھی گرم ہے کبھی سرد) اور اَبر (کے وجود) میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید (اور معلق) رہتا ہے (ان تمام چیزوں میں) دلائل (توحید کے موجود ہیں) ان لوگوں کے (اِستدلال کے) لئے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

معارف و مسائل

توحید کا وسیع مفہوم

وَ اِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ اللہ تعالیٰ کی توحید متعدد اور مختلف حیثیتوں سے ثابت ہے، مثلاً وہ ایک ہے، یعنی کائنات میں کوئی اس کی نظیر و شبیہ نہیں، نہ کوئی اس کا ہمسر و برابر ہے، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے۔

دُوسرے یہ کہ وہ ایک ہے اِستحقاقِ عبادت میں، یعنی اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔

تیسرے یہ کہ وہ ایک ہے یعنی ذی اجزاء نہیں، وہ اجزاء و اعضاء سے پاک ہے، نہ اس کا تجزیہ اور تقسیم ہوسکتی ہے۔

چوتھے یہ کہ وہ ایک ہے، یعنی اپنے وجودِ اَزَلی ابدی میں ایک ہے، وہ اس وقت بھی موجود تھا جب کوئی چیز موجود نہ تھی، اور اُس وقت بھی موجود رہے گا جب کوئی چیز موجود نہ رہے گی، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے، لفظ واحد میں یہ تمام حیثیتیں توحید کی ملحوظ ہیں۔ (جصّاص)

اس کے بعد حق تعالیٰ کے واحدِ حقیقی ہونے پر تکوینی علامات و دلائل بتلائے گئے ہیں جن کو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق اور رات دِن کے دائمی اِنقلاب اس کی قدرتِ کاملہ اور توحید کے واضح دلائل ہیں کہ ان چیزوں کی پیدائش اور بقا میں کسی دُوسری ہستی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی طرح پانی پر کشتیوں کا چلنا ایک بڑی آیتِ قدرت ہے، کہ پانی کو حق تعالیٰ نے ایسا جوہرِ سیال بنادیا کہ رقیق اور سیال ہونے کے باوجود اس کی پیٹھ پر لاکھوں من وزن کے جہاز بڑے بڑے وزن کو لے کر مشرق سے مغرب تک منتقل کردیتے ہیں، اور ان کو حرکت میں لانے کے لئے ہواؤں کا چلانا اور پھر اپنی حکمت کے ساتھ ان کے رُخ بدلتے رہنا یہ سب اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان چیزوں کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا کوئی بڑا علیم و خبیر اور حکیم ہے۔ اگر پانی کا مادّہ سیال نہ ہو تو یہ کام نہیں ہوسکتا، اور مادّہ سیال بھی ہو تو جب تک ہوائیں نہ چلیں جو اِن جہازوں کو حرکت میں لاتی ہیں، جہازوں کا لمبی لمبی مسافتیں طے کرنا ممکن نہیں، قرآنِ کریم نے اسی مضمون کو فرمایا:-

اِنۡ يَّشَاۡ يُسۡكِنِ الرِّيۡحَ فَيَظۡلَلۡنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهۡرِهٖ ؕ (الشوریٰ: ۳۳)

''اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو ہواؤں کو ساکن کردیں، اور یہ جہاز سمندر کی پشت پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔''

بِمَا يَنۡفَعُ النَّاسَ کے لفظ میں اِشارہ کردیا گیا کہ بحری جہازوں کے ذریعہ ایک ملک کا سامان دُوسرے ملک میں درآمد و برآمد کرنے کے ذریعہ عام اِنسانوں کے بے شمار فائدے ہیں جن کو شمار بھی نہیں کیا جاسکتا، اور یہ فائدے ہر زمانے،

ہر ملک میں نئی نئی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں۔

اسی طرح آسمان سے پانی کو قطرہ قطرہ کر کے اس طرح نازل کرنا کہ اس سے کسی چیز کو نقصان نہ پہنچے، اگر سیلاب کی طرح آتا تو کوئی آدمی، جانور، سامان کچھ نہ رہتا، پھر پانی برسنے کے بعد اس کا زمین پر محفوظ رکھنا، انسان کے بس کا نہیں، اگر کہہ دیا جاتا کہ چھ مہینے کے پانی کا کوٹہ اپنا اپنا ہر شخص رکھ لے، تو ہر شخص اس کے رکھنے کا کیا انتظام کرتا، اور کسی طرح رکھ بھی لیتا تو اس کو سڑنے اور خراب ہو جانے سے کیسے بچاتا، قدرت نے یہ سب انتظامات خود فرما دیئے، ارشاد فرمایا:-

فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ (المؤمنون)

"یعنی ہم نے ہی پانی کو زمین کے اندر ٹھہرا دیا، اگرچہ ہمیں اس کی بھی قدرت تھی کہ بارش کا پانی برسنے کے بعد بہہ کر ختم ہو جاتا۔"

مگر قدرت نے پانی کو اہلِ زمین انسان اور جانوروں کے لئے کہیں کھلے طور پر تالابوں اور حوضوں میں جمع کر دیا، کہیں پہاڑوں کی زمین میں پھیلی ہوئی رگوں کے ذریعہ زمین کے اندر اُتار دیا، اور پھر ایک غیر محسوس پائپ لائن ساری زمین میں بچھا دی، ہر شخص جہاں چاہے کھود کر پانی نکال لیتا ہے، اور اسی پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بحرِ منجمد بنا کر برف کی صورت میں پہاڑوں کے اُوپر لاد دیا، جو سڑنے اور خراب ہونے سے بھی محفوظ ہے، اور آہستہ آہستہ پگھل کر زمین کے اندر قدرتی پائپ لائن کے ذریعے پورے عالم میں پہنچتا ہے، غرض آیتِ مذکورہ میں قدرتِ کاملہ کے چند مظاہر کا بیان کر کے توحید کو ثابت کیا گیا، علمائے مفسرین نے ان تمام چیزوں پر تفصیلی بحث کی ہے، دیکھئے جصّاص، قرطبی وغیرہ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ

اور بعضے لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو، ان کی محبت ایسے رکھتے ہیں جیسے محبت اللہ کی،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ

اور ایمان والوں کو ان سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی، اور اگر دیکھ لیں یہ ظالم اس وقت کو جبکہ دیکھیں گے

الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

عذاب کہ قوت ساری اللہ ہی کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اس کے باوجود) لوگوں میں کچھ وہ بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو اس کی خدائی میں اس طرح شریک قرار دیتے ہیں کہ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ کی محبت (رکھنی چاہئے)۔ اور جو لوگ ایمان لاچکے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ اور کاش کہ یہ ظالم جب (دُنیا میں) کوئی تکلیف دیکھتے ہیں اُسی وقت یہ سمجھ لیا کریں کہ تمام تر طاقت اللہ ہی کو حاصل ہے، اور یہ کہ اللہ کا عذاب (آخرت میں) اُس وقت بڑا سخت ہوگا ﴿۱۶۵﴾

ربط

اُوپر کی آیات میں توحید کا اِثبات تھا، آگے مشرکین کی غلطی اور وعید کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور ایک آدمی وہ (بھی) ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک (خدائی) قرار دیتے ہیں (اور ان کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں اور) ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے (رکھنا) ضروری ہے، (یہ حالت تو مشرکین کی ہے) اور جو مؤمن ہیں ان کو (صرف) اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے، (کیونکہ اگر کسی مشرک کو یہ ثابت ہوجاوے کہ میرے معبود سے مجھ پر کوئی ضرر پڑے گا تو فوراً محبت منقطع ہوجاوے، اور مؤمن باوجود اس کے کہ نافع وضار حق تعالیٰ ہی کو اِعتقاد کرتا ہے، لیکن پھر بھی محبت ورضا اس کی باقی رہتی ہے، ونیز اکثر مشرکین مصیبتِ شدیدہ کے وقت اپنے شرکاء کو چھوڑ دیتے ہیں، اور مؤمنین من حیث الایمان مصیبت میں بھی خدا کو نہ چھوڑتے تھے، اور محاورات میں ایسے قضایا باعتبار حالتِ عالیہ کے بھی صادق ہوتے ہیں) اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دُنیا میں) کسی مصیبت کو دیکھتے تو (اس کے وقوع میں غور کرکے) یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے، (اور دُوسرے سب اس کے سامنے عاجز ہیں، چنانچہ اس مصیبت کو نہ کوئی روک سکا نہ ٹال سکا اور نہ ایسے وقت میں اور کوئی یاد رہا) اور (اس مصیبت کی شدّت میں غور کرکے) یہ (سمجھ لیا کرتے) کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں کہ دارالجزاء ہے اور بھی) سخت ہوگا، (تو اس طرح غور کرنے سے تراشیدہ معبودوں کا عجز اور حق تعالیٰ کی قدرت وعظمت منکشف ہوکر توحید واِیمان اِختیار کرلیتے)۔

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ

جبکہ بیزار ہوجاویں گے وہ کہ جن کی پیروی کی تھی اُن سے جو کہ اُن کے پیرو ہوئے تھے اور دیکھیں گے عذاب

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً

اور منقطع ہوجاویں گے ان کے سب علاقے۔ اور کہیں گے پیرو: کیا اچھا ہوتا جو ہم کو دُنیا کی طرف لوٹ جانا مِل جاتا

فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ

تو پھر ہم بھی بیزار ہوجاتے ان سے جیسے یہ ہم سے بیزار ہوگئے، اسی طرح پر دِکھلائے گا اللہ ان کو ان کے کام

ع ٢٠

حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾

حسرت دِلانے کو اور وہ ہرگز نکلنے والے نہیں نار سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

جب وہ (پیشوا) جن کے پیچھے یہ لوگ چلتے رہے ہیں، اپنے پیروکاروں سے مکمل بے تعلقی کا اعلان کریں گے، اور یہ سب لوگ عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیں گے، اور ان کے تمام باہمی رشتے کٹ کر رہ جائیں گے ﴿١٦٦﴾ اور جنہوں نے ان (پیشواؤں) کی پیروی کی تھی وہ کہیں گے کہ کاش ہمیں ایک مرتبہ پھر (دُنیا میں) لوٹنے کا موقع دے دیا جائے، تو ہم بھی ان (پیشواؤں) سے اسی طرح بے تعلقی کا اعلان کریں جیسے انہوں نے ہم سے بے تعلقی کا اعلان کیا ہے۔ اس طرح اللہ انہیں دِکھادے گا کہ ان کے اعمال (آج) اُن کے لئے حسرت ہی حسرت بن چکے ہیں، اور اب وہ کسی صورت دوزخ سے نکلنے والے نہیں ہیں ﴿١٦٧﴾

ربط

اُوپر عذابِ آخرت کو سخت فرمایا ہے، آگے اس سختی کی کیفیت کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

(وہ سختی عذاب کی اس وقت معلوم ہوگی) جبکہ (ان مشرکین میں سے) وہ (ذی اثر) لوگ جن کے کہنے پر دُوسرے (عوام) چلتے تھے، ان (عام) لوگوں سے صاف الگ ہوجاویں گے جو اُن کے کہنے پر چلے تھے اور سب (خواص وعوام) عذاب کا مشاہدہ کرلیں گے اور باہم ان میں جو تعلقات تھے (کہ ایک تابع تھا، دُوسرا متبوع تھا وغیرہ وغیرہ) اس وقت سب قطع ہوجاویں گے (جیسے دُنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ جرم میں سب شریک ومتفق ہوتے ہیں، اور تنقیحِ مقدمہ کے وقت سب الگ الگ بچنا چاہتے ہیں، حتیٰ کہ باہم دگر شناخت تک کے منکر ہوجاتے ہیں) اور (جب) یہ تابع لوگ (متبوعین کی یہ طوطاچشمی دیکھیں گے تو بڑے جھنجلاویں گے، اور تو کچھ نہ ہوسکے گا مگر جھلاکر) یوں کہنے لگیں گے: کسی طرح ہم سب کو (دُنیا میں) بس ذرا ایک دفعہ جانا مل جاوے تو ہم بھی ان سے (اتنا بدلہ تو لے لیں کہ اگر یہ پھر ہم کو اپنے تابع ہونے کی ترغیب دیں تو ہم بھی ان سے) صاف (ٹکا سا جواب دے کر) الگ ہوجاویں جیسا یہ ہم سے (اس وقت) صاف الگ ہو بیٹھے (اور کہہ دیں کہ جناب آپ وہی ہیں کہ عین موقع پر بے رُخی کی تھی، اب ہم سے کیا غرض، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تجویزوں اور سوچ بچاروں سے کیا ہاتھ آوے گا فقط) اللہ تعالیٰ یوں ہی اُن کی بداعمالیوں کو خالی ارمان (کے پیرائے میں) کرکے ان کو دِکھلا دیں گے اور ان (تابعین ومتبوعین سب) کو دوزخ سے نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا (کیونکہ شرک کی سزا خلود فی النار ہے)۔

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۡ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ اور پیروی نہ کرو

الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٦٨﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ

شیطان کی، بے شک وہ تمہارا دُشمن ہے صریح۔ وہ تو یہی حکم کرے گا تم کو کہ برے کام اور بے حیائی کرو

وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٦٩﴾

اور جھوٹ لگاؤ اللہ پر وہ باتیں جن کو تم نہیں جانتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے لوگو! زمین میں جو حلال پاکیزہ چیزیں ہیں وہ کھاؤ، اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ یقین جانو کہ وہ تمہارے لئے ایک کھلا دُشمن ہے ﴿١٦٨﴾ وہ تو تم کو یہی حکم دے گا کہ تم بدی اور بے حیائی کے کام کرو اور اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔ ﴿١٦٩﴾

خلاصۂ تفسیر

(بعض مشرکین بتوں کے نام جانور چھوڑتے تھے، اور ان سے منتفع ہونے کو باعتقاد ان کی تعظیم کے حرام سمجھتے تھے اور اپنے اس فعل کو حکمِ الٰہی اور موجبِ رضائے حق و وسیلۂ تقرب الی اللہ بواسطۂ شفاعت ان بتوں کے سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس باب میں خطاب فرماتے ہیں کہ) اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے (شرعی) حلال پاک چیزوں (کی نسبت اِجازت ہے کہ اُن) کو کھاؤ (برتو) اور (ان میں سے کسی حلال چیز سے یہ سمجھ کر پرہیز کرنا کہ اس سے اللہ راضی ہوگا، یہ سب شیطانی خیالات ہیں تم) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، فی الواقع وہ (شیطان) تمہارا صریح دُشمن ہے (کہ ایسے ایسے خیالات وجہالات سے تم کو خسرانِ ابدی میں گرفتار کر رکھا ہے اور دُشمن ہونے کی وجہ سے) وہ تم کو اُنہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ (شرعاً) بری اور گندی ہیں، اور یہ (بھی تعلیم کرے گا) کہ اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن کی تم سند بھی نہیں رکھتے (مثلاً یہی کہ ہم کو خدا تعالیٰ کا اس طرح حکم ہے)۔

معارف ومسائل

حل اللغات

حَلٰلًا طَيِّبًا، لفظ "حَـلّ" کے اصلی معنی گرہ کھولنے کے ہیں، جو چیز اِنسان کے لئے حلال کردی گئی گویا ایک گرہ کھول دی گئی اور پابندی ہٹادی گئی۔ حضرت سہل بن عبداللہؒ فرماتے ہیں کہ نجات تین چیزوں میں منحصر ہے: حلال کھانا، فرائض ادا کرنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اِتباع کرنا۔ اور لفظ "طیّب" کے معنی ہیں پاکیزہ جس میں شرعی حلال ہونا بھی داخل ہے اور طبعی مرغوب ہونا بھی۔

خُطُوٰتِ، خطوہ کی جمع ہے، اتنی مقدار کو خطوہ کہتے ہیں جو دونوں قدموں کے درمیان کا فاصلہ ہے، خطواتِ شیطان سے مراد شیطانی اعمال وافعال ہیں۔

بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ، "سوء" وہ چیز جس کو دیکھ کر عقل مند شریف آدمی کو دُکھ ہو، "فحشاء" بے حیائی کا کام۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ "سوء" سے مراد مطلق معصیت اور "فحشاء" سے مراد کبیرہ گناہ ہے۔ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ شیطان کے اَمر اور حکم کرنے سے مراد دِل میں وسوسہ ڈالنا ہے، جیسا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم کے بیٹے کے قلب میں ایک شیطانی اِلہام واثر ہوتا ہے، اور دُوسرا فرشتہ کی طرف سے، شیطانی وسوسہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بُرے کام کرنے کے فوائد اور مصالح سامنے آتی ہیں، اور حق کو جھٹلانے کی راہیں کھلتی ہیں، اور اِلہامِ فرشتہ کا اثر خیر اور نیکی پر اِنعام وفلاح کا وعدہ اور حق کی تصدیق پر قلب کا مطمئن ہونا ہوتا ہے۔ [1]

مسئلہ:- سانڈ وغیرہ جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں، یا اور کوئی جانور مرغا، بکرا وغیرہ کسی بزرگ یا اور کسی غیر اللہ کے نامزد کردیا جاتا ہے، اس کا حرام ہونا ابھی چار آیتوں کے بعد وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (البقرۃ:۱۷۳) کے تحت آنے والا ہے۔ اس آیت يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ میں ایسے جانور کے حرام ہونے کی نفی کرنا منظور نہیں، جیسا کہ بعضوں کو شبہ ہوگیا بلکہ مقصد اس فعل کی حرمت وممانعت ہے کہ غیر اللہ کے تقرب کے لئے جانوروں کو چھوڑ دینا اور اس عمل کو موجبِ برکت وتقرب سمجھنا، اور ان جانوروں کو اپنے اُوپر حرام کرلینے کا معاہدہ کرلینا، اس کو دائمی سمجھنا، یہ سب افعال ناجائز اور ان کا کرنا گناہ ہے۔

تو حاصلِ مطلب آیت کا یہ ہے کہ جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حلال بنایا ہے ان کو بتوں کے نام کرکے حرام نہ بناؤ، بلکہ اپنی حالت پر چھوڑ کر کھاؤ پیو، اور اگر ایسی حرکت جہالت سے ہوجائے تو اِصلاحِ نیت کے ساتھ تجدیدِ ایمان اور توبہ کرکے اس حرمت کو ختم کرو، اس طرح ان جانوروں کو تعظیماً حرام قرار دینا تو گناہ ہوا، مگر غیر اللہ کے نام پر کردینے سے یہ مردار اور نجس کے حکم میں ہوگیا، نجاست کی وجہ سے حرمت ثابت ہوگئی۔ [2]

مسئلہ:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے جہالت یا غفلت سے کسی جانور کو کسی غیر اللہ کے ساتھ نامزد کرکے چھوڑ دیا تو اس کی توبہ یہی ہے کہ اپنے اس خیالِ حرمت سے رُجوع کرے اور اس فعل سے توبہ کرے، تو پھر اس کا گوشت حلال ہوجائے گا، واللہ اعلم۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ

اور جب کوئی ان سے کہے کہ تابعداری کرو اس حکم کی جو کہ نازل فرمایا اللہ نے تو کہتے ہیں: ہرگز نہیں، ہم تو تابعداری کریں گے

[1] جامع الترمذي، ابواب التفسير، ومن سورة البقرة ج:۲ ص:۱۲۸

[2] شروع میں حضرت مؤلف قدس سرہٗ کی رائے یہی تھی جو یہاں مذکور ہے کہ یہ جانور حرام ہوگیا، لیکن بعد میں رائے تبدیل ہوئی، جو آگے صفحہ: ۴۲۳ و ۴۲۴ پر آیت ۱۷۲ کے تحت پر مذکور ہے، اسی کے مطابق حضرتؒ نے "امداد المفتین" کے صفحہ: ۹۴۱ پر سوال نمبر ۸۳۵ کے جواب کے آخر میں "قولِ مختار" کے عنوان سے فتویٰ دیا ہے۔
احقر محمد تقی عثمانی ۱/۶/۱۴۳۱ھ

مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا

اس کی جس پر دیکھا ہم نے اپنے باپ دادوں کو، بھلا اگرچہ اُن کے باپ دادے نہ سمجھتے ہوں کچھ بھی

وَّلَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ

اور نہ جانتے ہو سیدھی راہ۔ اور مثال اُن کافروں کی ایسی ہے جیسے پکارے کوئی شخص ایسی چیز کو جو کچھ نہ سنے

اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

سوائے پکارنے اور چلانے کے، بہرے، گونگے، اندھے ہیں، سو وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ اس کلام کی پیروی کرو جو اللہ نے اُتارا ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو ان باتوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے۔ بھلا کیا اس صورت میں بھی (ان کو یہی چاہئے) جب ان کے باپ دادے (دِین کی) ذرا بھی سمجھ نہ رکھتے ہوں، اور انہوں نے کوئی (آسمانی) ہدایت بھی حاصل نہ کی ہو؟ ﴿۱۷۰﴾ اور جن لوگوں نے کفر کو اَپنا لیا ہے ان (کو حق کی دعوت دینے) کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے کوئی شخص اُن (جانوروں) کو زور زور سے بلائے جو ہانک پکار کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، لہٰذا کچھ نہیں سمجھتے ﴿۱۷۱﴾

خلاصۂ تفسیر

اور جب کوئی ان (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم (اپنے پیغمبر کے پاس) بھیجا ہے، اس پر چلو تو (جواب میں) کہتے ہیں (کہ نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقہ) پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (کیونکہ وہ لوگ اس طریقہ کے اِختیار کرنے میں مامور من اللہ تھے، حق تعالیٰ ان پر رَدّ فرماتے ہیں) کیا (ہر حالت میں یہ لوگ اپنے باپ دادا ہی کے طریقہ پر چلیں گے) اگرچہ اُن کے باپ دادا (دِین کی) نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ (کسی آسمانی کتاب کی) ہدایت رکھتے ہوں۔

وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ (اِلٰی قولہ) فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ اور ان کافروں کی کیفیت (نافہمی میں) اس

(جانور) کی کیفیت کے مثل ہے (جس کا ذکر اس مثال میں کیا جاتا ہے) کہ ایک شخص ہے وہ ایسے (جانور) کے پیچھے چلا رہا ہے، جو بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی (پرمضمون) بات نہیں سنتا (اسی طرح) یہ کفار (بھی ظاہری بات چیت تو سنتے ہیں، لیکن کام کی بات سے بالکل) بہرے ہیں (گویا سنا ہی نہیں) گونگے ہیں (کہ کبھی ایسی بات زبان ہی پر نہیں آتی) اندھے ہیں (کیونکہ نفع نقصان نظر ہی نہیں آتا) سو (جب سارے ہی حواس مختل ہیں تو) سمجھتے (سمجھاتے) کچھ نہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت سے جس طرح باپ دادوں کی اندھی تقلید و اِتباع کی مذمت ثابت ہوئی، اسی طرح جائز تقلید و اِتباع کے شرائط اور ایک ضابطہ بھی معلوم ہوگیا، جس کی طرف دو لفظوں میں اِشارہ فرمایا ہے لَا يَعْقِلُوْنَ اور لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿١٧٠﴾ کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ ان آباء و اجداد کی تقلید و اِتباع کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ انہیں نہ عقل تھی نہ ہدایت۔ ''ہدایت'' سے مراد وہ اَحکام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح طور پر نازل کئے گئے، اور عقل سے مراد وہ جو بذریعہ اِجتہاد نصوصِ شرعیہ سے اِستنباط کئے گئے۔

تو وجہ ان کے اِتباع و تقلید کے عدمِ جواز کی یہ ہے کہ اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کئے ہوئے اَحکام ہیں، اور نہ اس کی صلاحیت کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے اَحکام نکال سکیں، اس میں اِشارہ پایا گیا کہ جس عالم کے متعلق یہ اِطمینان ہو جائے کہ اس کے پاس قرآن و سنت کا علم ہے، اور اس کو درجۂ اِجتہاد بھی حاصل ہے کہ جو اَحکام صراحۃً قرآن و سنت میں نہ ہوں ان کو نصوصِ قرآن و سنت سے بذریعہ قیاس نکال سکتا ہے، تو ایسے عالم مجتہد کی تقلید و اِتباع جائز ہے، نہ اس لئے کہ اس کا حکم ماننا اور اس کا اِتباع کرنا ہے، بلکہ اس لئے کہ حکم اللہ کا ماننا اور اسی کا اِتباع کرنا ہے، مگر چونکہ ہم براہِ راست اللہ کے حکم سے واقف نہیں ہو سکتے، اس لئے کسی عالم مجتہد کا اِتباع کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام پر عمل ہو سکے۔

جاہلانہ تقلید اور ائمۂ مجتہدین کی تقلید میں فرق

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مطلق تقلیدِ ائمۂ مجتہدین کے خلاف اس طرح کی آیات پڑھ دیتے ہیں، وہ خود ان آیات کے صحیح مدلول سے واقف نہیں۔

اِمام قرطبیؒ نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت میں تقلیدِ آبائی کے ممنوع ہونے کا جو ذِکر ہے اس سے مراد باطل عقائد و اعمال میں آباء و اجداد کی تقلید کرنا ہے، عقائدِ صحیحہ و اعمالِ صالحہ میں تقلید اس میں داخل نہیں، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام میں ان دونوں چیزوں کی وضاحت سورۂ یوسف میں اس طرح آئی ہے:-

اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَھُمْ بِالْاٰخِرَةِ ھُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ (یوسف)

''میں نے ان لوگوں کی ملت و مذہب کو چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اور جو آخرت کے منکر ہیں، اور میں نے اتباع کیا اپنے آباء ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا۔''

اس میں پوری وضاحت سے ثابت ہوگیا کہ آباء کی تقلید باطل میں حرام ہے، حق میں جائز بلکہ مستحسن ہے۔

امام قرطبیؒ نے اسی آیت کے ذیل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کے متعلق بھی مسائل واحکام بیان کئے ہیں، اور فرمایا ہے:-

تَعَلَّقَ قَوْمٌ بِھٰذِهِ الْاٰیَةِ فِیْ ذَمِّ التَّقْلِیْدِ (اِلٰی) وَھٰذَا فِی الْبَاطِلِ صَحِیْحٌ اَمَّا التَّقْلِیْدُ فِی الْحَقِّ فَاَصْلٌ مِنْ اُصُوْلِ الدِّیْنِ وَعِصْمَةٌ مِّنْ عِصَمِ الْمُسْلِمِیْنَ یَلْجَاءُ اِلَیْھَا الْجَاهِلُ الْمُقَصِّرُ عَنْ دَرْكِ النَّظَرِ۔ (تفسیر القرطبی تحت ھٰذه الآیة ج:۲ ص:۲۱۱)

''کچھ لوگوں نے اس آیت کو تقلید کی مذمت میں پیش کیا ہے، اور یہ باطل کے معاملہ میں تو صحیح ہے، لیکن حق کے معاملہ میں تقلید سے اس کا کوئی تعلق نہیں، حق میں تقلید کرنا تو دین کے اُصول میں سے ایک مستقل بنیاد ہے، اور مسلمانوں کے دین کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے کہ جو شخص اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ دین کے معاملے سے تقلید ہی پر اعتماد کرتا ہے۔''

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ

اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور شکر کرو اللہ کا اگر

كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ

تم اسی کے بندے ہو۔ اس نے تم پر یہی حرام کیا ہے مردہ جانور اور لہو اور گوشت

الْخِنْزِیْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ

سور کا اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی بے اختیار ہوجائے نہ تو نافرمانی کرے اور نہ زیادتی

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

تو اس پر کچھ گناہ نہیں، بے شک اللہ ہے بڑا بخشنے والا نہایت مہربان

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں رزق کے طور پر عطا کی ہیں، ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ، اور اللہ کا شکر ادا کرو، اگر واقعی تم صرف اسی کی بندگی کرتے ہو ﴿۱۷۲﴾ اُس نے تو تمہارے لئے بس مردار جانور، خون، اور سور کا گوشت حرام کیا ہے، نیز وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔ ہاں اگر کوئی شخص انتہائی مجبوری کی حالت میں ہو (اور ان چیزوں میں سے کچھ کھالے) جبکہ اس کا مقصد نہ لذّت حاصل کرنا ہو اور نہ وہ (ضرورت کی) حد سے آگے بڑھے، تو اُس پر کوئی گناہ نہیں۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۷۳﴾

خلاصۂ تفسیر

(اُوپر اَکلِ طیبات کے معاملہ میں مشرکین کی غلطی بتلا کر ان کی اِصلاح مقصود تھی، آگے اہلِ اِیمان کو اس بات سے متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس غلطی میں مشرکین کی موافقت نہ کرنے لگیں، اِسی کے ضمن میں اہلِ اِیمان کو اپنے اِنعامات کا ذِکر اور اس پر اَدائے شکر کی تعلیم بھی ہے۔)

اے ایمان والو! (ہماری طرف سے تم کو اِجازت ہے کہ) جو (شرع کی رُو سے) پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (برتو) اور (اس اِجازت کے ساتھ یہ حکم ہے کہ) حق تعالیٰ کی شکرگزاری کرو، (زبان سے بھی ہاتھ پاؤں سے خدمت وطاعت بجالا کر بھی، اور دِل سے ان نعمتوں کو من جانب اللہ سمجھ کر بھی) اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو (اور یہ تعلق ہونا مُسلّم اور ظاہر ہے، پس وجوبِ شکر بھی ثابت ہے)۔

ربط

اُوپر تو اس کا بیان تھا کہ حلال کو حرام مت کرو، آگے یہ مذکور ہوتا ہے کہ حرام کو حلال مت سمجھو، جیسا کہ مشرکین اس میں مبتلا تھے، مثلاً مردار جانور اور ایسے جانور جن کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، مشرکین ان کو کھایا کرتے تھے، اس سے منع کیا گیا، اسی کے ضمن میں یہ بھی بتلا دیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں، ان کے سوا دُوسرے جانوروں کو اپنی طرف سے حرام قرار دینا غلطی ہے، اس سے پچھلے مضمون کی تائید ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف (ان چیزوں کو) حرام کیا ہے (اور ان چیزوں کو حرام نہیں کیا جن کو تم اپنی طرف سے حرام کر رہے ہو، جیسا کہ گزرا یعنی) مردار (جانور) کو (جو باوجود واجب الذبح ہونے کے بلا ذبحِ شرعی مر جاوے) اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت کو (اسی طرح اس کے سب اجزاء کو بھی) اور ایسے جانور کو جو (بقصدِ تقرب) غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو (ان سب کو بے شک حرام کیا ہے) پھر بھی (اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص (بھوک سے بہت ہی) بے تاب ہو جاوے، بشرطیکہ نہ تو (کھانے میں) طالبِ لذت ہو، اور نہ (قدرِ ضرورت وحاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان چیزوں سے کھانے میں بھی) اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا، واقعی اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور رحیم (کہ ایسے وقت میں یہ رحمت فرمائی کہ گناہ کی چیز میں بھی گناہ اُٹھا دیا)۔

معارف ومسائل

حلال کھانے کی برکت اور حرام کھانے کی نحوست

آیاتِ مذکورہ میں جیسے حرام کھانے کی ممانعت کی گئی ہے، اسی طرح حلال طیب چیزوں کے کھانے اور اس پر شکر گزار ہونے کی ترغیب بھی ہے، کیونکہ جس طرح حرام کھانے سے اخلاقِ رذیلہ پیدا ہوتے ہیں، عبادت کا ذوق جاتا رہتا ہے، دُعا قبول نہیں ہوتی، اسی طرح حلال کھانے سے ایک نور پیدا ہوتا ہے، اَخلاقِ رذیلہ سے نفرت، اخلاقِ فاضلہ کی رغبت پیدا ہوتی ہے، عبادت میں دِل لگتا ہے، گناہ سے دِل گھبراتا ہے، دُعا قبول ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے سب رسولوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (المؤمنون:۵۱)

’’اے (ہمارے) رسولو! تم پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔‘‘

اس میں اِشارہ ہے کہ نیک عمل کرنے میں رزقِ حلال کو بڑا دخل ہے، اسی طرح قبولِ دُعا میں حلال کھانا معین اور حرام مانعِ قبول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت سے لوگ طویل السفر پریشان حال اللہ کے سامنے دُعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں، اور ’’یا رَبِّ، یا رَبِّ‘‘ پکارتے ہیں، مگر کھانا اُن کا حرام، پینا اُن کا حرام، لباس اُن کا حرام، غذا اُن کی حرام، ان حالات میں اُن کی دُعا کہاں قبول ہوسکتی ہے۔ (صحیح مسلم، ترمذی، از ابن کثیر) [1]

اِنَّمَا حَرَّمَ، کلمہ اِنَّمَا حصر کے لئے آتا ہے، اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف وہ چیزیں

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب بیان ان اسم الصدقۃ ...إلخ ج:۱ ص:۳۲۶ وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، ومن سورۃ البقرۃ ج:۲ ص:۱۲۸

حرام کی ہیں جن کا آگے ذِکر کیا جاتا ہے، اس کے سوا کچھ حرام نہیں، اس آیت میں تو لفظ اِنَّمَا سے اس کی طرف اِشارہ ہوا، اور دُوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ بھی آیا ہے: قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ الآیہ (الانعام:۱۴۵) اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ اِعلان کر دیں کہ میری وحی میں بجز ان چند چیزوں کے جن کا ذِکر آگے کیا گیا ہے، اور کوئی چیز حرام نہیں۔

مگر اس پر اِشکال یہ ہے کہ دُوسری آیاتِ قرآنیہ اور اَحادیثِ نبویہ سے ان چند چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے، تو یہ حصر اور حرمتِ ماسویٰ کی نفی کیسے دُرست ہوگی؟

جواب یہ ہے کہ یہاں مطلق حلال وحرام کا بیان نہیں، بلکہ ان مخصوص جانوروں کی حلت وحرمت کا بیان ہے جن کے بارے میں مشرکینِ مکہ اپنے مشرکانہ عقائد کی غلطیاں کیا کرتے تھے، پچھلی آیت میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ بہت سے حلال جانوروں کو مشرکین حرام سمجھتے تھے، یا اپنے اُوپر حرام کرلیتے تھے، اس کی مخالفت کی گئی تھی، اس کے بالمقابل یہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں جن سے تم اِجتناب نہیں کرتے، اور جو اللہ کے نزدیک حلال ہیں ان سے پرہیز کرتے ہو، اس لئے اس جگہ حصر مطلق نہیں، بلکہ اِضافی ہے مشرکانہ عقائد کے بالمقابل۔

آگے اس آیت میں جن چیزوں کو حرام قرار دِیا گیا ہے، وہ چار چیزیں یہ ہیں:-

۱-میتہ (مردار)، ۲-خون، ۳-لحمِ خنزیر، ۴-وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ پھر چاروں چیزوں کی مزید تشریحات خود قرآنِ کریم کی دُوسری آیات اور اَحادیثِ صحیحہ میں آئی ہیں جن کو ملانے کے بعد ان چاروں چیزوں کے اَحکام حسبِ ذیل ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

میتہ

جس کو اُردو میں ''مردار'' کہتے ہیں، اس سے مراد وہ جانور ہے جس کے حلال ہونے کے لئے اَز روئے شرع ذبح کرنا ضروری ہے، مگر وہ بغیر ذبح کے خود بخود مر جائے، یا گلا گھونٹ کر یا کسی دُوسری طرح چوٹ مار کر مار دِیا جائے، تو وہ مردار اور حرام ہے، لیکن خود قرآنِ کریم کی دُوسری آیت: اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (المائدۃ:۹۶) سے معلوم ہوا کہ دریائی جانور کے لئے ذبح کرنا شرط نہیں، وہ بلا ذبح بھی جائز ہے، اس بنا پر اَحادیثِ صحیحہ میں مچھلی اور ٹڈی کو میتہ سے مستثنیٰ قرار دے کر حلال کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے لئے دو مردار حلال کر دیئے گئے، ایک مچھلی دُوسرے ٹڈی، اور دو خون حلال کر دیئے گئے، جگر اور طحال۔ (ابنِ کثیر از احمد، ابنِ ماجہ، دارقطنی) [1]

---

[1] سنن الدارقطني، باب الصيد والذبائح رقم الحديث:۴۷۹۴ وابن ماجة، ابواب الصيد، باب صيد الحيتان والجراد ج:۲ ص:۲۳۲ ومسند احمد رقم الحديث:۵۴۶۵

معلوم ہوا کہ جانوروں میں سے مچھلی اور ٹڈی بغیر ذبح کے حلال ہیں، خواہ وہ خود مر جائیں، یا کسی کے مارنے سے مرجائیں، البتہ جو مچھلی سڑ جانے کی وجہ سے خود پانی کے اُوپر آجائے وہ حرام ہے۔ (جصّاص) [۱]

اسی طرح وہ شکاری جانور جو قابو میں نہیں کہ ذبح کرلیا جائے اور اس کو بھی بسم اللہ پڑھ کر تیر وغیرہ دھاردار چیز سے زخم لگادیں تو بغیر ذبح کے حلال ہوجاتا ہے، مطلقاً زخمی ہوجانا کافی نہیں، کسی آلۂ جارحہ تیز دھار سے زخمی ہونا شرط ہے۔

بندوق کی گولی سے شکار

مسئلہ:- بندوق کی گولی سے کوئی جانور زخمی ہوکر قبل ذبح مرجائے تو وہ ایسا ہے جیسے پتھر یا لاٹھی مارنے سے مرجائے، جس کو قرآنِ کریم کی دُوسری آیت میں "مَوْقُوْذَةٌ" کہا گیا ہے، اور حرام قرار دِیا ہے، ہاں مرنے سے پہلے اس کو ذبح کرلیا جائے تو حلال ہوجائے گا۔

مسئلہ:- آج کل بندوق کی ایک گولی نوکدار بنائی گئی ہے، اس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ تیر کے حکم میں ہے، مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ بھی تیر کی طرح آلۂ جارحہ نہیں، بلکہ خارقہ ہے، جس سے بارُود کی طاقت کے ذریعہ گوشت پھٹ جاتا ہے، ورنہ خود اس میں کوئی دھار نہیں جس سے جانور زخمی ہوجائے، اس لئے ایسی گولی کا شکار بھی بغیر ذبح کے جائز نہیں۔

مسئلہ:- آیتِ مذکورہ میں مطلقاً میتہ کو حرام قرار دِیا ہے، اس لئے جس طرح اس کا گوشت کھانا حرام ہے اس کی خرید وفروخت بھی حرام ہے، یہی حکم تمام نجاسات کا ہے کہ جیسے ان کا اِستعمال حرام ہے اُن کی خرید وفروخت اور ان سے نفع اُٹھانا بھی حرام ہے، یہاں تک کہ مردار جانور یا ناپاک کوئی چیز باختیارِ خود جانور کو کھلانا بھی جائز نہیں، ہاں ایسی جگہ رکھ دے جہاں سے کوئی کتا بلی خود کھالے، یہ جائز ہے، مگر خود اُٹھا کر ان کو کھلانا جائز نہیں۔ (جصاص، قرطبی وغیرہ) [۲]

مسئلہ:- اس آیت میں میتہ کے حرام ہونے کا حکم عام معلوم ہوتا ہے، جس میں میتہ کے تمام اجزاء شامل ہیں، لیکن دُوسری آیت میں اس کی تشریح: عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ کے الفاظ سے کردی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ مردار جانور کے وہ اجزاء حرام ہیں، جو کھانے کے قابل ہیں، اس لئے مردار جانور کی ہڈی، بال جو کھانے کی چیز نہیں، وہ پاک ہیں، اور ان کا اِستعمال جائز ہے، آیتِ قرآنِ کریم: وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝۸۰ (النحل) میں اُن جانوروں کے بالوں کو مطلقاً جائز الانتفاع قرار دِیا ہے، ذبیحہ کی شرط نہیں (جصّاص)۔ کھال پر چونکہ خون وغیرہ کی نجاست لگی

---

[۱] احکام القرآن للجصّاص ج:۱ ص:۱۰۷ تا ۱۰۹

[۲] احکام القرآن للجصّاص، باب جلود المیتة إذا دبغت ج:۱ ص:۱۱۷

ہوتی ہے اس لئے وہ دباغت سے پہلے حرام ہے، مگر دباغت دینے کے بعد حلال اور جائز ہے، احادیثِ صحیحہ میں اس کی مزید تصریح موجود ہے۔ (جصّاص) [۱]

مسئلہ:- مردار جانور کی چربی اور اس سے بنائی ہوئی چیزیں بھی حرام ہیں، ان کا اِستعمال کسی طرح سے جائز نہیں، اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔

مسئلہ:- یورپ وغیرہ سے آئی ہوئی چیزیں صابون وغیرہ جن میں چربی اِستعمال ہوتی ہے، ان سے پرہیز کرنا اِحتیاط ہے، مگر مردار کی چربی ہونے کا علم یقینی نہ ہونے کی وجہ سے گنجائش ہے، نیز اس وجہ سے بھی کہ بعض صحابہ کرام، ابن عمرؓ، ابوسعید خدریؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ نے مردار کی چربی کا صرف کھانے میں اِستعمال حرام قرار دِیا ہے، خارجی اِستعمال کی اِجازت دی ہے، اس لئے اس کی خرید و فروخت کو بھی جائز رکھا ہے۔ (جصّاص) [۲]

مسئلہ:- دُودھ کا پنیر بنانے میں ایک چیز اِستعمال کی جاتی ہے جس کو عربی زبان میں "اِنفَحَہ" کہا جاتا ہے، یہ جانور کے پیٹ سے نکالی جاتی ہے، اس کو دُودھ میں شامل کرنے سے دُودھ جم جاتا ہے، اب اگر یہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا ہو تو اس کے اِستعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، مذبوح جانور کا گوشت، چربی وغیرہ سب حلال ہیں، لیکن غیر مذبوح جانور کے پیٹ سے لیا جائے تو اس میں فقہاء کا اِختلاف ہے، اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ اور اِمام مالکؒ اس کو پاک قرار دیتے ہیں، لیکن صاحبین اِمام ابویوسفؒ و محمدؒ اور ثوریؒ وغیرہ اس کو ناپاک کہتے ہیں۔ (جصّاص، قرطبی) [۳]

یورپ اور دُوسرے غیر اِسلامی ملکوں سے جو پنیر بنا ہوا آتا ہے، اس میں غیر مذبوح جانوروں کا انفحہ اِستعمال ہونے کا اِحتمال غالب ہے، اس لئے جمہور فقہاء کے قول پر اس سے پرہیز کرنا چاہئے، اِمامِ اعظمؒ اور اِمام مالکؒ کے قول پر گنجائش ہے، ہاں یورپ سے آئے ہوئے بعض پنیر ایسے بھی ہیں جن میں خنزیر کی چربی اِستعمال ہوتی ہے، اور ڈبے پر لکھا ہوا ہوتا ہے، وہ قطعاً حرام اور نجس ہیں۔

خون کے مسائل

دُوسری چیز جو آیتِ مذکورہ میں حرام قرار دِی گئی ہے وہ خون ہے، لفظ "دَم" بمعنی خون اس آیت میں اگرچہ مطلق ہے، مگر سورۂ اَنعام کی آیت میں اس کے ساتھ "مَسْفُوْحٌ" یعنی بہنے والا ہونے کی شرط ہے، اَوْدَمًا مَّسْفُوْحًا (الانعام:۱۴۵) اس لئے باتفاقِ فقہاء خونِ منجمد جیسے گردہ، تلی وغیرہ وہ حلال اور پاک ہیں۔

---

[۱] احکام القرآن للجصّاص باب شعر المیتة وصوفها ... إلخ ج:۱ ص:۱۲۱

[۲] بحوالۂ بالا۔

[۳] احکام القرآن للجصّاص، باب منفحة المیتة ولبنها ج:۱ ص:۱۱۹، ۱۲۰

مسئلہ:- جبکہ حرام صرف بہنے والا خون ہے تو جو خون ذبح کے بعد گوشت میں لگا رہ جاتا ہے وہ پاک ہے، فقہاءؒ، وصحابہؓ وتابعینؒ اور اُمت کا اس پر اتفاق ہے، اسی طرح مچھر، مکھی، کھٹمل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں، لیکن زیادہ ہو جائے تو اس کو بھی دھونا چاہئے۔ (جصّاص) [1]

مسئلہ:- جس طرح خون کا کھانا پینا حرام ہے، اسی طرح اس کا خارجی استعمال بھی حرام ہے، اور جس طرح تمام نجاسات کی خرید وفروخت بھی اور اس سے نفع اُٹھانا حرام ہے، اسی طرح خون کی خرید وفروخت بھی حرام ہے، اس سے حاصل کی ہوئی آمدنی بھی حرام ہے، کیونکہ الفاظِ قرآنی میں مطلقاً ''دَم'' کو حرام فرمایا ہے، جس میں اس کے اِستعمال کی تمام صورتیں شامل ہیں۔

مریض کو دُوسرے کا خون دینے کا مسئلہ

تحقیق اس مسئلہ کی یہ ہے کہ انسانی خون اِنسان کا جزء ہے، اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے، اس کا اصل تقاضا تو یہی ہے کہ ایک اِنسان کا خون دُوسرے کے بدن میں داخل کرنا دو وجہ سے حرام ہو، اوّل اس لئے کہ اعضائے اِنسانی کا اِحترام واجب ہے، اور یہ اُس اِحترام کے منافی ہے، دُوسرے اس لئے کہ خون نجاستِ غلیظہ ہے اور نجس چیزوں کا اِستعمال ناجائز ہے۔

لیکن اِضطراری حالات اور عام معالجات میں شریعتِ اِسلام کی دی ہوئی سہولتوں میں غور کرنے سے اُمورِ ذیل ثابت ہوئے:-

اوّل یہ کہ خون اگرچہ جزءِ انسانی ہے، مگر اس کو کسی دُوسرے اِنسان کے بدن میں منتقل کرنے کے لئے اعضائے اِنسانی میں کاٹ چھانٹ اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آتی، انجکشن کے ذریعے خون نکالا اور دُوسرے کے بدن میں ڈالا جاتا ہے، اس لئے اس کی مثال دُودھ کی سی ہوگئی جو بدنِ انسانی سے بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے نکلتا اور دُوسرے اِنسان کا جزء بنتا ہے، اور شریعتِ اِسلام نے بچے کی ضرورت کے پیشِ نظر انسانی دُودھ ہی کو اس کی غذا قرار دِیا ہے، اور ماں پر اپنے بچوں کو دُودھ پلانا واجب کیا، جب تک وہ بچوں کے باپ کے نکاح میں رہے، طلاق کے بعد ماں کو دُودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بچوں کا رِزق مہیا کرنا باپ کی ذمہ داری ہے، وہ کسی دُوسری عورت سے دُودھ پلوائے، یا ان کی ماں ہی کو معاوضہ دے کر اس سے دُودھ پلوائے، قرآنِ کریم میں اس کی واضح تصریح موجود ہے:-

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ (الطّلاق:٦)

''اگر تمہاری مطلقہ بیوی تمہارے بچوں کو دُودھ پلائے تو اس کو اُجرت ومعاوضہ دے دو۔''

---

[1] احکام القرآن للجصّاص، باب تحریم الدم ج:۱ ص:۱۲۳

خلاصہ یہ ہے کہ دُودھ جزءِ انسانی ہونے کے باوجود بوجہ ضرورت اس کے استعمال کی اجازت بچوں کے لئے دی گئی ہے، اور علاج کے طور پر بڑوں کے لئے بھی، جیسا کہ عالمگیری میں ہے:-

وَلَا بَأْسَ بِاَنْ يُّسْعَطَ الرَّجُلُ بِلَبَنِ الْمَرْاَةِ وَيَشْرَبَهُ لِلدَّوَاءِ۔ [1] (عالمگیری)

"اس میں مضائقہ نہیں کہ دوا کے لئے کسی شخص کی ناک میں عورت کا دُودھ ڈالا جائے یا پینے میں استعمال کیا جائے۔"

اور مغنی ابنِ قدامہ میں اس مسئلہ کی مزید تفصیل مذکور ہے۔(مغنی، کتاب الصید ج:۸ ص:۲۰۲)

اگر خون کو دُودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید از قیاس نہیں، کیونکہ دُودھ بھی خون کی بدلی ہوئی صورت ہے، اور جزءِ انسان ہونے میں مشترک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ دُودھ پاک ہے اور خون ناپاک، تو حرمت کی پہلی وجہ یعنی جزءِ انسانی ہونا تو یہاں وجۂ ممانعت نہ رہی، صرف نجاست کا معاملہ رہ گیا، علاج ودوا کے معاملے میں بعض فقہاء نے خون کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔

اس لئے انسان کا خون دُوسرے کے بدن میں منتقل کرنے کا شرعی حکم یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں تو جائز نہیں، مگر علاج ودوا کے طور پر اس کا استعمال اضطراری حالت میں بلاشبہ جائز ہے، اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو اور کوئی دُوسری دوا اس کی جان بچانے کے لئے مؤثر یا موجود نہ ہو، اور خون دینے سے اس کی جان بچنے کا ظن غالب ہو، ان شرطوں کے ساتھ خون دینا تو اس نصِ قرآنی کی رُو سے جائز ہے، جس میں مضطر کے لئے مردار جانور کھا کر جان بچانے کی اجازت صراحۃً مذکور ہے، اور اگر اضطراری حالت نہ ہو یا دُوسری دوائیں بھی کام کرسکتی ہوں تو ایسی حالت میں مسئلہ مختلف فیہا ہے، بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے، بعض ناجائز کہتے ہیں، جس کی تفصیل کتبِ فقہ، بحث تداوی بالمحرم میں مذکور ہے، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ أعلم۔ احقر کا ایک مستقل رسالہ بھی اس موضوع پر شائع ہوگیا ہے جس کا نام ہے "اعضائے انسانی کی پیوندکاری" اس کو ملاحظہ فرمایا جائے۔

تحریمِ خنزیر

تیسری چیز جو اس آیت میں حرام کی گئی ہے وہ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ ہے، آیت میں حرمتِ خنزیر کے ساتھ "لحم" کی قید مذکور ہے، امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس سے مقصود لحم یعنی گوشت کی تخصیص نہیں، بلکہ اس کے تمام اجزاء ہڈی، کھال، بال، پٹھے سب ہی باجماعِ اُمت حرام ہیں، لیکن لفظ "لحم" بڑھا کر اشارہ اس طرف ہے کہ خنزیر دُوسرے حرام جانوروں

---

[1] عالمگیری، کتاب الکراھیۃ، باب فی التداوی ج:۵ ص:۳۵۵

کی طرح نہیں ہے کہ وہ ذبح کرنے سے پاک ہوسکتے ہیں، اگرچہ کھانا حرام ہی رہے، کیونکہ خنزیر کا گوشت ذبح کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا، کہ وہ نجس العین بھی ہے، حرام بھی، صرف چمڑا سینے کے لئے اس کے بال کا اِستعمال حدیث میں جائز قرار دِیا ہے۔ (جصّاص، قرطبی) [۱]

مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کی تین صورتیں

چوتھی چیز جس کو آیت میں حرام قرار دِیا گیا ہے وہ جانور ہے جو غیر اللہ کے لئے نامزد کردیا گیا ہو، جس کی تین صورتیں متعارف ہیں، اوّل یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا جائے، اور بوقتِ ذبح اسی غیر اللہ کا نام لیا جائے، یہ صورت باتفاق وباجماعِ اُمت حرام ہے، اور یہ جانور میتہ ہے، اس کے کسی جز سے اِنتفاع جائز نہیں، کیونکہ یہ صورت آیت: مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح ہے جس میں کسی کا اِختلاف نہیں۔

دُوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الیٰ غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے، یعنی اس کا خون بہانے سے تقرب الیٰ غیر اللہ مقصود ہو، لیکن بوقتِ ذبح اس پر نام اللہ ہی کا لیا جائے جیسے بہت سے ناواقف مسلمان بزرگوں، پیروں کے نام پر اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بکرے، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں، لیکن ذبح کے وقت اس پر نام اللہ ہی کا پکارتے ہیں، یہ صورت بھی باتفاقِ فقہاء حرام اور مذبوحہ مردار ہے۔

مگر تخریج دلیل میں کچھ اِختلاف ہے، بعض حضراتِ مفسرین وفقہاء نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح قرار دِیا ہے، جیسا کہ حواشی بیضاوی میں ہے:-

فَكُلُّ مَا نُوْدِيَ عَلَيْهِ بِغَيْرِ اسْمِ اللّٰهِ فَهُوَ حَرَامٌ وَإِنْ ذُبِحَ بِاسْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى حَيْثُ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ لَوْ اَنَّ مُسْلِمًا ذَبَحَ ذَبِيْحَةً وَقَصَدَ بِذَبْحِهِ التَّقَرُّبَ إِلٰى غَيْرِ اللّٰهِ صَارَ مُرْتَدًّا وَذَبِيْحَتُهٗ ذَبِيْحَةُ مُرْتَدٍّ۔

''ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام کردیا گیا وہ حرام ہے، اگرچہ بوقتِ ذبح اللہ ہی کا نام لیا ہو، اس لئے کہ علماء فقہاء کا اِتفاق ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد ہوجاوے گا، اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ کہلائے گا۔''

نیز درمختار، کتاب الذبائح میں ہے:-

ذُبِحَ لِقُدُوْمِ الْاَمِيْرِ وَنَحْوِهٖ كَوَاحِدٍ مِّنَ الْعُظَمَاءِ يَحْرُمُ لِاَنَّهٗ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَلَوْ ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ وَاَقَرَّهُ الشَّامِي۔ (ج:۵ ص:۲۱۴) [۲]

---

[۱] احکام القرآن للجصّاص، باب تحریم الخنزیر ج:۱ ص:۱۲۴

[۲] الدر المختار ج:۶ ص:۳۰۹

''کسی امیر یا بڑے کے آنے پر جانور ذبح کیا تو وہ حرام ہوگا، کیونکہ وہ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں داخل ہے، اگر چہ بوقتِ ذبح اللہ ہی کا نام لیا ہو، اور شامی نے اس کی تائید کی۔'' [1]

اور بعض حضرات نے اس صورت کو مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا مدلول صریح تو نہیں بنایا کیونکہ وہ بحیثیت عربیت تکلف سے خالی نہیں، مگر بوجہ اشتراکِ علت یعنی تقرب الیٰ غیر اللہ کی نیت کے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے، احقر کے نزدیک یہی وجہ اَحوَط اور اَسلم ہے۔

نیز اس صورت کی حرمت کے لئے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے، یعنی وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (المائدۃ:۳) ان تمام چیزوں کو کہا جاتا ہے، جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہے، معنی یہ ہیں کہ وہ جانور جس کو معبوداتِ باطلہ کے لئے ذبح کیا گیا ہے، اس سے پہلے وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا ذِکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مَآ اُهِلَّ کا مدلول صریح تو وہی جانور ہے جس پر بوقتِ ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا، اور ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (المائدۃ:۳) اس کے بالمقابل آیا ہے، جس میں غیر اللہ کے نام لینے کا ذِکر نہیں، صرف بتوں وغیرہ کی خوشنودی کی نیت سے ذبح کرنا مراد ہے، اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں جن کو ذبح تو کیا گیا ہے غیر اللہ کے تقرب کے لئے مگر بوقتِ ذبح اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔ (افادہ شیخ حکیم الامتؒ)

اِمام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اِختیار کیا ہے، اُن کی عبارت یہ ہے:-

وَجَرَتْ عَادَةُ الْعَرَبِ بِالصِّيَاحِ بِاسْمِ الْمَقْصُوْدِ بِالذَّبِيْحَةِ وَغَلَبَ ذٰلِكَ فِيْ اِسْتِعْمَالِهِمْ حَتّٰى عَبَّرَ بِهٖ عَنِ النِّيَّةِ الَّتِيْ هِيَ عِلَّةُ التَّحْرِيْمِ۔ [2] (تفسیر قرطبی ج:۲ ص:۲۰۷)

''عرب کی عادت تھی کہ جس کے لئے ذبح کرنا مقصود ہوتا ذبح کرنے کے وقت اس کا نام بلند آواز سے پکارتے، اور یہ رِواج ان میں عام تھا یہاں تک کہ اس آیت میں تقرب الیٰ غیر اللہ کو جو کہ اصل علتِ تحریم ہے اہلال کے لفظ سے تعبیر کردیا۔''

اِمام قرطبیؒ نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرامؓ میں سے دو حضرات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔

---

[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر محض ذبح کے عمل سے کسی بڑے کی تعظیم مقصود ہو تو یہ حرام ہے، لیکن اگر مقصد مہمانی کرنا ہو اور اس مہمانی کے لئے جانور ذبح کیا جائے، یعنی اس کا گوشت مہمان کو کھلانا مقصود ہو، محض ذبح کے عمل سے تعظیم مقصود نہ ہو تو یہ سنتِ ضیافت ہے اور جائز ہے، اور دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ دُوسری صورت میں میزبانی کے لئے گوشت کا حصول مقصود ہوتا ہے، اور پہلی صورت میں تعظیم کی علامت کے طور پر جانور کو ذبح کرنا مقصود ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا گوشت کھایا جائے گا یا نہیں؟ چنانچہ درمختار میں آگے یہی وضاحت کی گئی ہے: ولو ذبح للضيف لا يحرم لأنه سُنَّة الخليل وإكرام الضيف إكرام الله تعالى، والفارق أنه إن قدمها ليأكل منها كان الذبح لله والمنفعة للضيف أو للوليمة أو للربح، وإن لم يقدمها ليأكل منها بل يدفعها لغيره كان لتعظيم غير الله فتحرم۔ علامہ شامیؒ نے اس کی شرح میں مزید تشریح فرمادیا ہے (رد المحتار ج:٦ ص:٣٠٩ و ٣١٠)۔ محمد تقی عثمانی ۲۷/ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ

[2] ج:۲ ص:۲۲۴

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے زمانے میں فرزدق شاعر کے باپ غالب نے ایک اُونٹ ذبح کیا تھا، جس پر کسی غیر اللہ کا نام لینے کا کوئی ذِکر نہیں، مگر حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (المائدۃ:۳) میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، اور سب صحابہ کرامؓ نے اس کو قبول کیا، اسی طرح اِمام مسلمؒ کے شیخ یحییٰ بن یحییٰ کی سند سے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث نقل کی، جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت صدیقہؓ سے سوال کیا کہ اُمّ المؤمنین! ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار عجمی لوگوں میں سے ہیں، اور ان کے یہاں تو روز روز کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا رہتا ہے، یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ تحفہ ہمارے پاس بھی بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں یا نہیں؟ اس پر صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا:-

اَمَّا مَا ذُبِحَ لِذٰلِكَ الْيَوْمِ فَلَا تَاْكُلُوْا وَلٰكِنْ كُلُوْا مِنْ اَشْجَارِهِمْ۔ [۱]

(تفسیر قرطبی ج:۲ ص:۲۰۷)

''جو جانور اِس عید کے دن کے لئے ذبح کیا گیا ہو وہ نہ کھاؤ، لیکن اُن کے درختوں کے پھل وغیرہ کھا سکتے ہو۔''

الغرض یہ صورتِ ثانیہ جس میں نیت تو تقرب الیٰ غیر اللہ کی ہو، مگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے، اوّل تو اِشتراکِ علت یعنی نیت تقرب الیٰ غیر اللہ کی وجہ سے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے حکم میں ہے، دُوسرے آیت وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (المائدۃ:۳) کا بھی مدلول ہے، اس لئے یہ بھی حرام ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو کان کاٹ کر یا کوئی دُوسری علامت لگا کر تقرب الیٰ غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لئے چھوڑ دِیا جائے، نہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے کا قصد ہو، بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جانیں، یہ جانور مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اور وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (المائدۃ:۳) دونوں میں داخل نہیں، بلکہ اس قسم کے جانور کو ''بحیرہ'' یا ''سائبہ'' وغیرہ کہا جاتا ہے، اور حکم ان کا یہ ہے کہ یہ فعل تو بنصِ قرآن حرام ہے، جیسا کہ آیت مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ (المائدۃ:۱۰۳) میں اِن شاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

مگر ان کے اس حرام عمل سے اور اس جانور کو حرام سمجھنے کے عقیدہ سے یہ جانور حرام نہیں ہو جاتا بلکہ اس کو حرام سمجھنے میں تو ان کے عقیدۂ باطلہ کی تائید و تقویت ہوتی ہے، اس لئے یہ جانور عام جانوروں کی طرح حلال ہے۔

مگر شرعی اُصول کے مطابق یہ جانور اپنے مالک کی مِلک سے خارج نہیں ہوا، اسی کا مملوک ہے، اگرچہ وہ اپنے عقیدہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میری مِلک سے نکل کر غیر اللہ کے لئے وقف ہو گیا، مگر شرعاً اس کا یہ عقیدہ باطل ہے، وہ جانور بدستور اس کی مِلک میں ہے۔

---

[۱] بحوالۂ بالا۔

اب اگر وہ شخص خود اس جانور کو کسی کے ہاتھ فروخت کردے یا ہبہ کردے تو اس کے لئے یہ جانور حلال ہے، جیسا کہ بکثرت ہندو اپنے دیوتاؤں کے نام بکری یا گائے وغیرہ کو اپنے نزدیک وقف کر کے چھوڑ دیتے ہیں اور مندروں کے پجاریوں، جوگیوں کو اختیار دیتے ہیں وہ جو چاہیں کریں، یہ مندروں کے پجاری اُن کو مسلمانوں کے ہاتھ بھی فروخت کردیتے ہیں۔

یا اسی طرح بعض جاہل مسلمان بھی بعض مزارات پر ایسا ہی عمل کرتے ہیں کہ بکرا یا مرغا چھوڑ دیتے ہیں، اور مزارات کے مجاورین کو اختیار دیتے ہیں وہ ان کو فروخت کردیتے ہیں، تو جو لوگ اِن جانوروں کو اُن لوگوں سے خرید لیں جن کو اصل مالک نے اختیار دیا ہے ان کے لئے ان کا خریدنا اور ذبح کر کے کھانا اور فروخت کرنا سب حلال ہے۔

نذر لغیر اللہ کا مسئلہ

یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دُوسری چیزوں سے ہے، مثلاً مٹھائی، کھانا وغیرہ جن کو غیر اللہ کے نام پر نذر (منّت) کے طور سے، ہندو لوگ بتوں پر اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں، حضرات فقہاء نے اس کو بھی اشتراکِ علت یعنی تقرب الیٰ غیر اللہ کی وجہ سے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے حکم میں قرار دے کر حرام کہا ہے، اور اس کے کھانے پینے، دُوسروں کو کھلانے اور بیچنے خریدنے سب کو حرام کہا ہے، [1] کتب فقہ بحرالرائق وغیرہ میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں، یہ مسئلہ قیاسی ہے جس کو نص قرآنی متعلقہ حیوانات پر قیاس کیا گیا ہے، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ أعلم۔

اِضطرار و مجبوری کے اَحکام

آیتِ مذکورہ میں چار چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد ایک حکم اِستثنائی مذکور ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾ اس حکم میں اتنی آسانی کردی گئی ہے کہ جو شخص بھوک سے بہت ہی بے تاب ہوجائے، بشرطیکہ نہ تو کھانے میں طالبِ لذت ہو، اور نہ قدرِ ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس حالت میں اُن حرام چیزوں کو کھا لینے سے بھی اس شخص کو کوئی گناہ نہیں ہوتا، بے شک اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور و رحیم۔

اس میں "مضطر" کے لئے جان بچانے کے واسطے دو شرطوں کے ساتھ ان حرام چیزوں کے کھا لینے سے بھی گناہ اُٹھا دیا گیا ہے۔

"مضطر" شرعی اِصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی جان خطرے میں ہو، معمولی تکلیف یا ضرورت سے

---

[1] البحر الرائق، کتاب الذبائح ج:۶ ص:۴۵۳

مضطر نہیں کہا جاسکتا، تو جو شخص بھوک سے ایسی حالت پر پہنچ گیا کہ اگر کچھ نہ کھائے تو جان جاتی رہے گی، اس کے لئے دو شرطوں کے ساتھ یہ حرام چیزیں کھالینے کی گنجائش دی گئی ہے، ایک شرط یہ ہے کہ مقصود جان بچانا ہو، کھانے کی لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، دُوسری شرط یہ ہے کہ صرف اتنی مقدار کھائے جو جان بچانے کے لئے کافی ہو، پیٹ بھر کر کھانا یا قدرِ ضرورت سے زائد کھانا اس وقت بھی حرام ہے۔

اہم فائدہ

یہاں قرآنِ عزیز نے اِضطرار کی حالت میں بھی حرام چیزوں کے کھانے کو حلال نہیں فرمایا، بلکہ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو اَب بھی اپنی جگہ حرام ہی ہیں، مگر اس کے کھانے والے سے بوجہ اِضطرار کے اِستعمالِ حرام کا گناہ معاف کردیا گیا، حلال ہوجانے اور گناہ معاف کردینے میں بڑا فرق ہے، اگر اِضطراری حالت میں ان چیزوں کو حلال کردینا مقصود ہوتا تو حرمت سے صرف اِستثناء کردینا کافی ہوتا، مگر یہاں صرف اِستثناء پر اکتفا کردینے کے بجائے فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کا اِضافہ فرما کر اس نکتے کی طرف اِشارہ کردیا کہ حرام تو اپنی جگہ حرام ہی ہے، اور اس کا اِستعمال گناہ ہی ہے، مگر مضطر سے یہ گناہ معاف کردیا گیا۔

حالتِ اِضطرار میں دوا کے طور پر حرام چیزوں کا اِستعمال

آیتِ مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ جس شخص کی جان خطرہ میں ہو وہ جان بچانے کے لئے بطور دوا کے حرام چیز کو اِستعمال کرسکتا ہے، مگر آیتِ مذکورہ ہی کے اِشارے سے اس میں چند شرطیں معلوم ہوتی ہیں:-

اوّل یہ کہ حالت اِضطرار کی ہو، خطرہ جان جانے کا ہو، معمولی تکلیف و بیماری کا یہ حکم نہیں۔ دُوسرے یہ کہ بجز حرام چیز کے اور کوئی چیز علاج و دوا کے لئے مؤثر نہ ہو یا موجود نہ ہو، جیسے شدید بھوک کی حالت میں اِستثناء اُسی وقت ہے جبکہ کوئی دُوسری حلال غذا موجود و مقدور نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ اس حرام کے اِستعمال کرنے سے جان بچ جانا یقینی ہو، جیسے بھوک سے مضطر کے لئے ایک دو لقمے حرام گوشت کا کھالینا عادۃً اس کی جان بچانے کا یقینی سامان ہے، اگر کوئی دوا ایسی ہے کہ اس کا اِستعمال مفید تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے شفا یقینی نہیں تو اس دواءِ حرام کا اِستعمال آیتِ مذکورہ کے اِستثنائی حکم میں داخل ہوکر جائز نہیں ہوگا، اس کے ساتھ مزید دو شرطیں آیتِ قرآنی میں منصوص ہیں کہ اس کے اِستعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، اور قدرِ ضرورت سے زائد اِستعمال نہ کرے۔

آیتِ مذکورہ کی تصریح اور اِشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ ہر حرام و ناپاک دوا کا اِستعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی اِستعمال میں باتفاقِ فقہائے اُمت جائز ہے، اُن شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں:-

۱- حالت اِضطرار کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو۔

۲- دُوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

۳- اس دوا سے مرض کا اِزالہ عادۃً یقینی ہو۔

۴- اس کے اِستعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو۔

۵- قدرِ ضرورت سے زائد اس کو اِستعمال نہ کیا جائے۔

غیر اِضطراری حالت میں عام علاج و دوا کے لئے حرام چیز کا اِستعمال

اِضطراری حالت کا مسئلہ تو شرائطِ مذکورہ کے ساتھ نصِ قرآن سے ثابت اور اِجماعی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی ناپاک یا حرام دوا کا اِستعمال جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں فقہاء کا اِختلاف ہے، اکثر فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اِضطرار اور ان تمام شرائط کے جو اُوپر مذکور ہوئیں حرام دوا کا اِستعمال جائز نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے اہلِ اِیمان کے لئے حرام میں شفا نہیں رکھی۔'' (بخاری شریف) [۱]

بعض دُوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعۂ حدیث سے اِستدلال کر کے جائز قرار دیا ہے، وہ واقعہ عُرَنِیِّین کا ہے، جو تمام کتبِ حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اُونٹ کا دُودھ اور پیشاب اِستعمال کرنے کی اِجازت دی جس سے ان کو شفا ہوگئی۔ [۲]

مگر اس واقعہ میں متعدّد اِحتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا اِستعمال مشکوک ہو جاتا ہے، اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جب تک شرائطِ اِضطرار مذکورہ موجود نہ ہوں حرام دوا کا اِستعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہائے متأخرین نے موجودہ زمانے میں حرام و ناپاک دواؤں کی کثرت اور اِبتلائے عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اِجازت دی ہے کہ کوئی دُوسری حلال اور پاک دوا اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

كَمَا فِى الدُّرِّ الْمُخْتَارِ قُبَيْلَ فَصْلِ الْبِيْرِ اِخْتَلَفَ فِى التَّدَاوِىْ بِالْمُحَرَّمِ وَظَاهِرُ الْمَذْهَبِ

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب الأشربة، باب شراب الحلو أو العسل ج:۲ ص:۸۴۰

[۲] صحیح البخاری، کتاب المحاربین، باب لم یُسق المرتدون ...إلخ ج:۲ ص:۱۰۰۵

اَلْمَنْعُ كَمَا فِيْ رِضَاعِ الْبَحْرِ وَلٰكِنْ نَقَلَ الْمُصَنِّفُ ثَمَّ وَهٰهُنَا عَنِ الْحَاوِيْ قِيْلَ يُرَخَّصُ إِذَا عُلِمَ فِيْهِ الشِّفَاءُ وَلَمْ يُعْلَمْ دَوَاءٌ آخَرُ كَمَا رَخَّصَ فِي الْخَمْرِ لِلْعَطْشَانِ وَعَلَيْهِ الْفَتْوٰى۔ [۱] وَمِثْلُهٗ فِي الْعَالَمْگِيْرِيَّةِ۔ (ج:۵ ص:۳۵۵) [۲]

”درمختار میں فصل بیر سے پہلے مذکور ہے حرام چیزوں کو بطورِ دوا استعمال کرنے میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس کی ممانعت آئی ہے، جیسا کہ بحرالرائق کتاب الرضاع میں مذکور ہے، لیکن مصنف تنویر نے اس جگہ رضاع میں بھی اور یہاں بھی حاوی قدسی سے نقل کیا ہے کہ بعض علماء نے فرمایا: دوا وعلاج کے لئے حرام چیزوں کا استعمال اس شرط سے جائز ہے کہ اس دوا کے استعمال سے شفا ہو جانا عادۃً یقینی ہو، اور کوئی حلال دوا اس کا بدل نہ ہو سکے، جیسا کہ پیاسے کے لئے شراب کا گھونٹ پینے کی اجازت دی گئی ہے۔“

مسئلہ:- تفصیل مذکور سے اُن تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہو گیا جو یورپ وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیاء کا ہونا معلوم ویقینی ہو، اور جن دواؤں میں حرام ونجس اجزاء کا وجود مشکوک ہے ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط بہر حال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا لا

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لیتے ہیں اس پر تھوڑا سا مول

أُولٰٓئِكَ مَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا

وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ

يُزَكِّيْهِمْ ج وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ

پاک کرے گا اُن کو اور اُن کے لئے ہے عذاب دردناک۔ یہی ہیں جنہوں نے خریدا گمراہی کو

[۱] الدر المختار ج:۱ ص:۲۱۰

[۲] العالمگيرية، كتاب الكراهية، باب في التداوي ج:۵ ص:۳۵۵

بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

بدلے ہدایت کے اور عذاب بدلے بخشش کے، سو کس قدر صبر کرنے والے ہیں دوزخ پر۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ

یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمائی کتاب سچی، اور جنہوں نے اختلاف ڈالا کتاب میں

لَفِىْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع ۲۱

وہ بے شک ضد میں دُور جا پڑے۔

آسان ترجمۂ قرآن

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت وصول کر لیتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھر رہے۔ قیامت کے دن اللہ ان سے کلام بھی نہیں کرے گا، اور نہ ان کو پاک کرے گا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۷۴﴾ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی، اور مغفرت کے بدلے عذاب کی خریداری کر لی ہے۔ چنانچہ (اندازہ کرو کہ) یہ دوزخ کی آگ سہنے کے لئے کتنے تیار ہیں! ﴿۱۷۵﴾ یہ سب کچھ اس لئے ہوگا کہ اللہ نے حق پر مشتمل کتاب اُتاری ہے، اور جن لوگوں نے ایسی کتاب کے بارے میں مخالفت کا رویہ اختیار کیا ہے وہ ضد اضدی میں بہت دُور نکل گئے ہیں۔ ﴿۱۷۶﴾

خلاصۂ تفسیر و ربطِ آیات

اس سے پہلی آیات میں اُن حرام چیزوں کا ذکر تھا جو محسوسات میں سے ہیں، اگلی آیات میں ایسے حرام کاموں کا ذکر جو محسوس نہیں بلکہ وہ باطنی اور ظاہری اعمالِ شر ہیں، مثلاً علمائے یہود میں یہ مرض تھا کہ عوام سے رشوت لے کر اُن کے مطلب کے موافق غلط فتوے دے دیتے تھے، اور توراۃ کی آیات میں تحریف کر کے اُن کے مطلب کے موافق بناتے تھے، اس میں اُمتِ محمدیہ کے علماء کو بھی تنبیہ ہے کہ وہ ایسے افعال سے اجتناب کریں، کسی نفسانی غرض سے احکامِ حق کے اظہار میں کوتاہی نہ کریں۔

دین فروشی کی سزا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب (کے مضامین) کا اخفا کرتے ہیں اور (خیانت) کے معاوضہ میں (دُنیا کی) متاعِ قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے پیٹ میں آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ تو قیامت میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور نہ (گناہ معاف کرکے) ان کی صفائی کریں گے، اور ان کو سزائے دردناک ہوگی۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے (دُنیا میں تو) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اِختیار کی اور (آخرت میں) مغفرت چھوڑ کر عذاب (سر پر لیا) سو (شاباش ہے اُن کی ہمت کو) دوزخ (میں جانے) کے لئے کیسے باہمت ہیں (اور) یہ (ساری مذکورہ) سزائیں (ان کو) اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے (اس) کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا، اور جو لوگ (ایسی ٹھیک ٹھیک بھیجی ہوئی) کتاب میں بے راہی (اِختیار) کریں، وہ ظاہر ہے کہ بڑی دُور (و دراز) کی خلاف (ورزی) میں (مبتلا) ہوں گے (اور ایسی خلاف ورزی پر ضرور ایسی ہی سخت سزاؤں کا اِستحقاق ہوگا)۔

معارف ومسائل

مسئلہ:- آیاتِ مذکورہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص مال کے لالچ سے حکمِ شرعی کو بدل دے، وہ جو یہ مالِ حرام کھاتا ہے گویا اپنے پیٹ میں جہنم کے انگارے بھر رہا ہے، کیونکہ اس عمل کا انجام یہی ہے، اور بعض محقق علماء نے فرمایا کہ مالِ حرام درحقیقت جہنم کی آگ ہی ہے، اگرچہ اس کا آگ ہونا دُنیا میں محسوس نہیں ہوتا، مگر مرنے کے بعد اس کا یہ عمل آگ کی شکل میں سامنے آجائے گا۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ

نیکی کچھ یہی نہیں کہ منہ کرو اپنا مشرق کی طرف یا مغرب کی، لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے کہ

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۤئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى

جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دِن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور دے

الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ

مال اس کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو

وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ

اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں، اور قائم رکھے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ، اور پورا کرنے والے

بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ

اپنے اقرار کو جب عہد کریں، اور صبر کرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت،

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

یہی لوگ ہیں سچے اور یہی ہیں پرہیز گار۔

آسان ترجمۂ قرآن

نیکی بس یہی تو نہیں ہے کہ اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتابوں اور اس کے نبیوں پر ایمان لائیں، اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیں، اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کریں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اور جب کوئی عہد کرلیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے کے عادی ہوں، اور تنگی اور تکلیف میں، نیز جنگ کے وقت، صبر و استقلال کے خوگر ہوں۔ ایسے لوگ ہیں جو سچے (کہلانے کے مستحق) ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔ ﴿۱۷۷﴾

ربط از "بیان القرآن"

شروع سورت سے یہاں تک تقریباً نصف سورۂ بقرہ ہے، زیادہ رُوئے سخن منکرین کی طرف تھا، کیونکہ سب سے اوّل قرآن کی حقانیت کا اِثبات کیا، اس ضمن میں اس کے ماننے والے اور نہ ماننے والے فرقوں کا ذِکر کیا، پھر توحید و رِسالت کو ثابت کیا، پھر اولادِ ابراہیم علیہ السلام پر اِنعامات و احسانات کو وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ (البقرۃ: ۱۲۴) تک بیان فرمایا، وہاں

سے قبلہ کی بحث چلی، اور اس کو بیان کر کے صفا و مروہ کی بحث پر ختم کیا۔

پھر توحید کے اثبات کے بعد شرک کے اُصول و فروع کا ابطال کیا، اور یہاں تک یہی بیان ہوا، اور ان سب مضامین میں ظاہر ہے کہ منکرین کو زیادہ تنبیہ ہے، اور ضمناً کوئی خطاب مسلمانوں کو ہو جانا اور بات ہے۔

اب آیاتِ آئندہ میں کہ بقیہ تقریباً سورۂ بقرہ کا نصف ہے، زیادہ تر مقصود مسلمانوں کو بعض اُصول و فروع کی تعلیم کرنا ہے، گو ضمناً غیر مسلمین کو بھی کوئی خطاب ہو جاوے، اور یہ مضمون ختم سورۃ تک چلا گیا ہے، جس کو شروع کیا گیا ہے ایک مجمل عنوان "بِرّ" سے، لفظ "بِرّ" بکسر الباء عربی زبان میں مطلق خیر کے معنی میں ہے، جو تمام ظاہری اور باطنی طاعات و خیرات کو جامع ہے، اور اوّل آیات میں الفاظِ جامعہ سے کلی اور اُصولی تعلیم دی گئی ہے، مثلاً ایمان بالکتاب وایتاءِ مال و وفاءِ عہد و صبر حین البأس وغیرہ، جس میں قرآنی تمام اَحکام کے بنیادی اُصول آگئے، کیونکہ شریعت کے کل اَحکام کا حاصل تین چیزیں ہیں: عقائد، اعمال، اخلاق، باقی تمام جزئیات انہیں کلیات کے تحت میں داخل ہیں، اور اس آیت میں ان تینوں قسم کے بڑے بڑے شعبے آگئے۔

آگے اس "بِرّ" کی تفصیل چلی ہے، جس میں سے بہت سے اَحکام باقتضائے وقت و مقام مثل قصاص و وصیت و روزہ و جہاد و حج و اِنفاق و حیض و ایلاء و یمین و طلاق و نکاح و عدت و مہر و تکرار ذِکرِ جہاد، واِنفاق فی سبیل اللہ، و بعض معاملاتِ بیع و شراء، و شہادت بقدرِ ضرورت بیان فرما کر بشارت و وعدۂ رحمت و مغفرت پر ختم فرما دیا، سبحان اللہ کیا بلیغ ترتیب ہے، پس چونکہ ان مضامین کا حاصل "بِرّ" کا بیان ہے اِجمالاً و تفصیلاً، اس لئے اگر اس مجموعے کا لقب "ابوابُ البِرّ" رکھا جاوے تو نہایت زیبا ہے، واللہ الموفق۔

خلاصۂ تفسیر

ابوابُ البِرّ

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آگیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو، یا مغرب کو (کر لو) لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ (کی ذات و صفات پر) یقین رکھے، اور (اسی طرح) قیامت کے دن (آنے) پر (بھی) اور فرشتوں پر (بھی کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، نور سے بنے ہیں، گناہ سے معصوم ہیں، کھانے پینے اور اِنسانی شہوات سے پاک ہیں) اور (سب) کتب (سماویہ) پر (بھی) اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے حاجت مند) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو (یعنی جن بچوں کو ان کا باپ نابالغ چھوڑ کر مر گیا ہو) اور (دُوسرے غریب) محتاجوں کو (بھی) اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدی اور غلاموں

کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو) اور (وہ شخص) نماز کی پابندی (بھی) رکھتا ہو اور (مقرّرہ) زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص (کہ ان عقائد و اعمال کے ساتھ یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں، جب (کسی اَمرِ جائز کا) عہد کرلیں اور (اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ) وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل (مزاج) رہنے والے ہوں (ایک تو) تنگ دستی میں اور (دُوسرے) بیماری میں اور (تیسرے معرکۂ) قتال (کفار) میں (یعنی پریشان اور کم ہمت نہ ہوں، بس) یہ لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جاسکتے) ہیں (غرض اصلی مقاصد اور کمالاتِ دین کے یہ ہیں، نماز میں کسی سمت کو منہ کرنا انہی کمالاتِ مذکورہ میں سے ایک کمالِ خاص یعنی اقامتِ صلوٰۃ کے توابع اور شرائط میں سے ہے، اور اس کے حسن سے اس میں حسن آگیا، ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا)۔

معارف و مسائل

جب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کردیا گیا تو یہود و نصاریٰ اور مشرکین جو اسلام اور مسلمانوں میں عیب جوئی کی فکر میں رہتے تھے، ان میں بڑا شور و شغب ہوا اور طرح طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اعتراضات کا سلسلہ جاری کردیا، جس کے جوابات پچھلی آیات میں بڑی توضیح و تفصیل کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔

ان آیات میں ایک خاص انداز سے اس بحث کو ختم کردیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم نے سارا دین صرف اس بات میں منحصر کردیا کہ نماز میں انسان کا رُخ مغرب کی طرف ہو یا مشرق کی، مراد اس سے مطلق جہات اور سمتیں ہیں، یعنی تم نے صرف سمت و جہت کو دین کا مقصد بنالیا، اور ساری بحثیں اسی میں دائر ہوگئیں، گویا شریعت کا کوئی اور حکم ہی نہیں ہے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس آیت کا خطاب یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب کے لئے ہو، اور مراد یہ ہو کہ اصل برّ اور ثواب اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے، وہ جس طرف رُخ کرنے کا حکم دیں، وہی ثواب و صواب ہوجاتا ہے، اپنی ذات کے اعتبار سے مشرق و مغرب یا کوئی جانب و جہت نہ کوئی اہمیت رکھتی ہے، نہ ثواب، بلکہ ثواب دراصل اطاعتِ حکم کا ہے، جس جانب کا بھی حکم ہوجائے، جب تک بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم تھا وہ ثواب تھا، اور جب بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا ارشاد ہوا تو اَب وہی ثواب ہے۔

جیسا کہ بسلسلۂ ربطِ آیات بیان ہوچکا ہے کہ اس آیت سے سورۂ بقرہ کا ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے جس میں مسلمانوں کے لئے تعلیمات و ہدایات اصل ہیں، مخالفین کے جوابات ضمنی، اسی لئے اس آیت کو اَحکامِ اسلامیہ کی ایک نہایت جامع آیت کہا گیا ہے۔

اس کے بعد بقرہ کے ختم تک تقریباً اسی آیت کی مزید تشریحات ہیں، اس آیت میں اُصولی طور سے تمام اَحکامِ شرعیہ، اِعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق کا اِجمالی ذِکر آگیا ہے۔

پہلی چیز اِعتقادات ہیں، اس کا ذِکر مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ میں مفصل آگیا، دُوسری چیز اعمال یعنی عبادات اور معاملات ہیں، ان میں سے عبادات کا ذِکر وَاٰتَى الزَّكٰوةَ تک آگیا، پھر معاملات کا ذِکر وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ سے کیا گیا، پھر اَخلاق کا ذِکر وَالصّٰبِرِيْنَ سے کیا گیا، آخر میں بتلادیا کہ سچے مؤمن وہی لوگ ہیں جو ان تمام اَحکام کی پیروی مکمل کریں اور انہی کو تقویٰ شعار کہا جاسکتا ہے۔

ان اَحکام کے بیان کرنے میں بہت سے بلیغ اِشارات ہیں، مثلاً مال کو خرچ کرنے میں عَلٰى حُبِّهٖ کی قید لگادی، جس میں تین اِحتمال ہیں، ایک یہ کہ حُبِّهٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو، تو معنی یہ ہوں گے کہ مال خرچ کرنے میں کوئی نفسانی غرض نام ونمود کی شامل نہ ہو، بلکہ اِخلاصِ کامل کے ساتھ صرف اللہ جل شانہٗ کے ساتھ محبت اس خرچ کرنے کا داعیہ ہو۔

دُوسرا اِحتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر مال کی طرف راجع ہو تو مراد یہ ہوگی کہ اللہ کی راہ میں وہ مال خرچ کرنا موجبِ ثواب ہے جو اِنسان کو محبوب ہو، بے کار چیزیں جو پھینکنے کی تھیں ان کو دے کر صدقہ کا نام کرنا کوئی صدقہ نہیں، اگرچہ پھینکنے کی نسبت سے بہتر یہی ہے کہ کسی کے کام آسکے، تو اس کو دیدے۔

تیسرا اِحتمال یہ ہے کہ لفظ اٰتَى میں جو اس کا مصدر ''اِیتاء'' مفہوم ہوتا ہے، اس کی طرف ضمیر راجع ہو، اور معنی یہ ہوں کہ وہ اپنے خرچ کرنے پر دِل سے راضی ہو، یہ نہ ہو کہ خرچ تو کررہا ہے مگر اَندر سے دِل دُکھ رہا ہے۔

اِمام جصاصؒ نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ تینوں ہی چیزیں مراد میں داخل ہوں[1]، پھر اس جگہ مال کے خرچ کرنے کی دو صورتیں مقدم بیان کردیں، جو زکوٰۃ کے علاوہ ہیں، زکوٰۃ کا ذِکر اس کے بعد کیا، شاید تقدیم کی وجہ یہ ہو کہ عام طور سے ان حقوق میں غفلت اور کوتاہی برتی جاتی ہے، صرف زکوٰۃ ادا کردینے کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔

مسئلہ:- اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ مالی فرض صرف زکوٰۃ سے پورا نہیں ہوتا ہے، زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت جگہ پر مال خرچ کرنا فرض وواجب ہوتا ہے (جصاص، قرطبی)، جیسے رشتہ داروں پر خرچ کرنا کہ جب وہ کمانے سے معذور ہوں تو نفقہ ادا کرنا واجب ہوتا ہے، کوئی مسکین غریب مر رہا ہے اور آپ اپنی زکوٰۃ ادا کرچکے ہیں، مگر اس وقت مال خرچ کرکے اس کی جان بچانا فرض ہے۔

اِسی طرح ضرورت کی جگہ مسجد بنانا، یا دِینی تعلیم کے لئے مدارس ومکاتب بنانا یہ سب فرائضِ مالیہ میں داخل ہیں،

---

[1] احکام القرآن للجصّاص ج:۱ ص:۱۳۱

فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ کا ایک خاص قانون ہے اس کے مطابق ہر حال میں زکوٰۃ کا ادا کرنا ضروری ہے، اور یہ دُوسرے مصارف ضرورت و حاجت پر موقوف ہیں، جہاں ضرورت ہو خرچ کرنا فرض ہو جائے گا، جہاں نہ ہو فرض نہیں ہوگا۔

فائدہ

جن لوگوں پر مال خرچ کرنا ہے، مثلاً ذوی القربیٰ، مساکین، مسافر، سوال کرنے والے فقیر، ان سب کو تو ایک انداز سے بیان فرمایا، پھر وَفِی الرِّقَابِ میں حرف فِی بڑھا کر اِشارہ کر دیا کہ مملوک غلاموں کو مال کا مالک بنانا مقصود نہیں، بلکہ ان کے مالک سے خرید کر ان کے آزاد کرنے پر خرچ کیا جائے۔ اس کے بعد وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَى الزَّكٰوۃَ کا ذِکر بھی اسی طریق پر آیا، جیسے دُوسری چیزوں کا ذِکر ہے، آگے معاملات کا باب بیان کرنا تھا اس میں اُسلوب (طریق) بدل کر بجائے صیغۂ ماضی اِستعمال کرنے کے وَالْمُوْفُوْنَ صیغۂ اِسم فاعل اِستعمال کیا، اس میں اِشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس میں ایفائے عہد کی عادت دائمی ہونا چاہئے، اِتفاقی طور پر کوئی معاہدہ پورا کر دے تو یہ ہر کافر فاجر بھی کبھی نہ کبھی کرتا ہے، اس کا اِعتبار نہیں۔

اسی طرح معاملات کے باب میں صرف ایفائے عہد کا ذِکر کیا گیا، کیونکہ اگر غور کیا جائے تو تمام معاملات بیع وشراء، اِجارہ، شرکت سب ہی کی رُوح اِیفائے معاہدہ ہے۔

اسی طرح آگے اخلاق یعنی اعمالِ باطنہ کا ذِکر کرنا تھا، ان میں سے صرف ''صبر'' کو بیان کیا گیا، کیونکہ ''صبر'' کے معنی ہیں نفس کو قابو میں رکھنے اور برائیوں سے بچانے کے، اگر غور کیا جائے تو تمام اعمالِ باطنہ کی اصل رُوح ''صبر'' ہی ہے، اسی کے ذریعے اخلاقِ فاضلہ حاصل کئے جاسکتے ہیں، اور اسی کے ذریعہ اخلاقِ رذیلہ سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

ایک اور تغیرِ اُسلوب بیان میں یہاں یہ کیا گیا کہ پہلے وَالْمُوْفُوْنَ ذِکر کیا تھا، یہاں وَالصَّابِرُوْنَ نہیں بلکہ وَالصّٰبِرِيْنَ فرمایا، حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ یہ نصب علی المدح ہے، جس کی مراد یہ ہے کہ اس جگہ لفظ مدح مقدر ہے اور صابرین اس کا مفعول ہے، یعنی ان سب نیکوکار لوگوں میں خصوصیت سے قابلِ مدح صابرین ہیں، کیونکہ صبر ہی ایک ایسا ملکہ اور ایسی قوّت ہے جس سے تمام اعمالِ مذکورہ میں مدد لی جاسکتی ہے، اس طرح آیتِ مذکورہ میں دِین کے تمام شعبوں کے اہم اُصول بھی آگئے ہیں، اور بلیغ اِشارات سے ہر ایک کی اہمیت کا درجہ بھی معلوم ہوگیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ

اے ایمان والو! فرض ہوا تم پر (قصاص) برابر کرنا مقتولوں میں، آزاد کے بدلے آزاد

وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ

اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت، پھر جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی

فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

تو تابعداری کرنی چاہیے موافق دستور کے اور ادا کرنا چاہیئے اس کو خوبی کے ساتھ، یہ آسانی ہوئی تمہارے ربّ کی طرف سے

وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ

اور مہربانی، پھر جو زیادتی کرے اس فیصلے کے بعد تو اس کے لئے ہے عذاب دردناک، اور تمہارے واسطے

فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقل مندو! تاکہ تم بچتے رہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! جو لوگ (جان بوجھ کر ناحق) قتل کردیئے جائیں ان کے بارے میں تم پر قصاص (کا حکم) فرض کردیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام، اور عورت کے بدلے عورت (ہی کو قتل کیا جائے)، پھر اگر قاتل کو اس کے بھائی (یعنی مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے تو معروف طریقے کے مطابق (خوں بہا کا) مطالبہ کرنا (وارث کا) حق ہے، اور اسے خوش اُسلوبی سے ادا کرنا (قاتل کا) فرض ہے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک آسانی پیدا کی گئی ہے اور ایک رحمت ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی زیادتی کرے تو وہ دردناک عذاب کا مستحق ہے ﴿۱۷۸﴾ اور اے عقل رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی (کا سامان ہے) اُمید ہے کہ تم (اس کی خلاف ورزی سے) بچو گے۔ ﴿۱۷۹﴾

ربطِ آیات اور خلاصۂ تفسیر

اس سے پہلی آیات کی تفسیر میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ ان آیات میں اِجمالی طور پر نیکی اور خوبی کے اُصول

بتلادِیئے گئے ہیں، آگے اُن کی جزئی تفصیلات آئیں گی جن کو ''ابواب البر'' کہا جاسکتا ہے، آگے انہی ابواب البر کے کچھ اَحکامِ جزئیہ کا بیان ہوتا ہے، جو ضرورت اور حالات وواقعات کے تابع بیان ہوئے ہیں۔

حکمِ اوّل:- قصاص

اے اِیمان والو! تم پر (قانون) قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین (بہ قتلِ عمد) کے بارے میں (یعنی ہر) آزاد آدمی (قتل کیا جاوے ہر دُوسرے) آزاد آدمی کے عوض میں اور (اسی طرح ہر) غلام (دُوسرے ہر) غلام کے عوض میں اور (اسی طرح ہر) عورت (دُوسری ہر) عورت کے عوض میں (گو یہ قاتلین بڑے درجہ کے اور مقتولین چھوٹے درجہ کے ہوں، جب بھی سب سے برابر قصاص لیا جاوے گا، یعنی قاتل کو سزا میں قتل کیا جاوے گا) ہاں جس (قاتل) کو اس کے فریق (مقدمہ) کی طرف سے کچھ معافی ہوجاوے (مگر پوری معاف نہ ہو) تو (اس سے سزائے قتل سے تو بری ہوگیا، لیکن دِیت یعنی خون بہا کے طور پر ایک معین مقدار سے مال بذمہ قاتل واجب ہوجاوے گا، تو اس وقت فریقین کے ذمے ان دو اَمر کی رعایت ضروری ہے، مدعی یعنی وارثِ مقتول کے ذمہ تو) معقول طور پر (اس مال کا) مطالبہ کرنا (کہ اس کو زیادہ تنگ نہ کرے) اور (مدعا علیہ یعنی قاتل کے ذمہ) خوبی کے ساتھ (اس مال کا) اس (مدعی) کے پاس پہنچا دینا (کہ مقدار میں کمی نہ کرے، اور خواہ مخواہ ٹالے نہیں) یہ (قانونِ دِیت وعفو) تمہارے پروردگار کی طرف سے (سزا میں) تخفیف ہے اور (شاہانہ) ترحم ہے (ورنہ بجز سزائے قتل کے کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی) پھر جو شخص اس (قانون) کے (مقرّر ہوئے) بعد تعدی کا مرتکب ہو (مثلاً کسی پر جھوٹا یا اِشتباہ میں دعویٰ قتل کا کردے یا معاف کرکے پھر قتل کی پیروی کرے) تو اس شخص کو (آخرت میں) بڑا دردناک عذاب ہوگا، اور فہیم لوگو! (اس قانون) قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے (کیونکہ اس قانون کے خوف سے اِرتکابِ قتل سے ڈریں گے، تو کئی جانیں بچیں گی) ہم اُمید کرتے ہیں کہ تم لوگ (ایسے قانونِ امن کی خلاف ورزی سے) پرہیز رکھوگے۔

معارف ومسائل

''قصاص'' کے لفظی معنی مماثلت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جتنا ظلم کسی نے کسی پر کیا، اتنا ہی بدلہ لینا دُوسرے کے لئے جائز ہے، اس سے زیادتی کرنا جائز نہیں، قرآن مجید کی آیت میں عنقریب اسی سورت میں اس کی زیادہ وضاحت اس طرح آئی ہے: فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ (البقرۃ: ۱۹۴) اور سورۂ نحل کی آخری آیات میں وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ (النحل: ۱۲۶) اسی مضمون کے لئے آیا ہے۔

اسی لئے اِصطلاحِ شرع میں "قصاص" کہا جاتا ہے قتل کرنے اور زخم لگانے کی اس سزا کو جس میں مساوات اور مماثلت کی رعایت کی گئی ہو۔

مسئلہ:- قتل عمد وہ کہ ارادہ کر کے کسی کو آہنی ہتھیار سے یا ایسی چیز سے جس سے گوشت پوست کٹ کر خون بہہ سکے قتل کیا جاوے، قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینا، ایسے ہی قتل کے جرم کے ساتھ مخصوص ہے۔

مسئلہ:- ایسے قتل میں جیسے آزاد آدمی آزاد کے عوض میں قتل کیا جاتا ہے، ایسے ہی غلام کے عوض میں بھی غلام، اور جس طرح عورت کے عوض میں عورت ماری جاتی ہے، اسی طرح مرد بھی عورت کے مقابلے میں قتل کیا جاتا ہے۔

آیت میں آزاد کے مقابل آزاد اور عورت کے مقابل عورت کا جو ذِکر آیا ہے یہ اُس خاص واقعہ کی بنا پر ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

ابنِ کثیرؒ نے باسناد ابن ابی حاتمؒ نقل کیا ہے کہ زمانۂ اِسلام سے کچھ پہلے دو عرب قبیلوں میں جنگ ہوگئی، طرفین کے بہت سے آزاد آدمی اور غلام مرد اور عورتیں قتل ہوگئے، ابھی ان کے معاملہ کا تصفیہ ہونے نہیں پایا تھا کہ زمانۂ اِسلام شروع ہوگیا، اور یہ دونوں قبیلے اِسلام میں داخل ہوگئے، اِسلام لانے کے بعد اپنے اپنے مقتولوں کا قصاص لینے کی گفتگو شروع ہوئی، تو ایک قبیلہ جو قوت و شوکت والا تھا، اس نے کہا کہ ہم اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ہمارے غلام کے بدلے میں تمہارا آزاد آدمی اور عورت کے بدلے میں مرد قتل نہ کیا جائے۔ [1]

قصاص کے متعلق اِسلام کا عادلانہ قانون اور قصاص کے مسائل

ان کے جاہلانہ اور ظالمانہ مطالبے کی تردید کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی: اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ جس کا حاصل ان کے مطالبے کو رَدّ کرنا تھا، کہ غلام کے بدلے آزاد کو، اور عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے، اگرچہ وہ قاتل نہ ہو، اِسلام نے اپنا عادلانہ قانون یہ نافذ کر دیا کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے، اگر عورت قاتل ہے تو کسی بے گناہ مرد کو اس کے بدلے میں قتل کرنا، اسی طرح قاتل اگر غلام ہے تو اس کے بدلے میں کسی بے گناہ آزاد کو قتل کرنا ظلم عظیم ہے، جو اِسلام میں قطعاً برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا حاصل اس کے سوا نہیں کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے گا، عورت ہو یا غلام، قاتل عورت اور غلام کے بجائے بے گناہ مرد یا آزاد کو قتل کرنا جائز نہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت ھذہ الآیۃ ج: ۱ ص: ۴۸۹

آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت کو کوئی مرد قتل کردے یا غلام کو کوئی آزاد قتل کردے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، قرآن مجید کی اسی آیت کے شروع میں اَلْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اس عموم کی واضح دلیل ہے، اور دُوسری آیات میں اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے مثلاً: اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ (المائدۃ:۴۵) وغیرہ۔

مسئلہ: - اگر قتلِ عمد میں قاتل کو پوری معافی دے دی جاوے، مثلاً مقتول کے وارث صرف اس کے دو بیٹے تھے، اور ان دونوں نے اپنا حق معاف کردیا، تو قاتل پر کوئی مطالبہ نہیں رہا، اور اگر پوری معافی نہ ہو مثلاً صورتِ مذکورہ میں دو بیٹوں میں سے ایک نے معاف کیا، دُوسرے نے معاف نہیں کیا، تو سزائے قصاص سے تو قاتل بری ہوگیا، لیکن معاف نہ کرنے والے کو نصف دِیت (خون بہا) دِلایا جاوے گا، اور دِیت یعنی خون بہا شریعت میں سو اُونٹ یا ہزار دِینار، یا دس ہزار دِرہم ہوتے ہیں، اور دِرہم آج کل کے مروّجہ وزن کے اِعتبار سے تقریباً ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے، تو پوری دِیت دو ہزار نو سو سولہ تولے ۸ ماشے چاندی ہوگی، یعنی ۳۶ سیر ۶ تولے ۸ ماشے۔ [۱]

مسئلہ: - جس طرح ناتمام معافی سے مال واجب ہوجاتا ہے، اسی طرح اگر باہم کسی قدر مال پر مصالحت ہوجاوے تب بھی قصاص ساقط ہوکر مال واجب ہوجاتا ہے، لیکن اس میں کچھ شرائط ہیں جو کتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔

مسئلہ: - مقتول کے جتنے شرعی وارث ہیں وہی قصاص اور دِیت کے مالک بقدر اپنے حصۂ میراث کے ہوں گے، اگر دِیت یعنی خون بہا لیا گیا تو مال ان وارثوں میں بحسابِ وراثت تقسیم ہوگا، اور قصاص کا فیصلہ ہوا تو قصاص کا حق بھی سب میں مشترک ہوگا، مگر چونکہ قصاص ناقابلِ تقسیم ہے، اس لئے کوئی ادنیٰ درجہ کا حق رکھنے والا بھی اپنا حقِ قصاص معارف کردے گا تو دُوسرے وارثوں کا حقِ قصاص بھی معاف ہوجائے گا، ہاں ان کو دِیت (خون بہا) کی رقم حسبِ حصہ ملے گی۔

مسئلہ: - قصاص لینے کا حق اگرچہ اولیائے مقتول کا ہے، مگر باجماعِ اُمت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اِختیار نہیں، کہ خود ہی قاتل کو مار ڈالیں بلکہ اس حق کے حاصل کرنے کے لئے حکم سلطانِ مسلم یا اس کے کسی نائب کا ضروری ہے، کیونکہ قصاص کس صورت میں واجب ہوتا ہے کس میں نہیں، اس کی جزئیات بھی دقیق ہیں جن کو ہر شخص معلوم نہیں کرسکتا، اس کے علاوہ اولیائے مقتول اپنے غصّے میں مغلوب ہوکر کوئی زیادتی بھی کرسکتے ہیں، اس لئے باتفاقِ علمائے اُمت حقِ قصاص حاصل کرنے کے لئے اسلامی حکومت کی طرف رُجوع کرنا ضروری ہے۔ (قرطبی) [۲]

---

[۱] دیت کی یہ مقدار اس تحقیق پر مبنی ہے کہ درہم کا وزن ساڑھے تین ماشہ چاندی ہو مگر درہم کا صحیح وزن وہ ہے جو حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے ''اوزانِ شرعیہ'' میں لکھا ہے کہ درہم تین ماشہ ایک رتی اور ایک پانچواں حصہ رتی کا ہے، اس کے اعتبار سے دیت دو ہزار چھ سو پچیس (۲۶۲۵) تولہ بنتی ہے اور یہی مقدار دُرست اور مفتیٰ بہ ہے۔
(محمد تقی عثمانی ۳/۲/۱۴۳۲ھ)

[۲] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۲ ص:۲۴۵

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ الْوَصِيَّةُ

فرض کیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال وصیت کرنا

لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْ

ماں باپ کے واسطے اور رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ یہ حکم لازم ہے پرہیزگاروں پر۔ پھر جو کوئی

بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ

بدل ڈالے وصیت کو بعد اس کے کہ جو سن چکا تو اس کا گناہ انہی پر ہے جنہوں نے اس کو بدلا بے شک اللہ سننے والا

عَلِيمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ

جاننے والا ہے، پھر جو کوئی خوف کرے وصیت کرنے والے سے طرف داری کا یا گناہ کا پھر ان میں باہم صلح کرادے

فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع ۲۲

تو اس پر کچھ گناہ نہیں، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اپنے پیچھے مال چھوڑ کر جانے والا ہو تو جب اس کی موت کا وقت قریب آجائے، وہ اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں دستور کے مطابق وصیت کرے۔ یہ متقی لوگوں کے ذمے ایک لازمی حق ہے ﴿۱۸۰﴾ پھر جو شخص اِس وصیت کو سننے کے بعد اس میں کوئی تبدیلی کرے گا، تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہوگا جو اس میں تبدیلی کریں گے۔ یقین رکھو کہ اللہ (سب کچھ) سنتا جانتا ہے ﴿۱۸۱﴾ ہاں اگر کسی شخص کو یہ اندیشہ ہو کہ کوئی وصیت کرنے والا بے جا طرف داری یا گناہ کا اِرتکاب کر رہا ہے، اور وہ متعلقہ آدمیوں کے درمیان صلح کرادے تو اُس پر کوئی گناہ نہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۸۲﴾

ربطِ آیات و خلاصہ تفسیر

حکمِ دوم اَز ابوابُ البِرّ:- ''وَصِیت''

''وصیت'' ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جائے، خواہ زندگی میں یا بعد الموت، لیکن عرف میں اس کام کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم بعد الموت ہو۔

''خیر'' لفظِ خیر کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی مال کے بھی آتے ہیں، جیسے قرآن میں ہے: وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝۸ (العادیات) اس جگہ باتفاقِ مفسرین ''خیر'' سے مراد ''مال'' ہے۔

شروع اِسلام میں جب تک میراث کے حصے شرع سے مقرر نہ ہوئے تھے، یہ حکم تھا کہ ترکہ کے ایک ثلث میں مرنے والا اپنے والدین اور دُوسرے رشتہ داروں کے لئے جتنا جتنا مناسب سمجھے وصیت کردے، اتنا تو ان لوگوں کو حق تھا، باقی جو کچھ رہتا وہ سب اولاد کا حق ہوتا تھا، اس آیت میں یہ حکم مذکور ہے یعنی:-

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو (اپنے) والدین اور (دیگر) اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو) کچھ کچھ بتلا جاوے (اس کا نام ''وصیت'' ہے) جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمے یہ ضروری (کیا جاتا) ہے، پھر (جن لوگوں نے اس وصیت کو سنا ہے ان میں سے) جو شخص (بھی) سن لینے کے بعد اس (کے مضمون) کو تبدیل کرے گا (اور باہمی تقسیم و فیصلہ کے وقت غلط اِظہار دے گا، اور اس کے موافق فیصلہ ہونے سے کسی کا حق تلف ہو جاوے گا) تو اس (حق تلفی) کا گناہ انہی لوگوں کو ہوگا جو اس (مضمون) کو تبدیل کریں گے (حاکمِ عدالت یا ثالث کو یا مرنے والے کو گناہ نہ ہوگا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو یقیناً سنتے جانتے ہیں (تو تبدیل کرنے والے کے اِظہار بھی سنتے ہیں اور حاکم کا بے خبر اور معذور ہونا بھی جانتے ہیں) ہاں (ایک طرح کی تبدیل کی اِجازت بھی ہے وہ یہ کہ) جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے (وصیت کے بارے میں) کسی غلطی کی یا (قصداً قانونِ وصیت کے کسی دفعہ کی خلاف ورزی کے) کسی جرم کے اِرتکاب کی تحقیق ہوئی ہو (اور اس بے ضابطہ وصیت کی وجہ سے اس میّت کے پسماندہ مُستحقانِ ترکہ و مُستحقانِ مالِ وصیت میں نزاع کا خطرہ یا وقوع معلوم ہو) پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کرادے (گو وہ مصالحت اس مضمونِ وصیت کے خلاف ہو جو ظاہراً تبدیلِ وصیت ہے) تو اس شخص پر کوئی (بار) گناہ نہیں ہے (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (خود گناہوں کے) معاف فرمانے والے ہیں اور

(گناہگاروں پر) رحم کرنے والے ہیں (اور اس شخص نے تو کوئی گناہ نہیں کیا کیونکہ وصیت میں تبدیلی اِصلاح کے لئے کی ہے، تو اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی)۔

معارف ومسائل

اس آیت میں جو وصیت کرنا اس مرنے والے پر فرض کیا ہے جو کچھ مال چھوڑ کر مر رہا ہو، اس حکم کے تین جزء ہیں، ایک یہ کہ مرنے والے کے ترکہ میں اولاد کے سوا کسی دُوسرے وارث کے حصے مقرّر نہیں ہیں، اُن کے حصوں کا تعین مرنے والے کی وصیت کی بنیاد پر ہوگا۔

دُوسرے یہ کہ ایسے اقارب کے لئے وصیت کرنا مرنے والے پر فرض ہے۔

تیسرے یہ کہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں۔

ان تین اَحکام میں سے پہلا حکم تو اکثر صحابہؓ وتابعینؒ کے نزدیک آیتِ میراث سے منسوخ ہوگیا، ابنِ کثیرؒ نے بہ تصحیحِ حاکم وغیرہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اس حکم کو آیتِ میراث نے منسوخ کردیا، [1] یعنی: لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝ (النساء)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک دُوسری روایت میں اس کی یہ تفصیل ہے کہ آیتِ میراث نے ان لوگوں کی وصیت کو منسوخ کردیا جن کا میراث میں حصہ مقرّر ہے، دُوسرے رشتہ دار جن کا میراث میں حصہ نہیں، اُن کے لئے حکمِ وصیت اب بھی باقی ہے۔ (جصّاص، قرطبی) [2]

لیکن باجماعِ اُمت یہ ظاہر ہے کہ جن رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ مقرّر نہیں، اُن کے لئے میّت پر وصیت کرنا کوئی فرض ولازم نہیں، اس لئے فرضیتِ وصیت اُن کے حق میں بھی منسوخ ہی ہوگی (جصّاص، قرطبی)، [3] یعنی بشرطِ ضرورت صرف مستحب رہ جائے گی۔

دُوسرا حکم:- وَصیت کا فرض ہونا

یہ بھی باجماعِ اُمت منسوخ ہے، اور ناسخ اس کا وہ حدیثِ متواتر ہے جس کا اِعلان رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہؓ کے سامنے فرمایا:-

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۴۹۲

[2] احکام القرآن للجصّاص ج:۱ ص:۱۶۵ وتفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۲ ص:۲۶۲، ۲۶۳

[3] بحوالۂ بالا۔

اِنَّ اللّٰهَ اَعْطٰی لِکُلِّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِیَّةَ لِوَارِثٍ۔

اَخْرَجَهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ: هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ۔ [۱]

''اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حق والے کو اس کا حق خود دے دیا ہے، اس لئے اب کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔''

اسی حدیث میں بروایت ابن عباسؓ یہ الفاظ بھی منقول ہیں:-

لَا وَصِیَّةَ لِوَارِثٍ اِلَّا اَنْ تُجِیْزَهُ الْوَرَثَةُ۔ (جصاص) [۲]

''کسی وارث کے لئے وصیت اس وقت تک جائز نہیں جب تک باقی سب وارث اجازت نہ دے دیں۔''

اس لئے حاصل اس حدیث کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیئے ہیں، اس لئے اسے وصیت کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وارث کے حق میں وصیت کرنے کی اجازت بھی نہیں، ہاں اگر دوسرے ورثہ اس وصیت کی اجازت دے دیں تو جائز ہے۔

امام جصاصؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث ایک جماعتِ صحابہؓ سے منقول ہے، اور فقہائے اُمت نے باتفاق اس کو قبول کیا ہے، اس لئے بحکم متواتر ہے، جس سے آیتِ قرآن کا نسخ جائز ہے۔

اور امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ بات علمائے اُمت میں متفق علیہ ہے کہ جب کوئی حکم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یقینی طور پر معلوم ہو جائے جیسے خبرِ متواتر، مشہور وغیرہ میں ہوتا ہے، تو وہ بالکل بحکم قرآن ہے، اور وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے، اس لئے ایسی حدیث سے کسی آیتِ قرآن کا منسوخ ہو جانا کوئی محلِ شبہ نہیں۔ پھر فرمایا کہ اگرچہ یہ حدیث ہم تک خبرِ واحد ہی کے طریق پر پہنچی ہو، مگر اس کے ساتھ حجۃ الوداع کے سب سے بڑے اجتماع میں ایک لاکھ سے زائد صحابہؓ کے سامنے اس کا اعلان فرمانا اور اس پر اجماعِ صحابہؓ اور اجماعِ اُمت نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حدیث اُن حضرات کے نزدیک قطعی الثبوت ہے، ورنہ شک وشبہ کی گنجائش ہوتے ہوئے اس کی وجہ سے آیتِ قرآن کے حکم کو چھوڑ کر اس پر اجماع نہ کرتے۔ [۳]

تیسرا حکم:- وَصیت ایک تہائی مال سے زیادہ کی جائز نہیں

یہ باتفاقِ اُمت اب بھی باقی ہے، ہاں وارثوں کی اجازت سے ایک تہائی سے زائد کی بلکہ پورے مال کی بھی

[۱] جامع الترمذی، ابواب الفرائض، باب ما جاء لا وصیة لوارث ج:۲ ص:۳۲

[۲] احکام القرآن للجصّاص ج:۱ ص:۱۶۶، ۱۶۷

[۳] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۲ ص:۲۶۳

وصیت جائز اور قابلِ قبول ہے۔

مسئلہ:- تفصیلِ مذکور سے یہ واضح ہو چکا کہ اب جن رشتہ داروں کے حصے قرآنِ کریم نے خود مقرّر کر دیئے ہیں اُن کے لئے اب وصیت واجب نہیں، بلکہ بدونِ اجازت دُوسرے وارثوں کے جائز بھی نہیں، البتہ جو رشتہ دار شرعی وارث نہیں ان کے لئے وصیت کرنے کی اجازت ایک تہائی مال تک ہے۔

مسئلہ:- اس آیت میں ذِکر ایک خاص وصیت کا تھا، جو مرنے والا اپنے متروکہ مال کے متعلق کرتا تھا جو منسوخ ہوگیا، لیکن جس شخص کے ذمے دُوسرے لوگوں کے حقوق واجب ہوں یا اس کے پاس کسی کی امانت رکھی ہو اُس پر اُن تمام چیزوں کی ادائیگی کے لئے وصیت واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کچھ لوگوں کے حقوق ہوں اس پر تین راتیں ایسی نہ گزرنی چاہئیں کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے پاس موجود نہ ہو۔ [۱]

مسئلہ:- آدمی کو جو ایک تہائی مال میں وصیت کرنے کا حق دیا گیا ہے اپنی زندگی میں اس کو یہ بھی حق رہتا ہے کہ اس وصیت میں کچھ تبدیلی کردے یا بالکل ختم کردے۔ (جصّاص)

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ

اے ایمان والو! فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے

قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا

اگلوں پر تاکہ تم پرہیزگار ہوجاؤ۔ چند روز ہیں گنتی کے، پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو

اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ

یا مسافر تو اُن پر ان کی گنتی ہے اور دِنوں سے، اور جن کو طاقت ہے روزے کی اُن کے ذمے بدلہ ہے

طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ

ایک فقیر کا کھانا، پھر جو کوئی خوشی سے کرے نیکی تو اچھا ہے اس کے واسطے، اور روزہ رکھو تو بہتر ہے

---

[۱] سنن النسائی، کتاب الوصایا، باب الکراهیة فی تأخیر الوصیة ج:۲ ص:۱۲۸

لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

تمہارے لئے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کردیئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو ﴿۱۸۳﴾ گنتی کے چند دِن روزے رکھنے ہیں۔ پھر بھی اگر تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلے۔ اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں ان کے ذمہ یہ ہے کہ وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر (روزے کا) فدیہ ادا کردیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے کوئی نیکی کرے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم کو سمجھ ہو تو روزے رکھنے میں تمہارے لئے زیادہ بہتری ہے ﴿۱۸۴﴾

خلاصۂ تفسیر

حکم سوم:۔ صوم

اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے (اُمتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، اس توقع پر کہ تم (روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی نفس کو اس کے متعدّد تقاضوں سے روکنے کی، اور اسی عادت کی پختگی بنیاد ہے تقویٰ کی، سو) تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو (ان تھوڑے دِنوں سے مراد رمضان ہے، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے) پھر (اس میں بھی اتنی آسانی ہے کہ) جو شخص تم میں (ایسا) بیمار ہو (جس کو روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اِجازت ہے، اور بجائے رمضان کے) دُوسرے اَیام کا (اتنا ہی) شمار (کرکے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب) ہے، اور (دُوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہوگئی یہ ہے کہ) جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں (اور پھر روزہ رکھنے کو دِل نہ چاہے تو) اُن کے ذمہ (صرف روزے کا) فدیہ (یعنی بدلہ) ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا (کھلا دینا یا دے دینا) ہے، اور جو شخص خوشی سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے (کہ زیادہ فدیہ دیدے) تو یہ اس شخص کے لئے اور بہتر ہے، اور (گو ہم نے آسانی کے لئے ان حالتوں میں روزہ نہ رکھنے کی اِجازت دے دی ہے، لیکن) تمہارا روزہ رکھنا (اس حالت میں بھی) زیادہ بہتر ہے اگر تم (کچھ روزے کی فضیلت کی) خبر رکھتے ہو۔

معارف و مسائل

''صوم'' کے لفظی معنی اِمساک یعنی رُکنے اور بچنے کے ہیں، اور اِصطلاحِ شرع میں کھانے پینے اور عورت سے مباشرت کرنے سے رُکنے اور باز رہنے کا نام ''صوم'' ہے، بشرطیکہ وہ طلوعِ صبحِ صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک مسلسل رُکا رہے، اور نیت روزہ کی بھی ہو، اس لئے اگر غروبِ آفتاب سے ایک منٹ پہلے بھی کچھ کھا پی لیا تو روزہ نہیں ہوا، اسی طرح اگر ان تمام چیزوں سے پرہیز تو پورے دِن پوری اِحتیاط سے کیا، مگر نیت روزہ کی نہیں کی تو بھی روزہ نہیں ہوا۔

''صوم'' یعنی روزہ اُن عبادات میں سے ہے جن کو اِسلام کے عمود اور شعائر قرار دِیا گیا ہے، اس کے فضائل بے شمار ہیں، جن کے تفصیلی بیان کا یہ موقع نہیں۔

پچھلی اُمتوں میں روزے کا حکم

روزے کی فرضیت کا حکم مسلمانوں کو ایک خاص مثال سے دیا گیا ہے، حکم کے ساتھ یہ بھی ذِکر فرمایا کہ یہ روزے کی فرضیت کچھ تمہارے ساتھ خاص نہیں، پچھلی اُمتوں پر بھی روزے فرض کئے گئے تھے، اس سے روزے کی خاص اہمیت بھی معلوم ہوئی، اور مسلمانوں کی دِلجوئی کا بھی اِنتظام کیا گیا کہ روزہ اگرچہ مشقت کی چیز ہے، مگر یہ مشقت تم سے پہلے بھی سب لوگ اُٹھاتے آئے ہیں۔ طبعی بات ہے کہ مشقت میں بہت سے لوگ مبتلا ہوں تو وہ ہلکی معلوم ہونے لگتی ہے۔ (رُوح المعانی)

قرآنِ کریم کے الفاظ اَلَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ عام ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کی تمام شریعتوں اور اُمتوں کو شامل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نماز کی عبادت سے کوئی شریعت اور کوئی اُمت خالی نہیں رہی، اسی طرح روزہ بھی ہر شریعت میں فرض رہا ہے۔

جن حضرات نے فرمایا ہے کہ مِنْ قَبْلِكُمْ سے اس جگہ نصاریٰ مراد ہیں، وہ بطور ایک مثال کے ہے، اس سے دُوسری اُمتوں کی نفی نہیں ہوتی۔ (رُوح) [1]

آیت میں صرف اتنا بتلایا گیا ہے کہ روزے جس طرح مسلمانوں پر فرض کئے گئے پچھلی اُمتوں میں بھی فرض کئے گئے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پچھلی اُمتوں کے روزے تمام حالات وصفات میں مسلمانوں ہی کے روزوں کے برابر ہوں، مثلاً روزوں کی تعداد، روزوں کے اوقات کی تحدید، اور یہ کہ کن ایام میں رکھے جائیں، اِن اُمور میں اِختلاف ہوسکتا ہے، چنانچہ واقعہ بھی ایسا ہی ہوا کہ تعداد میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی، اور روزے کے اَیام اور اوقات میں فرق ہوتا رہا۔ (رُوح) [2]

---

[1] رُوح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۲۱

[2] رُوح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۲۳

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ میں اِشارہ ہے کہ تقویٰ کی قوّت حاصل کرنے میں روزہ کو بڑا دخل ہے، کیونکہ روزہ سے اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کا ایک ملکہ پیدا ہوتا ہے، وہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔

مریض کا روزہ

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا، مریض سے مراد وہ مریض ہے جس کو روزہ رکھنے سے ناقابلِ برداشت تکلیف پہنچے، یا مرض بڑھ جانے کا قوی اندیشہ ہو، بعد کی آیت: وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرۃ:۱۸۵) میں اس طرف اِشارہ موجود ہے، جمہور فقہائے اُمت کا یہی مسلک ہے۔

مسافر کا روزہ

اَوْ عَلٰى سَفَرٍ یہاں لفظ ''مسافر'' کے بجائے عَلٰى سَفَرٍ کا لفظ اِختیار فرما کر کئی اہم مسائل کی طرف اِشارہ فرمادیا:-

اوّل یہ کہ مطلقاً لغوی سفر یعنی اپنے گھر اور وطن سے باہر نکل جانا روزہ میں رُخصتِ سفر کے لئے کافی نہیں، بلکہ سفر کچھ طویل ہونا چاہئے، کیونکہ لفظ عَلٰى سَفَرٍ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ سفر پر سوار ہو، جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر سے دس پانچ میل چلے جانا مراد نہیں، مگر یہ تحدید کہ سفر کتنا طویل ہو قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہؓ کے تعامل سے اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ اور بہت سے فقہاء نے اس کی مقدار تین منزل یعنی وہ مسافت جس کو پیادہ سفر کرنے والا بآسانی تین روز میں طے کرسکے، قرار دی ہے، اور بعد کے فقہاء نے میلوں کے حساب سے اڑتالیس میل لکھے ہیں۔

دُوسرا مسئلہ اسی لفظ عَلٰى سَفَرٍ سے یہ نکلا کہ وطن سے نکل جانے والا مسافر اسی وقت تک رُخصتِ سفر کا مستحق ہے جب تک اس کے سفر کا سلسلہ جاری رہے، اور یہ ظاہر ہے کہ آرام کرنے یا کچھ کام کرنے کے لئے کسی جگہ ٹھہر جانا مطلقاً اس کے سلسلۂ سفر کو ختم نہیں کردیتا، جب تک کوئی معتد بہ مقدارِ قیام نہ ہو، اور اسی معتد بہ قیام کی مدّت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہوئی کہ پندرہ دن ہیں، جو شخص کسی ایک مقام پر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو وہ عَلٰى سَفَرٍ نہیں کہلاتا، اس لئے وہ رُخصتِ سفر کا بھی مستحق نہیں۔

مسئلہ:- اسی سے یہ بھی نکل آیا ہے کہ کوئی شخص پندرہ دن کے قیام کی نیت ایک جگہ نہیں بلکہ متفرق مقامات، شہروں اور بستیوں میں کرے تو وہ بدستور مسافر کے حکم میں رہ کر رُخصتِ سفر کا مستحق رہے گا، کیونکہ وہ عَلٰى سَفَرٍ کی حالت میں ہے۔

روزہ کی قضا

فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ یعنی مریض ومسافر کو اپنے فوت شدہ روزوں کی گنتی کے مطابق دُوسرے دِنوں میں روزے رکھنا واجب ہے، اس میں بتلانا تو یہ منظور تھا کہ مرض یا سفر کی مجبوری سے جو روزے چھوڑے گئے ہیں ان کی قضا ان لوگوں پر واجب ہے جس کے لئے "فَعَلَيْهِ الْقَضَآءُ" کا مختصر جملہ بھی کافی تھا، مگر اس کے بجائے فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ فرما کر اِشارہ کردیا گیا کہ مریض ومسافر پر فوت شدہ روزوں کی قضا صرف اس صورت میں واجب ہوگی جبکہ مریض صحت کے بعد اور مسافر مقیم ہونے کے بعد اتنے دنوں کی مہلت پائے جنہیں قضا کرسکے، تو اگر کوئی شخص اتنے دن سے پہلے ہی مرگیا تو اس پر قضا یا وصیتِ فدیہ لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ:- فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ میں چونکہ اس کی کوئی قید نہیں کہ ترتیب وار رکھے، یا غیر مسلسل رکھے، بلکہ عام اِختیار ہے، اس لئے اگر کوئی شخص جس کے رمضان کے اِبتدائی دس روزے قضا ہوگئے ہوں وہ دسویں یا نویں روزے کی قضا پہلے کرے اور اِبتدائی روزوں کی قضا بعد میں تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، اسی طرح متفرق کرکے قضا روزے رکھے، تو یہ بھی جائز ہے، کیونکہ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ میں اس کی گنجائش ہے۔

روزہ کا فدیہ

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ اس آیت کے بے تکلف معنی وہی ہیں جو خلاصۂ تفسیر میں بتلائے گئے ہیں، کہ جو لوگ مریض یا مسافر کی طرح روزہ رکھنے سے مجبور نہیں بلکہ روزے کی طاقت تو رکھتے ہیں، مگر کسی وجہ سے دِل نہیں چاہتا تو ان کے لئے بھی یہ گنجائش ہے کہ وہ روزے کے بجائے روزے کا فدیہ بصورتِ صدقہ ادا کردیں، اس کے ساتھ اتنا فرمادیا: وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ ہی رکھو۔

یہ حکم شروع اِسلام میں تھا جب لوگوں کو روزے کا خوگر کرنا مقصود تھا، اس کے بعد جو آیت آنے والی ہے، یعنی فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (البقرة:۱۸۵) اس سے یہ حکم عام لوگوں کے حق میں منسوخ کردیا گیا، صرف ایسے لوگوں کے حق میں ابھی باجماعِ اُمت باقی رہ گیا جو بہت بوڑھے ہوں (جصّاص)[۱]، یا ایسے بیمار ہوں کہ اب صحت کی اُمید ہی نہیں رہی، جمہور صحابہؓ وتابعینؒ کا یہی قول ہے۔ (جصّاص، مظہری)

صحیح بخاری ومسلم وابوداوٗد، نسائی، ترمذی، طبرانی وغیرہ تمام ائمۂ حدیث نے حضرت سلمہ بن اکوعؓ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ نازل ہوئی تو ہمیں اِختیار دے دیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے

---

[۱] احکام القرآن ج:۱ ص:۱۷۸ وتفسیر المظھری تحت ھذہ الآیۃ ج:۱ ص:۱۹۵

روزے رکھے، جس کا جی چاہے ہر روزے کا فدیہ دیدے، پھر جب دُوسری آیت: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (البقرۃ:۱۸۵) نازل ہوئی تو یہ اِختیار ختم ہوکر طاقت والوں پر صرف روزہ ہی رکھنا لازم ہوگیا۔ [۱]

مسندِ احمد میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نماز کے معاملات میں بھی اِبتدائے اِسلام میں تین تغیرات ہوئے اور روزے کے معاملہ میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں، روزے کی تین تبدیلیاں یہ ہیں کہ:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ہر مہینے میں تین روزے اور ایک روزہ یومِ عاشورا (یعنی دسویں محرم) کا رکھتے تھے، پھر رمضان کی فرضیت نازل ہوگئی: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ تو حکم یہ تھا کہ ہر شخص کو اِختیار ہے کہ روزہ رکھ لے یا فدیہ دیدے، اور روزہ رکھنا بہتر اور افضل ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے دُوسری آیت: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ (البقرۃ:۱۸۵) نازل فرمادی، اس آیت نے تندرست قوی کے لئے یہ اِختیار ختم کرکے صرف روزہ رکھنا لازم کردیا، مگر بہت بوڑھے آدمی کے لئے یہ حکم باقی رہا کہ وہ چاہے تو فدیہ ادا کردے۔

یہ تو دو تبدیلیاں ہوئیں، تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ شروع میں اِفطار کے بعد کھانے پینے اور اپنی خواہش پورا کرنے کی اِجازت صرف اس وقت تک تھی جب تک آدمی سوئے نہیں، جب سوگیا تو دُوسرا روزہ شروع ہوگیا، کھانا پینا وغیرہ ممنوع ہوگیا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت: أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ (البقرۃ:۱۸۷) الآیہ نازل فرماکر یہ آسانی عطا فرمادی کہ اگلے دِن کی صبحِ صادق تک کھانا پینا وغیرہ سب جائز ہیں، [۲] سوکر اُٹھنے کے بعد سحری کھانے کو سنت قرار دے دیا گیا، صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد میں بھی اس مضمون کی احادیث آئی ہیں۔ (ابنِ کثیر) [۳]

فدیہ کی مقدار اور متعلقہ مسائل

ایک روزہ کا فدیہ نصف صاع گندم یا اس کی قیمت ہے، نصف صاع ہمارے مروّجہ اَسّی تولہ کے حساب سے تقریباً پونے دوسیر ہوتے ہیں، اس کی بازاری قیمت معلوم کرکے کسی غریب مسکین کو مالکانہ طور پر دے دینا ایک روزہ کا فدیہ ہے، بشرطیکہ کسی مسجد، مدرسہ کی خدمت کے معاوضہ میں نہ ہو۔

مسئلہ:- ایک روزہ کے فدیہ کو دو آدمیوں میں تقسیم کرنا، یا چند روزوں کے فدیہ کو ایک ہی شخص کو ایک تاریخ میں

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب قوله فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الآية ج:۲ ص:۶۴۷، وصحيح مسلم، كتاب الصيام، باب بيان نسخ قول الله تعالىٰ ...إلخ ج:۱ ص:۳۶۱، وسنن النسائی، کتاب الصیام، باب تأویل قول الله عزّ وجلّ ...إلخ ج:۱ ص:۳۱۸، وسنن ابی داؤد، کتاب الصیام، باب قوله تعالیٰ: وَعَلَى الَّذِينَ الآية ج:۱ ص:۳۱۷ وجامع الترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء علی الذین ...إلخ ج:۱ ص:۱۶۴

[۲] مسند احمد رقم الحدیث:۲۱۱۰۷

[۳] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۱ ص:۵۱۲

دینا دُرست نہیں، جیسا کہ شامی [1] نے بحوالہ بحر اَز قنیہ نقل کیا ہے، اور ''بیان القرآن'' میں اسی کو نقل کیا گیا ہے، مگر حضرتؒ نے ''اِمداد الفتاویٰ'' میں فتویٰ اس پر نقل کیا ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، شامی نے بھی فتویٰ اسی پر نقل کیا ہے، البتہ ''اِمداد الفتاویٰ'' میں ہے کہ اِحتیاط اس میں ہے کہ کئی روزوں کا فدیہ ایک تاریخ میں ایک کو نہ دے، لیکن دے دینے میں گنجائش بھی ہے، یہ فتویٰ مؤرخہ ۱۶ ر جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ ''اِمداد الفتاویٰ'' جلد دوم صفحہ ۱۵۰ میں منقول ہے۔

مسئلہ:- اگر کسی کو فدیہ ادا کرنے کی بھی وسعت نہ ہو تو وہ فقط اِستغفار کرے اور دِل میں نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کر دوں گا۔ (بیان القرآن) [2]

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ

مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن

مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ

راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی، سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینے کو تو ضرور روزے رکھے اس کے، اور جو کوئی ہو

مَرِيضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا

بیمار یا مسافر تو اس کی گنتی پوری کرنی چاہئے اور دنوں سے، اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں

يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ

چاہتا تم پر دُشواری اور اس واسطے کہ تم پوری کرو گنتی اور تا کہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۸۵﴾

اور تا کہ تم اِحسان مانو۔

[1] الشامية، كتاب الصوم، فصل في العوارض المبيحه لعدم الصوم ج:۲ ص:۴۲۷

[2] تفسير بيان القرآن تحت هذه الآية ج:۱ ص:۱۱۶

آسان ترجمۂ قرآن

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لئے سراپا ہدایت، اور ایسی روشن نشانیوں کا حامل ہے جو صحیح راستہ دِکھاتی اور حق و باطل کے درمیان دوٹوک فیصلہ کر دیتی ہیں، لہٰذا تم میں سے جو شخص بھی یہ مہینہ پائے، وہ اس میں ضرور روزہ رکھے۔ اور اگر کوئی شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے۔ اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا معاملہ کرنا چاہتا ہے، اور تمہارے لئے مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتا، تاکہ (تم روزوں کی) گنتی پوری کر لو، اور اللہ نے تمہیں جو راہ دِکھائی اس پر اللہ کی تکبیر کہو، اور تاکہ تم شکر گذار بنو۔ ﴿۱۸۵﴾

خلاصہ تفسیر اور ربطِ آیات

تعیین ایامِ صیام

اُوپر اِرشاد ہوا تھا کہ تھوڑے روزے رکھ لیا کرو، آگے ان تھوڑے دنوں کا بیان ہے:-

(وہ تھوڑے ایام جن میں روزے کا حکم ہوا ہے) ماہِ رمضان ہے جس میں (ایسی برکت ہے کہ اس کے ایک خاص حصہ یعنی شبِ قدر میں) قرآن مجید (لوحِ محفوظ سے آسمانِ دُنیا پر) بھیجا گیا ہے، جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے (ذریعۂ) ہدایت ہے، اور (دُوسرا وصف یہ ہے کہ ہدایت کے طریقے بتلانے میں اس کا جزو جزو) واضح الدلالۃ ہے، (اور ان دونوں وصفوں میں) من جملہ ان کتب (سماویہ) کے (ہے) جو کہ (انہی دو وصفوں سے موصوف ہیں یعنی ذریعۂ) ہدایت (بھی) ہیں اور (وضوحِ دلالت کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں، سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے (اور وہ فدیہ کی اِجازت جو اُوپر مذکور تھی، منسوخ و موقوف ہوئی) اور (مریض اور مسافر کے لئے جو اُوپر قانون تھا وہ البتہ اب بھی اسی طرح باقی ہے کہ) جو شخص (ایسا) بیمار ہو (جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اِجازت ہے، اور بجائے اَیامِ رمضان کے) دُوسرے اَیام کا (اتنا ہی) شمار (کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب ہے) اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (اَحکام میں) آسانی (کی رعایت) کرنا منظور ہے (اس لئے ایسے اَحکام مقرّر کئے جن کو تم آسانی سے بجالاسکو، چنانچہ سفر اور مرض میں کیسا آسان قانون مقرّر کر دیا) اور تمہارے ساتھ (اَحکام و قوانین مقرّر کرنے میں) دُشواری منظور نہیں (کہ سخت اَحکام تجویز کر دیتے) اور (یہ اَحکامِ مذکورہ ہم نے خاص خاص مصلحتوں سے مقرّر کئے، چنانچہ اوّلاً روزہ ادا رکھنے کا اور کسی شرعی عذر

سے رہ جاوے تو دُوسرے اَیام میں قضا کرنے کا حکم تو اسی لئے کیا) تا کہ تم لوگ (اَیامِ اَدا، یا قضا کی) شمار کی تکمیل کرلیا کرو، (تاکہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور (خود قضا رکھنے کا حکم اس لئے کیا) تا کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی (اور ثنا) بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو (ایک ایسا) طریقہ بتلا دیا (جس سے تم برکات وثمراتِ صیام سے محروم نہ رہو، ورنہ اگر قضا واجب نہ ہوتی تو کون اتنے روزے رکھ کر ثواب حاصل کرتا) اور (عذر سے خاص رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اِجازت اس لئے دے دی) تا کہ تم لوگ (اس نعمتِ آسانی پر اللہ تعالیٰ کا) شکر اَدا کیا کرو (ورنہ اگر یہ اِجازت نہ ہوتی تو سخت مشقت ہو جاتی)۔

معارف ومسائل

اس آیت میں پچھلی مجمل آیت کا بیان بھی ہے اور ماہِ رمضان کی اعلیٰ فضیلت کا ذِکر بھی، بیان اس لئے کہ پچھلی آیات میں اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ (البقرۃ:۱۸۴) کا لفظ مجمل ہے، جس کی شرح اس آیت نے کردی کہ وہ پورے ماہِ رمضان کے اَیام ہیں، اور فضیلت یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کو اپنی وحی اور آسمانی کتابیں نازل کرنے کے لئے منتخب کر رکھا ہے، چنانچہ قرآن بھی اسی ماہ میں نازل ہوا، مسندِ احمد میں حضرت واثلہ بن اسقعؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت اِبراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی تاریخ میں نازل ہوئے، اور توراۃ چھ رمضان میں، اِنجیل تیرہ رمضان اور قرآن چوبیس رمضان میں نازل ہوا۔ اور حضرت جابرؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ زَبور بارہ رمضان میں، اِنجیل اٹھارہ رمضان میں نازل ہوئی۔ (ابنِ کثیر) [1]

حدیثِ مذکور میں پچھلی کتابوں کا نزول جس تاریخ میں ذِکر کیا گیا ہے اسی تاریخ میں وہ کتابیں پوری کی پوری انبیاء پر نازل کردی گئی ہیں، قرآنِ کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ رمضان کی ایک رات میں پورا کا پورا لوحِ محفوظ سے سماءِ دُنیا پر نازل کردیا گیا، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول تیئس سال میں رفتہ رفتہ ہوا۔

رمضان کی وہ رات جس میں قرآن نازل ہوا قرآن ہی کی تصریح کے مطابق شبِ قدر تھی: اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِيۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۝۱ ، مذکور الصدر حدیث میں اس کو ۲۴؍رمضان کی شب بتلایا ہے، اور حضرت حسنؒ کے نزدیک چوبیسویں شب شبِ قدر ہوتی ہے، اس طرح یہ حدیث آیتِ قرآن کے مطابق ہو جاتی ہے، اور اگر یہ مطابقت نہ تسلیم کی جائے تو بہرحال قرآنِ کریم کی تصریح سب پر مقدم ہے جو رات بھی شبِ قدر ہو وہی اس کی مراد ہوگی۔

فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ اس ایک جملے میں روزے کے متعلق بہت سے اَحکام ومسائل کی طرف اِشارت ہیں، لفظ شَهِدَ شہود سے بنا ہے، جس کے معنی حضور یعنی حاضر وموجود ہونے کے ہیں، اور "الشهر" عربی لغت

---

[1] مسند احمد رقم الحديث: ۱۶۳۷۰ وتفسير ابن كثير تحت هذه الآية ج:۱ ص:۵۰۱

میں مہینے کے معنی میں آتا ہے، مراد اس سے مہینہ رمضان کا ہے، جس کا ذِکر اُوپر آیا ہے، اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہوگئے کہ تم میں سے جو شخص ماہِ رمضان میں حاضر یعنی موجود ہو اس پر لازم ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے، روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا عام اِختیار جو اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے اس جملے نے منسوخ کرکے روزہ ہی رکھنا لازم کردیا ہے۔

ماہِ رمضان میں حاضر و موجود ہونے کا مفہوم یہی ہے کہ وہ ماہِ رمضان کو ایسی حالت میں پائے کہ اس میں روزہ رکھنے کی صلاحیت موجود ہو، یعنی مسلمان، عاقل، بالغ، مقیم، حیض و نفاس سے پاک ہو۔

اسی لئے جس شخص کا پورا رمضان ایسی حالت میں گزر گیا کہ اس میں روزہ رکھنے کی مطلق صلاحیت ہی نہیں، جیسے کافر، نابالغ، مجنون تو یہ لوگ اس حکم کے مخاطب ہی نہیں، اس لئے ان پر گزشتہ رمضان کے روزے فرض ہی نہیں ہوئے، اور جن میں صلاحیت ذاتی طور پر موجود ہے مگر کسی وقت عذر کی وجہ سے مجبور ہوگئے، جیسے حیض و نفاس والی عورت یا مریض اور مسافر، تو انہوں نے ایک حیثیت سے ماہِ رمضان بحالتِ صلاحیت پالیا، اس لئے حکم آیت کا اُن کے حق میں ثابت ہوگیا، مگر وقتی عذر کے سبب اُس وقت روزہ معاف ہے، البتہ بعد میں قضا لازم ہے، جیسا کہ اس کے بعد تفصیل آئے گی۔

مسئلہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ رمضان کے روزے فرض ہونے کے لئے ماہِ رمضان کا بحالتِ صلاحیت پالینا شرط ہے، اس لئے جس نے پورا رمضان پالیا اس پر پورے رمضان کے روزے فرض ہوگئے، جس نے کچھ کم پایا اُس پر اتنے ہی دن کے روزے فرض ہوئے جتنے دن رمضان کے پائے، اس لئے وسط رمضان میں جو کافر مسلمان ہوا، یا نابالغ بالغ ہوا اس پر صرف آئندہ کے روزے لازم ہوں گے، گزشتہ اَیامِ رمضان کی قضا لازم نہ ہوگی، البتہ مجنون مسلمان اور بالغ ہونے کے اِعتبار سے ذاتی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اگر رمضان کے کسی حصہ میں ہوش میں آجائے تو گزشتہ اَیامِ رمضان کی قضا بھی اس پر لازم ہوجائے گی، اسی طرح حیض و نفاس والی عورت وسطِ رمضان میں پاک ہوجائے یا مریض تندرست ہوجائے یا مسافر مقیم ہوجائے تو گزشتہ اَیام کی قضا لازم ہوگی۔

مسئلہ:- ماہِ رمضان کا پالینا شرعاً تین طریقوں سے ثابت ہوتا ہے، ایک یہ کہ خود رمضان کا چاند دیکھ لے، دُوسرے یہ کہ کسی معتبر شہادت سے چاند دیکھنا ثابت ہوجائے، اور جب یہ دونوں صورتیں نہ پائی جائیں تو شعبان کے تیس روزے پورے کرنے کے بعد ماہِ رمضان شروع ہوجائے گا۔

مسئلہ:- شعبان کی اُنتیسویں تاریخ کی شام کو اگر اَبر وغیرہ کے سبب چاند نظر نہ آئے اور کوئی شرعی شہادت بھی چاند دیکھنے کی نہ پہنچے تو اگلا روز "یـــوم الشَّك" کہلاتا ہے، کیونکہ اُس میں یہ بھی اِحتمال ہے کہ حقیقۃً چاند ہوگیا ہو، مگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہ آیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آج چاند ہی مطلع پر نہ آیا ہو، اُس روز میں چونکہ شہودِ شہر یعنی

رمضان کا پالینا صادق نہیں آتا، اس لئے اُس دن کا روزہ رکھنا واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے، حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے تاکہ فرض اور نفل میں اِختلاط اور اِلتباس نہ پیدا ہو جائے۔ (جصّاص) [۱]

مسئلہ:- جن ملکوں میں رات دن کئی کئی مہینوں کے طویل ہوتے ہیں، وہاں شہودِ شہر یعنی رمضان کا پالینا بظاہر صادق نہیں آتا، اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اُن پر روزے فرض ہی نہ ہوں، فقہائے حنفیہ میں سے حلوانی اور قبالی وغیرہ نے نماز کے متعلق تو اسی پر فتویٰ دیا ہے کہ ان لوگوں پر اپنے ہی دِن رات کے اِعتبار سے نماز کا حکم عائد ہوگا، مثلاً جس ملک میں مغرب کے فوراً بعد صبحِ صادق ہو جاتی ہے وہاں نمازِ عشاء فرض ہی نہیں (شامی)، اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دِن ہے وہاں چھ مہینے میں صرف پانچ نمازیں ہوں گی، اور رمضان وہاں آئے گا ہی نہیں، اس لئے روزے بھی فرض نہ ہوں گے، حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے ''اِمداد الفتاویٰ'' میں روزے کے متعلق اسی قول کو اِختیار فرمایا ہے۔

وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ اس میں مریض اور مسافر کو رُخصت دی گئی ہے کہ وہ اُس وقت روزہ نہ رکھیں، تندرستی ہونے پر اور سفر کے ختم ہونے پر اتنے دنوں کی قضا کرلیں، یہ حکم اگرچہ پچھلی آیت میں بھی آچکا تھا، مگر جب اس آیت میں روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا اِختیار منسوخ کیا گیا تو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید مریض اور مسافر کی رُخصت بھی منسوخ ہوگئی، اس لئے دوبارہ اس کا اِعادہ کر دیا گیا۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو سو میں تو قریب ہوں، قبول کرتا ہوں دُعا مانگنے والے کی دُعا کو

اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

جب مجھ سے دُعا مانگے، تو چاہئے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لائیں مجھ پر تاکہ نیک راہ پر آئیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں۔ لہٰذا وہ بھی میری بات دِل سے قبول کریں، اور مجھ پر اِیمان لائیں، تاکہ وہ راہِ راست پر آجائیں۔ ﴿۱۸۶﴾

---

[۱] احکام القرآن للجصّاص ج:۱ ص:۲۰۵، ۲۰۶

خلاصۂ تفسیر مع ربطِ آیات

پچھلی تین آیتوں میں روزہ اور رمضان کے اَحکام اور فضائل کا ذِکر تھا، اور اس کے بعد بھی ایک طویل آیت میں روزہ اور اِعتکاف کے اَحکام کی تفصیل ہے، درمیان کی اس مختصر آیت میں بندوں کے حال پر حق تعالیٰ کی خاص عنایت، ان کی دُعائیں سننے اور قبول کرنے کا ذِکر فرما کر اِطاعتِ اَحکام کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ روزہ کی عبادت میں رُخصتوں اور سہولتوں کے باوجود کسی قدر مشقت ہے، اس کو سہل کرنے کے لئے اپنی مخصوص عنایت کا ذِکر فرمایا کہ میں اپنے بندوں سے قریب ہی ہوں جب بھی وہ دُعا مانگتے ہیں میں اُن کی دُعائیں قبول کرتا ہوں اور ان کی حاجات کو پورا کر دیتا ہوں۔

ان حالات میں بندوں کو بھی چاہئے کہ میرے اَحکام کی تعمیل میں کچھ مشقت بھی ہو تو برداشت کریں، اور اِمام ابنِ کثیرؒ نے اس درمیانی جملہ ترغیبِ دُعا کی یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس آیت نے اِشارہ کر دیا کہ روزے کے بعد دُعا قبول ہوتی ہے، اس لئے اس دُعا کا خاص اِہتمام کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لِلصَّائِمِ عِنْدَ فِطْرِهٖ دَعْوَةٌ مُّسْتَجَابَةٌ۔ (ابوداوٗد طیالسی بروایۃ عبداللہ بن عمروؓ)[1]

''یعنی روزہ اِفطار کرنے کے وقت روزہ دار کی دُعا مقبول ہے۔''

اسی لئے حضرت عبداللہ بن عمروؓ اِفطار کے وقت سب گھر والوں کو جمع کر کے دُعا کیا کرتے تھے۔ تفسیر آیت کی یہ ہے:-

اور (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں (کہ میں ان سے قریب ہوں یا دُور) تو (میری طرف سے اُن سے فرما دیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں (اور باستثناء نامناسب درخواست کے) منظور کر لیتا ہوں (ہر) عرضی درخواست کرنے والے کی جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دے، سو (جس طرح میں اُن کی عرض معروض کو منظور کر لیتا ہوں) ان کو چاہئے کہ میرے اَحکام کو (بجا آوری کے ساتھ) قبول کیا کریں (اور چونکہ ان اَحکام میں کوئی حکم نامناسب نہیں اس لئے اس میں اِستثناء ممکن نہیں) اور مجھ پر یقین رکھیں (یعنی میری ہستی پر بھی، میرے حاکم ہونے پر بھی، میرے حکیم ہونے پر اور رعایت ومصالح پر بھی، اس طرح) اُمید ہے کہ وہ لوگ رُشد (وفلاح) حاصل کر سکیں گے۔

مسئلہ:- اس آیت میں فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ فرما کر اس طرف بھی اِشارہ کر دیا کہ دُعا آہستہ اور خفیہ کرنا چاہئے، دُعا میں آواز بلند کرنا پسند نہیں۔ ابنِ کثیرؒ نے آیت کا شانِ نزول یہی ذِکر کیا ہے کہ کسی گاؤں والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مسند ابی داوٗد الطیالسی، احادیث عبداللہ بن عمرو رقم الحدیث: ۲۳۶۴ وتفسیر ابن کثیر تحت ھٰذہ الآیۃ ج: ۱ ص: ۵۰۹

سے سوال کیا کہ ہمارا ربّ اگر ہم سے قریب ہے تو ہم دُعا آہستہ آواز سے مانگا کریں، اور دُور ہو تو بلند آواز سے پکارا کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ

حلال ہوا تم کو روزے کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے، وہ پوشاک ہیں تمہاری اور تم

لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا

پوشاک ہو ان کی، اللہ کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے سو معاف کیا تم کو اور درگزر کی

عَنكُمْ ۖ فَالْـَٔانَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا

تم سے، پھر ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس کو جو لکھ دیا ہے اللہ نے تمہارے لئے، اور کھاؤ اور پیو

حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ

جب تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری صبح کی جدا دھاری سیاہ سے، پھر

أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ

پورا کرو روزے کو رات تک، اور نہ ملو عورتوں سے جب تک کہ تم اعتکاف کرو

فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ

مسجدوں میں، یہ حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ کی، سو ان کے نزدیک نہ جاؤ، اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ اپنی آیتیں

لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

لوگوں کے واسطے تا کہ وہ بچتے رہیں۔

آسان ترجمۂ قرآن

تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے کہ روزوں کی رات میں تم اپنی بیویوں سے بے تکلف صحبت کرو۔ وہ تمہارے لئے لباس ہیں، اور تم اُن کے لئے لباس ہو۔ اللہ کو علم تھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے، پھر اس نے تم پر عنایت کی اور تمہاری غلطی معاف فرما دی، چنانچہ اب تم ان سے صحبت کر لیا کرو، اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے لکھ رکھا ہے اسے طلب کرو، اور اس وقت تک کھاؤ پیو جب تک صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے ممتاز ہو کر تم پر واضح (نہ) ہو جائے۔ اس کے بعد رات آنے تک روزے پورے کرو۔ اور ان (اپنی بیویوں) سے اس حالت میں مباشرت نہ کرو جب تم مسجدوں میں اِعتکاف میں بیٹھے ہو۔ یہ اللہ کی (مقرّر کی ہوئی) حدود ہیں، لہٰذا اِن (کی خلاف ورزی) کے قریب بھی مت جانا۔ اسی طرح اللہ اپنی نشانیاں لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ ﴿۱۸۷﴾

خلاصۂ تفسیر

حکمِ چہارم :- رمضان کی راتوں میں جماع

اس آیت میں روزہ کے بقیہ اَحکام کی کچھ تفسیر مذکور ہے :-

تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیبیوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا (اور پہلے جو اس سے ممانعت تھی وہ موقوف کی گئی) کیونکہ (بوجہ قرب واِتصال کے) وہ تمہارے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہیں اور تم ان کے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہو، خدا تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم (اس حکمِ اِلٰہی میں) خیانت (کر) کے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے تھے (مگر) خیر (جب تم معذرت سے پیش آئے تو) اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا، سو (جب اِجازت ہو گئی تو) اب ان سے ملو ملاؤ اور جو (قانونِ اِجازت) تمہارے لئے تجویز کر دیا ہے، (بے تکلف) اس کا سامان کرو، اور (جس طرح شبِ صیام میں بی بی سے ہم بستری کی اِجازت ہے، اسی طرح یہ بھی اِجازت ہے کہ تمام رات میں جب چاہو) کھاؤ (بھی) اور پیو (بھی) اس وقت تک کہ تم کو سفید خطِ صبح (صادق کی روشنی) کا متمیّز ہو جاوے سیاہ خط سے (یعنی رات کی تاریکی سے) تو پھر (صبحِ صادق سے) رات (آنے) تک روزے کو پورا کیا کرو۔

(صبح کی سفیدی کا سفید خط رات کی تاریکی کے سیاہ خط سے متمیّز ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ صبحِ صادق یقینی طور سے ثابت ہو جائے۔)

حکم پنجم :- اعتکاف

اور ان بیبیوں (کے بدن) سے اپنا بدن بھی (شہوت کے ساتھ) مت ملنے دو جس زمانے میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو، (جو کہ) مسجدوں میں (ہوا کرتا ہے) یہ (سب اَحکامِ مذکورہ) خداوندی ضابطے ہیں، سو اِن (ضابطوں) سے (نکلنا تو کیسا) نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا (اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ اَحکام بیان کئے ہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے (اور) اَحکام (بھی) لوگوں (کی اِصلاح) کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں، اس اُمید پر کہ وہ لوگ (اَحکام پر مطلع ہوکر ان اَحکام کے خلاف کرنے سے) پرہیز رکھیں۔

معارف ومسائل

اُحِلَّ لَکُمْ کے لفظ سے معلوم ہوا کہ جو چیز اس آیت کے ذریعہ حلال کی گئی ہے وہ اس سے پہلے حرام تھی، صحیح بخاری وغیرہ میں بروایت براء بن عازبؓ مذکور ہے کہ ابتدا میں جب رمضان کے روزے فرض کئے گئے تو اِفطار کے بعد کھانے پینے اور بیبیوں کے ساتھ اِختلاط کی صرف اُس وقت تک اِجازت تھی جب تک سو نہ جائے، سو جانے کے بعد یہ سب چیزیں حرام ہوجاتی تھیں، بعض صحابہ کرامؓ کو اس میں مشکلات پیش آئیں، قیس بن صرمہ انصاریؓ دن بھر مزدوری کر کے اِفطار کے وقت گھر پہنچے تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا، بیوی نے کہا کہ میں کہیں سے کچھ اِنتظام کر کے لاتی ہوں، جب وہ واپس آئی تو دِن بھر کے تکان کی وجہ سے ان کی آنکھ لگ گئی، اب بیدار ہوئے تو کھانا حرام ہو چکا تھا، اگلے دن اسی طرح روزہ رکھا، دوپہر کو ضعف سے بیہوش ہوگئے (ابن کثیر)[1]، اسی طرح بعض صحابہؓ سونے کے بعد اپنی بیبیوں کے ساتھ اِختلاط میں مبتلا ہوکر پریشان ہوئے، ان واقعات کے بعد یہ آیت نازل ہوئی، جس میں پہلا حکم منسوخ کر کے غروبِ آفتاب کے بعد سے طلوعِ صبح صادق تک پوری رات میں کھانے پینے اور مباشرت کی اجازت دے دی گئی، اگرچہ سوکر اُٹھنے کے بعد ہو، بلکہ سوکر اُٹھنے کے بعد آخرِ شب میں سحری کھانا سنت قرار دِیا گیا، جس کا ذِکر رِوایاتِ حدیث میں واضح ہے، اس آیت میں اسی حکم کا بیان کیا گیا ہے۔

''رَفَث'' کے لفظی معنی اگرچہ عام ہیں، ایک مرد بی بی سے اپنی خواہش پورا کرنے کے لئے جو کچھ کرتا یا کہتا ہے وہ سب اس میں شامل ہے، لیکن باتفاقِ اُمت اس جگہ اس سے مراد جماع ہے۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب قول اللہ: اُحِلَّ لَکُمْ ...إلخ ج:۱ ص:۲۵۶، ۲۵۷، وتفسیر ابن کثیر تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۵۱۰

ثبوتِ احکامِ شرعیہ کے لئے قولِ رسول کریم بھی بحکم قرآن ہے

اس آیت نے جس حکم کو منسوخ کیا ہے، یعنی سو جانے کے بعد کھانے، پینے وغیرہ کی حرمت کو، یہ حکم قرآن میں کہیں مذکور نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے صحابہ کرامؓ اس حکم پر عمل کرتے تھے (کما رواہ احمد فی مسندہ)[1]، اسی کو اس آیت نے حکمِ الٰہی قرار دے کر منسوخ کیا ہے۔

اس آیت میں پہلے حکم کو حکمِ الٰہی قرار دیا گیا، اور پھر آسانی کے لئے اس کو منسوخ کیا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سنت سے ثابت شدہ بعض احکام کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ (جصاص وغیرہ)[2]

سحری کھانے کا آخری وقت

حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ اس آیت میں رات کی تاریکی کو سیاہ خط اور صبح کی روشنی کو سفید خط کی مثال سے بتلا کر روزہ شروع ہونے اور کھانا پینا حرام ہو جانے کا صحیح وقت متعین فرما دیا، اور اس میں اِفراط و تفریط کے اِحتمالات کو ختم کرنے کے لئے حَتّٰى يَتَبَيَّنَ کا لفظ بڑھا دیا جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ نہ تو وہمی مزاج لوگوں کی طرح صبحِ صادق سے کچھ پہلے ہی کھانے پینے وغیرہ کو حرام سمجھو، اور نہ ایسی بے فکری اختیار کرو کہ صبح کی روشنی کا یقین ہو جانے کے باوجود کھاتے پیتے رہو، بلکہ کھانے پینے اور روزے کے درمیان حدِ فاصل صبحِ صادق کا تیقن ہے، اس تیقن سے پہلے کھانے پینے کو حرام سمجھنا دُرست نہیں، اور تیقن کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہنا بھی حرام اور روزے کے لئے مفسد ہے، اگرچہ ایک ہی منٹ کے لئے ہو، سحری کھانے میں وسعت اور گنجائش صرف اسی وقت تک ہے جب تک صبحِ صادق کا یقین نہ ہو، بعض صحابہ کرامؓ کے ایسے واقعات کو بعض کہنے والوں نے اس طرح بیان کیا کہ سحری کھاتے ہوئے صبح ہو گئی اور وہ بے پروائی سے کھاتے رہے، یہ اسی پر مبنی تھا کہ صبح کا یقین نہیں ہوا تھا اس لئے کہنے والوں کی جلد بازی سے متأثر نہیں ہوئے۔

ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلال کی اَذان تمہیں سحری کھانے سے مانع نہ ہونی چاہئے، کیونکہ وہ رات سے اَذان دے دیتے ہیں، اس لئے تم بلال کی اَذان سن کر بھی اُس وقت تک کھاتے پیتے رہو جب تک ابن اُمِّ مکتوم کی اَذان نہ سنو، کیونکہ وہ ٹھیک طلوعِ صبحِ صادق پر اَذان دیتے ہیں۔ (بخاری و مسلم)[3]

اس حدیث کے ناتمام نقل کرنے سے بعض معاصرین کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ اَذانِ فجر کے بعد بھی کچھ دیر کھایا پیا

---

[1] مسند احمد رقم الحديث: ١٧٨٧٠

[2] احكام القرآن للجصّاص، باب الأكل والشرب ج:٢ ص:٧٥

[3] صحيح البخاري، كتاب الصوم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: لا يمنعكم من سحوركم ...إلخ ج:١ ص:٢٥٧، وصحيح مسلم، كتاب الصيام، باب بيان الدخول في الصوم ...إلخ ج:١ ص:٣٤٩، ٣٥٠

جائے تو مضائقہ نہیں، اور جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی کہ صبح کی اَذان ہورہی تھی اس کے لئے جائز کردیا کہ وہ جلدی جلدی کچھ کھالے، حالانکہ اسی حدیث میں واضح طور پر بتلادیا گیا ہے کہ اَذانِ ابن اُمِّ مکتومؓ جو ٹھیک طلوعِ فجر کے ساتھ ہوتی تھی اس پر کھانے سے رُک جانا ضروری ہے، اس کے علاوہ قرآنِ کریم نے خود جو حدبندی فرمادی ہے وہ طلوعِ صبح کا تیقن ہے، اس کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی کھانے پینے کی اجازت دینا نصِ قرآن کی خلاف ورزی ہے، صحابہ کرامؓ اور اَسلافِ اُمت سے جو اِفطار وسحر میں مساہلت کی روایات منقول ہیں ان سب کا محل نصِ قرآن کے مطابق یہی ہوسکتا ہے کہ تیقنِ صبحِ صادق سے پہلے پہلے زیادہ اِحتیاطی تنگی اِختیار نہ کی جائے، اِمام ابنِ کثیرؒ نے بھی ان روایات کو اسی بات پر محمول فرمایا ہے،[۱] ورنہ نصِ قرآنی کی صریح مخالفت کو کون مسلمان برداشت کرسکتا ہے، اور صحابہ کرامؓ سے تو اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً جبکہ قرآنِ کریم نے اسی آیت کے اَخیر میں تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ کے ساتھ فَلَا تَقْرَبُوْهَا فرما کر خاص اِحتیاط کی تاکید بھی فرمادی ہے۔

مسئلہ:- یہ سب کلام ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ایسے مقام پر ہیں جہاں سے صبحِ صادق کو بچشم خود دیکھ کر یقین حاصل کرسکتے ہیں، اور مطلع بھی صاف ہے، اور وہ صبحِ صادق کی اِبتدائی روشنی کی پہچان بھی رکھتے ہیں، تو ان کو لازم ہے کہ براہِ راست اُفق کو دیکھ کر عمل کریں، اور جہاں یہ صورت نہ ہو مثلاً کھلا ہوا اُفق سامنے نہیں یا مطلع صاف نہیں، یا اس کو صبحِ صادق کی پہچان نہیں، اس لئے وہ دُوسرے آثار وعلامات یا ریاضی حسابات کے ذریعے وقت کا تعین کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے لئے کچھ وقت ایسا آئے گا کہ صبحِ صادق کا ہوجانا مشکوک ہو، یقینی نہ ہو، ایسے لوگوں کو مشکوک حالت میں کیا کرنا چاہئے؟ اس کے متعلق اِمام جصّاصؒ نے "اَحکام القرآن"[۲] میں فرمایا کہ اس حالت میں اصل تو یہی ہے کہ کھانے پینے پر اِقدام نہ کرے، لیکن مشکوک حالت میں صبحِ صادق کا یقین ہونے سے پہلے پہلے کسی نے کچھ کھاپی لیا تو گناہگار نہیں ہوگا، لیکن اگر بعد میں تحقیق سے یہ ثابت ہوگیا کہ اُس وقت صبح ہوچکی تھی تو قضا اس کے ذمے لازم ہے، جیسے شروع رمضان میں چاند نظر نہ آیا اور لوگوں نے روزہ نہیں رکھا، مگر بعد میں شہادت سے ۲۹ر کا چاند ثابت ہوگیا، تو جن لوگوں نے اس دن کو شعبان کی تیسویں تاریخ سمجھ کر روزہ نہیں رکھا تھا، وہ گنہگار تو نہیں ہوئے، مگر اس روزے کی قضا اُن پر باتفاق لازم ہے، اسی طرح بادل کے دن میں غروب کے گمان پر روزہ اِفطار کرلیا، بعد میں آفتاب نکل آیا، تو یہ شخص گناہگار تو نہیں مگر قضا اس پر واجب ہے۔

اِمام جصّاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اَذان ہوئی

---

[۱] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۵۱۵

[۲] باب الأکل والشرب والجماع لیلة الصیام ج:۱ ص:۷۲

تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھائے گا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قضا بھی اس پر لازم ہوگی، اور مشکوک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہو جائے گا، مگر قضا ساقط نہ ہوگی، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔ [1]

اِعتکاف اور اس کے مسائل

''اِعتکاف'' کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اِصطلاحِ قرآن وسنت میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام ''اِعتکاف'' ہے، لفظ فِي الْمَسٰجِدِ کے عموم سے ثابت ہوا کہ اِعتکاف ہر مسجد میں ہوسکتا ہے، حضراتِ فقہاء نے جو یہ شرط بیان کی ہے کہ اِعتکاف صرف اُس مسجد میں ہوسکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو، غیر آباد مسجد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اِعتکاف دُرست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہے، کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دُکان مکان وغیرہ میں ہوسکتی ہے۔

مسئلہ:- روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اُوپر بیان ہوا ہے، حالتِ اِعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہے جو سب کے لئے ہے، مگر مباشرتِ نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں، اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

مسئلہ:- اِعتکاف کے دُوسرے مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اِعتکاف میں مسجد سے نکلنا بغیر حاجتِ طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ ''اِعتکاف'' سے مستفاد ہیں، کچھ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل سے۔

روزے کے معاملے میں اِحتیاط کا حکم

آخرِ آیت میں تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا فرما کر اِشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی جو ممانعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں، ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا اِحتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلی کرنے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، منہ کے اندر کوئی دوا اِستعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس وکنار مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں اِحتیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور اِفطار میں دو تین منٹ مؤخر کرنا بہتر ہے، اس میں بے پروائی اور سہل انگاری اس اِرشادِ خداوندی کے خلاف ہے۔

---

[1] احكام القرآن للجصّاص، باب الأكل والشرب والجماع ليلة الصيام ج:۲ ص:۷۲

وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا

اور نہ کھاؤ مال ایک دُوسرے کا آپس میں ناحق، اور نہ پہنچاؤ اُن کو حاکموں تک کہ کھا جاؤ

ع ۲۳ فَرِيقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق) اور تم کو معلوم ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقوں سے نہ کھاؤ، اور نہ ان کا مقدمہ حاکموں کے پاس اس غرض سے لے جاؤ کہ لوگوں کے مال کا کوئی حصہ جانتے بوجھتے ہڑپ کرنے کا گناہ کرو۔ ﴿۱۸۸﴾

ربطِ آیات و خلاصۂ تفسیر

پچھلی آیتوں میں روزے کے اَحکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے اِستعمال کو ایک معین زمانے میں اور معین وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مالِ حرام حاصل کرنے اور اس کے اِستعمال کرنے کی ممانعت اسی مناسبت سے ذِکر کی گئی کہ عبادتِ صوم کا اصل منشا یہی ہے کہ اِنسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا خوگر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہے کہ جب روزہ ختم ہو اِفطار کے لئے مالِ حلال مہیا کرنا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مالِ حرام سے اِفطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

حکمِ ششم:- مالِ حرام سے بچنا

اور آپس میں ایک دُوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ، اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رُجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریقِ گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

معارف و مسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور اِستعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے

اسی سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گزر چکا ہے، جس میں اِرشاد ہے:-

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾

''یعنی اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے جو چیزیں حلال اور ستھری ہیں، اور شیطان کے قدم پر نہ چلو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دُشمن ہے۔''

اور سورۂ نحل آیت ۱۱۴ میں اِرشاد فرمایا:-

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

''یعنی کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ تعالیٰ نے حلال اور پاک اور شکر کرو اللہ کے اِحسان کا، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔''

کسبِ مال کے اچھے بُرے ذرائع اور اچھائی بُرائی کا معیار

جس طرح مال کی ضرورت اور مدارِ زندگی ہونے پر ساری دُنیا اور اس کی ہر قوم وملت کا اِتفاق ہے، اسی طرح اس پر بھی اِتفاق ہے کہ اس کی تحصیل کے کچھ ذرائع پسندیدہ اور جائز ہیں، کچھ ناپسند اور ممنوع ہیں۔ چوری، ڈاکہ، دھوکہ، فریب کو ساری ہی دُنیا برا سمجھتی ہے، لیکن ان ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے کا کوئی صحیح معیار عام طور پر لوگوں کے ہاتھ میں نہیں، اور ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس کا تعلق پوری دُنیا کے اِنسانوں کی صلاح وفلاح سے ہے اور پورا عالمِ اِنسانیت اس سے متأثر ہوتا ہے، اس کا صحیح اور معقول معیار صرف وہی ہوسکتا ہے جو ربّ العالمین کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہو، ورنہ اگر خود اِنسان اس کا معیار بنانے کا مختار ہو تو جو لوگ اس کا قانون بنائیں گے وہ اپنی قوم یا اپنے وطن یا اپنی ملت کے بارے میں جو کچھ سوچیں گے وہ عام عادت کے مطابق اس سے مختلف ہوگا جو دُوسری قومیں اور وطنوں کے متعلق سوچا جائے گا، اور بین الاقوامی کانفرنسوں کی صورت میں پوری دُنیا کی نمائندگی کی جائے تو تجربہ شاہد ہے کہ وہ بھی ساری مخلوق کو مطمئن کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ قانونی نااِنصافی اَنجامِ کار جنگ وجدل اور فساد کی صورت اِختیار کرے گی۔

اِسلامی نظامِ معاش ہی دُنیا میں امنِ عام قائم کرسکتا ہے

شریعتِ اِسلام نے حلال وحرام اور جائز وناجائز کا جو قانون بتاتا ہے وہ صراحۃً وحیِ اِلٰہی سے ہے یا اس سے مستفاد، اور وہی ایک ایسا معقول، فطری اور جامع قانون ہے جو ہر قوم وملت اور ہر ملک ووطن میں چل سکتا ہے، اور اَمنِ عامہ کا ضامن ہوسکتا ہے، کیونکہ اس قانونِ اِلٰہی میں قابلِ اِشتراک چیزوں کو مشترک اور وقفِ عام رکھا گیا ہے، جس میں تمام

اِنسان مساوی حق رکھتے ہیں، جیسے ہوا، پانی، خودرو گھاس، آگ کی حرارت اور غیر مملوک جنگلات اور غیر آباد پہاڑی جنگلات کی پیداوار وغیرہ کہ ان میں سب اِنسانوں کا مشترک حق ہے، کسی کو اُن پر مالکانہ قبضہ جائز نہیں، اور جن چیزوں کے اِشتراک میں اِنسانی معاشرت میں خلل پیدا ہوتا ہے، یا نزاع وجدال کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں ان میں اِنفرادی ملکیت کا قانون جاری فرمایا گیا، کسی زمین یا اس کی پیداوار پر اِبتدائی ملکیت کا قانون جدا ہے، اور پھر اِنتقالِ ملکیت کا جدا، اس قانون کی ہر دفعہ میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کوئی اِنسان ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے، بشرطیکہ وہ اپنی جدوجہد ان کی تحصیل میں خرچ کرے، اور کوئی اِنسان دُوسروں کے حقوق غصب کر کے یا دُوسروں کو نقصان پہنچا کر سرمایہ کو محدود افراد میں مقید نہ کردے، اِنتقالِ ملکیت خواہ بعد الموت وراثت کے قانونِ الٰہی کے مطابق ہو، یا پھر بیع وشرا وغیرہ کے ذریعے فریقین کی رضامندی سے ہو، مزدوری ہو، یا کسی مال کا معاوضہ دونوں میں اس کو ضروری قرار دِیا گیا کہ معاملہ میں کوئی دھوکہ، فریب، یا تلبیس نہ ہو، اور کوئی ایسا اِبہام اور اِجمال نہ رہے جس کی وجہ سے باہمی منازعت کی نوبت آئے۔

نیز اس کی بھی رعایت رکھی گئی ہے کہ فریقین جو رضامندی دے رہے ہیں وہ حقیقی رضامندی ہو، کسی اِنسان پر دباؤ ڈال کر کوئی رضامندی نہ لی گئی ہو، شریعتِ اسلام میں جتنے معاملات باطل یا فاسد اور گناہ کہلاتے ہیں اُن سب کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اُن میں وجوہِ مذکور میں سے کسی وجہ سے خلل ہوتا ہے، کہیں دھوکہ فریب ہوتا ہے، کہیں نامعلوم چیز یا نامعلوم عمل کا معاوضہ ہوتا ہے، کہیں کسی کا حق غصب ہوتا ہے، کہیں کسی کو نقصان پہنچا کر اَپنا نفع کیا جاتا ہے، کہیں حقوقِ عامہ میں ناجائز تصرف ہوتا ہے، سود، قمار وغیرہ کو حرام قرار دینے کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ حقوقِ عامہ کے لئے مضر ہیں، ان کے نتیجہ میں چند اَفراد پلتے بڑھتے ہیں، اور پوری ملت مفلس ہوتی ہے، ایسے معاملات فریقین کی رضامندی سے بھی اس لئے حلال نہیں کہ وہ پوری ملت کے خلاف ایک جرم ہے، آیتِ مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں پر حاوی ہے، اِرشاد ہے: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ یعنی "نہ کھاؤ ایک دُوسرے کا مال ناجائز طریق پر" اس میں ایک بات تو یہ قابلِ غور ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ میں "اَمْوَالَكُمْ" آیا ہے، جس کے اصلی معنی ہیں اپنے اموال، جس میں اس کی طرف اِشارہ کیا گیا کہ تم جو کسی دُوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہو تو یہ غور کرو کہ دُوسرے شخص کو بھی اپنے مال سے ایسی ہی محبت اور تعلق ہوگا جیسا تمہیں اپنے مال سے ہے، اگر وہ تمہارے مال میں ایسا ناجائز تصرف کرتا تو تمہیں جو دُکھ پہنچتا اُس کا اس وقت بھی ایسا ہی اِحساس کرو کہ گویا وہ تمہارا مال ہے۔

اس کے علاوہ اِشارہ اس طرف بھی ہوسکتا ہے کہ جب ایک شخص دُوسرے کے مال میں کوئی ناجائز تصرف کرتا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اگر یہ رسم چل پڑی تو دُوسرے اس کے مال میں ایسا ہی تصرف کریں گے، اس حیثیت سے کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرف درحقیقت اپنے مال میں ناجائز تصرف کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے، غور کیجئے اشیائے

ضرورت میں ملاوٹ کی رسم چل جائے، کوئی گھی میں تیل یا چربی ملاکر زائد پیسے حاصل کرے، تو اس کو جب دُودھ خریدنے کی ضرورت پڑے گی، دُودھ والا اس میں پانی ملاکر دے گا، مسالہ کی ضرورت ہوگی اس میں ملاوٹ ہوگی، دوا کی ضرورت ہوگی اس میں بھی یہی منظر سامنے آئے گا، تو جتنے پیسے ایک شخص نے ملاوٹ کر کے زائد حاصل کرلئے، دُوسرا آدمی وہ پیسے اس کی جیب سے نکال لیتا ہے، اسی طرح دُوسرے کے پیسے تیسرا نکال لیتا ہے، یہ بیوقوف اپنی جگہ بیسیوں کی زیادتی شمار کر کے خوش ہوتا ہے، مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس کیا رہا، تو جو کوئی دُوسرے کے مال کو غلط طریقے سے حاصل کرتا ہے درحقیقت وہ اپنے مال کے ناجائز تصرف کا دروازہ کھولتا ہے۔

دُوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ اس ارشادِ خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریق سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس میں کسی کا مال غصب کرلینا بھی داخل ہے، چوری اور ڈاکہ بھی، جن میں دُوسرے پر ظلم کر کے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے، اور سود، قمار، رِشوت اور تمام بیوعِ فاسدہ اور معاملاتِ فاسدہ بھی جواز رُوئے شرع جائز نہیں، اگرچہ فریقین کی رضامندی بھی متحقق ہو، جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرلینا یا ایسی کمائی جس کو شریعتِ اِسلام نے ممنوع قرار دِیا ہے، اگرچہ اپنی جان کی محنت ہی سے حاصل کی گئی ہو وہ سب حرام اور باطل ہیں، اور قرآن کے الفاظ میں اگرچہ صراحۃً کھانے کی ممانعت مذکور ہے، لیکن مراد اس جگہ صرف کھانا ہی نہیں بلکہ مطلقاً اِستعمال کرنا ہے، خواہ کھاپی کر، یا پہن کر یا دُوسرے طریقے کے اِستعمال سے، مگر محاورات میں ان سب قسم کے اِستعمالوں کو کھالینا ہی بولا جاتا ہے، کہ فلاں آدمی فلاں کا مال کھا گیا، اگرچہ وہ مال کھانے پینے کے لائق نہ ہو۔

شانِ نزول

یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضراتِ صحابہ کرامؓ میں سے دو صاحبوں کا آپس میں ایک زمین پر جھگڑا ہوا، مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، مدعی کے پاس گواہ نہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی ضابطہ کے مطابق مدعاعلیہ کو حلف کرنے کا حکم دیا، وہ حلف پر آمادہ ہوگیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ نصیحت اُن کو یہ آیت سنائی: اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (آل عمران: ۷۷) جس میں قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرنے پر وعید مذکور ہے، صحابی نے جب یہ آیت سنی تو قسم کھانے کو ترک کردیا اور زمین مدعی کے حوالے کردی۔ (رُوح المعانی) [1]

اس واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ناجائز طریق پر کسی کا مال کھانے یا حاصل کرنے کو حرام قرار دِیا ہے،

---

[1] رُوح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۴۰

اور اس کے آخر میں خاص طور پر جھوٹا مقدمہ بنانے اور جھوٹی قسم کھانے اور جھوٹی شہادت دینے اور دِلوانے کی سخت ممانعت اور اس پر وعید آئی ہے، اِرشاد ہے: وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ یعنی نہ لے جاؤ اموال کے مقدمات حکام تک، تاکہ ان کے ذریعہ تم لوگوں کے اَموال کا کوئی حصہ کھا جاؤ بطریقِ گناہ جبکہ تم جانتے بھی ہو کہ اس میں تمہارا کوئی حق نہیں، تم جھوٹا مقدمہ بنا رہے ہو۔ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی مغالطہ کی بنا پر اس چیز کو اپنا حق سمجھتا ہے، وہ اگر عدالت میں دعویٰ دائر کر کے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں، اسی جیسے ایک واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا:-

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَاَنْتُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَيَّ وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَنْ يَّكُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِيْ لَهٗ عَلٰى نَحْوِ مَا اَسْمَعُ مِنْهُ فَمَنْ قَضَيْتُ لَهٗ بِشَيْءٍ مِّنْ حَقِّ اَخِيْهِ فَلَا يَاْخُذَنَّهٗ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ۔ (رواه البخاری ومسلم عن اُمّ سلمةؓ) [1]

”یعنی میں ایک اِنسان ہوں اور تم میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو، اس میں یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے معاملہ کو زیادہ رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرے، اور میں اسی سے مطمئن ہوکر اس کے حق میں فیصلہ کردوں تو (یاد رکھو کہ حقیقتِ حال تو صاحبِ معاملہ کو خود معلوم ہوتی ہے) اگر فی الواقع وہ اس کا حق نہیں ہے تو اس کو لینا نہیں چاہئے، کیونکہ اس صورت میں جو کچھ میں اس کو دُوں گا وہ جہنم کا ایک قطعہ ہوگا۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اِرشاد میں واضح فرمادیا کہ اگر اِمام یا قاضی یا اِمام المسلمین کسی مغالطہ کی وجہ سے کوئی غلط فیصلہ کردے جس میں ایک کا حق دُوسرے کو ناجائز طور پر مل رہا ہو، تو اس عدالتی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوجاتا، اور جس کے لئے حلال ہے اس کے لئے حرام نہیں ہوجاتا، الغرض عدالت کا فیصلہ کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہیں بناتا، اگر کوئی شخص دھوکہ فریب یا جھوٹی شہادت یا جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی کا مال بذریعہ عدالت لے لے، تو اس کا وبال اس کی گردن پر رہے گا، اس کو چاہئے کہ آخرت کے حساب کتاب اور علیم وخبیر کی عدالت میں پیشی کا خیال کرکے اس کو چھوڑ دے۔

اِمام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جن معاملات میں کوئی عقد یا فسخ ہوتا ہو اور جن میں قاضی یا جج کو بھی شرعاً اِختیارات حاصل ہوتے ہیں، ایسے معاملات میں اگر جھوٹی قسم یا جھوٹی شہادت کی بنا پر بھی کوئی فیصلہ قاضی نے صادر کردیا تو شرعاً وہ

[1] صحیح البخاری، کتاب الأحکام، باب من قضی له بحق أخیه ...إلخ ج:۲ ص:۱۰۶۴، ۱۰۶۵، وصحیح مسلم، کتاب الأقضیة، باب بیان ان حکم الحاکم لا یغیر الباطن ج:۲ ص:۷۴

عقد یا فسخ صحیح ہوجائے گا، اور حلال وحرام کے اَحکام اس پر عائد ہوجائیں گے، اگرچہ جھوٹ بولنے اور جھوٹی شہادت دِلوانے کا وبال اس کی گردن پر رہے گا۔

مالِ حلال کی برکات اور حرام کی نحوست

حرام سے بچنے اور حلال کے حاصل کرنے کے لئے قرآنِ کریم نے مختلف مقامات میں مختلف عنوانات سے تاکیدیں فرمائی ہیں، ایک آیت میں اس کی طرف بھی اِشارہ کیا ہے کہ اِنسان کے اعمال واخلاق میں بہت بڑا دخل حلال کھانے کو ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں تو اس سے اخلاقِ حمیدہ اور اعمالِ صالحہ کا صدور مشکل ہے، اِرشاد ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۵۱ (المؤمنون)

''یعنی اے گروہِ انبیاء! حلال اور پاک چیزیں کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں تمہارے اعمال کی حقیقت سے واقف ہوں۔''

اس آیت میں حلال کھانے کے ساتھ عملِ صالح کا حکم فرما کر اِشارہ کردیا ہے کہ اعمالِ صالحہ کا صدور جب ہی ہوسکتا ہے جبکہ اِنسان کا کھانا پینا حلال ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یہ بھی واضح فرمادیا کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب انبیاء علیہم السلام کو ہے، مگر یہ حکم کچھ انہیں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان اس کے مأمور ہیں، اس حدیث کے آخر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حرام مال کھانے والے کی دُعا قبول نہیں ہوتی، بہت سے آدمی عبادت وغیرہ میں مشقت اُٹھاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ دُعا کے لئے پھیلاتے ہیں، اور ''یا ربّ، یا ربّ'' پکارتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس اُن کا حرام ہے تو اُن کی یہ دُعا کہاں قبول ہوسکتی ہے۔[1]

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا حصہ اِسی کام کے لئے وقف رہا ہے کہ اُمت کو حرام سے بچانے اور حلال کے اِستعمال کرنے کی ہدایتیں دیں۔

ایک حدیث میں اِرشاد فرمایا کہ جس شخص نے حلال کھایا اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کی اِیذاؤں سے محفوظ رہے، وہ جنت میں جائے گا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آج کل تو یہ حالات آپ کی اُمت میں عام ہیں، بیشتر مسلمان ان کے پابند ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! آئندہ بھی ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہیں گے جو اِن اَحکام کے پابند ہوں گے۔ (یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے، اور اس کو صحیح فرمایا ہے)[2]

ایک دُوسری حدیث میں اِرشاد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ چار

[1] مشکوٰة ج:۱ ص:۲۴۱

[2] جامع الترمذی، ابواب صفة القیامة، بابٌ منه ج:۲ ص:۷۸

خصلتیں ایسی ہیں جب وہ تمہارے اندر موجود ہوں تو پھر دُنیا میں کچھ بھی حاصل نہ ہو تو تمہارے لئے کافی ہیں، وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ ایک امانت کی حفاظت، دُوسرے سچ بولنا، تیسرے حسنِ خلق، چوتھے کھانے میں حلال کا اہتمام۔[۱]

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لئے یہ دُعا فرمادیجئے کہ میں مقبول الدعاء ہو جاؤں، جو دُعا کیا کروں قبول ہوا کرے، آپ نے فرمایا: اے سعد! اپنا کھانا حلال اور پاک بنالو، مستجاب الدعوات ہو جاؤ گے، اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے! بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو اس گوشت کے لئے تو جہنم کی آگ ہی لائق ہے۔[۲]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کا قلب اور زبان مسلمان نہ ہو جائے، اور جب تک اس کے پڑوسی اس کی اِیذاؤں سے محفوظ نہ ہو جائیں، اور جب کوئی بندہ مالِ حرام کماتا ہے پھر اس کو صدقہ کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا، اور اگر اس میں سے خرچ کرتا ہے تو برکت نہیں ہوتی، اور اگر اس کو اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جاتا ہے تو وہ جہنم کی طرف جانے کے لئے اس کا توشہ ہوتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ بری چیز سے برے عمل کو نہیں دھوتے، ہاں اچھے عمل سے برے عمل کو دھو دیتے ہیں۔[۳]

محشر میں ہر اِنسان سے پانچ سوالات

اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَا تَزَالُ قَدَمَا عَبْدٍ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ حَتّٰی یُسْاَلَ عَنْ اَرْبَعٍ: عَنْ عُمْرِہٖ فِیْمَا اَفْنَاہُ، وَعَنْ شَبَابِہٖ فِیْمَا اَبْلَاہُ، وَعَنْ مَالِہٖ مِنْ اَیْنَ اکْتَسَبَہٗ وَفِیْمَا اَنْفَقَہٗ، وَعَنْ عِلْمِہٖ مَاذَا عَمِلَ فِیْہِ۔ (البیہقی، ترغیب)[۴]

’’قیامت کے روز محشر میں کوئی بندہ اپنی جگہ سے سرک نہ سکے گا، جب تک اس سے چار[۵] سوالوں کا جواب نہ لیا جائے، ایک یہ کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں فنا کی، دُوسرے یہ کہ اپنی جوانی کس شغل

---

[۱] شعب الإیمان للبیہقی، بابٌ فی الأمانات رقم الحدیث: ۵۰۲۹

[۲] المعجم الأوسط للطبرانی رقم الحدیث: ۲۲۸۳

[۳] المعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث: ۱۰۴۰۱

[۴] الترغیب والترہیب، کتاب العلم، باب الترہیب من ان یعلم ولا یعمل ...اِلخ رقم الحدیث: ۱۲۷

[۵] بعض روایات میں پانچ کا عدد ہے، اس میں مال کے دوسوالوں کو الگ الگ شمار کرلیا گیا۔ ۱۲ منہ

میں برباد کی، تیسرے یہ کہ اپنا مال کہاں سے کمایا، اور کہاں خرچ کیا، اور چوتھے یہ کہ اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ اے جماعتِ مہاجرین! پانچ خصلتیں ہیں جن کے متعلق میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تمہارے اندر پیدا ہوجائیں، ایک یہ ہے کہ جب کسی قوم میں بے حیائی پھیلتی ہے تو ان پر طاعون اور وبائیں اور ایسے نئے نئے امراض مسلط کردیئے جاتے ہیں جو ان کے آباء واَجداد نے سنے بھی نہ تھے، اور دُوسرے یہ کہ جب کسی قوم میں ناپ تول کے اندر کمی کرنے کا مرض پیدا ہوجائے تو ان پر قحط اور گرانی اور مشقت ومحنت اور حکام کے مظالم مسلط کردیئے جاتے ہیں، اور تیسرے یہ کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہ کرے تو بارش بند کردی جاتی ہے، اور چوتھے یہ کہ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے عہد کو توڑ ڈالے تو اللہ تعالیٰ اُن پر اجنبی دُشمن مسلط فرمادیتے ہیں، جو اُن کے مال بغیر کسی حق کے چھین لیتا ہے، اور پانچویں یہ کہ جب کسی قوم کے اربابِ اِقتدار کتاب اللہ کے قانون پر فیصلہ نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ اَحکام اُن کے دِل کو نہ لگیں تو اللہ تعالیٰ اُن کے آپس میں منافرت اور لڑائی جھگڑے ڈال دیتے ہیں۔ (یہ روایت ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہ نے نقل کی ہے، اور حاکم نے اس کو صحیح علیٰ شرط مسلم فرمایا ہے) [1]

اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو ان آفات سے محفوظ رہنے کی توفیقِ کامل عطا فرمائیں، وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ

تجھ سے پوچھتے ہیں نئے چاند کا، کہہ دے کہ یہ اوقاتِ مقرّرہ ہیں لوگوں کے واسطے اور حج کے واسطے،

وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ

اور نیکی یہ نہیں کہ گھروں میں آؤ ان کی پشت کی طرف سے، اور لیکن نیکی یہ کہ جو کوئی ڈرے اللہ سے،

وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوْا

اور گھروں میں آؤ دروازوں سے، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو۔ اور لڑو

[1] ابن ماجة، ابواب الفتن، باب العقوبات ج:۲ ص:۲۹۰ والمستدرك، كتاب الفتن، حديث ابى عوانة رقم الحديث: ۸۷۷۲

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی مت کرو، بے شک اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے

الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ

زیادتی کرنے والوں کو، اور مار ڈالو اُن کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو اُن کو جہاں سے انہوں نے

اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ

تم کو نکالا، اور دین سے بچلانا مارڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے، اور نہ لڑو ان سے

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ

مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ، پھر اگر وہ خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مارو،

كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾

یہی ہے سزا کافروں کی۔

آسان ترجمۂ قرآن

لوگ آپ سے نئے مہینوں کے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ انہیں بتا دیجئے کہ یہ لوگوں کے (مختلف معاملات کے) اور حج کے اوقات متعین کرنے کے لئے ہیں۔ اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں اُن کی پشت کی طرف سے داخل ہو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے، اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔ ﴿۱۸۹﴾ اور اُن لوگوں سے اللہ کے راستے میں جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں، اور زیادتی نہ کرو۔ یقین جانو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ﴿۱۹۰﴾ اور تم ان لوگوں کو جہاں پاؤ قتل کرو، اور انہیں اس جگہ سے نکال باہر کرو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ سنگین بُرائی ہے۔ اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس اُس وقت تک لڑائی نہ کرو جب تک وہ خود اس میں تم سے لڑائی شروع نہ کریں۔ ہاں اگر وہ تم سے اس میں لڑائی

شروع کردیں تو تم ان کو قتل کر سکتے ہو۔ ایسے کافروں کی سزا یہی ہے ﴿۱۹۱﴾

ربطِ آیات

آیت لَيْسَ الْبِرَّ (البقرۃ:۱۷۷) کے تحت بیان ہو چکا ہے کہ اس کے بعد آخر سورۂ بقرہ تک ابوابُ البر کا بیان ہوگا، جو اہم اَحکامِ شرعیہ پر مشتمل ہیں، ان میں پہلا حکم قصاص کا، دُوسرا وصیت کا، تیسرا اور چوتھا صوم اور اس کے متعلقہ مسائل کا، پانچواں اِعتکاف کا، چھٹا مالِ حرام سے بچنے کا تھا، مذکور الصدر دو آیتوں میں حج اور جہاد کے اَحکام و مسائل کا بیان ہے، اور حج کے حکم سے پہلے یہ بتلایا گیا کہ روزہ اور حج وغیرہ میں قمری مہینوں اور دِنوں کا اِعتبار ہوگا۔

لغات:-"اَهِلَّةٌ" ہلال کی جمع ہے، قمری مہینے کی اِبتدائی چند راتوں کے چاند کو "ہلال" کہا جاتا ہے۔ [۱] مَوَاقِيْتُ میقات کی جمع ہے، جس کے معنی مطلقِ وقت یا منتہائے وقت کے آتے ہیں۔ (قرطبی)

خلاصۂ تفسیر

حکمِ ہفتم:- اِعتبارِ حسابِ قمری دَر حج وغیرہ

(بعضے آدمی) آپ سے (ان) چاندوں کے (ہر مہینے گھٹنے بڑھنے کی) حالت (اور اس میں جو فائدہ ہے اس فائدہ) کی تحقیقات کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ (فائدہ اس کا یہ ہے کہ) وہ چاند (اپنے اس گھٹنے اور بڑھنے کے اِعتبار سے لزوماً یا سہولۃً) آلۂ شناختِ اوقات ہیں لوگوں کے (اِختیاری معاملات مثل عدّت و مطالبۂ حقوق کے) لئے اور (غیر اِختیاری عبادات مثل) حج (وزکوٰۃ و روزہ وغیرہ) کے لئے۔

حکمِ ہشتم:- اِصلاحِ رسمِ جاہلیت

(بعض لوگ قبل اسلام کے اگر حج کا اِحرام باندھنے کے بعد کسی ضرورت سے گھر جانا چاہتے تھے تو دروازہ سے جانا ممنوع جانتے تھے، اس لئے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس میں سے اندر جاتے تھے، اور اس عمل کو فضیلت سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس کے متعلق بعد ذِکرِ حج کے اِرشاد فرماتے ہیں) اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو، ہاں لیکن فضیلت یہ ہے کوئی شخص حرام (چیزوں) سے بچے اور (چونکہ گھروں میں دروازہ کی طرف سے آنا حرام نہیں ہے اس لئے اس سے بچنا بھی ضروری نہیں، سو اگر آنا چاہو تو) گھروں میں اُن کے دروازوں سے آؤ، اور (اصل الاصول تو یہ ہے کہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو (اس سے البتہ) اُمید ہے کہ تم (دارین میں) کامیاب ہو۔

[۱] تفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۳۴۱

حکم نہم:- قتالِ کفار

(ذی قعدہ ۶ھ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادائے عمرہ کے قصد سے مکہ معظّمہ تشریف لے چلے، اُس وقت تک مکہ معظّمہ مشرکین کے قبضہ اور حکومت میں تھا، ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ہمراہیوں کو مکہ کے اندر نہ جانے دیا اور عمرہ رہ گیا، آخر بڑی گفتگو کے بعد یہ معاہدہ قرار پایا کہ سالِ آئندہ تشریف لا کر عمرہ ادا فرماویں، چنانچہ ذی قعدہ ۷ھ میں پھر آپ اسی قصد سے تشریف لے چلے، لیکن آپ کے ساتھی مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ شاید مشرکین اپنا معاہدہ پورا نہ کریں، اور آمادۂ مقابلہ ومقاتلہ نہ ہو جاویں، تو ایسی حالت میں نہ سکوت مصلحت ہے، اور اگر مقابلہ کیا جاوے تو ذی قعدہ میں قتال لازم آتا ہے، اور یہ مہینہ من جملہ اُن چار مہینوں کے ہے جن کو اَشہرِ حرم کہا جاتا ہے، ان چاروں مہینوں میں اُس وقت تک قتل وقتال حرام وممنوع تھا، یہ چار مہینے ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب تھے، غرض مسلمان اس تردّد سے پریشان تھے، حق تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں کہ ان خاص معاہدہ کرنے والوں کے ساتھ بوجہ باہمی معاہدہ کے تم کو اپنی جانب سے اِبتداءً قتال کرنے کی اجازت نہیں، لیکن اگر وہ لوگ خود عہد شکنی کریں اور تم سے لڑنے کو آمادہ ہو جاویں تو اُس وقت تم کسی طرح کا اندیشہ دِل میں مت لاؤ) اور (بے تکلف) تم (بھی) لڑو اللہ کی راہ میں (یعنی اس نیت سے کہ یہ لوگ دِین کی مخالفت کرتے ہیں) ان لوگوں کے ساتھ جو (نقضِ عہد کرکے) تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور (اَزخود) حد (معاہدہ) سے مت نکلو، (کہ عہد شکنی کرکے لڑنے لگو)، واقعی اللہ تعالیٰ حد (قانونِ شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے اور (جس حالت میں وہ خود عہد شکنی کریں تو اس وقت دِل کھول کر خواہ) ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ، اور (خواہ) ان کو (مکہ سے) نکال باہر کرو جہاں سے انہوں نے تم کو (تنگ کرکے اور اِیذائیں پہنچا کر) نکلنے (اور ہجرت کرنے) پر مجبور کیا ہے، اور (تمہارے اس قتل واِخراج کے بعد بھی عقلاً اِلزام انہیں پر رہے گا، کیونکہ عہد شکنی جو ان سے واقع ہوگی، بڑی شرارت کی بات ہے اور ایسی) شرارت (ضرر میں) قتل (واِخراج) سے بھی سخت تر ہے (کیونکہ اس قتل واِخراج کی نوبت اس شرارت ہی کی بدولت پہنچتی ہے) اور (علاوہ معاہدہ کے ان کے ساتھ اِبتداءً قتال کرنے سے ایک اور اَمر بھی مانع ہے وہ یہ کہ حرم شریف یعنی مکہ اور اس کا گرداگرد ایک واجب الاحترام جگہ ہے اور اس میں قتال کرنا اس کے اِحترام کے خلاف ہے، اس لئے بھی حکم دیا جاتا ہے کہ) ان کے ساتھ مسجدِ حرام کے قرب (ونواح) میں (جو حرم کہلاتا ہے) قتال مت کرو جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں، ہاں اگر وہ (کفار) خود ہی لڑنے کا سامان کرنے لگیں تو (اس وقت پھر تم کو بھی اِجازت ہے کہ) تم (بھی) ان کو مارو (دھاڑو) ایسے کافروں کی (جو حرم میں لڑنے لگیں) ایسی ہی سزا ہے۔

معارف ومسائل

پہلی آیت میں صحابہ کرامؓ کا ایک سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب نقل کیا گیا ہے، امام المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ایک خاص شان ہے، کہ انہوں نے بوجہ عظمت وہیبت کے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات بہت کم کئے ہیں، بخلاف پچھلی اُمتوں کے کہ جنہوں نے بکثرت سوالات کئے اور اس ادب کو ملحوظ نہیں رکھا، حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کے سوالات جن کا ذِکر قرآن میں آیا ہے کل چودہ ہیں، جن میں سے ایک سوال ابھی اُوپر گزرا ہے: اِذَاسَاَلَکَ عِبَادِیْ (البقرۃ:۱۸۶)، دُوسرا سوال یہ ہے، اوران کے بعد سورۂ بقرہ ہی میں چھ سوال اور مذکور ہیں، اور باقی چھ سوالات مختلف سورتوں میں آئے ہیں۔

آیتِ مذکورہ میں ذِکر یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اَھِلَّۃِ یعنی شروع مہینے کے چاند کے متعلق سوال کیا کہ اس کی صورت آفتاب سے مختلف ہے، کہ وہ کبھی باریک ہلالی شکل میں ہوتا ہے، پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، پھر پورا دائرہ ہوجاتا ہے، پھر اس میں تدریجی کمی اسی طرح آتی ہے، اس کی حقیقت دریافت کی یا حکمت ومصلحت کا سوال کیا، دونوں اِحتمال ہیں، مگر جو جواب دیا گیا اس میں حکمت ومصلحت کا بیان ہے، اگر سوال ہی یہ تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں حکمت ومصلحت کیا ہے؟ تب تو جواب اس کے مطابق ہوہی گیا، اور اگر سوال سے اس گھٹنے بڑھنے کی حقیقت دریافت کرنا مقصود تھا جو صحابہ کرامؓ کی شان سے بعید ہے تو پھر جواب بجائے حقیقت کے حکمت ومصلحت بیان کرنے سے اس اَمر کی طرف اِشارہ ہے کہ اَجرامِ سماویہ کے حقائق دریافت کرنا اِنسان کے بس میں بھی نہیں، اور ان کا کوئی دِینی یا دُنیوی کام اس حقیقت کے علم پر موقوف بھی نہیں، اس لئے حقیقت کا سوال فضول ہے، پوچھنے اور بتلانے کی بات یہ ہے کہ چاند کے اس طرح گھٹنے بڑھنے چھپنے اور طلوع ہونے سے ہمارے کون سے مصالح وابستہ ہیں، اس لئے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اِرشاد فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ تمہاری مصالح جو چاند سے وابستہ ہیں یہ ہیں کہ اس کے ذریعہ تمہیں اپنے معاملات اور معاہدوں کی میعاد مقرّر کرنا اور حج کے اَیام معلوم کرنا آسان ہوجائے گا۔

قمری اور شمسی حساب کی شرعی حیثیت

اس آیت سے تو اتنا معلوم ہوا کہ چاند کے ذریعے تمہیں تاریخوں اور مہینوں کا حساب معلوم ہوجائے گا، جس پر تمہارے معاملات اور عبادات حج وغیرہ کی بنیاد ہے، اسی مضمون کو سورۂ یونس کی آیت نمبر ۵ میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے: وَقَدَّرَہٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ ؕ (یونس:۵) جس سے معلوم ہوا کہ چاند کو مختلف منزلوں اور مختلف حالات

سے گزارنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سال اور مہینوں اور تاریخوں کا حساب معلوم ہو سکے، مگر سورۂ بنی اِسرائیل کی آیت نمبر ۱۲ میں اس حساب کا تعلق آفتاب سے بھی بتلایا گیا ہے، وہ یہ ہے:-

فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ (بنی اسرائیل:۱۲)

''پھر مٹایا رات کا نمونہ اور بنا دیا دِن کا نمونہ دیکھنے کو تا کہ تلاش کرو فضل اپنے رَبّ کا اور تا کہ معلوم کرو گنتی برسوں کی اور حساب۔''

اس تیسری آیت سے اگرچہ یہ ثابت ہوا کہ سال اور مہینوں وغیرہ کا حساب آفتاب سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔(کما ذکرہ فی رُوح المعانی) [۱]

لیکن چاند کے معاملہ میں جو اَلفاظ قرآنِ کریم نے اِستعمال کئے ان سے واضح اِشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ شریعتِ اِسلام میں حساب چاند ہی کا متعین ہے، خصوصاً اُن عبادات میں جن کا تعلق کسی خاص مہینے اور اس کی تاریخوں سے ہے، جیسے روزۂ رمضان، حج کے مہینے، حج کے ایام، محرم، شبِ براءت وغیرہ سے جو اَحکام متعلق ہیں وہ سب رُویتِ ہلال سے متعلق کئے گئے ہیں، کیونکہ اس آیت میں هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ فرما کر بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حساب چاند ہی کا معتبر ہے، اگرچہ یہ حساب آفتاب سے بھی معلوم ہوسکتا ہے۔

شریعتِ اِسلام نے چاند کے حساب کو اس لئے اِختیار فرمایا کہ اس کو ہر آنکھوں والا اُفق پر دیکھ کر معلوم کرسکتا ہے، عالم، جاہل، دیہاتی، جزیروں، پہاڑوں کے رہنے والے جنگلی سب کو اس کا علم آسان ہے، بخلاف شمسی حساب کے کہ وہ آلاتِ رصدیہ اور قواعدِ ریاضیہ پر موقوف ہے، جس کو ہر شخص آسانی سے معلوم نہیں کرسکتا، پھر عبادات کے معاملہ میں تو قمری حساب کو بطورِ فرض متعین کردیا، اور عام معاملاتِ تجارت وغیرہ میں بھی اسی کو پسند کیا جو عباداتِ اِسلامی کا ذریعہ ہے، اور ایک طرح کا اِسلامی شعار ہے، اگرچہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا، شرط یہ ہے کہ اس کا رِواج اتنا عام نہ ہوجائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلا دیں، کیونکہ ایسا کرنے میں عبادات روزہ وحج وغیرہ میں خلل لازم آتا ہے، جیسا اس زمانے میں عام دفتروں اور کاروباری اِداروں بلکہ نجی اور شخصی مکاتبات میں بھی شمسی حساب کا ایسا رِواج ہوگیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اِسلامی مہینے بھی پورے یاد نہیں رہے، یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرتِ قومی وملّی کا بھی دیوالیہ پن ہے، اگر دفتری معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے ان میں صرف شمسی حساب رکھیں، باقی نجی خط وکتابت اور روزمرہ کی ضروریات میں

[۱] رُوح المعانی، سورۃ الإسراء آیت:۱۲ ج:۱۰ ص:۳۸۹

قمری اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرضِ کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہوگا اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔

مسئلہ:- وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا، اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ جس چیز کو شریعتِ اسلام نے ضروری یا عبادت نہ سمجھا ہو، اس کو اپنی طرف سے ضروری اور عبادت سمجھ لینا جائز نہیں، اسی طرح جو چیز شرعاً جائز ہو اس کو گناہ سمجھنا بھی گناہ ہے، ان لوگوں نے ایسا ہی کر رکھا تھا کہ گھر کے دروازوں سے داخل ہونا جو شرعاً جائز تھا اس کو گناہ قرار دیا، اور مکان کی پشت سے دیوار توڑ کر آنا جو شرعاً ضروری نہیں تھا اس کو ضروری سمجھا، اسی پر ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی، بدعات کے ناجائز ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ غیر ضروری چیزوں کو فرض وواجب کی طرح ضروری سمجھ لیا جاتا ہے، یا بعض جائز چیزوں کو حرام وناجائز قرار دے دیا جاتا ہے، اس آیت سے ایسا کرنے کی ممانعت واضح طور پر ثابت ہوگئی جس سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہوگیا۔

حکم نہم:- جہاد وقتال

اس پر ساری اُمت کا اتفاق ہے کہ ہجرتِ مدینہ سے پہلے کفار کے ساتھ جہاد وقتال ممنوع تھا، اس وقت کی تمام آیاتِ قرآنی میں مسلمانوں کو کفار کی ایذاؤں پر صبر اور عفو ودرگزر کی ہی تلقین تھی، ہجرتِ مدینہ کے بعد سب سے پہلے اس آیت میں قتالِ کفار کا حکم آیا (قالہ الربیع بن انسؓ وغیرہ)، اور صدیقِ اکبرؓ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ قتالِ کفار کے متعلق پہلی آیت یہ ہے: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (الحج: ۳۹) مگر اکثر حضراتِ صحابہؓ وتابعینؒ کے نزدیک پہلی آیت سورۂ بقرہ کی آیتِ مذکورہ ہی ہے اور صدیقِ اکبرؓ نے جس کو پہلی فرمایا ہے وہ بھی ابتدائی آیتوں میں ہونے کے سبب پہلی کہی جاسکتی ہے۔

اس آیت میں حکم یہ ہے کہ مسلمان صرف اُن کافروں سے قتال کریں جو اُن کے مقابلہ پر قتال کے لئے آویں، اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں، بچے، بہت بوڑھے اور اپنے مذہبی شغل میں دُنیا سے یکسو ہو کر لگے ہوئے عبادت گزار راہب، پادری وغیرہ اور ایسے ہی اپاہج ومعذور لوگ، یا وہ لوگ جو کافروں کے یہاں محنت مزدوری کا کام کرتے ہیں ان کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوتے، ایسے لوگوں کو جہاد میں قتل کرنا جائز نہیں، کیونکہ حکم آیت کا صرف ان لوگوں سے قتال کرنے کا ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں قتال کریں، اور مذکورہ قسم کے سب اَفراد قتال کرنے والے نہیں، اسی لئے فقہاء رحمہم اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی عورت یا بوڑھا، یا مذہبی آدمی وغیرہ کفار کی طرف سے قتال میں شریک ہوں، یا مسلمانوں کے بالمقابل جنگ میں ان کی مدد کسی طرح سے کر رہے ہوں ان کا قتل جائز ہے، کیونکہ وہ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ

میں داخل ہیں۔ (مظہری، قرطبی، جصاص) [۱]

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات جو مجاہدینِ اسلام کو بوقتِ جہاد دی جاتی تھیں، ان میں اس حکم کی واضح تشریحات مذکور ہیں، صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک حدیث میں ہے:-

نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ النِّسَآءِ وَالصِّبْيَانِ۔ [۲]

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔"

اور ابوداؤد میں بروایت انسؓ جہاد پر جانے والے صحابہؓ کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایات منقول ہیں: تم اللہ کے نام پر اور رسول اللہ کی ملت پر جہاد کے لئے جاؤ، کسی بوڑھے ضعیف کو اور چھوٹے بچے کو یا کسی عورت کو قتل نہ کرو۔ (مظہری) [۳]

حضرت صدیقِ اکبرؓ نے جب یزید بن ابی سفیانؓ کو ملکِ شام بھیجا تو ان کو یہی ہدایت دی، اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عبادت گزار اور راہبوں کو اور کافروں کی مزدوری کرنے والوں کو بھی قتل نہ کریں، جبکہ وہ قتال میں حصہ نہ لیں۔ (قرطبی) [۴]

آیت کے آخر میں وَلَا تَعْتَدُوْا کا بھی جمہور مفسرین کے نزدیک یہی مطلب ہے کہ قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو، کہ عورتوں، بچوں وغیرہ کو قتل کرنے لگو۔

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ ۔ خلاصۂ تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ یہ آیت واقعۂ حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی جب صلحِ حدیبیہ کی شرط کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ اس عمرہ کی قضا کے لئے سفر کا ارادہ کیا، جس سے اس سے پہلے سال میں کفارِ مکہ نے روک دیا تھا، صحابہ کرامؓ کو اس سفر کے وقت یہ خیال ہو رہا تھا کہ کفار کی صلح اور معاہدہ کا کچھ بھروسہ نہیں، اگر وہ لوگ اس سال بھی آمادۂ پیکار ہو گئے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے، اس پر آیتِ مذکورہ کے الفاظ نے ان کو اجازت دے دی کہ اگر وہ قتال کرنے لگیں تو تمہیں بھی اجازت ہے، کہ جہاں پاؤ ان کو قتل کرو، اور اگر قدرت میں ہو تو جس طرح انہوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا، تم بھی ان کو مکہ سے نکال دو۔

اور پوری مکی زندگی میں جو مسلمانوں کو کفار کے ساتھ مقاتلہ سے روکا ہوا تھا، اور ہمیشہ عفو و درگزر کی تلقین ہوتی رہی تھی، اس لئے صحابہ کرامؓ کو اس آیت کے نازل ہونے سے یہی خیال تھا کہ کسی کافر کو قتل کرنا برا اور ممنوع ہے، اس خیال کے

---

[۱] احکام القرآن للجصاص ج:۱ ص:۲۵۷، ۲۵۸، وتفسیر المظہری تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۲۱۲

[۲] صحیح البخاری، کتاب الجهاد، باب قتل النساء في الحرب ج:۱ ص:۴۲۳، وصحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب النساء الغازيات ...إلخ ج:۲ ص:۱۱۶

[۳] سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، باب في دعاء المشركين ج:۱ ص:۳۵۱ وتفسیر المظہری تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۲۱۲

[۴] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۳۴۸

اِزالے کے لئے فرمایا: وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ یعنی یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ کسی کو قتل کرنا سخت برا کام ہے، مگر کفارِ مکہ کا اپنے کفر وشرک پر جمارہنا اور مسلمانوں کا اَدائے عبادت حج وعمرہ سے روکنا اس سے زیادہ سخت وشدید ہے، اس سے بچنے کے لئے ان کو قتل کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے، آیت میں لفظ ''فتنہ'' سے کفر وشرک اور مسلمانوں کو اَدائے عبادت سے روکنا ہی مراد ہے۔ (بصّاص، قرطبی وغیرہ) [1]

البتہ اس آیت کے عموم سے جو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ کفار جہاں کہیں ہوں ان کا قتل کرنا جائز ہے، اس عموم کی ایک تخصیص آیت کے اگلے جملے میں اس طرح کردی گئی: وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ یعنی مسجدِ حرام کے آس پاس جس سے مراد پورا حرمِ مکہ ہے اُس میں تم اُن لوگوں سے اس وقت تک قتال نہ کرو جب تک وہ خود قتال کی اِبتدا نہ کریں۔

مسئلہ:- حرمِ مکہ میں اِنسان کیا کسی شکاری جانور کو بھی قتل کرنا جائز نہیں، لیکن اسی آیت سے معلوم ہوا کہ اگر حرمِ محترم میں کوئی آدمی دُوسرے کو قتل کرنے لگے تو اس کو بھی مدافعت میں قتال کرنا جائز ہے، اس پر جمہور فقہاء کا اِتفاق ہے۔

مسئلہ:- اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اِبتدائے جہاد وقتال کی ممانعت صرف مسجدِ حرام کے آس پاس حرمِ مکہ کے ساتھ مخصوص ہے، دُوسرے مقامات میں جیسے دِفاعی جہاد ضروری ہے اسی طرح اِبتدائی جہاد وقتال بھی دُرست ہے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ

پھر اگر وہ بازِ آئیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔ اور لڑو ان سے یہاں تک کہ نہ باقی رہے فساد

وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ط فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

اور حکم رہے خدا تعالیٰ ہی کا، پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر ظالموں پر۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ط فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ

حرمت والا مہینہ بدلہ (مقابل) ہے حرمت والے مہینے کے اور اَدب رکھنے میں بدلہ ہے، پھر جس نے تم پر زیادتی کی

---

[1] احکام القرآن للجصّاص ج:۱ ص:۲۶۰، ۳۳۲ وتفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۲ ص:۳۵۱

فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

تم اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے زیادتی کی تم پر، اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ

ملع مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ

ساتھ ہے پرہیزگاروں کے۔ اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں،

وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

اور نیکی کرو بے شک اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

پھر اگر وہ باز آجائیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے ﴿۱۹۲﴾ اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور دِین اللہ کا ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو (سمجھ لو کہ) تشدّد سوائے ظالموں کے کسی پر نہیں ہونا چاہئے ﴿۱۹۳﴾ حرمت والے مہینے کا بدلہ حرمت والا مہینہ ہے، اور حرمتوں پر بھی بدلے کے اَحکام جاری ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص تم پر کوئی زیادتی کرے تو تم بھی ویسی ہی زیادتی اس پر کرو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ انہی کا ساتھی ہے جو اس کا خوف دِل میں رکھتے ہیں ﴿۱۹۴﴾ اور اللہ کے راستے میں مال خرچ کرو، اور اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو، اور نیکی اختیار کرو۔ بیشک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ ﴿۱۹۵﴾

خلاصۂ تفسیر

پھر اگر (بعد شروع قتال کے بھی) وہ لوگ (یعنی مشرکینِ مکہ اپنے کفر سے) باز آجاویں (اور اِسلام قبول کرلیں) تو (ان کا اِسلام بے قدر نہ سمجھا جاوے گا بلکہ) اللہ تعالیٰ (ان کے گزشتہ کفر کو) بخش دے گا (اور مغفرت کے علاوہ بے شمار نعمتیں دے کر ان پر) مہربانی (بھی) فرمادیں گے، اور (اگر وہ لوگ اِسلام نہ لاویں تو اگرچہ دُوسرے کفار کے لئے اِسلامی قانون یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی اگر اِسلامی حکومت کی اِطاعت اور جزیہ دینے کا اِقرار کرلیں تو ان کا قتل جائز نہیں رہتا، بلکہ ان کے حقوق کی حفاظت اِسلامی حکومت پر لازم ہوجاتی ہے، مگر یہ خاص کفار چونکہ اہلِ عرب ہیں، ان

کے لئے قانونِ جزیہ نہیں، بلکہ ان کے لئے صرف دو راستے ہیں، اِسلام یا قتل، اس واسطے) ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ (ان میں) فسادِ عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور (ان کا) دِین (خالص) اللہ ہی کا ہو جائے (اور کسی کا دِین و مذہب کا خالصاً اللہ کے لئے ہو جانا موقوف ہے، قبولِ اِسلام پر، تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اِسلام اِختیار کرلیں) اور اگر وہ لوگ (کفر سے) باز آجاویں (جس کا ذِکر اَبھی ہوا بھی ہے) تو (آخرت میں مغفرت و رحمت کے مستحق ہونے کے ساتھ دُنیا میں ان کے لئے تم کو یہ قانون بتلایا جاتا ہے کہ سزا کی) سختی کسی پر نہیں ہوا کرتی، بجز بے اِنصافی کرنے والوں کے (جو براہ بے اِنصافی خدائی اِحسانات کو بھول کر کفر و شرک کرنے لگیں اور جب یہ لوگ اِسلام لے آئے تو بے اِنصاف نہ رہے، لہٰذا ان پر سزائے قتل کی سختی نہ رہی، اور مسلمانو! تم کو جو یہ خیال ہے کہ کفارِ مکہ اگر اپنے عہد پر قائم نہ رہے تو شہرِ حرام یعنی ذی قعدہ میں اُن سے لڑنا پڑے گا، سو اس سے بھی بے فکر رہو، کیونکہ) حرمت والا مہینہ (تم کو قتالِ کفار سے مانع ہوسکتا) ہے بعوض (اس کے کہ اس) حرمت والے مہینے کے (سبب وہ بھی تم سے قتال نہ کریں) اور (وجہ یہ ہے کہ) یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں (سو جو تمہارے ساتھ ان حرمتوں کی رعایت کرے تو تم بھی رعایت رکھو اور) جو تم پر (ایسی حرمتوں کی رعایت نہ کرکے) زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے، اور (ان سب اَحکامِ مذکورہ کے برتاؤ میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی اَمر میں حدِ قانونی سے تجاوز نہ ہونے پاوے) اور یقین کرلو کہ اللہ تعالیٰ (اپنی عنایت و رحمت سے) ان ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

حکمِ دہم :- اِنفاق فی الجہاد

اور تم لوگ (جان کے ساتھ مال بھی) خرچ کیا کرو اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو (کہ ایسے مواقع میں جان و مال خرچ کرنے سے جبن یا بخل کرنے لگو، جس کا نتیجہ تمہارا ضعیف اور مخالف کا قوی ہو جانا ہے، جو کہ عین تباہی ہے) اور (جو) کام (کرو) اچھی طرح کیا کرو (مثلاً اس موقع پر خرچ کرنا ہے دِل کھول کر خوشی سے اچھی نیت کے ساتھ خرچ کرو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح کام کرنے والوں کو۔

معارف و مسائل

۷ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلحِ حدیبیہ کے قانون کے مطابق فوت شدہ عمرہ ادا کرنے کے لئے بہ معیتِ صحابہؓ مکہ کے سفر کا ارادہ کیا تو صحابہ کرامؓ جانتے تھے کہ ان کفار کے معاہدوں اور صلح کا کچھ اِعتبار نہیں، ممکن ہے کہ وہ جنگ کرنے لگیں، تو اس جنگ میں صحابہؓ کے لئے ایک اشکال تو یہ تھا کہ حرمِ مکہ میں جنگ کی نوبت آئے گی، جو اِسلام میں

ناجائز ہے، اس کا جواب پچھلی آیت میں دے دیا گیا، کہ حرمِ مکہ کی حرمت مسلمانوں پر ضرور لازم ہے، لیکن اگر کفار حدودِ حرم میں ہی مسلمانوں سے جنگ کرنے لگیں تو اُن کو بھی مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہے۔

دُوسرا اِشکال یہ تھا کہ یہ مہینہ ذیقعدہ کا ہے، جو اُن چار مہینوں میں سے ہے، جن کو اَشہرِ حرم کہا جاتا ہے، اور ان میں کسی سے کسی جگہ جنگ کرنا جائز نہیں، تو اگر مشرکینِ مکہ نے ہمارے خلاف جنگ شروع کر دی تو ہم اس مہینے میں دِفاعی جنگ کیسے کر سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کہ جیسے حرمِ مکہ کی حرمت سے حالتِ دِفاع مستثنیٰ ہے، اسی طرح اگر اَشہرِ حرم میں کافر ہم سے قتال کرنے لگیں تو ہم کو بھی اُن سے دِفاعی جنگ لڑنا جائز ہے۔

مسئلہ:- اَشہرِ حرم چار مہینے ہیں: ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم یہ تین ماہ تو مسلسل ہیں، چوتھا مہینہ رجب کا ہے، اِسلام سے پہلے بھی ان چار مہینوں میں جنگ کو حرام سمجھا جاتا تھا، اور مشرکینِ مکہ بھی اس کے پابند تھے، اِبتدائے اِسلام میں بھی ۷ھ ہجری تک یہی قانون نافذ تھا، اسی لئے صحابہ کرامؓ کو اِشکال پیش آیا، اس کے بعد یہ حرمتِ قتال منسوخ کر کے عام قتال کی اِجازت باجماعِ اُمت دے دی گئی، مگر اَفضل اب بھی یہی ہے کہ ان چار مہینوں میں اِبتداءً بالقتال نہ کی جائے، صرف مدافعت کی ضرورت سے قتال کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہنا بھی فی الجملہ دُرست ہے کہ اَشہرِ حرم کی حرمت منسوخ نہیں، باقی ہے، جیسے حرمِ مکہ میں قتال کی اِجازت بضرورت مدافعت دینے سے حرمِ مکہ کی حرمت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ صرف ایک اِستثنائی صورت پر عمل ہوا۔

دسواں حکم:- جہاد کے لئے مال خرچ کرنا

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، اس میں مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ جہاد کے لئے بقدرِ ضرورت اپنے اموال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کریں، اس سے فقہاء نے یہ حکم بھی نکالا ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کے علاوہ بھی دُوسرے حقوق فرض ہیں، مگر وہ نہ دائمی ہیں اور نہ اُن کے لئے کوئی نصاب اور مقدار متعین ہے، بلکہ جب اور جتنی ضرورت ہو اس کا اِنتظام کرنا سب مسلمانوں پر فرض ہے، اور ضرورت نہ ہو تو کچھ فرض نہیں، جہاد کا خرچ بھی اسی میں داخل ہے۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ کے لفظی معنی تو ظاہر ہیں، کہ اپنے اِختیار سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت بیان فرمائی ہے، اب یہ بات کہ ہلاکت میں ڈالنے سے اس جگہ کیا مراد ہے؟ اس میں حضراتِ مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، اور اِمام جصّاص رازیؒ نے فرمایا کہ ان سب اقوال میں کوئی تضاد نہیں، سب ہی مراد ہو سکتے ہیں، حضرت ابوایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہمارے ہی بارے میں نازل ہوئی ہے، ہم اس کی تفسیر بخوبی جانتے ہیں، بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اِسلام کو غلبہ اور قوت عطا فرما دیا تو ہم میں یہ گفتگو ہوئی کہ اب جہاد کی کیا ضرورت ہے، ہم اپنے وطن

میں ٹھہر کر اپنے مال و جائیداد کی خبر گیری کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے یہ بتلا دیا کہ ہلاکت سے مراد اس جگہ ترکِ جہاد ہے، اور اس سے ثابت ہوا کہ ترکِ جہاد مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کا سبب ہے، اسی لئے حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے عمر بھر جہاد میں صرف کر دی، یہاں تک کہ آخر میں قسطنطنیہ میں وفات پا کر وہیں مدفون ہوئے۔ [1]

حضرت ابن عباسؓ، حذیفہؓ، قتادہؒ، مجاہدؒ، ضحاکؒ ائمہ تفسیر سے بھی یہی مضمون منقول ہے۔

حضرت براء بن عازبؓ نے فرمایا کہ گناہوں کی وجہ سے اللہ کی رحمت اور مغفرت سے مایوس ہو جانا اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالنا ہے، اس لئے مغفرت سے مایوس ہونا حرام ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنا کہ بیوی بچوں کے حقوق ضائع ہو جائیں، یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، ایسا اسراف جائز نہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ ایسی صورت میں قتال کے لئے اقدام کرنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے جبکہ یہ اندازہ ظاہر ہے کہ دشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، خود ہلاک ہو جائیں گے، ایسی صورت میں اقدامِ قتال اس آیت کی بنا پر ناجائز ہے۔

اور جصاصؒ کے فرمانے کے مطابق یہ سب ہی احکام اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں۔

وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ اس جملے میں ہر کام کو اچھی طرح کرنے کی ترغیب ہے، اور کام کو اچھی طرح کرنا جس کو قرآن میں ''اِحسان'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، دو طرح کا ہے، ایک عبادت میں، دوسرے آپس کے معاملات و معاشرت میں۔ عبادت میں اِحسان کی تفسیر حدیثِ جبریلؑ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ ایسی طرح عبادت کرو جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم یہ تو اعتقاد لازم ہی ہے کہ خدا تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ [2]

اور معاملات و معاشرت میں اِحسان کی تفسیر مسند احمد [3] میں بروایت حضرت معاذؓ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ تم سب لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، اور جس چیز کو تم اپنے لئے برا سمجھتے ہو وہ دوسروں کے لئے بھی برا سمجھو۔ (مظہری)

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ

اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے واسطے، پھر اگر تم روک دیئے جاؤ تو تم پر ہے جو کچھ کہ میسر ہو قربانی سے،

[1] احکام القرآن للجصّاص ج:۱ ص:۲۶۲

[2] صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب سؤال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الإیمان ...إلخ ج:۱ ص:۱۲

[3] مسند احمد رقم الحدیث:۲۱۱۱۳

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ

اور حجامت نہ کرو اپنے سروں کی جب تک نہ پہنچ چکے قربانی اپنے ٹھکانے پر، پھر جو کوئی تم میں سے

مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ

بیمار ہو یا اس کو تکلیف ہو سر کی تو بدلہ دیوے روزے یا خیرات

اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۥ وقفة فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ

یا قربانی، پھر جب تمہاری خاطر جمع ہو تو جو کوئی فائدہ اُٹھاوے عمرہ ملا کر حج کے ساتھ تو اس پر ہے جو کچھ میسر ہو

مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا

قربانی سے، پھر جس کو قربانی نہ ملے تو روزے رکھے تین حج کے دنوں میں اور سات روزے جب

رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ

لوٹو، یہ دس روزے ہوئے پورے، یہ حکم اس کے لئے ہے جس کے گھر والے نہ رہتے ہوں

حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿١٩٦﴾ ع ۲۴ ع ۸ ۸

مسجد الحرام کے پاس، اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ

حج کے چند مہینے ہیں معلوم، پھر جس شخص نے لازم کرلیا ان میں حج تو بے حجاب ہونا جائز نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا

وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا وقف النبی ﷺ

اور نہ جھگڑا کرنا حج کے زمانے میں، اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی اللہ اس کو جانتا ہے، اور زادِ راہ لے لیا کرو کہ

فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ز وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿١٩٧﴾

بے شک بہتر فائدہ زادِ راہ کا بچنا ہے سوال سے، اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقل مندو۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ط فَاِذَآ اَفَضْتُمْ

کچھ گناہ نہیں تم پر کہ تلاش کرو فضل اپنے ربّ کا، پھر جب طواف کے لئے لوٹو

مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ص وَاذْكُرُوْهُ كَمَا

عرفات سے تو یاد کرو اللہ کو نزدیک مشعرالحرام کے اور اس کو یاد کرو جس طرح

هَدٰىكُمْ ج وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿١٩٨﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ

تم کو سکھلایا اور بے شک تم تھے اس سے پہلے ناواقف۔ پھر طواف کے لئے پھرو جہاں سے

اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٩٩﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمْ

سب لوگ پھریں، اور مغفرت چاہو اللہ سے، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے مہربان۔ پھر جب پورے کر چکو

مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ط فَمِنَ النَّاسِ

اپنے حج کے کام کو تو یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو، پھر کوئی آدمی

مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُمْ

تو کہتا ہے: اے ربّ ہمارے! دے ہم کو دُنیا میں اور اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔ اور کوئی

مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا

ان میں کہتا ہے: اے ربّ ہمارے! دے ہم کو دُنیا میں خوبی اور آخرت میں خوبی اور بچا ہم کو

النصف

عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾

دوزخ کے عذاب سے۔ انہی لوگوں کے واسطے حصہ ہے اپنی کمائی سے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ

اور یاد کرو اللہ کو گنتی کے چند دِنوں میں، پھر جو کوئی جلدی چلا گیا دو ہی دن میں تو اس پر گناہ نہیں،

وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ

اور جو کوئی رہ گیا تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں جو کہ ڈرتا ہے، اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو بے شک تم سب

إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٠٣﴾

اسی کے پاس جمع ہوگے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور حج اور عمرہ اللہ کے لئے پورا پورا ادا کرو، ہاں اگر تمہیں روک دیا جائے تو جو قربانی میسر ہو، (اللہ کے حضور پیش کردو)۔ اور اپنے سر اس وقت تک نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ ہاں اگر تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو، یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو روزوں یا صدقے یا قربانی کا فدیہ دے۔ پھر جب تم امن حاصل کرلو تو جو شخص حج کے ساتھ عمرے کا فائدہ بھی اُٹھائے، وہ جو قربانی میسر ہو (اللہ کے حضور پیش کرے)۔ ہاں اگر کسی کے پاس اس کی طاقت نہ ہو تو وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے، اور سات (روزے) اُس وقت جب تم (گھروں کو) لوٹ جاؤ۔ اس طرح یہ کُل دس روزے ہوں گے۔ یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہے جن کے گھر والے مسجدِ حرام کے پاس نہ رہتے ہوں۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے ﴿١٩٦﴾ حج کے چند متعین مہینے ہیں۔ چنانچہ جو شخص ان مہینوں میں (احرام باندھ کر) اپنے اُوپر حج لازم کرلے تو حج کے دوران نہ وہ کوئی فحش بات کرے، نہ کوئی گناہ، نہ کوئی جھگڑا۔ اور تم جو کوئی نیک کام کروگے، اللہ اسے جان لے گا۔ اور (حج کے سفر میں) زادِ راہ ساتھ لے جایا کرو، کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ اور اے عقل والو! میری نافرمانی سے ڈرتے رہو ﴿١٩٧﴾ تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم (حج کے دوران تجارت یا مزدوری کے

ذریعے) اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو۔ پھر جب تم عرفات سے روانہ ہو تو مشعرِ حرام کے پاس (جو مزدلفہ میں واقع ہے) اللہ کا ذکر کرو، اور اس کا ذکر اسی طرح کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت کی ہے، جبکہ اس سے پہلے تم بالکل ناواقف تھے ﴿۱۹۸﴾ اس کے علاوہ (یہ بات بھی یاد رکھو کہ) تم اسی جگہ سے روانہ ہو جہاں سے عام لوگ روانہ ہوتے ہیں۔ اور اللہ سے مغفرت مانگو۔ بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۹۹﴾ پھر جب تم اپنے حج کے کام پورے کر چکو تو اللہ کا اس طرح ذِکر کرو جیسے تم اپنے باپ دادوں کا ذِکر کیا کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ ذِکر کرو۔ اب بعض لوگ تو وہ ہیں جو (دُعا میں بس) یہ کہتے ہیں کہ: ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں دُنیا میں بھلائی عطا فرما'' اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا ﴿۲۰۰﴾ اور انہی میں سے وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ: ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں دُنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے'' ﴿۲۰۱﴾ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے اعمال کی کمائی کا حصہ (ثواب کی صورت میں) ملے گا، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ ﴿۲۰۲﴾ اور اللہ کو گنتی کے (ان چند) دنوں میں (جب تم منیٰ میں مقیم ہو) یاد کرتے رہو۔ پھر جو شخص دو ہی دن میں جلدی چلا جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے، اور جو شخص (ایک دن) بعد میں جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ (تفصیل) اس کے لئے ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ اور تم سب تقویٰ اختیار کرو، اور یقین رکھو کہ تم سب کو اسی کی طرف لے جا کر جمع کیا جائے گا ﴿۲۰۳﴾

خلاصۂ تفسیر

گیارہواں حکم متعلق حج و عمرہ

اور (جب حج یا عمرہ کرنا ہو تو اس) حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے (راضی کرنے کے) واسطے پورا پورا ادا کیا کرو (کہ اعمال و آداب بھی سب بجالاؤ اور نیت بھی خالص ثواب ہی کی ہو) پھر اگر (کسی دُشمن کی جانب سے یا کسی مرض کے سبب سے حج و عمرہ کے پورا کرنے سے) روک دیئے جاؤ تو (اس حالت میں یہ حکم ہے کہ) قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو (ذبح کرے اور حج عمرہ کی جو وضع اِختیار کر رکھی تھی موقوف کرے، اس کو اِحرام کھولنا کہتے ہیں، جس کا طریقہ شرع میں سر منڈانا ہے، اور بال کٹا دینے کا بھی یہی اثر ہے) اور (یہ نہیں کہ فوراً روک ٹوک کے ساتھ ہی تم کو اِحرام کھولنا دُرست ہو جاوے، بلکہ) اپنے سروں کو (اِحرام کھولنے کی غرض سے) اس وقت تک مت منڈاؤ جب تک کہ (وہ) قربانی (کا جانور جس کے ذبح کا اس حالت میں حکم تھا) اپنے موقع پر نہ پہنچ جاوے (اور وہ موقع حرم ہے کہ اس قربانی کا جانور حدودِ حرم ہی میں ذبح کیا جاسکتا ہے، وہاں اگر خود نہ جاسکے، تو کسی کے ہاتھ بھیج کر ذبح کرایا جاوے، جب جانور ذبح ہو جاوے اس وقت اِحرام کھولنا

جائز ہوگا) البتہ اگر کوئی تم میں سے (کچھ) بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ (زخم یا درد یا جوؤں وغیرہ کی) تکلیف ہو (اور اس بیماری یا تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت پڑے) تو (اس کو اجازت ہے کہ وہ سر منڈا کر) فدیہ (یعنی اس کا شرعی بدلہ) دیدے (یعنی خواہ تین) روزے سے یا (چھ مسکینوں کو فی مسکین صدقۂ فطر کے برابر یعنی نصف صاع گیہوں) خیرات (کے طور پر) دے دینے سے، یا (ایک بکری) ذبح کر دینے سے، پھر جب تم امن کی حالت میں ہو (خواہ تو پہلے ہی سے کوئی خوف و مزاحمت پیش نہیں آیا، یا ہو کر جاتا رہا) تو (اس صورت میں حج وعمرہ کے متعلق قربانی کرنا ہر ایک کے ذمہ نہیں ہے بلکہ خاص) جو شخص عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر منتفع ہوا ہو، (یعنی اَیامِ حج میں عمرہ بھی کیا ہو) تو (فقط اس پر واجب ہے کہ) جو کچھ قربانی میسر (ذبح کرے اور جس نے صرف عمرہ کیا ہو، یا صرف حج کیا ہو اس پر حج وعمرہ کے متعلق کوئی قربانی نہیں) پھر (اَیامِ حج میں حج وعمرہ کو جمع کرنے والوں میں سے) جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو (مثلاً غریب ہے) تو (اس کے ذمہ بجائے قربانی کے) تین دن کے روزے ہیں (اَیامِ) حج میں (کہ آخر ان اَیام کا نویں تاریخ ذی الحجہ ہے) اور سات (دن کے روزے) ہیں، جبکہ حج سے تمہارے لوٹنے کا وقت آجاوے (یعنی حج کر چکو خواہ لوٹنا ہو یا کہ وہیں رہنا ہو) یہ پورے دس (دن کے روزے) ہوئے، (اور یہ بھی یاد رکھو کہ ابھی جو حج وعمرہ کے ملانے کا حکم ہوا ہے) یہ (ملانا ہر ایک کو دُرست نہیں، بلکہ خاص) اس شخص کے لئے (دُرست) ہے جس کے اہل (وعیال) مسجدِ حرام (یعنی کعبہ) کے قرب (نواح) میں نہ رہتے ہوں (یعنی حدودِ حرم مکہ میں ان کا وطن نہ ہو) اور (ان سب اَحکام کی بجا آوری میں) اللّٰہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی امر میں خلاف نہ ہو جاوے) اور (خوب) جان لو کہ بلاشبہ اللّٰہ تعالیٰ (بے باکی اور مخالفت کرنے والوں کو) سزائے سخت دیتے ہیں۔

(زمانہ افعالِ) حج (کا) چند مہینے ہیں جو (مشہور و) معلوم ہیں (ایک شوال، دُوسرا ذی قعدہ، تیسرا دس تاریخیں ذی الحجہ کی) سو جو شخص ان (اَیام) میں (اپنے ذمہ) حج مقرّر کر لے (کہ حج کا احرام باندھ لے) تو پھر (اس شخص کو) نہ کوئی فحش بات (جائز) ہے، اور نہ کوئی بے حکمی (دُرست) ہے، اور نہ کسی قسم کا نزاع (وتکرار) زیبا ہے، (بلکہ اس کو چاہئے کہ ہر وقت نیک ہی کاموں میں لگا رہے) اور جو نیک کام کرو گے خدا تعالیٰ کو اس کی اِطلاع ہوتی ہے (سو اس کا ثمرہ تم کو عنایت ہوگا) اور (جب حج کو جانے لگو تو) خرچ ضرور (ساتھ) لے لیا کرو، سب سے بڑی بات (اور خوبی) خرچ میں (گداگری سے) بچا رہنا ہے، اور اے ذی عقل لوگو! (ان اَحکام کی تعمیل میں) مجھ سے ڈرتے رہو (اور کسی حکم کے خلاف مت کرو)۔

(اور اگر حج میں کچھ اسبابِ تجارت ہمراہ لے جانا مصلحت سمجھو تو) تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو (تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (لکھی) ہے، پھر جب تم لوگ عرفات (میں

ٹھہر کر وہاں) سے واپس آنے لگو تو مشعرِ حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں آکر شب کو وہاں قیام کر کے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو اور (یاد کرنے کے طریقہ میں اپنی رائے کو دخل مت دو، بلکہ) اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو (اللہ تعالیٰ نے) بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں قبل اس (بتلانے) کے تم محض ہی ناواقف تھے، پھر (اس میں اور بھی بات یاد رکھو کہ جیسا قریش نے دستور نکال رکھا تھا کہ تمام حجاج تو عرفات میں ہو کر پھر وہاں سے مزدلفہ کو آتے تھے اور یہ مزدلفہ ہی میں رہ جاتے تھے، عرفات نہ جاتے تھے، یہ جائز نہیں، بلکہ) تم سب کو (خواہ قریش ہوں یا غیر قریش) ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ، جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں اور (اَحکامِ حج میں پرانی رسموں پر عمل کرنے سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرما دیں گے۔

(جاہلیت میں بعضوں کی تو یہ عادت تھی کہ حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں جمع ہو کر اپنے آباء واَجداد کے مفاخر وفضائل بیان کیا کرتے، حق تعالیٰ بجائے اس بیہودہ شغل کے اپنے ذِکر کی تعلیم کے لئے فرماتے ہیں کہ) پھر جب تم اپنے اعمالِ حج پورے کر چکا کرو تو حق تعالیٰ کا (شکر وعظمت کے ساتھ) ذِکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباء (واَجداد) کا ذِکر کیا کرتے ہو، بلکہ یہ ذِکر اس سے (بدرجہا) بڑھ کر ہو (نا چاہئے)، اور بعضوں کی عادت تھی کہ حج میں ذِکر تو اللہ تعالیٰ ہی کا کرتے تھے لیکن چونکہ آخرت کے قائل نہ تھے، لہٰذا تمامتر ذِکر ان کا صرف دُنیا کے لئے دُعا مانگنا ہوتا تھا، حق تعالیٰ صرف دُنیا طلبی کی مذمت بیان فرما کر بجائے اس کے خیرِ دَارین طلب کرنے کی ترغیب دینے کے لئے فرماتے ہیں) سو بعضے آدمی (جو کہ کافر ہیں) ایسے ہیں جو (دُعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دُنیا میں دے دیجئے (وبس، سو ان کو جو کچھ ملنا ہوگا دُنیا ہی میں مل رہے گا) اور ایسے شخص کو آخرت میں (بوجہ اِنکارِ آخرت کے) کوئی حصہ نہ ملے گا، اور بعضے آدمی (جو کہ مؤمن ہیں) ایسے ہیں جو (دُعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دُنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے، اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے، اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچایئے (سو یہ لوگ اُوپر کے لوگوں کی طرح بے بہرہ نہیں بلکہ) ایسے لوگوں کو (دونوں جہان میں) بڑا حصہ ملے گا، بدولت ان کے اس عمل (یعنی طلب خیرِ دَارین) کے اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں (کیونکہ قیامت میں حساب ہوگا، اور قیامت نزدیک آتی جاتی ہے، جب حساب جلدی ہونے والا ہے تو وہاں کی بہتری کو مت بھولو) اور (منیٰ میں خاص طریقے سے بھی) اللہ تعالیٰ کا ذِکر کرو، کئی روز تک (وہ خاص طریقہ کنکریوں کا خاص تین پتھروں پر مارنا ہے، اور وہ کئی روز دسویں، گیارہویں، بارہویں تاریخیں ذی الحجہ کی ہیں، یا تیرہویں بھی کہ ان میں کنکریاں ماری جاتی ہیں) پھر جو شخص (کنکریاں مار کر دسویں تاریخ کے بعد) دو دِن میں (مکہ واپس آنے میں) تعجیل کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو شخص (ان) دو دِن میں (واپسی مکہ میں) تأخیر کرے (یعنی بارہویں کو نہ آوے، بلکہ تیرہویں کو آوے) اس پر بھی کچھ گناہ نہیں (اور یہ سب باتیں) اس شخص کے واسطے (ہیں) جو (خدا سے)

ڈرے (اور نہ ڈرنے والے کو گناہ ثواب ہی سے غرض نہیں) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔

معارف و مسائل

اَحکامِ حج و عمرہ

ابوابُ البر جن کے بیان کا سلسلہ نصف سورۂ بقرہ سے چل رہا ہے اُن میں گیارہواں حکم حج کا ہے، حج کا تعلق چونکہ مکہ مکرمہ اور بیت اللہ یعنی کعبہ سے ہے، اس لئے اس کے متعلقہ کچھ مسائل تو قبلے کے بیان میں ضمنی طور پر سورۂ بقرہ کی آیات ۱۲۵ سے ۱۲۸ تک وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً سے شروع ہو کر وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا تک ذِکر میں آگئے ہیں، پھر بحثِ قبلہ کے ختم پر ایک آیت ۱۵۸ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ میں صفا، مروہ کے درمیان سعی کرنے کا حکم بھی ضمنی طور پر بیان ہو چکا ہے، اب آیت نمبر ۱۹۶ سے آیت نمبر ۲۰۳ تک وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ سے شروع ہو کر فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ الخ تک آٹھ آیات مسلسل حج و عمرہ کے اَحکام و مسائل سے متعلق ہیں۔

حج باجماعِ اُمت اِسلام کے اَرکان میں سے ایک رُکن اور فرائضِ اِسلام میں سے ایک اہم فرض ہے، جس کی تاکید و اہمیت قرآنِ کریم کی بہت سی آیات اور بے شمار اَحادیثِ صحیحہ میں وارِد ہوئی ہے۔

جمہور کے قول کے مطابق حج کی فرضیت ہجرت کے تیسرے یعنی غزوۂ اُحد کے سال میں سورۂ آلِ عمران کی اس آیت :۹۷ سے ہوتی ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ الآیہ (ابنِ کثیر)[1]۔ اسی آیت میں فرضیتِ حج کی شرائط کا بیان اور باوجود قدرت ہونے کے حج نہ کرنے پر سخت وعید مذکور ہے۔

مذکور الصدر آٹھ آیتوں میں سے پہلی آیت وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ باتفاقِ مفسرین قصۂ حدیبیہ میں نازل ہوئی، جو ۶ھ میں واقع ہوا ہے، اسی سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس آیت کا مقصد حج کی فرضیت بتلانا نہیں، وہ پہلے بتلائی جا چکی ہے، بلکہ اس جگہ حج و عمرہ کے کچھ خاص اَحکام بتلانا مقصود ہے۔

عمرہ کا حکم

اور چونکہ سورۂ آلِ عمران جس میں حج کا فرض ہونا مذکور ہے، اس میں صرف حج ہی کا ذِکر ہے عمرہ کا نہیں، اور یہ آیت جس میں عمرہ کا ذِکر ہے اس میں اصل وجوب و فرضیت کا بیان نہیں بلکہ ذِکر اس کا ہے کہ جب کوئی شخص حج یا عمرہ کو

---

[1] تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورۃ آل عمران آیت:۹۷ ج:۲ ص:۸۱

بذریعہ احرام شروع کردے تو اس کا پورا کرنا واجب ہوجاتا ہے، جیسا عام نفلی نماز اور روزے کا بھی حکم یہی ہے کہ شروع کرنے سے واجب ہوجاتے ہیں، اس لئے اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم نہیں ہوتا کہ عمرہ واجب ہے یا نہیں، صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شروع کردے تو اس کا پورا کرنا واجب ہوجاتا ہے۔

ابن کثیرؒ نے بحوالۂ ترمذی، احمد، بیہقی حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ عمرہ واجب ہے، آپ نے فرمایا: واجب تو نہیں، لیکن کرلو تو بہتر و افضل ہے (قال الترمذی هٰذا حدیث حسن صحیح)،[۱] اس وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ، مالکؒ وغیرہ کے نزدیک عمرہ واجب نہیں سنت ہے، آیتِ مذکورہ میں جب یہ بیان ہوا کہ حج یا عمرے کا احرام باندھ لیں تو ان کا پورا کرنا واجب ہوجاتا ہے، تو اَب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر احرام باندھنے کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے، حج و عمرہ ادا نہ کرسکیں تو کیا کریں؟ اس کا بیان بعد کے جملے میں فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ سے فرمادیا۔

اِحرام کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے حج و عمرہ ادا نہ کرسکیں تو کیا کریں؟

یہ آیت چونکہ واقعۂ حدیبیہ میں نازل ہوئی ہے، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا، کفارِ مکہ نے مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ ادا کرنے سے روک دیا، اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ احرام کا فدیہ ایک قربانی دینا ہے، بکری، گائے، اُونٹ وغیرہ کی جو آسان ہو، قربانی دے کر احرام کھول دیں، مگر ساتھ ہی اگلے جملے وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ میں یہ بھی بتلادیا کہ احرام کھولنا جس کی شرعی صورت سر کے بال منڈوانا یا کٹوانا ہے اس وقت تک جائز نہیں جب تک محرم کی قربانی اپنے موقع پر پہنچ کر ذبح نہ ہوجائے۔

موقع پر پہنچنے سے مراد امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ ہے کہ حدودِ حرم میں پہنچ کر ذبح کی جائے، خود نہ کرسکیں تو کسی دُوسرے سے کرادیں، اس آیت میں مجبوری کی یہ صورت کہ کوئی دُشمن حائل ہوجائے صراحۃً مذکور ہے، امامِ اعظم ابوحنیفہؒ اور بعض دُوسرے ائمہ نے بیماری وغیرہ کی مجبوری کو بھی اس میں باشتراکِ علت داخل قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی بیان سے یہ امر بھی ثابت ہوگیا کہ مجبوری کی حالت میں قربانی دے کر احرام کھول دینا جائز ہے مگر بعد میں قضا کرنا واجب ہے، جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے اگلے سال عمرہ کی قضا کی ہے۔

اس آیت میں سر منڈانے کو احرام کھولنے کی علامت قرار دیا گیا، جس سے ثابت ہوا کہ حالتِ احرام میں سر منڈانا یا بال کٹوانا ممنوع ہے، اس کی مناسبت سے اگلا حکم یہ بتلایا گیا کہ جو شخص حج و عمرہ کے افعال ادا کرنے سے تو مجبور نہیں، مگر حالتِ احرام میں کوئی مجبوری سر کے بال منڈانے یا کٹوانے کی پیش آجائے تو وہ کیا کرے۔

---

[۱] جامع الترمذی، کتاب الحج، باب ما جاء فی العمرة ...إلخ ج:۱ ص:۱۸۶

حالتِ اِحرام میں بال منڈانے پر کوئی مجبور ہو جائے تو وہ کیا کرے؟

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ میں اِرشاد فرمایا کہ اگر کسی بیماری کے سبب سر یا بدن کے کسی دُوسرے حصہ کے بال منڈانے کی مجبوری ہو، یا سر میں جوویں پیدا ہو کر تکلیف دے رہی ہوں تو ایسی صورت میں بال منڈانا بقدرِ ضرورت جائز ہے، مگر اس کا فدیہ اور بدلہ یہ ہے کہ روزے رکھے، یا صدقہ دے یا قربانی کرے، قربانی کے لئے تو حدودِ حرم کی جگہ متعین ہے، روزے اور صدقہ کے لئے کوئی جگہ متعین نہیں، ہر جگہ ادا کرسکتا ہے، قرآن کے الفاظ میں صیام کا کوئی عدد اور صدقہ کی کوئی مقدار مذکور نہیں ہے، مگر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہؓ صحابی کی ایسی ہی حالت میں یہ فرمایا کہ تین روزے رکھیں یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع گندم کا بطورِ صدقہ دے دیں (صحیح بخاری)[1]۔ آدھا صاع ہمارے اَسّی تولے کے سیر کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر گندم ہوتے ہیں، اُن کی قیمت صدقہ کردینا بھی کافی ہے۔

حج کے مہینوں میں حج و عمرہ کو جمع کرنے کے اَحکام

اِسلام سے پہلے عرب اہلِ جاہلیت کا خیال تھا کہ جب حج کے مہینے شروع ہوجائیں یعنی ماہِ شوال شروع ہوجائے تو ان اَیام میں حج وعمرہ کا جمع کرنا سخت گناہ ہے، اس آیت کے آخری حصے میں ان کے اس خیال کی اِصلاح اس طرح کردی گئی کہ حدودِ میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے تو حج وعمرہ دونوں کو اَشہرِ حج میں جمع کرنا ممنوع رکھا گیا، کیونکہ ان کو اَشہرِ حج کے بعد دوبارہ عمرہ کے لئے سفر کرنا مشکل نہیں، لیکن حدودِ میقات کے باہر سے آنے والوں کے لئے جمع کرنے کو جائز قرار دیا، کہ دُور دراز سے عمرہ کے لئے مستقل سفر کرنا ان کے لئے آسان نہیں۔ ''میقات'' وہ معین مقامات ہیں جو اَطرافِ عالم سے مکہ میں آنے والوں کے ہر راستے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں کہ جب بقصدِ مکہ آنے والا مسافر یہاں پہنچے تو یہاں سے حج یا عمرہ کی نیت سے اِحرام باندھنا لازم ہے، بغیر اِحرام کے یہاں سے آگے بڑھنا جرم و گناہ ہے، لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا یہی مفہوم ہے کہ جس شخص کے اہل وعیال مسجدِ حرام کے قرب وجوار یعنی حدودِ میقات کے اندر نہیں رہتے، مقصد یہ ہے کہ اس کا وطن حدودِ میقات کے اندر نہیں ہے اس کے لئے حج وعمرہ کو اَشہرِ حج میں جمع کرنا جائز ہے۔

البتہ جو لوگ حج وعمرہ کو اَشہرِ حج میں جمع کریں اُن پر واجب ہے کہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کا شکرانہ ادا کریں، وہ یہ ہے کہ جس کو قربانی دینے کی قدرت ہو وہ ایک قربانی دیدے، بکری، گائے، اُونٹ جو اس کے لئے آسان ہو، لیکن جس

---

[1] صحيح البخاري، ابواب العمرة، باب قول الله: فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا ...إلخ ج:۱ ص:۲۴۴

شخص کی مالی حیثیت قربانی ادا کرنے کے قابل نہیں اس پر دس روزے اس طرح واجب ہیں کہ تین روزے تو اَیامِ حج کے اندر ہی رکھے، یعنی نویں ذی الحجہ تک پورے کر دے، باقی سات روزے حج سے فارغ ہو کر جہاں چاہے اور جب چاہے رکھے، وہیں مکہ مکرمہ میں رہ کر پورے کرے یا گھر واپس آکر، اختیار ہے، اگر کوئی شخص تین روزے اَیامِ حج میں نہ رکھ سکا تو پھر اِمام ابوحنیفہؒ اور اکابر صحابہؓ کے نزدیک اس کے لئے قربانی کرنا ہی متعین ہے، جب قدرت ہو کسی کے ذریعے حرم میں قربانی کرادے۔ (جصّاص) [1]

تمتع و قران

اَشہرِ حج میں حج کے ساتھ عمرہ کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ میقات سے ہی سے حج اور عمرہ دونوں کا اِحرام ایک ساتھ باندھ لے، اس کو اِصطلاحِ حدیث میں ''قران'' کہا گیا ہے، اس کا اِحرام حج کے اِحرام کے ساتھ کھلتا ہے، آخر اَیامِ حج تک اس کو اِحرام ہی کی حالت میں رہنا پڑتا ہے، دُوسرے یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا اِحرام باندھے، اور مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کے افعال اَدا کر کے اِحرام کھول دے، پھر آٹھویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ جانے کے وقت حج کا اِحرام حرم شریف کے اندر ہی باندھ لے، اس کو اِصطلاح میں ''تمتع'' کہا جاتا ہے، اور لفظی معنی کے اِعتبار سے لفظ ''تمتع'' دونوں صورتوں پر حاوی ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں حج و عمرہ کو جمع کر کے نفع اُٹھانا اور وہ دونوں صورتوں میں برابر ہے، قرآن کی آیتِ مذکورہ میں فَمَنْ تَمَتَّعَ اسی عام معنی میں ہے۔

اَحکامِ حج و عمرہ میں خلاف ورزی اور کوتاہی موجبِ عذاب ہے

آخر آیت میں اوّل تقویٰ اِختیار کرنے کا حکم دیا جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی خلاف ورزی سے ڈرنے اور بچنے کے، اس کے بعد فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ یعنی جو شخص جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے۔ آج کل حج و عمرہ کو جانے والے بکثرت اس سے غافل ہیں، اوّل تو حج و عمرہ کے اَحکام معلوم کرنے ہی کی پوری کوشش نہیں کرتے، پھر معلوم بھی ہو تو بکثرت ان کے مطابق عمل نہیں کرتے، غلط کار معلّموں اور ساتھیوں کی بے پروائی سے بہت سے واجبات تک چھوٹ جاتے ہیں، اور آداب و سنن کا تو کہنا کیا، اللہ تعالیٰ سب کو اصلاحِ عمل کی توفیق عطا فرماویں۔

اَحکامِ حج کی آٹھ آیتوں میں سے دُوسری آیت اور اس کے مسائل

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ''اَشْھُر'' شَھْرٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں مہینہ، پچھلی آیت میں یہ بتلایا گیا تھا کہ جو کوئی

---

[1] احکام القرآن للجصّاص ج:۱ ص:۲۹۵

حج یا عمرہ کا اِحرام باندھ لے، تو اس پر لازم آتا ہے کہ اس کے اُحکام پورے ادا کرے، ان دونوں میں عمرہ کے لئے تو کوئی تاریخ اور مہینہ مقرّر نہیں، سال بھر میں جب چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن حج کے لئے مہینہ اور اس کے افعال واعمال کے لئے خاص تاریخیں اور اوقات مقرّر ہیں، اس لئے اس آیت کے شروع میں یہ بتلادیا کہ حج کا معاملہ عمرہ کی طرح نہیں ہے، اس کے لئے کچھ مہینے مقرّر ہیں، وہ مہینے شوال، ذیقعدہ اور دس روز ذی الحجہ کے ہیں، جیسا کہ حدیث میں بروایت ابو اُمامہؓ وابنِ عمرؓ [1] منقول ہے (مظہری)، شوال سے حج کے مہینے شروع ہونے کا حاصل یہ ہے کہ اس سے پہلے حج کا اِحرام باندھنا جائز نہیں، بعض اَئمہ کے نزدیک تو قبل شوال کے اِحرام سے حج کی ادائیگی ہی نہیں ہوسکتی، امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس اِحرام سے حج تو اَدا ہو جائے گا مگر مکروہ ہوگا۔ (مظہری) [2]

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ اس میں حج کا احرام باندھنے والے کے لئے کچھ منفی آداب واَحکام کا بیان ہے، جن سے حالتِ اِحرام میں پرہیز کرنا لازم وواجب ہے، وہ تین چیزیں ہیں: رَفَث، فسوق، جدال۔

''رَفَث'' ایک لفظِ جامع ہے، جس میں عورت سے مباشرت اور اس کے مقدمات یہاں تک کہ زبان سے عورت کے ساتھ اس کی کھلی گفتگو بھی داخل ہے، محرم کو حالتِ اِحرام میں یہ سب چیزیں حرام ہیں، تعریض وکنایہ کا مضائقہ نہیں۔

''فسوق'' کے لفظی معنی خروج کے ہیں، اِصطلاحِ قرآن میں عدول حکمی اور نافرمانی کو ''فسوق'' کہا جاتا ہے، جو اپنے عام معنی کے اِعتبار سے سب گناہوں کو شامل ہے، اسی لئے بعض حضرات نے اس جگہ عام معنی ہی مراد لئے ہیں، مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس جگہ ''فسوق'' کی تفسیر محظوراتِ اِحرام سے فرمائی ہے، یعنی وہ کام جو حالتِ اِحرام میں ممنوع وناجائز ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اس مقام کے مناسب یہی تفسیر ہے، کیونکہ عام گناہوں کی ممانعت اِحرام کے ساتھ خاص نہیں ہر حال میں حرام ہیں۔

وہ چیزیں جو اُصل سے گناہ نہیں مگر اِحرام کی وجہ سے ناجائز ہوجاتی ہیں چھ چیزیں ہیں: اوّل عورت کے ساتھ مباشرت اور اس کے تمام متعلقات یہاں تک کہ کھلی گفتگو بھی، دُوسرے بری جانوروں کا شکار، خود کرنا یا شکاری کو بتلانا، تیسرے بال یا ناخن کٹوانا، چوتھے خوشبو کا اِستعمال، یہ چار چیزیں تو مرد وعورت دونوں کے لئے حالتِ اِحرام میں ناجائز ہیں، باقی دو چیزیں مردوں کے ساتھ خاص ہیں، یعنی سلے ہوئے کپڑے پہننا، اور سر اور چہرے کو ڈھانپنا، اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ

[1] صحيح البخاري، كتاب الحج، باب قول الله تعالى: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ج:۱ ص:۲۱۱

[2] تفسير المظهري تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۲۳۱

ومالکؒ کے نزدیک چہرے کو ڈھانپنا حالتِ اِحرام میں عورت کے لئے بھی ناجائز ہے، اس لئے یہ بھی مشترک محظوراتِ اِحرام میں شامل ہے۔

ان چھ چیزوں میں پہلی یعنی عورت سے مباشرت وغیرہ، اگرچہ "فسوق" میں داخل ہے، لیکن اس کو "فسوق" سے پہلے الگ کر کے لفظ "رَفَث" سے اس لئے بتلا دیا کہ اِحرام میں اس سے اِجتناب سب سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ دُوسرے محظوراتِ اِحرام کا تو کوئی بدل اور کفارہ بھی ہوجاتا ہے، اور مباشرت کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ اگر ان میں کوئی مبتلا ہوجائے تو حج ہی فاسد ہوجاتا ہے، اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں ہوسکتا، مثلاً وقوفِ عرفات سے پہلے بی بی سے صحبت کرلی، تو حج فاسد ہوگیا، اور اس کا جرمانہ بھی گائے یا اُونٹ کی قربانی سے دینا پڑے گا، اور اگلے سال پھر حج کرنا پڑے گا، اس مزید اہمیت کی بنا پر اس کو فَلَا رَفَثَ کے لفظ سے مستقلاً بیان فرمادیا۔

"جدال" کے معنی ایک دُوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کے ہیں، اس لئے سخت قسم کے جھگڑے کو "جدال" کہا جاتا ہے، یہ لفظ بھی بہت عام ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے عام ہی معنی مراد لئے ہیں، اور بعض حضرات نے مقامِ حج واِحرام کی مناسبت سے اس جگہ "جدال" کے معنی یہ لئے ہیں کہ جاہلیتِ عرب کے لوگ مقامِ وقوف میں اِختلاف رکھتے تھے، کچھ لوگ عرفات میں وقوف کرنا ضروری سمجھتے تھے جیسا کہ حقیقت ہے، اور کچھ مزدلفہ میں وقوف ضروری کہتے تھے، عرفات میں جانے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، اور اسی کو موقفِ ابراہیم علیہ السلام قرار دیتے تھے، اور کچھ ذیقعدہ ہی میں کرلیتے تھے، اور پھر ان معاملات میں باہمی نزاعات اور جھگڑے ہوتے تھے، ایک دُوسرے کو گمراہ کہتا تھا، قرآنِ کریم نے وَلَا جِدَالَ فرماکر ان جھگڑوں کا خاتمہ فرمایا، اور جو بات حق تھی کہ وقوفِ فرض عرفات میں اور پھر وقوفِ واجب مزدلفہ میں کیا جائے، اور حج صرف ذی الحجہ کے اَیام میں کیا جائے، اس کا اِعلان کر کے اس کے خلاف جھگڑا کرنے کو ممنوع کردیا۔

اس تفسیر وتقریر کے لحاظ سے اس آیت میں صرف محظوراتِ اِحرام کا بیان ہوا جو اگرچہ فی نفسہٖ جائز ہیں، مگر اِحرام کی وجہ سے ممنوع کردی گئی ہیں، جیسے نماز، روزے کی حالت میں کھانا پینا، کلام کرنا وغیرہ جائز چیزوں کو منع کردیا گیا ہے۔

اور بعض حضرات نے اس جگہ "فسوق" و "جدال" کو عام معنی میں لے کر مقصد یہ قرار دِیا کہ اگرچہ فسق وگناہ اسی طرح باہم جدال وخلاف ہر جگہ ہر حال میں مذموم وگناہ ہے، لیکن حالتِ اِحرام میں اس کا گناہ اور زیادہ شدید ہوجاتا ہے، مبارک اَیام اور مقدس سرزمین میں جہاں صرف اللہ کے لئے عبادت کے واسطے آتے ہیں، اور لبیک لبیک پکار رہے ہیں، اِحرام کا لباس ان کو ہر وقت اس کی یاددہانی کرا رہا ہے کہ تم اس وقت عبادت میں ہو، ایسی حالت میں فسق وفجور اور نزاع وجدال اِنتہائی بےباکی اور اَشد ترین گناہ ہوجاتا ہے۔

اس عام معنی کے اِعتبار سے اس جگہ رَفَث، فسوق، جدال سے روکنے اور ان کی حرمت کو بیان کرنے میں ایک

حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مقامِ حج اور زمانۂ حج کے حالات ایسے ہیں کہ ان میں اِنسان کو ان تینوں چیزوں میں اِبتلا کے مواقع بہت پیش آتے ہیں، حالتِ اِحرام میں اکثر اپنے اہل وعیال سے ایک طویل مدّت تک علیحدہ رہنا پڑتا ہے، اور پھر مطاف و مسعیٰ، عرفات، مزدلفہ، منیٰ کے اجتماعات میں کتنی بھی اِحتیاط برتی جائے عورتوں مردوں کا اِختلاط ہو ہی جاتا ہے، ایسی حالت میں نفس پر قابو پانا آسان نہیں، اس لئے سب سے پہلے "رَفَث" کی حرمت کا بیان فرمایا، اسی طرح اس عظیم الشان اِجتماع میں چوری وغیرہ دُوسرے گناہوں کے مواقع بھی بے شمار پیش آتے ہیں، اس لئے وَلَا فُسُوْقَ کی ہدایت فرمادی، اسی طرح سفرِ حج میں اوّل سے آخر تک بے شمار مواقع اس کے بھی پیش آتے ہیں کہ رُفقائے سفر اور دُوسرے لوگوں سے جگہ کی تنگی اور دُوسرے اسباب کی بنا پر جھگڑا لڑائی ہوجائے، اس لئے وَلَا جِدَالَ کا حکم دیا گیا۔

بلاغتِ قرآن

اس آیت فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ کے الفاظ نفی کے الفاظ ہیں کہ یہ سب چیزیں حج میں نہیں ہیں، حالانکہ مقصود ان چیزوں سے نہی اور ممانعت کرنا ہے، جس کا مقتضٰی یہ تھا کہ "لَا تَرْفُثُوْا وَلَا تَفْسُقُوْا وَلَا تُجَادِلُوْا" کہا جاتا، مگر یہاں نہی کی جگہ نفی کے الفاظ رکھ کر اس طرف اِشارہ فرمادیا کہ ان افعال کی حج میں کوئی گنجائش اور تصوّر ہی نہیں۔

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ محظورات وممنوعاتِ اِحرام بیان فرمانے کے بعد آخر میں اس جملے میں یہ ہدایت دی گئی کہ حج کے مبارک اَیام اور مقدس مقامات میں تو صرف یہی نہیں کہ محظورات اور گناہوں سے بچو، بلکہ غنیمت جان کر عبادت و ذِکر اللہ اور نیک کاموں میں لگے رہو، تم جو بھی نیک کام کروگے وہ اللہ کے علم میں ہے اور تمہیں اس پر بڑے اِنعامات ملیں گے۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى اس میں ان لوگوں کی اِصلاح ہے جو حج وعمرہ کے لئے بے سروسامانی کے ساتھ نکل کھڑے ہوتے ہیں، اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں، پھر راستے میں بھیک مانگنا پڑتی ہے، یا خود بھی تکلیف اُٹھاتے ہیں اور دُوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں، اُن کی ہدایت کے لئے حکم ہوا کہ سفرِ حج کے لئے ضروریاتِ سفر ساتھ لینا چاہئے، یہ توکل کے منافی نہیں، بلکہ توکل کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اسباب ووسائل کو اپنے مقدور کے مطابق حاصل اور جمع کرے، پھر اللہ پر توکل کرے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توکل کی یہی تفسیر منقول ہے، بالکل ترکِ اسباب کا نام توکل رکھنا جہالت ہے۔

سفرِ حج میں تجارت یا مزدوری کرنا کیسا ہے؟

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ یعنی "تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم سفرِ حج میں تجارت یا

مزدوری کے ذریعے کچھ روزی کمالو اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق حاصل کرو۔'' واقعۂ نزول اس آیت کا یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب نے جس طرح تمام عبادات و معاملات کو مسخ کر کے طرح طرح کی بیہودہ رسمیں ان میں شامل کر دی تھیں، اور عبادات کو بھی کھیل تماشا بنا دیا تھا، اسی طرح افعالِ حج میں بھی طرح طرح کی بیہودگیاں کرتے تھے، منیٰ کے عظیم اجتماع میں ان کے خاص خاص بازار لگتے تھے، نمائش ہوتی تھی، تجارتوں کے فروغ کے ذرائع لگائے جاتے تھے۔ اسلام آیا، اور حج مسلمانوں پر فرض کیا گیا تو ان تمام بیہودہ رسموں کا قلع قمع کیا گیا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مٹ جانے والے تھے، اب ان کو یہ خیال ہوا کہ اَیامِ حج میں تجارت کرنا یا مزدوری کر کے کچھ کما لینا یہ بھی جاہلیت کی پیداوار ہے، شاید اسلام میں اس کی مطلقاً حرمت و ممانعت ہو جائے،[1] یہاں تک کہ ایک صاحب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آئے اور یہ سوال کیا کہ ہمارا پیشہ پہلے سے یہ ہے کہ ہم اُونٹ کرایہ پر چلاتے ہیں، کچھ لوگ ہمارے اُونٹ حج کے لئے کرایہ پر لے جاتے ہیں، ہم اُن کے ساتھ جاتے ہیں اور حج کرتے ہیں، کیا ہمارا حج نہیں ہوگا؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور آپ سے وہی سوال کیا تھا، جو تم مجھ سے کر رہے ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس وقت کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ اُس وقت آپ نے اس شخص کو بلوایا اور فرمایا کہ ہاں تمہارا حج صحیح ہے۔[2]

الغرض اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ اگر کوئی شخص دورانِ حج میں کوئی بیع و شراء یا مزدوری کرے جس سے کچھ نفع ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، ہاں کفارِ عرب نے جو حج کو تجارت کی منڈی اور نمائش گاہ بنا لیا تھا، اس کی اصلاح قرآن کے دو لفظوں سے کر دی گئی، ایک تو یہ کہ جو کچھ کمائیں اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور عطا سمجھ کر حاصل کریں، شکر گزار ہوں، محض سرمایہ سمیٹنا مقصد نہ ہو، فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ میں اسی کی طرف اشارہ ہے، دُوسرے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ کے لفظ نے یہ بتلا دیا کہ اس کمائی میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جس میں ایک اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اس سے بھی اجتناب کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ اخلاصِ کامل میں فرق آتا ہے، اور حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ اس کا مدار اصل نیت پر ہے، اگر کسی شخص کی نیت اصل میں دُنیوی نفعِ تجارت یا مزدوری ہے اور ضمنی طور پر حج کا بھی قصد کر لیا، یا نفعِ تجارت اور قصدِ حج دونوں مساوی صورت میں ہیں، تب تو یہ اخلاص کے خلاف ہے، حج کا ثواب اس سے کم ہو جائے گا اور برکاتِ حج جیسی حاصل ہونی چاہئیں وہ حاصل نہ ہوں گی، اور اگر اصل نیت حج کی ہے اسی کے شوق میں نکلا ہے، لیکن مصارفِ حج میں یا گھر کی ضروریات میں تنگی ہے، اس

[1] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب قوله: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ ...إلخ ج:۲ ص:۶۴۸

[2] سنن ابی داود، کتاب المناسك، باب الكرى ج:۱ ص:۲۴۲

کو پورا کرنے کے لئے کوئی معمولی تجارت یا مزدوری کرلی، یہ اِخلاص کے بالکل منافی نہیں، ہاں اس میں بھی بہتر یہ ہے کہ خاص اُن پانچ اَیام میں جن میں حج کے افعال ادا ہوتے ہیں، ان میں کوئی مشغلہ تجارت ومزدوری کا نہ رکھے، بلکہ ان اَیام کو خالص عبادت وذِکر میں گزارے، اسی وجہ سے بعض علماء نے خاص ان اَیام میں تجارت ومزدوری کو ممنوع بھی فرمایا ہے۔

عرفات میں وقوف اور اس کے بعد مزدلفہ کا وقوف

اس کے بعد اسی آیت میں اِرشاد ہے: فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ ۖ وَٱذْكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِۦ لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ ﴿١٩٨﴾ یعنی ”پھر جب تم عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعرِ حرام کے پاس خدا تعالیٰ کی یاد کرو، اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے پہلے تم محض ہی ناواقف تھے۔“ اس میں بتلایا گیا ہے کہ عرفات سے واپسی میں رات کو مزدلفہ میں قیام اور اس کا خاص ذِکر واجب ہے۔

عرفات، لفظاً جمع ہے، اور ایک خاص میدان کا نام ہے، جس کے حدودِ اَربعہ معروف ومشہور ہیں، یہ میدان حرم سے خارج واقع ہوا ہے، حجاج کو اس میں پہنچنا اور زوالِ آفتاب سے مغرب تک یہاں قیام کرنا حج میں حج کا اہم ترین فرض ہے، جس کے فوت ہونے کا کوئی کفارہ اور فدیہ نہیں ہوسکتا۔

عرفات کو ”عرفات“ کہنے کی بہت سی وجوہ بتلائی جاتی ہیں، اُن میں واضح یہ ہے کہ اس میدان میں اِنسان اپنے ربّ کی معرفت اور بذریعہ عبادت وذِکر اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے، نیز مشرق ومغرب کے مسلمانوں کو آپس میں تعارف کا ایک موقع ملتا ہے۔ اِرشادِ قرآنی میں اس کی تاکید فرمائی ہے کہ عرفہ کے دن بعد مغرب عرفات سے واپس آتے ہوئے مشعرِحرام کے پاس ٹھہرنا چاہئے، ”مشعرِ حرام“ ایک پہاڑ کا نام ہے، جو مزدلفہ میں واقع ہے، ”مشعر“ کے معنی شعار اور علامت کے ہیں، اور ”حرام“ بمعنی محترم ومقدس کے ہے، معنی یہ ہیں کہ یہ پہاڑ شعارِ اسلام کے اِظہار کے لئے ایک مقدس مقام ہے، اس کے آس پاس کے میدان کو ”مزدلفہ“ کہتے ہیں، اس میدان میں رات گزارنا اور مغرب وعشاء دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مزدلفہ میں پڑھنا واجب ہے، مشعرِحرام کے پاس اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، اگرچہ ہر طرح کے ذِکر اللہ کو شامل ہے، مگر خصوصیت سے دونوں نمازوں کو ایک وقت یعنی مغرب کو عشاء کے ساتھ ادا کرنا اس جگہ کی مخصوص عبادت ہے، آیت کے جملے: وَٱذْكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمْ میں شاید اسی طرف اِشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد اور ذِکر کے لئے جو طریقہ بتلایا ہے، اسی طرح اس کو یاد کرو، اپنی رائے اور قیاس کو اس میں دخل نہ دو، کیونکہ رائے اور قیاس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ مغرب کی نماز مغرب کے وقت میں پڑھی جاتی، عشاء کی عشاء کے وقت میں، لیکن اُس روز اُس مقام پر حق تعالیٰ کو یہی پسند ہے کہ

مغرب کی نماز مؤخر کی جائے، اس کو عشاء کے ساتھ پڑھا جائے۔ ارشادِ قرآنی: وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ سے ایک اور بھی اُصولی مسئلہ نکل آیا کہ ذِکر اللہ اور عبادت میں آدمی خود مختار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح چاہے یاد کرے، اور جس طرح چاہے اس کی عبادت کرے، بلکہ ذِکر اللہ اور ہر عبادت کے خاص آداب ہیں، اُن کے موافق ادا کرنا ہی عبادت ہے، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں، اور اس میں کمی بیشی یا مقدم مؤخر کرنا خواہ اس میں ذِکر اللہ کی کچھ زیادتی بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، نفلی عبادات اور صدقہ وخیرات وغیرہا میں جو لوگ بلا دلیلِ شرعی اپنی طرف سے کچھ خصوصیات اور اِضافے کر لیتے ہیں، اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ضروری قرار نہیں دیا، اور ان افعال کے نہ کرنے والوں کو خطاوار سمجھتے ہیں، اس آیت نے اُن کی غلطی کو واضح کر دیا کہ وہ اہلِ جاہلیت کی سی عبادت ہے کہ اپنی رائے وقیاس سے عبادت کی صورتیں گھڑ رکھی تھیں، اور چند رسموں کا نام عبادت رکھ لیا تھا۔

اس کے بعد تیسری آیت میں اِرشاد ہے: ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾ یعنی ''پھر تم سب کو ضروری ہے کہ اسی جگہ ہوکر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر واپس آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرمادیں گے۔''

اس جملے کا شانِ نزول یہ ہے کہ قریشِ عرب جو بیت اللہ کے محافظ ومجاور تھے اور سارے عرب میں ان کا اِقتدار مُسلّم تھا، اور ان کی ایک ممتاز حیثیت تھی، زمانۂ جاہلیت میں وہ اپنی اِمتیازی شان بنانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے، اور سب لوگ تو عرفات کو جاتے اور وہاں وقوف کر کے واپس آتے تھے، یہ لوگ راستہ میں مزدلفہ کے اندر ہی ٹھہر جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم چونکہ بیت اللہ اور حرم کے مجاور ہیں، اس لئے حدودِ حرم سے باہر جانا ہمارے لئے مناسب نہیں، مزدلفہ حدودِ حرم کے اندر ہے، اور عرفات اس سے خارج، یہ بہانہ کر کے مزدلفہ ہی میں قیام کر لیتے، اور وہیں سے واپس آجایا کرتے تھے، اور درحقیقت وجہ اس حیلے بہانے کی اپنا فخر وغرور اور عام لوگوں سے ممتاز ہو کر رہنا تھا، حق تعالیٰ کے اس فرمان نے ان کی غلط کاری واضح فرمادی اور ان کو حکم دیا کہ تم بھی وہیں جاؤ جہاں سب لوگ جاتے ہیں، یعنی عرفات میں، اور پھر وہیں سے سب کے ساتھ واپس آؤ۔

اوّل تو عام اِنسانوں سے اپنے آپ کو ممتاز کر کے رکھنا خود ایک متکبرانہ فعل ہے، جس سے ہمیشہ ہی پرہیز لازم ہے، خصوصاً حج کے اَیام میں جہاں لباسِ اِحرام اور پھر قیام ومقام کی یکسانیت کے ذریعے اسی کا سبق دینا ہے کہ اِنسان سب برابر ہیں، اَمیر وغریب یا عالم وجاہل یا بڑے چھوٹے کا یہاں کوئی اِمتیاز نہیں، حالتِ اِحرام میں یہ اِمتیازی شان بنانا اور بھی زیادہ جرم ہے۔

اِنسانی مساوات کا زرّیں سبق اور اس کی بہترین عملی صورت

اس اِرشادِ قرآنی سے اُصولِ معاشرت کی ایک اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ رہن سہن، قیام و مقام میں بڑوں کو چاہئے کہ چھوٹوں سے الگ ممتاز ہو کر نہ رہیں، بلکہ مل جل کر رہیں، کہ اس میں باہمی اُخوت و ہمدردی اور محبت و تعلق پیدا ہوتا ہے، اور اَمیر و غریب کی تفریق مٹتی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ ختم ہو جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں اس کو خوب واضح کر کے اِرشاد فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر، یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت کا مدار تقویٰ اور اِطاعتِ خداوندی پر ہے، اسی لئے جو لوگ ان کے خلاف مزدلفہ میں قیام کر کے اپنی ممتاز حیثیت بنانا چاہتے تھے، ان کے اس فعل کو گناہ قرار دے کر ان پر لازم کیا کہ اپنے اس گناہ سے توبہ واِستغفار کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں معاف فرمادیں اور اپنی رحمت فرمادیں۔

رُسومِ جاہلیت کی اِصلاح منیٰ میں فضول اِجتماعات کی ممانعت

چوتھی، پانچویں اور چھٹی آیات میں چند رُسومِ جاہلیت کی اِصلاح کی گئی ہے، ایک تو یہ کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں عرفات و مزدلفہ اور طواف و قربانی سے فارغ ہو کر جب منیٰ میں قیام کرتے تھے تو ان کی مجلسیں صرف اس کام کے لئے ہوتی تھیں کہ مشاعرے منعقد کریں، اور ان میں اپنے مفاخر اور اپنے آباء واَجداد کے مفاخر اور کارناموں کا بیان کریں، ان کی مجلسیں ذِکر اللہ سے یکسر خالی ہوتی تھیں، ان مبارک ایام کو ایسی لغو اور فضول چیزوں میں ضائع کرتے تھے، اس لئے اِرشاد ہوا کہ جب تم اپنے افعالِ اِحرام کو پورا کر چکو اور منیٰ میں قیام کرو تو وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، اپنے آباء واَجداد کو یاد کرنا اور خصوصاً ان کے جھوٹے سچے مفاخر اور کارناموں کو بیان کرنا چھوڑو، جتنا تم ان کو یاد کرتے ہو اس کی جگہ بلکہ اس سے زیادہ خدا تعالیٰ کو یاد کرو، اور ذِکر اللہ میں مشغول رہو۔ قرآن کی اس آیت نے عرب کی ایک جاہلانہ رسم کو مٹا کر مسلمانوں کو یہ ہدایت کی کہ یہ اَیام اور یہ مقام عبادت اور ذِکر اللہ کے لئے مخصوص ہیں، ان میں ذِکر اللہ و عبادت کے جو فضائل و برکات ہیں وہ پھر ہاتھ نہ آئیں گے، ان کو غنیمت جاننا چاہئے۔

علاوہ ازیں حج ایک ایسی عبادت ہے جو عموماً سفرِ طویل کی مشقت، اہل وعیال کی مفارقت، کاروبار کو ترک کرنے اور ہزاروں روپے اور بہت سا وقت خرچ کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے، اس میں حوادث کا پیش آجانا کچھ بعید نہیں کہ آدمی باوجود کوشش کے اپنے مقصدِ حج میں کامیاب نہ ہو سکے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام موانع ہٹا کر آپ کے مقصد میں کامیاب فرمایا اور فرائضِ حج پورے ہوگئے، تو یہ مقامِ شکر ہے، جس کا اِقتضا یہ ہے کہ اور زیادہ اللہ تعالیٰ کے ذِکر میں

مشغول ہوں، ان اوقات کو فضول اجتماعات اور فضول کام یا کلام میں ضائع نہ کرو، اہلِ جاہلیت ان اوقات میں اپنے آباء واَجداد کے تذکرے کرتے تھے، جن کا کوئی نفع دِین و دُنیا میں نہ تھا، تم اس کی جگہ اللہ کا ذِکر کرو جو نور ہی نور اور نفع ہی نفع ہے، دُنیا کے لئے بھی آخرت کے لئے بھی، آج کل اگرچہ مسلمانوں میں وہ رسمِ جاہلیت تو نہیں رہی کہ مشاعرے قائم کریں اور آباء واَجداد کے تذکرے کریں، لیکن آج بھی ہزاروں مسلمان ہیں جو ان اَیام کو فضول اِجتماعات میں، فضول دعوتوں اور تفریحات میں صرف کرتے ہیں، یہ آیت ان کی تنبیہ کے لئے کافی ہے۔

بعض حضراتِ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو جیسے بچپن میں اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں کہ ان کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ کلام "یا اَبِ، یا اَبِ" ہوتا ہے، تم اب بالغ ہو، جوان ہو، عاقل ہو، "یا اَبِ، یا اَبِ" کی جگہ "یا رَبِّ، یا رَبِّ" کو اِختیار کرو، اور اس پر نظر ڈالو کہ بچہ اپنے باپ کو اس لئے پکارتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں اپنے آپ کو باپ کا محتاج سمجھتا ہے۔ اِنسان اگر ذرا غور کرے تو وہ ہر وقت، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج اس سے زیادہ ہے، جیسا بچہ اپنے باپ کا محتاج ہے۔ نیز بعض اوقات کچھ لوگ اپنے باپ کا ذِکر فخراً بھی کیا کرتے ہیں، جیسے اہلِ جاہلیت کرتے تھے، تو اس آیت نے یہ بھی ہدایت کردی کہ فخر وعزّت کے لئے بھی ذِکر اللہ سے زیادہ کوئی چیز مؤثر نہیں۔ (رُوح البیان) [۱]

ایک اور رسمِ جاہلیت کی اِصلاح دِین و دُنیا کی طلب میں اِسلامی اِعتدال

جس طرح جاہلیت کی یہ رسم بیہودہ تھی کہ ان مبارک اَیام کو اپنے باپ دادوں کے تذکروں اور مشاعروں میں گزاریں، اسی طرح کچھ لوگوں کی یہ عادت تھی کہ اگرچہ اَیامِ حج میں شغل تو ذِکر اللہ اور دُعاؤں ہی کا رکھتے تھے، مگر اُن کی تمامتر دُعائیں صرف دُنیوی حاجات اور دُنیا کی راحت وعزّت یا دولت کے لئے ہوتی تھیں، آخرت کی طرف کوئی دھیان نہ ہوتا تھا، ان کی اِصلاح کے لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ بعض لوگ وہ ہیں جو حج میں دُعا بھی مانگتے ہیں تو صرف دُنیا کی بھلائی مانگتے ہیں، آخرت کی فکر نہیں کرتے، ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، کیونکہ ان کے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوا کہ فریضۂ حج بھی انہوں نے محض رسماً ادا کیا ہے، یا دُنیا میں فخر ووجاہت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور آخرت میں نجات حاصل کرنا ان کے پیشِ نظر ہے ہی نہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ صرف دُنیاوی دُعا مانگنے والوں کا ذِکر اس آیت میں اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا اس کے ساتھ حَسَنَةً کا لفظ مذکور نہیں، جس میں اِشارہ اس کی طرف ہے کہ وہ دُنیا کے لئے

[۱] تفسیر رُوح البیان تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۲۱۶

بھی حسنہ کے طلب گار نہیں، بلکہ اَغراضِ دُنیویہ میں ایسے مست و سرشار ہیں کہ ان کی طلب یہ رہ گئی ہے کہ اپنی خواہش کسی طرح پوری ہو، خواہ وہ اچھی ہو یا بری اور اچھے طریقہ سے حاصل ہو یا برے راستہ سے، لوگ اُن کو اچھا کہیں یا برا۔

اس آیت میں اُن مسلمانوں کے لئے بھی بڑی تنبیہ ہے جو موسمِ حج اور مقاماتِ مقدسہ میں بھی دُعاؤں میں اپنی اَغراضِ دُنیویہ ہی کو ترجیح دیتے ہیں، اور بیشتر اوقات انہیں کے لئے صرف کرتے ہیں۔ اور اگر ہمارے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ بہت سے دولت مند لوگ یہاں بھی جو وظائف اور دُعائیں کرتے ہیں یا بزرگوں سے کراتے ہیں، ان میں بکثرت لوگ ایسے ہیں کہ ان کی غرض ان تمام وظائف و دُعاؤں سے بھی صرف دولت کی ترقی، تجارت میں برکت، اَغراضِ دُنیویہ میں کامیابی ہوتی ہے، وہ بہت سے وظائف اور نوافل پڑھ کر یہ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بہت عبادت گزار ہیں، لیکن وہ حقیقت میں ایک طرح کی دُنیا پرستی ہوتی ہے۔ بہت سے حضرات زندہ بزرگوں سے اور وفات یافتہ اولیاء اللہ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس تعلق کا بھی بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی دُعا یا تعویذ سے ہمارے کام نکلیں گے، دُنیا کی آفات دُور ہوں گی، مال میں برکت ہوگی، ایسے لوگوں کے لئے بھی اس آیت میں خاص ہدایت ہے، معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جو علیم وخبیر ہے، ہر شخص کو اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے کہ وظائف ونوافل اور دُعا و دُرود سے اور حج و زیارت سے اس کی نیت کیا ہے۔ اس آیت کے آخری حصہ میں کم نصیب محروم القسمۃ لوگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے نیک اور مقبول بندوں کا ذِکر اس طرح فرمایا ہے:۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ یعنی ''اُن میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی دُعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے دُنیا کی بھلائی اور بہتری بھی مانگتے ہیں اور آخرت کی بہتری بھی اور عذابِ جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔''

اس میں لفظ حَسَنَةً تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے، مثلاً دُنیا کی ''حسنہ'' میں بدن کی صحت، اہل وعیال کی صحت، رزقِ حلال میں وسعت وبرکت، دُنیوی سب ضروریات کا پورا ہونا، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ محمودہ، علمِ نافع، عزّت و وجاہت، عقائد کی دُرستی، صراطِ مستقیم کی ہدایت، عبادات میں اِخلاصِ کامل سب داخل ہیں۔ اور آخرت کی ''حسنہ'' میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دِیدار، یہ سب چیزیں شامل ہیں۔

الغرض یہ دُعا ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں اِنسان کے تمام دُنیوی اور دِینی مقاصد آجاتے ہیں، دُنیا وآخرت دونوں جہان میں راحت وسکون میسر آتا ہے۔ آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذِکر ہے، یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دُعا مانگا کرتے تھے: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ[1]۔ اور

[1] مشکوٰۃ، کتاب الدعوات، باب جامع الدعاء ج:۱ ص:۲۱۸

حالتِ طواف میں خصوصیت کے ساتھ یہ دُعا مسنون ہے۔ اس آیت میں ان جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دُعا مانگنے کو عبادت جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دُنیا کی کوئی پروا نہیں ہے، کیونکہ درحقیقت یہ ان کا دعویٰ غلط اور خیالِ خام ہے، اِنسان اپنے وجود اور بقا اور عبادت وطاعت سب میں ضروریاتِ دُنیوی کا محتاج ہے، وہ نہ ہوں تو دِین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے، اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہتری اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں اسی طرح دُنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے ہیں، جو شخص دُنیوی حاجات کے لئے دُعا مانگنے کو زُہد و بزرگی کے خلاف سمجھے وہ مقامِ انبیاء سے بے خبر اور جاہل ہے، ہاں صرف دُنیوی حاجات ہی کو مقصدِ زندگی نہ بنائے، اس سے زیادہ آخرت کی فکر کرے اور اس کے لئے دُعا مانگے۔

آیت کے آخر میں اسی دُوسرے طبقہ کا جو کہ اپنی دُعاؤں میں دُنیا وآخرت دونوں کی بھلائی مانگتا ہے، اَنجام ذِکر کیا گیا ہے کہ ان کے اس صحیح اور نیک عمل اور دُعاؤں کا نتیجہ ان کو دُنیا وآخرت میں ملے گا، اس کے بعد اِرشاد ہے: وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ یعنی ''اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔'' کیونکہ اس کا علم محیط اور قدرتِ کاملہ کے لئے ساری مخلوقات کے ایک ایک فرد اور پھر اس کی عمر بھر کے اعمال کا حساب لینے میں اُن آلات وذرائع کی ضرورت نہیں جن کا اِنسان محتاج ہے، اس لئے وہ بہت جلد ساری مخلوقات کا حساب لے لیں گے، اور اُن پر جزا وسزا مرتب فرمائیں گے۔

منیٰ میں دو یا تین دِن کا قیام اور ذِکر اللہ کی تاکید

آٹھویں آیت جو اس جگہ اَحکامِ حج کی آخری آیت ہے، اس میں حجاج کو ذِکر اللہ کی طرف متوجہ کر کے ان کے مقصدِ حج کی تکمیل اور آئندہ زندگی کو دُرست رکھنے کی ہدایت اس طرح فرمائی گئی ہے: وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ یعنی ''اللہ کو یاد کرو گنتی کے چند دِنوں میں'' ان چند دِنوں سے مراد اَیامِ تشریق ہیں جن میں ہر نماز کے بعد تکبیر کہنا واجب ہے۔

آگے ایک مسئلہ کی وضاحت کی گئی ہے کہ منیٰ میں قیام اور جمرات پر کنکریاں مارنا کب تک ضروری ہے، اس میں اہلِ جاہلیت کا اِختلاف رہا کرتا تھا، بعض لوگ تیرہویں تاریخ ذی الحجہ تک منیٰ میں قیام اور جمرات پر رَمی کرنے کو ضروری سمجھتے تھے، اس سے پہلے بارہویں کو واپس آجانے کو ناجائز اور ایسا کرنے والوں کو گنہگار کہا کرتے تھے، اسی طرح دُوسرے لوگ بارہویں تاریخ کو چلے آنا ضروری سمجھتے اور تیرہویں تک ٹھہرنے کو گناہ جانتے تھے، اس آیت میں ان دونوں کی اِصلاح اس طرح کی گئی کہ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ یعنی ''جو شخص عید کے بعد صرف دو دِن منیٰ میں قیام کر کے واپس آجائے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو تیسرے دِن تک مؤخر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔'' یہ دونوں فریق جو ایک دُوسرے کو گنہگار کہتے ہیں غلو اور غلطی میں مبتلا ہیں۔

صحیح یہ ہے کہ حجاج کو دونوں صورتوں میں اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں، ہاں افضل واَولیٰ یہی ہے کہ تیسرے دن تک ٹھہریں، فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص دُوسرے دن غروبِ آفتاب سے پہلے منیٰ سے چلا آیا اس پر تیسرے دن کی رَمی واجب نہیں، لیکن اگر آفتاب منیٰ میں غروب ہوگیا پھر تیسرے دن کی رَمی کرنے سے پہلے وہاں سے واپس آجانا جائز نہیں رہتا، البتہ تیسرے دن کی رَمی میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ زوالِ آفتاب سے پہلے صبح کے بعد بھی ہوسکتی ہے۔

منیٰ سے واپسی کا اور اس میں حجاج کو اختیار دینے کا ذِکر فرمانے کے بعد جو کچھ کہا گیا کہ دُوسرے دن واپس آجائے گا تو کچھ گناہ نہیں، اور تیسرے دن واپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں، یہ سب اس شخص کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے اَحکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ درحقیقت حج اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دُوسری جگہ ارشاد ہے: اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ (المائدة) یعنی ''اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعار بندے ہیں۔'' اور جو شخص حج سے پہلے بھی گناہوں میں ملوث تھا اور حج کے اندر بھی بے پروائی سے کام لیتا رہا، حج کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا حج کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا حجِ فرض ادا ہوگیا، ترکِ حج کا مجرم نہیں رہا۔

آخر میں اِرشاد فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ یعنی ''ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کرو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو۔'' وہ تمہارے کھلے ہوئے اور چھپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزاوسزا دیں گے، اَحکامِ حج جو اُوپر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت اُن سب کی رُوح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ خاص اَیامِ حج میں جبکہ اعمالِ حج میں مشغول ہو، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اِجتناب کرو، کیونکہ وزنِ اعمال کے وقت اِنسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھا جائیں گے، نیک اعمال کا اثر اور وزن ظاہر نہ ہونے دیں گے، عباداتِ حج کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب اِنسان حج سے فارغ ہوکر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہوجاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقویٰ کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہوچکے ہو، آگے اِحتیاط رکھو، تو دُنیا وآخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہے، ورنہ جو شخص حج کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہوگیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علماء نے فرمایا ہے کہ حجِ مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے حج سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دِل دُنیا کی محبت سے فارغ اور آخرت کی طرف راغب ہو، ایسے شخص کا حج مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دُعا اس کی مقبول ہے، دورانِ حج میں جگہ جگہ اِنسان اللہ تعالیٰ سے اِطاعت وفرمانبرداری کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگر حج کرنے والے اس کا دھیان رکھیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اِہتمام میسر آسکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حج سے واپس آیا تو اِتفاقاً میرے دِل میں ایک گناہ کا وسوسہ پیدا ہوا، مجھے غیب سے آواز آئی کہ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرمادیا۔

ایک ترکی بزرگ جو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر ایک نور کا مشاہدہ کیا کرتے تھے، وہ حج کو گئے اور فارغ ہوکر واپس آئے تو یہ کیفیت بجائے بڑھنے کے بالکل سلب ہوگئی، اپنے مرشد مولانا جامیؒ سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ حج سے پہلے تمہارے اندر تواضع و انکسار تھا، اپنے آپ کو گناہگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے اِلحاح وزاری کرتے تھے، حج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ حج ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہوگئی۔

اَحکامِ حج کے ختم پر تقویٰ کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ حج ایک بڑی عبادت ہے، اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دِل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کردینے والا ہے، اس لئے خاتمۂ کلام میں فرمایا کہ جس طرح حج سے پہلے اور حج کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اِطاعت لازم ہے، اسی طرح حج کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کی کرائی عبادت ضائع نہ ہوجائے، اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ وَالنِّيَّةِ۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ

اور بعضا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہے تجھ کو اس کی بات دُنیا کی زندگانی کے کاموں میں، اور گواہ کرتا ہے اللہ کو

عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿٢٠٤﴾ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ

اپنے دِل کی بات پر، اور وہ سخت جھگڑالو ہے۔ اور جب پھرے تیرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک میں

لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿٢٠٥﴾ وَ اِذَا

تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں، اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو۔ اور جب

قِيۡلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ فَحَسۡبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ

اُس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر، تو آمادہ کرے اس کو غرور گناہ پر، سو کافی ہے اس کو دوزخ

وَلَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ ؕ

اور وہ بے شک برا ٹھکانا ہے۔ اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے کہ بیچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضاجوئی میں،

وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌ بِالۡعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور لوگوں میں ایک وہ شخص بھی ہے کہ دُنیوی زندگی کے بارے میں اس کی باتیں تمہیں بڑی اچھی لگتی ہیں، اور جو کچھ اس کے دِل میں ہے اُس پر وہ اللہ کو گواہ بھی بناتا ہے، حالانکہ وہ (تمہارے) دُشمنوں میں سب سے زیادہ کٹر ہے ﴿۲۰۴﴾ اور جب اُٹھ کر جاتا ہے تو زمین میں اس کی دوڑ دھوپ اس لئے ہوتی ہے کہ وہ اس میں فساد مچائے، اور فصلیں اور نسلیں تباہ کرے، حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا ﴿۲۰۵﴾ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا خوف کر، تو نخوت اس کو گناہ پر اور آمادہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایسے شخص کو تو جہنم ہی راس آئے گی، اور یقین کرو وہ بہت بُرا بچھونا ہے ﴿۲۰۶﴾ اور (دوسری طرف) لوگوں میں وہ شخص بھی ہے جو اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنی جان کا سودا کر لیتا ہے، اور اللہ (ایسے) بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ ﴿۲۰۷﴾

ربطِ آیات

اُوپر کی آیتوں میں دُعا مانگنے والے آدمیوں کی دو قسمیں ٹھہرائی تھیں، ایک کافر کہ منکرِ آخرت ہے، اس لئے صرف دُنیا مانگتا ہے، دُوسرا مؤمن کہ معتقدِ آخرت ہے، دُنیا کی بھلائی کے ساتھ آخرت کی بھلائی بھی مانگتا ہے، اب اگلی آیت میں اسی طرح کی تقسیم نفاق و اِخلاص کے اعتبار سے فرماتے ہیں کہ بعض منافق ہوتے ہیں اور بعض مخلصین۔

خلاصۂ تفسیر

(کوئی شخص تھا اخنس بن شریق، بڑا فصیح و بلیغ، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر قسمیں کھا کھا کر دعویٰ اسلام کیا کرتا اور مجلس سے اُٹھ کر جاتا تو فساد و شرارت و اِیذا رسانیٔ خلق میں لگ جاتا، اس منافق کے باب میں فرماتے ہیں) اور بعضا آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دُنیوی غرض سے ہوتی ہے (کہ اظہارِ اسلام سے مسلمانوں کی طرح قرب و خصوصیت کے ساتھ رہوں گا، اس کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے) مزہ دار معلوم ہوتی ہے، اور وہ (اپنا اِعتبار بڑھانے کو) اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہے اپنے دِل کی سچائی پر، حالانکہ (بالکل جھوٹا ہے، کیونکہ واقع میں) وہ (آپ کی) مخالفت میں (نہایت) شدید ہے، اور (جس طرح آپ کا مخالف ہے اسی طرح اور مسلمانوں کو بھی اِیذا پہنچاتا ہے، چنانچہ) جب (آپ کی مجلس سے) پیٹھ پھیرتا ہے تو اس دوڑ دُھوپ میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں (کوئی) فساد کردے اور (کسی کی) کھیتی اور مواشی کو تلف کردے، (چنانچہ ایک مسلمان کا اس طرح نقصان کردیا) اور اللہ تعالیٰ فساد (کی باتوں) کو پسند نہیں فرماتے، اور (اس مخالفت و ایذا کے ساتھ مغرور اس درجہ ہے کہ) جب اس سے کوئی کہتا ہے خدا سے ڈر، تو (اور زیادہ) آمادہ کردیتا ہے اس کو غرور گناہ پر، سو ایسے شخص کی کافی سزا ہے جہنم، اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔ اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بدلہ میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔

معارف و مسائل

آیت کا آخری حصہ جس میں مؤمن مخلص کا یہ حال بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی بھی بازی لگا دیتا ہے، یہ اُن مخلص صحابہ کرامؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے بے مثال قربانیاں اللہ کی راہ میں پیش کی ہیں، مستدرک حاکم، ابنِ جریر، مسندِ ابنِ ابی حاتم وغیرہ میں بسندِ صحیح منقول ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب رُومی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں نازل ہوئی ہے کہ جب وہ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں کفارِ قریش کی ایک جماعت نے راستہ روک لیا یہ دیکھ کر حضرت صہیب رُومیؓ اپنی سواری سے اُتر کر کھڑے ہوگئے، اور ان کے ترکش میں جتنے تیر تھے سب نکال لئے، اور قریش کی اس جماعت سے خطاب کیا کہ اے قبیلۂ قریش! تم سب جانتے ہو کہ میں تیراندازی میں تم سب سے زیادہ ماہر ہوں، میرا تیر کبھی خطا نہیں کرتا، اور اَب میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تم میرے پاس اس وقت تک نہ پہنچ سکو گے جب تک میرے ترکش میں ایک تیر بھی باقی ہے، اور تیروں کے بعد میں تلوار سے کام لوں گا، جب تک مجھ میں دَم رہے گا، پھر جو تم چاہو کرلینا، اور اگر تم نفع کا سودا چاہتے ہو تو میں تمہیں اپنے مال کا پتہ دیتا ہوں جو مکہ

مکرمہ میں رکھا ہے، تم وہ مال لے لو، اور میرا راستہ چھوڑ دو، اس پر قریش کی جماعت راضی ہوگئی، اور حضرت صہیب رومیؓ نے صحیح سالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر واقعہ سنایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا:-

رَبِحَ الْبَیْعُ اَبَا یَحْیٰی رَبِحَ الْبَیْعُ اَبَا یَحْیٰی۔

''تمہارا بیوپار نفع بخش رہا، تمہاری بیع نفع بخش رہی۔''

اسی واقعہ میں آیتِ مذکورہ کے نزول نے اس کلام کی تصدیق کردی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلا تھا۔ [1]

اور بعض حضراتِ مفسرین نے کچھ دوسرے صحابہ کرامؓ کے ایسے ہی واقعات کو آیت کا شانِ نزول بتلایا ہے۔ (مظہری) [2]

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

اے ایمان والو! داخل ہوجاؤ اسلام میں پورے اور مت چلو قدموں پر

الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ

شیطان کے، بے شک وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ پھر اگر تم بچلنے لگو بعد اس کے کہ پہنچ چکے تم کو

الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ

صاف حکم تو جان رکھو کہ بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا۔ کیا وہ اسی کی راہ دیکھتے ہیں کہ

یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ قُضِیَ الْاَمْرُ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ

آوے اُن پر اللہ اَبر کے سائبانوں میں اور فرشتے اور طے ہوجاوے قصہ، اور اللہ ہی کی طرف

تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ ع

لوٹیں گے سب کام۔

ع ۲۵ / ۹

[1] المستدرك على الصحيحين، ذكر مناقب صهيب رقم الحديث: ۵۷۲۹

[2] تفسیر مظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج: ۱ ص: ۲۴۸

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ یقین جانو وہ تمہارا کھلا دُشمن ہے (۲۰۸) پھر جو روشن دلائل تمہارے پاس آچکے ہیں، اگر تم اُن کے بعد بھی (راہِ راست سے) پھسل گئے تو یاد رکھو کہ اللہ اقتدار میں بھی کامل ہے، حکمت میں بھی کامل۔ (۲۰۹) یہ (کفار ایمان لانے کے لئے) اس کے سوا کس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ خود بادل کے سائبانوں میں ان کے سامنے آموجود ہو، اور فرشتے بھی (اس کے ساتھ ہوں) اور سارا معاملہ ابھی چکا دیا جائے؟ حالانکہ آخرِ کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف تو لوٹ کر رہیں گے (۲۱۰)

ربطِ آیات

اُوپر مخلص کی مدح تھی، بعض اوقات اس اِخلاص میں غلطی سے غلوّ اور اِفراط ہو جاتا ہے، یعنی قصد تو ہوتا ہے زیادہ اِطاعت کا مگر وہ اِطاعت بنظرِ غائر حدِ شریعت وسنت سے متجاوز ہوتی ہے، اس کو ''بدعت'' کہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ جو پہلے علمائے یہود سے تھے، اور اس مذہب میں ہفتہ کا روز معظم تھا، اور اُونٹ کا گوشت حرام تھا، ان صاحبوں کو بعد اِسلام کے یہ خیال ہوا کہ شریعتِ موسوی میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی، اور شریعتِ محمدیہ میں اس کی بے تعظیمی واجب نہیں، اسی طرح شریعتِ موسویہ میں اُونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا اور شریعتِ محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں، سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اُونٹ کا گوشت باوجود حلال اِعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کردیں تو شریعتِ موسویہ کی بھی رعایت ہو جاوے اور شریعتِ محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا، اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اِطاعت اور دِین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خیال کی اِصلاح آیتِ آئندہ میں کسی قدر اہتمام سے فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ اِسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو اَمر اِسلام میں قابلِ رعایت نہ ہو اس کی رعایت دِین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جاوے، اور ایسے اَمر کو دِین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے، اور بہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کا عذاب زیادہ سخت ہونے کا خطرہ ہے۔

خلاصۂ تفسیر

اے اِیمان والو! اِسلام میں پورے پورے داخل ہو (یہ نہیں کہ کچھ یہودیت کی بھی رعایت کرو) اور (ایسے خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دُشمن ہے (کہ ایسی پٹی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر میں تو

سراسر دِین معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دِین کے خلاف) پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلیلیں (اَحکام وشرائع اِسلام کی) پہنچ چکی ہیں، (پھر بھی صراطِ مستقیم سے) لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالیٰ (بڑے) زبردست ہیں (سخت سزا دیں گے، اور کچھ دنوں تک سزا نہ دیں تو اس سے دھوکا مت کھانا کیونکہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (کسی حکمت ومصلحت سے کبھی سزا میں دیر بھی کر دیتے ہیں، معلوم ہوتا ہے) یہ لوگ (جو کہ بعد وضوح دلائل حق کے کج راہی اِختیار کرتے ہیں) صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے (یعنی کیا اس وقت اَمرِ حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہوگا) اور یہ سارے (جزا وسزا کے) مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رُجوع کئے جاویں گے (کوئی دُوسرا صاحبِ اِختیار نہ ہوگا، سو ایسے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام بجز خرابی کے کیا ہو سکتا ہے)۔

معارف ومسائل

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً "سِلم" بالکسر والفتح دو معنی کے لئے اِستعمال ہوتا ہے، ایک صلح، دُوسرے اِسلام، اس جگہ جمہور صحابہؓ وتابعینؒ کے نزدیک اِسلام مراد ہے (ابنِ کثیر)۔[1] لفظ کَآفَّۃً جمیعًا اور عَآمَّۃً کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ اس جگہ ترکیب میں حال واقع ہوا ہے، جس میں دو اِحتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیر اُدْخُلُوْا کا حال قرار دِیا جائے، دُوسرے یہ کہ "سلم" بمعنی اِسلام کا حال ہو، پہلی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم پورے پورے اِسلام میں داخل ہو جاؤ، یعنی تمہارے ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان، دِل اور دِماغ سب کا سب دائرۂ اِسلام واطاعتِ اِلٰہیہ کے اندر داخل ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے تو اَحکامِ اِسلامیہ بجالا رہے ہو مگر دِل ودِماغ اس پر مطمئن نہیں، یا دِل دِماغ سے تو اس پر مطمئن ہو مگر ہاتھ پاؤں اور اَعضاء وجوارح کا عمل اس سے باہر ہے۔

اور دُوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم داخل ہو جاؤ مکمل اور پورے اِسلام میں، یعنی ایسا نہ ہو کہ اِسلام کے بعض اَحکام تو قبول کرو، بعض میں پس وپیش رہے، اور چونکہ اِسلام نام ہے اس مکمل نظامِ حیات کا جو قرآن وسنت میں بیان ہوا ہے خواہ اس کا تعلق عقائد وعبادات سے ہو، یا معاملات ومعاشرت سے، حکومت وسیاست سے اس کا تعلق ہو یا تجارت وصنعت وغیرہ سے، اِسلام کا جو مکمل نظامِ حیات ہے تم سب اس پورے نظام میں داخل ہو جاؤ۔

خلاصہ دونوں صورتوں کا قریب قریب یہی ہے کہ اَحکامِ اِسلام خواہ وہ کسی شعبۂ زندگی سے متعلق ہوں اور اَعضائے ظاہری سے متعلق ہوں یا قلب اور باطن سے ان کا تعلق ہو، جب تک ان تمام اَحکام کو سچے دِل سے قبول نہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر، تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۵۲۵

کروگے مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہوگے۔

اس آیت کا شانِ نزول جو اُوپر بیان ہوا ہے، اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ صرف اسلام ہی کی تعلیمات تمہارا مطمحِ نظر ہونا چاہئے، اس کو پورا پورا اختیار کرلو تو وہ تمہیں سارے مذاہب و ملل سے بے نیاز کردے گا۔

تنبیہ:- اس میں اُن لوگوں کے لئے بڑی تنبیہ ہے جنہوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادات کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے، معاملات اور معاشرت کے اَحکام کو گویا دین کا جزء ہی نہیں سمجھتے، اصطلاحی دین داروں میں یہ غفلت عام ہے، حقوق و معاملات اور خصوصاً حقوقِ معاشرت سے بالکل بیگانہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان اَحکام کو وہ اسلام کے اَحکام ہی یقین نہیں کرتے، نہ اُن کے معلوم کرنے یا سیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، نہ اُن پر عمل کرنے کا، نعوذ باللہ، کم از کم مختصر رسالہ ''آدابِ معاشرت'' حضرت سیّدی حکیم الامتؒ کا ہر مسلمان مرد و عورت کو ضرور پڑھ لینا چاہئے۔

اور یہ واقعہ کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں اُن کے پاس آجائیں، قیامت میں پیش آئے گا، اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح آنا متشابہات میں سے ہے، جس کے متعلق جمہور صحابہؓ و تابعینؒ اور اَسلافِ اُمت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے مضمون کے حق و صحیح ہونے کا اعتقاد و یقین رکھے، اور کیفیت کہ کس طرح یہ کام ہوگا، اس کی دریافت کی فکر میں نہ پڑے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور تمام صفات کی حقیقت اور کیفیت کا معلوم کرنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے، یہ بھی اسی میں داخل ہے۔

سَلْ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ۗ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ

پوچھ بنی اسرائیل سے کس قدر عنایت کیں ہم نے ان کو نشانیاں کھلی ہوئی، اور جو کوئی بدل ڈالے اللہ کی نعمت

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا

بعد اس کے کہ پہنچ چکی ہو وہ نعمت اس کو تو اللہ کا عذاب سخت ہے۔ فریفتہ کیا ہے کافروں کو

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ (وقف لازم)

دُنیا کی زندگی پر اور ہنستے ہیں ایمان والوں سے، اور جو پرہیزگار ہیں وہ ان کافروں سے بالاتر ہوں گے

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

قیامت کے دِن، اور اللہ روزی دیتا ہے جس کو چاہے بے شمار۔

آسان ترجمۂ قرآن

بنی اسرائیل سے پوچھو ہم نے ان کو کتنی ساری کھلی نشانیاں دی تھیں! اور جس شخص کے پاس اللہ کی نعمت آچکی ہو، پھر وہ اس کو بدل ڈالے، تو (اسے یاد رکھنا چاہئے کہ) اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے ﴿۲۱۱﴾ جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے، ان کے لئے دُنیوی زندگی بڑی دِلکش بنادی گئی ہے، اور وہ اہلِ ایمان کا مذاق اُڑاتے ہیں، حالانکہ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے وہ قیامت کے دن ان سے کہیں بلند ہوں گے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ ﴿۲۱۲﴾

ربطِ آیات

اُوپر فرمایا تھا کہ بعد دلائلِ واضحہ آجانے کے حق کی مخالفت کرنا موجبِ سزا ہے، پہلی آیت میں اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ جیسے بعض بنی اِسرائیل کو ایسی ہی مخالفت پر سزا دی گئی۔

خلاصۂ تفسیر

آپ (علمائے) بنی اِسرائیل سے (ذرا) پوچھئے (تو سہی) ہم نے ان کو (یعنی اُن کے بزرگوں کو) کتنی واضح دلیلیں دی تھیں (مگر ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرتے اور اُلٹی گمراہی پر کمر باندھی، پھر دیکھو سزائیں بھی بھگتیں، مثلاً توراۃ ملی، چاہئے تو یہ تھا کہ اس کو قبول کرتے، مگر اِنکار کیا، آخر کوہِ طور گرانے کی ان کو دھمکی دی گئی، اور مثلاً حق تعالیٰ کا کلام سنا، چاہئے تھا سر آنکھوں پر رکھتے مگر شبہات نکالے، آخر بجلی سے ہلاک ہوئے، اور مثلاً دریا میں شگاف کر کے فرعون سے نجات دی گئی، اِحسان مانتے مگر گوسالہ پرستی شروع کی، جس پر سزائے قتل دی گئی، اور مثلاً من وسلویٰ نازل ہوا، شکر کرنا چاہئے تھا، نافرمانی کی وہ سڑنے لگا، اور اس سے نفرت ظاہر کی تو وہ موقوف ہوگیا، اور کھیتی کی مصیبت سر پر پڑی، اور مثلاً انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ان میں جاری رہا غنیمت سمجھتے، ان کو قتل کرنا شروع کر دیا، جس پر یہ سزا دی گئی کہ ان سے حکومت وسلطنت چھین لی گئی، وعلیٰ ھٰذا بہت سے معاملات اسی سورۂ بقرہ کے شروع میں بھی مذکور ہو چکے ہیں) اور (ہمارا قانون یہی ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کی (ایسی بڑی) نعمت (دلائلِ واضحہ) کو بدلتا ہے، اس کے پاس پہنچنے

کے بعد (یعنی بجائے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرے اور اُلٹا گمراہ بنتا ہے) تو یقیناً حق تعالیٰ (ایسے شخص کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

(دُوسری آیت میں مخالفتِ حق کی اصلی علت اکثر یہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ دُنیا کی محبت ہے، جس کے آثار میں سے اہلِ دِین کو حقیر سمجھنا بھی ہے، کیونکہ جب دُنیا کا غلبہ ہوتا ہے دِین کی طلب نہیں رہتی، بلکہ دِین کو اپنی دُنیوی اَغراض کے خلاف دیکھ کر ترک کر بیٹھتا ہے، اور دُوسرے طالبانِ دِین پر باستہزا پیش آیا کرتے تھے، ان لوگوں کا بیان فرماتے ہیں کہ) دُنیوی معاش کفار کو آراستہ پیراستہ معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) ان مسلمانوں سے تمسخر کرتے ہیں، حالانکہ یہ (مسلمان) جو کفر و شرک سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ (کی حالت) میں ہوں گے قیامت کے روز (کیونکہ کفار جہنم میں ہوں گے اور مسلمان جنت میں) اور (آدمی کو محض معاشی وسعت پر مغرور نہ ہونا چاہئے، کیونکہ) روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے انداز (یعنی بکثرت) دے دیتے ہیں (پس اس کا مدار قسمت پر ہے نہ کہ کمال اور مقبولیت پر، سو یہ ضرور نہیں کہ جو روزی میں بڑا ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی معزز ہو، اور بڑی عزّت وہی ہے جو اللہ کے نزدیک معتبر ہو، پھر محض اس کے اُوپر اپنے کو معزز اور دُوسرے کو ذلیل سمجھنا بیوقوفی ہے)۔

معارف و مسائل

دُنیا کے مال و دولت اور عزّت و جاہ پر مغرور ہونے اور غریب لوگوں کا اِستہزا کرنے کی حقیقت قیامت کے روز آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص کسی مؤمن مرد یا عورت کو اس کے فقر و فاقہ کی وجہ سے ذلیل و حقیر سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو اوّلین و آخرین کے مجمع میں رُسوا اور ذلیل کریں گے، اور جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت پر بہتان باندھتا ہے اور کوئی ایسا عیب اس کی طرف منسوب کرتا ہے جو اس میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو آگ کے ایک اُونچے ٹیلہ پر کھڑا کریں گے جب تک کہ وہ خود اپنی تکذیب نہ کرے۔ [1] (ذکر الحدیث القرطبی)

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۖ

تھے سب لوگ ایک دِین پر، پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۳ ص:۲۹

وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ

اور اُتاری اُن کے ساتھ کتاب سچی کہ فیصلہ کرے لوگوں میں جس بات میں وہ جھگڑا کریں،

وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ

اور نہیں جھگڑا ڈالا کتاب میں مگر اُنہی لوگوں نے جن کو کتاب ملی تھی اس کے بعد کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم

بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ

آپس کی ضد سے، پھر اب ہدایت کی اللہ نے ایمان والوں کو اس سچی بات کی جس میں وہ جھگڑا کر رہے تھے

بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

اپنے حکم سے اور اللہ بتلاتا ہے جس کو چاہے سیدھا راستہ۔

آسان ترجمۂ قرآن

(شروع میں) سارے انسان ایک ہی دین کے پیرو تھے۔ پھر (جب ان میں اختلاف ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے جو (حق والوں کو) خوشخبری سناتے، اور (باطل والوں کو) ڈراتے تھے، اور ان کے ساتھ حق پر مشتمل کتاب نازل کی، تا کہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں ان کا اختلاف تھا۔ اور (افسوس کی بات یہ ہے کہ) کسی اور نے نہیں بلکہ خود انہوں نے جن کو وہ کتاب دی گئی تھی، روشن دلائل آجانے کے بعد بھی، صرف باہمی ضد کی وجہ سے اسی (کتاب) میں اختلاف نکال لیا۔ پھر جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انہیں اپنے حکم سے حق کی ان باتوں میں راہِ راست تک پہنچایا جن میں انہوں نے اختلاف کیا تھا، اور اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست تک پہنچا دیتا ہے۔ ﴿۲۱۳﴾

ربطِ آیات

اُوپر دینِ حق سے اِختلاف کرنے کی علت حبِ دُنیا کو بتایا ہے، آگے اسی مضمون کی تائید فرماتے ہیں کہ مدّت سے یہی قصہ چلا آرہا ہے کہ ہم دلائلِ واضحہ دینِ حق پر قائم کرتے ہیں، اور طالبانِ دُنیا اپنی دُنیوی اَغراض کے سبب اس سے خلاف کرتے رہے۔

خلاصۂ تفسیر

(ایک زمانہ میں) سب آدمی ایک ہی طریق پر تھے (کیونکہ اوّل دُنیا میں حضرت آدم علیہ السلام مع اپنی بی بی کے تشریف لائے اور جو اولاد ہوتی گئی ان کو دِینِ حق کی تعلیم فرماتے رہے، اور وہ ان کی تعلیم پر عمل کرتے رہے، ایک مدّت اسی حالت میں گزر گئی، پھر اِختلافِ طبائع سے اَغراض میں اِختلاف ہونا شروع ہوا، حتیٰ کہ ایک عرصہ کے بعد اَعمال وعقائد میں اِختلاف کی نوبت آگئی) پھر (اس اِختلاف کے رفع کرنے کو) اللہ تعالیٰ نے (مختلف) پیغمبروں کو بھیجا جو کہ (حق ماننے والوں کو) خوشی (کے وعدے) سناتے تھے اور (نہ ماننے والوں کو عذاب سے) ڈراتے تھے، اور ان (پیغمبروں کی مجموعی جماعت) کے ساتھ (آسمانی) کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں (اور ان پیغمبروں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل فرمانا) اس غرض سے (تھا) کہ اللہ تعالیٰ (ان رُسل وکتب کے ذریعے سے اِختلاف کرنے والے) لوگوں میں ان کے اُمورِ اختلافیہ (مذہبی) میں فیصلہ فرمادیں (کیونکہ رُسل وکتب اَمرِ واقعی کا اِظہار کردیتے ہیں اور اَمرِ واقعی کے متعین ہونے سے ظاہر ہے کہ غیرِ واقعی کا غلط ہوجانا معلوم ہوجاتا ہے، اور یہی فیصلہ ہے، اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتابُ اللہ آنے سے چاہئے تھا کہ اس کتاب کو قبول کرتے، اور اس پر مدارِ کار رکھ کر اپنے سب اِختلافات مٹادیتے، مگر بعضوں نے خود اس کتاب ہی کو نہ مانا، اور خود اسی میں اِختلاف کرنا شروع کردیا) اور اس کتاب میں (یہ) اِختلاف اور کسی نے نہیں کیا، مگر صرف ان لوگوں نے جن کو (اوّلاً) وہ کتاب ملی تھی (یعنی اہلِ علم واہلِ فہم نے کہ اوّل مخاطب وہی لوگ ہوتے ہیں، دُوسرے عوام اُن کے ساتھ لگ لیا کرتے ہیں، اور اِختلاف بھی کیسے وقت کیا) بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائلِ واضحہ پہنچ چکے تھے (یعنی ان کے ذہن نشین ہوچکے تھے، اور اِختلاف کیا کس وجہ سے صرف) باہمی ضد اضدی کی وجہ سے (اور اصلی وجہ ضد اضدی کی حبِ دُنیا ہوتی ہے، حبِ مال ہو یا حبِ جاہ، پس مدارِ علت مخالفتِ حق کا وہی حبِ دُنیا ٹھہری، اور یہی مضمون تھا سابق میں) پھر (یہ اِختلاف کفار کا کبھی اہلِ اِیمان کو مضر نہیں ہوا، بلکہ) اللہ تعالیٰ نے (ہمیشہ) اِیمان والوں کو وہ اَمرِ حق جس میں (مختلفین) اِختلاف کیا کرتے تھے بفضلہٖ تعالیٰ (رسولوں اور کتابوں پر اِیمان لانے کی بدولت) بتلادیا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو راہِ راست بتلادیتے ہیں۔

معارف ومسائل

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں تمام اِنسان ایک ہی مذہب وملت اور عقیدہ وخیال پر تھے، جو ملتِ حق اور دِینِ فطرت تھی، پھر اُن میں مزاج ومذاق اور رائے وفکر کے اِختلاف سے بہت سے مختلف خیالات وعقائد پیدا

ہوگئے، جن میں یہ اِمتیاز کرنا دُشوار تھا کہ ان میں حق کونسا ہے اور باطل کونسا، حق کو واضح کرنے اور صحیح راہِ حق بتلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام بھیجے اوران پر کتابیں اور وحی نازل فرمائی، انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد اور تبلیغ و اِصلاح کے بعد اِنسان دوگروہوں میں منقسم ہوگئے، ایک وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات کو قبول کیا اور انبیاء علیہم السلام کے متبع ہوگئے، جن کو ''مؤمن'' کہا جاتا ہے، دُوسرے وہ جنہوں نے آسمانی ہدایات اور اَنبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا، ان کی بات نہ مانی، یہ لوگ ''کافر'' کہلاتے ہیں۔ اس آیت کے پہلے جملہ میں اِرشاد ہے: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً اِمام راغب اصفہانیؒ نے ''مفردات القرآن'' میں فرمایا ہے کہ لفظ ''اُمّۃ'' عربی لغت کے اعتبار سے ہر ایسی جماعت کو کہا جاتا ہے جس میں کسی وجہ سے رابطہ و اِتحاد اور وحدت قائم ہو[1]، خواہ یہ وحدت نظریات وعقائد کی ہو، یا ایک زمانہ میں یا کسی ایک خطۂ ملک میں جمع ہونے کی، یا کسی دُوسرے علاقہ یعنی نسب، زبان، رنگ وغیرہ کی، مفہوم اس جملہ کا یہ ہے کہ کسی زمانہ میں تمام اِنسان باہم متفق ومتحد ایک جماعت تھے، اس میں دو باتیں قابلِ غور ہیں:-

اوّل یہ کہ اس جگہ وحدت سے کس قسم کی وحدت مراد ہے، دُوسرے یہ کہ وحدت کس زمانہ میں تھی۔ اَمرِ اوّل کا فیصلہ تو اسی آیت کے آخری جملہ نے کردیا، جس میں اس وحدت کے بعد اِختلاف واقع ہونے کا اور مختلف راہوں میں حق متعین کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے کا ذِکر ہے، کیونکہ یہ اِختلاف جس میں فیصلہ کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ نسب یا زبان یا رنگ یا وطن اور زمانہ کا اِختلاف نہ تھا، بلکہ نظریات اور عقائد وخیالات کا اِختلاف تھا، اسی کے مقابلہ سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں وحدت سے بھی وحدتِ فکر وخیال اور وحدتِ عقیدہ ومسلک مراد ہے۔

تو اَب مفہوم آیت کا یہ ہوگیا کہ ایک زمانہ ایسا تھا جبکہ تمام اَفرادِ اِنسانی صرف ایک ہی عقیدہ وخیال اور ایک ہی مذہب ومسلک رکھتے تھے، وہ عقیدہ ومسلک کیا تھا، اس میں دو اِحتمال ہیں، ایک یہ کہ سب عقیدۂ توحید و اِیمان پر متفق تھے، دُوسرے یہ کہ سب کفر وضلال پر متحد تھے، مگر جمہور مفسرین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ مراد عقائدِ صحیحہ، توحید و اِیمان پر سب کا متحد ہونا ہے، سورۂ یونس میں بھی اسی مضمون کی ایک آیت آئی ہے:-

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٩﴾ (یونس)

''یعنی سب آدمی ایک ہی اُمت تھے، پھر آپس میں اِختلاف پڑ گیا، اور اگر اللہ تعالیٰ کا یہ اَزلی فیصلہ نہ ہوتا (کہ اس عالمِ دُنیا میں حق وباطل، کھرا کھوٹا، سچ اور جھوٹ ملے جلے چلیں گے) تو قدرتِ اِلٰہیہ ان

---

[1] مفردات القرآن للأصفهاني ج:۱ ص:۲۳

سب جھگڑوں کا ایسا فیصلہ کر دیتی کہ حق سے اختلاف کرنے والوں کا نام ہی نہ رہتا۔''

اور سورۂ انبیاء میں فرمایا:-

إِنَّ هٰذِهٖٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ (الانبیآء)

''یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رَبّ ہوں، اس لئے سب میری ہی عبادت کرتے رہو۔''

اسی طرح سورۂ مؤمنون میں فرمایا:-

وَإِنَّ هٰذِهٖٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ﴿۵۲﴾ (المؤمنون)

''یعنی یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رَبّ ہوں، اس لئے مجھ سے ہی ڈرتے رہو۔''

ان تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ وحدت سے عقیدہ ومسلک کی وحدت اور دِینِ حق توحید وایمان میں سب کا متحد ہونا مراد ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ دِینِ حق اِسلام واِیمان پر تمام اِنسانوں کا اِتفاق واِتحاد کس زمانہ کا واقعہ ہے، یہ وحدت کہاں تک قائم رہی؟ مفسرین صحابہؓ میں سے حضرت اُبیّ بن کعبؓ اور ابن زیدؓ نے فرمایا کہ یہ واقعہ عالمِ اَزل کا ہے، جب تمام اِنسانوں کی اَرواح کو پیدا کر کے ان سے سوال کیا گیا تھا: أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ (الاعراف:۱۷۲) یعنی ''کیا میں تمہارا رَبّ نہیں ہوں'' اور سب نے بلا اِستثناء یہ جواب دیا تھا کہ بے شک آپ ہمارے رَبّ اور پروردگار ہیں، اس وقت تمام اَفرادِ اِنسانی ایک ہی عقیدۂ حقہ پر قائم تھے، جس کا نام اِیمان واِسلام ہے۔ (قرطبی) [1]

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ وحدتِ عقیدہ کا واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ آدم علیہ السلام مع اپنی زوجہ محترمہ کے دُنیا میں تشریف لائے، اور آپ کی اولاد ہوئی اور پھیلتی گئی، وہ سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام کے دِین اور انہی کی تعلیم وتلقین کے تابع توحید کے قائل تھے، اور سب کے سب باستثناء قابیل وغیرہ متبعِ شریعت وفرمانبردار تھے۔

مسندِ بزار میں حضرت ابنِ عباسؓ کے اس قول کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ وحدتِ عقیدہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت اِدریس علیہ السلام تک قائم رہی، اس وقت سب کے سب مسلم اور توحید کے معتقد تھے، اور آدم علیہ السلام اور اِدریس علیہ السلام کے درمیان زمانہ دس قرن ہے، بظاہر ''قرن'' سے ایک صدی مراد ہے، تو کل زمانہ ایک ہزار سال کا ہوگیا۔

اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ وحدتِ عقیدہ کا زمانہ وہ ہے جبکہ نوح علیہ السلام کی بددُعا سے دُنیا میں طوفان آیا، اور بجز اُن لوگوں کے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہوگئے تھے، باقی ساری دُنیا غرق ہوگئی تھی، طوفان

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۳ ص:۳۱

ختم ہونے کے بعد جتنے آدمی اُس دُنیا میں رہے وہ سب مسلمان موحد اور دینِ حق کے پیرو تھے۔ [1]

اور درحقیقت ان تینوں اقوال میں کوئی اِختلاف نہیں، یہ تینوں زمانے ایسے ہی تھے جن میں سارے اِنسان ملتِ واحدہ اور اُمتِ واحدہ بنے ہوئے دِینِ حق پر قائم تھے۔

آیت کے دُوسرے جملہ میں اِرشاد ہے: فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ یعنی ''پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو خوشی سناتے تھے اور ڈراتے تھے، اور ان کے ساتھ کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں اس غرض سے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں ان کے اُمورِ اِختلافیہ میں فیصلہ فرمادیں۔''

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اُوپر کے جملہ میں تمام اِنسانوں کا اُمتِ واحدہ اور ملتِ واحدہ ہونا بیان کیا تھا، اور اس جملہ میں اسی پر تفریع کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ہم نے انبیاء اور کتابیں بھیجی تاکہ اِختلاف کا فیصلہ کیا جائے، ان دونوں جملوں میں بظاہر جوڑ نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ انبیاء اور کتابوں کے بھیجنے کی علت لوگوں کا اِختلاف ہے، اور اِختلاف اس وقت تھا نہیں، مگر جواب بالکل واضح ہے کہ مراد آیتِ مذکورہ کی یہ ہے کہ ابتدائے عالم میں تمام اِنسان ایک ہی عقیدۂ حق کے قائل اور پابند تھے، پھر رفتہ رفتہ اِختلافات پیدا ہوگئے، اِختلافات پیدا ہونے کے بعد انبیاء علیہم السلام اور کتابیں بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔

اب ایک بات رہ جاتی ہے کہ اُوپر صرف اُمتِ واحدہ ہونے کا ذِکر کیا گیا، اِختلاف پیدا ہونے کا ذِکر کیوں نہیں کیا گیا، جو لوگ قرآنِ کریم کے اُسلوبِ حکیم پر کچھ نظر رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کا جواب مشکل نہیں، کہ قرآنِ کریم اَحوالِ ماضیہ کے بیان میں قصہ کہانی یا تاریخ کی کتابوں کے سارے قصہ کو کہیں نقل نہیں کرتا، بلکہ درمیان سے وہ حصہ حذف کردیتا ہے جو اس سیاقِ کلام سے خود بخود سمجھا جاسکے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جو قیدی رہا ہوکر آیا اور خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے یوسف علیہ السلام کے پاس بھیج دو، تو قرآن میں اس قیدی کی تجویز نقل کرنے کے بعد بات یہاں سے شروع ہوتی ہے: يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ (یوسف:۴۶) اس کا ذِکر نہیں کیا کہ بادشاہ نے اس کی تجویز کو پسند کیا، اور اس کو جیل خانے میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجا، وہ وہاں پہنچ کر ان سے مخاطب ہوا، کیونکہ پچھلے اور اگلے جملوں کے ملانے سے یہ ساری باتیں خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔

اسی طرح اس آیت میں وحدتِ ملت کے بعد اِختلاف واقع ہونے کا تذکرہ اس لئے ضروری نہیں سمجھا گیا کہ اِختلافات کا وقوع تو ساری دُنیا جانتی ہے، ہر وقت مشاہدہ میں آتا ہے، ضرورت اس اَمر کے اِظہار کی تھی کہ ان

---

[1] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: تفسير الطبری تحت هٰذه الآية ج:۴ ص:۲۷۵ وتفسير ابن كثير تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۵۲۹ وتفسير القرطبي تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۳۱

اِختلافاتِ کثیرہ سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی گزر چکا ہے جس میں سارے اِنسان ایک ہی مذہب وملت اور ایک ہی دِینِ حق کے پیرو تھے، اسی کو بیان فرمایا، پھر جو اِختلافات دُنیا میں پھیلے ہوئے اور سب کے مشاہدہ میں آرہے ہیں ان کے وقوع کا بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی، ہاں یہ بتلایا گیا کہ ان اِختلافات میں راہِ حق کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان حق تعالیٰ نے کیا فرمایا، اس کے متعلق اِرشاد ہوا: فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ، یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا جو دِینِ حق کا اِتباع کرنے والوں کو دائمی آرام وراحت کی خوش خبری اور اس سے اِعراض کرنے والوں کو عذابِ جہنم کی وعید سنادیں، اور ان کے ساتھ اپنی وحی اور کتابیں بھیجیں جو مختلف عقائد وخیالات میں سے صحیح اور حق کو واضح کرکے بتلادیں، اس کے بعد یہ اِرشاد فرمایا کہ انبیاء ورُسل اور آسمانی کتابوں کے کھلے ہوئے فیصلوں کے بعد بھی یہ دُنیا دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی، کچھ لوگوں نے ان ہدایاتِ واضحہ کو قبول نہ کیا، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ قبول نہ کرنے والے اوّل وہی لوگ ہوئے جن کے پاس یہ انبیاء اور آیاتِ اِلٰہیہ بھیجی گئی تھیں، یعنی اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ، اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں کوئی اِشتباہ یا اِلتباس کی گنجائش نہ تھی، کہ ان کی سمجھ میں نہ آئے یا غلط فہمی کا شکار ہوجائیں، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ جاننے بوجھنے کے باوجود ان لوگوں نے محض ضد اور ہٹ دھرمی سے اِنکار کیا۔

اور دُوسرا گروہ وہ ہوا جن کو اللہ تعالیٰ نے راہِ ہدایت پر لگادیا اور جس نے انبیاء ورُسل اور آسمانی کتابوں کے فیصلے ٹھنڈے دِل سے تسلیم کئے، انہیں دونوں گروہوں کا بیان قرآنِ کریم نے سورۂ تغابن میں اس طرح فرمایا ہے:-

خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (التغابن:۲)

"یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا، پھر تم میں سے کچھ کافر ومنکر ہوگئے کچھ مؤمن ومسلم۔"

خلاصۂ مضمون آیت كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً کا یہ ہے کہ پہلے دُنیا کے سب اِنسان دِینِ حق پر قائم تھے، پھر اِختلافِ طبائع سے اَغراض میں اِختلاف ہونا شروع ہوا، ایک عرصے کے بعد اعمال وعقائد میں اِختلاف کی نوبت آگئی، یہاں تک کہ حق وباطل میں اِلتباس ہونے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنی کتابیں راہِ حق کی ہدایت کرنے کے لئے اور اسی دِینِ حق پر دوبارہ قائم ہوجانے کے لئے بھیجیں جس پر سب اِنسان پہلے قائم تھے، لیکن ان سب ہدایاتِ واضحہ اور آیاتِ بینات کے ہوتے ہوئے کچھ لوگوں نے مانا اور کچھ لوگوں نے ضد اور عناد سے اِنکار واِنحراف کی راہ اِختیار کرلی۔

مسائل

مسئلہ:- اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں، اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو بہت سے انبیاء اور کتابیں دُنیا میں بھیجیں یہ سب اس واسطے تھیں کہ یہ لوگ جو دِینِ حق کی ملتِ واحدہ کو چھوڑ کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں، پھر اُن کو اسی

ملتِ واحدہ پر قائم کردیں، انبیاء کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا کہ جب لوگ اس راہِ حق سے بچلے تو ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی بھیجا، اور کتاب اُتاری کہ اس کے موافق چلیں، پھر کبھی بہکے تو دُوسرا نبی اور کتاب اللہ تعالیٰ نے اسی راہِ حق پر قائم کرنے کے لئے بھیج دیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے تندرستی ایک ہے اور بیماریاں بے شمار، جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے موافق دوا اور پرہیز مقرّر فرمایا، جب دُوسرا مرض پیدا ہوا تو دُوسری دوا اور پرہیز اس کے موافق بتلایا، اب آخر میں ایسا جامع نسخہ تجویز فرمایا جو ساری بیماریوں سے بچانے میں اس وقت تک کے لئے کامیاب ثابت ہو جب تک اس عالم کو باقی رکھنا منظور ہو، یہ مکمل اور جامع نسخہ، ایک جامع اُصولِ علاج سب پچھلے نسخوں کے قائم مقام اور آئندہ سے بے نیاز کرنے والا ہو، اور وہ نسخۂ جامع اِسلام ہے، جس کے لئے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن بھیجے گئے، اور پچھلی کتابوں میں تحریف ہوکر جو پچھلے انبیاء کی تعلیمات ضائع اور گم ہو جانے کا سلسلہ اُوپر سے چلا آیا تھا جس کے سبب نئے نبی اور نئی کتاب کی ضرورت پیش آتی تھی، اس کا یہ اِنتظام فرمادیا گیا کہ قرآنِ کریم کے تحریف سے محفوظ رہنے کا ذِمہ خود حق تعالیٰ نے لے لیا اور قرآنِ کریم کی تعلیمات کو قیامت تک ان کی اصلی صورت میں قائم اور باقی رکھنے کے لئے اللہ جل شانہٗ نے اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تاقیامت ایک ایسی جماعت قائم رکھنے کا وعدہ فرمالیا جو ہمیشہ دِینِ حق پر قائم رہ کر کتاب وسنت کی صحیح تعلیم مسلمانوں میں شائع کرتی رہے گی، کسی کی مخالفت وعداوت اُن پر اَثر اَنداز نہ ہوگی، اس لئے اس کے بعد دروازۂ نبوّت اور وحی کا بند ہو جانا ناگزیر اَمر تھا، آخر ختمِ نبوّت کا اِعلان کردیا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء اور ان کی مختلف کتابیں آنے سے کوئی اس دھوکہ میں نہ پڑ جائے کہ انبیاء اور کتابیں لوگوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے اور اِفتراق پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی ہیں، بلکہ منشا ان سب انبیاء اور کتابوں کا یہ ہے کہ جس طرح پہلے سارے اِنسان ایک ہی دِینِ حق کے پیرو ہوکر ملتِ واحدہ تھے، اسی طرح پھر اُسی دِینِ حق پر سب جمع ہو جائیں۔

مسئلہ:- دُوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مذہب کی بنا پر قومیت کی تقسیم مسلم وغیر مسلم کا دوقومی نظریہ عین منشائے قرآنی کے مطابق ہے، آیت: فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (التغابن: ۲) اس پر شاہد ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوگیا کہ اِسلام میں اس دوقومی نظریے کی اصل بنیاد درحقیقت صحیح متحدہ قومیت پیدا کرنے پر ہے جو اِبتدائے آفرینش میں قائم تھی، جس کی بنیاد وطنیت پر نہ تھی بلکہ عقیدۂ حق اور دِینِ حق کی پیروی پر تھی، ارشادِ قرآنی: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً نے بتلایا کہ اِبتدائے عالم میں اِعتقادِ صحیح اور دِینِ حق کی پیروی کے اِعتبار سے ایک صحیح اور حقیقی وحدتِ قومی قائم تھی، بعد میں لوگوں نے اِختلافات پیدا کئے، انبیاء نے لوگوں کو اسی اصلی وحدت کی طرف بلایا، جنہوں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ اس متحدہ قومیت سے کٹ گئے اور جداگانہ قوم قرار دیئے گئے۔

مسئلہ:- تیسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ اَزَل سے سنت اللہ یہی جاری ہے کہ برے لوگ ہر نبیؑ مبعوث کے خلاف اور ہر کتابِ الٰہی سے اِختلاف کو پسند کرتے رہے اور ان کے مقابلہ ومخالفت میں پورا زور خرچ کرنے کے لئے آمادہ رہے ہیں، تو اَب اہلِ اِیمان کو ان کی بدسلوکی اور فساد سے تنگدل نہ ہونا چاہئے، جس طرح کفار نے اپنے بڑوں کا طریقہ کفر وعناد اور انبیاء کی مخالفت کا اِختیار کیا، اسی طرح مؤمنین صالحین کو چاہئے کہ وہ اپنے بزرگوں کا یعنی انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ اِختیار کریں، کہ اُن لوگوں کی اِیذاؤں اور مخالفتوں پر صبر کریں، اور حکمت وموعظت اور نرمی کے ساتھ ان کو دِینِ حق کی طرف بلاتے رہیں، اور شاید اسی مناسبت سے اگلی آیت میں مسلمانوں کو مصائب وآفات پر تحمل اور صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا

کیا تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤگے حالانکہ تم پر نہیں گزرے حالات اُن لوگوں کے جیسے جو ہو چکے

مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ

تم سے پہلے کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور جھڑجھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

اور جو اُس کے ساتھ اِیمان لائے: کب آوے گی اللہ کی مدد، سن رکھو اللہ کی مدد قریب ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

(مسلمانو!) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں (یونہی) داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تمہیں اس جیسے حالات پیش نہیں آئے جیسے اُن لوگوں کو پیش آئے تھے جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ ان پر سختیاں اور تکلیفیں آئیں، اور انہیں ہلا ڈالا گیا، یہاں تک کہ رسول اور ان کے ایمان والے ساتھی بول اُٹھے کہ ''اللہ کی مدد کب آئے گی؟''، یاد رکھو! اللہ کی مدد نزدیک ہے۔ ﴿۲۱۴﴾

ربطِ آیات

اُوپر کی آیت میں کفار کا ہمیشہ سے انبیاء و مؤمنین کے ساتھ اِختلاف اور خلاف کرتے رہنا مذکور تھا، جس میں ایک گونہ مسلمانوں کو اس طور پر تسلی دینا بھی مقصود تھا جن کو اِستہزاءِ کفار سے اِیذا ہوتی تھی، کہ یہ خلاف تمہارے ساتھ نیا نہیں ہے، ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، آگے ان کفار مخالفین سے انبیاء و مؤمنین کو اَنواع اَنواع کی اِیذائیں اور شدائد پہنچنے کی حکایت بیان فرماتے ہیں، اور اس سے بھی مسلمانوں کو تسلی دِلاتے ہیں کہ تم کو بھی کفار سے جو اِیذائیں پہنچتی ہیں اُن پر صبر کرنا چاہئے، کیونکہ کامل راحت تو آخرت کی محنت ہی اُٹھانے سے ہے۔

خلاصۂ تفسیر

(دُوسری بات سنو) کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں (بے مشقت) جا داخل ہوگے، حالانکہ (ابھی کچھ مشقت تو اُٹھائی ہی نہیں، کیونکہ) تم کو ہنوز ان (مسلمان) لوگوں کا سا عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہوگزرے ہیں، ان پر (مخالفین کے سبب) ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں ہوئیں کہ (اس زمانہ کے) پیغمبر تک اور جو اُن کے ہمراہ اہلِ ایمان تھے (بے قرار ہوکر) بول اُٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی اِمداد (موعود) کب ہوگی (جس پر اُن کو جواب سے تسلی کی گئی کہ) یاد رکھو! بے شک اللہ تعالیٰ کی اِمداد (بہت) نزدیک (ہونے والی) ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:-

اوّل یہ کہ اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بغیر مشقت و محنت کے اور بغیر مصائب و آفات میں مبتلا ہوئے کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا، حالانکہ اِرشادات قرآنی اور اِرشادات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہگار محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مغفرت سے جنت میں داخل ہوں گے، اُن پر کوئی مشقت بھی نہ ہوگی، وجہ یہ ہے کہ مشقت و محنت کے درجات مختلف ہیں، ادنیٰ درجہ نفس و شیطان سے مزاحمت کر کے یا دِینِ حق کے مخالفین کے ساتھ مخالفت کر کے اپنے عقائد کا دُرست کرنا ہے، اور یہ ہر مؤمن کو حاصل ہے، آگے اوسط اور اعلیٰ درجات ہیں، جس درجہ کی محنت و مشقت ہوگی اسی درجہ کا دُخولِ جنت ہوگا، اس طرح محنت و مشقت سے خالی کوئی نہ رہا، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ۔ [1]

''سب سے زیادہ سخت بلائیں اور مصیبتیں انبیاء علیہم السلام کو پہنچتی ہیں، اُن کے بعد جو اُن کے قریب تر ہیں۔''

دُوسری بات یہاں قابلِ نظر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عرض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی، کسی شک وشبہ کی وجہ سے نہ تھا، جو اُن کی شان کے خلاف ہے، بلکہ اس سوال کا منشا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ مدد کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا وقت اور مقام متعین نہیں فرمایا، اس لئے حالتِ اِضطرار میں ایسے الفاظ عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مدد جلد بھیجی جائے، اور ایسی دُعا کرنا توکل یا منصبِ نبوّت کے منافی نہیں، بلکہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی اِلحاح وزاری کو پسند فرماتے ہیں، اس لئے انبیاء اور صلحائے اُمت اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ

تجھ سے پوچھتے ہیں: کیا چیز خرچ کریں؟ کہہ دو کہ جو کچھ تم خرچ کرو مال سو ماں باپ کے لئے

وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ

اور قرابت والوں کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافروں کے، اور جو کچھ کروگے تم بھلائی

فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢١٥﴾

سو وہ بے شک اللہ کو خوب معلوم ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ (اللہ کی خوشنودی کے لئے) کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو وہ والدین، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہونا چاہئے۔ اور تم بھلائی کا جو کام بھی کرو، اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ﴿٢١٥﴾

[1] جامع الترمذي، ابواب الزهد، باب في الصبر على البلاء ج:٢ ص:٦٥

خلاصۂ تفسیر

بارھواں حکم :- صدقہ کے مصارف

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (ثواب کے واسطے) کیا چیز خرچ کیا کریں (اور کس موقع پر صرف کیا کریں) آپ فرما دیجئے کہ جو مال تم کو صرف کرنا ہو سو (اس کی تعیین تو تمہاری ہمت پر ہے، مگر ہاں موقع ہم بتلائے دیتے ہیں کہ) ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافر کا، اور جونسا نیک کام کرو گے (خواہ راہِ خدا میں خرچ کرنا ہو یا اور کچھ ہو) سو اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ اس پر ثواب دیں گے)۔

معارف ومسائل

اس سے پہلی آیتوں میں مجموعی حیثیت سے یہ مضمون بہت تاکید کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ کفر ونفاق کو چھوڑ و اور اِسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، حکمِ اِلٰہی کے مقابل میں کسی کی بات مت سنو، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جان اور مال خرچ کیا کرو، اور ہر طرح کی شدّت اور تکلیف پر تحمل کرو۔ اب یہاں سے اسی اِطاعت وفرمانبرداری اور اللہ کی راہ میں جان ومال خرچ کرنے کے متعلق کچھ جزئیات کی تفصیل بیان ہوتی ہے، جو کہ مال اور جان اور دیگر معاملات مثل نکاح وطلاق وغیرہ کے متعلق ہیں، اور اُوپر سے جو سلسلۂ اَحکام ابوابُ البر کا جاری ہے اس میں داخل ہیں۔

اور ان جزئیات کا بیان بھی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے کہ اکثر ان میں سے وہ ہیں جن کے متعلق صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، ان کے اِستفتاء اور سوالات کا جواب براہِ راست عرشِ رحمٰن سے بواسطۂ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیا گیا، اس کو اگر یوں سمجھا جائے کہ حق تعالیٰ نے خود فتویٰ دیا تو یہ بھی صحیح ہے، اور قرآنِ کریم کی آیت: قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ (النساء:۱۲۷) میں صراحۃً حق تعالیٰ نے فتویٰ دینے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، اس لئے اس نسبت میں کوئی اِستبعاد بھی نہیں۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ فتاویٰ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جو آپ کو بذریعۂ وحی تلقین کئے گئے ہیں، بہرحال اس رُکوع میں جو اَحکامِ شرعیہ صحابہ کرامؓ کے چند سوالات کے جواب میں بیان ہوئے ہیں، وہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، پورے قرآن میں اس طرح سوال وجواب کے انداز سے خاص اَحکام تقریباً سترہ جگہ میں آئے ہیں، جن میں سے سات تو اسی جگہ سورۂ بقرہ میں ہیں، ایک سورۂ مائدہ میں، ایک سورۂ اَنفال میں، یہ نو سوالات تو صحابہ کرامؓ کی طرف سے ہیں، سورۂ اَعراف میں دو اور سورۂ بنی اِسرائیل، سورۂ کہف، سورۂ طٰهٰ، سورۂ نازعات میں ایک ایک، یہ کل چھ سوال کفار کی

طرف سے ہیں، جن کا جواب قرآن میں "جواب" کے عنوان سے دیا گیا ہے۔

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی جماعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے بہتر نہیں دیکھی کہ دین کے ساتھ انتہائی شغف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت وتعلق کے باوجود انہوں نے سوالات بہت کم کیے، کل تیرہ مسائل میں سوال کیا ہے، جن کا جواب قرآن میں دیا گیا ہے، کیونکہ یہ حضرات بے ضرورت سوال نہ کرتے تھے۔ (قرطبی) [1]

متذکرہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں صحابہ کرامؓ کا استفتاء یعنی سوال ان الفاظ سے نقل فرمایا گیا ہے: يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ، یعنی "لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں" یہی سوال اس رُکوع میں تین آیتوں کے بعد پھر انہی الفاظ کے ساتھ دُہرایا گیا: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ (البقرۃ:۲۱۹) لیکن اس ایک ہی سوال کا جواب آیتِ متذکرہ میں کچھ اور دیا گیا ہے، اور تین آیتوں کے بعد آنے والے سوال کا جواب اور ہے۔

اس لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب کس حکمت پر مبنی ہیں، یہ حکمت اُن حالات وواقعات میں غور کرنے سے واضح ہوجاتی ہے جن میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، مثلاً آیتِ متذکرہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ عمرو بن جموحؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ: "مَا نُنْفِقُ مِنْ اَمْوَالِنَا وَاَيْنَ نَضَعُهَا" (اخرجه ابن المنذر، مظهری) یعنی "ہم اپنے اموال میں سے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں۔" اور ابنِ جریرؒ کی روایت کے موافق یہ سوال تنہا عمرو بن جموحؓ کا نہیں تھا، بلکہ عام مسلمانوں کا سوال تھا، اس سوال کے دو جزو ہیں، ایک یہ کہ مال میں سے کیا اور کتنا خرچ کریں، دُوسرے یہ کہ اس کا مصرف کیا ہو، کن لوگوں کو دیں۔

اور دُوسری آیت جو دو آیتوں کے بعد اسی سوال پر مشتمل ہے، اس کا شانِ نزول بروایت ابنِ ابی حاتمؒ [2] یہ ہے کہ جب قرآن میں مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا کہ اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں، تو چند صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ انفاق فی سبیل اللہ کا جو حکم ہمیں ملا ہے، ہم اس کی وضاحت چاہتے ہیں، کہ کیا مال اور کونسی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں۔ اس سوال میں صرف ایک ہی جزء ہے، یعنی کیا خرچ کریں، اس طرح ان دونوں سوالوں کی نوعیت کچھ مختلف ہوگئی کہ پہلے سوال میں کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں، کا سوال تھا، اور دُوسرے میں صرف کیا خرچ کریں کا سوال ہے، اور پہلے سوال کے جواب میں جو کچھ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کے دُوسرے جزء کو یعنی کہاں خرچ کریں زیادہ اہمیت دے کر اس کا جواب تو صریح طور پر دیا گیا، اور

---

[1] تفسير القرطبي تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۴۰

[2] تفسير ابن ابي حاتم رقم الحديث: ۲۰۵۱، ۲۰۵۲ ج:۲ ص:۸۳

پہلے جز یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر دے دینا کافی سمجھا گیا۔ اب الفاظِ قرآنی میں دونوں اجزاء پر نظر فرمائیں، پہلے جزء یعنی ''کہاں خرچ کریں'' کے متعلق اِرشاد ہوتا ہے: مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ یعنی ''جو کچھ بھی تم کو اللہ کے لئے خرچ کرنا ہو اس کے مستحق ماں باپ اور رشتہ دار اور بے باپ کے بچے اور مساکین اور مسافر ہیں۔''

اور دُوسرے جزء یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر ان الفاظ سے دیا گیا: وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾ یعنی ''تم جو کچھ بھلائی کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے۔'' اِشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر کوئی تحدید اور پابندی نہیں کہ مال کی اتنی ہی مقدار صرف کرو، بلکہ جو کچھ بھی اپنی اِستطاعت کے موافق خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا اجر وثواب پاؤ گے۔

الغرض پہلی آیت میں شاید سوال کرنے والوں کے پیشِ نظر زیادہ اہمیت اسی سوال کی ہو کہ ہم جو مال خرچ کریں، اس کا مصرف کیا ہو، کہاں خرچ کریں، اسی لئے اس کے جواب میں اہمیت کے ساتھ مصارف بیان فرمائے گئے، اور کیا خرچ کریں، اس سوال کا جواب ضمنی طور پر دے دینا کافی سمجھا گیا، اور بعد والی آیت میں سوال صرف اتنا ہی تھا کہ ہم کیا چیز اور کیا مال خرچ کریں، اس لئے اس کا جواب اِرشاد ہوا: قُلِ الْعَفْوَ ؕ (البقرۃ:۲۱۹) یعنی آپ فرمادیں کہ جو کچھ بچے اپنی ضروریات سے وہ خرچ کیا کریں، ان دونوں آیتوں سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے کے متعلق چند ہدایات ومسائل معلوم ہوئے۔

مسئلہ:- اوّل یہ کہ دونوں آیتیں زکوٰۃ فرض کے متعلق نہیں، کیونکہ زکوٰۃ فرض کے لئے تو نصابِ مال بھی مقرّر ہے، اور اس میں جتنی مقدار خرچ کرنا فرض ہے، وہ بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے پوری طرح متعین ومقرّر فرمادی گئی ہے، ان دونوں آیتوں میں نہ کسی نصابِ مال کی قید ہے، نہ خرچ کرنے کی مقدار بتلائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں آیتیں صدقاتِ نافلہ کے متعلق ہیں، اس سے یہ شبہ بھی رفع ہوگیا کہ پہلی آیت میں خرچ کا مصرف والدین کو بھی قرار دِیا گیا ہے، حالانکہ ماں باپ کو زکوٰۃ دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق جائز نہیں، کیونکہ ان آیتوں کا تعلق فریضۂ زکوٰۃ سے ہے ہی نہیں۔

مسئلہ:- دُوسری ہدایت اس آیت سے یہ حاصل ہوئی کہ ماں باپ اور دُوسرے اعزاء واَقرباء کو جو کچھ بطورِ ہدیہ دیا یا کھلایا جاتا ہے اگر اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کی نیت ہو تو وہ بھی موجبِ اجر وثواب اور اِنفاق فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔

مسئلہ:- تیسری ہدایت یہ حاصل ہوئی کہ نفلی صدقات میں اس کی رعایت ضروری ہے کہ جو مال اپنی ضروریات

سے زائد ہو وہی خرچ کیا جائے، اپنے اہل وعیال کو تنگی میں ڈال کر اور ان کے حقوق کو تلف کر کے خرچ کرنا ثواب نہیں، اسی طرح جس کے ذمہ کسی کا قرض ہے، قرض خواہ کو اَدا نہ کرے اور نفلی صدقات وخیرات میں اُڑائے، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، پھر ضروریات سے زائد مال کے خرچ کرنے کا جو اِرشاد اس آیت میں ہے اس کو حضرت ابوذر غفاریؓ اور بعض دُوسرے حضرات نے حکم وجوبی قرار دِیا کہ اپنی ضروریات سے زائد مال زکوٰۃ اور تمام حقوق ادا کرنے کے بعد بھی اپنی مِلک میں جمع رکھنا جائز نہیں، ضروریات سے زائد جو کچھ ہے سب کا صدقہ کر دینا واجب ہے، مگر جمہور صحابہؓ وتابعینؒ اور ائمۂ دِینؒ اس پر ہیں کہ اِرشادِ قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہو وہ ضروریات سے زائد ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو اس کو صدقہ کر دینا ضروری یا واجب ہے، صحابہ کرامؓ کے تعامل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ

فرض ہوئی تم پر لڑائی اور وہ بری لگتی ہے تم کو، اور شاید کہ بری لگے تم کو ایک چیز اور وہ بہتر ہو

لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ

تمہارے حق میں، اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمہارے حق میں، اور اللہ جانتا ہے اور تم

لَا تَعْلَمُوْنَ ۟ؑ ﴿۲۱۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ ۲۶ ع ۱۰

نہیں جانتے۔ تجھ سے پوچھتے ہیں مہینہ حرام کو کہ اس میں لڑنا کیسا؟ کہہ دے: اس میں لڑائی

كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ

بڑا گناہ ہے، اور روکنا اللہ کی راہ سے اور اس کو نہ ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا

اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ

اس کے لوگوں کو وہاں سے، اس سے بھی زیادہ گناہ ہے اللہ کے نزدیک، اور لوگوں کو دِین سے بچلانا قتل سے بھی بڑھ کر ہے،

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ

اور کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ تم کو پھیر دیں تمہارے دِین سے اگر قابو پاویں، اور جو کوئی

يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

پھرے تم میں سے اپنے دِین سے پھر مرجاوے حالتِ کفر ہی میں تو ایسوں کے ضائع ہوئے عمل

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢١٧﴾ اِنَّ

دُنیا اور آخرت میں، اور وہ لوگ رہنے والے ہیں دوزخ میں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور لڑے اللہ کی راہ میں وہ

يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢١٨﴾

اُمیدوار ہیں اللہ کی رحمت کے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

تم پر (دُشمنوں سے) جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے، اور وہ تم پر گراں ہے۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو بُرا سمجھو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں بُری ہو۔ اور (اصل حقیقت تو) اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے۔ ﴿٢١٦﴾ لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں جنگ کرنا کیسا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اس میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے، مگر لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا، اس کے خلاف کفر کی رَوِش اختیار کرنا، مسجدِ حرام پر بندش لگانا اور اس کے باسیوں کو وہاں سے نکال باہر کرنا اللہ کے نزدیک زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ سنگین چیز ہے۔ اور یہ (کافر) تم لوگوں سے برابر جنگ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو یہ تم کو تمہارا دِین چھوڑنے پر آمادہ کردیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی شخص اپنا دِین چھوڑ دے، اور کافر ہونے کی

حالت ہی میں مرے، تو ایسے لوگوں کے اعمال دُنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ دوزخ والے ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔(۲۱۷) (اس کے برخلاف) جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا، تو وہ بیشک اللہ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔(۲۱۸)

خلاصۂ تفسیر

تیرہواں حکم:- فرضیتِ جہاد

جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو (طبعًا) گراں (معلوم ہوتا) ہے، اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی بات کو گراں سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں خیر (اور مصلحت) ہو، اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی اَمر کو مرغوب سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی (کا) ہو، اور (ہر شے کی حقیقتِ حال کو) اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے (اچھے برے کا فیصلہ اپنی خواہش کی بنیاد پر نہ کرو، جو کچھ اللہ کا حکم ہو جائے، اسی کو اِجمالاً مصلحت سمجھ کر اس پر کاربند رہا کرو)۔

چودہواں حکم:- تحقیقِ قتال دَر شہرِ حرام

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہؓ کا ایک سفر میں اِتفاق سے کفار کے ساتھ مقابلہ ہو گیا، ایک کافر اُن کے ہاتھ سے مارا گیا، اور جس روز یہ قصہ ہوا رَجب کی پہلی تاریخ تھی، مگر صحابہؓ اس کو جمادی الاخریٰ کی تیس سمجھتے تھے، اور رَجب اَشہرِ حرم میں سے ہے، کفار نے اس واقعہ پر طعن کیا کہ مسلمانوں نے شہرِ حرام کی حرمت کا بھی خیال نہیں کیا، مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، اور بعض روایات میں ہے کہ خود بعض کفارِ قریش نے بھی حاضر ہو کر اِعتراضاً سوال کیا، اس کا جواب اِرشاد ہوتا ہے):-

لوگ آپ سے شہرِ حرام میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اس میں خاص طور پر (یعنی عمداً) قتال کرنا جرمِ عظیم ہے (مگر مسلمانوں سے یہ فعل بالقصد صادر نہیں ہوا، بلکہ تاریخ کی تحقیق نہ ہونے کے سبب غلطی سے ایسا ہو گیا، یہ تو تحقیقی جواب ہے) اور (اِلزامی جواب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کا تو کسی طرح منہ ہی نہیں مسلمانوں پر اِعتراض کرنے کا، کیونکہ اگرچہ شہرِ حرام میں لڑنا جرمِ عظیم ہے، لیکن ان کفار کی جو حرکتیں ہیں یعنی) اللہ تعالیٰ کی راہ (دِین)

سے (لوگوں کو) روک ٹوک کرنا (یعنی مسلمان ہونے پر تکلیفیں پہنچانا کہ ڈر کے مارے لوگ مسلمان نہ ہوں) اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجدِ حرام (یعنی کعبہ) کے ساتھ کفر کرنا (کہ وہاں بہت سے بت رکھ چھوڑے تھے، اور بجائے خدا کی عبادت کے ان کی عبادت اور طواف کرتے تھے) اور جو لوگ مسجدِ حرام کے اہل تھے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دُوسرے مؤمنین) ان کو (تنگ اور پریشان کرکے) اس (مسجدِ حرام) سے خارج (ہونے پر مجبور) کردینا (جس سے نوبت ہجرت یعنی ترکِ وطن کی پہنچی، سو یہ حرکتیں شہرِ حرام میں قتال کرنے سے بھی زیادہ) جرمِ عظیم ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک (کیونکہ یہ حرکتیں دِینِ حق کے اندر فتنہ پردازی کرنا ہے) اور (ایسی) فتنہ پردازی کرنا (اس) قتل (خاص) سے (جو مسلمانوں سے صادر ہوا) بدرجہا (قباحت میں) بڑھ کر ہے (کیونکہ اس قتل سے دِینِ حق کو تو کوئی مضرت نہیں پہنچی بہت سے بہت اگر کوئی جان کر کرے خود ہی گنہگار ہوگا، اور ان حرکتوں سے تو دِینِ حق کو ضرر پہنچتا ہے کہ اس کی ترقی رُکتی ہے) اور یہ کفار تمہارے ساتھ ہمیشہ جنگ (وجدال کا سلسلہ جاری ہی) رکھیں گے، اس غرض سے کہ اگر (خدا نہ کرے) قابو پاویں تو تم کو تمہارے دین (اسلام) سے پھیر دیں (ان کے اس فعل سے دِین کی مزاحمت ظاہر ہے)۔

انجامِ اِرتداد

اور جو شخص تم میں سے اپنے دِین (اسلام) سے پھر جاوے، پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مرجاوے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دُنیا اور آخرت میں سب غارت ہوجاتے ہیں (اور) یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

(شہرِ حرام میں قتال کرنے کے بارے میں مسلمانوں کو جوابِ مذکور سن کر گناہ نہ ہونے کا تو اِطمینان ہوگیا تھا، مگر اس خیال سے دِل شکستہ تھے کہ ثواب تو ہوا ہی نہ ہوگا، آگے اس میں تسلی کی گئی۔)

وعدۂ ثواب بر اِخلاصِ نیت

حقیقۃً جو لوگ اِیمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ترکِ وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو، ایسے لوگ تو رحمتِ خداوندی کے اُمیدوار ہوا کرتے ہیں (اور تم لوگوں میں یہ صفات علی السبیل منع الخلو موجود ہیں، چنانچہ اِیمان اور ہجرت تو ظاہر ہے، رہا اس جہادِ خاص میں شبہ ہوسکتا ہے، سو چونکہ تمہاری نیت تو جہاد ہی کی تھی، لہٰذا ہمارے نزدیک بھی وہ جہاد ہی میں شمار ہے، پھر ان صفات کے ہوتے ہوئے تم کیوں نا اُمید ہوتے ہو) اور اللہ تعالیٰ (اس غلطی کو) معاف کردیں گے اور (اِیمان و جہاد و ہجرت کی وجہ سے تم پر) رحمت کریں گے۔

معارف و مسائل

بعض اَحکامِ جہاد

مسئلہ:- مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں جہاد کے فرض ہونے کا حکم ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ، یعنی ''تم پر جہاد فرض کیا گیا'' ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد ہر مسلمان پر ہر حالت میں فرض ہے، بعض آیاتِ قرآنی اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ فرضِ عین کے طور پر ہر ہر مسلم پر عائد نہیں، بلکہ فرضِ کفایہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اس فرض کو اَدا کردے تو باقی مسلمان سبکدوش سمجھے جائیں گے، ہاں کسی زمانہ یا کسی ملک میں کوئی جماعت بھی فریضۂ جہاد اَدا کرنے والی نہ رہے تو سب مسلمان ترکِ فرض کے گنہگار ہو جائیں گے۔ حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشاد: "اَلْجِهَادُ مَاضٍ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ"[1] کا یہ مطلب ہے کہ ''قیامت تک ایسی جماعت کا موجود رہنا ضروری ہے جو فریضۂ جہاد اَدا کرتی رہے'' قرآن مجید کی دُوسری آیت میں اِرشاد ہے:-

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ (النساء:۹۵)

''یعنی اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو تارکینِ جہاد پر فضیلت دی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دونوں سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔''

اس میں ایسے لوگوں سے جو کسی عذر کے سبب یا کسی دُوسری دِینی خدمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہوں اُن سے بھی بھلائی کا وعدہ مذکور ہے، ظاہر ہے کہ اگر جہاد ہر فردِ مسلم پر فرضِ عین ہوتا تو اس کے چھوڑنے والوں سے وعدۂ حسنیٰ یعنی بھلائی کا وعدہ ہونے کی صورت نہ تھی۔

اسی طرح ایک دُوسری آیت میں ہے:-

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَاۗىِٕفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ (التوبہ:۱۲۲)

''اور کیوں نہ نکل کھڑی ہوئی تمہاری ہر بڑی جماعت میں سے چھوٹی جماعت اس کام کے لئے کہ وہ دِین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں۔''

اس میں خود قرآنِ کریم نے یہ تقسیمِ عمل پیش فرمائی کہ کچھ مسلمان جہاد کا کام کریں، اور کچھ تعلیمِ دِین میں مشغول

[1] المعجم الأوسط للطبراني رقم الحديث: ۴۹۳۱

رہیں، اور یہ جبھی ہوسکتا ہے جبکہ جہاد فرضِ عین نہ ہو بلکہ فرضِ کفایہ ہو۔

نیز صحیح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرکتِ جہاد کی اِجازت چاہی تو آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں زندہ ہیں، آپ نے فرمایا کہ ''پھر جاؤ، ماں باپ کی خدمت کرکے جہاد کا ثواب حاصل کرو۔''[1] اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے، جب مسلمانوں کی ایک جماعت فریضۂ جہاد کو قائم کئے ہوئے ہو تو باقی مسلمان دُوسری خدمتوں اور کاموں میں لگ سکتے ہیں، ہاں اگر کسی وقت اِمامُ المسلمین ضرورت سمجھ کر نفیرِ عام کا حکم دے اور سب مسلمانوں کو شرکتِ جہاد کی دعوت دے تو پھر جہاد سب پر فرضِ عین ہوجاتا ہے، قرآنِ کریم نے سورۂ توبہ میں اِرشاد فرمایا:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ (التوبہ:۳۸)

''اے مسلمانو! تمہیں کیا ہوگیا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم بوجھل بن جاتے ہو۔''

اس آیت میں اسی نفیرِ عام کا حکم مذکور ہے، اسی طرح اگر خدانخواستہ کسی وقت کفار کسی اِسلامی ملک پر حملہ آور ہوں اور مدافعت کرنے والی جماعت ان کی مدافعت پر پوری طرح قادر اور کافی نہ ہو تو اُس وقت بھی یہ فریضہ اس جماعت سے متعدی ہوکر پاس والے سب مسلمانوں پر عائد ہوجاتا ہے، اور اگر وہ بھی عاجز ہوں تو ان کے پاس والے مسلمانوں پر، یہاں تک کہ پوری دُنیا کے ہر ہر فردِ مسلم پر ایسے وقت جہاد فرضِ عین ہوجاتا ہے، قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات کے مطالعہ سے جمہور فقہاء و محدثین نے یہ حکم قرار دِیا ہے کہ عام حالات میں جہاد فرضِ کفایہ ہے۔

مسئلہ:- اسی لئے جب تک جہاد فرضِ کفایہ ہو، اولاد کو بغیر ماں باپ کی اِجازت کے جہاد میں جانا جائز نہیں۔

مسئلہ:- جس شخص کے ذمہ کسی کا قرض ہو اس کے لئے جب تک قرض ادا نہ کردے اس فرضِ کفایہ میں حصہ لینا دُرست نہیں، ہاں اگر کسی وقت نفیرِ عام کے سبب یا کفار کے نرغہ کے باعث جہاد سب پر فرضِ عین ہوجائے تو اس وقت نہ والدین کی اِجازت شرط ہے، نہ شوہر کی اور نہ قرض خواہ کی۔ اس آیت کے آخر میں جہاد کی ترغیب کے لئے اِرشاد فرمایا ہے کہ جہاد اگرچہ طبعی طور پر تمہیں بھاری معلوم ہو، لیکن خوب یاد رکھو کہ اِنسانی بصیرت و دانش مندی اور تدبیر و محنت عواقب و نتائج کے بارے میں بکثرت فیل ہوتی ہے، کسی مفید کو مضر، یا مضر کو مفید سمجھ لینا بڑے سے بڑے ہوشیار، عقل مند سے بھی مستبعد نہیں، ہر اِنسان اگر اپنی عمر میں پیش آنے والے وقائع پر نظر ڈالے تو اپنی ہی زندگی میں اس کو بہت سے واقعات ایسے نظر پڑیں گے کہ وہ کسی چیز کو نہایت مفید سمجھ کر حاصل کر رہے تھے، اور اَنجامِ کار یہ معلوم ہوا کہ وہ اِنتہائی مضر تھی، یا کسی چیز کو نہایت مضر سمجھ کر اس سے اِجتناب کر رہے تھے، اور اَنجامِ کار یہ معلوم ہوا کہ وہ نہایت مفید تھی، اِنسانی عقل و تدبیر کی رُسوائی

[1] صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب الجهاد بإذن الأبوين ج:۱ ص:۴۲۱ وصحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب بر الوالدين ...إلخ ج:۲ ص:۳۱۳

اس معاملہ میں بکثرت مشاہدہ میں آتی رہتی ہے ؎

خویش را دیدم و رسوائی خویش [1]

اس لئے فرمایا کہ جہاد و قتال میں اگرچہ بظاہر مال اور جان کا نقصان نظر آتا ہے، لیکن جب حقائق سامنے آئیں گے تو کھلے گا کہ یہ نقصان ہرگز نقصان نہ تھا، بلکہ سراسر نفع اور دائمی راحت کا سامان تھا۔

اَشہرِ حرم میں قتال کا حکم

آیاتِ مذکورہ میں سے دُوسری آیت اس پر شاہد ہے کہ اَشہرِ حرم یعنی چار مہینے: رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم میں قتال حرام ہے، اسی طرح قرآنِ کریم کی متعدّد آیتوں میں پوری تصریح کے ساتھ اَشہرِ حرم میں قتال کی ممانعت آئی ہے، مثلاً: مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڏ (التوبہ:۳۶) اور حجۃ الوداع کے معروف و مشہور خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، ثَلَاثٌ مُتَوَالِيَاتٌ وَرَجَبُ مُضَرُ“۔ [2]

ان آیات و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ چار مہینوں میں قتال حرام ہے، اور یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہے۔

اور اِمامِ تفسیر عطاء بن ابی رباحؒ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ یہ حکم ہمیشہ کے لئے باقی ہے، اور بھی متعدّد حضراتِ تابعین اس حکم کو ثابت، غیر منسوخ قرار دیتے ہیں، مگر جمہور فقہاء کے نزدیک اور بقول جصّاصؒ عام فقہائے امصار کے مسلک پر یہ حکم منسوخ ہے، اب کسی مہینہ میں قتال ممنوع نہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اس کا ناسخ کونسی آیت ہے، اس میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں، بعض نے فرمایا کہ آیتِ کریمہ: وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً (التوبہ:۳۶) اس کی ناسخ ہے، اور اکثر حضرات نے آیت: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبہ:۵) کو ناسخ قرار دِیا ہے، اور لفظ حَيْثُ کو اس جگہ زمانے کے معنی میں لیا ہے کہ مشرکین کو جس مہینے اور جس زمانے میں پاؤ قتل کردو۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس حکم کا ناسخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل ہے کہ خود آپ نے طائف کا محاصرہ اَشہرِ حرم میں فرمایا، اور حضرت عامر اشعری کو اَشہرِ حرم ہی میں ”اوطاس“ کے جہاد کے لئے بھیجا، اسی بنا پر عامہ فقہاء اس حکم کو منسوخ قرار دیتے ہیں، جصّاصؒ نے فرمایا: ”وَهُوَ قَوْلُ فُقَهَاءِ الْاَمْصَارِ“۔ [3]

رُوح المعانی نے اسی آیت کے تحت میں اور بیضاوی نے سورۂ براءت کے پہلے رُکوع کی تفسیر میں اَشہرِ حرم میں

---

[1] ترجمہ:- میں نے اپنے آپ کو بھی دیکھا اور اپنی رُسوائی کو بھی دیکھا۔

[2] صحيح البخاري، كتاب الأضاحي، باب من قال الأضحىٰ يوم النحر ج:۲ ص:۸۳۳۔ ترجمہ:- یعنی چار مہینے قابلِ احترام ہیں، تین تو مسلسل ہیں اور ایک رجب کا مہینہ ہے۔

[3] احكام القرآن للجصّاص ج:۱ ص:۳۲۲

حرمتِ قتال کے منسوخ ہونے پر اِجماعِ اُمت نقل کیا ہے (بیان القرآن)، [۱] مگر تفسیر مظہری میں مذکورہ تمام دلائل کا جواب یہ دیا ہے کہ اَشہرِ حرم کی حرمت کی تصریح خود اس آیت میں موجود ہے جس کو آیۃ السیف کہا جاتا ہے، یعنی: اِنَّ عِدَّۃَ الشُّھُوْرِ عِنْدَ اللّٰہِ اثْنَا عَشَرَ شَھْرًا فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْھَآ اَرْبَعَۃٌ حُرُمٌ (التوبہ:۳۶) اور یہ آیت آیاتِ قتال میں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے، اور خطبہ حجۃ الوداع جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف اسّی روز پہلے ہوا ہے اس میں بھی اَشہرِ حرم کی حرمت کی تصریح موجود ہے، اس لئے آیات متذکرہ کو اس کا ناسخ نہیں کہا جاسکتا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرۂ طائف ذُو القعدہ میں نہیں، شوال میں ہوا ہے، اس لئے اس کو بھی ناسخ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اَشہرِ حرم میں قتال کی حرمتِ مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کردی گئی ہے کہ خود کفار ان مہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دِفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصہ کو منسوخ کہا جاسکتا ہے، جس کی تصریح اس آیت میں ہے: اَلشَّھْرُ الْحَرَامُ بِالشَّھْرِ الْحَرَامِ الآیہ۔ (البقرۃ:۱۹۴) [۲]

تو خلاصہ یہ ہوا کہ اِبتداءً قتال تو ان مہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار اِن مہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعانہ قتال کی مسلمانوں کو بھی اِجازت ہے، جیسا کہ اِمام جصاصؒ نے بروایت حضرت جابر بن عبداللہؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہرِ حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی اِبتدا کفار کی طرف سے نہ ہوجائے۔ [۳]

انجامِ اِرتداد

آیتِ مذکورہ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الشَّھْرِ الْحَرَامِ کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و اِرتداد اِختیار کرنے کا یہ حکم ذِکر فرمایا ہے کہ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ یعنی ''ان لوگوں کے اعمال دُنیا و آخرت میں سب غارت ہوجائیں گے۔''

مسئلہ:- دُنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہے کہ اس کی بی بی نکاح سے نکل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے، اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، حالتِ اِسلام میں نماز، روزہ جو کچھ کیا تھا سب کالعدم ہوجاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی، مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات میں ثواب نہیں ملتا، ابدالآباد کے لئے دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔

---

[۱] رُوح المعانی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۱۰۸، وتفسیر البیضاوی ج:۱ ص:۲۴۸

[۲] تفسیر المظہری تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۲۶۳

[۳] احکام القرآن للجصّاصؒ ج:۱ ص:۳۲۱

مسئلہ:- اگر یہ شخص پھر مسلمان ہوجاوے تو آخرت میں دوزخ سے بچنے اور دُنیا میں آئندہ کے لئے اَحکامِ اِسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دُنیا میں اگر حج کرچکا تو بشرطِ وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزے کے ثواب کا عود کرنا نہ کرنا اس میں اِختلاف ہے، اِمام ابوحنیفہؒ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گزشتہ نماز و روزے پر ثواب ملنے کے قائل نہیں، اور اِمام شافعیؒ دونوں اَمر میں اِختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ:- لیکن جو کافرِ اَصلی ہو، اور اس حالت میں کوئی نیک کام کرلے اس کا ثواب معلق رہتا ہے، اگر کبھی اِسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مرگیا تو سب بیکار جاتا ہے، حدیث میں "اَسْلَمْتَ عَلٰی مَا اَسْلَفْتَ مِنْ خَیْرٍ" [1] اسی معنی میں وارِد ہے۔

مسئلہ:- غرض مرتد کی حالت کافرِ اَصلی سے بدتر ہے، اسی واسطے کافرِ اَصلی سے جزیہ قبول ہوسکتا ہے، اور مرتد اگر اِسلام نہ لاوے، اگر مرد ہے قتل کردیا جاتا ہے، اگر عورت ہو تو دوامِ حبس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اِسلام کی اہانت ہوئی ہے، سرکاری اہانت اسی سزا کے لائق ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم شراب کا اور جوے کا، کہہ دے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی لوگوں کو،

وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ

اور اُن کا گناہ بہت بڑا ہے اُن کے فائدے سے۔

آسان ترجمۂ قرآن

لوگ آپ سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ بھی ہے، اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں، اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان حکم عمل الکافر إذا أسلم بعده ج:۱ ص:۷۶۔ ترجمہ:- جو نیک کام تم نے زمانۂ جاہلیت میں کئے تھے وہ حالتِ اِسلام میں باقی ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

پندرہواں حکم :- متعلقہ شراب وقمار

لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں (چیزوں کے اِستعمال) میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی (پیدا ہو جاتی) ہیں اور لوگوں کو (بعضے) فائدے بھی ہیں اور (وہ) گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں (اس لئے دونوں قابلِ ترک ہیں)۔

معارف ومسائل

صحابہ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور جوے کے متعلق صحابہ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہے، یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور اَحکام سنئے :-

حرمتِ شراب اور اُس کے متعلقہ اَحکام

اِبتدائے اِسلام میں عام رُسومِ جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو اہلِ مدینہ میں بھی شراب اور قمار یعنی جوا کھیلنے کا رِواج تھا، عام لوگ تو ان دونوں چیزوں کے صرف ظاہری فوائد کو دیکھ کر اُن پر فریفتہ تھے، ان کے اندر جو بہت سے مفاسد اور خرابیاں ہیں اُن کی طرف نظر نہیں تھی، لیکن عادۃُ اللہ یہ بھی ہے کہ ہر قوم اور ہر خطہ میں کچھ عقل والے بھی ہوتے ہیں، جو طبیعت پر عقل کو غالب رکھتے ہیں، کوئی طبعی خواہش اگر عقل کے خلاف ہو تو وہ اس خواہش کے پاس نہیں جاتے، اس معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تو بہت ہی بلند تھا، کہ جو چیز کسی وقت حرام ہونے والی تھی آپ کی طبیعت اس سے پہلے ہی نفرت کرتی تھی، صحابہ کرامؓ میں بھی کچھ ایسے حضرات تھے جنہوں نے حلال ہونے کے زمانے میں بھی کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد چند حضراتِ صحابہؓ کو ان کے مفاسد کا زیادہ اِحساس ہوا، حضرت فاروقِ اعظمؓ اور معاذ بن جبلؓ اور چند اَنصاری صحابہؓ اسی اِحساس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ شراب اور قمار اِنسان کی عقل کو بھی خراب کرتے ہیں اور مال بھی برباد کرتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا اِرشاد ہے، اس سوال کے جواب میں آیتِ مذکورہ نازل ہوئی، یہ پہلی آیت ہے جس میں شراب اور جوے سے مسلمانوں کو روکنے کا اِبتدائی قدم اُٹھایا گیا۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ شراب اور جوے میں اگرچہ لوگوں کے کچھ ظاہری فوائد ضرور ہیں، لیکن ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں، جو ان کے منافع اور فوائد سے بڑھی ہوئی ہیں، اور گناہ کی باتوں سے وہ چیزیں مراد ہیں جو کسی گناہ کا سبب بن جائیں، مثلاً شراب میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ عقل و ہوش زائل ہو جاتا ہے جو تمام کمالات اور شرفِ اِنسانی کا اصلِ اُصول ہے، کیونکہ عقل ہی ایک ایسی چیز ہے جو اِنسانوں کو برے کاموں سے روکتی ہے، جب وہ نہ رہی تو ہر برے کام کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

اس آیت میں صاف طور پر شراب کو حرام تو نہیں کہا گیا، مگر اس کی خرابیاں اور مفاسد بیان کر دیئے گئے، کہ شراب کی وجہ سے اِنسان بہت سے گناہوں اور خرابیوں میں مبتلا ہو سکتا ہے، گویا اس کے ترک کرنے کے لئے ایک قسم کا مشورہ دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض صحابہ کرامؓ تو اس مشورہ ہی کو قبول کر کے اسی وقت شراب چھوڑ بیٹھے، اور بعض نے یہ خیال کیا کہ اس آیت نے شراب کو حرام تو کیا نہیں، بلکہ مفاسدِ دِینی کا سبب بننے کی وجہ سے اس کو سببِ گناہ قرار دِیا ہے، ہم اس کا اِہتمام کریں گے کہ وہ مفاسد واقع نہ ہوں، تو پھر شراب میں کوئی حرج نہیں، اس لئے پیتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک روز یہ واقعہ [1] پیش آیا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ میں سے چند اپنے دوستوں کی دعوت کی، کھانے کے بعد حسبِ دستور شراب پی گئی، اسی حال میں نمازِ مغرب کا وقت آ گیا، سب نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، تو ایک صاحب کو اِمامت کے لئے آگے بڑھایا، انہوں نے نشہ کی حالت میں جو تلاوت شروع کی تو سورۂ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کو غلط پڑھا، اس پر شراب سے روکنے کے لئے دُوسرا قدم اُٹھایا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (النساء:۴۳)

"یعنی اے ایمان والو! تم نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ۔"

اس میں خاص اوقاتِ نماز کے اندر شراب کو قطعی طور پر حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اِجازت رہی، جن حضراتِ صحابہؓ نے پہلی آیت نازل ہونے کے وقت شراب کو نہ چھوڑا تھا، اس آیت کے نازل ہونے کے وقت شراب کو مطلقاً ترک کر دیا کہ جو چیز اِنسان کو نماز سے روکے اُس میں کوئی خیر نہیں ہو سکتی، جب نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت ہو گئی تو ایسی چیز کے پاس نہ جانا چاہئے جو اِنسان کو نماز سے محروم کر دے، مگر چونکہ علاوہ اوقاتِ نماز کے شراب کی حرمت صاف طور پر اَب بھی نازل نہیں ہوئی تھی، اس لئے کچھ حضرات اب بھی اوقاتِ نماز کے علاوہ دُوسرے اوقات میں پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک اور واقعہ پیش آیا، عتبان بن مالکؓ نے چند صحابہ کرامؓ کی دعوت کی، جن میں سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے، کھانے کے بعد حسبِ دستور شراب کا دور چلا، نشہ کی حالت میں عرب کی عام عادت کے مطابق شعر و شاعری اور اپنے اپنے

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الأشربة، باب تحریم الخمر ج:۲ ص:۵۱۷

مفاخر کا بیان شروع ہوا، سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک قصیدہ پڑھا، جس میں انصارِ مدینہ کی ہجو اور اپنی قوم کی مدح وثنا تھی، اس پر ایک انصاری نوجوان کو غصہ آ گیا، اور اُونٹ کے جبڑے کی ہڈی سعد رضی اللہ عنہ کے سر پر دے ماری، جس سے ان کو شدید زخم آ گیا، حضرت سعدؓ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس انصاری جوان کی شکایت کی، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی: "اَللّٰهُمَّ بَيِّنْ لَنَا فِي الْخَمْرِ بَيَانًا شَافِيًا" یعنی "یا اللہ! شراب کے بارے میں ہمیں کوئی واضح بیان اور قانون عطا فرما دے" اس پر شراب کے متعلق تیسری آیت سورۂ مائدہ کی مفصل نازل ہوگئی، جس میں شراب کو مطلقاً حرام قرار دے دیا گیا،[1] آیت یہ ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ﴿٩١﴾ (المائدۃ)

"یعنی اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت اور جوے کے تیر، یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں، سو اس سے بالکل الگ الگ رہو، تاکہ تم کو فلاح ہو۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعے تمہارے آپس میں بغض اور عداوت پیدا کر دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے، سو کیا اب بھی باز آؤ گے۔"

حرمتِ شراب کے تدریجی اَحکام

اَحکامِ اِلٰہیہ کی اصلی اور حقیقی حکمتوں کو تو اَحکم الحاکمین ہی جانتا ہے، مگر اَحکامِ شرعیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ اِسلام نے اَحکام میں اِنسانی جذبات کی بڑی رعایت فرمائی ہے، تاکہ اِنسان کو ان کے اِتباع میں زیادہ تکلیف نہ ہو، خود قرآنِ کریم نے فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (البقرۃ:۲۸۶) یعنی "اللہ تعالیٰ کسی اِنسان کو ایسا حکم نہیں دیتا جو اس کی قدرت اور وسعت میں نہ ہو۔" اسی رحمت وحکمت کا تقاضا تھا کہ اِسلام نے شراب کے حرام کرنے میں بڑی تدریج سے کام لیا۔

شراب کی تدریجی ممانعت اور حرمت کی قرآنی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں شراب کے متعلق چار آیتیں نازل ہوئی ہیں، جن کا ذِکر اُوپر آ چکا ہے، ان میں سے ایک آیت سورۂ بقرہ کی ہے جس کی تفسیر آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، اس میں تو شراب سے پیدا ہو جانے والے گناہوں اور مفاسد کا ذِکر کر کے چھوڑ دیا گیا ہے، حرام نہیں کیا، گویا

[1] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، فضل سعد بن ابی وقاصؓ ج:۲ ص: ۲۸۱

ایک مشورہ دیا کہ یہ چھوڑنے کی چیز ہے، مگر چھوڑنے کا حکم نہیں دیا۔

دُوسری آیت سورۂ نساء کی: لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى (النساء: ۴۳) میں خاص اوقاتِ نماز کے اندر شراب کو حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اِجازت رہی۔

تیسری اور چوتھی دو آیتیں سورۂ مائدہ کی ہیں، جو اُوپر مذکور ہو چکی ہیں، ان میں صاف اور قطعی طور پر شراب کو حرام قرار دے دیا۔

شریعتِ اِسلام نے شراب کے حرام کرنے میں اس تدریج سے اس لئے کام لیا کہ عمر بھر کی عادت خصوصاً نشہ کی عادت کو چھوڑ دینا طبیعت پر اِنتہائی شاق اور گراں ہوتا، علماء نے فرمایا: "فِطَامُ الْعَادَةِ اَشَدُّ مِنْ فِطَامِ الرَّضَاعَةِ" یعنی "جیسے بچے کو ماں کا دُودھ پینے کی عادت چھوڑ دینا بھاری معلوم ہوتا ہے، اِنسان کو اپنی کسی عادتِ مستمرہ کو بدلنا اس سے زیادہ شدید اور سخت ہے۔" اس لئے اِسلام نے حکیمانہ اُصول کے مطابق اوّل اس کی برائی ذہن نشین کرائی، پھر نمازوں کے اوقات میں ممنوع کیا، پھر ایک خاص مدّت کے بعد قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔

ہاں جس طرح اِبتداءً تحریمِ شراب میں آہستگی اور تدریج سے کام لینا حکمت کا تقاضا تھا، اسی طرح حرام کر دینے کے بعد اس کی ممانعت کے قانون کو پوری شدّت کے ساتھ نافذ کرنا بھی حکمت ہی کا تقاضا تھا، اسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں اوّل سخت وعیدیں عذاب کی بتلائیں، اِرشاد فرمایا کہ یہ اُمّ الخبائث اور اُمّ الفواحش ہے، اس کو پی کر آدمی برے سے برے گناہ کا مرتکب ہوسکتا ہے۔

ایک حدیث میں اِرشاد فرمایا کہ شراب اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے، یہ روایتیں نسائی میں ہیں، اور جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی: ۱- نچوڑنے والا، ۲- بنانے والا، ۳- پینے والا، ۴- پلانے والا، ۵- اس کو لاد کر لانے والا، ۶- اور جس کے لئے لائی جائے، ۷- اور اس کا بیچنے والا، ۸- خریدنے والا، ۹- اس کو ہبہ کرنے والا، ۱۰- اس کی آمدنی کھانے والا۔[1] اور پھر صرف زبانی تعلیم وتبلیغ پر اِکتفا نہیں فرمایا، بلکہ عملی اور قانونی طور پر اِعلان فرمایا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب موجود ہو اس کو فلاں جگہ جمع کر دے۔

صحابہؓ میں تعمیلِ حکم کا بے مثال جذبہ

فرمانبردار صحابہ کرامؓ نے پہلا حکم پاتے ہی اپنے اپنے گھروں میں جو شراب اِستعمال کے لئے رکھی تھی اُس کو تو اسی

[1] جامع الترمذی، ابواب البیوع، باب ما جاء فی بیع الخمر والنهی عن ذلك ج:۱ ص:۲۴۲

وقت بہادیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے مدینہ کی گلیوں میں یہ آواز دی کہ شراب حرام کردی گئی ہے تو جس کے ہاتھ میں جو برتن شراب کا تھا اس کو وہیں پھینک دیا، جس کے پاس کوئی سبو یا خم شراب کا تھا اس کو گھر سے باہر لاکر توڑ دیا۔ حضرت انسؓ اُس وقت ایک مجلس میں دورِ جام کے ساقی بنے ہوئے تھے، ابوطلحہ، ابوعبیدہ بن جراح، اُبیّ بن کعب، سہیل رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہ موجود تھے، منادی کی آواز کان میں پڑتے ہی سب نے کہا کہ اب یہ شراب سب گرادو، اس کے جام وسبو توڑ دو۔ بعض روایات میں ہے کہ اعلانِ حرمت کے وقت جس کے ہاتھ میں جامِ شراب لبوں تک پہنچا ہوا تھا اُس نے وہیں سے اس کو پھینک دیا۔[1] مدینہ میں اُس روز شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کی رَو کا پانی، اور مدینہ کی گلیوں میں عرصۂ دراز تک یہ حالت رہی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کی بو اور رَنگ مٹی میں نکھر آتا تھا۔

جس وقت اُن کو یہ حکم ملا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب ہے وہ فلاں جگہ جمع کردے، اس وقت صرف وہ ذخیرے کچھ رہ گئے تھے جو مالِ تجارت کی حیثیت سے بازار میں تھے، اُن کو فرمانبردار صحابہ کرامؓ نے بلاتأمل مقرّرہ جگہ پر جمع فرمادیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس تشریف لے گئے، اور اپنے ہاتھ سے شراب کے بہت سے مشکیزوں کو چاک کردیا، اور باقی دُوسرے صحابہ کرامؓ کے حوالے کرکے چاک کرادیا۔ ایک صحابی جو شراب کی تجارت کرتے تھے اور ملکِ شام سے شراب لینے کے لئے گئے ہوئے تھے، اور جب یہ تجارتی مال لے کر واپس ہوئے تو مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُن کو اعلانِ حرمت کی خبر مل گئی، جاں نثار صحابی نے اپنے پورے سرمائے اور محنت کی حاصلات کو جس سے بڑے نفع کی اُمیدیں لئے ہوئے آرہے تھے اعلانِ حرمت سن کر اسی جگہ ایک پہاڑی پر ڈال دیا، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوال کیا کہ اب میرے اس مال کے متعلق کیا حکم ہے، اور مجھ کو کیا کرنا چاہئے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمانِ خداوندی کے مطابق حکم دے دیا کہ سب مشکیزوں کو چاک کرکے شراب بہادو، فرمانبردار محبِّ خدا ورسول نے بلاکسی جھجک کے اپنے ہاتھ سے اپنا پورا سرمایہ زمین پر بہادیا۔ یہ بھی اِسلام کا ایک معجزہ اور صحابہ کرامؓ کی حیرت انگیز و بے مثال اِطاعت ہے جو اس واقعہ میں ظاہر ہوئی، کہ جس چیز کی عادت ہوجائے سب جانتے ہیں کہ چھوڑنا سخت دُشوار ہے، اور یہ حضرات بھی اس کے ایسے عادی تھے کہ تھوڑی دیر اس سے صبر کرنا دُشوار تھا، ایک حکمِ الٰہی اور فرمانِ نبوی نے ان کی عادات میں ایسا عظیم الشان اِنقلاب برپا کردیا کہ اب یہ شراب اور جوے سے ایسے ہی متنفر ہیں، جیسے اس سے پہلے ان کے عادی تھے۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الأشربة، باب نزل تحريم الخمر وهي من البسر والتمر ج:٢ ص:٨٣٦

اِسلامی سیاست اور عام ملکی سیاستوں کا فرقِ عظیم

مذکورہ آیات پھر واقعات میں حرمتِ شراب کے حکم پر مسلمانوں کے عمل کا ایک نمونہ سامنے آ گیا ہے، جس کو اِسلام کا معجزہ کہو یا پیغمبرانہ تربیت کا بے مثال اثر، یا اِسلامی سیاست کا لازمی نتیجہ کہ نشہ کی عادت جس کے چھوڑنے کا اِنتہائی دُشوار ہونا ہر شخص کو معلوم ہے، اور عرب میں اس کا رِواج اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ چند گھنٹے اس کے بغیر صبر نہیں کر سکتے تھے، وہ کیا چیز تھی جس نے ایک ہی اِعلان کی آواز کان میں پڑتے ہی ان سب کے مزاجوں کو بدل ڈالا، اُن کی عادتوں میں وہ اِنقلاب پیدا کر دیا کہ اب سے چند منٹ پہلے جو چیز اِنتہائی مرغوب بلکہ زندگی کا سرمایہ تھی وہ چند منٹ کے بعد اِنتہائی مبغوض اور فحش و ناپاک ہوگئی۔

اس کے بالمقابل آج کی ترقی یافتہ سیاست کی ایک مثال کو سامنے رکھ لیجئے کہ اب سے چند سال پہلے امریکا کے ماہرینِ صحت اور سماجی مصلحین نے جب شراب نوشی کی بے شمار اور اِنتہائی مہلک خرابیوں کو محسوس کر کے ملک میں شراب نوشی کو قانوناً ممنوع کرنا چاہا تو اس کے لئے اپنے نشر و اشاعت کے وہ نئے سے نئے ذرائع جو اس ترقی یافتہ سیاست کا بڑا کمال سمجھے جاتے ہیں سب ہی شراب نوشی کے خلاف ذہن ہموار کرنے پر لگا دیئے، سینکڑوں اخبارات اور رسائل اس کی خرابیوں پر مشتمل ملک میں لاکھوں کی تعداد میں شائع کئے گئے، پھر امریکی دستور میں ترمیم کر کے اِمتناعِ شراب کا قانون نافذ کیا گیا، مگر ان سب کا اثر جو کچھ امریکا میں آنکھوں نے دیکھا، اور وہاں کے اربابِ سیاست کی رپورٹوں سے دُنیا کے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اس ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ قوم نے اس ممانعتِ قانونی کے زمانے میں عام زمانوں کی نسبت بہت زیادہ شراب اِستعمال کی، یہاں تک کہ مجبور ہو کر حکومت کو اپنا قانون منسوخ کرنا پڑا۔

عرب مسلمانوں اور موجودہ ترقی یافتہ امریکنوں کے حالات و معاملات کا یہ عظیم فرق تو ایک حقیقت اور واقعہ ہے جس کا کسی کو اِنکار کرنے کی گنجائش نہیں، یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس عظیم الشان فرق کا اصلی سبب اور راز کیا ہے۔

ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ شریعتِ اِسلام نے صرف قانون کو قوم کی اِصلاح کے لئے کبھی کافی نہیں سمجھا، بلکہ قانون سے پہلے ان کی ذہنی تربیت کی اور عبادت و زہادت اور فکرِ آخرت کے کیمیاوی نسخے سے ان کے مزاجوں میں ایک بڑا اِنقلاب لا کر ایسے افراد پیدا کر دیئے جو رسول کی آواز پر اپنی جان و مال آبرو سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، مکی زندگی کے پورے دور میں یہی افراد سازی کا کام ریاضتوں کے ذریعے ہوتا رہا، جب جاں نثاروں کی جماعت تیار ہوگئی اس وقت قانون جاری کیا گیا، ذہنوں کو ہموار کرنے کے لئے تو امریکا نے بھی اپنے بے مثال ذرائع

اِستعمال کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ان کے سامنے سب کچھ تھا مگر فکرِ آخرت نہیں تھی، اور مسلمانوں کے رگ و پے میں فکرِ آخرت سماوئی ہوئی تھی۔

کاش! آج بھی ہمارے عقلاء اس نسخۂ کیمیا کو اِستعمال کر کے دیکھیں تو دُنیا کو امن و سکون نصیب ہو جائے۔

شراب کے مفاسد اور فوائد میں موازنہ

اس آیت میں شراب اور قمار دونوں کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ بتلایا ہے کہ ان دونوں میں کچھ مفاسد بھی ہیں اور کچھ فوائد بھی، مگر اس کے مفاسد فوائد سے بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر نظر ڈالی جائے کہ ان کے فوائد کیا ہیں اور مفاسد کیا، اور پھر یہ کہ فوائد سے زیادہ مفاسد ہونے کے کیا وجوہ ہیں، آخر میں چند فقہی ضابطے بیان کئے جائیں گے جو اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں۔

پہلے شراب کو لے لیجئے، اس کے فوائد تو عام لوگوں میں مشہور و معروف ہیں کہ اس سے لذت و فرحت حاصل ہوتی ہے، اور وقتی طور پر قوّت میں اِضافہ ہو جاتا ہے، رنگ صاف ہو جاتا ہے، مگر ان حقیر وقتی فوائد کے مقابلے میں اس کے مفاسد اتنے کثیر و وسیع اور گہرے ہیں کہ شاید کسی دُوسری چیز میں اتنے مفاسد اور مضرات نہ ہوں گے، بدنِ اِنسانی پر شراب کے مضرات یہ ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ معدے کے فعل کو فاسد کر دیتی ہے، کھانے کی خواہش کم کر دیتی ہے، چہرے کی ہیئت بگاڑ دیتی ہے، پیٹ بڑھ جاتا ہے، مجموعی حیثیت سے تمام قویٰ پر یہ اثر ہوتا ہے جو ایک جرمن ڈاکٹر نے بیان کیا ہے کہ: ''جو شخص شراب کا عادی ہو، چالیس سال کی عمر میں اس کے بدن کی ساخت ایسی ہو جاتی ہے جیسے ساٹھ سالہ بوڑھے کی۔'' وہ جسمانی، اور قوّت کے اِعتبار سے سٹھیائے ہوئے بوڑھوں کی طرح ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شراب جگر اور گردوں کو خراب کر دیتی ہے، ''سل'' کی بیماری شراب کا خاص اثر ہے، یورپ کے شہروں میں ''سل'' کی کثرت کا بڑا سبب شراب ہی کو بتلایا جاتا ہے، وہاں کے بعضے ڈاکٹروں کا قول ہے کہ یورپ میں آدھی اموات مرضِ سل میں ہوتی ہیں، اور آدھی دُوسرے امراض میں، اور اس بیماری کی کثرت یورپ میں اسی وقت سے ہوئی جب سے وہاں شراب کی کثرت ہوئی۔

یہ تو شراب کی جسمانی اور بدنی مضرتیں ہیں، اب عقل پر اس کی مضرت کو تو ہر شخص جانتا ہے، مگر صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ شراب پی کر جب تک نشہ رہتا ہے اُس وقت تک عقل کام نہیں کرتی، لیکن اہلِ تجربہ اور ڈاکٹروں کی تحقیق یہ ہے کہ نشہ کی عادت خود قوّتِ عاقلہ کو بھی ضعیف کر دیتی ہے، جس کا اثر ہوش میں آنے کے بعد بھی رہتا ہے، بعض اوقات جنون تک اس کی نوبت پہنچ جاتی ہے، اطباء اور ڈاکٹروں کا اِتفاق ہے کہ شراب نہ جزوِ بدن بنتی ہے اور نہ اس سے خون بنتا ہے جس کی وجہ سے بدن میں طاقت آئے، بلکہ اس کا فعل صرف یہ ہوتا ہے کہ خون میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے، جس سے وقتی طور پر

قوّت کی زیادتی محسوس ہونے لگتی ہے، اور یہی خون کا دفعۃً ہیجان بعض اوقات اچانک موت کا سبب بھی بن جاتا ہے، جس کو ڈاکٹر ہارٹ فیل ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔

شراب سے شرائین یعنی وہ رگیں جن کے ذریعے سارے بدن میں رُوح پہنچتی ہے سخت ہوجاتی ہے جس سے بڑھاپا جلدی آجاتا ہے، شراب کا اثر اِنسان کے حلقوم اور تنفس پر بھی خراب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آواز بھاری ہوجاتی ہے، اور کھانسی دائمی ہوجاتی ہے، اور وہی آخر کار ''سل'' تک نوبت پہنچادیتی ہے، شراب کا اثر نسل پر بھی برا پڑتا ہے، شرابی کی اولاد کمزور رہتی ہے اور بعض اوقات اس کا نتیجہ قطعِ نسل تک پہنچتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شراب پینے کی اِبتدائی حالت میں بظاہر اِنسان اپنے جسم میں چستی وچالاکی اور قوّت محسوس کرتا ہے، اسی لئے بعض لوگ جو اس میں مبتلا ہوتے ہیں وہ ان طبّی حقائق کا اِنکار کرتے ہیں، لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ شراب کا یہ زہر ایسا زہر ہے جس کا اثر تدریجی طور پر ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد یہ سب مضرتیں مشاہدے میں آجاتی ہیں جن کا ذِکر کیا گیا ہے۔

شراب کا ایک بڑا مفسدۂ تمدنی یہ ہے کہ وہ اکثر لڑائی جھگڑے کا سبب بنتی ہے، اور پھر یہ بغض وعداوت دُور تک اِنسان کو نقصان پہنچاتی ہے، شریعتِ اِسلام کی نظر میں یہ مفسدہ سب سے بڑا ہے، اس لئے قرآن نے سورۂ مائدہ میں خصوصیت کے ساتھ اس مفسدہ کا ذِکر فرمایا ہے: اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ (المائدۃ:۹۱) یعنی ''شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعے تمہارے آپس میں بغض وعداوت پیدا کردے۔''

شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ مدہوشی کے عالم میں بعض اوقات آدمی اپنا پوشیدہ راز بیان کرڈالتا ہے، جس کی مضرت اکثر بڑی تباہ کن ہوتی ہے، خصوصاً وہ اگر کسی حکومت کا ذمہ دار آدمی ہے اور رَاز بھی حکومت کا رَاز ہے، جس کے اِظہار سے پورے ملک میں اِنقلاب آسکتا ہے اور ملکی سیاست اور جنگی مصالح سب برباد ہوجاتے ہیں، ہوشیار جاسوس ایسے مواقع کے منتظر رہتے ہیں۔

شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ وہ اِنسان کو ایک کھلونا بنادیتی ہے، جس کو دیکھ کر بچے بھی ہنستے ہیں، کیونکہ اس کا کلام اور اس کی حرکات سب غیر متوازن ہوجاتی ہیں۔ شراب کا ایک عظیم تر مفسدہ یہ ہے کہ وہ اُمّ الخبائث ہے، اِنسان کو تمام برے سے برے جرائم پر آمادہ کردیتی ہے، زِنا اور قتل اکثر اس کے نتائج ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ عام شراب خانے زِنا اور قتل کے اَڈّے ہوتے ہیں، یہ شراب کی جسمانی مضرتیں ہیں۔ اور اس کی رُوحانی مضرت تو ظاہر ہی ہے کہ نشہ کی حالت میں نہ نماز ہوسکتی ہے نہ اللہ کا ذِکر، نہ اور کوئی عبادت، اسی لئے قرآنِ کریم میں شراب کی مضرت کے بیان میں فرمایا: وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ (المائدۃ:۹۱) یعنی ''شراب تم کو ذِکر اللہ اور نماز سے روکتی ہے۔''

اب مالی مضرت اور نقصان کا حال سنئے جس کو ہر شخص جانتا ہے، کسی بستی میں اگر ایک شراب خانہ کھل جاتا ہے تو وہ پوری بستی کی دولت کو سمیٹ لیتا ہے، اس کی قسمیں بے شمار ہیں، اور بعض اَقسام تو بے حد گراں ہیں، بعض اَعداد و شمار لکھنے والوں نے صرف ایک شہر میں شراب کا مجموعی خرچہ پوری مملکتِ فرانس کے مجموعی خرچ کے برابر بتلایا ہے۔

یہ شراب کے دِینی، دُنیوی، جسمانی اور رُوحانی مفاسد کی مختصر فہرست ہے، جس کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلمہ میں اِرشاد فرمایا ہے کہ وہ ''اُمّ الخبائث'' [1] یا ''اُمّ الفواحش'' ہے۔ جرمنی کے ایک ڈاکٹر کا یہ مقولہ ضربُ المثل کی طرح مشہور ہے کہ اس نے کہا کہ اگر آدھے شراب خانے بند کردیئے جائیں تو میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ آدھے شفاخانے اور آدھے جیل خانے بے ضرورت ہوکر بند ہوجائیں گے۔ (تفسیر المنار لمفتی عبدہ ج:۲ ص:۲۲۶)

علامہ طنطاویؒ نے اپنی کتاب ''الجواہر'' میں اس سلسلے کی چند اہم معلومات لکھی ہیں، اُن میں سے بعض یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

ایک فرانسیسی محقق ہنری اپنی کتاب ''خواطر و سوانح فی الاسلام'' میں لکھتے ہیں:-

''بہت زیادہ مہلک ہتھیار جس سے اہلِ مشرق کی بیخ کنی کی گئی، اور وہ دودھاری تلوار جس سے مسلمانوں کو قتل کیا گیا ـــــ یہ شراب تھی ـــــ ہم نے الجزائر کے لوگوں کے خلاف یہ ہتھیار آزمایا، لیکن ان کی اِسلامی شریعت ہمارے راستے میں رُکاوَٹ بن کر کھڑی ہوگئی، اور وہ ہمارے اس ہتھیار سے متأثر نہیں ہوئے، اور نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کی نسل بڑھتی ہی چلی گئی، یہ لوگ اگر ہمارے اس تحفہ کو قبول کرلیتے جس طرح کہ اُن کے ایک منافق قبیلے نے اس کو قبول کرلیا ہے تو یہ بھی ہمارے سامنے ذلیل وخوار ہوجاتے، آج جن لوگوں کے گھروں میں ہماری شراب کے دور چل رہے ہیں وہ ہمارے سامنے اتنے حقیر و ذلیل ہوگئے ہیں کہ سر نہیں اُٹھا سکتے۔''

ایک انگریز قانون داں بنتام لکھتے ہیں کہ:-

''اِسلامی شریعت کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شراب حرام ہے، ہم نے دیکھا کہ جب افریقہ کے لوگوں نے اسے اِستعمال کرنا شروع کیا تو ان کی نسلوں میں پاگل پن سرایت کرنے لگا، اور یورپ کے جن لوگوں کو اس کا چسکا لگ گیا اُن کی بھی عقلوں میں تغیر آنے لگا، لہٰذا افریقہ کے لوگوں کے لئے بھی اس کی ممانعت ہونی چاہئے، اور یورپین لوگوں کو بھی اس پر شدید سزائیں دینی چاہئیں۔''

---

[1] سنن النسائی، کتاب الأشربة، باب ذکر الآثام المتولدة عن شرب الخمر ...إلخ ج:۲ ص:۳۳۰

غرض جس بھلے مانس نے بھی ٹھنڈے دِل سے غور کیا وہ بے اختیار پکار اُٹھا کہ یہ رِجس ہے، شیطانی عمل ہے، زہر ہے، تباہی اور بربادی کا ذریعہ ہے، اس اُمّ الخبائث سے باز آجاؤ، فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ [۱] (المائدۃ:۹۱)

شراب کی حرمت وممانعت کے متعلق قرآنِ کریم کی چار آیتوں کا بیان اُوپر آچکا ہے، سورۂ نحل میں ایک جگہ اور بھی نشہ کی چیزوں کا ذِکر ایک دُوسرے انداز سے آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی یہاں ذِکر کردیا جائے، تاکہ شراب ونشہ کے متعلق تمام قرآنی اِرشادات مجموعی طور پر سامنے آجائیں، وہ آیت یہ ہے:-

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ (النحل)

''اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم لوگ نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل ہے جو عقل رکھتے ہیں۔''

تشریح وتفسیر

پچھلی آیتوں میں حق تعالیٰ کی اُن نعمتوں کا ذِکر تھا جو اِنسانی غذائیں پیدا کرنے میں عجیب وغریب صنعت وقدرت کا مظہر ہیں، اس میں پہلے دُودھ کا ذِکر کیا، جس کو قدرت نے حیوان کے پیٹ میں خون اور فضلہ کی آلائشوں سے الگ کرکے صاف ستھری غذا اِنسان کے لئے عطا کردی، جس میں اِنسان کو کسی مزید صنعت کی ضرورت نہیں، اِسی لئے یہاں لفظ نُسْقِيْكُمْ (النحل:۶۶) اِستعمال فرمایا، کہ ہم نے دُودھ پلایا، اس کے بعد فرمایا کہ کھجور اور انگور کے کچھ پھلوں میں سے بھی اِنسان اپنی غذا اور نفع کی چیزیں بناتا ہے، اس میں اِشارہ اس طرف ہے کہ کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے اپنی غذا اور منفعت کی چیزیں بنانے میں اِنسانی صنعت کا کچھ دخل ہے، اور اسی دخل کے نتیجہ میں دو طرح کی چیزیں بنائی گئیں، ایک نشہ آور چیز، جس کو ''خمر'' یا ''شراب'' کہا جاتا ہے، دُوسری رزقِ حسن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تر وتازہ کھانے میں اِستعمال کریں یا خشک کرکے ذخیرہ کرلیں، مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے کھجور اور انگور کے پھل اِنسان کو دے دیئے، اور ان سے اپنی غذا وغیرہ بنانے کا اِختیار بھی دے دیا، اب یہ اس کا اِنتخاب ہے کہ اس سے کیا بنائے، نشہ آور چیز بناکر عقل کو خراب کرے یا غذا بناکر قوت حاصل کرے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت سے نشہ آور شراب کے حلال ہونے پر کوئی اِستدلال نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے اِستعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، جو ہر حال میں نعمتِ خداوندی ہے، جیسے تمام غذائیں

---

[۱] ترجمہ:- اب بتاؤ کہ کیا تم (ان چیزوں سے) باز آجاؤ گے؟

اور اِنسانی منفعت کی چیزیں کہ اُن کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی اِستعمال کرتے ہیں، مگر کسی کے غلط اِستعمال سے اصل نعمت، نعمت ہونے سے نہیں نکل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کونسا اِستعمال حلال ہے، کونسا حرام ہے، تاہم ایک لطیف اِشارہ اس میں بھی اس طرف کردیا کہ "سکر" کے مقابل "رزقِ حسن" رکھا، جس سے معلوم ہوا کہ سکر اچھا رزق نہیں، سکر کے معنی جمہور مفسرین [1] کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں۔ (رُوح المعانی، قرطبی، بصّاص) [2]

یہ آیات باتفاقِ اُمت مکی ہیں، اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، نزولِ آیات کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی اور مسلمان عام طور پر پیتے تھے، مگر اُس وقت بھی اس آیت میں اِشارہ اس طرف کردیا گیا کہ اس کا پینا اچھا نہیں، بعد میں صراحۃً شراب کو شدّت کے ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی اَحکام نازل ہوگئے۔ (هٰذا ملخص ما فی الجصّاص والقرطبی) [3]

حرمتِ قمار (جُوا)

"میسر" مصدر ہے، اور اصل لغت میں اس کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں، "یاسر" تقسیم کرنے والے کو کہا جاتا ہے، جاہلیتِ عرب میں مختلف قسم کے جوے رائج تھے جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اُونٹ ذبح کرکے اس کے حصے تقسیم کرنے میں جوا کھیلا جاتا تھا، بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے، بعض محروم رہتے تھے، محروم رہنے والے کو پورے اُونٹ کی قیمت ادا کرنا پڑتی تھی، گوشت سب فقراء میں تقسیم کیا جاتا، خود اِستعمال نہ کرتے تھے۔

اس خاص جوے میں چونکہ فقراء کا فائدہ اور جوا کھیلنے والوں کی سخاوت بھی تھی، اسی لئے اس کھیل کو باعثِ فخر سمجھتے تھے، جو اس میں شریک نہ ہوتا اس کو کنجوس اور منحوس کہتے تھے۔

تقسیم کی مناسبت سے قمار کو "میسر" کہا جاتا ہے، تمام صحابہؓ و تابعینؒ اس پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار یعنی جوے کی تمام صورتیں داخل اور سب حرام ہیں، ابنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور بصّاصؒ نے "اَحکام القرآن" میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابنِ عمرؓ اور قتادہؓ اور معاویہ بن صالحؒ اور عطاءؒ اور طاؤسؒ نے فرمایا:-

"اَلْمَيْسِرُ اَلْقِمَارُ حَتّٰى لُعَبِ الصِّبْيَانِ بِالْكِعَابِ وَالْجَوْزِ" یعنی "ہر قسم کا قمار میسر ہے، یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی کے گٹکوں اور اَخروٹ وغیرہ کے ساتھ۔"

---

[1] بعض علماء نے اس کے معنی "سرکہ" یا بے نشہ نبیذ کے بھی لئے ہیں (بصّاص، قرطبی) مگر اس جگہ اس اِختلاف کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ۱۲ منہ

[2] رُوح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۱۱، ۱۱۲ وتفسير القرطبی تحت سورة النحل:۶۷ ج:۱۰ ص:۱۲۸ واحکام القرآن للجصّاص، باب تحریم الخمر ج:۲ ص:۳۱۳، ۳۱۴

[3] بحوالۂ بالا۔

اور ابنِ عباسؓ نے فرمایا: "اَلْمُخَاطَرَةُ مِنَ الْقِمَارِ" یعنی "مخاطرہ قمار میں سے ہے" (جصّاص)، [1] ابنِ سیرینؒ نے فرمایا: جس کام میں مخاطرہ ہو وہ میسر میں داخل ہے۔ (رُوح البیان) [2]

"مخاطرہ" کے معنی ہیں کہ ایسا معاملہ کیا جائے جو نفع و ضرر کے درمیان دائر ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سا مال مل جائے اور یہ بھی کہ کچھ نہ ملے، جیسے آج کل کی لاٹری کے مختلف طریقوں میں پایا جاتا ہے، یہ سب قسمیں قمار اور میسر میں داخل اور حرام ہیں، اس لئے میسر یا قمار کی تعریف یہ ہے کہ جس معاملہ میں کسی مال کا مالک بنانے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود و عدم کی دونوں جانبیں مساوی ہوں، اور اسی بنا پر نفعِ خالص یا تاوانِ خالص برداشت کرنے کی دونوں جانبیں بھی برابر ہوں (شامی، کتاب الحظر والإباحۃ ج:۵ ص:۳۵۵)۔ مثلاً یہ بھی احتمال ہے کہ زید پر تاوان پڑ جائے، اور یہ بھی ہے کہ عمر پر پڑ جائے، اس کی جتنی قسمیں اور صورتیں پہلے زمانے میں رائج تھیں یا آج رائج ہیں یا آئندہ پیدا ہوں، وہ سب میسر اور قمار اور جوا کہلائے گا، معمے حل کرنے کا چلتا ہوا کاروبار اور تجارتی لاٹری کی عام صورتیں سب اس میں داخل ہیں، ہاں اگر صرف ایک جانب سے اِنعام مقرّر کیا جائے کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس کو یہ اِنعام ملے گا، اس میں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس شخص سے کوئی فیس وصول نہ کی جائے، کیونکہ اس میں معاملہ نفع و ضرر کے درمیان دائر نہیں، بلکہ نفع اور عدمِ نفع کے درمیان دائر ہے۔

اسی لئے احادیثِ صحیحہ میں شطرنج اور چوسر وغیرہ کو حرام قرار دِیا گیا ہے، جن میں مال کی ہار جیت پائی جاتی ہے، تاش پر اگر روپیہ کی ہار جیت ہو تو وہ بھی میسر میں داخل ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت بریدہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نردشیر (چوسر) کھیلتا ہے وہ گویا خنزیر کے گوشت اور خون میں اپنے ہاتھ رنگتا ہے۔ [3] اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شطرنج میسر یعنی جوے میں داخل ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا: شطرنج تو نردشیر سے بھی زیادہ بری ہے۔ (تفسیر ابنِ کثیر)

اِبتدائے اِسلام میں شراب کی طرح قمار بھی حلال تھا، مکہ میں جب سورۂ رُوم کی آیات: غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ نازل ہوئیں، اور قرآن نے خبر دی کہ اس وقت رُوم اگرچہ اپنے حریف کسریٰ سے مغلوب ہوگئے، لیکن چند سال بعد پھر رُومی غالب آجائیں گے، اور مشرکینِ مکہ نے اس کا اِنکار کیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان سے اسی طرح قمار کی شرط ٹھہرائی کہ اگر اتنے سال میں رُومی غالب آگئے تو اتنا مال تمہیں دینا پڑے گا، یہ شرط مان لی گئی، اور واقعہ قرآن کی خبر کے مطابق پیش

---

[1] احکام القرآن للجصّاص ج:۱ ص:۳۲۹

[2] تفسیر رُوح البیان ج:۱ ص:۲۳۰

[3] صحیح مسلم، کتاب الشعر، باب تحریم اللعب بالنردشیر ج:۲ ص:۲۴۰

آیا، تو ابو بکرؓ نے یہ مال وصول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، آپ نے اس واقعہ پر اظہارِ مسرت فرمایا مگر مال کو صدقہ کرنے کا حکم دے دیا۔

کیونکہ جو چیز آئندہ حرام ہونے والی تھی اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حلال ہونے کے زمانے میں بھی اس سے محفوظ فرما دیا تھا، اسی لئے شراب اور قمار سے ہمیشہ آپ نے اِجتناب کیا، اور خاص خاص صحابہ کرامؓ بھی ان چیزوں سے ہمیشہ محفوظ رہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جبریلِ امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جعفر طیارؓ کی چار خصلتیں زیادہ محبوب ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ سے پوچھا کہ آپ میں وہ چار خصلتیں کیا ہیں؟ عرض کیا کہ میں نے اس کا اِظہار اب تک کسی سے نہیں کیا تھا، مگر جبکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خبر دے دی ہے تو عرض کرتا ہوں کہ وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ میں نے دیکھا کہ شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے، اس لئے میں کبھی اس کے پاس نہیں گیا، اور میں نے بتوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کسی کا نفع وضرر نہیں، اس لئے جاہلیت میں بھی کبھی بت پرستی نہیں کی، اور مجھے چونکہ اپنی بیوی اور لڑکیوں کے معاملہ میں سخت غیرت ہے، اس لئے میں نے کبھی زِنا نہیں کیا، اور میں نے دیکھا کہ جھوٹ بولنا دنائت اور رذالت کی بات ہے اس لئے کبھی جہالت میں بھی جھوٹ نہیں بولا۔ (رُوح البیان) [1]

قِمار کے سماجی اور اِجتماعی نقصانات

قمار یعنی جوے کے متعلق بھی قرآنِ کریم نے وہی اِرشاد فرمایا جو شراب کے متعلق آیا ہے، کہ اس میں کچھ منافع بھی ہیں، مگر نفع سے اس کا نقصان وضرر بڑھا ہوا ہے، اس کے منافع کو تو ہر شخص جانتا ہے کہ جیت جائے تو بیٹھے بیٹھے ایک فقیر بدحال آدمی ایک ہی دن میں مال دار و سرمایہ دار بن سکتا ہے، مگر اس کی معاشی، اِجتماعی، سماجی اور رُوحانی خرابیاں اور مفاسد بہت کم لوگ جانتے ہیں، اس کا اِجمالی بیان یہ ہے کہ جوے کا کھیل سارا اس پر دائر ہے کہ ایک شخص کا نفع دُوسرے کے ضرر پر موقوف ہے، جیتنے والے کا نفع ہی نفع، ہارنے والے کے نقصان ہی نقصان کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ اس کاروبار سے کوئی دولت بڑھتی نہیں وہ اسی طرح منجمد حالت میں رہتی ہے، اس کھیل کے ذریعے ایک کی دولت سلب ہو کر دُوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، اس لئے قمار مجموعی حیثیت سے قوم کی تباہی اور اِنسانی اخلاق کی موت ہے، کہ جس اِنسان کو نفع رسانی خلق اور ایثار و ہمدردی کا پیکر ہونا چاہئے، وہ ایک خونخوار درندہ کی خاصیت اِختیار کر لے کہ دُوسرے بھائی کی موت میں اپنی زندگی، اس کی مصیبت میں اپنی راحت، اس کے نقصان میں اپنا نفع سمجھنے لگے، اور اپنی پوری قابلیت اس خودغرضی پر صرف کرے،

---

[1] تفسیر رُوح البیان تحت هٰذه الآية ج:١ ص:٢٣٠

بخلاف تجارت اور بیع وشراء کی جائز صورتوں کے، ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے، اور بذریعہ تجارت اموال کے تبادلہ سے دولت بڑھتی ہے، اور خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔

ایک بھاری نقصان جوے میں یہ ہے کہ اس کا عادی اصل کمائی اور کسب سے عادۃً محروم ہوجاتا ہے، کیونکہ اس کی خواہش یہی رہتی ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک شرط لگا کر دُوسرے کا مال چند منٹ میں حاصل کرے، جس میں نہ کوئی محنت ہے نہ مشقت۔ بعض حضرات نے جوے کا نام ''میسر'' رکھنے کی یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ اس کے ذریعہ آسانی سے دُوسرے کا مال اپنا بن جاتا ہے، جوے کا معاملہ اگر دو چار آدمیوں کے درمیان دائر ہو تو اس میں بھی مذکورہ مضرتیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں، لیکن اس نئے دور میں جس کو بعض سطحی نظر والے اِنسان عاقبت نااندیشی سے ترقی کا دور کہتے ہیں، جیسے شراب کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے نام رکھ لئے گئے، سود کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے اِجتماعی طریقے ''بینکنگ'' کے نام سے اِیجاد کر لئے گئے ہیں، اسی طرح قمار اور جوے کی بھی ہزاروں قسمیں چل گئیں، جن میں بہت سی قسمیں ایسی اِجتماعی ہیں کہ قوم کا تھوڑا تھوڑا روپیہ جمع ہوتا ہے، اور جو نقصان ہوتا ہے وہ ان سب پر تقسیم ہوکر نمایاں نہیں رہتا، اور جس کو یہ رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کے شخصی نفع کو دیکھتے ہیں، لیکن قوم کے اِجتماعی نقصان پر دھیان نہیں دیتے، اس لئے ان کا خیال ان نئی قسموں کے جواز کی طرف چلا جاتا ہے، حالانکہ اس میں وہ سب مضرتیں موجود ہیں جو دو چار آدمیوں کے جوے میں پائی جاتی ہیں، اور ایک حیثیت سے اس کا ضرر اس قدیم قسم کے قمار سے بہت زیادہ اور اس کے خراب اثرات دُوررَس اور پوری قوم کی بربادی کا سامان ہیں، کیونکہ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے عام افراد کی دولت گھٹتی جائے گی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اِضافہ ہوتا رہے گا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر محدود اَفراد اور محدود خاندانوں میں مرتکز ہوجائے گی، جس کا مشاہدہ سٹہ بازار اور قمار کی دُوسری قسموں میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے، اور اِسلامی معاشیات کا اہم اُصول یہ ہے کہ ہر ایسے معاملے کو حرام قرار دیا جس کے ذریعے دولت پوری ملت سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے حوالے ہوسکے، قرآنِ کریم نے اس کا اِعلان خود تقسیمِ دولت کا اُصول بیان کرتے ہوئے اس طرح فرمادیا ہے: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۤءِ مِنْكُمْ ۭ (الحشر:۷) یعنی مالِ فئے کی تقسیم مختلف طبقوں میں کرنے کا جو اُصول قرآن نے مقرّر کیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ دولت سمٹ کر صرف سرمایہ داروں میں جمع نہ ہوجائے۔

قمار یعنی جوے کی خرابی یہ بھی ہے کہ شراب کی طرح قمار بھی آپس میں لڑائی جھگڑے اور فتنہ وفساد کا سبب ہوتا ہے، ہارنے والے کو طبعی طور پر جیت جانے والے سے نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے، اور یہ تمدن ومعاشرت کے لئے سخت مہلک چیز ہے، اسی لئے قرآنِ حکیم نے خاص طور پر اس مفسدہ کو ذِکر فرمایا ہے:-

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ (المائدۃ:۹۱)

''شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض ونفرت پیدا کردے اور تم کو اللہ کے ذِکر اور نماز سے روک دے۔''

اسی طرح قمار کا ایک لازمی اثر یہ ہے کہ شراب کی طرح آدمی اس میں مست ہوکر ذِکر اللہ اور نماز سے غافل ہوجاتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے شراب اور قمار کو ایک ہی جگہ ایک انداز سے ذِکر فرمایا ہے کہ معنوی طور پر قمار کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے جو آدمی کو اس کے بھلے برے کی فکر سے غافل کردیتا ہے، مذکورہ آیات میں بھی ان دونوں چیزوں کو جمع کرکے دونوں کے یہ مفاسد ذِکر فرمائے ہیں کہ وہ آپس کی عداوت وبغض کا سبب بنتی ہے، اور ذِکر اللہ اور نماز سے مانع بن جاتی ہیں۔

قمار کی ایک اُصولی خرابی یہ بھی ہے کہ یہ باطل طریقہ پر دُوسرے لوگوں کا مال ہضم کرنے کا ایک طریق ہے، کہ بغیر کسی معقول معاوضہ کے دُوسرے بھائی کا مال لے لیا جاتا ہے، اسی کو قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے:-

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرۃ:۱۸۸) ''لوگوں کے مال باطل طریقے پر مت کھاؤ۔''

قمار میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ دفعۃً بہت سے گھر برباد ہوجاتے ہیں، لکھ پتی آدمی فقیر بن جاتا ہے، جس سے صرف یہی شخص متأثر نہیں ہوتا، جس نے جرمِ قمار کا اِرتکاب کیا ہے، بلکہ اس کا پورا گھرانہ اور خاندان مصیبت میں پڑجاتا ہے، اور اگر غور کیا جائے تو پوری قوم اس سے متأثر ہوتی ہے، کیونکہ جن لوگوں نے اس کی مالی ساکھ کو دیکھ کر اس سے معاہدے اور معاملات کئے ہوئے ہیں یا قرض دیئے ہوئے ہیں، وہ اب دیوالیہ ہوجائے گا تو ان سب پر اس کی بربادی کا اثر پڑنا لازمی ہے۔

قمار میں ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ اس سے اِنسان کی قوّتِ عمل سست ہوکر وہمی منافع پر لگ جاتی ہے، اور وہ بجائے اس کے کہ اپنے ہاتھ یا دِماغ کی محنت سے کوئی دولت بڑھاتا رہے، اُس کی فکر اس بات میں محصور ہوکر رہ جاتی ہے کہ کسی طرح دُوسرے کی کمائی پر اپنا قبضہ جمائے۔

یہ مختصر فہرست ہے قمار کے مفاسد کی جن سے نہ صرف اِس جرم کا مرتکب متأثر ہوتا ہے بلکہ اس کے سب متعلقین، اہل وعیال اور پوری قوم متأثر ہوتی ہے، اسی لئے قرآنِ کریم نے فرمایا: وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا یعنی ''شراب وقمار کے مفاسد ان کے نفع سے زیادہ ہیں۔''

چند فقہی ضابطے اور فوائد

اس آیت میں شراب اور قمار کے بعض فوائد کو تسلیم کرتے ہوئے اُن سے رُکنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، جس سے ایک اہم نتیجہ یہ نکل آیا کہ کسی چیز یا کسی کام میں کچھ دُنیوی منافع ہونا اس کے منافی نہیں ہے کہ اس کو شرعاً حرام قرار دِیا جائے، کیونکہ جس طرح محسوسات میں اُس دوا اور غذا کو مضر کہا جاتا ہے جس کی مضرتیں بہ نسبت اُس کے فائدے کے زیادہ سخت ہوں، ورنہ یوں تو دُنیا کی کوئی بری سے بری چیز بھی منافع سے خالی نہیں، زہرِ قاتل میں، سانپ اور بچھو میں، درندوں میں کتنے فوائد ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے اُن کو مضر کہا جاتا ہے، اور ان کے پاس جانے سے بچنے کی ہدایت کی جاتی ہے، اسی طرح معنوی اِعتبار سے جن کاموں کے مفاسد ان کے منافع سے زائد ہوں شرعاً ان کو حرام کر دیا جاتا ہے، چوری، ڈاکہ، زِنا، اِغوا، دھوکہ، فریب وغیرہ تمام جرائم میں کونسا جرم ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اگر یہ بالکل بے فائدہ ہوتے تو کوئی عقل و ہوش والا اِنسان اُن کے پاس نہ جاتا، حالانکہ ان سب جرائم میں کامل وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہوشیاری، عقل مندی میں معروف سمجھے جاتے ہیں، اس سے ہی معلوم ہوا کہ فوائد تو کچھ نہ کچھ تمام جرائم میں ہیں، مگر چونکہ ان کی مضرت فائدہ سے بڑھی ہوئی ہے، اس لئے کوئی عقل مند اِنسان اُن کو مفید اور جائز نہیں کہتا، شریعتِ اِسلام نے شراب اور جوے کو اسی اُصول کے تحت حرام قرار دِیا ہے کہ اس کے فوائد سے زیادہ مفاسد اور دِینی و دُنیوی مضرتیں ہیں۔

ایک اور فقہی ضابطہ

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جلبِ منفعت سے دفعِ مضرت مقدم ہے، یعنی ایک کام کے ذریعے کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی کوئی مضرت بھی پہنچتی ہے، تو مضرت سے بچنے کے لئے اس منفعت کو چھوڑ دینا ہی ضروری ہوتا ہے، ایسی منفعت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو مضرت کے ساتھ حاصل ہو۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دے: جو کچھ بچے اپنے خرچ سے، اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے واسطے حکم

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱۹ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ

تاکہ تم فکر کرو، دُنیا و آخرت کی باتوں میں۔ اور تجھ سے پوچھتے ہیں یتیموں کا حکم، کہہ دے:

اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ط وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ

سنوارنا ان کے کام کا بہتر ہے اور اگر ان کا خرچ ملالو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور اللہ جانتا ہے خرابی کرنے والے

مِنَ الْمُصْلِحِ ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٠﴾

اور سنوارنے والے کو، اور اگر اللہ چاہتا تو تم پر مشقت ڈالتا بے شک اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ط وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ

اور نکاح مت کرو مشرک عورتوں سے جب تک ایمان نہ لے آئیں اور البتہ لونڈی مسلمان بہتر ہے مشرک بی بی سے

وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ج وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ط وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ

اگرچہ وہ تم کو بھلی لگے، اور نکاح نہ کردو مشرکین سے جب تک وہ ایمان نہ لے آویں اور البتہ غلام مسلمان

خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ط اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ صلے وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا

بہتر ہے مشرک سے، اگرچہ وہ تم کو بھلا لگے، وہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ بلاتا ہے

ع ٢٧ ٥ ١١ اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ج وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٢١﴾ ع

جنت کی طرف اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے، اور بتلاتا ہے اپنے حکم لوگوں کو تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ (اللہ کی خوشنودی کے لئے) کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے کہ ''جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔'' اللہ اسی طرح اپنے اَحکام تمہارے لئے صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم غور وفکر سے کام لو ﴿٢١٩﴾ دُنیا کے بارے میں بھی اور آخرت کے بارے میں بھی۔ اور لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ ان کی بھلائی چاہنا نیک کام ہے، اور اگر تم ان کے ساتھ مل جل کر رہو تو (کچھ حرج نہیں کیونکہ) وہ تمہارے بھائی ہی تو

ہیں۔ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ کون معاملات بگاڑنے والا ہے اور کون سنوارنے والا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈال دیتا۔ یقیناً اللہ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔ (۲۲۰) اور مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ یقیناً ایک مؤمن باندی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر ہے، خواہ وہ مشرک عورت تمہیں پسند آ رہی ہو۔ اور اپنی عورتوں کا نکاح مشرک مردوں سے نہ کراؤ جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور یقیناً ایک مؤمن غلام کسی بھی مشرک مرد سے بہتر ہے، خواہ وہ مشرک مرد تمہیں پسند آ رہا ہو۔ یہ سب دوزخ کی طرف بلاتے ہیں، جبکہ اللہ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اور اپنے اَحکام لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ (۲۲۱)

خلاصہ تفسیر

سولہواں حکم :- مقدارِ انفاق

اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ کیا کریں؟ آپ فرما دیجئے کہ جتنا آسان ہو (کہ اس کے خرچ کرنے سے خود پریشان ہو کر دُنیوی تکلیف میں یا کسی کا حق ضائع کر کے اُخروی تکلیف میں نہ پڑ جائیں) اللہ تعالیٰ اس طرح اَحکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم (کو ان کا علم ہو جائے اور اس علم کی وجہ سے ہر عمل کرنے سے پہلے) دُنیا و آخرت کے معاملات میں (ان اَحکام کو) سوچ لیا کرو (اور سوچ کر ہر معاملہ میں اُن اَحکام کے موافق عمل کیا کرو)۔

سترہواں حکم :- مخالطتِ یتیم

(چونکہ اِبتدا میں مثل ہندوستان کے عرب میں بھی یتیموں کا حق دینے میں پوری اِحتیاط نہ تھی، اس لئے یہ وعید سنائی گئی کہ یتیموں کا مال کھانا ایسا ہے جیسا دوزخ کے انگارے پیٹ میں بھرنا، تو سننے والے ڈر کے مارے اتنی اِحتیاط کرنے لگے کہ اُن کا کھانا بھی الگ پکواتے اور الگ رکھواتے، اور اِتفاقاً اگر بچہ کم کھاتا تو کھانا بچتا اور سڑتا تھا، کیونکہ اس کا اِستعمال نہ اُن لوگوں کے لئے جائز تھا، اور نہ یتیم کے مال کو صدقہ کر دینے کا اِختیار تھا، اس طرح تکلیف بھی ہوتی اور یتیم کا نقصان بھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، اس کے متعلق آیت میں یہ اِرشاد آیا) اور لوگ آپ سے یتیم بچوں (کے خرچ علیحدہ یا شامل رکھنے) کا حکم پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ (اصل مقصود ہمارا ان کے اموال کھانے کی ممانعت سے یہ ہے کہ ان کی مصلحت کو ضائع نہ کیا جائے، اور جب خرچ شامل رکھنے میں ان کی مصلحت ہے تو) ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا (علیحدہ خرچ رکھنے سے جو خلافِ مصلحت ہے) زیادہ بہتر ہے اور تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو

(کچھ ڈر کی بات نہیں کیونکہ) وہ (بچے) تمہارے (دِینی) بھائی ہیں (اور بھائی بھائی شامل رہا ہی کرتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو (الگ الگ) جانتے ہیں (اس لئے کھانے پینے میں اِشتراک ایسا نہ ہونا چاہئے جس میں یتیم کی مصلحت ضائع ہوجائے اور بلا علم و بلا قصد کچھ کمی بیشی ہو بھی جائے تو چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کی نیک نیتی معلوم ہے اس لئے اس پر مؤاخذہ نہ ہوگا) اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو (اس معاملہ میں سخت قانون مقرّر کرکے) تم کو مصیبت میں ڈال دیتے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (مگر قانون سہل اس لئے مقرّر فرمادیا کہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (ایسا حکم نہیں دیتے جو نہ ہوسکے)۔

اٹھارواں حکم :- مناکحتِ کفار

اور نکاح مت کرو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک وہ مسلمان نہ ہوجاویں، اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی (کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر عورت سے (چاہے وہ آزاد بی بی ہی کیوں نہ ہو) گو وہ (کافر عورت بوجہ مال یا جمال کے) تم کو اچھی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان عورت ہی اس سے اچھی ہے) اور (اسی طرح اپنے اختیار کی) عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو جب تک وہ مسلمان نہ ہوجاویں، اور مسلمان مرد (چاہے) غلام (ہی کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر مرد سے (چاہے وہ آزاد ہی کیوں نہ ہو) گو وہ (کافر مرد بوجہ مال یا جاہ کے) تم کو اچھا ہی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان ہی اس سے اچھا ہے، اور وجہ ان کافروں کے برا ہونے کی، اور وہی اصل سبب ان سے ممانعتِ نکاح کا ہے، یہ ہے کہ) یہ (کافر) لوگ دوزخ (میں جانے) کی تحریک دیتے ہیں (کیونکہ کفر کی تحریک کرتے ہیں اور اس کا انجام جہنم ہے) اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت (کے حاصل کرنے) کی تحریک کرتے ہیں اپنے حکم سے (اور اس حکم کا ظہور اس طرح ہوا کہ کفار کے متعلق یہ حکم صادر فرمادیا کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے، تاکہ اُن کی تحریک کے اثر سے پوری حفاظت رہ سکے، اور اس سے محفوظ رہ کر جنت اور مغفرت حاصل ہوجاوے) اور اللہ تعالیٰ اس واسطے اپنے اَحکام بتلادیتے ہیں تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں (اور مستحقِ جنت و مغفرت ہوجاویں)۔

فوائد از ”بیان القرآن“

مسئلہ :- جو قوم اپنی وضع اور طرز سے اہلِ کتاب سمجھے جاتے ہوں، لیکن عقائد کی تحقیق کرنے سے کتابی ثابت نہ ہوں، اس قوم کی عورتوں سے نکاح دُرست نہیں، جیسے آج کل عموماً انگریزوں کو عام لوگ عیسائی سمجھتے ہیں، حالانکہ تحقیق سے اُن کے بعض عقائد بالکل ملحدانہ ثابت ہوئے کہ نہ خدا کے قائل، نہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوّت کے معتقد، نہ اِنجیل کی نسبت آسمانی کتاب ہونے کا اِعتقاد، سو ایسے لوگ عیسائی نہیں، ایسی جماعت میں کی جو عورت ہو اس سے نکاح دُرست نہیں، لوگ

بڑی غلطی کرتے ہیں کہ بلا تحقیق یورپ کی عورتیں بیاہ لاتے ہیں۔

مسئلہ:- اس طرح جو مرد ظاہری حالت سے مسلمان سمجھا جائے لیکن عقائد اس کے کفر تک پہنچے ہوں، اس سے مسلمان عورت کا نکاح دُرست نہیں، اور اگر نکاح ہو جانے کے بعد ایسے عقائد خراب ہو جاویں تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے، جیسے آج کل بہت سے آدمی اپنے مذہب سے ناواقف سائنس کے اثر سے اپنے عقائد تباہ کر لیتے ہیں، لڑکی والوں پر واجب ہے کہ پیام آنے کے وقت اوّل عقائد کی تحقیق کر لیا کریں تب زبان دیں۔

معارف و مسائل

مسلم و کافر کا باہمی اِزدواج ممنوع ہے

آیاتِ مذکورہ میں ایک اہم مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ مسلمان مردوں کا نکاح کافر عورتوں سے، اور کافر مردوں کا نکاح مسلمان عورتوں سے جائز نہیں، وجہ یہ ہے کہ کافر مرد اور عورتیں اِنسان کو جہنم کی طرف لے جانے کا سبب بنتے ہیں، کیونکہ اِزدواجی تعلقات، آپس کی محبت و مودّت اور یگانگت کو چاہتے ہیں، اور بغیر اس کے ان تعلقات کا اصلی مقصد پورا نہیں ہوتا، اور مشرکین کے ساتھ اس قسم کے تعلقاتِ قریبہ محبت و مودّت کا لازمی اثر یہ ہے کہ اُن کے دِل میں بھی کفر و شرک کی طرف میلان پیدا ہو، یا کم از کم کفر و شرک سے نفرت اُن کے دِلوں سے نکل جائے، اور اس کا انجام یہ ہے کہ یہ بھی کفر و شرک میں مبتلا ہو جائیں، اور اس کا نتیجہ جہنم ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اِنسان کو جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے، اور صاف صاف اپنے اَحکام بیان فرما دیتا ہے، تاکہ لوگ نصیحت پر عمل کریں۔ اس جگہ چند باتیں قابلِ غور ہیں:-

اوّل یہ کہ اس آیت میں لفظ مشرک سے اگر مطلقاً غیر مسلم مراد ہوں تو قرآنِ کریم کی ایک دُوسری آیت کی بنا پر اہلِ کتاب کی غیر مسلم عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، جس میں اِرشاد فرمایا گیا ہے: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ (المائدۃ:۵) اور اگر مشرک سے خاص وہ غیر مسلم مراد ہیں جو اہلِ کتاب نہیں تو یہ آیت اپنی جگہ عام ہے تمام اُن غیر مسلموں کو جو کسی پیغمبر اور آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

دُوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ مسلم و کافر کے درمیان اِزدواجی تعلقات کو حرام قرار دینے کی جو وجہ قرآنِ کریم میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے ساتھ ایسے تعلقاتِ قریبہ کفر و شرک میں مبتلا ہو جانے کا سبب بن سکتے ہیں، یہ بات تو بظاہر تمام غیر مسلم قوموں میں مساوی ہے، پھر اہلِ کتاب کی عورتوں کو مستثنیٰ کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب ظاہر ہے کہ اہلِ کتاب کا اِختلاف اِسلام کے ساتھ بہ نسبت دُوسرے غیر مسلموں کے کم اور ہلکا ہے، کیونکہ عقائدِ اِسلام کے تین عمود ہیں: توحید، آخرت، رِسالت۔ ان میں سے عقیدۂ آخرت میں تو اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ بھی اپنے اصل مذہب کے اِعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ متفق ہیں، اسی طرح خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا خود ان کے اصل مذہب میں بھی کفر ہے، یہ دُوسری بات ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت ومحبت کے غلوّ میں شرک تک جا پہنچے۔

اب بنیادی اِختلاف صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں مانتے، اور اِسلام میں یہ عقیدہ بھی بنیادی عقیدہ ہے، اس کے بغیر کوئی اِنسان مؤمن نہیں ہوسکتا۔ بہر حال دُوسرے غیر مسلم فرقوں کی نسبت سے اہلِ کتاب کا اِختلاف ہلکا اور کم ہے، اس لئے اس میں مفسدہ کا خطرہ زیادہ نہیں۔

تیسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ جب اہلِ کتاب کا اِختلاف ہلکا قرار دے کر ان کی عورتوں سے نکاح مسلمان کا جائز ہوا تو اس کے برعکس مسلمان عورتوں کا نکاح بھی غیر مسلم اہلِ کتاب سے جائز ہوجانا چاہئے، مگر ذرا غور کرنے سے فرق واضح ہوجاتا ہے کہ عورت کچھ فطرۃً ضعیف ہے، اور پھر شوہر اس پر حاکم اور نگراں بنایا گیا ہے، اس کے عقائد ونظریات سے عورت کا متأثر ہوجانا مستبعد نہیں، اس لئے اگر مسلمان عورت غیر مسلم کتابی کے نکاح میں رہے تو اس کے عقائد خراب ہوجانے کا قوی اندیشہ ہے، بخلاف اس کے کہ غیر مسلم کتابی عورت مسلمان کے نکاح میں رہے تو اس کے خیالات کا اثر شوہر پر پڑنا اُصولاً مستبعد ہے، کوئی بے اُصول اور اِفراط کا شکار ہوجائے یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

چوتھی بات قابلِ غور یہ ہے کہ اِزدواجی تعلقات میں جو کچھ اثر ہوتا ہے وہ طرفین پر یکساں ہوتا ہے، اس لئے جیسے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان کے عقائد غیر مسلم سے متأثر ہوجائیں اسی طرح یہ بھی تو اِحتمال ہے کہ معاملہ برعکس ہو، غیر مسلم کے عقائد مسلمان سے متأثر ہوں اور وہ بھی اِسلام قبول کرلے تو اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ مسلم وغیر مسلم کے اِزدواجی تعلقات کو ممنوع نہ کیا جائے۔

لیکن یہاں حکمت کی بات یہ ہے کہ جب کسی چیز میں ایک نفع کی اُمید بھی ہو اور کسی ضرر کا خطرہ بھی ہو تو عقلِ سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ضرر سے بچنے کا اِہتمام نفع کی فکر سے زیادہ ضروری ہے، فارسی کا ایک حکیمانہ مقولہ مشہور ہے کہ "عقل مند تریاق بیقین وزہر بگماں نخورد" [1] اس لئے اس نفع کی اُمید کو نظر انداز کیا گیا کہ شاید وہ غیر مسلم متأثر ہوکر اِسلام قبول کرلے، اِہتمام اس کا کیا گیا کہ مسلمان متأثر ہوکر کفر میں مبتلا نہ ہوجائے۔

---

[1] ترجمہ:- عقل مند شخص ایسی چیز کو اِستعمال نہیں کرتا جس کے تریاق ہونے کا یقین ہے مگر ساتھ ہی اس میں زہر کا خطرہ بھی موجود ہے۔

پانچویں بات قابلِ غور یہ ہے کہ اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مردوں کو نکاح کی اِجازت کے بھی معنی یہ ہیں کہ اگر نکاح کرلیا جائے تو نکاح صحیح ہوجائے گا، اولاد ثابت النسب ہوگی، لیکن روایاتِ حدیث اس پر شاہد ہیں کہ یہ نکاح بھی پسندیدہ نہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو اپنے نکاح کے لئے دِین دار صالح عورت تلاش کرنا چاہئے، [1] تاکہ خود اس کے لئے بھی دِین میں معین ثابت ہو، اور اس کی اولاد کو بھی دِین دار ہونے کا موقع میسر آئے۔ اور جب غیر متدین مسلمان عورت سے نکاح پسند نہیں کیا گیا تو کسی غیر مسلم سے کیسے پسند کیا جاتا، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو جب خبر پہنچی کہ عراق وشام کے مسلمانوں میں کچھ ایسے اِزدواج کی کثرت ہونے لگی تو بذریعہ فرمان اُن کو اس سے روک دیا گیا، اور اس پر توجہ دلائی گئی کہ یہ اِزدواجی تعلق دیانۃً بھی مسلم گھرانوں کے لئے خرابی کا سبب ہے، اور سیاسۃً بھی (کتابُ الآثار للإمام محمدؒ)۔ [2] اور آج کے غیر مسلم اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ اور ان کے سیاسی مکر وفریب اور سیاسی شادیاں اور مسلم گھرانوں میں داخل ہوکر ان کو اپنی طرف مائل کرنا اور ان کے راز حاصل کرنا وغیرہ جس کا اِقرار خود بعض مسیحی مصنّفین کی کتابوں میں میجر جنرل اکبر کی کتاب ''حدیث دفاع'' میں اس کی کچھ تفصیلات حوالوں کے ساتھ مذکور ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاروقِ اعظمؓ کی دُوربین نظریں ان واقعات کو دیکھ رہی تھیں خصوصاً اس زمانہ کے یورپ کے اکثر وہ لوگ جو عیسائی یا یہودی کہلائے جاتے ہیں، اور مردم شماری کے رجسٹروں میں ان کی قومیت عیسائی یا یہودی لکھی جاتی ہے اگر ان کے حالات کی تحقیق کی جائے تو ان میں بکثرت ایسے لوگ ملیں گے جن کو عیسائیت اور یہودیت سے کوئی تعلق نہیں وہ بالکل ملحد بے دِین ہیں، نہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں نہ اِنجیل کو، نہ موسیٰ علیہ السلام پر اِیمان ہے نہ توراۃ پر، نہ خدا تعالیٰ پر نہ آخرت پر، ظاہر ہے کہ حلتِ نکاح کا قرآنی حکم ایسے لوگوں کو شامل نہیں، ان کی عورتوں سے نکاح قطعاً حرام ہے، ایسے لوگ ظاہر ہے کہ آیتِ قرآن: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ (المائدۃ:۵) کے اِستثناء میں داخل نہیں ہوتے، غیر مسلموں کی طرح ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی قطعاً حرام ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں حکم حیض کا، کہہ دے: وہ گندگی ہے سو تم الگ رہو عورتوں سے حیض کے وقت

[1] مشکوٰۃ، کتاب النکاح ج:۲ ص:۲۶۷

[2] کتاب الآثار، کتاب النکاح، باب من تزوّج الیہودیۃ ...إلخ رقم الحدیث:۴۱۵

وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ

اور نزدیک نہ ہو ان کے جب تک پاک نہ ہوویں، پھر جب خوب پاک ہوجاویں تو جاؤ ان کے پاس جہاں سے حکم دیا تم کو

اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ

اللہ نے، بے شک اللہ کو پسند آتے ہیں توبہ کرنے والے اور پسند آتے ہیں گندگی سے بچنے والے۔ تمہاری عورتیں

حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا

تمہاری کھیتی ہیں، سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو، اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے اور ڈرتے رہو

اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

اللہ سے اور جان رکھو کہ تم کو اس سے ملنا ہے اور خوش خبری سنا ایمان والوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور لوگ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ وہ گندگی ہے، لہٰذا حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو، اور جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں، ان سے قربت (یعنی جماع) نہ کرو۔ ہاں جب وہ پاک ہوجائیں تو ان کے پاس اسی طریقے سے جاؤ جس طرح اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ بیشک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی طرف کثرت سے رُجوع کریں، اور ان سے محبت کرتا ہے جو خوب پاک صاف رہیں۔﴿۲۲۲﴾ تمہاری بیویاں تمہارے لئے کھیتیاں ہیں؛ لہٰذا اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو جاؤ، اور اپنے لئے (اچھے عمل) آگے بھیجو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ تم اس سے جاکر ملنے والے ہو۔ اور مؤمنوں کو خوشخبری سنادو۔﴿۲۲۳﴾

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۱۹:- حیض میں جماع کی حرمت اور پاکی کی شرائط

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ (الیٰ قولہ) وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ اور لوگ آپ سے حیض (کی حالت میں صحبت وغیرہ

کرنے) کا حکم پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ وہ (حیض) گندگی کی چیز ہے، تو حالتِ حیض میں عورتوں (کے ساتھ صحبت کرنے) سے علیحدہ رہا کرو اور (اس حالت میں) ان سے قربت مت کرو جب تک وہ (حیض سے) پاک نہ ہو جاویں، پھر جب وہ (عورتیں) اچھی طرح پاک ہو جاویں (کہ ناپاکی کا شک وشبہ نہ رہے) تو ان کے پاس آؤ جاؤ (یعنی ان سے صحبت کرو) جس جگہ سے تم کو خدا تعالیٰ نے اجازت دی ہے (یعنی آگے سے) یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے (مثلاً اتفاقاً یا بے احتیاطی سے حالتِ حیض میں صحبت کر بیٹھا، پھر متنبہ ہو کر توبہ کرلی) اور محبت رکھتے ہیں پاک صاف رہنے والوں سے (جو حالتِ حیض میں صحبت کرنے سے اور دُوسرے منہیات سے بچتے ہیں، اور حالتِ پاکی میں اجازت صحبت کی دینا پھر اس قید سے اجازت دینا کہ آگے کے موقع میں صحبت ہو، اس لئے ہے کہ) تمہاری بیبیاں تمہارے لئے (بمنزلۂ) کھیت (کے) ہیں (جس میں نطفہ بجائے تخم کے، اور بچہ بجائے پیداوار کے ہے) سو اپنے کھیت میں جس طرف سے چاہو آؤ (اور جس طرح کھیتوں میں اجازت ہے اسی طرح بیبیوں کے پاس پاکی کی حالت میں ہر طرف سے آنے کی اجازت ہے، خواہ کروَٹ سے ہو، یا پیچھے سے، یا آگے بیٹھ کر ہو یا اُوپر یا نیچے لیٹ کر ہو، یا جس ہیئت سے ہو، مگر آنا ہو ہر حال میں کھیت کے اندر کہ وہ خاص آگے کا موقع ہے، کیونکہ پیچھے کا موقع کھیت کے مشابہ نہیں، اس میں صحبت نہ ہو، اور ان لذات میں ایسے مشغول مت ہو جاؤ کہ آخرت ہی کو بھول جاؤ، بلکہ) آئندہ کے واسطے اپنے لئے کچھ (اعمالِ صالحہ) کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے (ہر حال میں) ڈرتے رہو، اور یہ یقین رکھو کہ بے شک تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والے ہو، اور (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ایسے) ایمان داروں کو (جو نیک کام کریں، خدا سے ڈریں، خدا تعالیٰ کے سامنے جانے کا یقین رکھیں) خوشی کی خبر سنا دیجئے (کہ ان کو آخرت میں ہر طرح کی نعمتیں ملیں گی)۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشانہ اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سلوک کرنے سے اور پرہیزگاری سے

وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

اور لوگوں میں صلح کرانے سے بچ جاؤ، اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور اللہ (کے نام) کو اپنی قسموں میں اس غرض سے استعمال نہ کرو کہ اس کے ذریعے نیکی اور تقویٰ کے کاموں اور

لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے سے بچ سکو۔ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ ﴿۲۲۴﴾

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۰: - نیک کام نہ کرنے کی قسم کی ممانعت

اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعے سے ان اُمور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نیکی کے اور تقویٰ کے اور اِصلاح فیما بین خلق کے کام کرو (یعنی اللہ کے نام کی یہ قسم نہ کھاؤ کہ ہم یہ نیک کام نہ کریں گے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو، اور دِل میں برے خیالات مت لاؤ)۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ

نہیں پکڑتا تم کو اللہ بیہودہ قسموں پر تمہاری، لیکن پکڑتا ہے تم کو ان قسموں پر جن کا قصد کیا

قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

تمہارے دِلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ تمہاری لغو قسموں پر تمہاری گرفت نہیں کرے گا، البتہ جو قسمیں تم نے اپنے دِلوں کے ارادے سے کھائی ہوں گی ان پر گرفت کرے گا۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا بُردبار ہے۔ ﴿۲۲۵﴾

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۱: - جھوٹی قسمیں کھانے کا حکم

اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں داروگیر نہ فرماویں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر (جس میں بلا قصد جھوٹ بولا

گیا) لیکن داروگیر فرماویں گے اس جھوٹی قسم پر جس میں تمہارے دِلوں نے (جھوٹ بولنے کا) اِرادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں (کہ ایسی بیہودہ قسم پر داروگیر نہ فرمائی) حلیم ہیں (کہ قصداً جھوٹی قسم کھانے کی سزا ابھی آخرت تک کی مہلت دی)۔

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ ۖ فَإِن فَآءُو فَإِنَّ

جو لوگ قسم کھالیتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے اُن کے لئے مہلت ہے چار مہینے کی، پھر اگر باہم مل گئے تو

اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۲۷﴾

اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر ٹھہرالیا چھوڑ دینے کو تو بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

جو لوگ اپنی بیویوں سے ایلاء کرتے ہیں (یعنی ان کے پاس نہ جانے کی قسم کھالیتے ہیں) ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ چنانچہ اگر وہ (قسم توڑ کر) رُجوع کرلیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔﴿۲۲۶﴾ اور اگر انہوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو (بھی) اللہ سننے جاننے والا ہے۔﴿۲۲۷﴾

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۲:- اِیلاء کا حکم

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ (الیٰ قولہ) سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۲۷﴾ یعنی جو لوگ (بلا قید مدت یا چار ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیبیوں کے پاس جانے سے ان کے لئے چار مہینے تک کی مہلت ہے، سو اگر (ان چار مہینے کے اندر) یہ لوگ (اپنی قسم توڑ کر عورت کی طرف) رُجوع کرلیں (تب تو نکاح باقی رہے گا اور) اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ کفارہ سے) معاف کردیں گے (اور چونکہ اب بی بی کے حقوق ادا کرنے لگا اس پر) رحمت فرمادیں گے، اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ اِرادہ کرلیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر قسم توڑ کر رُجوع نہیں کیا) تو (چار ماہ گزرتے ہی قطعی طلاق

پڑ جاویں گی اور) اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ

اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک، اور ان کو حلال نہیں کہ

يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ

چھپا رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور پچھلے دن پر،

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ

اور اُن کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کے لوٹا لینے کا اس مدت میں اگر چاہیں سلوک سے رہنا، اور عورتوں کا بھی حق ہے

مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ

جیسا کہ مردوں کا اُن پر حق ہے دستور کے موافق، اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے،

۲۸ ع ۱۲

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ ع

اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو وہ تین مرتبہ حیض آنے تک اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں۔ اور اگر وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہوں تو ان کے لئے حلال نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ (حمل یا حیض) پیدا کیا ہے اسے چھپائیں۔ اور اس مدّت میں اگر ان کے شوہر حالات بہتر بنانا چاہیں تو ان کو حق ہے کہ وہ ان عورتوں کو (اپنی زوجیت میں) واپس لے لیں۔ اور ان عورتوں کو معروف طریقے کے مطابق ویسے ہی حقوق حاصل ہیں جیسے (مردوں کو اُن پر حاصل ہیں۔ ہاں مردوں کو ان پر ایک درجہ فوقیت ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ ﴿۲۲۸﴾

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۳ و ۲۴: - مطلقہ کی عدت اور مدتِ رجعت کا بیان

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ (الیٰ قولہٖ) اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا اور طلاق دی ہوئی عورتیں (جن میں اتنی صفتیں ہوں، خاوند نے اُن سے صحبت یا خلوتِ صحیحہ کی ہو، ان کو حیض آتا ہو، آزاد ہوں، یعنی شرعی قاعدہ سے لونڈی نہ ہوں) اپنے آپ کو (نکاح سے) روکے رکھیں تین حیض (ختم ہونے) تک (اس کو ''عدت'' کہتے ہیں) اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم (بچہ دانی) میں پیدا کیا ہو (خواہ حمل ہو یا حیض) اس کو پوشیدہ کریں (کیونکہ اس کے پوشیدہ کرنے سے عدت کا حساب غلط ہو جاوے گا) اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یومِ آخرت پر یقین رکھتی ہیں (بوجہ اس کے کہ اس یقین کا مقتضٰی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں کہ قیامت میں نافرمانی پر سزا نہ ہو جاوے) اور ان عورتوں کے شوہر (جبکہ اُن کو طلاقِ رجعی ملی ہو جس کا بیان آگے آئے گا) ان کے (بلا تجدید نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں اس عدت کے اندر (اور اس لوٹا لینے کو ''رجعت'' کہتے ہیں) بشرطیکہ (رجعت کرنے سے) اِصلاح کا قصد رکھتے ہوں (ورنہ تنگ کرنے کے لئے رجعت کرنا لا حاصل ہے، گو رجعت تو ہو ہی جاوے گی) اور (یہ حکم اِصلاح کا اس لئے کیا گیا کہ) عورتوں کے حقوق ہیں (مردوں پر) جو کہ (نفسِ وجوب میں) مثل انہی کے حقوق کے ہیں جو اُن عورتوں پر ہیں (مردوں کے کہ ان کو) قاعدہ (شرعی) کے موافق (ادا کیا جاوے) اور (اتنی بات ضرور ہے کہ) مردوں کا اُن کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے (اس لئے ان کے حقوق کی نوعیت عورتوں کے حقوق کی نوعیت سے بڑھی ہوئی ہے) اور اللہ تعالیٰ زبردست (حاکم) ہیں (اور) حکیم (بھی) ہیں۔

مسائل متعلقہ آیت از ''بیان القرآن''

۱- اگر غلبۂ شہوت سے حالتِ حیض میں صحبت ہوگئی، تو خوب توبہ کرنا واجب ہے، اور کچھ خیر خیرات بھی دیدے تو زیادہ بہتر ہے۔

۲- پیچھے کے موقع میں اپنی بی بی سے بھی صحبت کرنا حرام ہے۔

۳- لغو قسم کے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا اِرادہ نکل گئی، یا نکلی تو اِرادے سے، مگر اس کو اپنے گمان میں صحیح سمجھتا ہے، جیسے اپنے علم و گمان کے مطابق قسم کھا بیٹھا کہ زید آگیا ہے، اور واقع میں وہ نہ آیا تھا، یا آئندہ بات پر اس طرح قسم نکل گئی کہ کہنا چاہتا تھا کچھ اور بے اِرادہ منہ سے قسم نکل گئی، اس میں گناہ نہیں ہوتا، اور اس کو اسی واسطے

''لغو'' کہتے ہیں، آخرت میں اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اور اس کے مقابلہ میں جس پر مؤاخذہ ہونے کا ذِکر فرمایا ہے یہ وہ قسم ہے جو قصداً جھوٹی سمجھ کر کھائی ہو، اس کو ''غموس'' کہتے ہیں، اس میں گناہ ہوتا ہے، مگر اِمام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کفارہ نہیں آتا، اور لغو بالمعنی المذکور میں بدرجۂ اَولیٰ کفارہ نہیں، اس آیت میں انہی دونوں کا بیان ہے، جن میں کفارہ نہیں۔

دُوسری معنی ''لغو'' کے یہ ہیں جس پر کفارہ نہ ہو، اور اس کو ''لغو'' اس لئے کہیں گے کہ مؤاخذۂ دُنیوی یعنی کفارہ اس پر نہیں آتا، اس معنی کے لحاظ سے لفظ ''لغو''، ''غموس'' کو بھی شامل ہے، کہ اس میں اگرچہ گناہ ہوتا ہے لیکن کفارہ نہیں آتا، اس کے مقابلہ میں وہ قسم جس پر کفارہ بھی آتا ہے ''منعقدہ'' کہلاتی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ قصداً یوں قسم کھائے کہ میں فلاں فعل کروں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا، اس میں خلاف کرنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔

۴- اگر کوئی قسم کھالے کہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کروں گا، اس کی چار صورتیں ہیں:-

ایک یہ کہ کوئی مدت معین نہ کرے، دوم یہ کہ چار مہینے کی مدت کی قید لگادے، سوم یہ کہ چار ماہ سے زیادہ کی مدت کی قید لگادے، چہارم یہ کہ چار ماہ سے کم کی مدت کا نام لے۔ پس صورتِ اوّل، دوم اور سوم کو شرع میں ''اِیلاء'' کہتے ہیں، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور بیوی کے پاس چلا آوے تو قسم کا کفارہ دے اور نکاح باقی ہے، اور اگر چار ماہ گزر گئے اور قسم نہ توڑی، تو اس عورت پر قطعی طلاق پڑگئی، یعنی بلا نکاح رُجوع کرنا دُرست نہیں رہا، البتہ اگر دونوں رضامندی سے پھر نکاح کرلیں تو دُرست ہے، حلالہ کی ضرورت نہ ہوگی، اور چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑے تو کفارہ لازم ہوگا، اور اگر قسم پوری کرلی جب بھی نکاح باقی ہے۔ (بیان القرآن) [1]

معارف ومسائل

مرد وعورت کے فرق اور میاں بیوی کے باہمی حقوق ودرجات پر ایک جامع آیت

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ الآیۃ، یہ آیت عورتوں اور مردوں کے باہمی حقوق وفرائض اور ان کے درجات کے بیان میں ایک شرعی ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کئی رُکوع تک اسی ضابطہ کی اہم جزئیات کا بیان ہوا ہے۔

اِسلام میں عورت کا موقف

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عورت کے اس موقف کی کچھ تشریح کردی جائے جو اِسلام نے اس کو عطا کیا

[1] تفسیر بیان القرآن تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۱۴۶

ہے، جس کو سمجھ لینے کے بعد یقینی طور پر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایک عادلانہ اور معتدلانہ نظام کا مقتضٰی یہی تھا، اور یہی وہ مقام ہے جس سے اُونچ نیچ یا انحراف انسان کے دین و دُنیا کے لئے عظیم خطرہ بن جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو دُنیا میں دو چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اس عالم کی بقا اور تعمیر و ترقی میں عمود کا درجہ رکھتی ہیں، ایک عورت، دُوسرے دولت، لیکن تصویر کا دُوسرا رُخ دیکھا جائے تو یہی دونوں چیزیں دُنیا میں فساد و خوں ریزی اور طرح طرح کے فتنوں کا سبب بھی ہیں، اور غور کرنے سے اس نتیجے پر پہنچنا کچھ دُشوار نہیں کہ یہ دونوں چیزیں اپنی اصل میں دُنیا کی تعمیر و ترقی اور اس کی رونق کا ذریعہ ہیں، لیکن جب کہیں ان کو اپنے اصلی مقام اور موقف سے اِدھر اُدھر کر دیا جاتا ہے تو یہی چیزیں دُنیا میں سب سے بڑا زلزلہ بھی بن جاتی ہیں۔

قرآن نے انسان کو نظامِ زندگی دیا ہے، اس میں ان دونوں چیزوں کو اپنے اپنے صحیح مقام پر ایسا رکھا گیا ہے کہ اُن کے فوائد و ثمرات زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں، اور فتنہ و فساد کا نام نہ رہے۔ دولت کا صحیح مقام، اس کے حاصل کرنے کے ذرائع اور خرچ کرنے کے طریقے اور تقسیمِ دولت کا عادلانہ نظام یہ ایک مستقل علم ہے جس کو "اِسلام کا معاشی نظام" کہا جاسکتا ہے، اس کا بیان اِن شاء اللہ کسی اور موقع پر ہوگا، احقر کا مطبوعہ رسالہ "تقسیمِ دولت" بھی ضروری اِشارات کا کام دے سکتا ہے۔

اس وقت عورت اور اس کے حقوق و فرائض کا ذِکر ہے، اس کے متعلق آیتِ مذکورہ میں یہ اِرشاد فرمایا گیا ہے کہ جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے، اسی طرح مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہے، ہاں اتنا فرق ضروری ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اور تقریباً یہی مضمون سورۂ نساء کی آیت میں اس طرح آیا ہے:-

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء: ۳۴)

"یعنی مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی اللہ نے دی ایک کو ایک پر، اور اس واسطے کہ خرچ کئے انہوں نے اپنے مال۔"

اِسلام سے پہلے معاشرہ میں عورت کا درجہ

اِسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں تمام دُنیا کی اَقوام میں جاری تھا کہ عورت کی حیثیت گھریلو اِستعمال کی اشیاء سے زیادہ نہ تھی، چوپاؤں کی طرح اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی، اس کو اپنی شادی بیاہ میں کسی قسم کا کوئی اِختیار نہ تھا، اس کے اولیاء جس کے حوالے کر دیتے وہاں جانا پڑتا تھا، عورت کو اپنے رشتہ داروں کی میراث میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا، بلکہ وہ خود

گھریلو اشیاء کی طرح مالِ وراثت سمجھی جاتی تھی، وہ مردوں کی ملکیت تصوّر کی جاتی تھی، اس کی ملکیت کسی چیز پر نہ تھی، اور جو چیزیں عورت کی ملکیت کہلاتی تھیں ان میں اس کو مرد کی اجازت کے بغیر کسی قسم کے تصرف کا کوئی اختیار نہ تھا، ہاں اس کے شوہر کو ہر قسم کا اختیار تھا کہ اس کے مال کو جہاں چاہے اور جس طرح چاہے خرچ کر ڈالے، اس کو پوچھنے کا بھی کوئی حق نہ تھا، یہاں تک کہ یورپ کے وہ ممالک جو آج کل دُنیا کے سب سے زیادہ متمدن ملک سمجھے جاتے ہیں ان میں بعض لوگ اس حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ عورت کے انسان ہونے کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔

عورت کے لئے دین و مذہب میں بھی کوئی حصہ نہ تھا، نہ اس کو عبادت کے قابل سمجھا جاتا تھا نہ جنت کے، روما کی بعض مجلسوں میں باہمی مشورہ سے یہ طے کیا گیا تھا کہ وہ ایک ناپاک جانور ہے جس میں رُوح نہیں، عام طور پر باپ کے لئے لڑکی کا قتل بلکہ زندہ درگور کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا، بلکہ یہ عمل باپ کے لئے عزت کی نشانی اور شرافت کا معیار تصوّر کیا جاتا تھا، بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کو کوئی بھی قتل کر دے نہ تو اس پر قصاص واجب ہے نہ خون بہا، اور اگر شوہر مر جائے تو بیوی کو بھی اس کی لاش کے ساتھ جلا کر ستی کر دیا جاتا تھا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد اور آپ کی نبوّت سے پہلے ۵۸۶ء میں فرانس نے عورت پر یہ احسان کیا کہ بہت سے اختلافات کے بعد یہ قرارداد پاس کی کہ عورت ہے تو انسان مگر وہ صرف مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

الغرض پوری دُنیا اور اس میں بسنے والے تمام اقوام و مذاہب نے عورت کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہوا تھا کہ جس کو سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس بیچاری مخلوق کے لئے نہ کہیں عقل و دانش سے کام لیا جاتا تھا، نہ عدل و انصاف سے۔

قربان جایئے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لائے ہوئے دینِ حق کے جس نے دُنیا کی آنکھیں کھولیں، انسان کو انسان کی قدر کرنا سکھلایا، عدل و انصاف کا قانون جاری کیا، عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم کئے جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں، اس کو آزاد و خودمختار بنایا، وہ اپنی جان و مال کی ایسی ہی مالک قرار دی گئی جیسے مرد، کوئی شخص خواہ باپ دادا ہی ہو، بالغ عورت کو کسی شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا، اور اگر بلا اس کی اجازت کے نکاح کر دیا جائے تو وہ اس کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، اگر نامنظور کر دے تو باطل ہو جاتا ہے، اس کے اموال میں کسی مرد کو بغیر اس کی رضا و اجازت کے کسی تصرف کا کوئی حق نہیں، شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد وہ خودمختار ہے کوئی اس پر جبر نہیں کر سکتا، اپنے رشتہ داروں کی میراث میں اس کو بھی ایسا ہی حصہ ملتا ہے جیسا لڑکوں کو، اس پر خرچ کرنے اور اس کے راضی رکھنے کو شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے ایک عبادت قرار دیا، شوہر اس کے حقوقِ واجبہ ادا نہ کرے تو وہ اسلامی عدالت کے ذریعہ اس کو اَدائے حقوق پر، ورنہ طلاق پر مجبور کر سکتی ہے۔

عورتوں کو مردوں کی سیادت اور نگرانی سے بالکل آزاد کر دینا بھی فسادِ عالم کا بہت بڑا سبب ہے

عورت کو اس کے حقوقِ مناسبہ نہ دینا ظلم و جور اور قساوت و شقاوت تھی جس کو اِسلام نے مٹایا ہے، اسی طرح ان کو کھلے مہار چھوڑ دینا اور مردوں کی نگرانی و سیادت سے آزاد کر دینا، اس کو اپنے گزارے اور معاش کا خود متکفل بنانا بھی اس کی حق تلفی اور بربادی ہے، نہ اس کی ساخت اس کی متحمل ہے اور نہ گھریلو کاموں کی ذمہ داری اور اولاد کی تربیت کا عظیم الشان کام جو فطرۃً اس کے سپرد ہے وہ اس کا متحمل ہے۔

علاوہ ازیں مردوں کی سیادت و نگرانی سے نکل کر عورت پورے اِنسانی معاشرہ کے لئے خطرۂ عظیم ہے، جس سے دُنیا میں فساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنے پیدا ہونا لازمی اور روزمرہ کا مشاہدہ ہے، اس لئے قرآنِ کریم نے عورتوں کے حقوقِ واجبہ کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ بھی اِرشاد فرمایا کہ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ یعنی مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اور دُوسرے لفظوں میں یہ کہ مرد ان کے نگراں اور ذمہ دار ہیں۔

مگر جس طرح اِسلام سے پہلے جاہلیتِ اُولیٰ میں اَقوامِ عالم سب اس غلطی کا شکار تھیں کہ عورتوں کو ایک گھریلو سامان یا چوپایہ کی حیثیت میں رکھا ہوا تھا، اسی طرح اِسلام کے زمانۂ اِنحطاط میں جاہلیتِ اُخریٰ کا دور شروع ہوا، اس میں پہلی غلطی کا رَدِّ عمل اس کے بالمقابل دُوسری غلطی کی صورت میں کیا جارہا ہے، کہ عورتوں پر مردوں کی اتنی سیادت سے بھی چھٹکارا حاصل کرنے اور کرانے کی سعیٔ مسلسل جاری ہے، جس کے نتیجے میں فحش و بے حیائی عام ہوگئی، دُنیا جھگڑوں اور فساد کا گھر بن گئی، قتل و خون ریزی کی اتنی کثرت ہوگئی کہ جاہلیتِ اُولیٰ کو مات دے دی، عرب کا مشہور مقولہ ہے: "اَلْجَاهِلُ إِمَّا مُفْرِطٌ اَوْ مُفَرِّطٌ" (یعنی جاہل آدمی کبھی اِعتدال پر نہیں رہتا، اگر اِفراط یعنی حد سے زیادہ کرنے سے باز آجاتا ہے تو کوتاہی اور تقصیر میں مبتلا ہوجاتا ہے)۔

یہی حال اس وقت ابنائے زمانہ کا ہے کہ یا تو عورت کو اِنسان کہنے اور سمجھنے کے لئے بھی تیار نہ تھے، اور آگے بڑھے تو یہاں تک پہنچے کہ مردوں کی سیادت و نگرانی جو مردوں، عورتوں اور پوری دُنیا کے لئے عین حکمت و مصلحت ہے اس کا جوا بھی گردن سے اُتارا جارہا ہے، جس کے نتائج بد روزانہ آنکھوں کے سامنے آرہے ہیں، اور یقین کیجئے کہ جب تک وہ قرآن کے اُس اِرشاد کے سامنے نہ جھکیں گے ایسے فتنے روز بڑھتے رہیں گے۔

آج کی حکومتیں دُنیا میں قیامِ اَمن کے لئے روز نئے نئے قانون بناتی ہیں، اس کے لئے نئے نئے اِدارے قائم کرتی ہیں، کروڑوں روپیہ اُن پر صرف ہوتا ہے، لیکن فتنے جس چشمے سے پھوٹ رہے ہیں اس کی طرف دھیان نہیں

دیتیں، اگر آج کوئی کمیشن اس تحقیق کے لئے بٹھایا جائے کہ فساد و خون ریزی اور باہمی جنگ وجدل کے اسباب کی تحقیق کرے تو خیال یہ ہے کہ پچاس فی صد سے زائد ایسے جرائم کا سبب عورت اور اس کی بے مہار آزادی نکلے گی، مگر آج کی دُنیا میں نفس پرستی کے غلبے نے بڑے بڑے حکماء کی آنکھوں کو خیرہ کیا ہوا ہے، خواہشاتِ نفسانی کے خلاف کسی مصلحانہ قدغن کو گوارا نہیں کیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب کو نورِ ایمان سے منور فرمائیں اور اپنی کتاب اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر پورا عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں کہ وہی دُنیا و آخرت میں سرمایۂ سعادت ہے۔

مسئلہ:- اس آیت کے ضمن میں یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآنِ حکیم نے زوجین کو اُن کے ذمہ عائد ہونے والے فرائض بتلائے کہ مردوں کے ذمہ عورتوں کے حقوق ادا کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسے کہ عورتوں پر مردوں کے حقوق کا ادا کرنا فرض ہے۔ اس میں اِشارہ ہے کہ ہر فریق کو اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے بجائے اپنے فرائض پر نظر رکھنا چاہئے، اور اگر وہ ایسا کرلیں تو مطالبۂ حقوق کا قضیہ ہی درمیان میں نہیں آئے گا، کیونکہ مرد کے فرائض ادا ہوگئے تو خود بخود حقوق ادا ہوجائیں گے، آج کل دُنیا کے سارے جھگڑے یہاں سے چلتے ہیں کہ ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ تو سامنے رکھتا ہے مگر اپنے فرائض کی ادائیگی سے غافل ہے۔

اس کا نتیجہ مطالبۂ حقوق کی جنگ ہوتی ہے جو آج کل عام طور پر حکومتوں اور عوام میں، زوجین میں، اور دُوسرے اہلِ معاملہ میں چلی ہوئی ہے۔ قرآنِ کریم کے اس اِشارہ نے معاملہ کے رُخ کو یوں بدلا ہے کہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے فرائض پورا کرنے کا اِہتمام کرے، اور اپنے حقوق کے معاملہ میں مساہلت اور عفو و درگزر سے کام لے، اگر اس قرآنی تعلیم پر دُنیا میں عمل ہونے لگے تو گھروں اور خاندانوں کے بلکہ ملکوں اور حکومتوں کے بیشتر نزاعات ختم ہوجائیں۔

مرد و عورت میں درجہ کا تفوق دُنیوی معاملات میں ہے، آخرت کی فضیلت میں اس کا کوئی اثر نہیں

دُنیا میں نظامِ عالم اور اِنسانی فطرت اور خود عورتوں کی مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک قسم کی حاکمیت اور نگرانی کا نہ صرف حق دیا جائے بلکہ اُن پر لازم کیا جائے، اسی کا بیان آیت: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء:۳۴) میں آیا ہے، لیکن اس سے سب مردوں کا سب عورتوں سے افضل ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ فضیلت عنداللہ کا تمام تر مدار ایمان اور عملِ صالح پر ہے، وہاں درجات کی ترقی و تنزل ایمان اور عمل کے درجات کے مطابق ہوتا ہے، اس لئے اُمورِ آخرت میں یہ ضروری نہیں کہ مردوں ہی کا درجہ عورتوں سے بلند رہے، یہ بھی ہوسکتا ہے اور حسبِ تصریح آیات

وروایات ایسا ہوگا بھی کہ بعض عورتیں اپنی طاعت وعبادت کے ذریعہ بہت سے مردوں پر فائق ہوجائیں گی، اُن کا درجہ بہت سے مردوں سے بڑھ جائے گا۔

قرآن مجید میں اَحکامِ شرعیہ اور اعمال کی جزا وسزا اور ثواب وعذاب کے بیان میں اگرچہ حسبِ تصریحِ قرآنِ کریم عورتیں اور مرد بالکل برابر ہیں، اور جن اَحکام میں کچھ فرق ہے، ان کو مستقل طور پر وضاحت کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے، لیکن عام طور پر خطاب مردوں کو کیا گیا ہے، اور صیغے مذکر کے اِستعمال کئے گئے ہیں، اور یہ بات صرف قرآنِ کریم کے ساتھ مخصوص نہیں، عام طور پر حکومتوں کے قوانین میں بھی صیغے مذکر کے اِستعمال کئے جاتے ہیں، حالانکہ قانون مرد وعورت کے لئے عام ہوتا ہے، اس کا ایک سبب تو وہی فرق ہے جس کا ذِکر قرآنِ کریم کی آیات میں مذکور ہوا ہے، کہ مردوں کو عورتوں پر ایک حیثیت سے تفوق حاصل ہے۔

دُوسری بات شاید یہ بھی مضمر ہو کہ مستورات کے ذِکر کے لئے بھی ستر ہی بہتر ہے، لیکن قرآنِ کریم میں جابجا مردوں کی طرح عورتوں کا ذِکر نہ ہونے سے اُن کو خیال پیدا ہوا تو اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اِظہار کیا تو سورۂ اَحزاب کی یہ آیت نازل ہوگئی: اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ الآیہ (الاحزاب:۳۵) جس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا مستقل ذِکر واضح کردیا گیا کہ طاعت وعبادت اور اس کی وجہ سے حق تعالیٰ کے قرب ورضا اور درجاتِ جنت میں عورتوں کا درجہ مردوں سے کچھ کم نہیں۔ (یہ روایت نسائی، مسندِ احمد اور تفسیر ابنِ جریر وغیرہ میں مفصل مذکور ہے) [1]

اور تفسیر ابنِ کثیر میں ایک روایت یہ ہے کہ بعض مسلمان عورتیں اَزواجِ مطہراتؓ کے پاس آئیں اور کہا کہ قرآنِ کریم میں جابجا مردوں کا تو ذِکر ہے، عورتوں میں سے اَزواجِ مطہرات کا بھی مستقل تذکرہ ہے مگر عام مسلمان عورتوں کا ذِکر نہیں، اس پر آیتِ مذکورہ نازل ہوئی۔ [2]

خلاصہ یہ ہے کہ دُنیوی نظام میں عورتوں پر مردوں کا ایک گونہ تفوق اور حاکمیت ان کی مصلحت اور حکمت کا تقاضا ہے، ورنہ نیک وبدعمل کی جزا وسزا اور درجات کا آخرت میں کوئی فرق نہیں۔

قرآنِ کریم میں ایک دُوسری جگہ یہی مضمون اور بھی وضاحت سے اس طرح مذکور ہے:-

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (النحل:۹۷)

''یعنی جو مرد وعورت نیک عمل کرے اور وہ مؤمن بھی ہو، تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔''

---

[1] تفسیر ابن جریر ج:۷ ص:۴۸۶ فی تفسیر سورة آل عمران:۱۹۵، والسنن الکبریٰ للنسائیؒ رقم الحدیث:۱۱۴۰۴، ومسند احمد رقم الحدیث:۲۶۳۳۴

[2] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج:۶ ص:۴۱۷

اس تمہید کے بعد اصل آیت کے الفاظ پر غور کیجئے، اِرشاد فرمایا: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ یعنی ''ان کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں جیسے کہ اُن کے ذمے مردوں کے حقوق ہیں۔'' اس میں عورتوں کے حقوق کا ذِکر مردوں کے حقوق سے پہلے کیا، جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرد تو اپنی قوّت اور خداداد تفوق کی بنا پر عورت سے اپنے حقوق وصول کر ہی لیتا ہے، فکر عورتوں کے حقوق کی ہونی چاہئے کہ وہ عادۃً اپنے حقوق زبردستی وصول نہیں کرسکتیں۔

دُوسرا اِشارہ اس میں یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورت کے حقوق ادا کرنے میں مسابقت کرنا چاہئے، اور یہاں جو لفظ ''مثل'' کے ساتھ دونوں کے حقوق کی مثلیت اور مساوات کا اِرشاد ہے اس کا یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جس طرح کے کام مرد کرے اسی طرح کے عورت بھی، یا برعکس کیونکہ مرد و عورت میں تقسیمِ کار اور ہر ایک کے فرائض فطرۃً جدا جدا ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ دونوں کے حقوق کی ادائیگی یکساں طور پر واجب ہے، اور اس میں کوتاہی اور تقصیر کی سزا بھی یکساں ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ قرآنِ کریم نے ایک مختصر سے جملے میں ایک عظیم الشان دفترِ حقوق وفرائض کو کیسا سمویا ہے، کیونکہ مفہومِ آیت میں عورتوں کے تمام حقوق مردوں پر، اور مردوں کے تمام حقوق عورتوں پر داخل اور شامل ہیں (بحرِ محیط)، اس جملے کے آخر میں ایک لفظ بِالْمَعْرُوفِ اور بڑھا کر آپس میں پیش آنے والے جھگڑوں کا خاتمہ فرمادیا کہ حقوق کی ادائیگی معروف طریقے پر کی جائے، کیونکہ معروف کے معنی یہ ہیں کہ جو شرعاً بھی منکر و ناجائز نہ ہو اور عام عادات اور عرف کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی تشدد اور زیادتی نہ ہو، اس کا حاصل یہ ہوا کہ زوجین کے حقوق اور ان کو اَذیت سے بچانے کے معاملہ میں خالص ضابطہ پری کافی نہیں، بلکہ عام عرف وعادت کے اِعتبار سے دیکھا جائے گا کہ اس معاملہ میں دُوسرے کو کوئی اِیذا یا ضرر تو نہیں پہنچتا، جو چیزیں عرف وعادت کے اِعتبار سے اِیذا اور اِضرار کی قرار دی جائیں وہ ممنوع و ناجائز ہوں گی، مثلاً بے رُخی، بے اِلتفاتی یا ایسے افعال اور حرکات جن سے دُوسرے کو اِیذا پہنچے، یہ چیزیں قانونی دفعات میں تو نہیں آسکتیں، مگر بِالْمَعْرُوفِ کے لفظ نے ان کا اِحاطہ کرلیا۔ اس کے بعد فرمایا: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ اس کا مشہور مطلب ومفہوم تو یہی ہے کہ حقوقِ طرفین مساوی ہونے کے باوجود حق تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کا تفوق اور حاکمیت عطا فرمادی ہے، اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں جس کی طرف آخرِ آیت کے الفاظ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۲۸﴾ میں اِشارہ فرمادیا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس جملے کا مطلب یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مقابلہ میں بڑا درجہ دیا ہے، اس لئے اُن کو زیادہ تحمل سے کام لینا چاہئے کہ اگر عورتوں کی طرف سے اُن کے حقوق میں کوئی کوتاہی ہو بھی جائے تو اُن کا درجہ یہ ہے کہ یہ اس کو برداشت کریں، اور صبر سے کام لیں، اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔ (قرطبی) [1]

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۳ ص:۱۲۵

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ

طلاقِ رجعی ہے دو بار تک، اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بھلی طرح سے،

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ

اور تم کو روا نہیں کہ لے لو کچھ اپنا دِیا ہوا عورتوں سے مگر جبکہ خاوند عورت دونوں ڈریں اس بات سے

اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ

کہ قائم نہ رکھ سکیں گے حکم اللہ کا، پھر اگر تم لوگ ڈرو اس بات سے کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کا حکم تو کچھ گناہ نہیں

عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ

دونوں پر اس میں کہ عورت بدلہ دے کر چھوٹ جاوے، یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، سو ان سے آگے مت بڑھو،

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا

اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی لوگ ہیں ظالم۔ پھر اگر اس عورت کو طلاق دی (یعنی تیسری بار)

فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا

تو اَب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک کہ نکاح نہ کر لے کسی خاوند سے اس کے سوا، پھر اگر طلاق دیدے دُوسرا خاوند

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ

تو کچھ گناہ نہیں اُن دونوں پر کہ باہم مل جاویں اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم، اور یہ

حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ کی، بیان فرماتا ہے ان کو واسطے جاننے والوں کے۔

آسان ترجمۂ قرآن

طلاق (زیادہ سے زیادہ) دوبار ہونی چاہئے۔ اس کے بعد (شوہر کے لئے دو ہی راستے ہیں) یا تو قاعدے کے مطابق (بیوی کو) روک رکھے (یعنی طلاق سے رُجوع کر لے) یا خوش اُسلوبی سے چھوڑ دے (یعنی رُجوع کے بغیر عدت گذر جانے دے)۔ اور (اے شوہرو!) تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ تم نے ان (بیویوں) کو جو کچھ دیا ہو وہ (طلاق کے بدلے) ان سے واپس لو، اِلّا یہ کہ دونوں کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ (نکاح باقی رہنے کی صورت میں) اللہ کی مقرّر کی ہوئی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ چنانچہ اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں کے لئے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورت مالی معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔ یہ اللہ کی مقرّر کی ہوئی حدود ہیں، لہٰذا ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ (۲۲۹) پھر اگر شوہر (تیسری) طلاق دیدے تو وہ (مطلقہ عورت) اس کے لئے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک وہ کسی اور شوہر سے نکاح نہ کرے۔ ہاں اگر وہ (دوسرا شوہر بھی) اسے طلاق دیدے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے پاس (نیا نکاح کر کے) دوبارہ واپس آجائیں، بشرطیکہ انہیں یہ غالب گمان ہو کہ اب وہ اللہ کی حدود قائم رکھیں گے۔ اور یہ سب اللہ کی حدود ہیں جو وہ ان لوگوں کے لئے واضح کر رہا ہے جو سمجھ رکھتے ہوں۔ (۲۳۰)

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۵:- طلاقِ رجعی کی تعداد

طلاق دو مرتبہ کی ہے، پھر (دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد دو اِختیار ہیں) خواہ (یہ کہ رجعت کر کے عورت کو) قاعدہ کے مطابق رکھ لے، خواہ (یہ کہ رجعت نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، اور اس طرح) اچھے طریقے سے اس کو چھوڑ دے۔

حکم نمبر ۲۶:- خُلَع

اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ (بیبیوں کو چھوڑنے کے وقت ان سے) کچھ بھی لو (اگرچہ وہ لیا ہوا) اسی (مال) میں سے (کیوں نہ ہو) جو تم نے (ہی مہر میں) ان کو دِیا تھا مگر (ایک صورت البتہ حلال ہے، وہ) یہ کہ (کوئی) میاں بیوی (ایسے ہوں کہ) دونوں کو خطرہ ہو کہ (دربارۂ حقوقِ زوجیت) وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ ضابطوں کو قائم نہ رکھ

سکیں گے، سو اگر تم کو (یعنی میاں بیوی کو) یہ خطرہ ہو کہ وہ دونوں ضوابطِ خداوندی کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا، اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑائے (بشرطیکہ مہر سے زیادہ نہ ہو) یہ سب اَحکام خدائی ضابطے ہیں، تم ان سے باہر نہ نکلنا، اور جو شخص خدائی ضابطوں (کو توڑ کر) باہر نکل جائے تو ایسے لوگ اپنا ہی نقصان کرنے والے ہیں۔

حکم نمبر ۲۷:- تین طلاقوں کے بعد حلالہ

پھر اگر (دو طلاق کے بعد) کوئی (تیسری) طلاق (بھی) دیدے تو پھر وہ عورت اس (تیسری طلاق دینے) کے بعد اس شخص کے لئے حلال نہ ہوگی جب تک وہ اس خاوند کے سوا دُوسرے شخص کے ساتھ (عدت کے بعد) نکاح نہ کرے (اور حقوقِ زوجیت صحبت کے ادا نہ کرے)، پھر اگر یہ دُوسرا خاوند اس کو طلاق دیدے (اور اس کی عدت بھی گزر جائے) تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ دوبارہ (آپس میں نکاح کر کے) بدستور پھر مل جاویں، بشرطیکہ دونوں کو اپنے اُوپر یہ اِعتماد ہو کہ آئندہ خداوندی ضابطوں کو قائم رکھیں گے، اور یہ خداوندی ضابطے ہیں، حق تعالیٰ ان کو بیان فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے جو دانش مند ہیں۔

معارف و مسائل

طلاق و نکاح کے اَحکام پورے قرآنِ کریم میں بہت سی آیتوں میں آئے ہیں، مگر یہ چند آیتیں جو یہاں مذکور ہیں طلاق کے معاملہ میں اہم ضابطوں کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کو سمجھنے کے لئے پہلے نکاح کی شرعی حیثیت کو جاننا ضروری ہے۔

نکاح و طلاق کی شرعی حیثیت اور حکیمانہ نظام

نکاح کی ایک حیثیت تو ایک باہمی معاملے اور معاہدے کی ہے، جیسے بیع و شراء اور لین دین کے معاملات ہوتے ہیں۔ دُوسری حیثیت ایک سنت اور عبادت کی ہے، اس پر تو تمام اُمت کا اِتفاق ہے کہ نکاح عام معاملات و معاہدات سے بالاتر ایک حیثیت شرعی عبادت و سنت کی رکھتا ہے، اسی لئے نکاح کے منعقد ہونے کے لئے باجماعِ اُمت کچھ ایسی شرائط ضروری ہیں جو عام معاملاتِ بیع و شراء میں نہیں ہوتیں۔

اوّل تو یہ کہ ہر عورت سے اور ہر مرد سے نکاح نہیں ہوسکتا، اس میں شریعت کا ایک **مستقل قانون** ہے، جس کے تحت بہت سی عورتوں اور مردوں کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا۔

دُوسرے تمام معاملات و معاہدات کے منعقد اور مکمل ہونے کے لئے کوئی گواہی شرط نہیں، گواہی کی ضرورت اس

وقت پڑتی ہے جب فریقین میں اختلاف ہو جائے، لیکن نکاح ایسا معاملہ نہیں، یہاں اس کے منعقد ہونے کے لئے بھی گواہوں کا سامنے ہونا شرط ہے، اگر دو مرد و عورت بغیر گواہوں کے آپس میں نکاح کرلیں، اور دونوں میں کوئی فریق کبھی اختلاف و انکار بھی نہ کرے اس وقت بھی شرعاً وہ نکاح باطل کالعدم ہے جب تک گواہوں کے سامنے دونوں کا ایجاب وقبول نہ ہو، اور سنت یہ ہے کہ نکاح اعلانِ عام کے ساتھ کیا جائے، اسی طرح کی اور بہت سی شرائط اور آداب ہیں جو معاملۂ نکاح کے لئے ضروری یا مسنون ہیں۔

امامِ اعظم ابوحنیفہؒ اور بہت سے دُوسرے حضراتِ ائمہؒ کے نزدیک تو نکاح میں معاملہ اور معاہدہ کی حیثیت سے زیادہ عبادت وسنت کی حیثیت غالب ہے، اور قرآن وسنت کے شواہد اس پر قائم ہیں۔

نکاح کی اجمالی حقیقت معلوم کرنے کے بعد طلاق کو سمجھئے، طلاق کا حاصل نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ختم کرنا ہے، جس طرح شریعتِ اسلام نے نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ایک عبادت کی حیثیت دے کر عام معاملات ومعاہدات کی سطح سے بلند رکھا ہے اور بہت سی پابندیاں اس پر لگائی ہیں، اسی طرح اس معاملہ کا ختم کرنا بھی عام لین دین کے معاملات کی طرح آزاد نہیں رکھا، کہ جب چاہے جس طرح چاہے اس معاملہ کو فسخ کردے، اور دُوسرے سے معاملہ کرلے، بلکہ اس کے لئے ایک خاص حکیمانہ قانون بنایا ہے، جس کا بیان آیاتِ مذکورہ میں کیا گیا ہے۔

اِسلامی تعلیمات کا اصل رُخ یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لئے ہو، اس کے توڑنے اور ختم کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے، کیونکہ اس معاملہ کے انقطاع کا اثر صرف فریقین پر نہیں پڑتا، نسل واولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں میں فساد تک کی نوبت پہنچتی ہے، اور پورا معاشرہ بری طرح اس سے متأثر ہوتا ہے، اسی لئے جو اَسباب اور وجوہ اس معاملہ کو توڑنے کا سبب بن سکتے ہیں قرآن وسنت کی تعلیمات نے ان تمام اسباب کو راہ سے ہٹانے کا پورا انتظام کیا ہے، زوجین کے ہر معاملے اور ہر حال کے لئے جو ہدایتیں قرآن وسنت میں مذکور ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے، ٹوٹنے نہ پائے، ناموافقت کی صورت میں اوّل اِفہام وتفہیم کی پھر زجر وتنبیہ کی ہدایتیں دی گئیں، اور اگر بات بڑھ جائے اور اس سے بھی کام نہ چلے تو خاندان ہی کے چند اَفراد کو حَکَم اور ثالث بنا کر معاملہ طے کرنے کی تعلیم دی، آیت: حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا (النساء:۳۵) میں خاندان ہی کے افراد کو ثالث بنانے کا اِرشاد کس قدر حکیمانہ ہے، کہ اگر معاملہ خاندان سے باہر گیا تو بات بڑھ جانے اور دِلوں میں زیادہ بعد پیدا ہوجانے کا خطرہ ہے۔

لیکن بعض اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ اِصلاحِ حال کی تمام کوششیں ناکام ہوجاتی ہیں، اور تعلقِ نکاح کے مطلوبہ ثمرات حاصل ہونے کے بجائے طرفین کا آپس میں مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے، ایسی حالت میں اس

اِزدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی طرفین کے لئے راحت اور سلامتی کی راہ ہوجاتی ہے، اس لئے شریعتِ اِسلام نے بعض دُوسرے مذاہب کی طرح یہ بھی نہیں کیا کہ رشتۂ اِزدواج ہر حال میں ناقابلِ فسخ ہی رہے، بلکہ طلاق اور فسخِ نکاح کا قانون بنایا، طلاق کا اِختیار تو صرف مرد کو دِیا، جس میں عادۃً فکر و تدبر اور تحمل کا مادّہ عورت سے زائد ہوتا ہے، عورت کے ہاتھ میں یہ آزاد اِختیار نہیں دیا، تاکہ وقتی تأثرات سے مغلوب ہوجانا جو عورت میں بہ نسبت مرد کے زیادہ ہے وہ طلاق کا سبب نہ بن جائے۔

لیکن عورت کو بھی بالکل اس حق سے محروم نہیں رکھا کہ وہ شوہر کے ظلم وستم سہنے ہی پر مجبور ہوجائے، اس کو یہ حق دیا کہ حاکمِ شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے اور شکایات کا ثبوت دے کر نکاح فسخ کراسکے یا طلاق حاصل کرسکے، پھر مرد کو طلاق کا آزادنہ اِختیار تو دے دیا مگر اوّل تو یہ کہہ دیا کہ اس اِختیار کا اِستعمال کرنا اللہ کے نزدیک بہت مبغوض و مکروہ ہے، صرف مجبوری کی حالت میں اِجازت ہے، حدیث میں اِرشادِ نبوی ہے:-

اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ۔ [1]

''یعنی حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔''

دُوسری پابندی یہ لگائی کہ حالتِ غیظ وغضب میں یا کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری میں اس اِختیار کو اِستعمال نہ کریں، اِسی حکمت کے ماتحت حالتِ حیض میں طلاق دینے کو ممنوع قرار دِیا، اور حالتِ طہر میں بھی جس طہر میں صحبت وہم بستری ہوچکی ہے، اس میں طلاق دینے کو اس بنا پر ممنوع قرار دِیا کہ اس کی وجہ سے عورت کی عدت طویل ہوجائے گی، اس کو تکلیف ہوگی، ان دونوں چیزوں کے لئے قرآنِ کریم کا اِرشاد یہ آیا: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (الطّلاق:۱) یعنی طلاق دینا ہو تو ایسے وقت میں دو جس میں بلاوجہ عورت کی عدت طویل نہ ہو، حیض کی حالت میں طلاق ہوئی تو موجودہ حیض عدت میں شمار نہ ہوگا، اس کے بعد طہر اور پھر طہر کے بعد حیض سے عدت شمار ہوگی، اور جس طہر میں ہم بستری ہوچکی ہے، اس میں یہ اِمکان ہے کہ حمل رہ گیا ہو، تو عدت وضعِ حمل تک طویل ہوجائے گی۔ طلاق دینے کے لئے مذکورہ وقت طہر کا مقرر کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ اس اِنتظار کے وقفہ میں بہت ممکن ہے کہ غصہ فرو ہو، معافی تلافی ہوکر طلاق کا اِرادہ ہی ختم ہوجائے۔

تیسری پابندی یہ لگائی کہ معاہدۂ نکاح توڑنے اور فسخ کرنے کا طریقہ بھی وہ نہیں رکھا جو عام بیع وشراء کے معاملات و معاہدات کا ہے کہ ایک مرتبہ معاہدہ فسخ کردیا تو اسی وقت اسی منٹ میں فریقین آزاد ہوگئے، اور پہلا معاملہ بالکل ختم ہوگیا، ہر ایک کو اِختیار ہوگیا کہ دُوسرے سے معاہدہ کرلے، بلکہ معاملۂ نکاح کو قطع کرنے کے لئے اوّل تو اس کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے، پھر اس پر عدت کی پابندی لگادی کہ عدت پوری ہونے تک معاملۂ نکاح

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب النکاح، باب الخلع والطّلاق ج:۲ ص:۲۸۳

کے بہت سے اثرات باقی رہیں گے، عورت کو دُوسرا نکاح حلال نہ ہوگا، مرد کے لئے بھی بعض پابندیاں باقی رہیں گی۔

چوتھی پابندی یہ لگائی کہ اگر صاف وصریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دی گئی ہے تو طلاق دیتے ہی نکاح نہیں ٹوٹا، بلکہ رشتۂ اِزدواج عدت پوری ہونے تک قائم ہے، دورانِ عدت میں اگر یہ اپنی طلاق سے رُجوع کرلے تو نکاحِ سابق بحال ہوجائے گا۔

لیکن یہ رُجوع کرنے کا اِختیار صرف ایک یا دو طلاق تک محدود کردیا گیا، تاکہ کوئی ظالم شوہر ایسا نہ کرسکے کہ ہمیشہ طلاق دیتا رہے، پھر رُجوع کرکے اپنی قید میں رکھتا رہے، اس لئے حکم یہ دے دیا کہ اگر کسی نے تیسری طلاق بھی دے دی تو اَب اس کو رُجوع کرنے کا بھی اِختیار نہیں، بلکہ اگر دونوں راضی ہوکر آپس میں دوبارہ بھی نکاح کرنا چاہیں تو بغیر ایک مخصوص صورت کے جس کا ذِکر آگے آتا ہے، دوبارہ نکاح بھی آپس میں حلال نہیں۔

آیاتِ مذکورہ میں اسی نظامِ طلاق کے اہم اَحکام کا ذِکر ہے، اب ان آیات کے الفاظ پر غور کیجئے، پہلی آیت میں اوّل تو اِرشاد فرمایا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۠ یعنی طلاق دو ہی مرتبہ ہے، پھر ان دونوں مرتبہ کی طلاقوں میں یہ لچک رکھ دی کہ ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوا، بلکہ عدت پوری ہونے تک مرد کو اِختیار ہے کہ رُجوع کرکے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے یا پھر رُجوع نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، عدت پوری ہونے پر نکاح کا تعلق ختم ہوجائے گا، اسی مضمون کو ان الفاظ میں اِرشاد فرمایا: فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۭ یعنی یا تو شرعی قاعدے کے مطابق رجعت کرکے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر خوب صورتی اور خوش معاملگی کے ساتھ اس کی عدت پوری ہونے دے تاکہ وہ آزاد ہوجائے۔

ابھی تیسری طلاق کا ذِکر نہیں آیا، درمیان میں ایک اور مسئلہ بیان فرمادیا جو ایسے حالات میں عموماً زیرِ بحث آجاتا ہے، وہ یہ کہ بعض ظالم شوہر بیوی کو نہ رکھنا چاہتے ہیں، نہ اُس کے حقوق کی فکر کرتے ہیں، نہ طلاق دیتے ہیں، بیوی تنگ ہوتی ہے، اس کی مجبوری سے یہ ناجائز فائدہ اُٹھاکر طلاق دینے کے لئے اس سے کچھ مال کا یا کم از کم مہر کی معافی یا واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں، قرآنِ کریم نے اس کو حرام قرار دِیا، اِرشاد فرمایا: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْھُنَّ شَيْـــًٔا یعنی ''تمہارے لئے حلال نہیں کہ طلاق کے معاوضہ میں اُن سے اپنا دیا ہوا مال اور مہر وغیرہ واپس لے لو۔''

البتہ ایک صورت اس سے مستثنیٰ فرمادی کہ اس میں مہر کی واپسی یا معافی جائز کردی، وہ یہ کہ عورت بھی یہ محسوس کرے کہ طبیعتوں میں بعد ومخالفت کی وجہ سے میں شوہر کے حقوق ادا نہیں کرسکتی، اور مرد بھی یہی سمجھے تو ایسی صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ مہر کی واپسی یا معافی کے بدلے میں طلاق دی جائے اور لی جائے۔

یہ مسئلہ ضمنی بیان فرمانے کے بعد پھر تیسری طلاق کا ذِکر اس طرح فرمایا: فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ یعنی اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی (جو شرعاً پسندیدہ نہ تھی) تو اَب نکاح کا معاملہ بالکلیہ ختم ہوگیا،

اس کو رجعت کرنے کا کوئی اختیار نہ رہا، اور چونکہ اس نے شرعی حدود سے تجاوز کیا کہ بلا وجہ تیسری طلاق دے دی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو وہ بھی نہیں کر سکتے، اب ان کے آپس میں دوبارہ نکاح کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عورت (عدتِ طلاق پوری کرکے) کسی دُوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوقِ زوجیت ادا کرکے دُوسرے شوہر کے ساتھ رہے، پھر اگر اتفاق سے وہ دُوسرا شوہر بھی طلاق دیدے (یا مرجائے) تو اس کی عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہوسکتا ہے، آیت کے آخری جملے فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ کا یہی مطلب ہے۔

تین طلاق اور اس کے اَحکام کی تفصیل

یہاں قرآنِ کریم کے اُسلوبِ بیان پر غور کرنے سے یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ طلاق دینے کا اصل شرعی طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاق تک پہنچا جائے، تیسری طلاق تک نوبت پہنچانا مناسب نہیں، الفاظِ آیت: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کے بعد تیسری طلاق کو حرف "اِنْ" کے ساتھ فَاِنْ طَلَّقَهَا فرمانے میں اس کی طرف اِشارہ موجود ہے، ورنہ سیدھی تعبیر یہ تھی کہ "اَلطَّلَاقُ ثَلٰثٌ" کہا جاتا، اس کو چھوڑ کر یہ تعبیر اختیار کرنے میں واضح اِشارہ ہے کہ تیسری طلاق تک پہنچنا نہیں چاہئے، یہی وجہ ہے کہ اِمام مالکؒ اور بہت سے فقہاء نے تیسری طلاق کی اِجازت ہی نہیں دی، وہ اس کو "طلاقِ بدعت" کہتے ہیں، اور دُوسرے فقہاء نے تین طلاق کو صرف اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ الگ الگ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں، اِن فقہاء کی اِصطلاح میں اس کو بھی "طلاقِ سنت" کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں ہے کہ اس طرح تین طلاقیں دینا مسنون اور محبوب ہے، بلکہ طلاقِ بدعت کے مقابلے میں اس کو طلاقِ سنت اس معنی سے کہہ دیا گیا کہ یہ صورت بھی بدعت میں داخل نہیں۔

قرآن وسنت کے اِرشادات اور تعاملِ صحابہؓ و تابعینؒ سے عددِ طلاق کے متعلق جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے تو طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے کہ صرف ایک طلاق حالتِ طہر میں دیدے جس میں مجامعت نہ کی ہو، اور یہ ایک طلاق دے کر چھوڑ دے، عدت ختم ہونے کے ساتھ رشتۂ نکاح خود ٹوٹ جائے گا، اس کو فقہاء نے "طلاقِ احسن" کہا ہے، اور حضراتِ صحابہؓ نے اسی کو طلاق کا بہتر طریق قرار دیا ہے۔

ابنِ ابی شیبہؒ نے اپنے مصنف میں حضرت ابراہیم نخعیؒ سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ طلاق دینے میں اس کو پسند کرتے تھے کہ صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دی جائے اور عدتِ طلاق تین حیض پورے ہونے دیئے جائیں تاکہ عورت آزاد ہوجائے۔[1]

[1] مصنّف ابن ابی شیبة، کتاب الطلاق ج:۴ ص:۵

قرآنِ کریم کے الفاظِ مذکورہ سے اس کی بھی اِجازت نکلتی ہے کہ دوطلاق تک دے دی جائیں، مگر مَرَّتٰنِ کے لفظ میں اس طرف اِشارہ فرمادیا گیا ہے کہ دوطلاق بیک لفظ و بیک وقت نہ ہوں بلکہ دوطہروں میں الگ الگ ہوں، "اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ" سے بھی دوطلاق کی اِجازت ثابت ہوسکتی تھی، مگر مَرَّتٰنِ ایک ترتیب وتراخی کی طرف مشیر ہے، جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ دوطلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں، مثال سے یوں سمجھئے کہ کوئی شخص کسی کو دوروپیہ ایک دفعہ دیدے تو اس کو دومرتبہ دینا نہیں کہتے، الفاظِ قرآن میں دومرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہر میں دوطلاق دی جائیں۔ (رُوح المعانی)

بہرحال دوطلاقوں تک قرآنِ حکیم کے الفاظ سے ثابت ہے، اس لئے باتفاقِ اَئمہ وفقہاء یہ طلاق سنت میں داخل ہے، یعنی بدعت نہیں، تیسری طلاق کے غیر مستحسن ہونے کی طرف تو خود اُسلوبِ قرآن میں واضح اِشارہ پایا جاتا ہے، اس کے غیر مستحسن ہونے میں کسی کا بھی اِختلاف نہیں۔

اور حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اِرشاد سے تیسری طلاق کا مبغوض ومکروہ ہونا ثابت ہوتا ہے، اِمام نسائی نے بروایت محمود بن لبیدؓ نقل کیا ہے کہ:-

اُخْبِرَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَّجُلٍ طَلَّقَ امْرَاَتَهٗ ثَلَاثَ تَطْلِيْقَاتٍ جَمِيْعًا فَقَامَ غَضْبَانًا ثُمَّ قَالَ: اَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللهِ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ، حَتّٰى قَامَ رَجُلٌ وَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! اَلَا اَقْتُلُهٗ؟ (نسائی، کتاب الطّلاق ج:٢ ص:٩٨) [١]

"رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک آدمی کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں، آپ غصہ ہوکر کھڑے ہوگئے اور فرمایا: کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں، اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! کیا میں اس کو قتل نہ کردوں؟"

اس حدیث کی اسناد کو حافظ ابنِ قیمؒ نے صحیح علیٰ شرطِ مسلم قرار دِیا ہے (زادُالمعاد)، اور جوہرنقی میں علامہ ماوردیؒ نے اس حدیث کی سند کو صحیح اور ابنِ کثیرؒ نے اسناد جید، ابنِ حجرؒ نے رُوَاتُهٗ مُوَثَّقُوْنَ فرمایا ہے۔ [٢]

اسی بنا پر حضرت اِمام مالکؒ اور بعض دُوسرے اَئمہ فقہاء نے تیسری طلاق کو مطلقاً ناجائز اور طلاقِ بدعت قرار دِیا ہے، دُوسرے اَئمہ نے تین طہروں میں تین طلاقوں کو اگرچہ طلاقِ سنت میں داخل کہہ کر طلاقِ بدعت سے نکال دیا ہے، مگر اس کے غیر مستحسن ہونے میں کسی کو اِختلاف نہیں۔

[١] نسائی کتاب الطّلاق، باب الثلث المجموعة وما فيه من التغليظ ج:٢ ص:٩٩

[٢] یعنی حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کے راوی قابلِ اعتماد ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلام نے جو طلاق کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تینوں درجوں کو عبور کرنا ضروری یا بہتر ہے، بلکہ منشا شریعت کا تو یہ ہے کہ اوّل تو طلاق پر اِقدام ہی ایک مبغوض و مکروہ فعل ہے، اگر بمجبوری اس اِقدام کی نوبت آجائے تو اس کے کم سے کم درجے یعنی ایک طلاق پر اِکتفا کیا جائے اور عدت گزرنے دیں، تو عدت ختم ہوتے ہی یہی ایک طلاق رشتۂ زوجیت قطع کرنے کے لئے کافی ہوجائے گی، اور عورت آزاد ہوکر دُوسرے شخص سے نکاح کرسکے گی، یہی طریقہ طلاق اَحسن کہلاتا ہے، اس طریقے میں یہ حکمت اور فائدہ بھی ہے کہ صریح الفاظِ طلاق سے ایک طلاق دینے کی صورت میں طرفین کے لئے مصالحت کی راہیں کھلی رہیں گی، عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے تو صرف طلاق سے رُجوع کرلینا بقائے نکاح کے لئے کافی ہوگا، اور عدت ختم ہوجانے کے بعد اگرچہ نکاح ٹوٹ چکے گا اور عورت آزاد ہوجائے گی، مگر پھر بھی یہ گنجائش باقی رہے گی کہ اگر دونوں میں اب مصالحت ہوجائے اور باہم نکاح کرنا چاہیں تو نکاحِ جدید اسی وقت ہوسکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص اس طلاقِ اَحسن کے طریقے پر اِکتفا نہ کرے، دورانِ عدت میں مزید ایک طلاق صریح اور صاف لفظوں میں دیدے تو اس نے قطعِ نکاح کے دو درجے طے کرلئے جس کی ضرورت نہ تھی، اور ایسا کرنا شرعاً پسندیدہ بھی نہ تھا، مگر بہرحال دو درجے طے ہوگئے، مگر ان دو درجوں کے طے ہوجانے تک بھی بات وہی رہی کہ دورانِ عدت میں رجعت کا اِختیار باقی ہے، اور عدت ختم ہوجانے کے بعد بتراضیٔ طرفین نکاحِ جدید ہوسکتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دو طلاق تک پہنچنے میں شوہر نے اپنے اِختیارات کی ایک کڑی اور توڑ ڈالی اور اس سرحد پر پہنچ گیا کہ اگر اَب ایک مرتبہ بھی طلاق دیدے تو معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے۔

جس شخص نے یہ دو درجے طلاق کے طے کرلئے اس کے لئے آگے یہ ہدایت دی گئی: فَإِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌۢ بِإِحْسَانٍ اس میں فَإِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوفٍ کے لفظوں میں دو حکم بتلائے گئے، اوّل یہ کہ عدت کے دوران رجعت کرلینا نکاحِ جدید کا محتاج نہیں، بلکہ صرف اِمساک یعنی طلاق سے رجعت کرکے روک لینا کافی ہے، اگر ایسا کرلیا تو سابق نکاح ہی کی بنیاد پر تعلقِ زوجیت بحال ہوجائے گا۔

دُوسرے اس میں شوہر کو یہ ہدایت دی گئی کہ اگر اس کا اِرادہ اِصلاحِ حال اور صلح وصفائی کے ساتھ زندگی گزارنے کا ہے تب تو رجعت پر اِقدام کرے، ورنہ چھوڑ دے کہ عدت گزر کر تعلقِ زوجیت ختم ہوجائے، ایسا نہ ہو کہ بغیر اِرادۂ اِصلاح کے محض عورت کو پریشان کرنے کے لئے رجعت کرے۔

اس کے بالمقابل أَوْ تَسْرِيحٌۢ بِإِحْسَانٍ فرمایا، ''تسریح'' کے معنی کھول دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں، اس سے اِشارہ کردیا کہ قطعِ تعلق کے لئے کسی مزید طلاق یا دُوسرے کسی عمل کی ضرورت نہیں، بغیر رجعت کے عدّت ختم ہوجانا ہی

تعلقاتِ زوجیت ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔

اِمامِ حدیث ابوداوٗدؒ نے بروایت ابورزین اسدی نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول پر ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فرمایا، تیسری طلاق کا یہاں کیوں ذِکر نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ جو بعد میں مذکور ہے وہی تیسری طلاق ہے (رُوح المعانی)[1]، مطلب اس کا جمہور علماء کے نزدیک یہ ہے کہ جو کام تعلقاتِ زوجیت کے کلی اِنقطاع کا تیسری طلاق سے ہوتا، وہی کام اس طرزِ عمل سے ہوجائے گا کہ عدت کے اندر رجعت نہ کرے۔ اور جس طرح فَاِمْسَاكٌۢ کے ساتھ بِمَعْرُوْفٍ کی قید لگا کر یہ ہدایت فرمادی کہ رجعت کرکے بیوی کو روکا جائے تو حسنِ سلوک کے ساتھ روکا جائے، اسی طرح تَسْرِيْحٌۢ کے ساتھ بِاِحْسَانٍ کی قید لگا کر یہ ہدایت دے دی کہ طلاق ایک معاملہ کا فسخ ہے، شریف اِنسان کا کام یہ ہے کہ جس طرح معاملہ اور معاہدہ خوش دِلی اور حسنِ سلوک کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسی طرح اگر فسخِ معاہدہ کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو بھی غصہ یا لڑائی جھگڑے کے ساتھ نہ کریں، بلکہ وہ بھی احسان وسلوک کے ساتھ کریں، کہ رُخصت کے وقت مطلقہ بیوی کو کچھ تحفہ، کپڑے وغیرہ کا دے کر رُخصت کریں، جس کا ذِکر قرآنِ کریم کی دُوسری آیت میں ہے:-

وَمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ (البقرۃ:۲۳۶)

''یعنی مطلقہ بیوی کو کچھ جوڑا کپڑے کا دے کر رُخصت کریں مالی حیثیت کے مطابق۔''

اور اگر اس نے اس پر بھی ایسا نہ کیا بلکہ تیسری طلاق بھی دے ڈالی، تو اَب اس نے اپنے سارے اِختیارات شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر اَنداز کرکے بلاوجہ اور بلاضرورت ختم کردیئے، تو اَب اس کی سزا یہ ہے کہ نہ رجعت ہوسکے اور نہ بغیر دُوسری شادی کے آپس میں نکاح ہوسکے۔

اگر کسی غیر مستحسن یا غیر مشروع طریقہ سے تین طلاق دے دی تو اس کا اثر کیا ہوگا؟

اس کا جواب عقلی اور عرفی طور پر تو یہی ہے کہ کسی فعل کا جرم وگناہ ہونا اس کے مؤثر ہونے میں کہیں بھی مانع نہیں ہوتا، قتلِ ناحق جرم وگناہ ہے، مگر جس کو گولی یا تلوار مار کر قتل کیا گیا ہے وہ تو قتل ہو ہی جاتا ہے، اس کی موت تو اس کا اِنتظار نہیں کرتی کہ یہ گولی جائز طریقہ سے ماری گئی ہے یا ناجائز طریقہ سے، چوری کرنا باتفاقِ مذاہب جرم وگناہ ہے، مگر جو مال اس طرح غائب کردیا گیا وہ تو ہاتھ سے نکل ہی جاتا ہے، اسی طرح تمام معاصی اور جرائم کا یہی حال ہے کہ ان کا جرم وگناہ ہونا اُن کے مؤثر ہونے میں مانع نہیں ہوتا۔

[1] رُوح المعانی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۲ ص:۱۳۵

اس اُصول کا مقتضیٰ یہی ہے کہ شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کرنا اور بلا وجہ اپنے سارے اختیاراتِ طلاق کو ختم کر کے تین طلاق تک پہنچنا اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہوا جیسا کہ سابقہ روایت میں لکھا جاچکا ہے، اور اسی لئے جمہور اُمت کے نزدیک یہ فعل غیر مستحسن اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے، مگر ان سب باتوں کے باوجود جب کسی نے ایسا اقدام کرلیا تو اس کا وہی اثر ہونا چاہئے جو جائز طلاق کا ہوتا، یعنی تین طلاق واقع ہوجائیں اور رجعت ہی کا اختیار نہیں، نکاحِ جدید کا اختیار بھی سلب ہوجائے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس پر شاہد ہے کہ اظہارِ غضب کے باوجود آپ نے تین طلاقوں کو نافذ فرمایا، جس کے بہت سے واقعات کتبِ حدیث میں مذکور ہیں، اور جن علماء نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں ان میں ان واقعات کو جمع کردیا ہے، حال میں مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان صاحب کی کتاب ''عمدۃ الاثاث'' بھی اس مسئلہ پر شائع ہوگئی ہے جو بالکل کافی ہے، یہاں صرف دو تین حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

محمود بن لبید کی روایت جو بحوالہ نسائی اُوپر لکھی گئی ہے، اس میں تین طلاقیں بیک وقت دینے پر انتہائی ناراضگی کا اظہار تو منقول ہے، یہاں تک کہ بعض صحابہؓ نے اس شخص کو مستوجبِ قتل سمجھا، مگر یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کی طلاق کو ایک رجعی طلاق قرار دے کر بیوی اس کے حوالے کردی ہو۔

بلکہ دُوسری روایت جو آگے آتی ہے جس طرح اس میں اس کی تصریح موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمرؓ کی بیک وقت تین طلاق کو باوجود ناراضی کے نافذ فرمادیا، اسی طرح مذکورہ حدیث محمود بن لبید کے متعلق قاضی ابوبکر بن عربی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمرؓ کی تین طلاقوں کی طرح اس کی بھی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا، اُن کے الفاظ یہ ہیں:-

فَلَمْ يَرُدَّهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ اَمْضَاهُ كَمَا فِيْ حَدِيْثِ عُوَيْمَرَ الْعَجْلَانِيِّ فِي اللِّعَانِ حَيْثُ اَمْضٰى طَلَاقَهُ الثَّلَاثَ وَلَمْ يَرُدَّهُ۔ (تهذيب سنن ابی داؤد، طبع مصر ج:۳ ص:۱۲۹ از عمدة الأثاث)

''تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رَدّ نہیں کیا، بلکہ اُسے نافذ فرمادیا، جیسا کہ عویمر عجلانیؓ کی لعان والی حدیث میں ہے کہ آپ نے اُن کی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا اور رَدّ نہیں کیا تھا۔''

دُوسری حدیث صدیقہ عائشہؓ کی صحیح بخاری میں بالفاظِ ذیل ہے:-

اِنَّ رَجُلًا طَلَّقَ امْرَاَتَهٗ ثَلَاثًا فَتَزَوَّجَتْ فَطُلِّقَ فَسُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَحِلُّ

لِلْاَوَّلِ؟ قَالَ: لَا، حَتّٰى يَذُوْقَ عُسَيْلَتَهَا كَمَا ذَاقَهَا الْاَوَّلُ۔ (صحیح بخاری ج:۲ ص:۹۱، [1] صحیح مسلم ص:۴۶۳)

''ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی، اس عورت نے دُوسری جگہ نکاح کیا تو اس دُوسرے شوہر نے بھی اُسے طلاق دے دی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، جب تک کہ دُوسرا شوہر اس سے ہم بستری کر کے لطف اندوز نہ ہوجائے جس طرح پہلے شوہر نے کیا تھا، اس وقت تک طلاق دینے سے پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی۔''

الفاظِ روایت سے ظاہر یہی ہے کہ یہ تینوں طلاق بیک وقت دی گئی تھیں، شروحِ حدیث فتح الباری، عمدۃ القاری، قسطلانی وغیرہ میں روایت کا مفہوم یہی قرار دِیا گیا ہے کہ بیک وقت تین طلاق دی تھیں، اور حدیث میں یہ فیصلہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاق کو نافذ قرار دے کر یہ حکم دیا کہ جب تک شوہرِ ثانی سے ہم بستری اور صحبت نہ ہوجائے، تو اس کے طلاق دینے سے شوہرِ اوّل کے لئے حلال نہیں ہوگی۔

تیسری روایت حضرت عویمر عجلانیؓ کی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا، اور اس کے بعد عرض کیا:-

فَلَمَّا فَرَغَا قَالَ عُوَيْمَرُ: كَذَبْتُ عَلَيْهَا يَا رَسُوْلَ اللهِ إِنْ اَمْسَكْتُهَا فَطَلَّقَهَا ثَلَاثًا قَبْلَ اَنْ يَّأْمُرَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (صحیح بخاری مع فتح الباری ج:۹ ص:۳۰۱، صحیح مسلم ج:۱ ص:۴۸۹)

''پس جب وہ دونوں لعان سے فارغ ہوگئے تو عویمرؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں اس پر جھوٹ بولنے والا ہوں گا اگر میں نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا، تو عویمر رضی اللہ عنہ نے اس کو تین طلاقیں دے دیں قبل اس کے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں حکم دیتے۔''

اور اَبوداؤدؒ نے اس واقعے کو بروایت حضرت سہل بن سعدؓ نقل کر کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:-

فَاَنْفَذَهٗ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مَا صُنِعَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُنَّةً قَالَ سَعْدٌ: حَضَرْتُ هٰذَا عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَضَتِ السُّنَّةُ بَعْدُ فِي الْمُتَلَاعِنَيْنِ اَنْ يُّفَرَّقَ بَيْنَهُمَا ثُمَّ لَا يَجْتَمِعَانِ اَبَدًا۔ (ابوداؤد، ص:۳۰۶ طبع أصح المطابع)

''تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے نافذ فرمادیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو

[1] صحیح البخاری، کتاب الطَّلاق، باب من اجاز طلاق الثلاث ج:۲ ص:۷۹۱ وصحیح مسلم، کتاب الطَّلاق، باب لا تحل المطلقة ...إلخ ج:۱ ص:۴۶۳

کچھ پیش آیا وہ سنت قرار پایا۔ سعدؓ فرماتے ہیں: اس موقع پر میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا، پس اس کے بعد لعان کرنے والوں کے بارے میں یہ طریقہ رائج ہوگیا کہ اُن کے درمیان فریق کر دی جائے، اور پھر وہ کبھی بھی جمع نہ ہوں۔''

اس حدیث میں پوری وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمرؓ کی بیک وقت تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ فرمایا ہے۔

اور محمود بن لبید کی سابقہ روایت میں بھی ابوبکر ابنِ عربی کی روایت کے مطابق تین طلاقوں کو نافذ کرنے کا ذِکر موجود ہے، اور بالفرض یہ بھی نہ ہوتا تو یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کو ایک طلاقِ رجعی قرار دے کر بیوی اس کے سپرد کر دی ہو۔

الحاصل مذکورہ تینوں احادیث سے یہ ثابت ہوگیا کہ اگرچہ تین طلاق بیک وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سخت ناراضی کا موجب تھیں، مگر بہرحال اثر اُن کا یہی ہوا کہ تینوں طلاقیں واقع قرار دی گئیں۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ کا واقعہ اور اس پر اِشکال و جواب

مذکور الصدر تحریر سے یہ ثابت ہوا کہ بیک وقت تین طلاق کو تین قرار دینا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تھا، مگر یہاں ایک اِشکال حضرت فاروقِ اعظمؓ کے ایک واقعے سے پیدا ہوتا ہے جو صحیح مسلم اور اکثر کتبِ حدیث میں منقول ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:-

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: كَانَ الطَّلَاقُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِىْ بَكْرٍ وَّسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً، فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: اِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوْا فِىْ اَمْرٍ كَانَتْ لَهُمْ فِيْهِ اَنَاةٌ فَلَوْ اَمْضَيْنَا عَلَيْهِمْ فَاَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ۔ (صحیح مسلم ج:۱ ص:۴۷۷)

''حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے اِبتدائی دو سالوں میں طلاق کا یہ طریقہ تھا کہ تین طلاقوں کو ایک قرار دِیا جاتا تھا، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ میں جس میں اُن کے لئے مہلت تھی، تو مناسب رہے گا ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں، تو آپ نے اُن پر نافذ کر دیا۔''

فاروقِ اعظمؓ کا یہ اِعلان فقہاءِ صحابہؓ کے مشورہ سے صحابہؓ وتابعینؒ کے مجمعِ عام میں ہوا، کسی سے اس پر اِنکار یا تردّد منقول نہیں، اسی لئے حافظِ حدیث اِمام ابنِ عبدالبر مالکیؒ نے اس پر اِجماع نقل کیا ہے، زرقانی شرح مؤطا میں یہ الفاظ ہیں:-

وَالْجُمْهُوْرُ عَلٰى وُقُوْعِ الثَّلَاثِ بَلْ حَكَى ابْنُ عَبْدِالْبَرِّ الْاِجْمَاعَ قَائِلًا اَنَّ خِلَافَهٗ لَا يُلْتَفَتُ اِلَيْهِ۔ (زرقانی شرح مؤطا ج:۳ ص:۱۶۷)

''اور جمہور اُمت تین طلاقوں کے واقع ہونے پر متفق ہیں، بلکہ ابنِ عبدالبر نے اس پر اِجماع نقل کر کے فرمایا کہ اس کا خلاف شاذ ہے جس کی طرف اِلتفات نہیں کیا جائے گا۔''

اور شیخ الاسلام نوویؒ نے شرح مسلم میں فرمایا:-

قَالَ الشَّافِعِيُّ وَمَالِكٌ وَاَبُوْحَنِيْفَةَ وَاَحْمَدُ وَجَمَاهِيْرُ الْعُلَمَاءِ مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ يَقَعُ الثَّلَاثُ، وَقَالَ طَاؤُسٌ وَبَعْضُ اَهْلِ الظَّاهِرِ لَا يَقَعُ بِذٰلِكَ اِلَّا وَاحِدَةٌ۔ (شرح مسلم ج:۱ ص:۴۷۸)

''اِمام شافعیؒ، اِمام مالکؒ، اِمام ابوحنیفہؒ، اِمام احمدؒ اور سلف وخلف کے جماہیر علماء نے فرمایا کہ تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، اور طاؤس اور بعض اہلِ ظاہر نے کہا کہ اس سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔''

اِمام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں فرمایا:-

فَخَاطَبَ عُمَرُ بِذٰلِكَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَفِيْهِمْ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمُ الَّذِيْنَ قَدْ عَلِمُوْا مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذٰلِكَ فِيْ زَمَنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يُنْكِرْ عَلَيْهِ مِنْهُمْ مُنْكِرٌ وَلَمْ يَدْفَعْهُ دَافِعٌ۔ (شرح معانی الآثار ج:۲ ص:۲۹)

''پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ لوگوں کو مخاطب فرمایا، اور ان لوگوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابہؓ بھی تھے جن کو اس سے پہلے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے طریقے کا علم تھا، تو ان میں سے کسی اِنکار کرنے والے نے اِنکار نہیں کیا، اور کسی رَدّ کرنے والے نے اسے رَدّ نہیں کیا۔''

مذکورہ واقعہ میں اگرچہ اُمت کے لئے عمل کی راہ باجماعِ صحابہؓ وتابعینؒ مقرّر ہوگئی کہ تین طلاقیں بیک وقت دینا اگرچہ غیر مستحسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہے، مگر اس کے باوجود جس نے اس غلطی کا اِرتکاب کیا اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی، اور بغیر دُوسرے شخص سے نکاح وطلاق کے اس کے لئے حلال نہ ہوگی۔

لیکن علمی اور نظری طور پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اوّل تو یہ کہ سابقہ تحریر میں متعدد روایاتِ حدیث کے

حوالے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تین طلاق بیک وقت دینے والے پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کو نافذ فرمایا ہے، اس کو رجعت یا نکاحِ جدید کی اجازت نہیں دی، پھر اس واقعہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس کلام کا کیا مطلب ہوگا کہ عہدِ رسالت میں اور عہدِ صدیقی میں اور دو سال تک عہدِ فاروقی میں تین طلاق کو ایک ہی مانا جاتا تھا، فاروقِ اعظمؓ نے تین طلاق کا فیصلہ فرمایا؟

دُوسرا سوال یہ ہے کہ اگر واقعہ اسی طرح تسلیم کرلیا جائے کہ عہدِ رسالت، عہدِ صدیقی میں تین طلاق کو ایک مانا جاتا تھا، تو فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کو کیسے بدل دیا، اور بالفرض ان سے کوئی غلطی بھی ہوگئی تھی تو تمام صحابہ کرامؓ نے اس کو کیسے تسلیم کرلیا؟

ان دونوں سوالوں کے حضراتِ فقہاء و محدثینؒ نے مختلف جوابات دیئے ہیں، ان میں صاف اور بے تکلف جواب وہ ہے جس کو اِمام نوویؒ نے شرح مسلم[1] میں "اَصَحّ" کہہ کر نقل کیا ہے، کہ فاروقِ اعظمؓ کا یہ فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کا اِجماع طلاقِ ثلاث کی ایک خاص صورت کے متعلق قرار دیا جائے، وہ یہ کہ کوئی شخص تین مرتبہ "تجھ کو طلاق، تجھ کو طلاق، تجھ کو طلاق" کہے یا "میں نے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی" کہے۔

یہ صورت ایسی ہے کہ اس کے معنی میں دو احتمال ہوتے ہیں، ایک یہ کہ کہنے والے نے تین طلاق دینے کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہوں، دُوسرے یہ کہ تین مرتبہ محض تاکید کے لئے مکرّر کہا ہو، تین طلاق کی نیت نہ ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ نیت کا علم کہنے والے ہی کے اِقرار سے ہوسکتا ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں صدق و دیانت عام اور غالب تھی، اگر ایسے الفاظ کہنے کے بعد کسی نے یہ بیان کیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ محض تاکید کے لئے یہ الفاظ مکرّر بولے تھے، تو آپ اس کے حلفی بیان کی تصدیق فرمادیتے اور اس کو ایک ہی طلاق قرار دیتے تھے۔

اس کی تصدیق حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے، جس میں مذکور ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو لفظ "البتــــة" کے ساتھ طلاق دے دی تھی، یہ لفظ عرب کے عرفِ عام میں تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، مگر تین اس کا مفہوم صریح نہیں تھا، اور حضرت رکانہؓ نے کہا کہ میری نیت تو اس لفظ سے تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ ایک طلاق دینے کا قصد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قسم دی، انہوں نے اس پر حلف کرلیا، تو آپ نے ایک ہی طلاق قرار دے دی۔

یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، ابنِ ماجہ، دارمی میں مختلف سندوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے،[2] بعض الفاظ

---

[1] ج:۱ ص:۴۷۸

[2] سنن ابی داؤد، کتاب الطّلاق، باب بقیه نسخ المراجعة بعد التطلیقات الثلاث ج:۱ ص:۲۹۸، وجامع الترمذی، ابواب الطّلاق، باب ما جاء فی الرجل طلق امرأته البتة ج:۱ ص:۲۲۲

میں یہ بھی ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی تھیں مگر ابوداوٗد نے ترجیح اس کو دی ہے کہ دراصل رکانہؓ نے لفظ ''البتۃ'' سے طلاق دی تھی، یہ لفظ چونکہ عام طور پر تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، اس لئے کسی راوی نے اس کو تین طلاق سے تعبیر کردیا ہے۔

بہرحال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہے کہ حضرت رکانہؓ کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جبکہ انہوں نے حلف کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے، ورنہ پھر تین کی نیت نہ کرنے کا کوئی اِحتمال ہی نہ رہتا، نہ اُن سے سوال کی کوئی ضرورت رہتی۔

اس واقعہ نے یہ بات واضح کردی کہ جن الفاظ میں یہ اِحتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، اُن میں آپ نے حلفی بیان پر ایک قرار دے دیا، کیونکہ زمانہ صدق و دیانت کا تھا، اس کا اِحتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیقِ اکبرؓ کے عہد میں اور فاروقِ اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دو سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار گھٹ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دُوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہوگئی کہ تین مرتبہ الفاظِ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے، تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کرکے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا اِستعمال کرنے لگیں، اور بیوی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروقِ اعظمؓ کی فراست اور انتظامِ دِین میں دُور بینی کو سبھی صحابہؓ نے دُرست سمجھ کر اِتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے، انہوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب دِلوں کی مخفی نیت اور صاحبِ معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظِ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دِی جائیں گی، اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی تھی۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ کے مذکور الصدر واقعے میں جو اَلفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انہوں نے فرمایا:-

اِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوْا فِیْ اَمْرٍ کَانَتْ لَھُمْ فِیْہِ اَنَاۃٌ فَلَوْ اَمْضَیْنَا عَلَیْھِمْ۔ [1]

[1] صحیح مسلم، کتاب الطّلاق، باب طلاق الثلاث ج:۱ ص:۴۷۸

"لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ میں جس میں اُن کے لئے مہلت تھی، تو مناسب رہے گا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کردیں۔"

حضرت فاروقِ اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اِجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے، اس کی تصدیق روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایاتِ حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ کرنا متعدّد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ عہدِ رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرارِ طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس عہدِ رسالت میں بھی تین ہی قرار دی جاتی تھیں، ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں "ثلاث" کی تصریح نہ ہو، یا تین طلاق دینے کا اِقرار نہ ہو، بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہوجاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دِیا تھا تو فاروقِ اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اِتفاق کیسے کرلیا، کیونکہ اس صورت میں فاروقِ اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا اِستعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف کا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اِشکالات رفع ہوگئے، والحمدللہ، اس جگہ مسئلہ طلاقِ ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا اِحاطہ مقصود نہیں، وہ شروحِ حدیث میں بہت مفصل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصل رسالوں میں بھی واضح کردیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہے، واللہ الموفق والمعین۔

وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی عدت کو تو رکھ لو اُن کو موافق دستور کے یا

سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ ۚ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَمَنۡ

چھوڑ دو اُن کو بھلی طرح سے، اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کے لئے تاکہ اُن پر زیادتی کرو، اور جو

يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۚ وَّاذۡكُرُوۡا

ایسا کرے گا وہ بے شک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت ٹھہراؤ اللہ کے اَحکام کو ہنسی، اور یاد کرو

نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ

اللہ کا اِحسان جو تم پر ہے اور اس کو جو اُتاری تم پر کتاب اور علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا

بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٣١﴾ ع وَاِذَا طَلَّقْتُمُ ع ٢٩/١٤ الثلثة

اس کے ساتھ، اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ اور جب طلاق دی تم نے

النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا

عورتوں کو پھر پورا کرچکیں اپنی عدت کو تو اَب نہ روکو ان کو اس سے کہ نکاح کرلیں اپنے انہی خاوندوں سے جبکہ

تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ

راضی ہوجاویں آپس میں موافق دستور کے، یہ نصیحت اس کو کی جاتی ہے جو کہ تم میں سے اِیمان رکھتا ہے اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٢﴾

اور قیامت کے دن پر، اس میں تمہارے واسطے بڑی ستھرائی ہے اور بہت پاکیزگی، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی ہو، اور وہ اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں، تو یا تو ان کو بھلائی کے ساتھ (اپنی زوجیت میں) روک رکھو، یا انہیں بھلائی کے ساتھ چھوڑ دو۔ اور انہیں ستانے کی خاطر اس لئے روک کر نہ رکھو کہ ان پر ظلم کرسکو۔ اور جو شخص ایسا کرے گا وہ خود اپنی جان پر ظلم کرے گا۔ اور اللہ کی آیتوں کو مذاق مت بناؤ اور اللہ نے تم پر جو اِنعام فرمایا ہے اُسے، اور تم پر جو کتاب اور حکمت کی باتیں تمہیں نصیحت کرنے کے لئے نازل کی ہیں انہیں یاد رکھو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ ﴿٢٣١﴾ اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی ہو، اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں، تو (اے میکے والو!) انہیں اس بات سے منع نہ کرو کہ وہ اپنے (پہلے) شوہروں سے (دوبارہ) نکاح کریں، بشرطیکہ وہ بھلائی کے ساتھ ایک دوسرے سے راضی ہوگئے ہوں۔ ان باتوں کی نصیحت تم میں سے ان لوگوں کو کی

جا رہی ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں۔ یہی تمہارے لئے زیادہ ستھرا اور پاکیزہ طریقہ ہے۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (۲۳۲)

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۲۸ :- عورتوں کو معلق رکھنے کی ممانعت

اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دی ہو، پھر وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں تو تم ان کو قاعدہ کے موافق (رجعت کر کے) نکاح میں رہنے دو، یا قاعدے کے موافق ان کو رہائی دو، اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت روکو، اس ارادہ سے کہ اُن پر ظلم کیا جائے، اور جو شخص ایسا برتاؤ کرے گا تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، اور حق تعالیٰ کے اَحکام کو کھیل نہ بناؤ، اور حق تعالیٰ کی جو تم پر نعمتیں ہیں ان کو یاد کرو، اور خصوصاً کتاب وحکمت کی باتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر (اس حیثیت سے) نازل فرمائی ہے کہ ان کے ذریعے تم کو نصیحت فرماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

حکم نمبر ۲۹ :- عورتوں کو نکاحِ ثانی سے منع کرنے کی ممانعت

اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور عورتیں اپنی میعادِ عدت پوری کر چکیں تو تم ان کو اس اَمر سے مت روکو کہ وہ اپنے (تجویز کئے ہوئے) شوہروں سے نکاح کر لیں، جبکہ باہم سب رضامند ہو جائیں قاعدہ کے موافق، اس مضمون سے نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر یقین رکھتا ہو، اس نصیحت کا قبول کرنا تمہارے لئے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکی کی بات ہے، اور اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔

معارف ومسائل

ان سے پہلے بھی دو آیتوں میں قانونِ طلاق کی اہم دفعات اور اسلام میں طلاق کا عادلانہ اور معتدلانہ نظام قرآنِ کریم کے حکیمانہ اُسلوب کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اب مذکور الصدر دو آیتوں میں چند اَحکام ومسائل مذکور ہیں۔

اَحکامِ طلاق کے بعد رجعت یا اِنقطاعِ نکاح دونوں کے لئے خاص ہدایات

پہلی آیت میں پہلا مسئلہ یہ اِرشاد ہوا ہے کہ جب مطلقہ رجعی عورتوں کی عدت گزرنے کے قریب آئے تو شوہر کو دو

اِختیار حاصل ہیں، ایک یہ کہ رجعت کر کے اس کو اپنے نکاح میں رہنے دو، دُوسرے یہ کہ رجعت نہ کرے، اور تعلقِ نکاح ختم کر کے اس کو بالکل آزاد کر دے۔

لیکن دونوں اِختیاروں کے ساتھ قرآنِ کریم نے یہ قید لگائی کہ رکھنا ہو تو قاعدہ کے مطابق رکھا جائے، اور چھوڑنا ہو تب بھی شرعی قاعدے کے مطابق چھوڑا جائے، اس میں بِمَعْرُوْفٍ کا لفظ دونوں جگہ علیحدہ علیحدہ لاکر اس کی طرف اشارہ فرما دیا ہے کہ رجعت کے لئے بھی کچھ شرائط اور قواعد ہیں اور آزاد کرنے کے لئے بھی، دونوں حالتوں میں سے جس کو بھی اِختیار کرے شرعی قاعدے کے موافق کرے، محض وقتی غصّے یا جذبات کے ماتحت نہ کرے، دونوں صورتوں کے شرعی قواعد کا کچھ حصہ تو خود قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے، باقی تفصیلات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔

مثلاً اگر واقعۂ طلاق کے بعد مفارقت کے ناگوار عواقب کا خیال کر کے رائے یہ ہو جائے کہ رجعت کر کے نکاح قائم رکھنا ہے، تو اس کے لئے شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ پچھلے غصہ و ناراضی کو دِل سے نکال کر حسنِ معاشرت کے ساتھ زندگی گزارنا اور حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھنا پیشِ نظر ہو، عورت کو اپنی قید میں رکھ کر ستانا اور تکلیف پہنچانا مقصود نہ ہو، اسی کے لئے آیتِ متذکرہ میں یہ الفاظ اِرشاد فرمائے گئے: وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ یعنی ”عورتوں کو اپنے نکاح میں اس لئے نہ روکو کہ اُن پر ظلم کرو۔“

دُوسرا قاعدہ رجعت کا یہ ہے جو سورۂ طلاق میں ذِکر کیا گیا ہے: وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۭ (الطلاق:۲) ”اور آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کر لو، پھر اگر گواہی کی حاجت پڑے تو ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے بلا رو و رعایت گواہی دو۔“

مطلب یہ ہے کہ جب رجعت کا اِرادہ کرو تو اس پر دو معتبر مسلمانوں کو گواہ بنالو، اس میں کئی فائدے ہیں، ایک یہ کہ اگر عورت کی طرف سے رجعت کے خلاف کوئی دعویٰ ہو تو اس گواہی سے کام لیا جاسکے۔

دُوسرے خود اِنسان کو اپنے نفس پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، اگر رجعت پر شہادت کا قاعدہ نہ جاری کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص عدت پوری گزر جانے کے بعد بھی اپنی غرض یا شیطانی اِغوا سے یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ میں نے عدت گزرنے سے پہلے رجعت کر لی تھی۔

ان مفاسد کے اِنسداد کے لئے قرآن نے یہ قاعدہ مقرّر فرما دیا کہ رجعت کرو تو اس پر دو معتبر گواہ بنالو۔

معاملہ کا دُوسرا رُخ یہ تھا کہ عدت کی مہلت اور غور و فکر کا وقت ملنے کے باوجود دِلوں کا اِنقباض اور ناراضی ختم نہ ہوئی اور قطع تعلق ہی برقرار رکھنا ہے تو اس صورت میں بہت اندیشہ ہوتا ہے کہ دُشمنی اور اِنتقامی جذبے بھڑک اُٹھیں، جن کا اثر دو شخصوں سے متعدی ہو کر دو خاندانوں تک پہنچ سکتا ہے، اور طرفین کی دُنیا و آخرت کے لئے خطرہ بن سکتا ہے، اس کے

اِنسداد کے لئے مختصر طور پر تو یہی اِرشاد فرمایا گیا کہ: اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ یعنی چھوڑنا اور قطع کرنا ہی ہو تو وہ بھی قاعدے کے موافق کریں، اس قاعدہ کی کچھ تفصیلات خود قرآنِ کریم میں مذکور ہیں، باقی تفصیلات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قولی اور عملی بیان سے ثابت ہیں۔

مثلاً اس سے پہلی آیت میں اِرشاد فرمایا: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا (البقرۃ:۲۲۹)، یعنی بلا کسی عذرِ شرعی کے ایسا نہ کرو کہ عورت سے طلاق کے معاوضہ میں اپنا دیا ہوا سامان یا مہر واپس لے لو، یا کچھ اور معاوضہ طلب کرو۔

اور اس کے بعد کی ایک آیت میں اِرشاد فرمایا: وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ؁ (البقرۃ) ''سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ فائدہ پہنچانا قاعدہ کے موافق مقرّر ہوا ہے، اُن پر جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔'' فائدہ پہنچانے کی تفسیر، رُخصت کے وقت مطلقہ عورت کو کچھ تحفہ نقد یا کم از کم ایک جوڑا کپڑے کا دینا ہے، اس میں طلاق دینے والے شوہر پر مطلقہ بی بی کے کچھ حقوق واجب و لازم کر کے اور کچھ بطور اِحسان و سلوک کے عائد کر دیئے گئے ہیں، جو بلند اَخلاق اور حسنِ معاشرت کی پاکیزہ تعلیم ہے، اور جس میں اس طرف ہدایت ہے کہ جس طرح نکاح ایک معاملہ اور باہمی معاہدہ تھا، اسی طرح طلاق بھی ایک معاملہ کا ختم کرنا ہے، اس فسخِ معاملہ کو دُشمنی اور جنگ و جدل کا سامان بنانے کی کوئی وجہ نہیں، معاملہ کا اِنقطاع بھی خوب صورتی اور حسنِ سلوک کے ساتھ ہونا چاہئے کہ طلاق کے بعد مطلقہ بی بی کو فائدہ پہنچایا جائے۔

اس فائدہ کی تفصیل یہ ہے کہ اَیامِ عدت میں اس کو اپنے گھر میں رہنے دے، اس کا پورا خرچ برداشت کرے، اگر مہر اَب تک نہیں دیا ہے اور خلوَت ہو چکی تو پورا مہر اَدا کرے، اور خلوَت سے پہلے ہی طلاق کا واقعہ پیش آ گیا ہے تو آدھا مہر خوش دِلی کے ساتھ ادا کرے۔ یہ تو سب حقوقِ واجبہ ہیں جو طلاق دینے والے کو لازمی طور پر اَدا کرنا ہیں، اور مستحب اور افضل یہ بھی ہے کہ مطلقہ بی بی کو رُخصت کرنے کے وقت کچھ نقد یا کم از کم ایک جوڑا دے کر رُخصت کیا جائے، سبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے کہ جو چیزیں عرفاً جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑے کے اسباب اور خاندانوں کی تباہی تک پہنچانے والی ہیں ان کو دائمی محبت و مسرت میں تبدیل کر دیا گیا۔

ان سب اَحکام کے بعد اِرشاد فرمایا: وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ یعنی ''جو شخص ان حدودِ خداوندی کے خلاف کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا'' آخرت میں تو ظاہر ہے کہ وہاں ہر ظلم و جور کا اِنتقام بارگاہِ خداوندی میں لیا جائے گا، اور جب تک مظلوم کا بدلہ ظالم سے نہ لے لیا جائے گا آگے نہ بڑھے گا۔

اور دُنیا میں بھی اگر بصیرت اور تجربہ کے ساتھ غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ کوئی ظالم بظاہر تو مظلوم پر ظلم کر کے اپنا دِل ٹھنڈا کر لیتا ہے، لیکن اس کے نتائجِ بد اِس دُنیا میں بھی اس کو اکثر ذلیل و خوار کرتے ہیں، اور وہ سمجھے یا نہ سمجھے اکثر ایسی

آفتوں میں مبتلا ہوتا ہے کہ ظلم کا نتیجہ اس کو دُنیا میں بھی کچھ نہ کچھ چکھنا پڑتا ہے، اسی کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ؎

پنداشت ستمگر کہ جفا برما کرد
برگردنِ وے بماند وبرما بگذشت [۱]

قرآنِ کریم کا اُسلوبِ حکیم اور خاص اندازِ بیان ہے کہ وہ قانون کو دُنیا کے قوانینِ تعزیرات کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مربیانہ انداز میں قانون کا بیان، اس کی حکمت ومصلحت کی وضاحت، اس کے خلاف کرنے میں اِنسان کی مضرت ونقصان کا ایسا سلسلہ بیان کرتا ہے جس کو دیکھ کر کوئی اِنسان جو اِنسانیت کے جامے سے باہر نہ ہوا ن جرائم پر اِقدام کر ہی نہیں سکتا، ہر قانون کے پیچھے خدا کا خوف وآخرت کا حساب یاد دِلایا جاتا ہے۔

نکاح وطلاق کو کھیل نہ بناؤ

دُوسرا مسئلہ اس آیت میں یہ اِرشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو کھیل نہ بناؤ: وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۡ کھیل بنانے کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ نکاح وطلاق کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو حدود وشرائط مقرّر کردیئے ہیں اُن کی خلاف ورزی کرنا۔ اور دُوسری تفسیر حضرت ابوالدرداءؓ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بعض لوگ طلاق دے کر یا غلام آزاد کر کے مکر جاتے اور کہتے تھے کہ میں نے تو ہنسی مذاق میں کہہ دیا تھا، طلاق یا عتاق کی نیت نہیں تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، [۲] جس نے یہ فیصلہ کردیا کہ طلاق ونکاح کو اگر کسی نے کھیل یا مذاق میں بھی پورا کردیا تو وہ نافذ ہوجائیں گے، نیت نہ کرنے کا عذر مسموع نہ ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد فرمایا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں ہنسی کے طور پر کرنا اور واقعی طور پر کرنا دونوں برابر ہیں، ایک طلاق، دُوسرے عتاق، تیسرے نکاح۔ (اخرجه ابن مردويه عن ابن عباسؓ وابن المنذر عن عبادة بن الصامتؓ)

اور حضرت ابوہریرہؓ سے اس حدیث میں یہ الفاظ منقول ہیں:-

ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ: اَلنِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ۔ [۳]

''یعنی تین چیزیں ایسی ہیں جن کو قصد واِرادہ سے کہنا اور ہنسی مذاق کے طور پر کہنا برابر ہے، ایک نکاح، دُوسرے طلاق، تیسری رجعت۔'' (مظہری)

---

[۱] ترجمہ:- جس ظالم نے مجھ پر ظلم کیا ہے وہ سمجھ لے کہ اس کی گردن پر یہ ظلم موجود ہے اور میرے اُوپر سے گزر چکا ہے۔

[۲] مجمع الزوائد رقم الحديث: ۷۵۲۹

[۳] سنن ابی داؤد، كتاب الطّلاق، باب في الطّلاق على الهزل ج: ۱ ص: ۲۹۸

ان تینوں چیزوں میں حکمِ شرعی یہ ہے کہ دو مرد و عورت اگر بلا قصدِ نکاح ہنسی ہنسی میں گواہوں کے سامنے نکاح کا ایجاب و قبول کرلیں تو بھی نکاح منعقد ہوجاتا ہے، اسی طرح اگر بلا قصد ہنسی ہنسی میں صریح طور پر طلاق دیدے تو طلاق ہوجاتی ہے، یا رجعت کرے تو رجعت ہوجاتی ہے، ایسے ہی کسی غلام کو ہنسی میں آزاد کرنے کو کہہ دے تو غلام، باندی آزاد ہوجاتے ہیں، ہنسی مذاق کوئی عذر نہیں مانا جاتا۔

اس حکم کے بیان کے بعد پھر قرآنِ کریم نے اپنے مخصوص انداز میں انسان کو حق تعالیٰ کی اطاعت اور آخرت کے خوف کا سبق دیا، ارشاد فرمایا: وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ یعنی ”یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو تم پر نازل فرمائی اور یاد کرو اس خاص نعمت کو جو کتاب وحکمت کی صورت میں تمہیں دی گئی، اور اللہ سے ڈرو، اور یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔“ تمہاری نیتوں اور ارادوں اور دلوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے باخبر ہیں، اس لئے اگر بیوی کو طلاق دے کر آزاد ہی کرنا ہو تو باہمی نزاع اور ایک دوسرے کی حق تلفی اور ظلم سے بچنے بچانے کی نیت سے کرو، غصہ کے انتقام یا بیوی کو ذلیل ورُسوا کرنے یا تکلیف پہنچانے کی نیت سے نہ کرو۔

طلاق میں اصل یہی ہے کہ صریح اور رجعی طلاق دی جائے

تیسرا مسئلہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا یہ ہے کہ شریعت وسنت کی نظر میں اصل یہی ہے کہ کوئی آدمی اگر طلاق دینے پر مجبور ہی ہوجائے تو صاف وصریح لفظوں میں ایک طلاقِ رجعی دیدے، تاکہ عدت تک رجعت کا حق باقی رہے، ایسے الفاظ نہ بولے جن سے فوری طور پر تعلقِ زوجیت منقطع ہوجائے، جس کو ”طلاقِ بائن“ کہتے ہیں، اور نہ تین طلاق تک پہنچے، جس کے بعد آپس میں نکاحِ جدید بھی حرام ہوجائے، یہ اشارہ لفظ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ کو مطلق بلا قید کے ذکر کرنے سے حاصل ہوا، کیونکہ جو حکم اس آیت میں بتلایا ہے وہ اگرچہ صرف طلاقِ رجعی ایک دو تک کے لئے ہے، طلاقِ بائن یا تین طلاق کا یہ حکم نہیں، مگر قرآنِ کریم نے کوئی قید اس کی ذکر نہ فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ اصل طلاقِ مشروع رجعی طلاق ہی ہے، دُوسری صورتیں کراہت یا ناپسندیدگی سے خالی نہیں۔

مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی کرنے سے بلا وجہِ شرعی روکنا حرام ہے

دُوسری آیت میں اس ناروا ظالمانہ سلوک کا انسداد کیا گیا ہے جو عام طور پر مطلقہ عورتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، کہ اُن کو دُوسری شادی کرنے سے روکا جاتا ہے، پہلا شوہر بھی عموماً اپنی مطلقہ بیوی کو دُوسرے شخص کے نکاح میں جانے سے روکتا اور اس کو اپنی عزت کے خلاف سمجھتا ہے، اور بعض خاندانوں میں لڑکی کے اولیاء بھی اس کو دُوسری شادی کرنے سے

روکتے ہیں، اوران میں بعض اس طمع میں روکتے ہیں کہ اس کی شادی پر ہم کوئی رقم اپنے لئے حاصل کرلیں، بعض اوقات مطلقہ عورت پھر اپنے سابق شوہر سے نکاح پر راضی ہوجاتی ہے، مگر عورت کے اولیاء واقرباء کوطلاق دینے کی وجہ سے ایک قسم کی عداوت اس سے ہوجاتی ہے، وہ اب دونوں کے راضی ہونے کے بعد بھی ان کے باہمی نکاح سے مانع ہوتے ہیں، آزاد عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی سے بلاعذرِ شرعی روکنا خواہ پہلے شوہر کی طرف سے ہو یا لڑکی کے اولیاء کی طرف سے، بڑا ظلم ہے، اس ظلم کا اِنسداد اس آیت میں فرمایا گیا ہے۔

اس آیت کا شانِ نزول بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معقل بن یسارؓ نے اپنی بہن کی شادی ایک شخص کے ساتھ کردی تھی، اس نے طلاق دے دی اور عدت بھی گزر گئی، اس کے بعد یہ شخص اپنے فعل پر پشیمان ہوا، اور چاہا کہ دوبارہ نکاح کرلیں، اس کی بیوی یعنی معقل بن یسارؓ کی بہن بھی اس پر آمادہ ہوگئی، لیکن جب اس شخص نے معقلؓ سے اس کا ذِکر کیا تو ان کوطلاق دینے پر غصہ تھا، انہوں نے کہا کہ میں نے تمہارا اِعزاز کیا، اپنی بہن تمہارے نکاح میں دے دی، تم نے اس کی یہ قدر کی کہ اس کوطلاق دے دی، اب پھر تم میرے پاس آئے ہو کہ دوبارہ نکاح کرو، خدا کی قسم! اب وہ تمہارے نکاح میں نہ لوٹے گی۔ [1]

اسی طرح ایک واقعہ جابر بن عبداللہؓ کی چچازاد بہن کا پیش آیا تھا، ان واقعات پر آیتِ مذکورہ نازل ہوئی، جس میں معقلؓ اور جابرؓ کے اس رویے کو ناپسند و ناجائز قرار دیا گیا۔

صحابہ کرامؓ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے، آیتِ کریمہ کے سنتے ہی معقل بن یسارؓ کا سارا غصہ ٹھنڈا ہوگیا، اور خود جا کر اس شخص سے بہن کا دوبارہ نکاح کردیا، اور قسم کا کفارہ ادا کیا، اسی طرح جابر بن عبداللہؓ نے بھی تعمیل فرمائی۔

اس آیت کے خطاب میں وہ شوہر بھی داخل ہیں جنہوں نے طلاق دی ہے، اور لڑکی کے اولیاء بھی، دونوں کو یہ حکم دیا گیا کہ: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی ''مت روکو مطلقہ عورتوں کو اس بات سے کہ وہ اپنے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کریں'' خواہ پہلے ہی شوہر ہوں جنہوں نے طلاق دی تھی، یا دُوسرے لوگ، مگر اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگادی گئی: اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی ''جب دونوں مرد و عورت شرعی قاعدہ کے مطابق رضامند ہوجائیں'' تو نکاح سے نہ روکو، جس میں اِشارہ فرمایا گیا کہ اگر ان دونوں کی رضامندی نہ ہو، کوئی کسی پر زور زبردستی کرنا چاہے تو سب کو روکنے کا حق ہے، یا رضامندی بھی ہو مگر شرعی قاعدہ کے موافق نہ ہو، مثلاً بلا نکاح آپس میں میاں بیوی کی طرح رہنے پر رضامند ہوجائیں، یا تین طلاقوں کے بعد ناجائز طور پر آپس میں نکاح کرلیں، یا اَیامِ عدت میں دُوسرے

[1] صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب من قال لا نکاح الی بولیّ ...إلخ ج:۲ ص:۷۷۰ وسنن ابی داوٗد، کتاب النکاح، باب العضل ج:۱ ص:۲۸۴، ۲۸۵

شوہر سے نکاح کا اِرادہ ہو تو ہر مسلمان کو بالخصوص اُن لوگوں کو جن کا اِن مرد و عورت کے ساتھ تعلق ہے روکنے کا حق حاصل ہے، بلکہ بقدرِ استطاعت روکنا واجب ہے۔

اسی طرح کوئی لڑکی بلا اِجازت اپنے اولیاء کے اپنے کفو کے خلاف دُوسرے کفو میں نکاح کرنا چاہے، یا اپنے مہرِ مثل سے کم پر نکاح کرنا چاہے جس کا اثر خاندان پر پڑتا ہے، جس کا اس کو حق نہیں، تو یہ رضامندی بھی قاعدۂ شرعی کے مطابق نہیں، اس صورت میں لڑکی کے اولیاء کو اس نکاح سے روکنے کا حق حاصل ہے، اِذَا تَرَاضَوْا کے الفاظ سے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ عاقلہ بالغہ لڑکی کا نکاح بغیر اس کی رضا یا اِجازت کے نہیں ہوسکتا۔

آیت کے آخر میں تین جملے اِرشاد فرمائے گئے، ایک یہ کہ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی ''یہ اَحکام اُن لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دِن پر ایمان رکھتے ہیں۔'' اس میں اِشارہ فرمادیا گیا کہ اللہ پر اور روزِ قیامت پر اِیمان رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی ان اَحکامِ اِلٰہیہ کا پورا پابند ہو، اور جو لوگ ان اَحکام کے اِتباع میں کوتاہی کرتے ہیں وہ سمجھ لیں کہ ان کے اِیمان میں خلل ہے۔

دُوسرا جملہ یہ اِرشاد فرمایا کہ: ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ یعنی ''ان اَحکام کی پابندی تمہارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔'' اس میں اِشارہ فرمایا گیا کہ ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ گناہوں کی غلاظت میں آلودگی اور فتنہ وفساد ہے، کیونکہ عاقلہ بالغہ جوان لڑکیوں کو مطلقاً نکاح سے روکا گیا تو ایک طرف اُن پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہے، اور دُوسری طرف اُن کی عفت وعصمت کو خطرہ میں ڈالنا ہے، تیسرے اگر خدانخواستہ وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوں، تو اس کا وبال ان لوگوں پر بھی عائد ہوگا جنہوں نے ان کو نکاح سے روکا، اور وبالِ آخرت سے پہلے بہت ممکن ہے کہ ان مجبور عورتوں کا یہ اِبتلا خود مردوں میں جنگ وجدال اور قتل وقتال تک نوبت پہنچادے جیسا کہ رات دن مشاہدہ میں آتا ہے، اس صورت میں وبالِ آخرت سے پہلے ان کا عمل دُنیا ہی میں وبال بن جائے گا۔ اور اگر مطلقاً نکاح سے تو نہ روکا، مگر ان کی پسند کے خلاف دُوسرے شخص سے نکاح پر مجبور کیا گیا تو اس کا نتیجہ بھی دائمی مخالفت اور فتنہ وفساد یا طلاق وخلع ہوگا، جس کے ناگوار اَثرات ظاہر ہیں، اس لئے فرمایا گیا کہ ان کو ان کے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکنا ہی تمہارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔

تیسرا جملہ یہ اِرشاد فرمایا کہ: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ یعنی ''تمہاری مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، تم نہیں جانتے۔'' اس اِرشاد کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ مطلقہ عورتوں کو نکاح سے روکتے ہیں، وہ اپنے نزدیک اس میں کچھ مصالح اور فوائد سوچتے ہیں، مثلاً اپنی عزت وغیرت کا تخیل، یا یہ کہ اُن کی شادی کے بدلے کچھ مالی منفعت حاصل کی جائے، اس شیطانی تلبیس اور بے جا مصلحت اندیشی کے اِزالہ کے لئے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں اور فائدوں سے خوب

واقف ہیں، اُن کی رعایت کر کے احکام دیتے ہیں، اور تم چونکہ حقائقِ اُمور اور معاملات کے انجام سے بے خبر ہو، اس لئے اپنے ناتمام غور و فکر اور ناقص رائے سے کبھی ایسی چیزوں کو مصلحت اور فائدہ سمجھ لیتے ہو جس میں تمہاری ہلاکت و بربادی ہے، تم جس عزت و غیرت کو تھامتے پھرتے ہو، اگر مطلقہ عورتیں بے قابو ہوگئیں تو سب عزت خاک میں مل جائے گی، اور مالی منافع کے ناجائز تصورات ممکن ہے کہ تمہیں ایسے فتنوں اور جھگڑوں میں مبتلا کر دیں جن میں مال کے ساتھ جان کا بھی خطرہ ہو جائے۔

قانون سازی اور اس کی تنفیذ میں قرآنِ کریم کا بے نظیر حکیمانہ اُصول

قرآنِ کریم نے اس جگہ ایک قانون پیش فرمایا کہ مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کے مطابق نکاح سے روکنا جرم ہے، اس قانون کو بیان فرمانے کے بعد اس پر عمل کرنے کو سہل اور اس کے لئے عوام کے ذہنوں کو ہموار کرنے کے واسطے یہ تین جملے ارشاد فرمائے جن میں سے پہلے جملے میں روزِ قیامت کے حساب اور جرائم کی سزا سے ڈر کر انسان کو اس قانون پر عمل کرنے کے لئے آمادہ فرمایا، دُوسرے جملے میں اس قانون کی خلاف ورزی میں جو مفاسد اور انسانیت کے لئے مضرتیں ہیں ان کو بتلا کر قانون کی پابندی کے لئے تیار کیا، تیسرے جملے میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمہاری اپنی مصلحت بھی اسی میں ہے کہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون کی پابندی کرو، اس کے خلاف کرنے میں اگر تم کوئی مصلحت سوچتے ہو تو وہ تمہاری کوتاہ نظری اور عواقب سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

قرآنِ کریم کا یہ اُسلوب اور طرزِ بیان صرف یہیں نہیں بلکہ تمام اَحکام میں جاری ہے، کہ ایک قانون بتایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ اور آخرت کے حساب و عذاب سے ڈرایا جاتا ہے، ہر قانون کے آگے پیچھے اِتَّقُوا اللّٰهَ یا اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ وغیرہ جملے لگائے ہوئے ہیں، قرآن ساری دُنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے ایک مکمل نظامِ حیات اور ہر شعبۂ زندگی پر حاوی قانون ہے، اس میں حدود و تعزیرات کا بھی بیان ہے، لیکن اس کی ادا ساری دُنیا کے قانون کی کتابوں سے نرالی ہے، اس کا طرزِ بیان حاکمانہ سے زیادہ مربیانہ ہے، اس میں ہر قانون کے بیان کے ساتھ اس کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی انسان اس قانون کی خلاف ورزی کر کے مستحقِ سزا نہ بنے، دُنیا کی حکومتوں کی طرح نہیں کہ انہوں نے ایک قانون بنا دیا، اور شائع کر دیا، جو کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنی سزا بھگتتا ہے۔

اس کے علاوہ اس اُسلوبِ قرآن اور اس کے مخصوص اندازِ بیان سے ایک دُوررَس بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو دیکھنے سننے کے بعد انسان اس قانون کی پابندی صرف اس بنا پر نہیں کرتا کہ اگر خلاف کرے گا تو دُنیا میں اس کو کوئی سزا مل جائے

گی، بلکہ دُنیا کی سزا سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کی سزا کی فکر ہوتی ہے، اور اسی فکر کی بنا پر اس کا ظاہر و باطن، خفیہ وعلانیہ برابر ہو جاتا ہے، وہ کسی ایسی جگہ میں بھی قانون کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا، جہاں کسی ظاہری یا خفیہ پولیس کی بھی رسائی نہ ہو، کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ذرّے ذرّے سے باخبر ہیں، یہی سبب ہے کہ قرآنی تعلیم نے جو اُصولِ معاشرت تیار کئے تھے ہر مسلمان اس کی پابندی کو اپنا مقصدِ حیات تصور کرتا تھا۔

قرآنی نظامِ حکومت کا یہی اِمتیاز ہے کہ اس میں ایک طرف قانون کی حدود و قیود کا ذِکر ہے تو دُوسری طرف ترغیب و ترہیب کے ذریعے اِنسان کے اَخلاق و کردار کو ایسا بلند کیا گیا ہے کہ قانونی حدود و قیود اس کے لئے ایک طبعی چیز بن جاتی ہیں، جس کے سامنے وہ اپنے جذبات اور تمام نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتا ہے، دُنیا کی حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور ان میں جرم و سزا کے واقعات پر ذرا گہری نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ نرے قانون سے کبھی کسی قوم یا فرد کی اِصلاح نہیں ہوئی، محض پولیس اور فوج سے کبھی جرائم کا اِنسداد نہیں ہوا، جب تک قانون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خوف و عظمت کا سکہ اس کے قلب پر نہ بیٹھے، جرائم سے روکنے والی چیز دراصل خوفِ خدا اور خوفِ حسابِ آخرت ہے، یہ نہ ہو تو کوئی شخص کسی سے جرائم کو نہیں چھڑا سکتا۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ

اور بچے والی عورتیں دُودھ پلاویں اپنے بچوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ پوری کرے

الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

دُودھ کی مدت، اور لڑکے والے یعنی باپ پر ہے کھانا اور کپڑا اُن عورتوں کا موافق دستور کے،

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا وَلَا

تکلیف نہیں دی جاتی کسی کو مگر اس کی گنجائش کے موافق، نہ نقصان دیا جاوے ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے، اور نہ

مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ق وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا

اس کو جس کا وہ بچہ ہے یعنی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے اور وارثوں پر بھی یہی لازم ہے، پھر اگر ماں باپ چاہیں کہ دُودھ چھڑا لیں

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَإِنْ أَرَدْتُّمْ أَنْ

یعنی دو برس کے اندر ہی اپنی رضا اور مشورے سے تو اُن پر کچھ گناہ نہیں اور اگر تم لوگ چاہو کہ

تَسْتَرْضِعُوٓا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ آتَيْتُم

دُودھ پلواؤ کسی دایہ سے اپنی اولاد کو تو بھی تم پر کچھ گناہ نہیں جبکہ حوالے کردو جو تم نے دینا ٹھہرایا تھا

بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوٓا أَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۳﴾

موافق دستور کے، اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دُودھ پلائیں۔ یہ مدت ان کے لئے ہے جو دُودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہیں۔ اور جس باپ کا وہ بچہ ہے اس پر واجب ہے کہ وہ معروف طریقے پر ان ماؤں کے کھانے اور لباس کا خرچ اُٹھائے۔ (ہاں) کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی۔ نہ تو ماں کو اپنے بچے کی وجہ سے ستایا جائے، اور نہ باپ کو اپنے بچے کی وجہ سے۔ اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے۔ پھر اگر وہ دونوں (یعنی والدین) آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے (دو سال گذرنے سے پہلے ہی) دُودھ چھڑانا چاہیں تو اس میں بھی ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کو کسی انا سے دُودھ پلواؤ تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ تم نے جو اُجرت ٹھہرائی تھی وہ (دُودھ پلانے والی انا کو) بھلے طریقے سے دے دو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سارے کاموں کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔ ﴿۲۳۳﴾

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳۰:- رضاعت

اور مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دُودھ پلایا کریں (یہ مدت اس کے لئے ہے) جو شیر خوارگی کی تکمیل کرنا

چاہیے، اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان ماؤں کا کھانا کپڑا قاعدہ کے موافق، اور کسی شخص کو کوئی حکم نہیں دیا جاتا مگر اس کی برداشت کے موافق، کسی ماں کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہئے اس کے بچے کی وجہ سے، اور نہ کسی کے باپ کو تکلیف دینی چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے، اور (اگر باپ زندہ نہ ہو تو) مثل طریقِ مذکور کے (بچے کی پرورش کا انتظام) اس کے (محرم قرابت دار کے) ذمہ ہے جو (شرعاً بچے کا) وارث (ہونے کا حق رکھتا) ہے، پھر (یہ سمجھ لو کہ) اگر دونوں (ماں اور باپ دو سال سے کم میں) دُودھ چھڑانا چاہیں باہمی رضامندی اور مشورے سے تو بھی ان دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں، اور اگر تم لوگ (ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی کسی مصلحتِ ضروریہ سے مثلاً یہ کہ ماں کا دُودھ اچھا نہیں، بچے کو ضرر ہوگا) اپنے بچوں کو کسی اور اَنا کا دُودھ پلوانا چاہو تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ اُن کے حوالے کر دو جو کچھ ان کو دینا طے ہے قاعدہ کے موافق، اور حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھ رہے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں رضاعت یعنی بچوں کو دُودھ پلانے کے متعلق اَحکام ہیں، اس سے پہلی اور بعد کی آیات میں طلاق کے اَحکام مذکور ہیں، درمیان میں دُودھ پلانے کے اَحکام اس مناسبت سے ذِکر کئے گئے ہیں کہ عموماً طلاق کے بعد بچوں کی پرورِش اور دُودھ پلانے یا پلوانے کے معاملات زیرِ نزاع آجاتے ہیں، اور ان میں جھگڑے فساد ہوتے ہیں، اس لئے اس آیت میں ایسے معتدل اَحکام بیان فرمادیئے گئے جو عورت و مرد دونوں کے لئے سہل اور مناسب ہیں، خواہ دُودھ پلانے یا چھڑانے کے معاملات قیامِ نکاح کی حالت میں پیش آئیں یا طلاق دینے کے بعد، بہر دو صورت اس کا ایک ایسا نظام بتادیا گیا جس سے جھگڑے فساد یا کسی فریق پر ظلم و تعدی کا راستہ نہ رہے۔

مثلاً آیت کے پہلے جملے میں اِرشاد فرمایا: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ یعنی ”مائیں اپنے بچوں کو دُودھ پلایا کریں دو سال کامل جبکہ کوئی عذرِ قوی اس سے پہلے دُودھ چھڑانے کے لئے مجبور نہ کرے۔“

اس آیت سے رضاعت کے چند مسائل معلوم ہوئے:-

دُودھ پلانا ماں کے ذمہ واجب ہے

اوّل یہ کہ دُودھ پلانا دیانۃً ماں کے ذمہ واجب ہے، بلاعذر کسی ضد یا ناراضی کے سبب دُودھ نہ پلائے تو گنہگار ہوگی، اور دُودھ پلانے پر وہ شوہر سے کوئی اُجرت و معاوضہ نہیں لے سکتی، جب تک وہ اس کے اپنے نکاح میں ہے، کیونکہ وہ اس کا اپنا فرض ہے۔

پوری مدتِ رضاعت

دُوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ پوری مدتِ رضاعت دو سال ہے، جب تک کوئی خاص عذر مانع نہ ہو بچے کا حق ہے کہ یہ مدت پوری کی جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دُودھ پلانے کے لئے پوری مدت دو سال دی گئی ہے، اس کے بعد دُودھ نہ پلایا جائے، البتہ بعض آیاتِ قرآن اور اَحادیث کی بنا پر اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر تیس مہینے یعنی ڈھائی سال کے عرصہ میں بھی دُودھ پلا دیا تو اَحکام رضاعت کے ثابت ہو جائیں گے، اور اگر بچے کی کمزوری وغیرہ کے عذر سے ایسا کیا گیا تو گناہ بھی نہ ہوگا، ڈھائی سال پورے ہونے کے بعد بچے کو ماں کا دُودھ پلانا باتفاق حرام ہے۔

اس آیت کے دُوسرے جملے میں اِرشاد ہے: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ یعنی ”باپ کے ذمہ ہے ماؤں کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق، کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیا جاتا جس کو وہ برداشت نہ کر سکے۔“

اس میں پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ ماؤں کے لئے تو قرآن نے لفظ ”وَالِدٰتُ“ اِستعمال کیا، مگر باپ کے لئے مختصر لفظ ”والد“ چھوڑ کر اَلْمَوْلُوْدِ لَهٗ اِختیار فرمایا، حالانکہ قرآن میں دُوسری جگہ لفظ والد بھی مذکور ہے: لَا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۚ (لقمان: ۳۳) مگر یہاں والد کی جگہ ”مَوْلُوْدٌ لَّهٗ“ کے اِختیار کرنے میں ایک خاص راز ہے، وہ یہ کہ پورے قرآنِ کریم کا ایک خاص اُسلوب اور طرزِ بیان ہے کہ وہ کسی قانون کو دُنیا کی حکومتوں کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مربیانہ اور مشفقانہ طرز سے بیان کرتا ہے، اور ایسے انداز سے بیان کرتا ہے جس کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا اِنسان کے لئے آسان ہو جائے۔

یہاں بھی چونکہ بچہ کا نفقہ باپ کے ذمہ ڈالا گیا ہے، حالانکہ وہ ماں اور باپ کی متاعِ مشترک ہے، تو ممکن تھا کہ باپ کو یہ حکم کچھ بھاری معلوم ہو، اس لئے بجائے ”والد“ کے ”مَوْلُوْدٌ لَّهٗ“ کا لفظ اِختیار کی (وہ شخص جس کا بچہ ہے) اس میں اس طرف اِشارہ کر دیا کہ اگرچہ بچے کی تولید میں ماں اور باپ دونوں کی شرکت ضرور ہے، مگر بچہ باپ ہی کا کہلاتا ہے، نسب باپ ہی سے چلتا ہے، اور جب بچہ اس کا ہوا تو ذمہ داری خرچ کی اس کو بھاری نہ معلوم ہونی چاہئے۔

بچے کو دُودھ پلانا ماں کے ذمہ اور ماں کا نان ونفقہ وضروریات باپ کے ذمہ ہیں

تیسرا مسئلہ شرعیہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ دُودھ پلانا ماں کے ذمہ ہے، لیکن ماں کا نان ونفقہ اور ضروریاتِ زندگی باپ کے ذمہ ہے، اور یہ ذمہ داری جس وقت تک بچے کی ماں اس کے نکاح میں یا عدت میں ہے اس وقت تک ہے، اور طلاق اور عدت پوری ہونے کے بعد نفقہ زوجیت تو ختم ہو جائے گا، مگر بچے کو دُودھ پلانے کا معاوضہ دینا

باپ کے ذمہ پھر بھی لازم رہے گا۔ (مظہری) [١]

زوجہ کا نفقہ شوہر کی حیثیت کے مناسب ہونا چاہئے یا زوجہ کی؟

چوتھا مسئلہ اس پر تو اِتفاق ہے کہ میاں بیوی دونوں امیر مال دار ہوں تو نفقہ امیرانہ واجب ہوگا، اور دونوں غریب ہوں تو نفقۂ غریبانہ واجب ہوگا، البتہ جب دونوں کے حالاتِ مالی مختلف ہوں تو اس میں فقہاء کا اِختلاف ہے، صاحبِ ہدایہ نے خصاف کے اس قول پر فتویٰ دیا ہے کہ اگر عورت غریب اور مرد مال دار ہو تو اس کا نفقہ درمیانہ حیثیت کا دیا جائے گا کہ غریبوں سے زائد مال داروں سے کم، اور کرخیؒ کے نزدیک اِعتبار شوہر کے حال کا ہوگا، ''فتح القدیر'' میں بہت سے فقہاء کا فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، واللہ اعلم۔ (فتح القدیر ج:٣ ص:٤٢٢)

آیتِ مذکورہ میں اَحکام کے بعد اِرشاد فرمایا: لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ یعنی ''نہ تو کسی ماں کو اُس کے بچے کی وجہ سے تکلیف میں ڈالنا جائز ہے، اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے۔'' مطلب یہ ہے کہ بچے کے ماں باپ آپس میں ضد اضدی نہ کریں، مثلاً ماں دُودھ پلانے سے معذور ہو اور باپ اس پر یہ سمجھ کر زبردستی کرے کہ آخر اس کا بھی تو بچہ ہے، یہ مجبور ہوگی اور پلاوے گی، یا باپ مفلس ہے، اور ماں کو کوئی معذوری بھی نہیں پھر دُودھ پلانے سے اس لئے اِنکار کرے کہ اس کا بھی تو بچہ ہے، جھک مار کر کسی سے پلوالے گا۔

ماں کو دُودھ پلانے پر مجبور کرنے یا نہ کرنے کی تفصیل

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا سے پانچواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ ماں اگر بچے کو دُودھ پلانے سے کسی ضرورت کے سبب اِنکار کرے تو باپ کو اسے مجبور کرنا جائز نہیں، اور اگر بچہ کسی دُوسری عورت یا جانور کا دُودھ نہیں لیتا تو ماں کو مجبور کیا جائے گا، یہ مسئلہ وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ سے معلوم ہوا۔

عورت جب تک نکاح میں ہے تو اپنے بچے کو دُودھ پلانے کی اُجرت کا مطالبہ نہیں کرسکتی، طلاق وعدت کے بعد کرسکتی ہے

چھٹا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر بچے کی ماں دُودھ پلانے کی اُجرت مانگتی ہے تو جب تک اس کے نکاح یا عدت کے اندر ہے اُجرت کے مطالبہ کا حق نہیں، یہاں اس کا نان نفقہ جو باپ کے ذمہ ہے وہی کافی ہے، مزید اُجرت کا مطالبہ باپ کو ضرر پہنچانا ہے، اور اگر طلاق کی عدت گزر چکی ہے اور نفقہ کی ذمہ داری ختم ہوچکی ہے، اب اگر یہ مطلقہ بیوی اپنے بچے کو

---

[١] تفسیر المظہری تحت ہٰذہ الآیۃ ج:١ ص:٣٢٢

دُودھ پلانے کا معاوضہ باپ سے طلب کرتی ہے تو باپ کو دینا پڑے گا، کیونکہ اس کے خلاف کرنے میں ماں کا نقصان ہے، شرط یہ ہے کہ یہ معاوضہ اتنا ہی طلب کرے کہ جتنا کوئی دُوسری عورت لیتی ہے، زائد کا مطالبہ کرے گی تو باپ کو حق ہوگا کہ اس کی بجائے کسی اَنا کا دُودھ پلوائے۔

یتیم بچے کے دُودھ پلوانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟

آیتِ متذکرہ میں اس کے بعد یہ اِرشاد ہے: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یعنی اگر باپ زندہ نہ ہو تو بچے کو دُودھ پلانے یا پلوانے کا اِنتظام اس شخص پر ہے جو بچے کا جائز وارث اور محرم ہو، یعنی اگر بچہ مرجائے تو جن کو اس کی وراثت پہنچتی ہے وہی باپ نہ ہونے کی حالت میں اس کے نفقہ کے ذمہ دار ہوں گے، اگر ایسے وارث کئی ہوں تو ہر ایک پر بقدرِ میراث اس کی ذمہ داری عائد ہوگی۔ اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ یتیم بچے کو دُودھ پلوانے کی ذمہ داری وارث پر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نابالغ بچے کا خرچہ دُودھ چھڑانے کے بعد بھی وارثوں پر ہوگا، کیونکہ دُودھ کی کوئی خصوصیت نہیں، مقصود بچے کا گزارہ ہے، مثلاً اگر یتیم بچے کی ماں اور دادا زندہ ہیں تو یہ دونوں اس بچے کے محرم بھی ہیں اور وارث بھی، اس لئے اس کا نفقہ ان دونوں پر بقدر حصہ میراث عائد ہوگا، یعنی ایک تہائی خرچہ ماں کے ذمہ اور دو تہائی دادا کے ذمہ ہوگا، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یتیم پوتے کا حق دادا پر اپنے بالغ بیٹوں سے بھی زیادہ ہے، کیونکہ بالغ اولاد کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں، اور یتیم پوتے کا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے، ہاں میراث میں بیٹوں کے موجود ہوتے ہوئے پوتے کو حق دار بنانا اُصولِ میراث اور اِنصاف کے خلاف ہے، کہ قریب تر اولاد کے ہوتے ہوئے بعید کو دینا معقول بھی نہیں، اور صحیح بخاری کی حدیث: "لِاَوْلٰی رَجُلٍ ذَکَرٍ"[1] کے بھی خلاف ہے، البتہ دادا کو یہ حق ہے کہ اگر ضرورت سمجھے تو یتیم پوتے کے لئے کچھ وصیت کر جائے، اور یہ وصیت بیٹوں کے حصے سے زائد بھی ہوسکتی ہے، اسی طرح یتیم پوتے کی ضرورت کو بھی پورا کردیا گیا اور وراثت کا اُصول کہ قریب کے ہوتے ہوئے بعید کو نہ دیا جائے، یہ بھی محفوظ رہا۔

دُودھ چھڑانے کے اَحکام

اس کے بعد آیتِ متذکرہ میں اِرشاد ہوتا ہے: فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا یعنی "اگر بچے کے ماں باپ دونوں آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے یہ اِرادہ کریں کہ شیرخوارگی کی مدت یعنی دو سال سے کم میں ہی دُودھ چھڑادیں، خواہ ماں کی معذوری کے سبب یا بچے کی کسی بیماری کے سبب، تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں۔" آپس کے مشورے اور رضامندی کی شرط اس لئے لگائی کہ دُودھ چھڑانے میں بچے کی مصلحت پیشِ نظر ہونی چاہئے، آپ

[1] صحيح البخاري، كتاب الفرائض، باب ميراث الولد من أبيه وأمه ج:۲ ص:۹۹۷

کے لڑائی جھگڑے کا بچے کو تختۂ مشق نہ بنائیں۔

ماں کے سوا دُوسری عورت کا دُودھ پلوانے کے اَحکام

آخر میں اِرشاد فرمایا گیا: وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ یعنی ''اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کی کسی مصلحت سے ماں کی بجائے کسی اَنا کا دُودھ پلواؤ تو اس میں بھی کچھ گناہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دُودھ پلانے والی کی جو اُجرت مقرر کی گئی تھی وہ پوری پوری ادا کردیں'' اور اگر اس کو مقررہ اُجرت نہ دی گئی تو اس کا گناہ ان کے ذمہ رہے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں دُودھ پلانے پر راضی ہے لیکن باپ یہ دیکھتا ہے کہ ماں کا دُودھ بچے کے لئے مضر ہے تو ایسی حالت میں اس کو حق ہے کہ ماں کو دُودھ پلانے سے روک دے اور کسی اَنا سے پلوائے۔

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جس عورت کو دُودھ پلانے پر رکھا جائے اس سے معاملہ تنخواہ یا اُجرت کا پوری صفائی کے ساتھ طے کرلیا جائے کہ بعد میں جھگڑا نہ پڑے، اور پھر وقتِ مقررہ پر یہ طے شدہ اُجرت اس کو سپرد بھی کردے، اس میں ٹال مٹول نہ کرے۔

یہ سب اَحکامِ رضاعت بیان کرنے کے بعد پھر قرآن نے اپنے مخصوص انداز اور اُسلوب کے ساتھ قانون پر عمل کو آسان کرنے اور ظاہر و غائب ہر حال میں اس کا پابند رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے علمِ محیط کا تصور سامنے کردیا، اِرشاد ہوتا ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾ یعنی ''اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کھلے اور چھپے اور ظاہر و غائب کو پوری طرح دیکھ رہے ہیں۔'' اور وہ تمہارے دِلوں کے مخفی اِرادوں اور نیتوں سے باخبر ہیں، اگر کسی فریق نے دُودھ پلانے یا چھڑانے کے مذکورہ اَحکام کی خلاف ورزی کی یا بچے کی مصلحت کو نظر اَنداز کر کے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا تو وہ مستحقِ سزا ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ

اور جو لوگ مرجاویں تم میں سے اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو چاہیے کہ وہ عورتیں اِنتظار میں رکھیں اپنے آپ کو

اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا

چار مہینے اور دس دن، پھر جب پورا کرچکیں اپنی عدت کو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس بات میں کہ

فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۲۳۴ وَلَا جُنَاحَ

کریں وہ اپنے حق میں قاعدے کے موافق، اور اللہ کو تمہارے تمام کاموں کی خبر ہے۔ اور کچھ گناہ نہیں

عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ

تم پر اس میں کہ اِشارے میں کہو پیغامِ نکاح اُن عورتوں کا یا پوشیدہ رکھو اپنے دِل میں،

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْھُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ

اللہ کو معلوم ہے کہ تم البتہ اُن عورتوں کا ذِکر کروگے لیکن ان سے نکاح کا وعدہ نہ کر رکھو چھپ کر مگر یہی کہ

تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ

کہہ دو کوئی بات رواجِ شریعت کے موافق، اور نہ ارادہ کرو نکاح کا یہاں تک کہ پہنچ جاوے

الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ

عدت مقررہ اپنی اِنتہا کو، اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ تمہارے دِل میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۲۳۵ ع

اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور تحمل کرنے والا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں، اور بیویاں چھوڑ کر جائیں تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن انتظار میں رکھیں گی۔ پھر جب وہ اپنی (عدت کی) میعاد کو پہنچ جائیں تو وہ اپنے بارے میں جو کارروائی (مثلاً دوسرا نکاح) قاعدے کے مطابق کریں تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ (۲۳۴) اور (عدّت کے دوران) اگر تم ان عورتوں کو اِشارے کنائے میں نکاح کا پیغام دو یا (ان سے نکاح کا ارادہ) دِل میں چھپائے رکھو تو تم پر کوئی

گناہ نہیں ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ان (سے نکاح) کا خیال تو دِل میں لاؤ گے، لیکن ان سے نکاح کا دوطرفہ وعدہ مت کرنا، اِلّا یہ کہ مناسب طریقے سے کوئی بات کہہ دو۔ اور نکاح کا عقد پکا کرنے کا اس وقت تک ارادہ بھی مت کرنا جب تک عدّت کی مقرّرہ مدّت اپنی میعاد کو نہ پہنچ جائے۔ اور یاد رکھو کہ جو کچھ تمہارے دِلوں میں ہے اللہ اسے خوب جانتا ہے، لہٰذا اس سے ڈرتے رہو، اور یاد رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا، بڑا بُردبار ہے۔ (۲۳۵)

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۱۳۱:- شوہر کی وفات ہونے کی صورت میں عدت کا بیان

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (الیٰ قولہ) وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲۳۴) اور جو لوگ تم میں وفات پا جاتے ہیں، اور بیبیاں چھوڑ جاتے ہیں وہ بیبیاں اپنے آپ کو (نکاح وغیرہ سے) روکے رکھیں چار مہینے اور دس دن، پھر جب اپنی (عدت کی) میعاد ختم کرلیں تو تم کو (بھی) کچھ گناہ نہ ہوگا ایسی بات (کے جائز رکھنے) میں کہ وہ عورتیں اپنی ذات کے لئے کچھ کارروائی (نکاح کی) کریں قاعدہ کے موافق (البتہ اگر کوئی بات خلاف قاعدۂ شرع کے کریں اور تم باوجود روک سکنے کے نہ روکو تو تم بھی شریکِ گناہ ہوگے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام افعال کی خبر رکھتے ہیں۔

حکم نمبر ۱۳۲:- عدت میں نکاح کا پیغام دینا

اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا جو ان مذکورہ عورتوں کو (جو عدتِ وفات میں ہیں) پیغام (نکاح) دینے کے بارے میں کوئی بات اِشارۃً کہہ دو (مثلاً یہ کہ مجھ کو ایک نیک عورت سے نکاح کی ضرورت ہے) یا اپنے دِل میں (آئندہ نکاح کرنے کے اِرادے کو) پوشیدہ رکھو (جب بھی گناہ نہیں اور وجہ اس اِجازت کی یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا (ضرور) ذِکر مذکور کروگے (سو خیر ذِکر مذکور کرو) لیکن ان سے (صاف لفظوں میں) نکاح کا وعدہ (اور گفتگو) مت کرو، مگر یہ کہ کوئی بات قاعدہ کے موافق کہو (تو مضائقہ نہیں، اور وہ بات قاعدہ کے مطابق یہی ہے کہ اِشارۃً کہو) اور تم تعلق نکاح (فی الحال) کا اِرادہ بھی مت کرو، یہاں تک کہ عدت اپنے مقررہ وقت پر ختم ہوجائے، اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ کو اِطلاع ہے تمہارے دِلوں کی بات کی، سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو (اور ناجائز اَمر کا دِل میں اِرادہ بھی مت کیا کرو) اور (یہ بھی) یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ معاف بھی کرنے والے ہیں اور حلیم بھی ہیں۔

معارف و مسائل

عدت کے بعض احکام

۱- جس کا خاوند مرجائے اس کو عدت کے اندر خوشبو لگانا، سنگھار کرنا، سرمہ اور تیل بلاضرورتِ دوا لگانا، مہندی لگانا، رنگین کپڑے پہننا دُرست نہیں، اور صریح گفتگوئے نکاحِ ثانی بھی دُرست نہیں، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے، اور رات کو دُوسرے گھر میں رہنا بھی دُرست نہیں۔ ترجمہ میں ''نکاح'' کے ساتھ جو ''وغیرہ'' کہا گیا ہے اس سے یہی اُمور مراد ہیں، اور یہی حکم ہے اس عورت کا جس پر طلاقِ بائن واقع ہوئی، یعنی جس میں رجعت دُرست نہیں، مگر اس کو اپنے گھر سے دن کو بھی بدون سخت مجبوری کے نکلنا دُرست نہیں۔

۲- اگر چاند رات کو خاوند کی وفات ہوئی تب تو یہ مہینے خواہ تیس کے ہوں خواہ اُنتیس کے ہوں، چاند کے حساب سے پورے کئے جاویں گے، اور اگر چاند رات کے بعد وفات ہوئی ہے تو یہ سب مہینے تیس تیس دن کے حساب سے پورے کئے جاویں گے، پس کل ایک سوتیس دن پورے کریں گے، اس مسئلہ سے بہت لوگ غافل ہیں، اور جس وقت وفات ہوئی ہو جب یہ مدت گزر کر وہی وقت آوے گا، عدت ختم ہوجاوے گی۔ اور یہ جو فرمایا کہ اگر عورتیں قاعدہ کے موافق کچھ کریں تو تم کو بھی گناہ نہ ہوگا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کوئی کام خلافِ شرع کرے تو اوروں پر بھی واجب ہوتا ہے کہ بشرطِ قدرت اس کو روکیں، ورنہ یہ لوگ بھی گنہگار ہوتے ہیں، اور قاعدہ کے موافق سے یہ مراد ہے کہ جو نکاح تجویز ہو وہ شرعاً صحیح اور جائز ہو، تمام شرائط حلت کی وہاں جمع ہوں۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ

کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ اُن کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور نہ مقرر کیا ہو اُن کے لئے

فَرِيضَةً ۚ وَّمَتِّعُوهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ

کچھ مہر، اور اُن کو کچھ خرچ دو مقدور والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق،

مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ

جو خرچ کہ قاعدے کے موافق ہے لازم ہے نیکی کرنے والوں پر۔ اور اگر طلاق دو اُن کو

مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ

ہاتھ لگانے سے پہلے اور ٹھہرا چکے تھے تم اُن کے لئے مہر تو لازم ہوا آدھا اس کا کہ تم مقرر کر چکے تھے

إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا

مگر یہ کہ درگزر کریں عورتیں یا درگزر کرے وہ شخص کہ اس کے اختیار میں ہے گرہ نکاح کی یعنی خاوند، اور تم مرد درگزر کرو تو

أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا

قریب ہے پرہیزگاری کے، اور نہ بھلادو احسان کرنا آپس میں، بے شک اللہ جو کچھ

تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾

تم کرتے ہو خوب دیکھتا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

تم پر اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم عورتوں کو ایسے وقت طلاق دو جبکہ ابھی تم نے ان کو چھوا بھی نہ ہو، اور نہ کوئی مہر ان کے لئے مقرر کیا ہو۔ اور (ایسی صورت میں) ان کو کوئی تحفہ دو، خوشحال شخص اپنی حیثیت کے مطابق اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق بھلے طریقے سے یہ تحفہ دے۔ یہ نیک آدمیوں پر ایک لازمی حق ہے۔﴿٢٣٦﴾ اور اگر تم نے انہیں چھونے سے پہلے ہی اس حالت میں طلاق دی ہو جبکہ ان کے لئے (نکاح کے وقت) کوئی مہر مقرر کر لیا تھا تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا تھا اس کا آدھا دینا (واجب ہے) اِلَّا یہ کہ وہ عورتیں رعایت کر دیں (اور آدھے مہر کا بھی مطالبہ نہ کریں) یا وہ (شوہر) جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، رعایت کرے (اور پورا مہر دیدے) اور اگر تم رعایت کرو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اور آپس میں فراخ دلی کا برتاؤ کرنا مت بھولو۔ جو عمل بھی تم کرتے ہو، اللہ یقیناً اسے دیکھ رہا ہے۔﴿٢٣٧﴾

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳۳: - طلاق قبل الدخول کی صورت میں مہر کے وجوب اور عدمِ وجوب کا بیان

طلاق قبل الدخول کے معنی یہ ہیں کہ زوجین میں یک جائی اور خلوتِ صحیحہ سے پہلے ہی طلاق کی نوبت آجائے، اس کی دو صورتیں ہیں، یا تو اس نکاح کے وقت مہر مقرر کی مقدار متعین نہیں کی گئی، یا مقدارِ مہر متعین کردی گئی، پہلی صورت کا حکم اوّلاً مذکور ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ (الی قولہ) حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ یعنی تم پر (مہر کا) کچھ مؤاخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دے دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہے، (سو اس صورت میں مہر اپنے ذمہ مت سمجھو) اور (صرف) ان کو (ایک) فائدہ پہنچاؤ، صاحبِ وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، اور تنگ دست کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا جو قاعدہ کے موافق واجب ہے خوش معاملہ لوگوں پر (یعنی سب مسلمانوں پر، کیونکہ خوش معاملگی کا بھی سب ہی کو حکم ہے، مراد اس سے ایک جوڑا کپڑوں کا دینا ہے)۔

اور دُوسری صورت کا حکم یہ ہے: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ (الی قولہ) اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾ اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ اُن کو ہاتھ لگاؤ، اور ان کے لئے کچھ مہر بھی مقرر کرچکے تھے تو (اس صورت میں) جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا نصف (واجب) ہے (اور نصف معاف) مگر (دو صورتیں اس مجموعی حکم سے مستثنیٰ ہیں، ایک صورت تو) یہ کہ وہ عورتیں (اپنا نصف) بھی معاف کردیں (تو اس صورت میں نصف بھی واجب نہ رہا) یا (دُوسری صورت) یہ (ہے) کہ وہ شخص رعایت کردے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق (رکھنا اور توڑنا) ہے (یعنی خاوند پورا مہر ہی اس کو دیدے تو اس صورت میں خاوند کی مرضی سے پورا ہی مہر ادا کرنا ہوگا) اور (اے اہلِ حق!) تمہارا (اپنے حقوق کو) معاف کردینا (بہ نسبت وصول کرنے کے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (کیونکہ معاف کرنے سے ثواب ملتا ہے، اور ثواب کا کام کرنا ظاہر ہے کہ تقویٰ کی بات ہے) اور آپس میں اِحسان (اور رعایت) کرنے سے غفلت مت کرو، (بلکہ ہر شخص دُوسرے کے ساتھ رعایت کرنے کا خیال رکھا کرے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (تو تم اگر کسی کے ساتھ رعایت واِحسان کروگے اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر تم کو دیں گے)۔ (بیان القرآن)

معارف و مسائل

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (الیٰ قولہ) اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾ طلاق کی، مہر اور صحبت کے لحاظ سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں، ان میں سے دو کا حکم ان آیات میں بیان کیا گیا ہے، ایک یہ کہ نہ مہر مقرر ہو، نہ صحبت وخلوَت، دُوسری یہ کہ مہر تو مقرر ہو لیکن صحبت وخلوَت کی نوبت نہ آئے، تیسری صورت یہ ہے کہ مہر بھی مقرر ہو اور صحبت کی بھی نوبت آوے، اس میں جو مہر مقرر کیا ہے پورا دینا ہوگا، یہ حکم قرآن مجید میں دُوسرے مقام پر بیان کیا گیا ہے، چوتھی صورت یہ ہے کہ مہر معین نہ کیا، اور صحبت یا خلوَت کے بعد طلاق دی، اس میں مہرِ مثل پورا دینا ہوگا، یعنی جو اس عورت کی قوم میں رِواج ہے، اس کا بیان بھی ایک دُوسری آیت میں آیا ہے۔

مذکورہ آیت میں پہلی دو قسموں کا حکم بیان کیا گیا ہے، اس میں سے پہلی صورت کا حکم یہ ہے کہ مہر کچھ واجب نہیں مگر زوج پر واجب ہے کہ اپنے پاس سے عورت کو کچھ دیدے، کم از کم یہی کہ ایک جوڑا کپڑے کا دیدے، دراصل قرآنِ کریم نے اس عطیہ کی کوئی مقدار متعین نہیں کی، البتہ یہ بتلا دیا کہ مال دار کو اپنی حیثیت کے مطابق دینا چاہئے، جس میں اس کی ترغیب ہے کہ صاحبِ وسعت اس میں تنگی سے کام نہ لے۔ حضرت حسنؓ نے ایسے ہی ایک واقعہ میں مطلقہ عورت کو بیس ہزار کا عطیہ دیا، اور قاضی شریحؒ نے پانچ سو دِرہم کا، اور حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک جوڑا کپڑے کا دیدے۔ (قرطبی) [1]

اور دُوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ جس عورت کا مہر نکاح کے وقت مقرر ہوا ہو، اور اس کو قبل صحبت وخلوَتِ صحیحہ کے طلاق دے دی ہو تو مقرر کئے ہوئے مہر کا نصف مرد کے ذمے واجب ہوگا، البتہ اگر عورت معاف کردے یا مرد پورا دیدے تو اختیاری بات ہے، جیسا کہ آیت: اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ سے معلوم ہوتا ہے۔

۱- مرد کے پورا مہر دینے کو بھی معاف کرنے کے لفظ سے شاید اس لئے تعبیر کیا کہ عام عادت عرب کی یہ تھی کہ مہر کی رقم شادی کے ساتھ ہی دے دی جاتی تھی، تو طلاق قبل اَز خلوَت کی صورت میں وہ نصف واپس لینے کا حق دار ہوگیا، اب اگر وہ رعایت کر کے اپنا نصف واپس نہ لے تو یہ بھی معاف ہی کرنا ہے، اور معاف کرنے کو افضل اور اقرب للتقویٰ قرار دِیا، کیونکہ یہ معافی علامت اس کی ہے کہ تعلقِ نکاح کا قطع کرنا بھی اِحسان اور حسنِ سلوک کے ساتھ ہوا جو مقصدِ شریعت اور موجبِ ثوابِ عظیم ہے، خواہ معافی عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

۲- اَلَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ کی تفسیر خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی: "وَلِيُّ عُقْدَةِ النِّكَاحِ اَلزَّوْجُ"

[1] تفسير القرطبي تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۲۰۱

یعنی ''عقدۂ نکاح کا مالک شوہر ہے۔'' [1] یہ حدیث دارقطنی میں بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ منقول ہے، اور حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی۔ (قرطبی) [2]

اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ نکاح مکمل ہو جانے کے بعد نکاح کو قائم رکھنے یا ختم کرنے کا مالک شوہر ہے، طلاق وہی دے سکتا ہے، عورت کا طلاق میں کوئی اختیار نہیں۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾

خبردار رہو سب نمازوں سے اور بیچ والی نماز سے، اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ

پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھ لو یا سوار، پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح کہ تم کو سکھایا ہے

مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٩﴾

جس کو تم نہ جانتے تھے۔

آسان ترجمۂ قرآن

تمام نمازوں کا پورا پورا خیال رکھو، اور (خاص طور پر) بیچ کی نماز کا۔ اور اللہ کے سامنے باادب فرماں بردار بن کر کھڑے ہوا کرو ﴿٢٣٨﴾ اور اگر تمہیں (دشمن کا) خوف لاحق ہو تو کھڑے کھڑے یا سوار ہونے کی حالت ہی میں (نماز پڑھ لو) پھر جب تم امن کی حالت میں آجاؤ تو اللہ کا ذِکر اس طریقے سے کرو جو اس نے تمہیں سکھایا ہے جس سے تم پہلے ناواقف تھے ﴿٢٣٩﴾

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳۴: - نمازوں کی حفاظت کا بیان

اس سے آگے پیچھے طلاق وغیرہ کے اَحکام ہیں، درمیان میں نماز کے اَحکام بیان فرمانا اشارہ اس طرف ہے کہ

---

[1] سنن دارقطني، كتاب النكاح، باب المهر رقم الحديث: ٣٧٦٢

[2] تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج: ٣ ص: ٢٠٦

مقصودِ اصلی توجہ الی الحق ہے، اور معاشرت اور معاملات کے اَحکام سے، علاوہ اور مصلحتوں کے اس توجہ کی حفاظت اور ترقی بھی مقصود ہے، چنانچہ جب ان کو خدائی اَحکام سمجھ کر عمل کیا جاوے گا تو توجہ لازم ہوگی، پھر یہ کہ ان اَحکام میں ادائے حقوقِ عباد بھی ہے اور حقوقِ عباد کے اِتلاف سے درگاہِ اِلٰہی سے دُوری ہوتی ہے، جس کے لوازم میں سے حق و عبد دونوں کی طرف سے بے توجہی ہے، چونکہ نماز میں یہ توجہ زیادہ ظاہر ہے اس لئے اس کے درمیان میں لانے سے اس توجہ کے مقصود ہونے پر زیادہ دلالت ہوگی، تاکہ بندہ اس توجہ کو ہر وقت پیشِ نظر رکھے۔

حٰفِظُوۡا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰى (الیٰ قولہ) مَا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ۝۲۳۹ محافظت کرو سب نمازوں کی (عموماً) اور درمیان والی نماز (یعنی عصر) کی (خصوصاً) اور (نماز میں) کھڑے ہوا کرو اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے، پھر اگر تم کو (باقاعدہ نماز پڑھنے میں کسی دُشمن وغیرہ کا) اندیشہ ہو تو کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے (جس طرح بن سکے خواہ قبلہ کی طرف بھی منہ ہو یا نہ ہو، اور گو رُکوع وسجود صرف اِشارہ ہی سے ممکن ہو) پڑھ لیا کرو (اس حالت میں بھی اس پر محافظت رکھو اس کو ترک مت کرو) پھر جب تم کو (بالکل) اِطمینان ہو جاوے (اور اندیشہ جاتا رہے) تو تم خدا تعالیٰ کی یاد (یعنی ادائے نماز) اس طریق سے کرو جو تم کو (اِطمینان کی حالت میں) سکھلایا ہے جس کو تم (پہلے سے) جانتے نہ تھے۔

معارف ومسائل

کثرت سے علماء کا قول بعض احادیث کی دلیل سے یہ ہے کہ بیچ والی نماز سے مراد نمازِ عصر ہے[۱]، کیونکہ اس کے ایک طرف دو نمازیں دن کی ہیں فجر اور ظہر، اور ایک طرف دو نمازیں رات کی ہیں مغرب اور عشاء، اس کی تاکید خصوصیت کے ساتھ اس لئے کی گئی کہ اکثر لوگوں کو یہ وقت کام کی مصروفیت کا ہوتا ہے، اور "عاجزی" کی تفسیر حدیث میں "سکوت" کے ساتھ آئی ہے۔

اسی آیت سے نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت ہوئی ہے، پہلے کلام کرنا دُرست تھا، اور یہ نماز کھڑے کھڑے اِشارہ سے جب صحیح ہوگی جب ایک جگہ کھڑا ہو سکے، اور اس میں سجدے کا اِشارہ ذرا زیادہ پست کرے، اور چلنے سے نماز نہیں ہوگی، البتہ جب ایسا ممکن نہ ہو، مثلاً عین لڑائی کا وقت ہے، تو نماز کو قضا کر دیا جاوے گا، دُوسرے وقت پڑھ لیں۔ (بیان القرآن)[۲]

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ، باب الدلیل لمن قال ...إلخ ج:۱ ص:۲۲۶

[۲] تفسیر بیان القرآن تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۱ ص:۱۶۳

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا

اور جو لوگ تم میں سے مرجاویں اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو وہ وصیت کردیں اپنی عورتوں کے واسطے خرچ دینا

اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ

ایک برس تک بغیر نکالنے کے گھر سے، پھر اگر وہ عورتیں آپ نکل جاویں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ کریں وہ عورتیں

فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ

اپنے حق میں بھلی بات اور اللہ زبردست ہے حکمت والا۔ اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے واسطے خرچ دینا

بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ

ہے قاعدے کے موافق لازم ہے پرہیزگاروں پر۔ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے حکم

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع ۱۵

تا کہ تم سمجھ لو۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جایا کریں کہ ایک سال تک وہ (ترکے سے نفقہ وصول کرنے کا) فائدہ اُٹھائیں گی اور ان کو (شوہر کے گھر سے) نکالا نہیں جائے گا۔ ہاں اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنے حق میں قاعدے کے مطابق وہ جو کچھ بھی کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اور اللہ صاحبِ اقتدار بھی ہے، صاحبِ حکمت بھی۔ ﴿۲۴۰﴾ اور مطلقہ عورتوں کو قاعدے کے مطابق فائدہ پہنچانا متقیوں پر ان کا حق ہے۔ ﴿۲۴۱﴾ اللہ اپنے اَحکام اسی طرح وضاحت سے تمہارے سامنے بیان کرتا ہے، تا کہ تم سمجھ داری سے کام لو۔ ﴿۲۴۲﴾

خلاصۂ تفسیر

حکم نمبر ۳۵:- بیوہ عورت کی سکونت اور متاع کی بعض اَقسام کا بیان

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (الیٰ قولہ) وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٤٠﴾ اور جولوگ وفات پا جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیبیوں کو (ان کے ذمہ لازم ہے کہ) وہ وصیت کر جایا کریں اپنی بیبیوں کے واسطے ایک سال تک (نان ونفقہ اور گھر میں سکونت رکھنے سے) منتفع ہونے کی اس طور پر کہ وہ گھر سے نکالی نہ جاویں، ہاں اگر (چار مہینے دس دن کے بعد، یا وضعِ حمل کے بعد عدت گزار کر) خود نکل جاویں تو تم کو کوئی گناہ نہیں، اس قاعدہ کی بات میں جس کو اپنے بارے میں (تجویز) کریں (جیسے نکاح وغیرہ) اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (ان کے خلاف حکم مت کرو) اور حکمت والے ہیں (کہ تمام اَحکام میں تمہاری مصلحتیں ملحوظ رکھی ہیں، گو تمہاری فہم میں نہ آسکیں)۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ (الیٰ قولہ) لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٤٢﴾ اور سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ کچھ فائدہ پہنچانا (کسی درجہ میں مقرر ہے) قاعدہ کے موافق (اور یہ) مقرر ہوا ہے ان پر جو (شرک وکفر سے) پرہیز کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں پر خواہ یہ مقرر ہونا وجوب کے درجہ میں ہو یا اِستحباب کے مرتبہ میں) اسی طرح حق تعالیٰ تمہارے (عمل کرنے کے) لئے اپنے اَحکام بیان فرماتے ہیں اس توقع پر کہ تم (ان کو) سمجھو (اور عمل کرو)۔

معارف ومسائل

۱- وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (الیٰ قولہ) وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٤٠﴾ زمانۂ جاہلیت میں وفاتِ زوج کی عدت ایک سال تھی، اور اِسلام میں بجائے ایک سال کے، چار مہینے دس دن مقرر ہوئے جیسا کہ ماقبل میں آیت: يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (البقرۃ:۲۳۴) سے معلوم ہو چکا ہے، مگر اس میں عورت کی اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ چونکہ اس وقت تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا، اور بیوی کا کوئی حصہ میراث میں مقرر نہ ہوا تھا، بلکہ اوروں کے حق کا مدار محض مردے کی وصیت پر تھا جیسا کہ آیت: كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ (البقرۃ:۱۸۰) کی تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے، اس لئے یہ حکم ہو گیا تھا کہ اگر عورت اپنی مصلحت سے خاوند کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہے تو سال بھر تک اس کو رہنے کا حق حاصل ہے، اور اسی ترکہ سے اس مدت میں اس کو نان نفقہ بھی دیا جاوے، اس آیت میں اسی کا بیان ہے، اور خاوندوں کو حکم ہے کہ اس طرح کی وصیت کر جایا کریں، اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا، اس کو اس کے وصول کرنے نہ کرنے کا اِختیار حاصل تھا اس لئے وارثوں کو تو

گھر سے نکالنا جائز نہ تھا، لیکن خود اس کو جائز تھا کہ خود اس کے گھر نہ رہے، اور اپنا حق ورثہ کو چھوڑے، بشرطیکہ عدت پوری ہو چکے، اور نکاح وغیرہ سب دُرست تھا، اور یہی مراد ہے قاعدہ [1] کی بات سے، البتہ عدت کے اندر نکلنا اور نکاح کرنا وغیرہ سب گناہ تھا، عورت کے لئے بھی اور جو منع کر سکے اور نہ روکے اس کے لئے بھی، پھر جب آیت میراث کی نازل ہوئی، گھر بار سب ترکہ میں سے عورت کا حق مل گیا، سوا اپنے حصہ میں رہے اور اپنے حصہ سے خرچ کرے، یہ آیت منسوخ ہوگئی۔

۲- وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ مطلقہ عورتوں کو متعہ یعنی فائدہ پہنچانا اس سے پہلی آیات میں بھی آچکا ہے مگر وہ صرف دو قسم کی مطلّقات کے لئے تھا، جن کو صحبت وخلوت سے پہلے طلاق ہوگئی ہو، ایک کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ جوڑا دِیا جائے، دُوسری کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ آدھا مہر دِیا جائے، اب وہ طلاق والیاں رہ گئیں جن کو صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی جاوے سو اُن میں جس کا مہر مقرر کیا گیا ہو اس کو فائدہ پہنچانا یہ ہے کہ پورا مہر دینا چاہئے، اور جس کا مہر مقرر نہ کیا جاوے اس کے لئے بعد دُخول کے مہرِ مثل واجب ہے، یہ متاع بمعنی مطلق فائدہ پہنچانا اس تفصیل سے تو واجب ہے، اور اگر متاع سے مراد فائدۂ خاص یعنی تحفہ یا جوڑا دینا ہی لیا جائے تو ایک مطلقہ کو تو دینا واجب ہے، جس کا ذِکر ماقبل میں آچکا ہے، اور باقی سب اَقسام میں مستحب ہے، اور اگر متاع سے مراد نفقہ لیا جاوے تو جس طلاق میں عدت ہے اس میں عدت گزرنے تک واجب ہے، خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن، غرض آیت اپنے الفاظِ عامہ سے سب صورتوں کو شامل ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠

کیا نہ دیکھا تو نے اُن لوگوں کو جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے،

فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۗ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ

پھر فرمایا اُن کو اللہ نے کہ مرجاؤ، پھر اُن کو زِندہ کردیا، بے شک اللہ فضل کرنے والا ہے لوگوں پر

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا

لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اور لڑو اللہ کی راہ میں اور جان لو

---

[1] اور قاعدہ سے مراد یہی تفصیل ہو جائے گی، اور ہر صورت کے وجوب اور اِستحباب کا فرق دُوسرے دلائل سے ثابت کیا جائے گا، اور ''حَقًّا'' کو واجب کے معنی میں نہ لیں گے، اور ''عَلَى'' اِلزام کے لئے نہ ہوگا، بلکہ محض تاکید کے لئے ہوگا گو درجۂ اِستحباب ہی میں سہی۔ (بیان القرآن تحت هٰذه الآیة ج:۱ ص:۱۶۴)

اَنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۴۴﴾

کہ اللہ بے شک خوب سنتا جانتا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

کیا تمہیں ان لوگوں کا حال معلوم نہیں ہوا جو موت سے بچنے کے لئے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے، اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے؟ چنانچہ اللہ نے ان سے کہا: ''مرجاؤ'' پھر انہیں زندہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بہت فضل فرمانے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ ﴿۲۴۳﴾ اور اللہ کے راستے میں جنگ کرو، اور یقین رکھو کہ اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ ﴿۲۴۴﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب!) کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے موت سے بچنے کے لئے سو اللہ نے اُن کے لئے (حکم) فرمادیا کہ مرجاؤ (سب مرگئے) پھر اُن کو جلادِیا، بے شک اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے والے ہیں لوگوں (کے حال) پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور (اس واقعہ پر غور کرکے) اللہ کی راہ میں قتال کرو اور یقین رکھو اس بات کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں (جہاد کرنے اور نہ کرنے والوں کی باتیں سنتے اور ہر ایک کی نیت جانتے ہیں، اور سب کو مناسب جزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

یہ تین آیتیں جو اُوپر مذکور ہوئی ہیں، ان میں ایک عجیب بلیغ انداز میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال کی قربانی پیش کرنے کی ہدایت ہے کہ ان اَحکام کے بیان کرنے سے پہلے تاریخ کا ایک اہم واقعہ ذِکر کیا گیا ہے، جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ موت وحیات تقدیرِ الٰہی کے تابع ہے، جنگ و جہاد میں جانا موت کا سبب نہیں، اور بزدلی سے جان چرانا موت سے بچنے کا ذریعہ نہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں سلفِ صحابہؓ اور تابعینؒ کے حوالے سے اس واقعہ کی تشریح یہ بیان کی ہے کہ بنی اِسرائیل کی کوئی جماعت ایک شہر میں بستی تھی، اور وہاں کوئی سخت وبا طاعون وغیرہ پھیلا، یہ لوگ جو تقریباً دس ہزار کی تعداد میں تھے گھبرا اُٹھے، اور موت کے خوف سے اس شہر کو چھوڑ کر سب کے سب دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع میدان میں

جا کر مقیم ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر اور دُنیا کی دُوسری قوموں پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ موت سے کوئی شخص بھاگ کر جان نہیں چھڑا سکتا، دو فرشتے بھیج دیئے، جو میدان کے دونوں سروں پر آ کھڑے ہوئے، اور کوئی ایسی آواز دی جس سے سب کے سب بیک وقت مرے ہوئے رہ گئے، ایک بھی زندہ نہ رہا، آس پاس کے لوگوں کو جب اس واقعہ کی اِطلاع ہوئی، یہاں پہنچے، دس ہزار اِنسانوں کے کفن دفن کا اِنتظام آسان نہ تھا، اس لئے ان کے گرد ایک احاطہ کھینچ کر حظیرہ جیسا بنا دیا، اُن کی لاشیں حسبِ دستور گل سڑ گئیں، ہڈیاں پڑی رہ گئیں، ایک زمانۂ دراز کے بعد بنی اِسرائیل کے ایک پیغمبر جن کا نام حزقیل علیہ السلام بتلایا گیا ہے، اس مقام پر گزرے، اس حظیرہ میں جگہ جگہ اِنسانی ہڈیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے، بذریعہ وحی ان کو ان لوگوں کا پورا واقعہ بتلا دیا گیا، حضرت حزقیل علیہ السلام نے دُعا کی کہ یا اللہ! ان لوگوں کو پھر زندہ فرما دے، اللہ تعالیٰ نے اُن کی دُعا قبول فرمائی اور انہیں حکم دیا گیا کہ آپ ان شکستہ ہڈیوں کو اس طرح خطاب فرمائیں:-

اَیَّتُهَا الْعِظَامُ الْبَالِیَةُ اِنَّ اللهَ یَأْمُرُكِ اَنْ تَجْتَمِعِیْ۔

''یعنی اے پرانی ہڈیو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ہر جوڑ کی ہڈی اپنی جگہ جمع ہو جائے۔''

پیغمبر کی زبان سے خدا تعالیٰ کا حکم ان ہڈیوں نے سنا اور حکم کی تعمیل کی، جن کو دُنیا بے عقل و بے شعور سمجھتی ہے مگر دُنیا کے ہر ذرّے ذرّے کی طرح وہ بھی تابع فرمان اور اپنے وجود کے مناسب عقل و اِدراک رکھتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مطیع ہیں، قرآنِ کریم نے آیت: اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝۵۰ (طٰہٰ) میں اس کی طرف اِشارہ فرمایا ہے، یعنی ''اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا پھر اس کو اس کے مناسبِ حال ہدایت فرمائی۔'' مولانا رُومیؒ نے ایسے ہی اُمور کے متعلق فرمایا ہے ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

بامن وتو مردہ باحق زندہ اند [1]

بہر حال ایک آواز پر ہر اِنسان کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ لگ گئیں، پھر حکم ہوا کہ اب ان کو یہ آواز دو:-

اَیَّتُهَا الْعِظَامُ اِنَّ اللهَ یَأْمُرُكِ اَنْ تَكْتَسِیَ لَحْمًا وَّعَصَبًا وَّجِلْدًا۔

''یعنی اے ہڈیو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اپنا گوشت پہن لو اور پٹھے اور کھال دُرست کرلو۔''

یہ کہنا تھا کہ ہڈیوں کا ہر ڈھانچہ ان کے دیکھتے دیکھتے ایک مکمل لاش بن گئی، پھر حکم ہوا کہ اب اَرواح کو یہ خطاب کیا جائے:-

اَیَّتُهَا الْاَرْوَاحُ اِنَّ اللهَ یَأْمُرُكِ اَنْ تَرْجِعَ كُلُّ رُوْحٍ اِلَی الْجَسَدِ الَّذِیْ كَانَتْ تَعْمُرُهٗ۔

[1] ترجمہ:- مٹی، تیز ہوا، پانی اور آگ سب اللہ کے فرمانبردار ہیں، میں اور تو ان کو مردہ سمجھتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ زندہ ہیں۔

''یعنی اے اَرواح! تمہیں اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اپنے اپنے بدنوں میں لوٹ آئیں، جن کی تعمیر وحیات اُن سے وابستہ تھی۔''

یہ آواز دیتے ہی اُن کے سامنے سارے لاشے زندہ ہوکر کھڑے ہوگئے اور حیرت سے چار طرف دیکھنے لگے، سب کی زبانوں پر تھا: ''سُبْحَانَکَ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ''۔ [1]

یہ واقعۂ ہائلہ دُنیا کے فلاسفروں اور عقلاء کے لئے دعوتِ فکر اور منکرینِ قیامت پر حجتِ قاطعہ ہونے کے ساتھ اس ہدایت پر بھی مشتمل ہے کہ موت کے خوف سے بھاگنا خواہ جہاد سے ہو یا کسی وبا و طاعون سے اللہ تعالیٰ اور اس کی تقدیر پر ایمان رکھنے والے کے لئے ممکن نہیں، جس کا یہ ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، نہ اس سے ایک سیکنڈ پہلے آسکتی ہے، اور نہ ایک سیکنڈ مؤخر ہوسکتی ہے، اس لئے یہ حرکت فضول بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہونے کی وجہ بھی۔

اب اس واقعہ کو قرآن کے الفاظ سے دیکھئے، بیانِ واقعہ کے لئے قرآن نے فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ یعنی'' کیا آپ نے ان لوگوں کے واقعہ کو نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے بخوفِ موت نکل کھڑے ہوئے تھے۔''

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہزاروں برس پہلے کا ہے، اس کے دیکھنے کا حضور سے سوال ہی نہیں ہوسکتا، تو یہاں اَلَمْ تَرَ فرمانے کا کیا منشا ہے، مفسرین نے فرمایا ہے کہ ایسے تمام مواقع میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ اَلَمْ تَرَ کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، حالانکہ واقعہ آپ کے زمانے سے پہلے کا ہے، جس کے دیکھنے کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا، ان سب مواقع میں رُویت سے رُویتِ قلبی مراد ہوتی ہے، جس کے معنی ہیں علم واِدراک یعنی اَلَمْ تَرَ ایسے مواقع میں ''اَلَمْ تَعْلَمْ'' کے معنی میں ہوتا ہے، لیکن اس کو لفظ اَلَمْ تَرَ سے تعبیر کرنے میں حکمت اس واقعہ کے مشہور و معروف ہونے کی طرف اِشارہ کرنا ہے، کہ یہ واقعہ ایسا یقینی ہے جیسے کوئی آج دیکھ رہا ہو اور دیکھنے کے قابل ہو، اَلَمْ تَرَ کے بعد حرف اِلٰی بڑھانے سے اَز روئے زبان اس کی طرف اِشارہ بھی ہوتا ہے۔

اس کے بعد قرآن میں اُن کی ایک بڑی تعداد ہونے کا بیان فرمایا گیا وَهُمْ اُلُوْفٌ یعنی وہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے، اس تعداد کی تعیین میں روایات مختلفہ ہیں، لیکن عربی زبان کے قاعدے سے یہ لفظ جمع کثرت ہے، جس کا اِطلاق دس سے کم پر نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ ان کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔

اس کے بعد اِرشاد ہے: فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۗ یعنی'' کہہ دیا اُن کو اللہ تعالیٰ نے کہ مرجاؤ۔'' اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بلاواسطہ بھی ہوسکتا ہے اور بواسطہ کسی فرشتے کے بھی، جیسے دُوسری آیت میں اِرشاد ہے: اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ (یٰسٓ)

---

[1] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآیة ج:۱ ص:۲۲۰، ۲۲۱

اس کے بعد فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ، یعنی ''اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے والے ہیں لوگوں پر۔'' اس میں وہ فضل بھی داخل ہے جو بنی اسرائیل کی اس قوم کو دوبارہ زندہ کرکے فرمایا، اور یہ فضل بھی شامل ہے جو یہ واقعہ اُمتِ محمدیہ کو بتلا کر ان کے لئے درسِ عبرت بنایا۔

آخر میں غفلت شعار انسان کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا: وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۲۴۳﴾ یعنی ''اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت کے ہزاروں مظاہر انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں، مگر اس کے باوجود اکثر انسان شکرگزار نہیں ہوتے۔''

مسائلِ متعلقہ

اس آیت سے چند مسائل اور اَحکام مستفاد ہوئے:-

تدبیر پر تقدیر غالب ہے

اوّل یہ کہ تقدیرِ الٰہی کے مقابلے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی، اور جہاد سے یا طاعون وغیرہ سے بھاگنا جان بچانے کا ذریعہ نہیں ہوسکتا، اور نہ اُن میں قائم رہنا موت کا باعث ہوتا ہے، بلکہ موت کا ایک وقت معین ہے، نہ اُس میں کمی ہوسکتی ہے نہ زیادتی۔

جس بستی میں کوئی وبا طاعون وغیرہ ہو اس میں جانا یا وہاں سے بھاگ کر کہیں اور جانا دونوں ناجائز ہیں

دُوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس شہر میں کوئی وبائی مرض طاعون وغیرہ پھیل جائے وہاں سے بھاگ کر دُوسری جگہ جانا جائز نہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشاد میں اس پر اتنا اور اِضافہ ہے کہ دُوسرے لوگوں کو وہاں جانا بھی دُرست نہیں، حدیث میں ہے:-

اِنَّ هٰذَا السَّقَمَ عُذِّبَ بِهِ الۡاُمَمُ قَبۡلَكُمۡ فَاِذَا سَمِعۡتُمۡ بِهٖ فِي الۡاَرۡضِ فَلَا تَدۡخُلُوۡهَا وَاِذَا وَقَعَ بِاَرۡضٍ وَّاَنۡتُمۡ بِهَا فَلَا تَخۡرُجُوۡا فِرَارًا۔ [1] (بخاری ومسلم، ابن کثیر)

''یعنی اس بیماری (طاعون) کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلی قوموں پر عذاب نازل فرمایا ہے، سو جب تم یہ سنو کہ کسی شہر میں طاعون وغیرہ وبائی مرض پھیل رہا ہے تو وہاں نہ جاؤ، اور اگر کسی بستی میں یہ

[1] صحيح مسلم، كتاب السلام، باب الطاعون والطيرة ...إلخ ج:۲ ص:۲۲۸ وصحيح البخاري، كتاب احاديث الأنبياء، بابٌ ج:۱ ص:۴۹۴

مرض پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو وہاں سے بھاگ کر نہ نکلو۔‘‘

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے ایک مرتبہ ملکِ شام کے قصد سے سفر کیا، سرحدِ شام پر تبوک کے قریب ایک مقام سرغ ہے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملکِ شام میں سخت طاعون پھیلا ہوا ہے، یہ طاعون ملکِ شام کی تاریخ میں ایک عظیم سانحہ تھا، یہ طاعون ’’عمواس‘‘ کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ اوّل یہ طاعون ایک بستی عمواس نامی میں شروع ہوا، جو بیت المقدس کے قریب ہے، پھر سارے ملک میں پھیل گیا، ہزار ہا انسان جن میں بہت سے صحابہؓ و تابعینؒ بھی تھے، اس طاعون میں شہید ہوئے۔

فاروقِ اعظمؓ نے طاعون کی شدت کی خبر سنی تو اسی مقام پر ٹھہر کر صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ ہمیں ملکِ شام میں اس وقت جانا چاہئے یا واپس ہونا مناسب ہے، اُس وقت جتنے حضرات مشورہ میں شریک تھے اُن میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق کوئی حکم سنا ہو، بعد میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد اس معاملے کے متعلق یہ ہے:-

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَكَرَ الْوَجَعَ فَقَالَ: رِجْزٌ وَّعَذَابٌ عُذِّبَ بِهِ الْاُمَمُ ثُمَّ بَقِيَ مِنْهُ بَقِيَّةٌ فَيَذْهَبُ الْمَرَّةَ وَيَأْتِي الْاُخْرٰى فَمَنْ سَمِعَ بِهٖ بِاَرْضٍ فَلَا يَقْدِمَنَّ عَلَيْهِ وَمَنْ كَانَ بِاَرْضٍ وَقَعَ بِهَا فَلَا يَخْرُجْ فِرَارًا مِّنْهُ۔ [1] (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ عَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ، وَاَخْرَجَهُ الْاَئِمَّةُ بِمِثْلِهٖ)

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (طاعونی گلٹی کے) درد کا ذِکر کیا تو فرمایا کہ یہ ایک عذاب ہے جس سے بعض اُمتوں کو عذاب دیا گیا تھا، پھر اس کا کچھ بقیہ رہ گیا، اب اس کا یہ حال ہے کہ کبھی چلا جاتا ہے اور پھر آجاتا ہے، تو جو شخص یہ سنے کہ فلاں خطۂ زمین میں یہ عذاب آیا ہوا ہے تو اس کو چاہئے کہ اس خطۂ زمین میں نہ جائے، اور جو شخص اس خطہ میں پہلے سے موجود ہو تو طاعون سے بھاگنے کے لئے وہاں سے نہ نکلے۔ (بخاری وغیرہ)

حضرت فاروقِ اعظمؓ نے جب یہ حدیث سنی تو رُفقاء کو واپسی کا حکم دے دیا، حضرت ابوعبیدہؓ ملکِ شام کے عامل و امیر (گورنر) بھی اس مجلس میں موجود تھے، فاروقِ اعظمؓ کا یہ حکم سن کر فرمانے لگے: ’’اَفِرَارًا مِّنْ قَدَرِ اللّٰهِ‘‘ یعنی کیا آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں؟ فاروقِ اعظمؓ نے جواب میں فرمایا: ابوعبیدہ! کاش یہ بات کوئی اور کہتا، یعنی تمہاری زبان سے ایسی بات قابلِ تعجب ہے، اور پھر فرمایا:-

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الحيل، باب ما يكره من الإحتيال في الفرار من الطاعون ج:۲ ص:۱۰۳۳

نَعَمْ نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللهِ إِلٰى قَدَرِ اللهِ۔ [1]

''بے شک ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں۔''

مطلب یہ تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

دربارۂ طاعون اِرشادِ نبوی کی حکمتیں

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشادِ مذکور سے معلوم ہوا کہ جس شہر یا بستی میں طاعون وغیرہ امراضِ وبائی پھیلے ہوئے ہوں، باہر والوں کو وہاں جانا ممنوع ہے، اور وہاں کے رہنے والوں کو اُس جگہ سے بخوفِ موت بھاگنا ممنوع ہے۔

اور اس کے ساتھ اِسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ نہ کسی جگہ جانا موت کا سبب ہے، نہ کہیں سے بھاگنا نجات کا سبب، اس اہم عقیدہ کے ہوتے ہوئے حکمِ مذکور بڑی دُور رَس حکمتوں پر مبنی ہے، باہر والوں کو وہاں جانے سے روکنے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ ممکن ہے کہ وہاں پہنچ کر کسی کی عمر ختم ہو چکی ہو اور اس مرض میں مبتلا ہو کر اِنتقال ہو گیا تو مرنے والے کو کبھی یہ گمان ہوگا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو زندہ رہتا، اور دُوسروں کو بھی یہی خیال ہوگا کہ یہاں آنے سے اس کی موت واقع ہوئی، حالانکہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے لکھا ہوا تھا، اس کی عمر اتنی ہی تھی، کہیں بھی رہتا، اس وقت اس کی موت لازمی تھی، اس حکم میں مسلمانوں کے عقیدہ کو تذبذب سے بچایا گیا کہ وہ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

دُوسری حکمت یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے اِنسان کو یہ ہدایت دی ہے کہ جس جگہ تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہو یا جہاں ہلاکت کا اندیشہ ہو وہاں نہ جائے، بلکہ مقدور بھر ایسی چیزوں سے بچنے کی فکر کرے جو اس کے لئے مضر یا ہلاکت کا سبب بن سکتی ہیں، اور اپنی جان کی حفاظت ہر اِنسان کے ذمے پر واجب قرار دی ہے، اس قاعدہ کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ تقدیرِ اِلٰہی پر ایمان کامل رکھتے ہوئے اِحتیاطی تدبیروں میں کمی نہ کرے، اور ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ ایسی جگہ نہ جائے جہاں جان کا خطرہ ہو۔

اسی طرح اُس بستی کے رہنے والوں کو بخوفِ موت وہاں سے بھاگنے کی ممانعت میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔

ایک حکمت تو اِجتماعی اور عوامی ہے کہ اگر یہ بھاگنے کا سلسلہ چلا تو اُمیر اور پیسے والے اور قدرت وطاقت والے آدمی تو بھاگ جائیں گے، مگر بستی میں ایسے ضعفاء، مرد و عورت کا بھی عادۃً ہونا لازمی ہے جو کہیں جانے پر قدرت نہیں رکھتے، اُن کا حشر کیا ہوگا، اوّل تو وہ تنہا رہ کر ہیبت ہی سے مرنے لگیں گے، پھر اُن میں جو بیمار ہیں اُن کی خبر گیری کون کرے

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الطب، باب ما یذکر فی الطاعون ج:۲ ص:۸۵۲، ۸۵۳ وتفسیر القرطبی تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۳ ص:۲۳۳

گا، مر جائیں گے تو دفن کفن کا انتظام کیسے ہوگا۔

دُوسری حکمت یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ موجود ہیں بعید نہیں کہ ان میں اس مرض کے جراثیم اثر کر چکے ہوں ایسی حالت میں وہ سفر کریں گے تو اور زیادہ مصیبتوں اور مشقتوں کے شکار ہوں گے، سفر کی حالت میں بیمار ہوئے تو ظاہر ہے کہ ان پر کیا گزرے گی، ابن المدینی نے علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:-

مَا فَرَّ اَحَدٌ مِّنَ الْوَبَاءِ فَسَلِمَ۔ [۱] (قرطبی)

''یعنی جو شخص وبا سے بھاگتا ہے وہ کبھی سالم نہیں رہتا۔''

تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر ان میں مرض کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں تو یہ مختلف بستیوں میں پہنچیں گے، تو وہاں وبائی جراثیم پھیلیں گے، اور اگر اپنی جگہ صبر و توکل کے ساتھ ٹھہرے رہے تو بہت ممکن ہے کہ مرض سے نجات حاصل ہو جائے، اور بالفرض اسی مرض میں موت مقدر تھی تو ان کو اپنے صبر وثبات کی وجہ سے درجہ شہادت کا ملے گا، جیسا کہ حدیث میں اِرشاد ہے:-

رَوَى الْبُخَارِيُّ عَنْ يَحْيَى بْنِ يَعْمُرَ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا اَخْبَرَتْهُ اَنَّهَا سَاَلَتْ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الطَّاعُوْنِ فَاَخْبَرَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ كَانَ عَذَابًا يَبْعَثُهُ اللهُ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ فَجَعَلَهُ اللهُ رَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ فَلَيْسَ مِنْ عَبْدٍ يَّقَعُ الطَّاعُوْنَ فَيَمْكُثُ فِيْ بَلَدِهٖ صَابِرًا يَّعْلَمُ اَنَّهٗ لَنْ يُّصِيْبَهٗ اِلَّا مَا كَتَبَ اللهُ لَهٗ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِ شَهِيْدٍ۔ [۲] وَهٰذَا تَفْسِيْرُ لِقَوْلِهٖ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الطَّاعُوْنُ شَهَادَةٌ وَالْمَطْعُوْنُ شَهِيْدٌ۔ [۳] (قرطبی ج:۳ ص:۲۳۵)

''اِمام بخاریؒ نے یحییٰ بن یعمرؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اُن کو خبر دی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے متعلق سوال کیا تھا، تو آپ نے ان کو بتلایا کہ یہ بیماری اصل میں عذاب کی حیثیت سے نازل ہوئی تھی اور جس قوم کو عذاب دینا منظور ہوتا تھا اس پر بھیج دی جاتی تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو مؤمنین کے لئے رحمت بنا دیا، تو جو اللہ کا بندہ طاعون پھیلنے کے بعد اپنی بستی میں صبر و سکون کے ساتھ ٹھہرا رہے اور یہ اعتقاد رکھے کہ اس کو صرف وہی مصیبت پہنچ سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے لکھ دی ہے، تو ایسے شخص کو شہید کے برابر ثواب ملے گا۔ اور یہی تشریح

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج:۳ ص:۲۳۳

[۲] صحيح البخاری، كتاب الطب، باب اجر الصابر فی الطاعون ج:۲ ص:۸۵۳، ۸۵۴

[۳] صحيح البخاری ج:۲ ص:۸۵۲

ہے اس حدیث کی جس میں اِرشاد ہے کہ طاعون شہادت ہے اور طاعون زدہ شخص شہید ہے۔''

بعض خاص صورتوں کا اِستثناء

حدیث کے الفاظ میں "فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِّنْهُ" آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص موت سے فرار کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی دُوسری ضرورت سے دُوسری جگہ چلا جائے تو وہ اس ممانعت میں داخل نہیں، اسی طرح اگر کسی شخص کا عقیدہ اپنی جگہ پختہ ہو کہ یہاں سے دُوسری جگہ چلا جانا مجھے موت سے نجات نہیں دے سکتا، اگر میرا وقت آ گیا ہے تو جہاں جاؤں گا موت لازمی ہے، اور وقت نہیں آیا تو یہاں رہنے سے بھی موت نہیں آئے گی، یہ عقیدہ پختہ رکھتے ہوئے محض آب وہوا کی تبدیلی کے لئے یہاں سے چلا جائے تو وہ بھی ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کسی ضرورت سے اس جگہ میں داخل ہو جہاں وبا پھیلی ہوئی ہے، اور عقیدہ اس کا پختہ ہو کہ یہاں آنے سے موت نہیں آئے گی، وہ اللہ کی مشیت کے تابع ہے، تو ایسی حالت میں اُس کے لئے وہاں جانا بھی جائز ہوگا۔

تیسرا مسئلہ اس آیت سے یہ مستفاد ہوا کہ بخوفِ موت جہاد سے بھاگنا بھی حرام ہے، قرآنِ کریم میں یہ مسئلہ دُوسری جگہ زیادہ تفصیل اور وضاحت سے آیا ہے، جس میں بعض خاص صورتوں کو مستثنیٰ بھی فرمایا گیا ہے۔

جو مضمون اس آیت کا ہے تقریباً یہی مضمون دُوسری آیت میں جہاد سے بھاگنے والوں یا اس میں شامل نہ ہونے والوں کے بارے میں آیا ہے، اِرشاد یہ ہے:-

اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ (آل عمران)

''یعنی کچھ لوگ خود بھی جہاد میں شریک نہ ہوئے، اور جہاد میں شریک ہو کر شہید ہو جانے والوں کے متعلق لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری بات نہ سنی اس لئے مارے گئے، اگر یہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے، (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ) آپ ان سے فرمادیں کہ اگر موت سے بچنا تمہارے اختیار میں ہے تو اوروں کی کیا فکر کرتے ہو، تم خود اپنی فکر کرو، اور اپنے آپ کو موت سے بچالو، یعنی جہاد میں جانے نہ جانے پر موقوف نہیں، تمہیں گھر بیٹھے ہوئے بھی آخر موت آئے گی۔''

عجائبِ قدرت سے ہے کہ صحابہ کرامؓ کے سب سے بڑے جنگی جرنیل سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی اِسلامی عمر ساری جہاد ہی میں گزری ہے، وہ کسی جہاد میں شہید نہیں ہوئے، بیمار ہو کر گھر میں وفات پائی، وفات کے قریب اپنے بستر پر مرنے کا افسوس کرتے ہوئے گھر والوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں فلاں فلاں عظیم الشان

جنگوں اور جہادوں میں شریک ہوا، اور میرا کوئی عضو ایسا نہیں جس میں تیر یا نیزے یا چوٹ کے زخم کا اثر ونشان نہ ہو، مگر افسوس ہے کہ میں اب گدھے کی طرح بستر پر مر رہا ہوں، خدا تعالیٰ بزدلوں کو آرام نہ دے، اُن کو میری نصیحت پہنچاؤ۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بطورِ تمہید لایا گیا تھا، اگلی آیت میں جہاد وقتال کا حکم دیا گیا جو اس قصہ کے ذِکر کرنے سے اصل مقصود تھا، کہ جہاد میں جانے کو موت یا بھاگنے کو نجات نہ سمجھو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی تعمیل کر کے فلاحِ دارین حاصل کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری سب باتیں سننے والے اور جاننے والے ہیں۔

تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت کا ذِکر ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗۤ اَضْعَافًا کَثِیْرَةً ؕ

کون شخص ہے ایسا جو قرض دے اللہ کو اچھا قرض، پھر دُگنا کردے اللہ اس کو کئی گنا،

وَ اللّٰہُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

اور اللہ ہی تنگی کر دیتا ہے اور وہی کشائش کرتا ہے، اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

کون ہے جو اللہ کو اچھے طریقے پر قرض دے، تا کہ وہ اسے اس کے مفاد میں اتنا بڑھائے چڑھائے کہ وہ بدرجہا زیادہ ہو جائے؟ اور اللہ ہی تنگی پیدا کرتا ہے، اور وہی وسعت دیتا ہے، اور اسی کی طرف تم سب کو لوٹایا جائے گا۔ ﴿۲۴۵﴾

خلاصۂ تفسیر

جہاد وغیرہ کارِ خیر میں اِنفاق کی ترغیب

کون شخص ہے (ایسا) جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا (یعنی اِخلاص کے ساتھ) پھر اللہ تعالیٰ اس (قرض کے ثواب) کو بڑھا کر بہت سے حصے کر دیوے اور (اس کا اندیشہ مت کرو کہ خرچ کرنے سے مال کم ہو جائے گا، کیونکہ یہ تو) اللہ (ہی کے قبضہ میں ہے وہی) کمی کرتے ہیں اور (وہی) فراخی کرتے ہیں (کچھ خرچ کرنے نہ کرنے پر اس کا اصلی مدار نہیں) اور تم اُسی کی طرف (بعد مرنے کے) لے جائے جاؤ گے (سو اس وقت نیک کام میں خرچ کرنے کی جزا اور

واجب موقع پر خرچ نہ کرنے کی سزا تم کو ملے گی)۔

معارف ومسائل

١- يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، قرض سے مراد نیک عمل کرنا، اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہے، اس کو ''قرض'' مجازاً کہہ دیا، ورنہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی مِلک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے قرض کا عوض ضروری دیا جاتا ہے اسی طرح تمہارے اِنفاق کا عوض ضروری ملے گا، اور بڑھانے کا بیان ایک حدیث میں آیا ہے، کہ ایک خرما اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا جاوے تو خدا تعالیٰ اس کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ وہ اُحد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اس کے بندوں کو قرض دیا جائے اور اُن کی حاجت برآری کی جائے، چنانچہ حدیث میں قرض دینے کی بہت فضیلت وارِد ہوئی ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُقْرِضُ مُسْلِمًا قَرْضًا مَرَّةً إِلَّا كَانَ كَصَدَقَتِهٖ مَرَّتَيْنِ۔ (مظہری بحوالہ ابنِ ماجہ) [1]

''جو مسلمان دُوسرے مسلمان کو قرض دے دیتا ہے، یہ قرض دینا اللہ کے راستے میں اس مال کے دو دفعہ صدقہ کرنے کے برابر ہے۔''

٢- ابنِ عربیؒ فرماتے ہیں اس آیت کو سن کر لوگوں کے تین فرقے ہوگئے، پہلا فرقہ اُن بدنصیب لوگوں کا ہے جنہوں نے یہ آیت سن کر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رَبّ ہماری طرف محتاج ہے، اور ہم غنی ہیں۔ اس کا جواب قرآنِ کریم کی ایک اور آیت: لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ (آل عمران:١٨١) سے دیا۔ دُوسرا فرقہ اُن لوگوں کا ہے جنہوں نے اس آیت کو سن کر اس کے خلاف کیا، اور بخل ہی کو اِختیار کرلیا، مال کی طرف زیادہ رغبت اور اس کی حرص نے ان کو اس طرح باندھ لیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ تیسرا فرقہ ان مخلص مسلمانوں کا ہے جنہوں نے فوراً ہی اس آیت پر عمل کرلیا، اور اپنا پسندیدہ مال اللہ کے راستے میں دے دیا، جیسا کہ ابوالدحداحؓ وغیرہ، جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوالدحداحؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ سے پوچھا: اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض مانگتے ہیں، حالانکہ وہ قرض سے مستغنی ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے تم کو جنت میں داخل کر دیں، ابوالدحداحؓ نے یہ سن کر کہا: اللہ کے رسول ہاتھ بڑھائیں، آپ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا، ابوالدحداحؓ نے کہنا شروع کیا:-

[1] تفسير المظهري تحت هٰذه الآية ج:١ ص:٣٤٥ وسنن ابن ماجة، كتاب الصدقات، باب القرض رقم الحديث:٢٤٣١

میں کھجور کے دو باغوں کا مالک ہوں، اس کے علاوہ میری مِلک میں کچھ نہیں، میں اپنے یہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔

آپ نے اُن سے فرمایا: ایک اللہ کے راستے میں وقف کردو اور دُوسرا اپنے اہل وعیال کی معاشی ضرورت کے لئے باقی رکھو۔ ابوالدحداحؓ نے کہا: آپ گواہ رہئے ان دونوں میں سے بہترین باغ جس میں کھجور کے چھ سو درخت ہیں، اس کو میں اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اللہ تمہیں اس کے بدلے میں جنت عطا کریں گے۔

ابوالدحداحؓ اپنے گھر آئے اور بیوی کو اس کی اِطلاع دے دی، تو وہ بھی ابوالدحداحؓ کے اس بہترین سودے پر بہت خوش ہوئیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

كَمْ مِّنْ عِذْقٍ رَدَاحٍ وَدَارٍ فَيَاحٍ لِأَبِي الدَّحْدَاحِ۔ (قرطبی) [۱]

''کھجوروں سے لبریز بے شمار درخت اور کشادہ محلات کس قدر ابوالدحداح کے لئے تیار ہیں (یعنی جنت میں)۔''

۳- قرض میں واپسی کے وقت اگر زیادتی کی شرط نہ ٹھہرائی گئی ہو اور اپنی طرف سے قرض سے کچھ زیادہ ادا کردیا، تو یہ پسندیدہ ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

إِنَّ خِيَارَكُمْ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً۔ [۲]

''تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے حق (قرض) کو اچھے طریقے سے ادا کرے۔''

لیکن اگر زیادتی کی شرط ٹھہرائی گئی ہو تو وہ حرام ہے اور سود ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ (وقف لازم)

کیا نہ دیکھا تو نے ایک جماعت بنی اِسرائیل کو موسیٰ کے بعد جب انہوں نے کہا اپنے نبی سے

ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ

مقرر کردو ہمارے لئے ایک بادشاہ تا کہ ہم لڑیں اللہ کی راہ میں، پیغمبر نے کہا: کیا تم سے بھی یہ توقع ہے کہ اگر حکم ہو لڑائی کا

[۱] تفسیر القرطبی تحت ھذہ الآیۃ ج:۳ ص:۲۳۹ ومسند احمد باختصارٍ رقم الحدیث:۱۲۸۱۸

[۲] صحیح البخاری، کتاب الوکالۃ، باب وکالۃ الشاھد والغائب جائزۃ ج:۱ ص:۳۰۹

عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

تو تم اس وقت نہ لڑو؟ وہ بولے: ہم کو کیا کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں

وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاۗىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا

اور ہم تو نکال دیئے گئے اپنے گھروں سے اور بیٹوں سے، پھر جب حکم ہوا اُن کو لڑائی کا تو وہ سب پھر گئے

اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۲۴۶ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ

مگر تھوڑے سے ان میں کے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو۔ اور فرمایا اُن سے اُن کے نبی نے: بے شک اللہ نے

قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ

مقرر فرمادیا تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ، کہنے لگے: کیونکر ہوسکتی ہے اس کو حکومت ہم پر اور ہم

اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ

زیادہ مستحق ہیں سلطنت کے اس سے، اور اس کو نہیں ملی کشائش مال میں، پیغمبر نے کہا: بے شک اللہ نے پسند فرمایا اس کو

عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ

تم پر اور زیادہ فراخی دی اس کو علم اور جسم میں، اور اللہ دیتا ہے ملک اپنا جس کو

يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۴۷ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ

چاہے اور اللہ ہے فضل کرنے والا سب کچھ جاننے والا۔ اور کہا بنی اسرائیل سے اُن کے نبی نے کہ طالوت کی سلطنت کی نشانی

اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ

یہ ہے کہ آوے تمہارے پاس ایک صندوق کہ جس میں تسلی خاطر ہے تمہارے ربّ کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں

مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

اُن میں سے جو چھوڑ گئی تھی موسیٰ و ہارون کی اولاد اور اُٹھا لاویں گے اس صندوق کو فرشتے، بے شک اُس میں پوری نشانی ہے

لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٤٨﴾ ع فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ ع ٣٢

تمہارے واسطے اگر تم یقین رکھتے ہو۔ پھر جب باہر نکلا طالوت فوجیں لے کر کہا: بے شک اللہ

مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ

تمہاری آزمائش کرتا ہے ایک نہر سے، سو جس نے پانی پیا اس نہر کا تو وہ میرا نہیں، اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ بے شک

مِنِّیْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا

میرا ہے، مگر جو کوئی بھرے ایک چلو اپنے ہاتھ سے، پھر پی لیا سب نے اس کا پانی مگر تھوڑوں نے ان میں سے، پھر جب

جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ

پار ہوا طالوت اور ایمان والے ساتھ اس کے تو کہنے لگے: طاقت نہیں ہم کو آج جالوت

وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ

اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی، کہنے لگے وہ لوگ جن کو خیال تھا کہ ان کو اللہ سے ملنا ہے: بارہا تھوڑی جماعت

غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٢٤٩﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا

غالب ہوئی بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جب سامنے ہوئے

لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا

جالوت کے اور اس کی فوجوں کے تو بولے: اے ربّ ہمارے! ڈال دے ہمارے دلوں میں صبر اور جمائے رکھ ہمارے پاؤں،

وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ قف وَقَتَلَ دَاوٗدُ

اور ہماری مدد کر اس کافر قوم پر۔ پھر شکست دی مؤمنوں نے جالوت کے لشکر کو اللہ کے حکم سے، اور مار ڈالا داؤد نے

جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ

جالوت کو اور دی داؤد کو اللہ نے سلطنت اور حکمت اور سکھایا اُن کو جو چاہا، اور اگر نہ ہوتا دفع کرادینا

اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ

اللہ کا ایک کو دُوسرے سے تو خراب ہوجاتا ملک، لیکن اللہ بہت مہربان ہے

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٥١﴾

جہان کے لوگوں پر۔

آسان ترجمۂ قرآن

کیا تمہیں موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے گروہ کے اس واقعے کا علم نہیں ہوا جب انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا تھا کہ ہمارا ایک بادشاہ مقرر کردیجئے تاکہ (اس کے جھنڈے تلے) ہم اللہ کے راستے میں جنگ کرسکیں۔ نبی نے کہا: ''کیا تم لوگوں سے یہ بات کچھ بعید ہے کہ جب تم پر جنگ فرض کی جائے تو تم نہ لڑو؟'' انہوں نے کہا: ''بھلا ہمیں کیا ہوجائے گا جو ہم اللہ کے راستے میں جنگ نہ کریں گے حالانکہ ہمیں اپنے گھروں اور اپنے بچوں کے پاس سے نکال باہر کیا گیا ہے۔'' پھر (ہوا یہی کہ) جب ان پر جنگ فرض کی گئی تو ان میں سے تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب پیٹھ پھیر گئے۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ﴿٢٤٦﴾ اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ: ''اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا ہے۔'' کہنے لگے: ''بھلا اس کو ہم پر بادشاہت کرنے کا حق کہاں سے آگیا؟ ہم اس کے مقابلے میں بادشاہت کے زیادہ مستحق ہیں۔ اور اس کو تو مالی وسعت بھی حاصل نہیں۔'' نبی نے کہا: ''اللہ نے ان کو تم پر فضیلت دے کر چنا ہے، اور انہیں علم اور جسم میں (تم سے) زیادہ وسعت عطا کی ہے۔ اور اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت اور بڑا علم رکھنے والا ہے'' ﴿٢٤٧﴾ اور ان سے ان کے نبی نے یہ بھی کہا کہ: ''طالوت کی بادشاہت کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق

(واپس) آجائے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے سکینت کا سامان ہے، اور موسیٰ اور ہارون نے جو اَشیاء چھوڑی تھیں ان میں سے کچھ باقی ماندہ چیزیں ہیں۔ اسے فرشتے اُٹھائے ہوئے لائیں گے، اگر تم مؤمن ہو تو تمہارے لئے اس میں بڑی نشانی ہے۔ ﴿۲۴۸﴾ چنانچہ جب طالوت لشکر کے ساتھ روانہ ہوا تو اس نے (لشکر والوں سے) کہا کہ: ''اللہ ایک دریا کے ذریعے تمہارا اِمتحان لینے والا ہے۔ جو شخص اس دریا سے پانی پیئے گا وہ میرا آدمی نہیں ہوگا، اور جو اسے نہیں چکھے گا وہ میرا آدمی ہوگا، اِلَّا یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھرلے (تو کچھ حرج نہیں)۔'' پھر (ہوا یہ کہ) ان میں سے تھوڑے آدمیوں کے سوا باقی سب نے اس دریا سے (خوب) پانی پیا۔ چنانچہ جب وہ (یعنی طالوت) اور اس کے ساتھ ایمان رکھنے والے دریا کے پار اُترے، تو یہ لوگ (جنہوں نے طالوت کا حکم نہیں مانا تھا) کہنے لگے کہ: ''آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی ہم میں بالکل طاقت نہیں ہے۔'' (مگر) جن لوگوں کا ایمان تھا کہ وہ اللہ سے جا ملنے والے ہیں انہوں نے کہا کہ: ''نجانے کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ اور اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں'' ﴿۲۴۹﴾ اور جب یہ لوگ جالوت اور اس کے لشکروں کے آمنے سامنے ہوئے تو انہوں نے کہا: ''اے ہمارے پروردگار! صبر و اِستقلال کی صفت ہم پر اُنڈیل دے، ہمیں ثابت قدمی بخش دے، اور ہمیں اس کافر قوم کے مقابلے میں فتح و نصرت عطا فرمادے'' ﴿۲۵۰﴾ چنانچہ انہوں نے اللہ کے حکم سے ان (جالوت کے ساتھیوں) کو شکست دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا، اور اللہ نے اس کو سلطنت اور دانائی عطا کی، اور جو علم چاہا اس کو عطا فرمایا۔ اگر اللہ لوگوں کا ایک دوسرے کے ذریعے دِفاع نہ کرے تو زمین میں فساد پھیل جائے، لیکن اللہ تمام جہانوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ ﴿۲۵۱﴾

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

مقصود اس مقام میں زیادہ ترغیب قتال کی ہے، اُوپر کا قصہ اسی کی تمہید ہے، اِنفاق فی سبیل اللہ کا مضمون اسی کی تائید ہے، آگے طالوت و جالوت کا قصہ اسی کی تاکید ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے اس قصے میں قبض و بسط کا بھی مشاہدہ کرادیا، جس کا ذِکر ماقبل کی آیت: وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ (البقرۃ: ۲۴۵) میں آیا ہے، کہ فقیر کو بادشاہ بنانا اور بادشاہ سے بادشاہت چھین لینا سب اسی کے اِختیار میں ہے۔

طالوت اور جالوت کا قصہ

(اے مخاطب!) کیا تجھ کو بنی اِسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے، تحقیق نہیں ہوا (جس

سے پہلے اُن پر کافر جالوت غالب آچکا تھا، اور ان کے کئی صوبے دبالئے تھے) جبکہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم (اس کے ساتھ ہوکر) اللہ کی راہ میں (جالوت سے) قتال کریں، اس پیغمبر نے فرمایا کہ کیا یہ اِحتمال ہے اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے کہ تم (اس وقت) جہاد نہ کرو، وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کونسا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، حالانکہ (جہاد کے لئے ایک محرک بھی ہے، وہ یہ کہ) ہم (اُن کافروں کے ہاتھوں) اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں (کیونکہ ان کی بعض بستیاں بھی کافروں نے دبالی تھیں اور ان کی اولاد کو بھی قید کرلیا گیا تھا) پھر جب ان لوگوں کو جہاد کا حکم ہوا تو باستثناء ایک قلیل مقدار کے (باقی) سب پھر گئے، (جیسا کہ آگے جہاد کی غرض سے بادشاہ کے مقرر ہونے کا اور ان لوگوں کے پھر جانے کا تفصیلاً بیان آتا ہے) اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو (یعنی خلافِ حکم کرنے والوں کو) خوب جانتے ہیں (سب کو مناسب سزا دیں گے) اور ان لوگوں سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا، کہنے لگے: ان کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہوسکتا ہے، حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں، اور اُن کو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی (کیونکہ طالوت غریب آدمی تھے) ان پیغمبر نے (جواب میں) فرمایا کہ (اوّل تو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں اُن کو منتخب فرمایا ہے (اور اِنتخاب کی مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں) اور (دُوسرے) علم (سیاست وحکمرانی) اور جسامت میں اس کو زیادتی دی ہے (اور بادشاہ ہونے کے لئے اس علم کی زیادہ ضرورت ہے، تاکہ ملکی انتظام پر قادر ہو اور جسامت بھی بایں معنی ہے کہ موافق ومخالف کے قلب میں وقعت وہیبت ہو) اور (تیسرے) اللہ تعالیٰ (مالک الملک ہیں) اپنا ملک جس کو چاہیں دیں (ان سے کوئی سال کا منصب نہیں رکھتا) اور (چوتھے) اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں (ان کو مال دے دینا کیا مشکل ہے، جس کے اِعتبار سے تم کو شبہ ہو، اور) جاننے والے ہیں (کہ کون لیاقت سلطنت کی رکھتا ہے) اور (جب ان لوگوں نے پیغمبر سے یہ درخواست کی کہ اگر کوئی ظاہری حجت بھی ان کی منجانب اللہ بادشاہ ہونے کی ہم مشاہدہ کرلیں تو اور زیادہ اِطمینان ہوجاوے، اس وقت) اُن سے اُن کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے (منجانب اللہ) بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (بدون تمہارے لائے ہوئے) آجاوے گا جس میں تسکین (اور برکت) کی چیز ہے، تمہارے رَبّ کی طرف سے (یعنی توراۃ، اور توراۃ کا منجانب اللہ ہونا ظاہر ہے) اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں جن کو حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام چھوڑ گئے ہیں (یعنی ان حضرات کے کچھ ملبوسات وغیرہ، غرض) اُس صندوق کو فرشتے لے آویں گے اس (طرح کے صندوق کے آجانے) میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے اگر تم یقین لانے والے ہو۔ پھر جب (بنی اِسرائیل نے طالوت کو بادشاہ تسلیم کرلیا اور جالوت کے مقابلے کے لئے لوگ جمع ہوگئے اور) طالوت فوجوں کو لے کر (اپنے مقام یعنی بیت المقدس سے عمالقہ کی طرف) چلے تو انہوں نے (اپنے ہمراہی پیغمبر کی وحی کے ذریعے دریافت کرکے

ساتھیوں سے) کہا کہ اب حق تعالیٰ (اِستقلالی و بے اِستقلالی میں) تمہارا اِمتحان کریں گے ایک نہر کے ذریعے (جو راہ میں آوے گی اور تم شدتِ تشنگی کے وقت اُس پر گزرو گے) سو جو شخص اس سے (اِفراط کے ساتھ) پانی پیوے گا وہ تو میرے ساتھیوں میں نہیں، اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے (اور اصل حکم یہی ہے) وہ میرے ساتھیوں میں ہے، لیکن جو شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (تو اتنی رُخصت ہے، غرض وہ نہر راستے میں آئی، پیاس کی تھی شدت) سو سب نے اس سے (بے تحاشا) پینا شروع کردیا، مگر تھوڑے سے آدمیوں نے ان میں سے (اِحتیاط کی، کسی نے بالکل نہ پیا ہوگا، کسی نے چلو سے زیادہ نہ پیا ہوگا) سو جب طالوت اور جو مؤمنین اُن کے ہمراہ تھے نہر سے پار اُتر گئے، (اور اپنے مجمع کو دیکھا تو تھوڑے سے آدمی رہ گئے، اُس وقت بعضے آدمی آپس میں) کہنے لگے کہ آج تو (ہمارا مجمع اتنا کم ہے کہ اس حالت سے) ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے کی طاقت نہیں معلوم ہوتی (یہ سن کر) ایسے لوگ جن کو یہ خیال (پیشِ نظر) تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رُوبرو پیش ہونے والے ہیں، کہنے لگے کہ کثرت سے (ایسے واقعات ہوچکے ہیں کہ) بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آگئی ہیں (اصل چیز اِستقلال ہے) اور اللہ تعالیٰ اِستقلال والوں کا ساتھ دیتے ہیں، اور جب (دیارِ عمالقہ میں پہنچے اور) جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے میدان میں آگئے تو (دُعا میں حق تعالیٰ سے) کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر (یعنی ہمارے قلوب پر) اِستقلال (غیب سے) نازل فرمایئے اور (مقابلہ کے وقت) ہمارے قدم جمائے رکھئے، اور ہم کو اس کافر قوم پر غالب کیجئے، پھر طالوت والوں نے جالوت والوں کو خدا تعالیٰ کے حکم سے شکست دے دی اور داؤد علیہ السلام نے (جو کہ اس وقت طالوت کے لشکر میں تھے اور اس وقت تک نبوّت وغیرہ نہ ملی تھی) جالوت کو قتل کر ڈالا (اور مظفر و منصور واپس آئے) اور (اس کے بعد) ان کو (یعنی داؤد علیہ السلام کو) اللہ تعالیٰ نے سلطنت اور حکمت (یہاں حکمت سے مراد نبوّت ہے) عطا فرمائی، اور بھی جو منظور ہوا ان کو تعلیم فرمایا (جیسے بغیر آلات کے زرہ بنانا اور جانوروں کی بولی سمجھنا، آگے اس واقعہ کی مصلحتِ عامہ فرماتے ہیں) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو (جو کہ مفسد ہوں) بعضوں کے ذریعے سے (جو کہ مصلح ہوں وقتاً فوقتاً) دفع کرتے رہا کرتے ہیں (یعنی اگر مصلحین کو مفسدین پر غالب نہ کرتے رہتے) تو سرزمین (تمامتر) فساد سے پر ہوجاتی، ولیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں جہان والوں پر (اس لئے وقتاً فوقتاً اِصلاح فرماتے رہتے ہیں)۔

معارف و مسائل

۱- اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ان بنی اِسرائیل نے حق تعالیٰ کے اَحکام کو چھوڑ دیا تھا، کفارِ عمالقہ ان پر مسلط کردیئے گئے، اُس وقت ان لوگوں کو اِصلاح کی فکر ہوئی، اور جس نبی کا یہاں ذِکر ہے ان کا نام ”شموئیل“ مشہور ہے۔

۲- اَنۡ يَّاۡتِيَكُمُ التَّابُوۡتُ ، بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا، اس میں تبرکات تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء کے، بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی میں آگے رکھتے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے فتح دیتا، جب جالوت بنی اسرائیل پر غالب آیا، تو یہ صندوق بھی وہ لے گیا تھا، جب اللہ تعالیٰ کو صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو یہ کیا کہ وہ کافر جہاں صندوق کو رکھتے وہیں وبا اور بلا آئی، پانچ شہر ویران ہو گئے، ناچار ہو کر دو بیلوں پر اس کو لاد کر ہانک دیا، فرشتے بیلوں کو ہانک کر طالوت کے دروازے پر پہنچا گئے، بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر طالوت کی بادشاہت پر یقین لائے، اور طالوت نے جالوت پر فوج کشی کر دی اور موسم نہایت گرم تھا۔

۳- قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبۡتَلِيۡكُمۡ بِنَهَرٍ ۚ اس امتحان کی حکمت اور توجیہ احقر کے ذوق میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر جوش و خروش میں بھیڑ بھڑ کا بہت ہو جایا کرتا ہے، لیکن وقت پر جمنے والے کم ہوتے ہیں، اور اُس وقت ایسوں کا اُکھڑ جانا باقی لوگوں کے پاؤں بھی اُکھاڑ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کا علیحدہ کرنا منظور تھا، اس کا یہ امتحان مقرر کیا گیا جو کہ نہایت ہی مناسب ہے، کیونکہ قتال میں ضرورت استقلال و جفاکشی کی ہوتی ہے، سو شدتِ پیاس کے وقت بے منّت پانی ملنے پر ضبط کرنا دلیل استقلال کی اور اندھے باؤلوں کی طرح جا گرنا دلیل بے استقلالی کی ہے، آگے خرقِ عادت ہے کہ زیادہ پانی پینے والے غیبی طور پر بھی زیادہ بے کار اور از کار رفتہ ہو گئے، جیسا ''رُوح المعانی'' میں بسندِ ابنِ ابی حاتمؒ حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت کیا ہے،[۱] اور اس قصے میں جو احوال و اقوال مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تین قسم کے لوگ تھے: ناقص الایمان جو امتحان میں پورے نہ اُترے، اور کامل جو امتحان میں پورے اُترے، مگر اپنی قلّت کی فکر ہوئی، اور اکمل جن کو یہ بھی فکر نہیں ہوئی۔

تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۲۵۲﴾

یہ آیتیں اللہ کی ہیں ہم تجھ کو سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک اور تو بے شک ہمارے رسولوں میں ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ کے سامنے ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں، اور آپ بیشک ان پیغمبروں میں سے ہیں جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ ﴿۲۵۲﴾

---

[۱] رُوح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۲ ص:۱۷۰

خلاصۂ تفسیر

چونکہ قرآنِ کریم کا ایک بڑا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کا اِثبات بھی ہے، اس لئے جس جگہ مضمون کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اس کا اِعادہ کردیا جاتا ہے، اس موقع پر اس قصہ کی صحیح صحیح خبر دینا جبکہ آپ نے نہ کسی سے پڑھا نہ کہیں سنا نہ دیکھا، ایک معجزہ ہے، آپ کی نبوّت کی صحیح دلیل ہے، اس لئے ان آیات میں آپ کی نبوّت پر اِستدلال فرماتے ہیں:

نبوّتِ محمدیہ پر اِستدلال

یہ (آیتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہوا) اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور (اس سے ثابت ہوتا ہے کہ) آپ بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہیں۔

وقف لازم

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ

یہ سب رسول فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض سے، کوئی تو وہ ہے کہ کلام فرمایا اس سے اللہ نے اور بلند کئے

بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ

بعضوں کے درجے اور دیئے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور قوت دی اس کو

بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا

رُوح القدس یعنی جبریل سے، اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ہوئے ان پیغمبروں کے پیچھے بعد اس کے کہ

جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ

پہنچ چکے ان کے پاس صاف حکم لیکن اُن میں اِختلاف پڑ گیا، پھر کوئی تو ان میں ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا، اور اگر

شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝۲۵۳ ع

اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے، لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

یہ پیغمبر جو ہم نے (مخلوق کی اصلاح کے لئے) بھیجے ہیں، ان کو ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت عطا کی ہے۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام فرمایا، اور ان میں سے بعض کو اس نے بدر جہا بلندی عطا کی۔ اور ہم نے عیسیٰ ابنِ مریم کو کھلی نشانیاں دیں، اور رُوح القدس سے ان کی مدد فرمائی۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے لوگ اپنے پاس روشن دلائل آجانے کے بعد آپس میں نہ لڑتے، لیکن انہوں نے خود اِختلاف کیا، چنانچہ ان میں سے کچھ وہ تھے جو اِیمان لائے، اور کچھ وہ جنہوں نے کفر اَپنایا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے، لیکن اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ﴿۲۵۳﴾

خلاصۂ تفسیر

بعض انبیاء اور اُمتوں کے کچھ احوال

یہ حضراتِ مرسلین (جن کا ذکر اَبھی وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾ میں آیا ہے) ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے، (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ (بلا واسطہ فرشتہ کے) ہم کلام ہوئے ہیں، (مراد موسیٰ علیہ السلام)، اور بعضوں کو ان میں بہت سے درجوں میں (اعلیٰ مقام سے) سرفراز کیا، اور ہم نے حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کو کھلے کھلے دلائل (یعنی معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کی تائید رُوح القدس (یعنی جبریل علیہ السلام) سے فرمائی (ہر وقت یہود سے ان کی حفاظت کرنے کے لئے ساتھ رہتے تھے) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو (اُمت کے) جو لوگ ان (پیغمبروں) کے بعد ہوئے ہیں (کبھی دِین میں اِختلاف کر کے) باہم قتل و قتال نہ کرتے بعد اس کے کہ اُن کے پاس (اَمرِ حق کے) دلائل (پیغمبروں کی معرفت) پہنچ چکے تھے (جن کا مقتضیٰ تھا دِینِ حق کے قبول پر متفق ہونا) ولیکن (چونکہ اللہ تعالیٰ کو بعض حکمتیں منظور تھیں، اس لئے ان میں اِتفاقِ مذہبی نہیں پیدا کیا) وہ لوگ باہم (دِین میں) مختلف ہوئے، سو اُن میں کوئی تو اِیمان لایا، اور کوئی کافر رہا، (پھر اس اِختلاف میں نوبت قتل و قتال بھی پہنچ گئی) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ باہم قتل و قتال نہ کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتے ہیں (اپنی قدرت سے) وہی کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

۱- تِلْكَ الرُّسُلُ الآیہ، اس مضمون میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک گونہ تسلی دینا ہے، کیونکہ جب آپ کی رِسالت

دلیل سے ثابت تھی، جس کو وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴿۲۵۲﴾ میں بھی فرمایا ہے، اور پھر بھی منکرین نہ مانتے تھے، تو یہ آپ کے رنج وافسوس کا محل تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات سنادی کہ اور بھی پیغمبر مختلف درجوں کے گزرے ہیں، لیکن ایمان عام کسی کی اُمت میں نہیں ہوا، کسی نے موافقت کی، کسی نے مخالفت، اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں، گو ہر شخص پر منکشف نہ ہوں، مگر اِجمالاً اتنا عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ کوئی حکمت ضرور ہے۔

۲- تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یہاں یہ اِشکال پیش آسکتا ہے کہ یہ آیت صراحۃً اس بات پر دَلالت کر رہی ہے کہ بعض انبیاء بعض سے افضل ہیں، حالانکہ حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ اَنْبِيَاءِ اللّٰهِ۔ [۱] ''انبیاء کے درمیان تفضیل نہ کیا کرو۔''

نیز فرمایا:-

لَا تُخَيِّرُوْنِيْ عَلٰى مُوْسٰى۔ [۲] ''مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو۔''

اور فرمایا:-

لَا اَقُوْلُ اِنَّ اَحَدًا اَفْضَلُ مِنْ يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰى۔ [۳]

''میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی یونس بن متیٰ سے افضل ہے۔''

ان احادیث میں بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دینے کی ممانعت وارِد ہوئی ہے؟

جواب یہ ہے کہ احادیث کا مطلب یہ ہے کہ دلیل کے بغیر اپنی رائے سے بعض کو بعض پر فضیلت نہ دو، اس لئے کہ کسی نبی کے افضل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے یہاں اُن کا مرتبہ بہت زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا علم رائے اور قیاس سے حاصل نہیں ہوسکتا، لیکن قرآن وسنت کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاء کی بعض پر فضیلت معلوم ہوگئی تو اس کے مطابق اِعتقاد رکھا جائے گا۔

رہا آپ کا یہ اِرشاد کہ ''لَا اَقُوْلُ اِنَّ اَحَدًا اَفْضَلُ مِنْ يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰى'' اور ''لَا تُخَيِّرُوْنِيْ عَلٰى مُوْسٰى'' تو یہ اس وقت سے متعلق ہے جبکہ آپ کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ تمام انبیاء سے افضل ہیں، بعد میں بذریعہ وحی آپ کو یہ بات بتلادی گئی اور صحابہ کرامؓ سے آپ نے اس کا اِظہار بھی فرمادیا۔ (مظہری)

۳- مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ، موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہم کلامی گو بلا واسطہ فرشتہ کے ہو مگر بے حجاب نہ تھی، پس سورۂ شوریٰ

---

[۱] صحيح البخاري، كتاب الأنبياء، باب قول الله عزَّ وجلَّ وان يونس الآية ج:۱ ص:۴۸۵

[۲] صحيح البخاري، كتاب الخصومات، باب ما يذكر في الأشخاص ...إلخ ج:۱ ص:۳۲۵

[۳] صحيح البخاري ج:۱ ص:۴۸۵

کی آیت: وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ الخ (الشوریٰ:۵۱) جس میں بے حجاب کلام کی نفی کی گئی اس سے کچھ تعارض نہ رہا، البتہ بعد موت کے بے حجاب کلام ہونا بھی شرعاً ممکن ہے، پس وہ شوریٰ کی آیت دُنیا کے اعتبار سے ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ

اے ایمان والو! خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو روزی دی پہلے اُس دِن کے آنے سے کہ جس میں

لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۵۴

نہ خرید وفروخت ہے اور نہ آشنائی اور نہ سفارش، اور جو کافر ہیں وہی ہیں ظالم۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے وہ دن آنے سے پہلے پہلے (اللہ کے راستے میں) خرچ کرلو جس دن نہ کوئی سودا ہوگا، نہ کوئی دوستی (کام آئے گی)، اور نہ کوئی سفارش ہو سکے گی۔ اور ظالم وہ لوگ ہیں جو کفر اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ۝۲۵۴

خلاصۂ تفسیر

اِنفاق فی سبیل اللہ میں تعجیل کرنا

اے ایمان والو! خرچ کرو ان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دِی ہیں قبل اس کے کہ وہ دِن آجاوے (یعنی قیامت کا دِن) جس میں (کوئی چیز اعمالِ خیر کا بدل نہ ہو سکے گی، کیونکہ اس میں) نہ تو خرید وفروخت ہوگی (کہ کوئی چیز دے کر اَعمالِ خیر کی خرید کرلو) اور نہ (ایسی) دوستی ہوگی (کہ کوئی تم کو اپنے اعمالِ خیر دیدے) اور نہ (بلا اذنِ الٰہی کسی کی) کوئی سفارش ہوگی (جس سے اعمالِ خیر کی تم کو حاجت نہ رہے) اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں (کہ اعمال اور مال کو بے موقع اِستعمال کرتے ہیں، اس طرح کہ طاعاتِ بدنیہ ومالیہ کو ترک اور معصیتِ مالیہ وبدنیہ کو اِختیار کرتے ہیں، تم تو ایسے نہ بنو)۔

معارف ومسائل

اس سورۃ میں عبادات ومعاملات کے متعلق اَحکامِ کثیرہ بیان فرمائے جن میں سب کی تعمیل نفس کو ناگوار اور بھاری

ہے، اور تمام اعمال میں زیادہ دُشوار اِنسان کو جان اور مال کا خرچ کرنا ہوتا ہے، اور اَحکامِ اِلٰہی اکثر جو دیکھے جاتے ہیں یا جان کے متعلق یا مال کے، اور گناہ میں بندہ کو جان یا مال کی محبت اور رعایت ہی اکثر مبتلا کرتی ہے، گویا ان دونوں کی محبت گناہوں کی جڑ اور اس سے نجات جملہ طاعات کی سہولت کا منشا ہے، اس لئے ان اَحکامات کو بیان فرما کر قتال اور اِنفاق کو بیان فرمانا مناسب ہوا۔ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ الخ (البقرة: ۲۴۴) میں اوّل کا بیان تھا، اور مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللهَ الخ (البقرة: ۲۴۵) میں دُوسرے کا ذکر ہے، اس کے بعد قصہ طالوت سے اوّل کی تاکید ہوئی تو اَب اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ الخ (البقرة: ۲۵۴) سے دُوسرے کی تاکید منظور ہے، اور چونکہ اِنفاقِ مال پر بہت سے اُمورِ عبادات و معاملات کے موقوف ہیں، تو اس کے بیان میں زیادہ تفصیل اور تاکید سے کام لیا، چنانچہ اب جو رُکوع آتے ہیں ان میں اکثروں میں اَمرِ ثانی یعنی اِنفاقِ مال کا ذِکر ہے، خلاصۂ معنی یہ ہوا کہ عمل کا وقت ابھی ہے، آخرت میں تو نہ عمل بکتے ہیں، نہ کوئی دوستی سے دیتا ہے، نہ کوئی سفارش سے چھڑا سکتا ہے، جب تک پکڑنے والا نہ چھوڑے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے، سب کا تھامنے والا، نہیں پکڑ سکتی اس کو اُونگھ اور نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ

فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ

آسمانوں اور زمین میں ہے، اور ایسا کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس مگر اس کی اجازت سے،

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ

جانتا ہے جو کچھ خلقت کے رُوبرو ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے، اور وہ سب اِحاطہ نہیں کر سکتے کسی چیز کا اس کی معلومات میں سے

اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ

مگر جتنا کہ وہ چاہے، گنجائش ہے اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو، اور گراں نہیں اس کو تھامنا ان کا،

وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

اور وہی ہے سب سے برتر عظمت والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو سدا زندہ ہے، جو پوری کائنات سنبھالے ہوئے ہے؛ جس کو نہ کبھی اُونگھ لگتی ہے، نہ نیند۔ آسمانوں میں جو کچھ ہے (وہ بھی) اور زمین میں جو کچھ ہے (وہ بھی)، سب اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے؟ وہ سارے بندوں کے تمام آگے پیچھے کے حالات کو خوب جانتا ہے، اور وہ لوگ اُس کے علم کی کوئی بات اپنے علم کے دائرے میں نہیں لا سکتے، سوائے اُس بات کے جسے وہ خود چاہے۔ اس کی کرسی نے سارے آسمانوں اور زمین کو گھیرا ہوا ہے، اور ان دونوں کی نگہبانی سے اسے ذرا بھی بوجھ نہیں ہوتا، اور وہ بڑا عالی مقام، صاحبِ عظمت ہے۔ ﴿۲۵۵﴾

خلاصۂ تفسیر

اللہ تعالیٰ (ایسا ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، زندہ ہے (جس کو کبھی موت نہیں آسکتی)، سنبھالنے والا ہے (تمام عالم کا) نہ اس کو اُونگھ دبا سکتی ہے اور نہ نیند (دبا سکتی ہے)، اسی کے مملوک ہیں سب جو کچھ (بھی) آسمانوں میں (موجودات) ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں، ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کر سکے بدون اس کی اِجازت کے، وہ جانتا ہے ان (تمام موجودات) کے تمام حاضر و غائب حالات کو، اور وہ موجودات اس کی معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے اِحاطۂ علمی میں نہیں لا سکتے مگر جس قدر (علم دینا وہی) چاہے، اس کی کرسی (اتنی بڑی ہے کہ اس) نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں (آسمان و زمین) کی حفاظت کچھ گراں نہیں گزرتی، اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے۔

معارف ومسائل

آیتُ الکرسی کے خاص فضائل

یہ آیت قرآنِ کریم کی عظیم ترین آیت ہے، احادیث میں اس کے بڑے فضائل و برکات مذکور ہیں، مسندِ احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سب آیات سے افضل فرمایا ہے، اور ایک دُوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ قرآن میں کونسی آیت سب سے زیادہ عظیم

ہے، اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: آیت الکرسی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا: اے ابوالمنذر تمہیں علم مبارک ہو۔ [۱]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: یارسول اللہ! قرآن میں عظیم تر آیت کونسی ہے؟ فرمایا: آیت الکرسی۔ (ابن کثیر عن احمد فی المسند) [۲]

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہے جو سیّدۂ آیات القرآن ہے، وہ جس گھر میں پڑھی جائے شیطان اس سے نکل جاتا ہے۔ [۳]

نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ہر نماز فرض کے بعد آیت الکرسی پڑھا کرے تو اس کو جنت میں داخل ہونے کے لئے بجز موت کے کوئی مانع نہیں ہے، [۴] یعنی موت کے بعد فوراً وہ جنت کے آثار اور راحت و آرام کا مشاہدہ کرنے لگے گا۔

اس آیت میں اللہ جل شانہٗ کی توحید ذات وصفات کا بیان ایک عجیب وغریب انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس میں اللہ جل شانہٗ کا موجود ہونا، زندہ ہونا، سمیع و بصیر ہونا، متکلم ہونا، واجب الوجود ہونا، دائم وباقی ہونا، سب کائنات کا موجد وخالق ہونا، تغیرات اور تأثرات سے بالاتر ہونا، تمام کائنات کا مالک ہونا، صاحبِ عظمت وجلال ہونا، کہ اس کے آگے کوئی بغیر اس کی اجازت کے بول نہیں سکتا، ایسی قدرتِ کاملہ کا مالک ہونا کہ سارے عالم اور اس کی کائنات کو پیدا کرنے باقی رکھنے اور ان کا نظامِ محکم قائم رکھنے سے اس کو نہ کوئی تھکان پیش آتا ہے نہ سستی، ایسے علم محیط کا مالک ہونا جس سے کوئی کھلی یا چھپی چیز کا کوئی ذرّہ یا قطرہ باہر نہ رہے، یہ اجمالی مفہوم ہے اس آیت کا، اب تفصیل کے ساتھ اس کے الفاظ کے معنی سنئے:-

اس آیت میں دس جملے ہیں، پہلا جملہ ہے: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس میں لفظ اَللّٰهُ اسمِ ذات ہے، جس کے معنی ہیں "وہ ذات جو تمام کمالات کی جامع اور تمام نقائص سے پاک ہے"، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ میں اسی ذات کا بیان ہے، کہ قابلِ عبادت اس ذات کے سوا کوئی چیز نہیں۔

دُوسرا جملہ ہے اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لفظ "حَیّ" کے معنی عربی زبان میں ہیں "زندہ" اسمائے اِلٰہیہ میں سے یہ لفظ لاکر یہ بتلانا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے، وہ موت سے بالاتر ہے، لفظ "قَیُّوم" قیام سے نکلا ہے، قیام کے معنی کھڑا ہونا، "قائم" کھڑا ہونے والے کو کہتے ہیں۔ "قیُّوم" اور "قیَّام" مبالغہ کے صیغے کہلاتے ہیں، ان کے معنی ہیں وہ جو خود قائم رہ کر دُوسروں کو قائم رکھتا اور سنبھالتا ہے۔ "قَیُّوم" حق تعالیٰ کی خاص صفت ہے، جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہوسکتی،

---

[۱] مسند احمد رقم الحدیث:۲۰۳۱۸ [۲] مسند احمد رقم الحدیث:۲۰۵۶۶
[۳] مصنَّف ابن ابی شیبۃ ج:۷ ص:۱۶۷ [۴] السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۹۹۲۸

کیونکہ جو چیزیں خود اپنے وجود و بقا میں کسی دُوسرے کی محتاج ہوں وہ کسی دُوسری چیز کو کیا سنبھال سکتی ہیں؟ اس لئے کسی اِنسان کو ''قیوم'' کہنا جائز نہیں، جو لوگ ''عبدالقیوم'' کے نام کو بگاڑ کر صرف ''قیوم'' بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔

اللہ جل شانہٗ کے اسمائے صفات میں ''حی وقیوم'' کا مجموعہ بہت سے حضرات کے نزدیک اسم اعظم ہے، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں میں نے ایک وقت یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھوں آپ کیا کر رہے ہیں، پہنچا تو دیکھا کہ آپ سجدہ میں پڑے ہوئے بار بار "یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ، یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ" کہہ رہے ہیں۔ [1]

تیسرا جملہ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ہے، لفظ "سِنَةٌ" سین کے زیر کے ساتھ، اُونگھ کو کہتے ہیں، جو نیند کے اِبتدائی آثار ہوتے ہیں، اور " نَوْمٌ " مکمل نیند کو۔ اس جملے کا مفہوم یہ کہ اللہ جل شانہٗ اُونگھ اور نیند سب سے بری و بالا ہے، پچھلے جملے میں لفظ ''قیوم'' نے جب اِنسان کو یہ بتلایا کہ اللہ جل شانہٗ سارے آسمانوں، زمینوں اور ان میں سمانے والی تمام کائنات کو تھامے اور سنبھالے ہوئے ہیں، اور ساری کائنات اسی کے سہارے قائم ہے، تو ایک اِنسان کا خیال اپنی جبلت وفطرت کے مطابق اس طرف جانا ممکن ہے کہ جو ذاتِ پاک اتنا بڑا کام کر رہی ہے اس کو کسی وقت تھکان بھی ہونا چاہئے، کچھ وقت آرام اور نیند کے لئے بھی ہونا چاہئے، اس دُوسرے جملے میں محدود علم وبصیرت اور محدود قدرت رکھنے والے اِنسان کو اس پر متنبہ کر دیا کہ اللہ جل شانہٗ کو اپنے اُوپر یا دُوسری مخلوقات پر قیاس نہ کرے، اپنا جیسا نہ سمجھے، وہ مثل ومثال سے بالاتر ہے، اس کی قدرتِ کاملہ کے سامنے یہ سارے کام نہ کچھ مشکل ہیں، نہ اُس کے لئے تکان کا سبب ہیں، اور اس کی ذاتِ پاک تمام تأثرات اور تکان وتعب اور اُونگھ اور نیند سے بالاتر ہے۔

چوتھا جملہ ہے لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اس کے شروع میں لفظ لَهٗ کا ''لام'' تملیک کے معنی کے لئے آیا ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام چیزیں جو آسمانوں یا زمین میں ہیں سب اللہ تعالیٰ کی مملوک ہیں، وہ مختار ہے، جس طرح چاہے اُن میں تصرف فرماوے۔

پانچواں جملہ ہے مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ یعنی ''ایسا کون ہے جو اس کے آگے کسی کی سفارش کر سکے بدون اس کی اِجازت کے''، اس میں چند مسائل بیان فرما دیئے ہیں:-

اوّل یہ کہ جب اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک ہے، کوئی اس سے بڑا اور اس کے اُوپر حاکم نہیں تو کوئی اس سے کسی کام کے بارے میں باز پرس کرنے کا بھی حق دار نہیں، وہ جو حکم جاری فرمائیں اس میں کسی کو چون وچرا کی مجال نہیں، ہاں یہ ہوسکتا تھا کہ کوئی شخص کسی کی سفارش وشفاعت کرے سو اس کو بھی واضح فرما دیا کہ بارگاہِ عزت وجلال میں کسی کو مجالِ دم زدن نہیں، ہاں کچھ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں جن کو خاص طور پر کلام اور شفاعت کی اِجازت دے دی جائے گی، غرض

---

[1] السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:۱۰۴۴۷

بلا اجازت کوئی کسی کی سفارش وشفاعت بھی نہ کر سکے گا، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں سب سے پہلے میں ساری اُمتوں کی شفاعت کروں گا، اسی کا نام مقامِ محمود ہے، [۱] جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔

چھٹا جملہ ہے يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ یعنی "اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے آگے پیچھے کے تمام حالات وواقعات سے واقف وباخبر ہے۔" آگے اور پیچھے کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ اُن کے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کے تمام حالات وواقعات حق تعالیٰ کے علم میں ہیں، اور یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ آگے سے مراد وہ حالات ہیں جو اِنسان کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور پیچھے سے مراد اس سے مخفی واقعات وحالات ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ اِنسان کا علم تو بعض چیزوں پر ہے، اور بعض پر نہیں، کچھ چیزیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہیں کچھ چھپی ہوئی، مگر اللہ جل شانہٗ کے سامنے یہ سب چیزیں برابر ہیں، اس کا علم ان سب چیزوں کو یکساں محیط ہے، اور ان دونوں مفہوموں میں کوئی تعارض نہیں، آیت کی وسعت میں یہ دونوں داخل ہیں۔

ساتواں جملہ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ ہے، یعنی "اِنسان اور تمام مخلوقات اللہ کے علم کے کسی حصہ کا بھی اِحاطہ نہیں کر سکتے، مگر اللہ تعالیٰ ہی خود جس کو جتنا حصۂ علم عطا کرنا چاہیں صرف اتنا ہی اس کو علم ہوسکتا ہے۔" اس میں بتلا دیا گیا کہ تمام کائنات کے ذرّہ ذرّہ کا علمِ محیط صرف اللہ جل شانہٗ کی خصوصی صفت ہے، اِنسان یا کوئی مخلوق اس میں شریک نہیں ہوسکتی۔

آٹھواں جملہ ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ یعنی "اس کی کرسی اتنی بڑی ہے جس کی وسعت کے اندر ساتوں آسمان اور زمین سمائے ہوئے ہیں۔" اللہ جل شانہٗ نشست وبرخاست اور حیّز ومکان سے بالاتر ہیں۔ اس قسم کی آیات کو اپنے معاملات پر قیاس نہ کیا جائے، اس کی کیفیت وحقیقت کا اِدراک اِنسانی عقل سے بالاتر ہے، البتہ مستند روایاتِ حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ "عرش" اور "کرسی" بہت عظیم الشان جسم ہیں جو تمام آسمان وزمین سے بدرجہا بڑے ہیں۔

ابنِ کثیرؒ نے بروایت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کرسی کیا اور کیسی ہے؟ آپ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ ساتوں آسمانوں اور زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں کوئی حلقہ انگشتری جیسا ڈال دیا جائے۔ [۲]

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، تحت تفسیر بنی إسرائیل آیت: ۷۹ ج: ۵ ص: ۱۰۴

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هٰذه الآیة ج: ۱ ص: ٦٨٠

اور بعض دُوسری روایات میں ہے کہ عرش کے سامنے کرسی کی مثال بھی ایسی ہی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں انگشتری کا حلقہ۔

نواں جملہ ہے وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا یعنی "اللہ تعالیٰ کو ان دونوں عظیم مخلوقات آسمان وزمین کی حفاظت کچھ گراں نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اس قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کے سامنے یہ سب چیزیں نہایت آسان ہیں۔

دسواں آخری جملہ ہے وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۲۵۵﴾ یعنی "وہ عالی شان اور عظیم الشان ہے"، پچھلے نو جملوں میں حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے کمالات بیان ہوئے ہیں، ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ہر عقل رکھنے والا انسان یہی کہنے پر مجبور ہے کہ عزت وعظمت اور بلندی وبرتری کی مالک وسزاوار وہی ذاتِ پاک ہے، ان دس جملوں میں اللہ جل شانہ کی صفاتِ کمال اور اس کی توحید کا مضمون پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ آ گیا۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ

زبردستی نہیں دِین کے معاملے میں، بے شک جدا ہوچکی ہے ہدایت گمراہی سے، اب جو کوئی نہ مانے

بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ

گمراہ کرنے والوں اور یقین لاوے اللہ پر تو اس نے پکڑ لیا حلقہ مضبوط

لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

جو ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

دِین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت کا راستہ گمراہی سے ممتاز ہو کر واضح ہو چکا۔ اس کے بعد جو شخص طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے گا، اس نے ایک مضبوط کنڈا تھام لیا جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ اور اللہ خوب سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ ﴿۲۵۶﴾

خلاصۂ تفسیر

دِین (اِسلام کے قبول کرنے) میں زبردستی (کا فی نفسہٖ کوئی موقع) نہیں (کیونکہ) ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہوچکی ہے (یعنی اِسلام کا حق ہونا دلائل سے واضح ہو چکا ہے، تو اس میں اِکراہ کا موقع ہی کیا ہے، اِکراہ تو غیر پسندیدہ چیز پر مجبور کرنے سے ہوتا ہے، اور جب اِسلام کی خوبی یقیناً ثابت ہے) تو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اِعتقاد (یعنی اسلام قبول کرلے) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں (اقوالِ ظاہری کے) اور خوب جاننے والے ہیں (احوالِ باطنی کے)۔

معارف و مسائل

اِسلام کو مضبوط پکڑنے والا چونکہ ہلاکت اور محرومی سے محفوظ رہتا ہے، اس لئے اس کو ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی مضبوط رسّی کا حلقہ ہاتھ میں مضبوط تھام کر گرنے سے مأمون رہتا ہے، اور جس طرح ایسی رسّی ٹوٹ کر گرنے کا خطرہ نہیں اور یوں کوئی رسّی ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے، اسی طرح اِسلام میں کسی قسم کی ہلاکت اور خسران نہیں ہے، اور خود کوئی اِسلام کو ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے۔ (بیان القرآن) [1]

اس آیت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ اِعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دِین میں زبردستی نہیں ہے، حالانکہ اِسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم اس کے معارض ہے۔

اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ اِعتراض صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اِسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم لوگوں کو قبولِ اِیمان پر مجبور کرنے کے لئے نہیں ہے، ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی ذمہ داری میں رکھنے اور ان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کرنے کے اِسلامی اَحکام کیسے جاری ہوتے، بلکہ دفعِ فساد کے لئے ہے، کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، جس کے درپے کافر رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٦٤﴾ (المائدة)

''یہ لوگ زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کے ذریعے سے ان لوگوں کے فساد کو دُور کرنے کا حکم دیا ہے، پس ان لوگوں کا قتل ایسا ہی ہے جیسے سانپ، بچھو اور دیگر موذی جانوروں کا قتل۔

---

[1] بیان القرآن تحت هذه الآية ج:۱ ص:۱۷۵

اِسلام نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہج وغیرہ کے قتل کو عین میدانِ جہاد میں بھی سختی سے روکا ہے، کیونکہ وہ فساد کرنے پر قادر نہیں ہوتے، ایسے ہی اُن لوگوں کے بھی قتل کرنے کو روکا ہے جو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے قانون کے پابند ہو گئے ہوں۔

اِسلام کے اس طرزِ عمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد اور قتال سے لوگوں کو اِیمان قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اس سے وہ دُنیا میں ظلم و ستم کو مٹا کر عدل و اِنصاف اور اَمن و امان قائم رکھنا چاہتا ہے، حضرت عمرؓ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اِسلام کی دعوت دی تو اس کے جواب میں اس نے کہا: "اَنَا عَجُوْزٌ کَبِیْرَۃٌ وَالْمَوْتُ اِلَیَّ قَرِیْبٌ" یعنی "میں ایک قریب المرگ بڑھیا ہوں، آخری وقت میں اپنا مذہب کیوں چھوڑوں؟" حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اس کو اِیمان پر مجبور نہیں کیا، بلکہ یہی آیت تلاوت فرمائی: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یعنی "دِین میں زبردستی نہیں ہے۔"

درحقیقت اِیمان کے قبول پر جبر و اِکراہ ممکن بھی نہیں ہے، اس لئے کہ اِیمان کا تعلق ظاہری اَعضاء سے نہیں ہے، بلکہ قلب کے ساتھ ہے، اور جبر و اِکراہ کا تعلق صرف ظاہری اَعضاء سے ہوتا ہے، اور جہاد و قتال سے صرف ظاہری اَعضاء ہی متاثر ہو سکتے ہیں، لہٰذا اس کے ذریعہ سے اِیمان کے قبول کرنے پر جبر ممکن ہی نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ آیاتِ جہاد و قتال آیت لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے معارض نہیں ہیں۔ (مظہری، قرطبی) [1]

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۥ وَالَّذِيْنَ

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف، اور جو لوگ

كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ

کافر ہوئے اُن کے رفیق ہیں شیطان، نکالتے ہیں اُن کو روشنی سے اندھیروں کی طرف،

اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵۷ ع ۳۴

یہی لوگ ہیں دوزخ میں رہنے والے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

[1] تفسیر المظہری تحت هذه الآیة ج:۱ ص:۳۶۳

آسان ترجمۂ قرآن

اللہ ایمان والوں کا رکھوالا ہے، وہ انہیں اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے، ان کے رکھوالے وہ شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر اندھیریوں میں لے جاتے ہیں۔ وہ سب آگ کے باسی ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ (۲۵۷)

خلاصۂ تفسیر

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (الی قولہ) خٰلِدُوْنَ (۲۵۷) اللہ تعالیٰ ساتھی ہی ان لوگوں کا جو اِیمان لائے ان کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر یا بچا کر نور (اِسلام) کی طرف لاتا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں اُن کے ساتھی شیاطین ہیں (اُنسی یا جنی) وہ ان کو نور (اِسلام) سے نکال کر یا بچا کر (کفر کی) تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں، ایسے لوگ (جو اِسلام کو چھوڑ کر کفر اِختیار کریں) دوزخ میں رہنے والے ہیں (اور) یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے۔

معارف ومسائل

اس آیت سے اِیمان کا سب سے بڑی نعمت اور کفر کا سب سے بڑی مصیبت ہونا بھی معلوم ہوا اور یہ بھی کہ کافروں کی دوستی میں بھی ظلمت ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ (وقف لازم)

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے جھگڑا کیا اِبراہیم سے اس کے رَبّ کی بابت اس وجہ سے کہ دی تھی اللہ نے اس کو سلطنت،

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ

جب کہا اِبراہیم نے: میرا رَبّ وہ ہے جو زِندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، وہ بولا: میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں،

قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ

کہا اِبراہیم نے: بے شک وہ لاتا ہے سورج کو مشرق سے اب تو لے آ اس کو مغرب سے،

فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّٰلِمِينَ ﴿٢٥٨﴾

تب حیران رہ گیا وہ کافر، اور اللہ سیدھی راہ نہیں دِکھاتا بے انصافوں کو۔

آسان ترجمۂ قرآن

کیا تم نے اس شخص (کے حال) پر غور کیا جس کو اللہ نے سلطنت کیا دے دی تھی کہ وہ اپنے پروردگار (کے وجود ہی) کے بارے میں ابراہیم سے بحث کرنے لگا؟ جب ابراہیم نے کہا کہ: "میرا پروردگار وہ ہے جو زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی" تو وہ کہنے لگا کہ: "میں بھی زندگی دیتا ہوں اور موت دیتا ہوں۔" ابراہیم نے کہا: "اچھا! اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم ذرا اسے مغرب سے تو نکال کر لاؤ۔" اس پر وہ کافر مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ﴿٢٥٨﴾

خلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب!) کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا (یعنی نمرود کا) جس نے اِبراہیم (علیہ السلام) سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارے میں (یعنی توبہ توبہ وہ خدا کے وجود ہی کا منکر تھا) اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی (یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ نعمتِ سلطنت پر اِحسان ماننا اور اِیمان لاتا، اس کے برعکس اِنکار اور کفر شروع کر دیا اور یہ مباحثہ اس وقت شروع ہوا تھا) جب اِبراہیم علیہ السلام نے (اس کے پوچھنے پر کہ خدا کیسا ہے، جواب میں) فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی زندہ کرنا اور مارنا اس کی قدرت میں ہے، وہ کوڑھ مغز جلانے مارنے کا مطلب تو سمجھا نہیں) کہنے لگا کہ (یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں کہ) میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں (چنانچہ جس کو چاہوں قتل کر دوں، یہ تو مارنا ہے، اور جس کو چاہوں قتل سے معاف کر دوں، یہ جلانا ہے) اِبراہیم علیہ السلام نے (جب دیکھا کہ بالکل ہی بھدی عقل کا ہے کہ اِس کو جلانا اور مارنا سمجھتا ہے، حالانکہ جلانے کی حقیقت بے جان چیز میں جان ڈال دینا ہے، اسی طرح مارنے کا معاملہ سمجھو، اور قرائن سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ جلانے اور مارنے کی حقیقت سمجھے گا نہیں، اس لئے اس ضرورت سے دُوسرے جواب کی طرف متوجہ ہوئے اور) فرمایا کہ (اچھا) اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روزانہ) مشرق سے نکالتا ہے تو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال (کر دِکھلا) اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر (اور کچھ جواب نہ بن آیا، اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ وہ ہدایت کو قبول کرتا، مگر وہ اپنی گمراہی پر جما رہا اس لئے ہدایت نہ ہوئی) اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ

چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے۔

معارف و مسائل

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کافر کو دُنیاوی عزت وشرف اور ملک وسلطنت عطا کردیں تو اس نام سے تعبیر کرنا جائز ہے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت مناظرہ اور مجادلہ کرنا بھی جائز ہے، تاکہ حق و باطل میں فرق ظاہر ہوجائے۔ (قرطبی) [۱]

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی مغرب سے نکالے۔ دفع اس شبہ کا یہ ہے کہ اس کے قلب میں بلا اختیار یہ بات پڑگئی کہ خدا ضرور ہے، اور یہ مشرق سے نکالنا اسی کا فعل ہے، اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے، اور یہ شخص پیغمبر ہے، اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہوگا، اور ایسا ہونے سے انقلابِ عظیم عالم میں پیدا ہوگا، کہیں اور لینے کے دینے نہ پڑجائیں، مثلاً لوگ اس معجزے کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہوکر ان کی راہ پر ہولیں، ذرا سی حجت میں سلطنت جاتی رہے، یہ جواب تو اس لئے نہ دیا اور دُوسرا کوئی جواب تھا نہیں، اس لئے حیران رہ گیا۔ (بیان القرآن) [۲]

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو کہ گزرا وہ ایک شہر پر اور وہ گرا پڑا تھا اپنی چھتوں پر بولا: کیونکر زندہ کرے گا اس کو

اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ

اللہ مرگئے پیچھے، پھر مردہ رکھا اس شخص کو اللہ نے سو برس، پھر اُٹھایا اس کو، کہا: تو کتنی دیر یہاں رہا؟

قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ

بولا: میں رہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم، کہا: نہیں بلکہ تو رہا سو برس، اب دیکھ

اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً

اپنا کھانا اور پینا، سڑ نہیں گیا، اور دیکھ اپنے گدھے کو اور ہم نے تجھ کو نمونہ بنانا چاہا

---

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآیة ج:۳ ص:۲۸۶

[۲] بیان القرآن تحت هذه الآیة ج:۱ ص:۱۷۶

لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ط

لوگوں کے واسطے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم اُن کو کس طرح اُبھار کر جوڑ دیتے ہیں، پھر اُن پر پہناتے ہیں گوشت،

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۙ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۵۹﴾

پھر جب اس پر ظاہر ہوا یہ حال تو کہہ اُٹھا کہ مجھ کو معلوم ہے کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

یا (تم نے) اس جیسے شخص (کے واقعے) پر (غور کیا) جس کا ایک بستی پر ایسے وقت گذر ہوا جب وہ چھتوں کے بل گری پڑی تھی؟ اس نے کہا کہ "اللہ اس بستی کو اس کے مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟" پھر اللہ نے اس شخص کو سو سال تک کے لئے موت دی، اور اس کے بعد زندہ کر دیا۔ (اور پھر) پوچھا کہ تم کتنے عرصے تک (اس حالت میں) رہے ہو؟ اس نے کہا: "ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ!" اللہ نے کہا: "نہیں! بلکہ تم سو سال اسی طرح رہے ہو۔ اب اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ ذرا نہیں سڑیں۔ اور (دوسری طرف) اپنے گدھے کو دیکھو (کہ گل سڑ کر اس کا کیا حال ہو گیا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنا دیں۔ اور (اب اپنے گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کس طرح انہیں اُٹھاتے ہیں، پھر ان کو گوشت کا لباس پہناتے ہیں!" چنانچہ جب حقیقت کھل کر اس کے سامنے آ گئی تو وہ بول اُٹھا کہ "مجھے یقین ہے اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔" ﴿۲۵۹﴾

خلاصۂ تفسیر

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ (الیٰ قولہ) أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۵۹﴾ کیا تم کو اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے، جیسے ایک شخص تھا کہ (چلتے چلتے) ایک بستی پر ایسی حالت میں اس کا گزر ہوا کہ اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گر گئے تھے، (یعنی پہلے چھتیں گریں، پھر اُن کی دیواریں گر گئیں، مراد یہ ہے کہ کسی حادثہ سے وہ بستی ویران ہو گئی تھی، اور سب آدمی مر مرا گئے تھے، وہ شخص یہ حالت دیکھ کر حیرت سے) کہنے لگا کہ (معلوم نہیں) اللہ تعالیٰ اس بستی کو (یعنی اس کے مردوں کو) اس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے (قیامت میں) زندہ کریں گے (یہ تو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں مردوں کو جلا دیں گے، مگر اس وقت کے جلانے کا جو خیال غالب ہوا تو بوجہ اس اَمر کے عجیب ہونے کے ایک حیرت سی دِل پر غالب ہو گئی، اور

چونکہ خدا تعالیٰ ایک کام کو کئی طرح کر سکتے ہیں، اس لئے طبیعت اس کی متلاشی ہوئی کہ خدا جانے جلا دینا کس صورت سے ہوگا؟ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس کا تماشا اس کو دُنیا ہی میں دِکھلا دیں، تا کہ ایک نظیر کے واقع ہو جانے سے لوگوں کو زیادہ ہدایت ہو) سو (اس لئے) اللہ تعالیٰ نے اس شخص (کی جان قبض کر کے اس کو) سو برس تک مردہ رکھا، پھر (سو برس کے بعد) اس کو زِندہ اُٹھایا (اور پھر) پوچھا کہ تو کتنی مدت اس حالت میں رہا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا، یا ایک دن سے بھی کم (کنایہ ہے مدتِ قلیل سے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ تو (اس حالت میں) سو برس رہا ہے، (اور اگر اپنے بدن کے اندر تغیر نہ ہونے سے تعجب ہو) تو اپنے کھانے پینے (کی) چیز کو دیکھ لے کہ (ذرا) نہیں سڑی گلی (ایک قدرت تو ہماری یہ ہے) اور (دُوسری قدرت دیکھنے واسطے) اپنے (سواری کے) گدھے کی طرف نظر کر (کہ گل سڑ کر کیا حال ہو گیا ہے، اور ہم عنقریب اس کو تیرے سامنے زندہ کئے دیتے ہیں) اور (ہم نے تجھ کو اس لئے مار کر زِندہ کیا ہے) تا کہ ہم تجھ کو (اپنی قدرت کی) ایک نظیر لوگوں کے لئے بنا دیں (کہ اس نظیر سے بھی قیامت کے روز زِندہ ہونے پر اِستدلال کر سکیں) اور (اب اس گدھے کی) ہڈیوں کی طرف نظر کر کہ ہم ان کو کس طرح ترکیب دیئے دیتے ہیں، پھر اُن پر گوشت چڑھا دیتے ہیں (پھر اس میں جان ڈال دیتے ہیں، غرض یہ سب اُمور یوں ہی کر دیئے گئے) پھر جب یہ سب کیفیات اس شخص کو (مشاہدہ سے) واضح ہو گئی، تو (بے اِختیار جوش میں آ کر) کہہ اُٹھا کہ میں (دِل سے) یقین رکھتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهٖمُ رَبِّ أَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے: اے پروردگار میرے! دِکھلا دے مجھ کو کیونکر زِندہ کرے گا تو مردے، فرمایا: کیا تو نے یقین نہیں کیا؟

قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ

کہا: کیوں نہیں، لیکن اس واسطے کہ چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جاوے میرے دِل کو، فرمایا: تو پکڑ لے چار جانور اُڑنے والے،

فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ

پھر اُن کو ہلا لے اپنے ساتھ، پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر اُن کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر اُن کو بلا،

يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦٠﴾ ع

چلے آویں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لے کہ بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

آسان ترجمۂ قرآن

اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب ابراہیم نے کہا تھا کہ میرے پروردگار! مجھے دِکھایئے کہ آپ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ اللہ نے کہا: ''کیا تمہیں یقین نہیں؟'' کہنے لگے: ''یقین کیوں نہ ہوتا؟ مگر (یہ خواہش اس لئے کی ہے) تاکہ میرے دِل کو پورا اطمینان حاصل ہوجائے۔'' اللہ نے کہا: ''اچھا! تو چار پرندے لو، اور انہیں اپنے سے مانوس کرلو، پھر (ان کو ذبح کرکے) ان کا ایک ایک حصہ ہر پہاڑ پر رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ، وہ چاروں تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ اور جان رکھو کہ اللہ پوری طرح صاحب اِقتدار بھی ہے، اعلیٰ درجے کی حکمت والا بھی۔'' ﴿٢٦٠﴾

خلاصۂ تفسیر

اور اس وقت (کے واقعہ) کو یاد کرو جبکہ اِبراہیم علیہ السلام نے (حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو (یہ) دِکھلا دیجئے کہ آپ مردوں کو (قیامت میں مثلاً) کس کیفیت سے زندہ کریں گے (یعنی زندہ کرنے کا تو یقین ہے لیکن زندہ کرنے کی بھی مختلف صورتیں اور کیفیتیں ہوسکتی ہیں، وہ معلوم نہیں، اس لئے وہ معلوم کرنے کو دِل چاہتا ہے، اس سوال سے کسی کم سمجھ آدمی کو اس کا شبہ ہوسکتا تھا کہ معاذ اللہ ابراہیم علیہ السلام کو مرنے کے بعد زِندہ ہونے پر اِیمان ویقین نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے خود یہ سوال قائم کرکے بات کھول دی، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام سے اس سوال کے جواب میں اوّل) اِرشاد فرمایا کہ کیا تم (اس پر) یقین نہیں لاتے؟ انہوں نے (جواب میں) عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لاتا، لیکن اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو (معین صورت زندہ کرنے کی مشاہدہ کرنے سے) سکون ہوجاوے (ذہن دُوسرے اِحتمالات سے چکر میں نہ پڑے) اِرشاد ہوا کہ اچھا تو تم چار پرندے لو، پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلالو (تاکہ اُن کی خوب شناخت ہوجاوے) پھر (سب کو ذبح کرکے اور ہڈیوں پروں سمیت ان کا قیمہ سا کرکے اس کے کئی حصے کرو اور کئی پہاڑ اپنی مرضی سے اِنتخاب کرکے) ہر پہاڑ پر اُن میں سے ایک ایک حصہ رکھ دو (اور) پھر اُن سب کو بلاؤ (دیکھو) تمہارے پاس (زندہ ہوکر) دوڑے دوڑے چلے آویں گے، اور خوب یقین رکھو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست (قدرت والے) ہیں (سب کچھ کرسکتے ہیں، پھر بھی بعض باتیں نہیں کرتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حکمت

والے (بھی) ہیں (ہر کام حکمت و مصلحت کے مطابق کرتے ہیں)۔

معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی درخواستِ حیات بعد الموت کا مشاہدہ اور شبہات کا اِزالہ

یہ تیسرا قصہ ہے جو آیتِ مذکورہ میں بیان فرمایا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ مجھے اس کا مشاہدہ کرا دیجئے کہ آپ مردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس درخواست کی کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کو ہماری قدرتِ کاملہ پر یقین نہیں کہ وہ ہر چیز پر حاوی ہے، ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا واقعی حال عرض کیا کہ یقین تو کیسے نہ ہوتا، کیونکہ آپ کی قدرتِ کاملہ کے مظاہر ہر لحظہ، ہر آن مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں، اور غور و فکر کرنے والے کے لئے خود اس کی ذات میں اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، لیکن اِنسانی فطرت ہے کہ جس کام کا مشاہدہ نہ ہو خواہ وہ کتنا ہی یقینی ہو اس میں اس کے خیالات منتشر رہتے ہیں، کہ یہ کیسے اور کس طرح ہوگا؟ یہ ذہنی اِنتشار سکونِ قلب اور اِطمینان میں خلل انداز ہوتا ہے، اس لئے یہ مشاہدہ کی درخواست کی گئی کہ اِحیائے موتیٰ کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں میں ذہنی اِنتشار واقع نہ ہو کر قلب کو سکون و اِطمینان حاصل ہو جائے۔

حق تعالیٰ نے ان کی درخواست قبول فرما کر ان کے مشاہدہ کی بھی ایک ایسی عجیب صورت تجویز فرمائی جس میں منکرین کے تمام شبہات و خدشات کے اِزالے کا بھی مشاہدہ ہو جائے، وہ صورت یہ تھی کہ آپ کو حکم دیا گیا کہ چار پرندے جانور اپنے پاس جمع کرلیں، پھر اُن کو اپنے پاس رکھ کر ہلالیں کہ وہ ایسے ہل جائیں کہ آپ کے بلانے سے آجایا کریں، اور ان کی پوری طرح شناخت بھی ہو جائے، یہ شبہ نہ رہے کہ شاید کوئی دُوسرا پرندہ آگیا ہو، پھر ان چاروں کو ذبح کرکے اور ہڈیوں اور پروں سمیت اُن کا خوب قیمہ سا کرکے اس کے کئی حصے کردیں، اور پھر اپنی تجویز سے مختلف پہاڑوں پر اس قیمے کا ایک ایک حصہ رکھ دیں، پھر اُن کو بلائیں، تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے زندہ ہو کر دوڑے دوڑے آپ کے پاس آجائیں گے۔

تفسیر رُوح المعانی میں بسند ابن المنذر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا ہی کیا، پھر ان کو پکارا تو فوراً ہڈی سے ہڈی، پر سے پر، خون سے خون، گوشت سے گوشت مل ملا کر سب اپنی اپنی اصلی ہیئت میں زندہ ہوکر دوڑتے ہوئے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آ گئے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم! قیامت کے روز اسی طرح سب اجزاء واَجساد کو جمع کر کے ایک دم سے ان میں جان ڈال دوں گا۔ [1]

قرآن کے الفاظ میں يَأْتِينَكَ سَعْيًا آیا ہے، کہ یہ پرندے دوڑتے ہوئے آئیں گے، جس سے معلوم ہوا کہ اُڑ کر نہیں آئیں گے، کیونکہ آسمان میں اُڑ کر آنے میں نظروں سے اوجھل ہوکر بدل جانے کا شبہ ہوسکتا ہے، زمین پر چل کر آنے میں یہ بالکل سامنے رہیں گے۔ اس واقعہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کے بعد حیات بعد الموت کا ایسا نمونہ حضرت خلیل اللہ کو دِکھلا دیا جس نے مشرکین اور منکرین کے سارے شبہات کا اِزالہ مشاہدے سے کرا دیا۔

حیات بعد الموت اور عالمِ آخرت کی زندگی پر سب سے بڑا اِشکال منکرین کو یہی ہوتا ہے کہ اِنسان مرنے کے بعد مٹی ہوجاتا ہے، پھر یہ مٹی کہیں ہوا کے ساتھ اُڑ جاتی ہے، کہیں پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے، کہیں درختوں اور کھیتوں کی شکل میں برآمد ہوتی ہے، پھر اس کا ذرّہ ذرّہ دُنیا کے اَطرافِ بعیدہ میں پھیل جاتا ہے، ان منتشر ذرّوں اور اَجزائے اِنسانی کو جمع کر دینا اور پھر ان میں رُوح ڈال دینا سطحی نظر والے اِنسان کی اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سب کو اپنی قدرت و اپنی حیثیت پر قیاس کرتا ہے، وہ اپنے سے مافوق اور ناقابلِ قیاس قدرت میں غور نہیں کرتا۔

حالانکہ اگر وہ ذرا سا اپنے ہی وجود میں غور کر لے تو اسے نظر آئے کہ آج بھی اس کا وجود ساری دُنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء وذرّات کا مجموعہ ہے، اِنسان کی آفرینش جن ماں اور باپ کے ذریعے ہوتی ہے، اور جن غذاؤں سے اُن کا خون اور جسم بنتا ہے، وہ خود جہان کے مختلف گوشوں سے سمٹے ہوئے ذرّات ہوتے ہیں، پھر پیدائش کے بعد اِنسان جس غذا کے ذریعے نشو ونما پاتا ہے، جس سے اس کا خون اور گوشت پوست بنتا ہے، اس میں غور کرے تو اس کی غذاؤں میں ایک ایک چیز ایسی ہے جو تمام دُنیا کے مختلف ذرّات سے بنی ہوئی ہے، دُودھ پیتا ہے تو وہ کسی گائے، بھینس یا بکری کے اَجزا ہیں، اور ان جانوروں میں یہ اَجزاء اُس گھاس دانے سے پیدا ہوئے جو انہوں نے کھائے ہیں، یہ گھاس دانے معلوم نہیں کس کس خطۂ زمین سے آئے ہیں، اور ساری دُنیا میں پھرنے والی ہواؤں نے کہاں کہاں کے ذرّات کو ان کی تربیت میں شامل کر دیا ہے، اِسی طرح دُنیا کا دانہ دانہ اور پھل اور ترکاریاں اور اِنسان کی تمام غذائیں اور دوائیں جو اس کے بدن کو جزو بنتی ہیں، وہ کس کس گوشۂ عالم سے کس کس طرح حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور نظامِ محکم نے ایک انسان کے بدن میں جمع فرمادیئے، اگر غافل اور کوتاہ نظر اِنسان دُنیا کو چھوڑ کر اپنے ہی بدن کی تحقیق (ریسرچ) کرنے بیٹھ جائے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ اس کا

[1] رُوح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۲۹

وجود خود ایسے بے شمار اَجزاء سے مرکب ہے، جو کوئی مشرق کا ہے، کوئی مغرب کا، کوئی جنوبی دُنیا کا، کوئی شمالی حصے کا، آج بھی دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے اَجزاء قدرت کے نظامِ محکم نے اس کے بدن میں جمع فرما دیئے ہیں، اور مرنے کے بعد یہ اَجزاء پھر اسی طرح منتشر ہو جائیں گے، تو اَب دُوسری مرتبہ پھر ان کا جمع فرما دینا اس کی قدرتِ کاملہ کے لئے کیا دُشوار ہے جس نے پہلی مرتبہ اس کے وجود میں ان منتشر ذرّات کو جمع فرما دیا تھا۔

واقعۂ مذکورہ پر چند سوالات مع جوابات

آیتِ متذکرہ بالا کے مضمون میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:-

اوّل یہ کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا، جبکہ وہ حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر ایمان لانے میں اس وقت کی ساری دُنیا سے زیادہ یقین پر تھے؟

اس کا جواب اس تقریر کے ضمن میں آچکا ہے جو اُوپر کی گئی ہے کہ درحقیقت حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال کسی شک وشبہ کی بنا پر تھا ہی نہیں، بلکہ سوال کا منشا صرف یہ تھا کہ حق تعالیٰ قیامت میں مردوں کو زِندہ کریں گے، اُن کی قدرتِ کاملہ سے یہ کسی طرح بھی مستبعد یا حیرت انگیز نہیں، بلکہ یقینی ہے، لیکن مردہ کو زِندہ کرنے کا کام اِنسان کی طاقت سے باہر ہے، اس نے کبھی کسی مردہ کو زِندہ ہوتے ہوئے دیکھا نہیں، اور مردہ کو زِندہ کرنے کی کیفیات اور صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں، اِنسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ میں نہ ہو اس کی کیفیات کی کھوج لگانے کی فکر میں رہا کرتا ہے، اس میں اس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہے، جس میں ذہنی اِنتشار کی تکلیف بھی برداشت کرتا ہے، اس ذہنی اِنتشار کو رفع کر کے قلب کو سکون مل جانے ہی کا نام اِطمینان ہے، اسی کے لئے حضرت خلیل اللہ نے یہ درخواست پیش فرمائی تھی۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ''ایمان'' اور ''اِطمینان'' میں کیا فرق ہے، ''ایمان'' اس اِختیاری یقین کا نام ہے جو اِنسان کو رسول کے اِعتماد پر کسی غیب کی بات کے متعلق حاصل ہو جائے، اور ''اِطمینان'' سکونِ قلب کا نام ہے، بعض اوقات نظروں سے غائب کسی چیز پر یقین کامل تو ہوتا ہے، مگر قلب کو سکون اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا، یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہوسکتا ہے، حضرت خلیل اللہ کو بھی حیات بعد الموت پر تو کامل ایمان و یقین تھا، سوال صرف کیفیتِ اِحیاء کے متعلق تھا۔

دُوسرا سوال یہ ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال زندہ کرنے کی کیفیت سے متعلق تھا، اصل حیات بعد الموت میں کوئی شک وشبہ نہ تھا، تو پھر ارشادِ ربانی اَوَلَمْ تُؤْمِنْ یعنی ''کیا آپ کو یقین نہیں'' فرمانے کا کوئی موقع نہیں رہتا؟

جواب یہ ہے کہ جو سوال حضرت اِبراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش فرمایا کہ اصل واقعہ میں کوئی شک نہیں، لیکن اس سوال کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ زندہ کرنے کی کیفیت دریافت کرنا منظور ہے۔

انہی الفاظِ سوال کا ایک دُوسرا مفہوم بھی ہوسکتا ہے جو اَصل قدرت میں شبہ یا اِنکار سے پیدا ہوا کرتا ہے، جیسے آپ کسی بوجھ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ فلاں آدمی اس کو نہیں اُٹھا سکتا اور آپ اس کا عاجز ہونا ظاہر کرنے کے لئے کہیں کہ دیکھیں تم کیسے اس بوجھ کو اُٹھاتے ہو، چونکہ اِبراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوال کا یہ غلط مفہوم بھی کوئی لے سکتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے اِبراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس غلط بات سے بری ثابت کرنے کے لئے ہی یہ اِرشاد فرمایا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ تاکہ اِبراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے جواب میں بَلٰی فرما کر اِفترا پردازوں کی زد سے نکل جائیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اس سوالِ اِبراہیمی سے کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ ان کو حیات بعد الموت پر اطمینان حاصل نہ تھا، حالانکہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر عالمِ غیب سے پردہ اُٹھا دیا جائے تو میرے یقین واطمینان میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، کیونکہ مجھے اِیمان بالغیب ہی سے اِطمینانِ کامل حاصل ہے۔ تو جب بعض اُمتیوں کو درجۂ اِطمینان حاصل ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ کے خلیل کو اِطمینان کا درجہ حاصل نہ ہو؟

اس کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اِطمینان کے بھی بہت سے درجات ہیں، ایک وہ اِطمینان ہے جو اَولیاء اللہ اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے اعلیٰ مقامِ اِطمینان ہے جو عام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے بھی مافوق ہے، جو خاص خاص کو بصورتِ مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے۔

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کو جو درجہ اِطمینان کا حاصل تھا، وہ بلاشبہ حضرت خلیل کو حاصل تھا، بلکہ اس سے اعلیٰ درجۂ اِطمینان جو مقامِ نبوّت کے ساتھ خاص ہے، اس اِطمینان میں حضرت خلیل اللہ اور سب اُمتیوں سے فائق تھے، پھر جس کو وہ طلب فرمارہے ہیں وہ سب سے اعلیٰ مقامِ اِطمینان ہے جو خاص خاص انبیاء کو عطا فرمایا جاتا ہے، جیسے سرورِ کائنات سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرا کر اِطمینانِ خاص بخشا گیا۔

الغرض اس سوال کی وجہ سے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اِبراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اِطمینان حاصل نہ تھا، یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اِطمینانِ کامل جو مشاہدہ سے حاصل ہوا کرتا ہے وہ نہ تھا، اسی کے لئے یہ درخواست فرمائی تھی۔

آیت کے آخر میں فرمایا: اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾ یعنی ''اللہ تعالیٰ زبردست ہیں اور حکمت والے ہیں۔'' زبردست ہونے میں قدرتِ کاملہ کا بیان فرمادیا، اور حکمت والا کہہ کر اس کی طرف اِشارہ کردیا کہ بمقتضائے حکمت ہر ایک کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ نہیں کرایا جاتا، ورنہ حق جل شانہٗ کے لئے کوئی دُشوار نہیں کہ ہر اِنسان کو مشاہدہ کرادیں، مگر پھر اِیمان بالغیب کی جو فضیلت ہے وہ قائم نہیں رہ سکتی۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ

مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ایسی ہے کہ جیسے ایک دانہ اس سے اُگیں سات

سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ

بالیں، ہر بالی میں سو سو دانے، اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے، اور اللہ

وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ

بے نہایت بخشش کرنے والا ہے، سب کچھ جانتا ہے۔ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں، پھر

لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ

خرچ کرنے کے بعد نہ اِحسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں انہی کے لئے ہے ثواب اُن کا اپنے رَبّ کے یہاں،

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ

اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ غمگین ہوں گے۔ جواب دینا نرم اور درگزر کرنا بہتر ہے اس

صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

خیرات سے جس کے پیچھے ہو ستانا، اور اللہ بے پروا ہے نہایت تحمل والا۔ اے ایمان والو!

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ

مت ضائع کرو اپنی خیرات اِحسان رکھ کر اور اِیذا دے کر اس شخص کی طرح جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کے دِکھانے کو

وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ

اور یقین نہیں رکھتا اللہ پر اور قیامت کے دن پر، سو اس کی مثال ایسی ہے جیسے صاف پتھر کہ اُس پر پڑی ہے کچھ مٹی

فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلۡدًا ؕ لَا يَقۡدِرُوۡنَ عَلٰى شَىۡءٍ مِّمَّا كَسَبُوۡا ؕ

پھر برسا اُس پر زور کا مینھ تو کر چھوڑا اس کو بالکل صاف، کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کے ثواب اس چیز کا جو انہوں نے کمایا،

وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمُ

اور اللہ نہیں دکھاتا سیدھی راہ کافروں کو۔ اور مثال اُن کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال

ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ وَتَثۡبِيۡتًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبۡوَةٍ اَصَابَهَا

اللہ کی خوشی حاصل کرنے کو اور اپنے دِلوں کو ثابت کرکر، ایسی ہے جو ایک باغ ہے بلند زمین پر اس پر پڑا

وَابِلٌ فَاٰتَتۡ اُكُلَهَا ضِعۡفَيۡنِ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يُصِبۡهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ

زور کا مینھ تو لایا وہ باغ اپنا پھل دوچند، اور اگر نہ پڑا اس پر مینھ تو پھوار ہی کافی ہے، اور اللہ

بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمۡ اَنۡ تَكُوۡنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ

تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔ کیا پسند آتا ہے تم میں سے کسی کو یہ کہ ہووے اس کا ایک باغ کھجور کا

وَّاَعۡنَابٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۙ لَهٗ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ

اور انگور کا، بہتی ہوں نیچے اس کے نہریں، اس کو اس باغ میں اور بھی سب طرح کا میوہ ہو حاصل اور آگیا اس پر

الۡكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَآ اِعۡصَارٌ فِيۡهِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ ؕ

بڑھاپا اور اس کی اولاد ہیں ضعیف تب آپڑا اس باغ پر ایک بگولا جس میں آگ تھی جس سے وہ باغ جل اُٹھا،

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۶۶﴾ ع ۳۶ ۴

یوں سمجھاتا ہے تم کو اللہ آیتیں تاکہ تم غور کرو۔

آسان ترجمۂ قرآن

جولوگ اللہ کے راستے میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اُگائے (اور) ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے (ثواب میں) کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے۔ اللہ بہت وسعت والا (اور) بڑے علم والا ہے۔ (۲۶۱) جولوگ اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ کوئی تکلیف پہنچاتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کے پاس اپنا ثواب پائیں گے، نہ ان کو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ کوئی غم پہنچے گا۔ (۲۶۲) بھلی بات کہہ دینا اور درگذر کرنا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد کوئی تکلیف پہنچائی جائے۔ اور اللہ بڑا بے نیاز، بہت بُردبار ہے۔ (۲۶۳) اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر اُس شخص کی طرح ضائع مت کرو جو اپنا مال لوگوں کو دِکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چکنی چٹان پر مٹی جمی ہو، پھر اس پر زور کی بارش پڑے اور اس (مٹی کو بہا کر چٹان) کو (دوبارہ) چکنی بنا چھوڑے۔ ایسے لوگوں نے جو کمائی کی ہوتی ہے وہ ذرا بھی ان کے ہاتھ نہیں لگتی۔ اور اللہ (ایسے) کافروں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا (۲۶۴) اور جولوگ اپنے مال اللہ کی خوشنودی طلب کرنے کے لئے اور اپنے آپ میں پختگی پیدا کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باغ کسی ٹیلے پر واقع ہو، اس پر زور کی بارش برسے تو وہ دُگنا پھل لے کر آئے۔ اور اگر اس پر زور کی بارش نہ بھی برسے تو ہلکی پھوار بھی اس کے لئے کافی ہے۔ اور تم جو عمل بھی کرتے ہو اللہ اسے خوب اچھی طرح دیکھتا ہے۔ (۲۶۵) کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں (اور) اس کو اس باغ میں اور بھی ہر طرح کے پھل حاصل ہوں، اور بڑھاپے نے اسے آ پکڑا ہو، اور اس کے بچے ابھی کمزور ہوں، اتنے میں ایک آگ سے بھرا بگولا آ کر اس کو اپنی زد میں لے لے اور پورا باغ جل کر رہ جائے؟ اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔ (۲۶۶)

خلاصۂ تفسیر

جولوگ اللہ کی راہ میں (یعنی اُمورِ خیر میں) اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اُن کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت (عند اللہ) ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے (فرض کرو) سات بالیں جمیں (اور) ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں (اسی طرح خدا تعالیٰ ان کا ثواب سات سو حصے تک بڑھاتا ہے) اور یہ افزونی خدا تعالیٰ جس کو چاہتا ہے (بقدر اس کے اخلاص اور مشقت کے) عطا فرماتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں، وہ

سب کو یہ افزونی دے سکتے ہیں مگر ساتھ ہی) جاننے والے (بھی) ہیں (اس لئے اِخلاصِ نیت وغیرہ کو دیکھ کر عطا فرماتے ہیں) جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو (جس کو دِیا ہے اس پر زبان سے) اِحسان جتلاتے ہیں اور نہ (برتاؤ سے اس کو) آزار پہنچاتے ہیں، ان لوگوں کو ان (کے عمل) کا ثواب ملے گا اُن کے پروردگار کے پاس (جاکر) اور نہ (قیامت کے دن) ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ مغموم ہوں گے (ناداری کے وقت جواب میں معقول و) مناسب بات کہہ دینا اور (اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دلاوے یا اِصرار سے تنگ کرے تو اس سے) درگزر کرنا (ہزار درجہ) بہتر ہے ایسی خیرات (دینے) سے جس کے بعد آزار پہنچایا جائے، اور اللہ تعالیٰ (خود) غنی ہیں (کسی کے مال کی ان کو حاجت نہیں، جو کوئی خرچ کرتا ہے اپنے واسطے، پھر آزار کس بنا پر پہنچایا جائے اور آزار دینے پر جو فوراً سزا نہیں دیتے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حلیم (بھی) ہیں۔ اے ایمان والو! تم اِحسان جتلا کر یا اِیذا پہنچا کر اپنی خیرات (کے ثواب بڑھنے) کو برباد مت کرو جس طرح وہ شخص (خود خیرات کے اصل ثواب ہی کو برباد کردیتا ہے) جو اپنا مال خرچ کرتا ہے (محض) لوگوں کو دِکھلانے کی غرض سے اور اِیمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یومِ آخرت پر (مراد اس سے بقرینہ نفیٔ ایمان کے منافق ہے) سو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو اس پر) جب کچھ مٹی (آگئی) ہو (اور اس مٹی میں کچھ گھاس پھونس جم آیا ہو) پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے سو اس کو (جیسا تھا ویسا ہی) بالکل صاف کردے (اسی طرح اُس منافق کے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ ہوگیا جو ظاہر میں ایک نیک عمل، جس میں اُمیدِ ثواب ہو، معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے نفاق نے اس شخص کو ویسا ہی کورا ثواب سے خالی چھوڑ دیا، چنانچہ قیامت میں) ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (کیونکہ کمائی نیک عمل ہے اور اس کا ہاتھ لگنا ثواب کا ملنا ہے، اور ثواب ملنے کی شرط اِیمان اور اِخلاص ہے، اور ان لوگوں میں یہ مفقود ہے، کیونکہ ریاکار بھی ہیں اور کافر بھی ہیں) اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو (قیامت کے روز ثواب کے گھر یعنی جنت کا) راستہ نہ بتلائیں گے (کیونکہ کفر کی وجہ سے اُن کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوا جس کا ثواب آخرت میں ذخیرہ ہوتا اور وہاں حاضر ہوکر اس کے صلہ میں جنت میں پہنچائے جاتے) اور ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے (جو کہ خاص اس عمل سے ہوگی) اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس عملِ شاق کا خوگر بنا کر ان) میں پختگی پیدا کریں (تاکہ دُوسرے اعمالِ صالحہ سہولت سے پیدا ہوا کریں پس ان لوگوں کے نفقات وصدقات کی حالت) مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی ٹیلے پر ہو کہ (اس جگہ کی ہوا لطیف اور بارآور ہوتی ہے اور) اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ (باغ لطافتِ ہوا اور بارش کے سبب اور باغوں سے یا اور دفعوں سے) دونا (چوگنا) پھل لایا ہو، اور اگر ایسے زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکی پھوار (یعنی خفیف بارش) بھی اس کو کافی ہے (کیونکہ زمین اور موقع اس کا اچھا ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (اس لئے جب وہ اِخلاص دیکھتے ہیں ثواب بڑھادیتے ہیں)۔

بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا (یعنی زیادہ درخت اس میں ان کے ہوں اور) اس (باغ) کے (درختوں کے) نیچے نہریں چلتی ہوں (جس سے وہ خوب سرسبز و شاداب ہوں اور) اس شخص کے یہاں اس باغ میں (علاوہ کھجوروں اور انگوروں کے) اور بھی ہر قسم کے (مناسب) میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھاپا آ گیا ہو، (جو کہ زمانہ زیادہ اِحتیاج کا ہوتا ہے) اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں، جن میں (کمانے کی) قوت نہیں (اس صورت میں اہل و عیال سے بھی اس کو توقع خبر گیری کی نہیں ہوگی، بس وجہ معاش صرف وہی باغ ہوا) سو (ایسی حالت میں یہ قصہ ہو کہ) اس باغ پر ایک بگولہ آئے جس میں آگ (کا مادّہ) ہو پھر (اس سے) وہ باغ جل جائے (ظاہر بات ہے کسی کو اپنے لئے یہ بات پسند نہیں آسکتی، پھر اسی کے مشابہ تو یہ بات بھی ہے کہ اوّل صدقہ دیا یا کوئی اور نیک کام کیا جس کے قیامت میں کار آمد ہونے کی اُمید ہو جو کہ وقت ہوگا غایت اِحتیاج کا اور زیادہ مدار قبول ہوگا انہی طاعات پر پھر ایسے وقت میں معلوم ہوگا کہ ہمارے اِحسان جتلانے یا غریب کو ایذا دینے سے ہماری طاعات باطل یا بے برکت ہوگئیں، اس وقت کیسی سخت حسرت ہوگی کہ کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہو گیا، پس جب تم مثال کے واقعہ کو پسند نہیں کرتے تو اِبطالِ طاعات کو کیسے گوارا کرتے ہو) اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے (سمجھانے کے) لئے تاکہ تم سوچا کرو (اور سوچ کر اس کے موافق عمل کیا کرو)۔

معارف و مسائل

یہ سورۂ بقرہ کا چھتیسواں رُکوع ہے جو آیت نمبر ۲۶۱ سے شروع ہوتا ہے، اب سورۂ بقرہ کے پانچ رُکوع باقی ہیں جن میں آخری رُکوع میں تو کلیات اور اہم اُصولی چیزوں کا بیان ہے، اس سے پہلے چار رُکوع میں آیت نمبر ۲۶۱ سے ۲۸۳ تک کل ۲۳ آیات ہیں، جن میں مالیات سے متعلق خاص ہدایات اور ایسے اِرشادات ہیں کہ اگر دُنیا آج ان پر پوری طرح عامل ہو جائے تو معاشی نظام کا وہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے جس میں آج کی دُنیا چار سو بھٹک رہی ہے، کہیں سرمایہ داری کا نظام ہے تو کہیں اس کا رَدِّعمل اِشتراکیت اور اِشتمالیت کا نظام ہے، اور ان نظاموں کے باہمی ٹکراؤ نے دُنیا کو قتل و قتال اور جنگ و جدال کا ایک جہنم بنا رکھا ہے۔ ان آیات میں اِسلام کے معاشی نظام کے ایک اہم پہلو کا بیان ہے، جس کے دو حصے ہیں:-

۱- اپنی ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی رضا کے لئے حاجت مند، مفلس لوگوں پر خرچ کرنے کی تعلیم جس کو صدقہ وخیرات کہا جاتا ہے۔

۲- دُوسرے سود کے لین دین کو حرام قرار دے کر اس سے بچنے کی ہدایات۔

ان میں سے پہلے دو رُکوع صدقہ وخیرات کے فضائل اور اس کی ترغیب اور اس کے متعلقہ اَحکام وہدایات پر مشتمل ہیں، اور آخری دو رُکوع سودی کاروبار کی حرمت وممانعت اور قرض اُدھار کے جائز طریقوں کے بیان میں ہیں۔

جو آیات اُوپر لکھی گئی ہیں ان میں اوّل اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے فضائل کا بیان فرمایا گیا ہے، اس کے بعد ایسی شرائط کا بیان ہے جن کے ذریعے صدقہ خیرات اللہ کے نزدیک قابلِ قبول اور موجبِ ثواب بن جائے، پھر ایسی چیزوں کا بیان ہے جو اِنسان کے صدقہ وخیرات کو برباد کرکے نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق بنادیتی ہیں۔

اس کے بعد دو مثالیں بیان کی گئی ہیں، ایک اُن نفقات وصدقات کی جو اللہ کے نزدیک مقبول ہوں، دُوسرے اُن نفقات وصدقات کی جو غیر مقبول اور فاسد ہوں۔

یہ پانچ مضمون ہیں جو اس رُکوع میں بیان ہوئے ہیں۔

یہاں ان مضامین سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم نے اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کو کہیں بہ لفظ ''اِنفاق'' بیان فرمایا ہے، کہیں بہ لفظ ''اِطعام''، کہیں بہ لفظ ''صدقہ'' اور کہیں بہ لفظ ''اِیتاء الزکوٰۃ''، ان الفاظِ قرآنی اور ان کے جگہ جگہ اِستعمال پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ: اِنفاق، اِطعام، صدقہ عام ہیں، جو ہر قسم کے صدقہ خیرات اور رضائے اِلٰہی حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کے خرچ پر حاوی ہیں، خواہ فرض وواجب ہوں، یا نفلی اور مستحب، اور زکوٰۃ فرض کے لئے قرآن نے ایک ممتاز لفظ ''اِیتاء الزکوٰۃ'' اِستعمال فرمایا ہے، جس میں اس کی طرف اِشارہ ہے کہ اس خاص صدقہ کے لئے حاصل کرنے اور خرچ کرنے دونوں میں کچھ خصوصیات ہیں۔

اس رُکوع میں اکثر لفظ ''اِنفاق'' سے اور کہیں لفظ ''صدقہ'' سے تعبیر کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں عام صدقات ومبرات کا بیان ہے، اور جو اَحکام یہاں ذِکر کئے گئے ہیں ہر قسم کے صدقات اور اللہ کے لئے خرچ کرنے کی سب صورتوں کو شامل اور حاوی ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ایک مثال

پہلی آیت میں اِرشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یعنی حج میں یا جہاد میں، یا فقراء ومساکین اور بیواؤں اور یتیموں پر یا بہ نیتِ اِمداد اپنے عزیزوں دوستوں پر، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک دانہ گیہوں کا عمدہ زمین میں بوئے، اس دانے سے گیہوں کا ایک پودا نکلے، جس میں سات خوشے گیہوں کے پیدا ہوں، اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے حاصل ہوگئے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کا اجر وثواب ایک سے لے کر سات سو تک پہنچتا ہے، ایک پیسہ

خرچ کرے تو سات سو پیسوں کا ثواب حاصل ہو سکتا ہے۔

صحیح و معتبر احادیث میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اس کا دس گنا ملتا ہے، اور سات سو گنے تک پہنچ سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جہاد اور حج میں ایک دِرہم خرچ کرنے کا ثواب سات سو دِرہم کے برابر ہے، یہ روایت ابنِ کثیر نے بحوالۂ مسندِ احمد بیان کی ہے۔[1]

الغرض اس آیت نے بتلایا کہ اللہ کی راہ میں ایک روپیہ خرچ کرنے والے کا ثواب سات سو روپے کے خرچ کے برابر ملتا ہے۔

قبولیتِ صدقات کی مثبت شرائط

لیکن قرآنِ حکیم نے اس مضمون کو بجائے مختصر اور صاف لفظوں میں بیان کرنے کے دانۂ گندم کی مثال کی صورت میں بیان فرمایا، جس میں اس بات کی طرف اِشارہ ہے کہ جس طرح کاشتکار ایک دانۂ گندم سے سات سو دانے اُسی وقت حاصل کر سکتا ہے جبکہ یہ دانہ عمدہ ہو خراب نہ ہو، اور دانہ ڈالنے والا کاشتکار بھی کاشتکاری کے فن سے پورا واقف ہو، اور جس زمین میں ڈالے وہ بھی عمدہ زمین ہو، کیونکہ ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہوگئی تو یا یہ دانہ ضائع ہو جائے گا، ایک دانہ بھی نہ نکلے گا، اور یا پھر ایسا بار آور نہ ہوگا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے بن جائیں۔

اسی طرح عام اعمالِ صالحہ اور خصوصاً اِنفاق فی سبیل اللہ کی مقبولیت اور زیادتیٔ اجر کے لئے بھی یہی تین شرطیں ہیں کہ جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ پاک اور حلال ہو، کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور حلال مال کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔

دُوسرے خرچ کرنے والا بھی نیک نیت اور صالح ہو، بدنیتی یا نام و نمود کے لئے خرچ کرنے والا اس ناواقف کاشتکار کی طرح ہے جو دانے کو کسی ایسی جگہ ڈال دے کہ وہ ضائع ہو جائے۔

تیسرے جس پر خرچ کرے وہ بھی صدقہ کا مستحق ہو، کسی نااہل پر خرچ کر کے ضائع نہ کرے، اس طرح اس مثال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بہت بڑی فضیلت بھی معلوم ہوگئی، اور ساتھ ہی اس کی تین شرطیں بھی کہ مالِ حلال سے خرچ کرے، اور خرچ کرنے کا طریقہ بھی سنت کے مطابق ہو، اور مستحقین کو تلاش کر کے اُن پر خرچ کرے، محض جیب سے نکال ڈالنے سے یہ فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

دُوسری آیت میں صدقہ کرنے کے صحیح اور مسنون طریقے کا بیان اس طرح فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں

---

[1] مسند احمد رقم الحدیث: ۲۳۸۸

خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ اِحسان جتاتے ہیں، اور نہ جن کو دِیا گیا ہے ان کو کوئی اِیذا پہنچاتے ہیں ان کا ثواب ان کے رَبّ کے پاس محفوظ ہے، نہ اُن پر آئندہ کے لئے کوئی خطرہ ہے، اور نہ گزشتہ پر کوئی رنج وغم۔

قبولیتِ صدقہ کی منفی شرائط

اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی دو منفی شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں، ایک یہ کہ دے کر اِحسان نہ جتائیں، دُوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کو عملاً ذلیل وخوار نہ سمجھیں، اور کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی حقارت وذِلت محسوس کرے یا اس کو اِیذا پہنچے۔

تیسری آیت قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ میں بھی صدقات وخیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ان دو شرطوں کی مزید وضاحت کی گئی ہے، جن کا بیان اس سے پہلی آیت میں ہو چکا ہے، ایک یہ کہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے کسی پر اِحسان نہ جتائیں، دُوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی ذِلت وحقارت محسوس کرے، یا جس سے اس کو اِیذا پہنچے۔

وضاحت اس طرح کی گئی کہ ناداری یا معذوری کی حالت میں سائل کے جواب میں کوئی معقول ومناسب عذر پیش کر دینا، اور اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دِلا دے تو اس سے درگزر کرنا ہزار درجے بہتر ہے ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد اس کو اِیذا پہنچائی جائے، اور اللہ تعالیٰ خود غنی وحلیم ہیں، اُن کو کسی کے مال کی حاجت نہیں، جو خرچ کرتا ہے اپنے نفع کے لئے کرتا ہے، تو ایک عاقل اِنسان کو خرچ کرنے کے وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ میرا کسی پر اِحسان نہیں، میں اپنے نفع کے لئے خرچ کر رہا ہوں، اور اگر لوگوں کی طرف سے کوئی ناشکری بھی محسوس کرے تو اَخلاقِ الٰہیہ کے تابع ہو کر عفو ودرگزر سے کام لے۔

چوتھی آیت میں اسی مضمون کو دُوسرے عنوان سے اور بھی تاکید کے ساتھ اس طرح اِرشاد فرمایا کہ اپنے صدقات کو برباد نہ کرو، زبان سے اِحسان جتلا کر یا برتاؤ سے اِیذا پہنچا کر۔

اس سے واضح ہوگیا کہ جس صدقہ وخیرات کے بعد اِحسان جتلانے یا مستحقین کو اِیذا پہنچانے کی صورت ہو جائے وہ صدقہ باطل کالعدم ہے، اُس پر کوئی ثواب نہیں۔ اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی ایک اور شرط کا اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص لوگوں کے دِکھاوے اور نام ونمود کے واسطے خرچ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اور قیامت پر اِیمان نہیں رکھتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی صاف پتھر پر کچھ مٹی جم جائے، اور اس میں کوئی دانہ بوئے، پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے اور وہ اس کو بالکل صاف کر دے، ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی، اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دِکھلائیں گے۔

اس سے قبولیتِ صدقہ وخیرات کی یہ شرط معلوم ہوئی کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ثوابِ آخرت کی نیت سے خرچ کرے، دِکھلاوے یا نام ونمود کی نیت سے نہ ہو، نام ونمود کی نیت سے خرچ کرنا، اپنے مال کو برباد کرنا ہے، اور آخرت پر ایمان رکھنے والا مؤمن بھی اگر کوئی خیرات محض نام ونمود اور رِیا کے لئے کرتا ہے تو اس کا بھی یہی حال ہے کہ اس کو کوئی ثواب نہیں ملتا، پھر اس جگہ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ کے اِضافہ سے شاید اس طرف اِشارہ کرنا منظور ہے کہ ''رِیاکاری'' اور نام ونمود کے لئے کام کرنا اس شخص سے متصوّر ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، رِیاکاری اس کے اِیمان میں خلل کی علامت ہے۔

آیت کے آخر میں جو یہ اِرشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دِکھائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات اور آیات جو سب اِنسانوں کے لئے عام ہیں، کافر جو اِن ہدایات پر نظر نہیں کرتے بلکہ تمسخر اور اِستہزا کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اُن کو توفیق سے محروم کردیتے ہیں، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی ہدایت قبول نہیں کرتے۔

پانچویں آیت میں صدقۂ مقبولہ اور اِنفاقِ مقبول کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ جو لوگ اپنے مال خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی نیت سے خرچ کرتے ہیں کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی باغ ہو کسی ٹیلے پر اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ اپنا پھل لایا ہو دو چند، اور اگر ایسے زور کی بارش بھی نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی اس کے لئے کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے جانتے ہیں۔

اس میں اِخلاصِ نیت اور رعایتِ شرائطِ مذکورہ کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بڑی فضیلت اس مثال سے واضح کردی گئی کہ نیک نیتی اور اِخلاص کے ساتھ تھوڑا بھی خرچ کیا جائے تو وہ کافی اور موجبِ ثمراتِ آخرت ہے۔

چھٹی آیت میں صدقہ وخیرات میں شرائطِ مذکورہ کی خلاف ورزی کرنے پر صدقہ کے باطل ومردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجور اور انگوروں کا، اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں، اور اس شخص کا بڑھاپا آگیا ہو، اور اس کے اہل وعیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس باغ پر ایک بگولہ آوے جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل جاوے، اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلافِ شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کرکے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کررہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدیں بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھاپا آگیا، اس کے اولاد بھی ہے، اور اولاد بھی چھوٹے

بچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جوانی کی حالت میں کسی کا باغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ اُمید ہو سکتی ہے کہ پھر باغ لگالوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ باغ لگانے کی اُمید بھی نہ ہو تو باغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گزارا کرسکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی اِنسان کو باغ کے جل جانے یا لٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اُٹھا سکتی ہے۔ غرض یہ تینوں قیدیں شدتِ اِحتیاج کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کرکے ایک باغ لگایا، اور وہ باغ تیار ہوکر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھاپا اور کمزوری کا زمانہ بھی آگیا، اور یہ شخص صاحبِ عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور بچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگایا ہوا باغ جل جائے تو صدمہ شدید ہوگا اور تکلیف بے حد ہوگی۔

اسی طرح جس شخص نے رِیاکاری سے صدقہ وخیرات کیا یہ گویا اس نے باغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہوگئی جو کمانے اور دوبارہ باغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد اِنسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیال دار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ پچھلی کمائی محفوظ ہوتا کہ ضعیفی میں کام آئے، اور اگر اس حالت میں اس کا باغ اور مال ومتاع جل جائے تو اس کے دُکھ اور دَرد کی اِنتہا نہ رہے گی، اسی طرح یہ صدقہ وخیرات جو رِیا ونمود کے لئے کیا گیا تھا، عین ایسے وقت ہاتھ سے جاتا رہے گا جبکہ وہ اس کا بہت حاجت مند ہوگا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ وخیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اِخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام ونمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رُکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے اِنفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ وخیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی چھ شرائط معلوم ہوں گی:-

اوّل اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دُوسرے طریقِ سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف پر خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر اِحسان نہ جتلانا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اِخلاصِ نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے ہو، نام ونمود کے لئے نہ ہو۔

دُوسری شرط یعنی طریقِ سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حق دار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اِخراجات بغیر ان کی رضامندی کے بند یا کم کرکے صدقہ

وخیرات کرنا کوئی امرِ ثواب نہیں، حاجت مند وارثوں کو محروم کر کے سارے مال کو صدقہ وخیرات یا وقف کر دینا تعلیمِ سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریقِ سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتخاب کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رُو سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائیداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا مستحق ہوگا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہے جو شریعت کی رُو سے مستحسن نہیں ہیں۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَنفِقُوا۟ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم

اے ایمان والو! خرچ کرو ستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے

مِّنَ ٱلْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا۟ ٱلْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِـَٔاخِذِيهِ إِلَّآ

زمین سے اور قصد نہ کرو گندی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کرو، حالانکہ تم اس کو کبھی نہ لوگے مگر

أَن تُغْمِضُوا۟ فِيهِ ۚ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ غَنِىٌّ حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾ ٱلشَّيْطَٰنُ يَعِدُكُمُ

یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ، اور جان رکھو کہ اللہ بے پروا ہے خوبیوں والا۔ شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو

ٱلْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِٱلْفَحْشَآءِ ۖ وَٱللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَٱللَّهُ

تنگ دستی کا اور حکم کرتا ہے بے حیائی کا، اور اللہ وعدہ دیتا ہے تم کو اپنی بخشش اور فضل کا اور اللہ

وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦٨﴾ يُؤْتِى ٱلْحِكْمَةَ مَن يَشَآءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ ٱلْحِكْمَةَ

بہت کشائش والا ہے سب کچھ جانتا ہے۔ عنایت کرتا ہے سمجھ جس کو چاہے، اور جس کو سمجھ ملی ہے

فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ؕ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ

اُس کو بڑی خوبی ملی اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ اور جو

اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُهٗ ؕ

خرچ کروگے تم خیرات یا قبول کروگے کوئی منّت تو بے شک اللہ کو سب معلوم ہے،

وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَاِنْ

اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اگر ظاہر کرکے دو خیرات تو کیا اچھی بات ہے، اور اگر

تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ وَیُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِكُمْ ؕ

اس کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ بہتر ہے تمہارے حق میں، اور دُور کرے گا کچھ گناہ تمہارے

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَیْسَ عَلَیْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ

اور اللہ تمہارے کاموں سے خوب خبردار ہے۔ تیرا ذمہ نہیں اُن کو راہ پر لانا اور لیکن اللہ راہ پر لاوے

مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ

جس کو چاہے، اور جو کچھ خرچ کروگے تم مال سو اپنے ہی واسطے، جب تک کہ خرچ کروگے

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْكُمْ وَاَنْتُمْ

اللہ ہی کی رضاجوئی میں، اور جو خرچ کروگے خیرات سو پوری ملے گی تم کو اور تمہارا

لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ

حق نہ رہے گا۔ خیرات اُن فقیروں کے لئے ہے جو رُکے ہوئے ہیں اللہ کی راہ میں

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ

چل پھر نہیں سکتے ملک میں، سمجھے ان کو ناواقف مال دار اُن کے سوال نہ کرنے سے،

تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ إِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ

تو پہچانتا ہے اُن کو اُن کے چہرے سے، نہیں سوال کرتے لوگوں سے لپٹ کر، اور جو خرچ کرو گے کام کی چیز وہ بے شک

اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ ع اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا

اللہ کو معلوم ہے۔ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات کو اور دِن کو چھپا کر

وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

اور ظاہر میں تو اُن کے لئے ثواب ہے اُن کا اپنے ربّ کے پاس اور نہ ڈر ہے اُن پر

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! جو کچھ تم نے کمایا ہو اور جو پیداوار ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہو اس کی اچھی چیزوں کا ایک حصہ (اللہ کے راستے میں) خرچ کیا کرو، اور یہ نیت نہ رکھو کہ بس ایسی خراب قسم کی چیزیں (اللہ کے نام پر) دیا کرو گے جو (اگر کوئی دوسرا تمہیں دے تو نفرت کے مارے) تم اسے آنکھیں میچے بغیر نہ لے سکو۔ اور یاد رکھو کہ اللہ ایسا بے نیاز ہے کہ ہر قسم کی تعریف اسی کی طرف لوٹتی ہے۔ ﴿۲۶۷﴾ شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے، اور اللہ تم سے اپنی مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا، ہر بات جاننے والا ہے۔ ﴿۲۶۸﴾ وہ جس کو چاہتا ہے دانائی عطا کر دیتا ہے، اور جسے دانائی عطا ہوگئی اسے وافر مقدار میں بھلائی مل گئی۔ اور نصیحت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو سمجھ کے مالک ہیں۔ ﴿۲۶۹﴾ اور تم جو کوئی خرچ کرو یا کوئی منّت مانو اللہ اسے جانتا ہے۔ اور ظالموں کو کسی طرح

کے مددگار میسر نہیں آئیں گے۔(۲۷۰) اگر تم صدقات ظاہر کر کے دو تب بھی اچھا ہے، اور اگر ان کو چھپا کر فقراء کو دو تو یہ تمہارے حق میں کہیں بہتر ہے۔ اور اللہ تمہاری بُرائیوں کا کفارہ کر دے گا، اور اللہ تمہارے تمام کاموں سے پوری طرح باخبر ہے۔(۲۷۱) (اے پیغمبر!) ان (کافروں) کو راہِ راست پر لے آنا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہِ راست پر لے آتا ہے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو وہ خود تمہارے فائدے کے لئے ہوتا ہے جبکہ تم اللہ کی خوشنودی طلب کرنے کے سوا کسی اور غرض سے خرچ نہیں کرتے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تم پر ذرا بھی ظلم نہیں ہوگا۔(۲۷۲) (مالی امداد کے بطورِ خاص) مستحق وہ فقراء ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں اس طرح مقید کر رکھا ہے کہ وہ (معاش کی تلاش کے لئے) زمین میں چل پھر نہیں سکتے۔ چونکہ وہ اتنے پاک دامن ہیں کہ کسی سے سوال نہیں کرتے، اس لئے ناواقف آدمی انہیں مال دار سمجھتا ہے۔ تم ان کے چہرے کی علامتوں سے ان (کی اندرونی حالت) کو پہچان سکتے ہو (مگر) وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ اور تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔(۲۷۳) جو لوگ اپنے مال دن رات خاموشی سے بھی اور علانیہ بھی خرچ کرتے ہیں وہ اپنے پروردگار کے پاس اپنا ثواب پائیں گے، اور نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا، نہ کوئی غم پہنچے گا۔(۲۷۴)

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! (نیک کام میں) خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور (عمدہ چیز کو) اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے (کام میں لانے کے) لئے زمین سے پیدا کیا اور رَدّی (ناکارہ) چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کر دو حالانکہ (ویسی ہی چیز اگر کوئی تم کو تمہارے حقِ واجب کے عوض یا سوغات میں دینے لگے تو) تم کبھی اس کے لینے والے نہیں، ہاں مگر چشم پوشی (اور رعایت) کر جاؤ (تو اور بات ہے) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں (جو ایسی ناکارہ چیزوں سے خوش ہوں) تعریف کے لائق ہیں (یعنی ذات وصفات میں کامل ہیں تو ان کے دربار میں چیز بھی کامل تعریف کے لائق ہی پیش کرنا چاہئے) شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے، (کہ اگر خرچ کرو گے یا اچھا مال خرچ کرو گے تو محتاج ہو جاؤ گے) اور تم کو بری بات (یعنی بخل) کا مشورہ دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے (خرچ کرنے پر اور اچھی چیز خرچ کرنے پر) اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا (یعنی چونکہ نیک جگہ خرچ کرنا طاعت ہے اور طاعت سے معصیت کا کفارہ ہو جاتا ہے، لہٰذا اس سے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں، اور حق تعالیٰ کسی کو دُنیا میں بھی اور آخرت میں تو سبھی کو خرچ کا عوض بھی زیادہ کر کے دیتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں (وہ سب کچھ دے سکتے ہیں) خوب جاننے والے ہیں (نیت کے موافق ثمرہ دیتے ہیں، اور یہ سب مضامین بہت ظاہر ہیں، لیکن ان کو وہی سمجھتا

ہے جس کو دِین کا فہم ہو اور اللہ تعالیٰ) دِین کا فہم جس کو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کو دِین کا فہم مل جاوے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی (کیونکہ دُنیا کی کوئی نعمت اس کے برابر نافع نہیں) اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (یعنی جو عقلِ صحیح رکھتے ہیں) اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو سو حق تعالیٰ کو سب کی یقیناً اِطلاع ہے، اور بے جا کام کرنے والوں کا (قیامت میں) کوئی ہمراہی (حمایتی) نہ ہوگا، اگر تم ظاہر کرکے دو صدقات کو تب بھی اچھی بات ہے اور اگر ان کا اِخفا کرو اور (اِخفا کے ساتھ) فقیروں کو دے دو تب اِخفا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اور اللہ تعالیٰ (اس کی برکت سے) تمہارے کچھ گناہ بھی دُور کردیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کی خوب خبر رکھتے ہیں، (چونکہ بہت سے صحابہؓ کفار کو بایں مصلحت خیرات نہ دیتے تھے کہ شاید اسی تدبیر سے کچھ لوگ مسلمان ہوجاویں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی رائے دی تھی اس لئے اس آیت میں دونوں طرح کے خطاب کرکے اِرشاد فرماتے ہیں کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) ان (کافروں) کو ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمہ (فرض واجب) نہیں (جس کے لئے اتنی دُور دراز اِہتمام کئے جاویں) ولیکن (یہ تو) خدا تعالیٰ (کا کام ہے) جس کو چاہیں ہدایت پر لے آویں، (آپ کا کام صرف ہدایت کا پہنچا دینا ہے خواہ کوئی ہدایت پر آوے یا نہ آوے اور ہدایت کا پہنچا دینا کچھ اس ممانعت پر موقوف نہیں) اور (اے مسلمانو!) تم اور کسی غرض سے خرچ نہیں کرتے بجز رضا جوئی ذاتِ پاک حق تعالیٰ کے (کہ ثواب اس کے لوازم سے ہے اور یہ ہر حاجت مند کی رفعِ حاجت کرنے سے حاصل ہوتی ہے، پھر مسلمان فقیر کی تخصیص کیوں کی جاوے) اور (نیز) جو کچھ مال خرچ کر رہے ہو یہ سب (یعنی اس کا عوض اور ثواب) پورا پورا تم (ہی) کو (آخرت میں) مل جاوے گا اور تمہارے لئے اس میں ذرا کمی نہ کی جاوے گی (سو تم کو اپنے عوض سے مطلب رکھنا چاہئے، اور عوض ہر حال میں ملے گا، پھر تم کو اس سے کیا بحث کہ ہمارا صدقہ مسلمان ہی کو ملے، کافر کو نہ ملے، صدقات) اصل حق اُن حاجت مندوں کا ہے جو مقید ہوگئے ہوں اللہ کی راہ (یعنی دِین کی خدمت) میں، (اور اسی خدمتِ دِین میں مقید اور مشغول رہنے سے) وہ لوگ (طلبِ معاش کے لئے) کہیں ملک میں چلنے پھرنے کا (عادۃً) اِمکان نہیں رکھتے (اور) ناواقف ان کو مال دار خیال کرتا ہے اُن کے سوال سے بچنے کے سبب سے (البتہ) تم ان لوگوں کو اُن کے طرز (ہیئت) سے پہچان سکتے ہو (کیونکہ فقر و فاقہ سے چہرے اور بدن میں ایک گونہ اِضمحلال ضرور آجاتا ہے اور یوں) وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے (جس سے کوئی اُن کو حاجت مند سمجھے، یعنی مانگتے ہی نہیں، کیونکہ اکثر جو لوگ مانگنے کے عادی ہیں وہ لپٹ کر ہی مانگتے ہیں) اور (ان لوگوں کی خدمت کرنے کو) جو مال خرچ کروگے بے شک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اِطلاع ہے (اور لوگوں کو دینے سے اُن کی خدمت کا فی نفسہٖ زیادہ ثواب دیں گے) جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دِن میں (یعنی بلا تخصیصِ اوقات) پوشیدہ اور آشکارا (یعنی بلا تخصیصِ حالات) سو اُن لوگوں کو ان کا ثواب ملے گا (قیامت کے

روز) ان کے رَبّ کے پاس (جا کر) اور نہ (اس روز) اُن پر کوئی خطرہ (واقع ہونے والا) ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

معارف و مسائل

اس سے قبل کے رُکوع میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا بیان تھا، اب اسی سے متعلقہ اُمور کا مزید بیان اس رُکوع کی سات آیات میں کیا گیا ہے، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:-

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا (الیٰ قولہ) غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ شانِ نزول سے "طیب" کے معنی عمدہ کے کئے گئے ہیں، کیونکہ بعض لوگ خراب چیزیں لے آتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی، اور بعض نے عمومِ لفظ سے "طیب" کی تفسیر حلال سے کی ہے، کیونکہ پوری عمدہ جب ہی ہوتی ہے جب حلال بھی ہو، پس اس بنا پر آیت میں اس کی بھی تاکید ہوگی اور پہلی تفسیر پر دُوسرے دلائل سے اس تاکید کو ثابت کیا جاوے گا، اور یاد رکھو کہ یہ اس شخص کے لئے ہے جس کے پاس عمدہ چیز ہو، اور پھر وہ بری نکمّی چیز خرچ کرے، جیسا کہ لفظ مَا كَسَبْتُمْ اور اَخْرَجْنَا اس کے موجود ہونے پر اور وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ عمداً نکمّی چیز کے خرچ کرنے پر دَلالت کر رہا ہے، اور جس کے پاس اچھی چیز ہو ہی نہیں وہ اس ممانعت سے بری ہے، اور اس کی وہ بری بھی مقبول ہے۔

لفظ مَا كَسَبْتُمْ سے بعض علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ والد کا اپنے بیٹے کی کمائی سے کھانا جائز ہے، لقولہ علیہ السلام:-

اَوْلَادُكُمْ مِنْ طَيِّبِ اَكْسَابِكُمْ فَكُلُوْا مِنْ اَمْوَالِ اَوْلَادِكُمْ هَنِيْئًا۔ (قرطبی) [1]

"تمہاری اولاد تمہاری کمائی کا ایک پاکیزہ حصہ ہے، پس تم اپنی اولاد کی کمائی سے مزے سے کھاؤ۔"

عُشر اَراضی کے اَحکام

وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ میں لفظ اَخْرَجْنَا سے اِشارہ اس بات کی طرف ہے کہ عشری زمین میں عشر واجب ہے، اس آیت کے عموم سے اِمام ابوحنیفہؒ نے اِستدلال کیا ہے کہ عشری زمین کی ہر قلیل و کثیر پیداوار پر عشر واجب ہے، سورۂ اَنعام کی آیت: وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (الانعام:۱۴۱) وجوبِ عشر میں بالکل صریح اور واضح ہے۔ "عشر وخراج" شریعتِ اِسلامی کے دو اِصطلاحی لفظ ہیں، ان دونوں میں ایک بات مشترک ہے کہ اِسلامی حکومت کی طرف سے زمینوں پر عائد کردہ ٹیکس کی ایک حیثیت ان دونوں میں ہے، فرق یہ ہے کہ "عشر" فقط ٹیکس نہیں بلکہ اس میں ٹیکس سے زیادہ اصلی حیثیت عبادتِ مالی کی ہے، مثل زکوٰۃ کے، اسی لئے اس کو "زکوٰۃ الارض" بھی کہا جاتا ہے، اور "خراج" خالص ٹیکس

---

[1] سنن النسائی، کتاب البیوع، باب الحث علی الکسب ج:۲ ص:۲۱۰

ہے، جس میں عبادت کی کوئی حیثیت نہیں، مسلمان چونکہ عبادت کے اہل اور پابند ہیں، ان سے جو زمین کی پیداوار کا حصہ لیا جاتا ہے اس کو ''عشر'' کہتے ہیں، اور غیر مسلم چونکہ عبادت کے اہل نہیں، ان کی زمینوں پر جو کچھ عائد کیا جاتا ہے اس کا نام ''خراج'' ہے۔ عملی طور پر زکوٰۃ اور عشر میں بھی یہ فرق ہے کہ سونا چاندی اور تجارت کے مال پر زکوٰۃ سال بھر گزرنے کے بعد عائد ہوتی ہے، اور عشر زمین سے پیداوار حاصل ہوتے ہی واجب ہو جاتا ہے۔

دُوسرا فرق یہ بھی ہے کہ اگر زمین سے کوئی پیداوار نہ ہو تو عشر ساقط ہو جاتا ہے، لیکن اَموالِ تجارت اور سونے چاندی پر اگر کوئی نفع بھی نہ ہو تب بھی سال پورا ہونے پر ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ عشر و خراج کے مسائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، کتبِ فقہ میں مذکور ہے، اور احقر نے اپنی کتاب ''نظام الاراضی'' میں بھی تفصیل سے لکھ دیا ہے، جس میں پاکستان و ہندوستان کی زمینوں کے خصوصی اَحکام بھی لکھے گئے ہیں۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ (الیٰ قولہ) وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ جب کسی کے دِل میں یہ خیال آئے کہ اگر خیرات کروں گا تو مفلس ہو جاؤں گا، اور حق تعالیٰ کی تاکید سن کر بھی اس کی ہمت نہ ہو، اور دِل چاہے کہ اپنا مال خرچ نہ کرے، اور وعدۂ اِلٰہی سے اِعراض کر کے وعدۂ شیطانی پر طبیعت کو میلان اور اِعتماد ہو تو اس کو یقین کر لینا چاہئے کہ یہ مضمون شیطان کی طرف سے ہے، یہ نہ کہے کہ ''شیطان کی تو ہم نے کبھی صورت بھی نہیں دیکھی، حکم کرنا تو درکنار رہا۔'' اور اگر یہ خیال آوے کہ صدقہ و خیرات سے گناہ بخشے جائیں گے، اور مال میں بھی ترقی اور برکت ہوگی، تو جان لے کہ یہ مضمون اللہ کی طرف سے آیا ہے، اور خدا کا شکر کرے اور اللہ کے خزانے میں کمی نہیں، سب کے ظاہر و باطن، نیت و عمل کو خوب جانتا ہے۔

حکمت کے معنی اور تفسیر

یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ لفظ ''حکمت'' قرآنِ کریم میں بار بار آیا ہے، اور ہر جگہ اس کی تفسیر میں مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں، تفسیر ''بحرِ محیط'' میں اس جگہ تمام اقوالِ مفسرین کو جمع کیا ہے، وہ تقریباً تیس ہیں، مگر آخر میں فرمایا کہ درحقیقت یہ سب اقوال متقارب ہیں، ان میں کوئی اِختلاف نہیں، صرف تعبیرات کا فرق ہے، کیونکہ لفظ حکمت، اِحکام بالکسر کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں کسی عمل یا قول کو اس کے تمام اوصاف کے ساتھ مکمل کرنا۔

اسی لئے ''بحرِ محیط'' میں آیتِ بقرہ: وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ (البقرۃ:۲۵۱) جو حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ہے، اس کی تفسیر میں فرمایا:-

وَالْحِكْمَةُ وَضْعُ الْاُمُوْرِ فِيْ مَحَلِّهَا عَلَى الصَّوَابِ وَكَمَالُ ذٰلِكَ اِنَّمَا يَحْصُلُ بِالنُّبُوَّةِ۔

''حکمت کے اصلی معنی ہر شئے کو اس کے محل میں رکھنے کے ہیں، اور اس کا کمال صرف نبوّت سے ہو سکتا

ہے، اس لئے یہاں حکمت کی تفسیر نبوّت سے کی گئی ہے۔''

امام راغب اصفہانیؒ نے ''مفردات القرآن'' میں فرمایا کہ لفظ ''حکمت'' جب حق تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جائے تو معنی تمام اشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تو موجودات کی صحیح معرفت اور اس کے مطابق عمل مراد ہوتا ہے۔[1]

اسی مفہوم کی تعبیریں مختلف الفاظ میں کی گئی ہیں، کسی جگہ اس سے مراد قرآن ہے، کسی جگہ حدیث، کسی جگہ علمِ صحیح، کہیں عملِ صالح، کہیں قولِ صادق، کہیں عقلِ سلیم، کہیں فقہ فی الدین، کہیں اصابتِ رائے اور کہیں خشیۃ اللہ، اور آخری معنی تو خود حدیث میں بھی مذکور ہیں: ''رَأْسُ الْحِكْمَةِ خَشْيَةُ اللهِ'' یعنی اصل حکمت خدا تعالیٰ سے ڈرنا ہے، اور آیت: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ:۲) میں ''حکمت'' کی تفسیر صحابہؓ وتابعینؒ سے حدیث وسنت منقول ہے، اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ آیت زیرِ نظر يُؤْتِي الْحِكْمَةَ میں یہ سب چیزیں مراد ہیں۔ (بحرِ محیط ج:۲ ص:۳۲۰)

اور ظاہر یہی قول ہے، اور ارشادِ قرآنی: وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا سے بھی اس کی طرف اشارہ نکلتا ہے، کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ جس شخص کو حکمت دے دی گئی اس کو خیرِ کثیر دے دی گئی، واللہ اعلم۔

وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ (الیٰ قولہ) وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ''کسی قسم کے خرچ کرنے میں'' سب خرچ آگئے، وہ بھی جس میں سب شرائط مذکورہ کی رعایت ہو، اور وہ بھی جس میں کل کی یا بعض کی رعایت نہ ہو، مثلاً فی سبیل اللہ نہ ہو، بلکہ معصیت میں ہو، یا انفاق میں ریا شامل ہو، یا انفاق کر کے اس پر احسان جتلانا ہو، یا حلال یا عمدہ مال نہ ہو۔ اسی طرح ''نذر'' کے عموم میں سب نذریں آگئیں، مثلاً عباداتِ مالیہ کی نذر، اور اسی مناسبت سے انفاق کے ساتھ نذر کو لائے ہیں، یا عباداتِ بدنیہ کی نذر ہو، پھر وہ مطلق ہو یا کسی اَمر پر معلق ہو، پھر یہ کہ اس کا ایفا کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو، اور مقصود اس کہنے سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سب چیزوں کا علم ہے وہ اس کی جزا دیں گے، یہ اس لئے سنایا تاکہ حدود وشرائط کی رعایت کی ترغیب اور عدمِ رعایت سے ترہیب ہو، اور بے جا کام کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروری شرائط کی رعایت نہیں کرتے، ان کو صریحاً وعید سنا دی۔

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ (الیٰ قولہ) وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ بظاہر یہ آیت فرض اور نفل سب صدقات کو شامل ہے، اور سب میں اِخفاہی افضل ہے، اس میں دینی مصلحت بھی ہے کہ ریا سے ابعد ہے، لینے والا بھی نہیں شرماتا، اور دُنیوی مصلحت بھی ہے کہ اپنے مال کی مقدار عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی، اور مراد افضلیتِ اِخفا سے آیت میں افضلیت فی نفسہٖ ہے، پس اگر کسی مقام پر کسی عارض سے مثلاً رفعِ تہمت یا اُمیدِ اقتداء وغیرہ سے اِظہار کو ترجیح ہو جاوے تو افضلیت

---

[1] مفردات القرآن للأصفهانیؒ ج:۱ ص:۱۲۷

فی نفسہ کے منافی نہیں۔ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ کفارۂ سیئات کچھ اخفا کے ساتھ تو خاص نہیں، صرف اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے اخفا کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے کہ اخفا میں تجھے اگر کوئی ظاہری فائدہ نظر نہ آئے تو منقبض نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ تمہارے گناہ اللہ معاف کرتا ہے، اور یہ تمہارے لئے فائدۂ عظیمہ ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ (الیٰ قولہ) وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٢﴾ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ نیت بھی تمہاری اصل میں اپنے ہی نفع حاصل کرنے کی ہے، اور واقع میں بھی حاصل خاص تم ہی کو ہوگا، پھر ان زوائد پر کیوں نظر کی جاتی ہے کہ یہ نفع خاص اسی طریق سے حاصل کیا جاوے کہ مسلمان ہی کو صدقہ دیں، اور کافر کو نہ دیں۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اس صدقہ سے مراد صدقۂ نفلی ہے جس کا ذمی کافر کو بھی دینا جائز ہے، زکوٰۃ مراد نہیں، کیونکہ وہ سوائے مسلمان کے کسی دوسرے کو دینا جائز نہیں۔ (مظہری) [1]

مسئلہ:- حربی کافر کو کسی قسم کا صدقہ وغیرہ دینا جائز نہیں۔

مسئلہ:- کافر ذمی یعنی غیر حربی کو صرف زکوٰۃ وعشر دینا جائز نہیں، اور دوسرے صدقاتِ واجبہ ونفل سب جائز ہیں، اور آیت میں زکوٰۃ داخل نہیں۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الیٰ قولہ) فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢٧٣﴾ یہاں ''فقراء'' سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو دینی مشغولیت کی وجہ سے دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتے۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی فقیر قیمتی کپڑے پہنے ہوئے ہو تو اس کی وجہ سے اس کو غنی نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کو فقیر ہی کہا جائے گا، اور ایسے آدمی کو زکوٰۃ دینا بھی صحیح ہوگا۔ (قرطبی) [2]

تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ سے معلوم ہوا کہ علامات کو دیکھ کر حکم لگانا صحیح ہے، چنانچہ اگر کوئی مردہ اس قسم کا پایا جائے کہ اس پر زنار ہے اور اس کا ختنہ بھی نہیں کیا ہوا ہو تو اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا۔ (قرطبی) [3]

لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا اس آیت سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ لپٹ کر نہیں مانگتے، لیکن بغیر لپٹ کر مانگنے کی نفی نہیں ہے چنانچہ بعض حضرات کا یہی قول ہے، لیکن جمہور کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سوال بالکل ہی نہیں کرتے، لِاَنَّهُمْ مُتَعَفِّفُوْنَ عَنِ الْمَسْاَلَةِ عِفَّةً تَامَّةً۔ (قرطبی) [4]

[1] تفسیر المظهری تحت هٰذه الآية ج:٢ ص:٣٩١

[2] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:٣ ص:٣٤١

[3] بحوالۂ بالا۔

[4] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:٣ ص:٣٤٣۔ ترجمہ:- کیونکہ وہ سوال کرنے سے مکمل طور پر بچتے ہیں۔

آٹھویں آیت اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ میں ان لوگوں کے اجرِ عظیم اور فضیلت کا بیان ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے عادی ہیں، تمام حالات واوقات میں رات میں اور دن میں، خفیہ اور علانیہ ہر طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتے رہتے ہیں، اس کے ضمن میں یہ بھی بتلادیا کہ صدقہ وخیرات کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، نہ رات اور دن کی کوئی تعیین ہے، اس طرح خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ثواب ہے، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے، نام ونمود مقصود نہ ہو، خفیہ خرچ کرنے کی فضیلت بھی اسی حد تک ہے کہ علانیہ خرچ کرنے کے لئے کوئی ضرورت داعی نہ ہو، اور جہاں ایسی ضرورت ہو وہاں علانیہ خرچ کرنا ہی افضل ہے۔

''رُوح المعانی'' میں بحوالہ ابنِ عساکر نقل کیا ہے کہ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے چالیس ہزار دینار اللہ کی راہ میں اسی طرح خرچ کئے کہ دس ہزار دن میں، دس ہزار رات میں، دس ہزار خفیہ اور دس ہزار علانیہ، بعض مفسرین نے اس آیت کا شانِ نزول اسی واقعۂ صدیقِ اکبرؓ کو لکھا ہے، اس کے شانِ نزول کے متعلق اور بھی مختلف اقوال ہیں۔ [1]

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ

جو لوگ کھاتے ہیں سود نہیں اُٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اُٹھتا ہے وہ شخص کہ جس کے حواس کھودیئے ہوں

الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ (وقف لازم)

جن نے لپٹ کر، یہ حالت اُن کی اس واسطے ہوگی کہ انہوں نے کہا کہ سوداگری بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا،

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ

حالانکہ اللہ نے حلال کیا ہے سوداگری کو اور حرام کیا ہے سود کو، پھر جس کو پہنچی نصیحت اپنے ربّ کی طرف سے

فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ

اور وہ باز آگیا تو اس کے واسطے ہے جو پہلے ہو چکا اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے ہے، اور جو کوئی پھر لیوے سود تو وہی لوگ ہیں

[1] رُوح المعانی تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۴۸

أَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿٢٧٥﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي

دوزخ والے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ مٹاتا ہے اللہ سود اور بڑھاتا ہے

الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٧٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا

خیرات کو، اور اللہ خوش نہیں کسی ناشکر گنہگار سے۔ جو لوگ ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ

اور عمل نیک کئے اور قائم رکھا نماز کو اور دیتے رہے زکوٰۃ ان کے لئے ہے ثواب

عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٧﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا

اُن کے ربّ کے پاس، اور نہ اُن کو خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اے ایمان والو!

اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِنْ لَمْ

ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ باقی رہ گیا ہے سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا۔ پس اگر نہیں

تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ ۚ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ

چھوڑتے تو تیار ہوجاؤ لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے، اور اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارے واسطے ہے

رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ

اصل مال تمہارا، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی۔ اور اگر ہے تنگ دست

فَنَظِرَةٌ إِلٰى مَيْسَرَةٍ ۗ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾

تو مہلت دینی چاہئے کشائش ہونے تک، اور بخش دو تو بہت بہتر ہے تمہارے لئے، اگر تم کو سمجھ ہے۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ

اور ڈرتے رہو اس دن سے جس دن لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف، پھر پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾ ع

اور اُن پر ظلم نہ ہوگا۔

آسان ترجمۂ قرآن

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت میں) اُٹھیں گے تو اس شخص کی طرح اُٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس لئے ہوگا کہ انہوں نے کہا تھا کہ: ''بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہوتی ہے۔'' حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا جس شخص کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت آ گئی اور وہ (سودی معاملات سے) باز آ گیا تو ماضی میں جو کچھ ہوا وہ اسی کا ہے۔ اور اس (کی باطنی کیفیت) کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جس شخص نے لوٹ کر پھر وہی کام کیا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ ﴿٢٧٥﴾ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ ہر اس شخص کو ناپسند کرتا ہے جو ناشکرا گنہگار ہو ﴿٢٧٦﴾ (ہاں) وہ لوگ جو ایمان لائیں، نیک عمل کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں وہ اپنے رَبّ کے پاس اپنے اجر کے مستحق ہوں گے، نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا، نہ کوئی غم پہنچے گا۔ ﴿٢٧٧﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اگر تم واقعی مؤمن ہو تو سود کا جو حصہ بھی (کسی کے ذمے) باقی رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو ﴿٢٧٨﴾ پھر بھی اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو۔ اور اگر تم (سود سے) توبہ کرو تو تمہارا اصل سرمایہ تمہارا حق ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے ﴿٢٧٩﴾ اور اگر کوئی تنگدست (قرض دار) ہو تو اس کا ہاتھ کھلنے تک مہلت دینی ہے۔ اور صدقہ ہی کر دو تو یہ تمہارے حق میں کہیں زیادہ بہتر ہے، بشرطیکہ تم کو سمجھ ہو ﴿٢٨٠﴾ اور ڈرو اس دن سے جب تم سب اللہ کے پاس لوٹ کر جاؤ گے، پھر ہر ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا ہے پورا پورا دیا جائے گا، اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ ﴿٢٨١﴾

خلاصۂ تفسیر

جو لوگ سود کھاتے ہیں (یعنی لیتے ہیں) نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر جس طرح کھڑا ہوتا

ہے ایسا شخص جس کو شیطان نے خبطی بنادیا ہو لپٹ کر (یعنی حیران مدہوش) یہ سزا اس لئے ہوگی کہ ان (سودخوار) لوگوں نے (سود کے حلال ہونے پر اِستدلال کرنے کے لئے) کہا تھا کہ بیع بھی تو مثل سود کے ہے (کیونکہ اس میں بھی مقصود نفع حاصل کرنا ہوتا ہے، اور بیع یقیناً حلال ہے، پھر سود بھی جو کہ اس کا مثل ہے حلال ہونا چاہئے) حالانکہ (دونوں میں کھلا فرق ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے (جو کہ مالک ہیں اَحکام کے) بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کردیا ہے (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا) پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے (اس بارے میں) نصیحت پہنچی اور وہ (اس سود کے فعل اور اس کفر کے قول سے یعنی حلال کہنے سے) باز آ گیا (یعنی حرام سمجھنے لگا اور لینا بھی چھوڑ دیا) تو جو کچھ (اس حکم کے آنے سے) پہلے (لینا) ہو چکا ہے وہ اس کا رہا (یعنی ظاہرِ شرع کے نزدیک اس کی یہ توبہ قبول ہوگئی، اور لیا ہوا مال اسی کی مِلک ہے) اور (باطنی) معاملہ اس کا (کہ وہ دِل سے باز آیا ہے یا منافقانہ توبہ کرلی ہے، یہ) خدا کے حوالے رہا، (اگر دِل سے توبہ کی ہوگی عنداللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم ہوگی، تم کو بدگمانی کا کوئی حق نہیں) اور جو شخص (نصیحتِ مذکور سن کر بھی اسی قول اور اسی فعل کی طرف) پھر عود کرے تو (بوجہ اس کے کہ ان کا یہ فعل خود گناہِ کبیرہ ہے) یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے (اور بوجہ اس کے کہ اُن کا یہ قول کفر ہے اس لئے) وہ اس (دوزخ) میں ہمیشہ رہیں گے (اور گو سود لینے سے فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے، لیکن مآلِ کار) اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں (کبھی تو دُنیا ہی میں سب برباد ہوجاتا ہے، ورنہ آخرت میں تو یقینی برباد ہے، کیونکہ وہاں اس پر عذاب ہوگا) اور (برخلاف اس کے صدقہ دینے میں گو فی الحال مال گھٹتا معلوم ہوتا ہے، لیکن مآلِ کار اللہ تعالیٰ) صدقات کو بڑھاتے ہیں (کبھی تو دُنیا میں بھی ورنہ آخرت میں تو یقیناً بڑھتا ہے، کیونکہ وہاں اس پر بہت سا ثواب ملے گا، جیسا اُوپر آیات میں مذکور ہوا) اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا (بلکہ مبغوض رکھتے ہیں) کسی کفر کرنے والے کو (جو کہ قولِ مذکور کے مثل کلماتِ کفر منہ سے بکے، اور اسی طرح پسند نہیں کرتے) کسی گناہ کے کام کرنے والے کو (جو کہ فعلِ مذکور یعنی سود کے مثل کبائر کا مرتکب ہو)۔

بے شک جو لوگ اِیمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے اور (بالخصوص) نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کا ثواب ہوگا اُن کے پروردگار کے نزدیک اور (آخرت میں) ان پر کوئی خطرہ (واقع ہونے والا) نہیں ہوگا اور نہ وہ (کسی مقصود کے فوت ہونے سے) مغموم ہوں گے۔

اے اِیمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم اِیمان والے ہو (کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے) پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اِشتہار سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے (یعنی تمہارے خلاف جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کرلو گے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جاویں گے (اس قانون کے بعد) نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے (کہ تم اصل مال سے زیادہ لینے لگو) اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پاوے گا (کہ تمہارا

اصل مال بھی نہ دِلایا جاوے) اور اگر (قرض دار) تنگ دست ہو (اور اس لئے میعاد پر نہ دے سکے) تو (اس کو) مہلت دینے کا حکم ہے آسودگی تک (یعنی جب اس کے پاس ادا کی گنجائش ہو) اور یہ (بات) کہ (بالکل) معاف ہی کر دو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے، اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔

اور (مسلمانو!) اس دن سے ڈرو جس میں تم (سب) اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا (تو تم پیشی کے لئے اپنی کارگزاری دُرست رکھو، اور کسی قسم کی خلاف ورزی مت کرو)۔

معارف ومسائل

ان آیات میں رِبا یعنی سود کی حرمت اور اس کے اَحکام کا بیان شروع ہوا ہے، یہ مسئلہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے، ایک طرف سود و رِبا پر قرآن وسنت کی شدید وعیدیں اور دُوسری طرف دُنیا کی اِقتصادیات میں اس کا جزءِ لازم بن جانا اور اس سے نجات کی مشکلات کا مسئلہ طویل الذیل ہے، اور کئی حیثیتوں سے اس پر غور کرنا ہے۔

اوّل اس بارے میں قرآن کی آیات کی صحیح تفسیر اور اَحادیثِ صحیحہ کے اِرشادات میں غور کر کے یہ متعین کرنا کہ قرآن وسنت کی اِصطلاح میں رِبا کیا چیز ہے، اور کن کن معاملات کو شامل ہے، اور اس کی حرمت کس حکمت ومصلحت پر مبنی ہے، اس میں کس قسم کی مضرتیں ہیں۔

دُوسری حیثیت اس کی عقلی اور معاشی ہے کہ کیا فی الواقع سود و رِبا ایسی چیز ہے جو دُنیا کی اِقتصادی ترقی کی ضامن ہو سکے، اور جس کو نظر اَنداز کرنے کا لازمی نتیجہ تجارت اور عام اِقتصادیات کی تباہی ہو، یا سارا چکر صرف خدا تعالیٰ اور آخرت سے غافل دِماغوں کی پیداوار ہے، ورنہ بغیر اس کے بھی تمام معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں، اور نہ صرف مشکلات کا حل بلکہ دُنیا میں اِقتصادی امن واِطمینان سود کے چھوڑنے پر موقوف ہے، اور یہ کہ دُنیا کے اِقتصادی مصائب کا سب سے بڑا سبب سود و رِبا ہے۔

یہ دُوسری بحث ایک معاشی اور اِقتصادی مسئلہ ہے، جس کے تحت میں بہت سی اُصولی اور فروعی طویل بحثیں ہیں، جن کا تعلق تفسیرِ قرآن سے نہیں، اس لئے اس جگہ پہلی ہی بحث پر اِکتفا کیا جاتا ہے، وہ بھی خاصی طویل ہے۔

یہ چھ آیتیں ہیں جن میں سود کی حرمت اور اَحکام کا بیان ہے، ان میں سے پہلی آیت کے پہلے جملہ میں سود خوروں کے اَنجامِ بد اور محشر میں ان کی رُسوائی اور گمراہی کا ذِکر ہے، اِرشاد ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ آدمی جس کو کسی شیطان جن نے لپٹ کر خبطی بنا دیا ہو، حدیث میں ہے کہ کھڑے ہونے سے مراد

محشر میں قبر سے اُٹھنا ہے کہ سود خور جب قبر سے اُٹھے گا تو اُس پاگل و مجنون کی طرح اُٹھے گا جس کو کسی شیطان جن نے خبطی بنادیا ہو۔

اس جملہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جنات وشیاطین کے اثر سے اِنسان بیہوش یا مجنون ہوسکتا ہے، اور اہلِ تجربہ کے متواتر مشاہدات اس پر شاہد ہیں، اور حافظ ابنِ قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اطباء اور فلاسفہ نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے کہ صرع، بیہوشی یا جنون مختلف اسباب سے ہوا کرتا ہے، ان میں بعض اوقات جنات وشیاطین کا اثر بھی اس کا سبب ہوتا ہے، جن لوگوں نے اس کا اِنکار کیا ہے ان کے پاس بجز ظاہری اِستبعاد کے کوئی دلیل نہیں۔

دُوسری بات یہ غور طلب ہے کہ قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ سود خور محشر میں پاگل یا مجنون ہوکر اُٹھیں گے، بلکہ دیوانہ پن یا بے ہوشی کی ایک خاص صورت کا ذِکر کیا ہے، کہ جیسے کسی کو شیطان نے لپٹ کر خبطی بنادیا ہو، اس میں شاید یہ اِشارہ ہے کہ بے ہوش و مجنون تو بعض اوقات چپ چاپ پڑا بھی رہتا ہے، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ شیطان کے خبطی بنائے ہوؤں کی طرح بکواس اور ہذیان اور دُوسری مجنونانہ حرکتوں کی وجہ سے پہچانے جائیں گے۔

اور شاید اس طرف بھی اِشارہ ہو کہ بیماری سے بے ہوش یا مجنون ہوجانے کے بعد چونکہ اِحساس بالکل باطل ہوجاتا ہے، اس کو تکلیف یا عذاب کا بھی اِحساس نہیں رہتا، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ آسیب زدہ کی طرح تکلیف وعذاب کو پوری طرح محسوس کرے گا۔

اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ جرم وسزا میں کوئی مناسبت ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا کسی شخص یا جماعت کے کسی جرم کے مقابلہ میں دی جاتی ہے، وہ یقیناً اس جرم کے مناسب ہوتی ہے، اس لئے سود خوروں کو خبطی بناکر محشر میں اُٹھانا شاید اس کا اِظہار ہے کہ سود خور روپے پیسے کی حرص میں اس قدر مدہوش ہوتا ہے کہ اس کو نہ کسی غریب پر رحم آتا ہے، نہ کسی کی شرم مانع ہوتی ہے، وہ چونکہ اپنی زندگی میں درحقیقت بے ہوش تھا، اس لئے محشر میں بھی اسی حالت میں اُٹھایا گیا، یا یہ سزا اس کے لئے دی گئی کہ دُنیا میں اس نے عقلی رنگ میں اپنی بے عقلی کو ظاہر کیا، کہ بیع کو مثل سود قرار دِیا، اس لئے اس کو بے عقل کرکے اُٹھادیا گیا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذِکر ہے کہ آیت میں سود کھانے کا ذِکر ہے، اور مراد مطلقاً سود لینا اور اس کا اِستعمال کرنا ہے، خواہ کھانے میں اِستعمال کرے یا لباس میں یا مکان اور اس کے فرنیچر میں، لیکن اس کو "کھانے" کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ جو چیز کھائی جائے اس کی واپسی کا کوئی اِمکان نہیں رہتا، بخلاف دُوسری ضرورتوں کے اِستعمال کے کہ اس چیز کو واپس لیا دیا جاسکتا ہے، اس لئے مکمل قبضہ اور تصرف کو کھا جانے کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور نہ صرف عربی زبان میں بلکہ اُردو، فارسی وغیرہ اکثر زبانوں کا یہی محاورہ ہے۔

اس کے بعد دُوسرے جملہ میں سودخوروں کی اس سزا کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ان لوگوں نے دو جرم کئے، ایک تو بذریعہ سود کے حرام مال کھایا، دُوسرے اس کو حلال سمجھا اور حرام کہنے والوں کے جواب میں یہ کہا بیع وشراء بھی تو رِبا ہی کی مثل ہے، جس طرح رِبا کے ذریعہ نفع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح بیع وشراء کے ذریعہ نفع مقصود ہے، اگر سود حرام ہے تو بیع بھی حرام ہونی چاہئے، حالانکہ اس کے حرام ہونے کا کوئی قائل نہیں۔ اس جگہ بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ لوگ یوں کہتے کہ رِبا بھی تو مثل بیع کے ہے، جب بیع حلال ہے تو رِبا بھی حلال ہونا چاہئے، مگر انہوں نے طرزِ بیان بدل کر حرام کہنے والوں پر ایک قسم کا اِستہزاء کیا کہ تم رِبا کو حرام کہتے ہو تو بیع کو بھی حرام کہو۔

تیسرے جملے میں ان لوگوں کے اس قول کا جواب حق تعالیٰ نے یہ دیا کہ یہ لوگ بیع کو رِبا کی مثل اور برابر قرار دیتے ہیں، حالانکہ بحکم خداوندی ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو حلال قرار دِیا اور دُوسرے کو حرام، پھر دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔

اس جواب میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان لوگوں کا اِعتراض تو عقلی طور پر تھا کہ جب دونوں معاملوں کا مقصد نفع کمانا ہے تو دونوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہئے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے عقلی شبہ کا جواب عقلی طور پر فرق بیان کر کے نہیں دیا، بلکہ حاکمانہ انداز میں یہ جواب دیا کہ مالک الملک والملکوت اللہ جل شانہٗ ہے، وہ ہی ہر چیز کے نفع وضرر اور بھلے برے کو پوری طرح جانتا ہے، جب اس نے ایک کو حلال اور دُوسرے کو حرام قرار دے دیا، تو سمجھ لو کہ جس چیز کو حرام کیا ہے اس میں ضرور کوئی نقصان وضرر اور کوئی خباثت ہے، خواہ عام اِنسان اس کو محسوس کرے یا نہ کرے، کیونکہ مجموعۂ نظامِ عالم کی پوری حقیقت اور اس کے نفع وضرر کا اِحاطہ صرف وہی علیم وخبیر کر سکتا ہے، جس کے علم سے کوئی ذرّہ جہان چھپا ہوا نہیں ہے، عالم کے افراد یا جماعتیں اپنے اپنے مصالح اور مضرتوں کو پہچان سکتے ہیں، پورے عالم کے نفع وضرر کا اِحاطہ نہیں کر سکتے، بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کسی شخص یا جماعت کے حق میں مفید نظر آتی ہیں، مگر پوری قوم یا پورے ملک کے لئے اس میں مضرت ہوتی ہے۔

اس کے بعد تیسرے جملہ میں یہ اِرشاد ہے کہ سود حرام ہونے سے پہلے جس شخص نے کوئی رقم جمع کر لی تھی، لیکن جب سود کو حرام قرار دے دیا گیا، تو اگر آئندہ کے لئے اس نے توبہ کر لی اور باز آ گیا تو اس سے پہلے جمع شدہ رقم ظاہرِ شرع کے حکم سے اُسی کی ہوگئی، اور باطنی معاملہ اس کا کہ وہ دِل سے باز آیا، یا منافقانہ توبہ کر لی، اس کا یہ معاملہ خدا کے حوالے رہا۔

اگر دِل سے توبہ کی ہے تو عند اللہ نافع ہوگی، ورنہ کالعدم ہوگی، عام لوگوں کو بدگمانی کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور جو شخص نصیحت سن کر بھی اسی قول وفعل کی طرف پھر عود کرے تو چونکہ یہ فعل سودخوری گناہ ہے، یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے، اور چونکہ اُن کا یہ قول کہ ''سود مثل بیع کے حلال ہے'' کفر ہے اس لئے وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

دُوسری آیت میں جو یہ اِرشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں، یہاں سود کے ساتھ صدقات کا ذِکر ایک خاص مناسبت سے لایا گیا ہے، کہ سود اور صدقہ دونوں کی حقیقت میں بھی تضاد ہے، اور ان کے نتائج بھی متضاد ہیں، اور عموماً ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی غرض ونیت بھی متضاد ہوتی ہے۔

حقیقت کا تضاد تو یہ ہے کہ صدقہ میں تو بغیر کسی معاوضہ کے اپنا مال دُوسروں کو دِیا جاتا ہے، اور سود میں بغیر کسی معاوضہ کے دُوسرے کا مال لیا جاتا ہے، ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی نیت اور غرض اس لئے متضاد ہے کہ صدقہ کرنے والا محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ثوابِ آخرت کے لئے اپنے مال کو کم یا ختم کر دینے کا فیصلہ کرتا ہے، اور سود لینے والا اپنے موجودہ مال پر ناجائز زیادتی کا خواہش مند ہے۔ اور نتائج کا متضاد ہونا قرآنِ کریم کی اس آیت سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ سود سے حاصل شدہ مال کو یا اس کی برکت کو مٹا دیتے ہیں، اور صدقہ کرنے والے کے مال یا اس کی برکت کو بڑھاتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ مال کی ہوس کرنے والے کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا جو اپنے مال کی کمی پر راضی تھا، اس کے مال میں برکت ہو کر اس کا مال یا اس کے ثمرات وفوائد بڑھ جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آیت میں سود کو مٹانے اور صدقات کو بڑھانے کا کیا مطلب ہے؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ مٹانا اور بڑھانا آخرت کے متعلق ہے کہ سود خور کو اس کا مال آخرت میں کچھ کام نہ آئے گا بلکہ اس پر وبال بن جائے گا، اور صدقہ خیرات کرنے والوں کا مال آخرت میں ان کے لئے ابدی نعمتوں اور راحتوں کا ذریعہ بنے گا، اور یہ بالکل ظاہر ہے جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اور عامۂ مفسرین نے فرمایا ہے کہ سود کا مٹانا اور صدقہ کا بڑھانا آخرت کے لئے تو ہے ہی، مگر اس کے کچھ آثار دُنیا میں بھی مشاہدہ میں آجاتے ہیں۔

سود جس مال میں شامل ہو جاتا ہے، بعض اوقات تو وہ مال خود ہلاک و برباد ہو جاتا ہے، اور پچھلے مال کو بھی ساتھ لے جاتا ہے، جیسے کہ رِبا اور سٹے کے بازاروں میں اس کا ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بڑے بڑے کروڑ پتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ اور فقیر بن جاتے ہیں۔ بے سود کی تجارتوں میں بھی نفع ونقصان کے اِحتمالات رہتے ہیں، اور بہت سے تاجروں کو نقصان بھی کسی تجارت میں ہو جاتا ہے، لیکن ایسا نقصان کہ کل کروڑ پتی تھا، اور آج ایک ایک پیسے کی بھیک کا محتاج ہے، یہ صرف سود اور سٹے کے بازاروں میں ہی ہوتا ہے، اور اہلِ تجربہ کے بے شمار بیانات اس بارے میں مشہور ومعروف ہیں کہ سود کا مال فوری طور پر کتنا ہی بڑھ جائے، لیکن وہ عموماً پائیدار اور باقی نہیں رہتا، جس کا فائدہ اولاد اور نسلوں میں چلے، اکثر کوئی نہ کوئی آفت پیش آ کر اس کو برباد کر دیتی ہے۔ حضرت معمرؒ نے فرمایا کہ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ سود خور پر چالیس سال گزرنے نہیں پاتے کہ اس کے مال پر محاق (یعنی گھاٹا) آجاتا ہے۔

اور اگر ظاہری طور پر مال ضائع و برباد بھی نہ ہو تو اس کے فوائد و برکات وثمرات سے محرومی تو یقینی اور لازمی ہے،

کیونکہ یہ بات کچھ مخفی نہیں کہ سونا چاندی خود تو نہ مقصود ہے نہ کار آمد، نہ اس سے کسی کی بھوک مٹ سکتی ہے نہ پیاس، نہ سردی نہ گرمی سے بچنے کے لئے اوڑھا بچھایا جا سکتا ہے، نہ وہ کپڑوں اور برتنوں کا کام دے سکتا ہے، پھر اس کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے میں ہزاروں مشقتیں اُٹھانے کا منشا ایک عقل مند اِنسان کے نزدیک اس کے سوا نہیں ہوسکتا کہ سونا چاندی ذریعہ ہیں ایسی چیزوں کے حاصل کرنے کا کہ جن سے اِنسان کی زندگی خوشگوار بن سکے، اور وہ راحت وعزت کی زندگی گزار سکے، اور اِنسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ یہ راحت وعزت جس طرح اسے حاصل ہوئی اس کی اولاد اور متعلقین کو بھی حاصل ہو۔

یہی وہ چیزیں ہیں جو مال و دولت کے فوائد وثمرات کہلا سکتے ہیں، اس کے نتیجہ میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ جس شخص کو یہ ثمرات وفوائد حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے بڑھ گیا، اگرچہ دیکھنے میں کم نظر آئے، اور جس کو یہ فوائد وثمرات کم حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے گھٹ گیا، اگرچہ دیکھنے میں زیادہ نظر آئے۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد سود کا کاروبار اور صدقہ وخیرات کے اعمال کا جائزہ لیجئے، تو یہ بات مشاہدہ میں آجائے گی کہ سودخور کا مال اگرچہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے کہ جیسے کسی اِنسان کا بدن ورم وغیرہ سے بڑھ جائے، ورم کی زیادتی بھی تو بدن ہی کی زیادتی ہے، مگر کوئی سمجھ دار اِنسان اس زیادتی کو پسند نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ زیادتی موت کا پیغام ہے، اسی طرح سودخور کا مال کتنا ہی بڑھ جائے، مگر مال کے فوائد وثمرات یعنی راحت وعزت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آج تو سودخوروں کو بڑی سے بڑی راحت وعزت حاصل ہے، وہ کوٹھیوں، بنگلوں کے مالک ہیں، عیش وآرام کے سارے سامان مہیا ہیں، کھانے، پینے، پہننے اور رہنے سہنے کی ضروریات بلکہ فضولیات بھی سب اُن کو حاصل ہیں، نوکر چاکر اور شان وشوکت کے تمام سامان موجود ہیں، لیکن غور کیا جائے تو ہر شخص سمجھ لے گا کہ "سامانِ راحت" اور "راحت" میں بڑا فرق ہے، سامانِ راحت تو فیکٹریوں اور کارخانوں میں بنتا اور بازاروں میں بکتا ہے، وہ سونے چاندی کے عوض حاصل ہوسکتا ہے، لیکن جس کا نام "راحت" ہے وہ نہ کسی فیکٹری میں بنتی ہے، نہ کسی منڈی میں بکتی ہے، وہ ایک ایسی رحمت ہے جو براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہے، وہ بعض اوقات ہزاروں سامان کے باوجود حاصل نہیں ہوسکتی۔ ایک نیند کی راحت کو دیکھ لیجئے کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے یہ تو کرسکتے ہیں کہ سونے کے لئے مکان کو بہتر سے بہتر بنائیں، ہوا اور روشنی کا پورا اِعتدال ہو، مکان کا فرنیچر دیدہ زیب، دِل خوش کن ہو، چارپائی اور گدے اور تکیے حسبِ منشا ہوں، لیکن کیا نیند کا آجانا ان سامانوں کے مہیا ہونے پر لازمی ہے؟ اگر آپ کو کبھی اِتفاق نہ ہوا ہو تو ہزاروں وہ اِنسان اس کا جواب نفی میں دیں گے جن کو کسی عارضے سے نیند نہیں آتی۔ اب امریکا جیسے مال دار، متمدن ملک

کے متعلق بعض رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ وہاں پچھتر فی صد آدمی خواب آور گولیوں کے بغیر سو ہی نہیں سکتے، اور بعض اوقات خواب آور دوائیں بھی جواب دے دیتی ہیں، نیند کے سامان تو آپ بازار سے خرید لائے، مگر نیند آپ کسی بازار سے کسی قیمت پر نہیں لا سکتے۔ اسی طرح دُوسری راحتوں اور لذتوں کا حال ہے کہ اُن کے سامان تو روپیہ پیسے کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں، مگر راحت ولذت کا حاصل ہونا ضروری نہیں۔

یہ بات سمجھ لینے کے بعد سودخوروں کے حالات کا جائزہ لیجئے تو ان کے پاس آپ کو سب کچھ ملے گا مگر ''راحت'' کا نام نہ پائیں گے، وہ اپنے کروڑ کو ڈیڑھ کروڑ، اور ڈیڑھ کروڑ کو دو کروڑ بنانے میں ایسے مست نظر آئیں گے کہ نہ ان کو اپنے کھانے پہننے کا ہوش ہے، نہ اپنی بیوی بچوں کا، کئی کئی مل چل رہے ہیں، دُوسرے ملکوں سے جہاز آرہے ہیں، اُن کی اُدھیڑ بن ہی میں صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے،، افسوس ہے کہ ان دیوانوں نے سامانِ راحت ہی کا نام ''راحت'' سمجھ لیا ہے، اور حقیقت میں راحت سے کوسوں دُور ہیں۔

یہ حال تو ان کی راحت کا ہے، اب عزت کو دیکھ لیجئے، یہ لوگ چونکہ سخت دِل اور بے رحم ہو جاتے ہیں، اُن کا پیشہ ہی یہ ہوتا ہے کہ مفلسوں کی مفلسی سے یا کم مایہ لوگوں کی کم مائیگی سے فائدہ اُٹھائیں، اُن کا خون چوس کر اپنے بدن کو پالیں، اس لئے ممکن نہیں کہ لوگوں کے دِلوں میں اُن کی کوئی عزت ووقار ہو، اپنے ملک کے بنیوں اور ملکِ شام کے یہودیوں کی تاریخ پڑھ جائیے، اُن کے حالات کو دیکھ لیجئے، اُن کی تجوریاں کتنے ہی سونے چاندی اور جواہرات سے بھری ہوں، لیکن دُنیا کے کسی گوشہ میں اِنسانوں کے کسی طبقہ میں ان کی کوئی عزت نہیں، بلکہ ان کے اس عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب مفلس لوگوں کے دِلوں میں اُن کی طرف سے بغض ونفرت پیدا ہوتی ہے، اور آج کل تو دُنیا کی ساری جنگیں اسی بغض ونفرت کی مظاہر ہیں، محنت وسرمایہ کی جنگ نے ہی دُنیا میں اِشتراکیت اور اِشتمالیت کے نظریے پیدا کئے، کمیونزم کی تخریبی سرگرمیاں اسی بغض ونفرت کا نتیجہ ہیں، جن سے پوری دُنیا قتل وقتال اور جنگ وجدال کا جہنم کدہ بن کر رہ گئی ہے، یہ حال تو اپنی راحت وعزت کا ہے، اور تجربہ شاہد ہے کہ سود کا مال سودخور کی آنے والی نسلوں کی زندگی کو بھی کبھی خوشگوار نہیں بناتا، یا ضائع ہو جاتا ہے، یا اس کی نحوست سے وہ بھی مال ودولت کے حقیقی ثمرات سے محروم وذلیل رہتے ہیں۔ لوگ یورپ کے سودخوروں کی مثال سے شاید فریب میں آئیں کہ وہ لوگ تو سب کے سب خوش حال ہیں، اور اُن کی نسلیں بھی پھولتی پھلتی ہیں، لیکن اوّل تو ان کی خوش حالی کا اِجمالی خاکہ عرض کر چکا ہوں۔

دُوسرے ان کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی مردُم خور دُوسرے اِنسانوں کا خون چوس کر اپنا بدن پالتا ہو اور ایسے کچھ اِنسانوں کا جتھہ ایک محلّہ میں آباد ہو جائے، آپ کسی کو اس محلّہ میں لے جا کر مشاہدہ کرائیں کہ یہ سب کے سب بڑے صحت مند اور سرسبز وشاداب ہیں، لیکن ایک عقل مند آدمی کو جو اِنسانیت کی فلاح کا خواہش مند ہے صرف اس محلّہ کا دیکھنا

نہیں، بلکہ اس کے مقابل ان بستیوں کو بھی دیکھنا ہے جن کا خون چوس کر ان کو ادھ موا کر دیا گیا ہے، اس محلّہ اور ان بستیوں کے مجموعہ پر نظر ڈالنے والا کبھی اس محلّہ کے فربہ ہونے پر خوش نہیں ہو سکتا، اور مجموعی حیثیت سے ان کے عمل کو اِنسانی ترقی کا ذریعہ نہیں بتا سکتا، بلکہ اس کو اِنسان کی ہلاکت و بربادی ہی کہنے پر مجبور ہوگا۔

اس کے بالمقابل صدقہ خیرات کرنے والوں کو دیکھئے کہ اُن کو کبھی اس طرح مال کے پیچھے حیران و سرگرداں نہ پائیں گے، ان کو راحت کے سامان اگرچہ کم حاصل ہوں، مگر سامان والوں سے زیادہ اِطمینان اور سکونِ قلب جو اَصلی راحت ہے ان کو حاصل ہوگی، دُنیا میں ہر اِنسان ان کو عزت کی نظر سے دیکھے گا۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں جو یہ اِرشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقے کو بڑھاتا ہے، یہ مضمون آخرت کے اِعتبار سے تو بالکل صاف ہے ہی، دُنیا کے اِعتبار سے بھی اگر ذرا حقیقت سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بالکل کھلا ہوا ہے، یہی ہے مطلب اس حدیث کا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

إِنَّ الرِّبٰوا وَإِنْ كَثُرَ فَإِنَّ عَاقِبَتَهٗ تَصِيْرُ إِلٰى قُلٍّ۔[1]

''یعنی سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر اَنجامِ کار نتیجہ اس کا قلّت ہے۔''

یہ روایت مسندِ احمد اور ابنِ ماجہ میں مذکور ہے۔

آیت کے آخر میں اِرشاد ہے: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ یعنی ''اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو، کسی گناہ کا کام کرنے والے کو'' اس میں اِشارہ فرما دیا ہے کہ جو لوگ سود کو حرام ہی نہ سمجھیں وہ کفر میں مبتلا ہیں، اور جو حرام سمجھنے کے باوجود عملاً اس میں مبتلا ہیں وہ گنہگار فاسق ہیں۔

تیسری آیت میں مؤمنین صالحین جو نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں، ان کے اَجرِ عظیم اور آخرت کی راحت کا ذکر ہے، چونکہ اس سے پہلی آیت میں سود خوروں کے لئے عذابِ جہنم اور اُن کی ذِلت و خواری کا ذِکر آیا تھا، قرآنِ کریم کے عام اُسلوب کے مطابق اس کے ساتھ ہی ایمان و عملِ صالح کے پابند نماز و زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے ثواب اور درجاتِ آخرت کا ذِکر کر دیا گیا۔

چوتھی آیت: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ کا خلاصہ یہ ہے کہ سود و رِبا کی حرمت نازل ہونے کے بعد جو سود کی بقایا رقمیں کسی کے ذمے باقی تھیں ان کا لینا دینا بھی حرام کر دیا گیا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ سود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے عام عرب میں سود کا رِواج پھیلا ہوا تھا، آیاتِ

[1] سنن ابن ماجة، ابواب التجارات، باب التغليظ في الربوا ج:۲ ص:۱۶۵ ومستدرك رقم الحديث: ۲۲۶۲

متذکرہ سے پہلی آیتوں میں اس کی ممانعت آئی تو حسبِ عادت تمام مسلمانوں نے سود کے معاملات ترک کر دیئے، لیکن کچھ لوگوں کے مطالبات سود کی بقایا رقموں کے دُوسرے لوگوں پر تھے، اسی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنی ثقیف اور بنی مخزوم کے آپس میں سودی معاملات کا سلسلہ تھا، اور بنوثقیف کے لوگوں کا کچھ سودی مطالبہ بنی مخزوم کی طرف تھا، بنومخزوم مسلمان ہوگئے تو اِسلام لانے کے بعد انہوں نے سود کی رقم ادا کرنا جائز نہ سمجھا، ادھر بنوثقیف کے لوگوں نے مطالبہ شروع کیا، کیونکہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے، مگر مسلمانوں سے مصالحت کرلی تھی، بنومخزوم کے لوگوں نے کہا کہ اِسلام میں داخل ہونے کے بعد ہم اپنی اِسلامی کمائی کو سود کی ادائیگی میں خرچ نہ کریں گے۔

یہ جھگڑا مکہ مکرمہ میں پیش آیا، اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مکہ کے امیر حضرت معاذؓ اور دُوسری روایت میں عتاب بن اُسیدؓ تھے، انہوں نے اس جھگڑے کا قضیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بغرض دریافتِ حکم لکھ بھیجا، اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اِسلام میں داخل ہونے کے بعد سود کے تمام سابقہ معاملات ختم کر دیئے جائیں، پچھلا سود بھی وصول نہ کیا جائے، صرف رأس المال وصول کیا جائے۔

یہ اِسلامی قانون رائج کیا گیا تو مسلمان تو اس کے پابند تھے ہی، جو غیرمسلم قبائل بطورِ صلح ومعاہدہ اِسلامی قانون کو قبول کر چکے تھے وہ بھی اس کے پابند ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود جب حجۃ الوداع کے خطبے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کا اِعلان کیا تو اس کا اِظہار فرمایا کہ یہ قانون کسی خاص شخص یا قوم یا مسلمانوں کے مالی مفاد کے پیشِ نظر نہیں، بلکہ پوری اِنسانیت کی تعمیر اور صلاح وفلاح کے لئے جاری کیا گیا ہے، اسی لئے ہم سب سے پہلے مسلمانوں کی بہت بڑی رقمِ سود جو غیرمسلموں کے ذمے تھی اس کو چھوڑتے ہیں تو اَب ان کو بھی اپنے بقایا سود کی رقم چھوڑنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے، چنانچہ اس خطبے میں اِرشاد فرمایا:-

اَلَا اِنَّ كُلَّ رِبًا كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ عَنْكُمْ كُلُّهٗ لَكُمْ رُؤُسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ وَاَوَّلُ رِبًا مَوْضُوْعٌ رِبَا الْعَبَّاسِ ابْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ كُلُّهٗ۔ [1] (ابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم)

''یعنی زمانۂ جاہلیت میں جو سودی معاملات کئے گئے، سب کا سود چھوڑ دِیا گیا، اَب ہر شخص کو اَصل رقم ملے گی، سود کی زائد رقم نہ ملے گی، نہ تم زیادتی وصول کر کے کسی پر ظلم کرسکو گے اور نہ کوئی اصل رأس المال میں کمی کر کے تم پر ظلم کرسکے گا، اور سب سے پہلے جو سود چھوڑا تھا وہ عباسؓ بن عبدالمطلب کا سود ہے، جس کی بہت بھاری رقمیں غیرمسلموں کے ذمہ بطورِ سود کے عائد ہوتی تھیں۔'' قرآن مجید کی آیتِ متذکرہ میں اسی واقعہ کی طرف اِشارہ اور بقایا سود چھوڑنے کا حکم مذکور ہے۔

[1] تفسیر ابن کثیر ج:۱ ص:۲۵۳، رقم الحدیث:۱۲۸۴، تحت ھٰذہ الآیۃ۔

اس آیت کو شروع اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو خطاب کر کے اوّل اِتَّقُوا اللّٰهَ کا حکم سنایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کے بعد اصل مسئلہ کا حکم بتلایا گیا، یہ قرآن حکیم کا وہ خاص طرز ہے جس میں وہ دُنیا بھر کے قانون کی کتابوں سے ممتاز ہے، کہ جب کوئی ایسا قانون بنایا جاتا ہے جس پر عمل کرنے میں لوگوں کو کچھ دُشواری معلوم ہو تو اس کے آگے پیچھے خدا تعالیٰ کے سامنے پیشیٔ اعمال کے حساب اور آخرت کے عذاب وثواب کا ذِکر کر کے مسلمانوں کے دِلوں اور ذہنوں کو اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے، اس کے بعد حکم سنایا جاتا ہے۔ یہاں بھی پچھلے عائد شدہ سود کی رقم کا چھوڑ دینا اِنسانی طبیعت پر بار ہوسکتا تھا، اس لئے پہلے اِتَّقُوا اللّٰهَ فرمایا، اس کے بعد حکم دیا: وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا یعنی چھوڑ دو بقایا سود کو، آیت کے آخر میں فرمایا: اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ یعنی اگر تم اِیمان والے ہو، اس میں اشارہ کر دیا کہ اِیمان کا تقاضا یہ ہے کہ حکم خداوندی کی اِطاعت کی جائے، اس کی خلاف ورزی اِیمان کے منافی ہے، یہ حکم چونکہ طبائع پر بھاری تھا، اس لئے حکم سے پہلے اِتَّقُوا اللّٰهَ اور حکم کے بعد اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ کے اِرشادات ملا دیئے گئے۔

اس کے بعد پانچویں آیت میں اس حکم کی مخالفت کرنے والوں کو سخت وعید سنائی گئی جس کا مضمون یہ ہے کہ اگر تم نے سود کو نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے اِعلانِ جنگ سن لو۔ یہ وعید شدید ایسی ہے کہ کفر کے سوا اور کسی بڑے سے بڑے گناہ پر قرآن میں ایسی وعید نہیں آئی، پھر اس آیت کے آخر میں اِرشاد فرمایا ہے:-

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ یعنی ''اگر تم توبہ کرلو اور آئندہ کے لئے سود کی بقایا رقم چھوڑنے کا عزم کرلو تو تمہیں تمہارے اصل رأس المال مل جائیں گے، نہ تم اصل رأس المال سے زائد حاصل کر کے کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ کوئی اصل رأس المال میں کمی یا دیر کر کے تم پر ظلم کرنے پائے گا۔'' اس میں اصل رأس المال دینے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ تم توبہ کرلو اور آئندہ کو سود چھوڑنے کا عزم کرلو، تب اصل رأس المال ملے گا۔

اس سے بظاہر اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اگر سود چھوڑنے کا عزم کر کے توبہ نہ کی تو اصل رأس المال بھی نہ ملے گا۔ سو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مسلمان ہو جانے کے باوجود سود کو حرام ہی نہ سمجھے، اس لئے سود چھوڑنے کے لئے توبہ نہیں کرتا تب تو یہ شخص اِسلام سے خارج اور مرتد ہو گیا، جس کا حکم یہ ہے کہ مرتد کا مال اس کی مِلک سے نکل جاتا ہے، پھر جو زمانۂ اِسلام کی کمائی ہے وہ اس کے مسلمان وارثوں کو مل جاتی ہے، اور جو کفر کے بعد کی کمائی ہے تو وہ بیت المال میں جمع کر دی جاتی ہے، اس لئے سود سے توبہ نہ کرنا اگر حلال سمجھنے کی بنا پر ہو تو اس کو اَصل رأس المال بھی نہ ملے گا، اور اگر حلال تو نہیں سمجھتا مگر عملاً باز نہیں آتا اور اس کے ساتھ جتھہ بنا کر حکومتِ اِسلامیہ کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ باغی ہے، اس کا بھی سب مال ضبط کر کے بیت المال میں امانت رکھا جاتا ہے، کہ جب یہ توبہ کرلے تب اس کا مال اس کو واپس دے دیا جائے۔ شاید اس قسم کی جزئیات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بصورتِ شرط فرمایا گیا: وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ یعنی اگر تم توبہ نہ

کرو گے تو تمہارے رأس المال بھی ضبط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد چھٹی آیت میں سودخوری کی اِنسانیت سوز حرکت کے بالمقابل پاکیزہ اخلاق اور غریبوں اور ناداروں کے ساتھ مساہلت کے سلوک کی تعلیم دی جاتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ، یعنی '' اگر تمہارا مدیون تنگ دست ہو، تمہارا قرض ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک مہلت دی جائے، اور اگر تم اس کو اپنا قرض معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔''

سودخوروں کی عادت تو یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مدیون مفلس ہے اور میعادِ مقررہ پر وہ قرض ادا نہیں کر سکتا تو سود کی رقم اصل میں جمع کر کے سود دَر سود کا سلسلہ چلاتے ہیں، اور سود کی مقدار بھی اور بڑھا دیتے ہیں۔

یہاں احکم الحاکمین نے یہ قانون بنادیا کہ اگر کوئی مدیونِ واقعی مفلس ہے، ادائے قرض پر قادر نہیں تو اس کو تنگ کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کو اس وقت تک مہلت دینی چاہئے جب تک کہ وہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو جائے، ساتھ ہی اس کی ترغیب بھی دے دی کہ اس غریب کو اپنا قرض معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

یہاں معاف کرنے کو قرآن نے بلفظ '' صدقہ '' تعبیر فرمایا ہے، جس میں اِشارہ ہے کہ یہ معافی تمہارے لئے بحکمِ صدقہ ہو کر موجبِ ثوابِ عظیم ہوگی۔ نیز یہ جو فرمایا کہ معاف کر دینا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، حالانکہ بظاہر تو ان کے لئے نقصان کا سبب ہے کہ سود تو چھوڑا ہی تھا، اصل رأس المال بھی گیا، مگر قرآن نے اس کو بہتر فرمایا، اس کی دو وجہ ہیں، اوّل تو یہ کہ یہ بہتری اس دُنیا کی چندروزہ زندگی کے بعد مشاہدہ میں آجائے گی، جبکہ اس حقیر مال کے بدلہ میں جنت کی دائمی نعمتیں اس کو ملیں گی۔

دُوسرے شاید اس میں اس طرف بھی اِشارہ ہو کہ دُنیا میں بھی تمہیں اس عمل کی بہتری کا مشاہدہ ہو جائے گا کہ تمہارے مال میں برکت ہوگی۔ '' برکت '' کی حقیقت یہ ہے کہ تھوڑے مال میں کام بہت نکل جائیں، یہ ضروری نہیں کہ مال کی مقدار یا تعداد بڑھ جائے، سو یہ مشاہدہ ہے کہ صدقہ خیرات کرنے والوں کے مال میں بے شمار برکت ہوتی ہے، ان کے تھوڑے مال سے اتنے کام نکل جاتے ہیں کہ حرام مال والوں کے بڑے بڑے اموال سے وہ کام نہیں نکلتے۔

اور جس مال میں بے برکتی ہوتی ہے اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لئے خرچ کرتا ہے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، یا غیر مقصود چیزوں میں مثلاً دوا، علاج اور ڈاکٹروں کی فیسوں میں ایسے مال داروں کی بڑی بڑی رقمیں خرچ ہو جاتی ہیں، جس کا غریبوں کو کبھی سابقہ نہیں پڑتا، اوّل تو اللہ تعالیٰ ان کو تندرستی کی نعمت عطا فرماتے ہیں، کہ علاج میں کچھ خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے، اور اگر کبھی بیماری آئی بھی تو معمولی اخراجات سے تندرستی حاصل ہو جاتی ہے، اس لحاظ سے مدیونِ مفلس کو قرض معاف کر دینا جو بظاہر اس کے لئے نقصان دہ نظر آتا تھا، اس قرآنی تعلیم کے پیشِ نظر وہ ایک مفید و نافع کام بن گیا۔

مدیونِ مفلس کے ساتھ نرمی ومساہلت کی تعلیم کے لئے اَحادیثِ صحیحہ میں جو اِرشادات وارِد ہوئے ہیں، ان کے چند جملے سنئے۔ طبرانی کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے سر پر اس روز اللہ کی رحمت کا سایہ ہو جبکہ اس کے سوا کسی کو کوئی سایہ سر چھپانے کے لئے نہ ملے گا، تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مقروض کے ساتھ نرمی اور مساہلت کا معاملہ کرے، یا اس کو معاف کردے۔ [1]

اسی مضمون کی حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے، [2] اور مسندِ احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی مفلس مدیون کو مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اتنی رقم کے صدقہ کا ثواب ملے گا جتنی اس مدیون کے ذمہ واجب ہے، اور یہ حساب میعادِ قرض پورا ہونے سے پہلے مہلت دینے کا ہے، اور جب میعادِ قرض پوری ہوجائے اور وہ شخص ادا کرنے پر قادر نہ ہو اس وقت اگر کوئی مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اس کی دُگنی رقم صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔ [3]

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی دُعا قبول ہو، یا اس کی مصیبت دُور ہو تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مدیون کو مہلت دیدے۔ [4]

اس کے بعد آخری آیت میں پھر روزِ قیامت کا خوف اور محشر کے حساب کتاب اور ثواب عذاب کے ذِکر پر اَحکامِ سود کی آیات کو ختم کیا، اِرشاد فرمایا:-

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ یعنی ''ڈرو اس روز سے جس میں تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اپنے اپنے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت نزول کے اِعتبار سے سب سے آخری آیت ہے، اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اس کے اِکتیس روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، اور بعض روایات میں صرف نو دِن بعد وفات ہونا مذکور ہے۔

یہاں تک رِبا کے اَحکام سے متعلقہ سورۂ بقرہ کی آیات کی تفسیر آئی ہے، رِبا کی حرمت وممانعت پر قرآنِ کریم میں سورۂ بقرہ میں مذکورہ سات آیتیں اور سورۂ آلِ عمران میں ایک آیت، سورۂ نساء میں دو آیتیں آئی ہیں، اور ایک آیت سورۂ رُوم میں بھی ہے، جس کی تفسیر میں اِختلاف ہے، بعض حضرات نے اس کو بھی سود بیاج کے مفہوم پر محمول کیا ہے، بعض نے

---

[1] المعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث: ۸۹۴

[2] صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب فضل إنظار المعسر ...إلخ ج:۲ ص:۱۸

[3] مسند احمد رقم الحدیث: ۲۱۹۶۸

[4] مسند احمد رقم الحدیث: ۴۵۱۹

دُوسری تفسیر بیان کی ہے، اس طرح قرآنِ حکیم کی دس آیتیں ہیں، جن میں سود و رِبا کے اَحکام مذکور ہیں۔

سود کی پوری حقیقت بتلانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن باقی آیات کا ترجمہ اور تفسیر بھی اسی جگہ لکھ دی جائے جو سورۂ آلِ عمران اور سورۂ نساء اور سورۂ رُوم میں آئی ہیں، تاکہ تمام آیات یکجا ہو کر رِبا کی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہو۔

آل عمران کے تیرہویں رُکوع کی ایک سوتیسویں آیت یہ ہے:-

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۳۰ (آل عمران)

''یعنی اے اِیمان والو! سود مت کھاؤ حصے سے زائد، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اُمید ہے کہ تم کامیاب ہو۔''

اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے کہ جاہلیتِ عرب میں سودخوری کا عام طور پر یہ طریق تھا کہ ایک خاص میعادِ معین کے لئے اُدھار سود پر دِیا جاتا تھا، اور جب وہ میعاد آگئی اور قرض دار اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہوا تو اس کو مزید مہلت اس شرط پر دِی جاتی تھی کہ سود کی مقدار بڑھادی جائے، اسی طرح دُوسری میعاد پر بھی ادائیگی نہ ہوئی تو سود کی مقدار اور بڑھادی، یہ واقعہ عام کتبِ تفسیر میں بالخصوص لباب النقول میں بروایت مجاہدؒ مذکور ہے۔

جاہلیتِ عرب کی اس ملت کش رسم کو مٹانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، اسی لئے اس آیت میں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آل عمران:۱۳۰) (یعنی کئی حصے زائد) فرما کر ان کے مروّجہ طریقہ کی مذمت اور ملت کشی وخودغرضی پر تنبیہ فرما کر اس کو حرام قرار دِیا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اضعاف ومضاعف نہ ہو تو حرام نہیں، کیونکہ سورۂ بقرہ اور نساء میں مطلقاً رِبا کی حرمت صاف صاف مذکور ہے، اضعاف مضاعف ہو یا نہ ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے قرآنِ کریم میں جابجا فرمایا گیا ہے: لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا یعنی ''میری آیتوں کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت مت لو۔'' اس میں ''تھوڑی سی قیمت'' اس لئے فرمایا کہ آیاتِ اِلٰہیہ کے بدلے میں اگر ہفت اِقلیم کی سلطنت بھی لے لے تو وہ بھی تھوڑی ہی قیمت ہوگی، اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کی آیات کے بدلے میں تھوڑی قیمت لینا تو حرام ہے اور زیادہ لینا جائز۔ اسی طرح اس آیت میں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آل عمران:۱۳۰) کا لفظ ان کے شرمناک طریقے پر فکر کرنے کے لئے لایا گیا، حرمت کی شرط نہیں۔

اور اگر سود کے مروّجہ طریقوں پر غور کیا جائے تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب سودخوری کی عادت پڑ جائے تو پھر وہ سود تنہا سود ہی نہیں رہتا بلکہ لازماً اضعاف مضاعف ہوجاتا ہے، کیونکہ جو رقم سود سے حاصل ہوکر سودخور کے مال میں شامل ہوئی تو اَب اس سود کی زائد رقم کو بھی سود پر چلائے گا تو سود مضاعف ہوجائے گا، اور یہی سلسلہ آگے چلا تو اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آل عمران:۱۳۰) ہوجائے گا، اس طرح سود اَضعاف مضاعفہ بن کر رہے گا۔

اور سورۂ نساء میں دو آیتیں سود کے متعلق یہ ہیں:-

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۝۱۶۰ وَّاَخْذِهِمُ

الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾ (النساء)

''یعنی یہود کے انہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو اُن کے لئے حلال تھیں اُن پر حرام کردیں، اور بسبب اس کے کہ وہ بہت آدمیوں کو رُشد کی راہ سے مانع بن جاتے تھے، اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیا کرتے تھے، حالانکہ ان کو ان سے ممانعت کی گئی تھی، اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھا جاتے تھے، اور ہم نے ان لوگوں کے لئے جو اُن میں کافر ہیں دردناک سزا کا سامان مقرر کر رکھا ہے۔''

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ شریعتِ موسویہ میں بھی سود حرام تھا، اور یہود نے جب اس کی مخالفت کی تو دُنیا میں بھی اُن کو یہ مناسب سزا دی گئی کہ انہوں نے حرصِ دُنیا کی خاطر حرام کھانا شروع کردیا، تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر بعض حلال چیزیں بھی حرام فرمادیں۔

اور سورۂ رُوم کے چوتھے رُکوع کی اُنتالیسویں آیت میں ہے:-

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾ (الروم)

''یعنی جو چیز تم اس لئے دوگے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہوجائے تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، اور جو زکوٰۃ دوگے جس سے اللہ کی رضا مطلوب ہو تو ایسے لوگ خدا کے پاس بڑھاتے رہیں گے۔''

بعض حضراتِ مفسرین نے لفظ ''رِبا'' اور ''زیادتی'' پر نظر کرکے اس آیت کو بھی سود بیاج پر محمول فرمایا ہے، اور یہ تفسیر فرمائی ہے کہ سود بیاج کے لینے میں اگرچہ بظاہر مال کی زیادتی نظر آتی ہے، مگر درحقیقت وہ زیادتی نہیں، جیسے کسی شخص کے بدن پر ورم ہوجائے تو بظاہر وہ اس کے جسم میں زیادتی ہے، لیکن کوئی عقل مند اس کو زیادتی سمجھ کر خوش نہیں ہوتا، بلکہ اس کو ہلاکت کا مقدمہ سمجھتا ہے، اس کے بالمقابل زکوٰۃ وصدقات دینے میں اگرچہ بظاہر مال میں کمی آتی ہے، مگر درحقیقت وہ کمی نہیں بلکہ ہزاروں زیادتیوں کا موجب ہے، جیسے کوئی شخص مادّۂ فاسدہ کے اِخراج کے لئے مسہل لیتا ہے، یا فصد کھلوا کر خون نکلواتا ہے، تو بظاہر وہ کمزور نظر آتا ہے اور اس کے بدن میں کمی محسوس ہوتی ہے، مگر جاننے والوں کی نظر میں یہ کمی اس کی زیادتی اور قوّت کا پیش خیمہ ہے۔

اور بعض علمائے تفسیر نے اس آیت کو سود بیاج کی ممانعت پر محمول ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ

جو شخص کسی کو اپنا مال اِخلاص و نیک نیتی سے نہیں، بلکہ اس نیت سے دے کہ میں اس کو یہ چیز دُوں گا تو وہ مجھے اس کے بدلہ میں اس سے زیادہ دے گا، جیسے بہت سی برادریوں میں ''نوتا'' کی رسم ہے کہ وہ ہدیہ کے طور پر نہیں بلکہ بدلہ لینے کی غرض سے دی جاتی ہے، یہ دینا چونکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی غرض کے لئے ہے اس لئے آیت میں فرمایا کہ اس طرح اگرچہ ظاہر میں مال بڑھ جائے مگر وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، ہاں جو زکوٰۃ صدقات اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے دیئے جائیں ان میں اگرچہ بظاہر مال گھٹتا ہے، مگر اللہ کے نزدیک وہ دوگنا اور چوگنا ہوتا جاتا ہے۔

اس تفسیر پر آیتِ مذکورہ کا وہ مضمون ہوجائے گا جو دُوسری ایک آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے اِرشاد فرمایا ہے: وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ (المدثر) یعنی ''آپ کسی پر اِحسان اس نیت سے نہ کریں کہ اس کے بدلہ میں کچھ مال کی زیادتی آپ کو حاصل ہوجائے گی۔''

اور سورۂ رُوم کی اس آیت میں بظاہر یہ دُوسری تفسیر ہی راجح معلوم ہوتی ہے، اوّل تو اس لئے کہ سورۂ رُوم مکی ہے، جس کے لئے اگرچہ ضروری نہیں کہ اس کی ہر آیت مکی ہو، مگر غالب گمان مکی ہونے کا ضرور ہے جب تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملے، اور آیت کے مکی ہونے کی صورت میں اس کو حرمتِ سود کے مفہوم پر اس لئے محمول نہیں کیا جاسکتا کہ حرمتِ سود مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اس کے علاوہ اس آیت سے پہلے جو مضمون آیا ہے اس سے بھی دُوسری تفسیر ہی کا رُجحان معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سے پہلے اِرشاد ہے:-

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۡ (الروم:۳۸) ''قرابت دار کو اس کا حق دِیا کرو اور مسکین کو اور مسافر کو بھی، یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں۔''

اس آیت میں رشتہ داروں اور مساکین اور مسافروں پر خرچ کرنے کے ثواب ہونے کے لئے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں نیت اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی ہو، تو اس کے بعد والی آیتِ مذکورہ میں اس کی توضیح اس طرح کی گئی کہ اگر مال کسی کو اس غرض سے دیا جائے کہ اس کا بدلہ اس کی طرف سے زیادہ ملے گا تو یہ رضاجوئی حق تعالیٰ کے لئے خرچ نہ ہوا اس لئے اس کا ثواب نہ ملے گا۔

بہرحال ممانعتِ سود کے مسئلے میں اس آیت کو چھوڑ کر بھی مذکورۃ الصدر بہت سی آیتیں آئی ہیں، جن میں سے سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت[1] میں اَضعاف مضاعف سود کی حرمت بیان کی گئی ہے، اور باقی سب آیتوں میں مطلق سود کی حرمت کا بیان ہے، اس تفصیل سے یہ تو واضح ہوگیا کہ سود خواہ اَضعاف مضاعف اور سود دَر سود ہو یا اِکہرا سود، بہرحال حرام ہے، اور حرام بھی ایسا شدید کہ اس کی مخالفت کرنے پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اِعلانِ جنگ سنایا گیا ہے۔

[1] آیت نمبر: ۱۳۰

مسئلہ سود و رِبا کی کچھ مزید تشریح و تفصیل

آج کل رِبا چونکہ نظامِ تجارت کا رُکنِ اعظم اور عمود بن گیا ہے، اس لئے جب کتاب وسنت کی آیات و روایات میں اس کی حرمت وممانعت سامنے آتی ہے تو عام طبائع اس کی حقیقت کو سمجھنے سمجھانے کے وقت اس کی حرمت سے ہچکچاتی ہیں، اور حیلہ جوئی کی طرف مائل ہوتی ہیں، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ بحث کا تجزیہ کر کے اس کے ہر پہلو پر علیحدہ علیحدہ غور وفکر کرنا چاہئے، خلط ملط کرنے کا نتیجہ بحث کے اُلجھنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، یہاں بحث کے تین حصے ہیں:-

اوّل یہ کہ قرآن وسنت میں ''رِبا'' کی کیا حقیقت ہے اور وہ کن کن صورتوں پر حاوی ہے؟

دُوسرے یہ کہ اس رِبا کی حرمت وممانعت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے؟

تیسرے یہ کہ سود و رِبا کتنا ہی برا سہی، لیکن آج کل کی دُنیا میں وہ نظامِ معاشیات وتجارت کا رُکنِ اعظم بن چکا ہے، اگر قرآنی اَحکام کے ماتحت اس کو چھوڑ دیا جائے تو نظامِ بینک وتجارت کیسے چلے گا؟

اصل ''رِبا'' کی تعریف میں کبھی کوئی اِبہام نہیں رہا، ایک مغالطہ کا جواب

اب سنئے کہ لفظ ''رِبٰوا'' عربی زبان کا معروف لفظ ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزولِ قرآن سے قبل جاہلیتِ عرب میں بھی یہ لفظ متعارف تھا، اور نہ صرف متعارف بلکہ رِبا کا لین دین عام طور پر جاری تھا، بلکہ سورۂ نساء کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ''رِبا'' کا لفظ اور اس کے معاملات زمانۂ توراۃ میں بھی معروف تھے، اور توراۃ میں بھی اس کو حرام قرار دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسا لفظ جو زمانۂ قدیم سے عرب اور اس کے قرب وجوار میں معروف چلا آتا ہے اور اس پر لین دین کا رِواج چل رہا ہے، اور قرآن اس کی حرمت وممانعت بیان کرنے کے ساتھ یہ خبر بھی دیتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی اُمت پر بھی سود و رِبا حرام کیا گیا تھا، اس لفظ کی حقیقت کوئی ایسی مبہم چیز نہیں ہوسکتی جس کے سمجھنے سمجھانے میں دُشواریاں پیش آئیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب ۸ھ میں سورۂ بقرہ کی آیات رِبا کی حرمت کے متعلق نازل ہوئیں تو صحابہ کرامؓ سے کہیں منقول نہیں کہ ان کو لفظِ ''رِبا'' کی حقیقت سمجھنے میں کوئی اِشتباہ پیش آیا ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دُوسرے معاملات کی طرح اس کی تحقیق کی نوبت آئی ہو، بلکہ جس طرح شراب کی حرمت نازل ہوتے ہی صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل کیا، اسی طرح رِبا کی حرمت نازل ہوتے ہی رِبا کے سب معاملات ترک کردیئے، پچھلے زمانہ کے معاملات میں مسلمانوں کو جو رِبا غیر مسلموں کے ذمہ واجب الادا تھا، وہ بھی مسلمانوں نے چھوڑ دیا، اور جو غیر مسلموں کا مسلمانوں کے ذمہ واجب الادا تھا،

اور مسلمان نزولِ ممانعت کے بعد اس کو دینا نہیں چاہتے تھے اس کا جھگڑا امیرِ مکہ کی عدالت میں پیش ہوا، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دریافت کیا، تو اس کا فیصلہ سورۂ بقرہ کی آیات میں آسمان سے نازل ہوا کہ پچھلے زمانے کے بقایا رِبا کا لین دین بھی اب جائز نہیں۔

اور اس میں چونکہ غیر مسلموں کو یہ شکایت کا موقع مل سکتا تھا کہ ایک اسلامی حکمِ شرعی کی وجہ سے ہمارا روپیہ کیوں مارا جائے تو اس کے اِزالہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ واضح کر دیا کہ اس حکمِ شرعی کا اثر صرف غیر مسلموں پر نہیں، بلکہ مسلمانوں پر بھی یکساں ہے، اور سب سے پہلے جو سود کی رقم چھوڑی گئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمِ محترم حضرت عباسؓ کی کثیر التعداد رقم تھی۔

الغرض رِبا کی ممانعت ہونے کے وقت رِبا کا مفہوم کچھ مخفی نہ تھا، عام طور پر معروف تھا، وہی رِبا جس کو عرب رِبا کہتے تھے اور اس کا لین دین کرتے تھے، قرآن نے حرام کیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صرف اخلاقی انداز میں نہیں، بلکہ قانونِ ملک کی حیثیت سے نافذ فرمایا، البتہ بعض ایسی صورتوں کو بھی آپ نے رِبا میں شامل قرار دِیا جس کو عام طور پر رِبا نہیں سمجھا جاتا تھا، اِنہیں صورتوں کی تعیین میں حضرت فاروقِ اعظمؓ کو اِشکال پیش آیا، اور انہی میں اَئمہ مجتہدین کے نظریات میں اِختلاف ہوا، ورنہ اصل رِبا جس کو عرب رِبا کہتے تھے نہ اس میں کسی کو اِشتباہ کا موقع تھا، نہ اس میں کسی کا اِختلاف ہوا۔

اب سنئے عرب کا مروّجہ رِبا کیا تھا؟ اِمامِ تفسیر ابن جریرؒ نے حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ جو رِبا جاہلیت میں جاری تھا، اور قرآن نے اس سے منع کیا وہ یہ تھا کہ کسی کو ایک میعادِ معین کے لئے قرض دے کر اس پر اَصل رأس المال سے زائد مقررہ زیادتی لیتے تھے، اور اگر میعادِ مقررہ پر وہ قرض ادا نہ کر سکا تو مزید میعاد اس شرط پر بڑھا دیتے تھے کہ سود میں اِضافہ کیا جائے، یہی مضمون حضرت قتادہؒ اور دُوسرے حضرات اَئمہ تفسیر سے نقل کیا ہے۔ (تفسیر ابن جریر ج:۳ ص:۶۲)

اندلس کے مشہور اِمامِ تفسیر ابوحیان غرناطی کی تفسیر ''بحرِ محیط'' میں بھی جاہلیت کے رِبا کی یہی صورت لکھی ہے کہ اُدھار دے کر اس پر نفع لیتے اور جتنی مدت اُدھار کی بڑھ جائے اتنا ہی سود اس پر بڑھا دینے کا نام رِبا تھا، اسی جاہلیتِ عرب کے لوگ یہ کہتے تھے کہ جیسے بیع وشراء میں نفع لینا جائز ہے، اسی طرح اپنا روپیہ اُدھار دے کر نفع لینا بھی جائز ہونا چاہئے، قرآنِ کریم نے اس کو حرام قرار دِیا، اور بیع و رِبا کے اَحکام کا مختلف ہونا واضح فرمایا۔

یہی مضمون تمام مستند کتبِ تفسیر ابنِ کثیر، تفسیر کبیر اور رُوح المعانی وغیرہ میں معتبر روایات کے ساتھ منقول ہے۔ [1]

ابنِ عربی نے ''اَحکام القرآن'' میں فرمایا: "اَلرِّبٰوا فِی اللُّغَةِ الزِّيَادَةُ وَالْمُرَادُ بِهٖ فِی الْاٰيَةِ كُلُّ زِيَادَةٍ لَا

[1] تفسیر البحر المحیط تحت هذه الآية ج:۳ ص:۸۵ و تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج:۱ ص:۷۰۹، ۷۱۰

يُقَابِلُهَا عِوَضٌ" (ج:۲ ص:۱۰۱) یعنی رِبا کے معنی اصل لغت میں زیادتی کے ہیں، اور آیت میں اس سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو، بلکہ محض اُدھار اور اس کی میعاد ہو۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ رِبا کی دو قسمیں ہیں، ایک معاملاتِ بیع و شراء کے اندر رِبا، دُوسرے اُدھار کا رِبا، اور جاہلیتِ عرب میں دُوسری قسم ہی رائج اور معروف تھی کہ وہ اپنا مال کسی کو معین میعاد کے لئے دیتے تھے، اور ہر مہینہ اس کا نفع لیتے تھے، اور اگر میعادِ معین پر ادائیگی نہ کر سکا، تو میعاد اور بڑھادی جاتی تھی، بشرطیکہ وہ سود کی رقم اور بڑھادیتے، یہی جاہلیت کا رِبا تھا جس کو قرآن نے حرام کیا۔

اِمام جصّاصؒ نے ''اَحکام القرآن'' میں رِبا کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں:-

هُوَ الْقَرْضُ الْمَشْرُوْطُ فِيْهِ الْاَجَلُ وَزِيَادَةُ مَالٍ عَلَى الْمُسْتَقْرِضِ۔ [۱]

''یعنی وہ قرض ہے جس میں کسی میعاد کے لئے اس شرط پر قرض دیا جائے کہ قرض دار اس کو اصل مال سے زائد کچھ رقم ادا کرے گا۔''

حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رِبا کی تعریف یہ فرمائی ہے:-

كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبًا۔ [۲] ''یعنی جو قرض نفع حاصل کرے وہ رِبا ہے۔''

یہ حدیث جامع صغیر میں ہے اور عزیزی نے اس کو ''حسن'' کہا ہے۔ [۳]

خلاصہ یہ ہے کہ اُدھار دے کر اس پر نفع لینے کا نام رِبا ہے جو جاہلیتِ عرب کے زمانے میں رائج اور معروف تھا، جس کو قرآنِ کریم کی آیتِ مذکورہ نے صراحۃً حرام قرار دیا، اور ان آیات کے نازل ہوتے ہی صحابہ کرامؓ نے اس کو چھوڑ دیا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی خصومات میں اس کو نافذ فرمایا، اس میں نہ کوئی اِبہام تھا نہ اِجمال، نہ اس میں کسی کو کوئی اِشتباہ و اِشکال پیش آیا۔

البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رِبا کے مفہوم میں بیع و شراء کی چند صورتوں کو بھی داخل فرمایا جن کو عرب رِبا نہ سمجھتے تھے، مثلاً چھ چیزوں کی بیع و شراء میں یہ حکم دیا کہ اگر ان کا تبادلہ کیا جائے تو برابر سرابر ہونا چاہئے، اور نقد دست بدست ہونا چاہئے، اس میں کمی بیشی کی گئی یا اُدھار کیا گیا تو وہ بھی رِبا ہے، یہ چھ چیزیں: سونا، چاندی، گیہوں، جَو، کھجور اور نمک ہیں۔

اسی اُصول کے ماتحت عرب میں معاملات کی جو چند صورتیں مزابنہ [۴] اور محاقلہ کے نام سے رائج تھیں آیاتِ رِبا

---

[۱] احکام القرآن للجصّاص، باب البیع ج:۱ ص:۴۶۹

[۲] کنز العمال رقم الحدیث:۱۵۵۱۶، سبل السلام رقم الحدیث:۸۱۲

[۳] الجامع الصغیر ج:۳ ص:۱۲۹۰ رقم الحدیث:۶۳۳۶

[۴] "مزابنہ" یہ ہے کہ درخت پر لگے ہوئے پھل کو ٹوٹے ہوئے پھلوں کے بدلے میں اندازے سے فروخت کیا جائے، اور "محاقلہ" یہ کہ کھڑے کھیت کے غلہ گندم، چنا وغیرہ کو خشک صاف کئے ہوئے غلہ گندم یا چنے سے اندازہ لگا کر فروخت کیا جائے، اندازے میں چونکہ کمی بیشی کا اِمکان رہتا ہے اس لئے اس کو منع کیا گیا۔ ۱۲ منہ

نازل ہونے کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رِبا میں شامل قرار دے کر منع فرمایا۔ (ابن کثیر بحوالہ مستدرک حاکم ج:۱ ص:۳۲۷)

اس میں یہ بات قابلِ غور تھی کہ ان چھ چیزوں کی خصوصیت ہے یا اُن کے علاوہ اور بھی کچھ چیزیں ان کے حکم میں ہیں، اور اگر ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے، کس کس صورت کو داخلِ رِبا سمجھا جائے، یہی اِشکال حضرت فاروقِ اعظمؓ کو پیش آیا، جس کی بنا پر فرمایا:-

إِنَّ آيَةَ الرِّبٰوا مِنْ آخِرِ مَا نَزَلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَاَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُبِضَ قَبْلَ اَنْ يُّبَيِّنَهٗ لَنَا فَدَعُوا الرِّبٰوا وَالرِّيْبَةَ۔ (احکام القرآن، جصاص ص:۵۵۱ [1] وتفسیر ابن کثیر بحوالہ ابن ماجہ ج:۱ ص:۳۲۸)

''یعنی آیتِ رِبا قرآن کی آخری آیتوں میں ہے، اس کی پوری تفصیلات بیان فرمانے سے پہلے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، اس لئے اب اِحتیاط لازم ہے، رِبا کو تو چھوڑنا ہی ہے، جس صورت میں رِبا کا شبہ بھی ہو اس کو بھی چھوڑ دینا چاہئے۔''

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی مراد معاملاتِ بیع وشراء کی وہ صورتیں اور ان کی تفصیلات ہیں جو جاہلیتِ عرب میں رِبا نہیں سمجھی جاتی تھیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رِبا میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، باقی اصل رِبا جو تمام عرب میں معروف ومشہور تھا اور صحابہ کرامؓ نے اس کو چھوڑا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا قانون نافذ فرمایا، اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس کا اِعلان کیا، اس میں فاروقِ اعظمؓ کو کوئی اِشکال یا اِشتباہ ہونے کا کوئی اِمکان نہیں، پھر جب فاروقِ اعظمؓ کو رِبا کی جن خاص صورتوں میں اِشتباہ پیش آیا تو اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ جن صورتوں میں رِبا کا شبہ بھی ہو ان کو بھی چھوڑ دیا جائے۔

مگر حیرت ہے کہ آج بعض وہ لوگ جو یورپ کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور دولت مندی اور موجودہ نظامِ تجارت وغیرہ میں سود کے رُکن بن جانے سے مرعوب ہیں، انہوں نے فاروقِ اعظمؓ کے اس اِرشاد کا یہ نتیجہ نکالا کہ ''رِبا کا مفہوم ہی مجمل رہ گیا تھا، اس لئے اس میں رائے کی گنجائش ہے'' جس کے غلط ہونے کا کافی مواد سامنے آچکا ہے، ''اَحکام القرآن'' میں ابنِ عربیؒ نے ان لوگوں پر سخت اِنکار کیا ہے جنھوں نے اس فاروقی اِرشاد کی بنا پر آیاتِ رِبا کو مجمل کہا تھا۔

ابنِ عربیؒ نے ''اَحکام القرآن'' میں فرمایا:-

إِنَّ مَنْ زَعَمَ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ مُجْمَلَةٌ فَلَمْ يَفْهَمْ مَقَاطِعَ الشَّرِيْعَةِ فَإِنَّ اللهَ تَعَالٰى اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ

[1] باب الربا ج:۱ ص:۴۶۴

إِلٰى قَوْمٍ هُوَ مِنْهُمْ بِلُغَتِهِمْ وَاَنْزَلَ عَلَيْهِ كِتَابَهٗ تَيْسِيْرًا مِّنْهُ بِلِسَانِهٖ وَلِسَانِهِمْ وَالرِّبَا فِي اللُّغَةِ الرِّبَاوَةُ وَالْمُرَادُ بِهٖ فِي الْاٰيَةِ كُلُّ زِيَادَةٍ لَا يُقَابِلُهَا عِوَضٌ۔ [۱]

''یعنی جس نے یہ کہا کہ یہ آیت مجمل ہے، اس نے شریعت کی تصریحات کو نہیں سمجھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسی قوم کی طرف بھیجا کہ وہ خود اسی قوم میں سے تھے، انہی کی زبان میں بھیجا، اُن پر اپنی کتاب آسانی کے لئے انہی کی زبان میں نازل فرمائی، اور لفظِ رِبا کے معنی ان کی زبان میں زیادتی کے ہیں، اور مراد آیت میں وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں مال نہیں بلکہ میعاد ہے۔''

اور اِمام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ رِبا کی دو قسمیں ہیں، ایک اُدھار کا روبار، دُوسرے نقد بیع میں زیادہ لینے کا رِبا، پہلی قسم وہ ہے جو زمانۂ جاہلیت میں مشہور و معروف تھی اور اہلِ جاہلیت اس کا لین دین کرتے تھے، اور دُوسری قسم وہ ہے جو حدیث نے بیان کی کہ فلاں فلاں چیزوں کی بیع و شراء میں کمی زیادتی رِبا میں داخل ہے۔ [۲]

اور اَحکام القرآن جصّاص میں ہے کہ رِبا کی دو قسمیں ہیں، ایک بیع و شراء کے اندر، دُوسری بغیر بیع و شراء کے، اور زمانۂ جاہلیت کا رِبا یہی دُوسری قسم کا تھا، اور اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ قرض جس میں بحساب میعاد کوئی نفع لیا جائے۔ [۳] اور یہی مضمون ابنِ رُشد نے ''بدایۃ المجتھد'' میں لکھا ہے، اور قرض اُدھار پر نفع لینے کے رِبا کا حرام ہونا قرآن، سنت اور اجماعِ اُمت سے ثابت کیا ہے۔

اِمام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے کلام کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ قرآن میں جو رِبا مذکور ہے اس سے جلی اور واضح طور پر وہ رِبا مراد ہے جو قرض اُدھار پر لیا دیا جاتا تھا، اور اسی کو زمانۂ جاہلیت میں رِبا کہا جاتا تھا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور آپ کی سنت سے دُوسری قسم کے رِبا کا علم ہوا، جو خاص خاص اَقسامِ بیع و شراء میں کمی زیادتی یا اُدھار کرنے کا نام ہے، اور اس رِبا کے حرام ہونے پر بھی احادیثِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم متواتر آئی ہیں، مگر اس قسم کے رِبا کی تفصیلات پوری واضح نہ ہونے کے سبب اس میں بعض صحابہ کرامؓ کو اِشکال پیش آیا، اور فقہاء کے اِختلافات ہوئے۔ (معانی الآثار ج:۲ ص:۲۳۲)

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں فرمایا ہے کہ رِبا ایک حقیقی ہے اور ایک وہ جو بحکم رِبا ہے، حقیقی رِبا قرض اُدھار پر زیادتی لینے کا نام ہے، اور بحکم رِبا وہ ہے جس کا بیان حدیث میں آیا کہ بعض خاص چیزوں کی بیع میں

---

[۱] احکام القرآن، لابن العربی، سورۃ البقرۃ مسئلۃ کل زیادۃ لم یقابلھا عوض ج:۱ ص:۴۸۵

[۲] التفسیر الکبیر تحت ھٰذہ الآیۃ ج:۴ ص:۲۵

[۳] احکام القرآن، باب البیع ج:۱ ص:۴۶۹

زیادتی لینے کو رِبا کہا گیا ہے، اور ایک حدیث میں جو آیا ہے: "لَا رِبَا إِلَّا فِي النَّسِيئَةِ" (رواہ البخاری) [1] یعنی رِبا صرف اُدھار میں ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ حقیقی اور اصل رِبا جس کو عام طور پر رِبا سمجھا اور کہا جاتا ہے وہ اُدھار پر نفع لینے کا نام ہے، اس کے سوا جتنی اَقسام اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں، وہ سب حکماً رِبا میں داخل ہیں۔

اس تفصیل سے چند چیزیں واضح ہوگئیں

اوّل یہ کہ نزولِ قرآن سے پہلے رِبا ایک متعارف چیز تھی، قرض اُدھار پر بحساب میعاد زیادتی لینے کو رِبا کہا جاتا تھا۔

دُوسرے یہ کہ قرآن میں حرمتِ رِبا نازل ہوتے ہی سب صحابہ کرامؓ نے اس رِبا کو ترک کردیا، اس کے معنی سمجھنے سمجھانے میں کسی کو نہ اِشکال پیش آیا نہ اِشتباہ۔

تیسرے یہ کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزوں کے بارے میں یہ اِرشاد فرمایا کہ ان کی باہمی بیع وشراء میں برابری شرط ہے، کمی بیشی رِبا میں داخل ہے، اور ان میں اُدھار کرنا بھی رِبا میں داخل ہے، یہ چھ چیزیں: سونا، چاندی، گیہوں، جَو، کھجور، نمک ہیں، اور اسی قانون کے تحت عرب میں مروّجہ اَقسامِ بیع مزابنہ، محاقلہ وغیرہ کو حرام قرار دِیا گیا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اِرشاد میں چھ چیزوں کی بیع وشراء میں کمی بیشی اور اُدھار کو تو صراحۃً رِبا میں داخل کرکے حرام قرار دے دیا تھا، لیکن اس میں یہ بات محلِ تفقہ واجتہاد تھی کہ یہ حکم ان چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا دُوسری اشیاء میں بھی ہے، اور اس کا ضابطہ کیا ہے؟ اس ضابطہ میں فقہاء نے اپنے اپنے غور وفکر اور اِجتہاد سے مختلف صورتیں تجویز کیں، اور چونکہ یہ ضابطہ خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ فرمایا تھا اس میں اِشتباہ رہنے کے سبب حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اس پر اِظہارِ افسوس کیا کہ کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کا کوئی ضابطہ بیان فرمادیتے تو مشتبہ حالات میں اِطمینان پیدا ہوجاتا، اور پھر یہ اِرشاد فرمایا کہ جہاں رِبا کا شبہ بھی ہو اس سے بچنا چاہئے۔

چوتھے یہ معلوم ہوا کہ اصلی اور حقیقی رِبا جس کو فقہاء نے "رِبا القرآن" یا "رِبا القرض" کے نام سے موسوم کیا ہے، وہی ہے جو عرب میں متعارف تھا، یعنی قرض اُدھار پر بحسابِ میعاد نفع لینا، دُوسری قسم کے رِبا جو حدیث میں بتلائے گئے وہ سب اسی رِبا کے ساتھ ملحق اور اسی کے حکم میں ہیں، اور جو کچھ خلاف واِختلاف اُمت میں ہوا وہ سب اسی دُوسری قسم کے معاملاتِ رِبا میں ہوا، پہلی قسم کا رِبا جو "رِبا القرآن" کہلاتا ہے اس کے حرام ہونے میں پوری اُمتِ محمدیہ میں کبھی کوئی اِختلاف نہیں ہوا۔

اور آج کل جو رِبا اِنسانی معاشیات کا مدار سمجھا جاتا ہے، اور مسئلۂ سود میں جو زیرِ بحث ہے وہ یہی رِبا ہے، جس کی

[1] صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب بیع الدینار بالدینار نساءً ج:۱ ص:۲۹۱

حرمت قرآن کی سات آیات اور چالیس سے زیادہ احادیث اور اجماعِ اُمت سے ثابت ہے۔

رِبا کی دُوسری قسم جو بیع وشراء کے ضمن میں ہوتی ہے نہ اس کا رِواج عام ہے، نہ اس میں کوئی بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں تک یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن وسنت میں رِبا کی حقیقت کیا ہے جو مسئلۂ سود کی پہلی بات ہے۔

حرمتِ سود کی حکمت و مصلحت

اس کے بعد دُوسری بحث اس کی ہے کہ رِبا کی حرمت وممانعت کس حکمت ومصلحت پر مبنی ہے، اور اس میں وہ کونسی رُوحانی یا معاشی مضرتیں ہیں جن کی وجہ سے اسلام نے اس کو اتنا بڑا گناہ قرار دِیا ہے۔

اس جگہ پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دُنیا کی ساری مخلوقات اور ان کے معاملات میں ایسی کوئی چیز نہیں جس میں کوئی بھلائی یا فائدہ نہ ہو، سانپ، بچھو، بھیڑیا، شیر اور سنکھیا جیسے زہرِ قاتل میں بھی اِنسان کے لئے ہزاروں فوائد ہیں ؎

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

چوری، ڈاکہ، بدکاری، رِشوت ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس میں کچھ نہ کچھ فائدہ نہ ہو، مگر ہر مذہب وملت اور ہر مکتبِ فکر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس چیز کے منافع زیادہ اور مضرتیں کم ہیں ان کو نافع ومفید کہا جاتا ہے، اور جن کے مفاسد ومضرات زیادہ اور منافع کم ہیں ان کو مضر اور بیکار سمجھا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے بھی شراب اور قمار کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کا اِعلان فرمایا کہ ان میں بڑے گناہ بھی ہیں، اور لوگوں کے کچھ منافع بھی، مگر ان کے گناہ کا وَبال منافع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، اس لئے ان چیزوں کو اچھا یا مفید نہیں کہا جاسکتا بلکہ ان کو نہایت مضر اور تباہ کن سمجھ کر ان سے اِجتناب لازم ہے۔

رِبا، یعنی سود کا بھی یہی حال ہے، اس میں سودخور کے لئے کچھ وقتی نفع ضرور نظر آتا ہے، لیکن اس کا دُنیوی اور اُخروی وبال اس نفع کے مقابلے میں نہایت شدید ہے۔

ہر چیز کے نفع ونقصان یا مفاسد ومصالح کا موازنہ کرنے میں یہ بات بھی ہر عقل مند کے نزدیک قابلِ نظر ہوتی ہے کہ اگر کسی چیز میں نفع محض وقتی اور ہنگامی ہو اور نقصان اس کا دیرپا، یا دائمی تو اس کو کوئی عقل مند مفید اَشیاء کی فہرست میں شمار نہیں کرسکتا، اسی طرح اگر کسی چیز کا نفع شخصی اور انفرادی ہو اور اس کا نقصان پوری ملت اور جماعت کو پہنچتا ہو تو اس کو بھی کوئی ہوش مند اِنسان مفید نہیں کہہ سکتا، چوری اور ڈاکہ میں چور ڈاکو کا تو نفع کھلا ہوا ہے، مگر وہ پوری ملت کے لئے مضر اور ان کے امن وسکون کو برباد کرنے والا ہے، اسی لئے کوئی اِنسان چوری اور ڈاکہ کو اچھا نہیں کہتا۔

اس تمہید کے بعد مسئلۂ سود پر نظر ڈالئے تو اس میں ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں سود خور کے وقتی اور ہنگامی نفع کے مقابلہ میں اس کا رُوحانی اور اَخلاقی نقصان اتنا شدید ہے کہ وہ اس کو اِنسانیت سے نکال دیتا ہے، اور یہ کہ اس کا جو وقتی نفع ہے وہ بھی صرف اس کی ذات کا نفع ہے، اس کے مقابلہ میں پوری ملت کو نقصانِ عظیم اور معاشی بحران کا شکار ہونا پڑتا ہے، لیکن دُنیا کا حال یہ ہے کہ جب اِس میں کوئی چیز رِواج پا جاتی ہے تو اس کی خرابیاں نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہیں، اور صرف اس کے فوائد سامنے رہ جاتے ہیں اگرچہ وہ فوائد کتنے ہی حقیر و ذلیل اور ہنگامی ہوں، اس کے نقصانات کی طرف دھیان نہیں جاتا اگرچہ وہ کتنے ہی شدید اور عام ہوں۔

رسم و رِواج طبائعِ اِنسانی کے لئے ایک کلوروفارم ہے جو اس کو بےحس بنا دیتا ہے، بہت کم افراد ہوتے ہیں جو چلے ہوئے رسم و رِواج پر تحقیقی نظر ڈال کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس میں فائدے کتنے ہیں اور نقصان کتنا، بلکہ اگر کسی کے متنبہ کرنے سے اس کے نقصانات سامنے بھی آجائیں، تو پابندیٔ رسم و رِواج اس کو صحیح راستہ پر نہیں آنے دیتی۔

سود و رِبا اس زمانہ میں ایک وبائی مرض کی صورت اِختیار کرچکا ہے اور اس کا رِواج ساری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے، اس نے اِنسانی فطرت کا ذائقہ بدل دیا ہے کہ کڑوے کو میٹھا سمجھنے لگی، اور جو چیز پوری اِنسانیت کے لئے معاشی بربادی کا سبب ہے، اس کو معاشی مسئلہ کا حل سمجھا جانے لگا، آج اگر کوئی مفکر محقق اس کے خلاف آواز اُٹھاتا ہے تو اس کو دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ ہے، لیکن وہ ڈاکٹر ڈاکٹر نہیں بلکہ اِنسانیت کا ڈاکو ہے جو کسی ملک میں وبا پھیل جانے کو اور علاج کے غیر مؤثر ہونے کا مشاہدہ کرنے کی بنا پر اب یہ طے کرے کہ لوگوں کو یہ سمجھائے کہ یہ مرض مرض ہی نہیں، بلکہ عین شفا اور عین راحت ہے۔ ماہر ڈاکٹر کا کام ایسے وقت میں بھی یہی ہے کہ لوگوں کو اس مرض اور اس کی مضرت سے آگاہ کرتا رہے، اور علاج کی تدبیریں بتاتا رہے۔

انبیاء علیہم السلام اِصلاحِ خلق کے ذمہ دار ہوکر آتے ہیں، وہ کبھی اس کی پروا نہیں کرتے کہ کوئی ان کی بات سنے گا یا نہیں، وہ اگر لوگوں کے سننے اور ماننے کا اِنتظار کیا کرتے تو ساری دُنیا کفر و شرک ہی سے آباد ہوتی، کلمہ ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ'' کا ماننے والا اُس وقت کون تھا جبکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تبلیغ و تعلیم کا حکم منجانب اللہ ملا تھا؟

سود و رِبا کو اگرچہ آج کی معاشیات میں ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا ہے، لیکن حقیقت وہ ہے جو آج بھی بعض حکمائے یورپ نے تسلیم کی کہ وہ معاشیات کے لئے ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی میں پیدا ہوجانے والا ایک کیڑا ہے جو اس کو کھا رہا ہے۔

مگر اَفسوس ہے کہ آج کل کے اہلِ علم و فن بھی کبھی رسم و رِواج کے تنگ دائرے سے آزاد ہوکر اس طرف نظر نہیں

کرتے، اور سیکڑوں برس کے تجربے بھی ان کو اس طرف متوجہ نہیں کرتے کہ سود و رِبا کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام خلق خدا اور تمام ملت فقر و فاقہ اور معاشی بحران کا شکار ہو، اور وہ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جائیں، اور چند سرمایہ دار پوری ملت کے مال سے فائدہ اُٹھا کر، یا یوں کہئے کہ ملت کا خون چوس کر اپنا بدن بڑھاتے اور پالتے چلے جائیں، اور حیرت ہے کہ جب کبھی ان حضرات کے سامنے اس حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے، تو اس کے جھٹلانے کے لئے ہمیں امریکا، اور انگلینڈ کے بازاروں میں لے جا کر سود کی برکات کا مشاہدہ کرانا چاہتے ہیں، اور یہ دِکھلانا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ سود و رِبا کی بدولت کیسے پھلے اور پھولے ہیں، لیکن اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی مردُم خوروں کی کسی قوم اور ان کے عمل کی برکات کا مشاہدہ کرانے کے لئے آپ کو مردُم خوروں کے محلّہ میں لے جا کر یہ دِکھلائے کہ یہ کتنے موٹے تازے اور تندرست ہیں، اور اس سے یہ ثابت کرے کہ ان کا یہ عمل بہترین عمل ہے۔

لیکن اس کو کسی سمجھ دار آدمی سے سابقہ پڑے تو وہ کہے گا کہ تم مردُم خوروں کے عمل کی برکات مردُم خوروں کے محلّہ میں نہیں، دُوسرے محلوں میں جا کر دیکھو جہاں سیکڑوں، ہزاروں مردے پڑے ہوئے ہیں، جن کا خون اور گوشت کھا کر یہ درندے پلے ہیں۔ اسلام اور اسلامی شریعت کبھی ایسے عمل کو دُرست اور مفید نہیں مان سکتی جس کے نتیجہ میں پوری انسانیت اور ملت تباہی کا شکار ہو، اور کچھ افراد یا ان کے جتھے پھولتے پھلتے چلے جائیں۔

سود و رِبا کی معاشی خرابیاں

سود و رِبا میں اگر کوئی دُوسرا عیب بھی اس کے سوا نہ ہوتا کہ اس کے نتیجہ میں چند اَفراد کا نفع اور پوری انسانیت کا نقصان ہے تو یہی اس کی ممانعت اور قابلِ نفرت ہونے کے لئے کافی تھا، حالانکہ اس میں اس کے علاوہ اور بھی معاشی خرابیاں اور رُوحانی تباہ کاریاں پائی جاتی ہیں۔

پہلے اس کو سمجھئے کہ سود کے ذریعہ ملت کی تباہی اور خاص اَفراد کا نفع کیونکر ہے، سود و رِبا کے مہاجنی اور فرسودہ طریقوں میں تو ایسا بھونڈا پن تھا کہ عام ملت کا ضرر اور کسی خاص فرد کا نفع ہر موٹی عقل والے کو بھی سمجھ میں آ جاتا تھا، مگر آج کل کی ''نئی روشنی''، جس کو ''نئی اندھیری'' کہنا زیادہ موزوں ہے، اس نے جس طرح شراب کو مشینوں میں صاف کر کے، چوری اور ڈاکہ کی نئی نئی صورتیں ایجاد کر کے، بدکاری و بے حیائی کے نئے نئے ڈھنگ نکال کر کے سب کو ایسا مہذب بنا لیا ہے کہ سطحی نظر والوں کو اس کی اندرونی خرابیاں نظر نہ آئیں، اسی طرح رِبا اور سود کے لئے بجائے شخصی دُکانوں کے مشترک کمپنیاں بنالی ہیں جن کو ''بینک'' کہا جاتا ہے، اور اَب دُنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے یہ بتلایا جاتا ہے کہ رِبا کے اس جدید طریقہ سے پوری ملت کا فائدہ ہے، کیونکہ عوام جو اپنے روپے سے تجارت کرنا نہیں جانتے، یا قلتِ سرمایہ کی بنا پر

نہیں کر سکتے، ان سب کا روپیہ بینکوں میں جمع ہو کر ان میں سے ہر ایک کو گو قلیل ہی سہی کچھ نہ کچھ نفع سود کے نام سے مل جاتا ہے، اور بڑے تاجروں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ بینکوں سے سودی قرض لے کر بڑی تجارت کر کے فائدہ اُٹھاتے رہیں، اس طرح سود ایسی مبارک چیز بن گئی کہ ساری ملت کے اَفراد کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے۔

لیکن ذرا اِنصاف سے کام لیا جائے تو یہ وہ ابلہ فریبی ہے جو شراب کی گندی بھٹیوں کو صاف ستھرے ہوٹلوں میں اور عصمت فروشی کے اَڈّوں کو سینماؤں اور شبینہ کلبوں میں تبدیل کر کے زہر کو تریاق اور مضر کو مفید بنا کر دِکھلانے کے لئے عمل میں لائی گئی ہے، اور جس طرح اہلِ بصیرت پر یہ بات روشن ہے کہ اخلاق سوز جرائم کو جدید غلاف پہنانے کا نتیجہ اس کے سوا نہیں کہ یہ جرائم پہلے سے زیادہ ہو گئے، اور ان کا زہر پہلے سے زیادہ تیز ہو گیا، اسی طرح سود و رِبا کی اس نئی شکل نے سود کے چند آنے فی سیکڑہ عوام کے منہ کو لگا کر ایک طرف ان کو اپنے جرم کا شریک کر لیا، اور دُوسری طرف اپنے لئے اس جرم کے اِرتکاب کا غیر محدود میدان فراہم کر لیا۔

کون نہیں جانتا کہ یہ چند آنے فی سیکڑہ کا سود جو سیونگ بینکوں اور ڈاک خانہ جات سے لوگوں کو ملتا ہے، یہ کسی طرح اُن کے معاش کی کفالت نہیں کر سکتا، اس لئے وہ مجبور ہیں کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کوئی مزدوری یا ملازمت تلاش کریں، تجارت کی طرف اوّل تو ان کی نظر خود نہیں جاتی، اور اگر کسی کو اس طرف توجہ بھی ہو جائے تو پوری ملت کا سرمایہ بینکوں میں جمع ہو کر جو صورت تجارت کی بن گئی ہے اس میں کسی چھوٹے سرمایہ والے کو داخل ہونا خود اپنی موت کو دعوت دینے سے کم نہیں، کیونکہ بینک کوئی بڑا سرمایہ قرض پر صرف اسی کو دے سکتے ہیں جس کی بازار میں اپنی ساکھ ہو اور بڑا کاروبار ہو، دس لاکھ کے مالک کو ایک کروڑ قرض مل سکتا ہے، وہ اپنے ذاتی روپے کی نسبت سے دس گنا زیادہ کی تجارت چلا سکتا ہے، اور تھوڑے سرمایہ والے کی نہ کوئی ساکھ ہوتی ہے، نہ بینک اس پر اِعتماد کرتے ہیں، کہ ان کو دس گنا زیادہ قرض دے دیں، ایک ہزار کی مالیت کو دس ہزار تو کیا ایک ہزار ملنا بھی مشکل ہے، اور جبکہ ایک شخص جو ایک لاکھ کی ملکیت رکھنے والا ہو، نو لاکھ بینک کا سرمایہ لگا کر دس لاکھ کی تجارت کرتا ہے، اور فرض کر لیجئے کہ اس کو ایک روپیہ فی صد نفع ہوتا ہے تو گویا اس کو اپنے ایک لاکھ پر دس فی صد نفع ہوا، اس کے بالمقابل اگر کوئی شخص اپنے ذاتی روپے سے ایک لاکھ کی تجارت کرتا ہے اس کو ایک لاکھ پر صرف ایک ہی فیصد کا نفع ہوگا، جو اس کے ضروری اِخراجات کے لئے بھی کافی نہ ہوں گے، اُدھر مارکیٹ میں بڑے سرمایہ والے کو خام سامان جس نرخ اور رعایت کے ساتھ ملتا ہے وہ چھوٹے سرمایہ والے کو میسر نہیں آ سکتا، اس لئے چھوٹے سرمایہ والا مفلوج اور محتاج ہو کر رہ جاتا ہے، اور اگر اس کی شامت آئی، اور اس نے بھی کسی ایسی تجارت میں ہاتھ ڈال دیا تو بڑے سرمایہ والا اس کو اپنی خدائی کا شریک سمجھ کر کچھ اپنی گرہ سے نقصان اُٹھا کر بھی بازار کو ایسا ڈاؤن کر دیتا ہے کہ چھوٹے سرمایہ والا اصل اور نفع سب سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تجارت صرف اُن چند اَفراد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے جو

بڑے سرمایہ دار ہیں۔

۱- یہ ملت پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ ساری ملت اصلی تجارت سے محروم ہو کر صرف بڑے سرمایہ داروں کی دست نگر بن جائے، ان کو وہ جتنا نفع دینا چاہیں بخشش کے طور پر دے دیں۔

۲- اور دُوسرا اس سے بڑا نقصان جس کی زد میں پورا ملک آجاتا ہے یہ ہے کہ ایسی صورت میں اشیاء کے نرخ پر ان بڑے سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے، وہ گراں سے گراں فروخت کر کے اپنی گرہ مضبوط کر لیتے اور پوری ملت کی گرہیں کھلوا لیتے ہیں، اور قیمت بڑھانے کے لئے جب چاہیں مال کی فروخت بند کر دیتے ہیں، اگر ساری ملت کا سرمایہ بینکوں کے ذریعے کھینچ کر ان خودغرض لوگوں کی پرورِش نہ کی جاتی اور یہ مجبور ہوتے کہ صرف اپنے ذاتی سرمایہ سے تجارت کریں تو نہ چھوٹے سرمایہ والوں کو یہ مصیبت پیش آتی، اور نہ یہ خودغرض درندے پوری تجارت کے ناخدا بنتے، چھوٹے سرمایہ والوں کی تجارت کے منافع سامنے آتے تو دُوسروں کا حوصلہ بڑھتا، تجارت کا کاروبار عام ہوتا، جس سے ہر ایک کا اسٹاف علیحدہ ہوتا، جس سے ہزاروں حاجت مندوں کی روزی پیدا ہوتی، اور تجارتی نفع بھی عام ہوتا، اور اَشیاء کی ارزانی پر بھی یقینی اثر پڑتا، کیونکہ باہمی مقابلہ (کمپٹیشن) ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی آدمی اس پر تیار ہوتا ہے کہ اپنا نفع کم کرلے، اس عیارانہ طریقِ کار نے پوری قوم کو ایک مہلک بیماری لگا دی اور دُوسرے اس کی ذہنیت خراب کر دی کہ اس بیماری ہی کو شفا سمجھے۔

۳- بینکوں کے سود سے ملت کا ایک تیسرا معاشی نقصان اور دیکھئے کہ جس شخص کا سرمایہ دس ہزار ہے، اور وہ بینک سے سودی قرض لے کر ایک لاکھ کا بیوپار کرتا ہے، اگر کہیں اس کا سرمایہ ڈُوب گیا، اور تجارت میں اس کو نقصان پہنچ گیا، اور وہ دِیوالیہ ہو گیا، تو غور کیجئے کہ نقصان صرف دس فی صد تو اس پر پڑا، باقی نوّے فی صد نقصان پوری ملت کا ہوا، جن کا سرمایہ بینک سے لے کر اس نے لگایا تھا، اگر بینک نے دِیوالیہ کے نقصان کو سرِدست خود ہی برداشت کر لیا، تو یہ ظاہر ہے کہ بینک تو قوم کی جیب ہے، اس کا نقصان انجامِ کار قوم پر عائد ہوگا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ سرمایہ دار کو جب تک نفع ہوتا رہا تو نفع کا وہ تنہا مالک تھا، اس میں ملت کے لئے کچھ نہ تھا، یا برائے نام تھا، اور جب نقصان آیا تو نوّے فی صد نقصان پوری ملت پر پڑ گیا۔

۴- سود سے ایک معاشی نقصان یہ بھی ہے کہ سودخور جب گھاٹے میں آجائے تو پھر وہ پنپنے کے قابل نہیں رہتا، کیونکہ اتنا سرمایہ تو تھا نہیں جس کے نقصان کو یہ برداشت کر سکے، نقصان کے وقت اس پر دُہری مصیبت ہوتی ہے، ایک تو اپنا نفع اور سرمایہ گیا، اور اُوپر سے بینک کے قرض میں دَب گیا، جس کی ادائیگی کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں، اور بے سود کی تجارت میں اگر سارا سرمایہ بھی کسی وقت چلا جائے تو فقیر ہی ہوگا مقروض تو نہ ہوگا۔

۱۹۵۴ء میں پاکستان میں رُوئی کے بیوپار پر قرآنی اِرشاد کے مطابق محاق کی آفت آئی اور حکومت نے کروڑوں

روپے کا نقصان اُٹھا کر تاجروں کو سنبھالا، مگر کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ وہ سب سود کی نحوست تھی، کیونکہ کاٹن کے تاجروں نے اس کاروبار میں بیشتر سرمایہ بینکوں کا لگایا ہوا تھا، اپنا سرمایہ برائے نام تھا، بقضائے خداوندی رُوئی کا بازار اتنا گر گیا کہ اس کے دام ایک سو پچیّس سے گر کر دس پر آ گئے، تاجر اس قابل نہ رہے کہ بینکوں میں مارجن پوری کرنے کے لئے روپیہ واپس دیں، مجبور ہو کر مارکیٹ بند کر دی گئی، اور حکومت سے فریاد کی، حکومت نے دس کے بجائے نوّے کے دام لگا کر خود مال خریدا اور کروڑوں روپے کا نقصان برداشت کر کے ان تاجروں کو دِیوالیہ ہونے سے بچالیا، حکومت کا روپیہ کس کا تھا، وہی بیچاری غریب ملت وقوم کا، غرض بینکوں کے کاروبار کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ پوری ملت کے سرمایہ سے چند اَفراد نفع اُٹھاتے ہیں اور جہاں نقصان ہو جائے تو وہ پوری قوم وملت پر پڑے۔

خویش پروَرِی اور مِلّت کُشی کی ایک اور چال

سود وربا کی ملت کشی اور اَفراد پروَرِی کا اِجمالی نقشہ آپ کے سامنے آ چکا ہے، اس کے ساتھ ایک اور ہوشیاری اور چالاکی دیکھئے کہ سودخوروں نے جب اپنے تجربہ سے بھی اس چیز کو محسوس کیا جو قرآن کا اِرشاد ہے: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا یعنی ''سود کے مال میں محاق کی آفتیں آنا لازمی ہیں''، جس کے نتیجہ میں دِیوالیہ ہونا پڑتا ہے، تو ان آفتوں سے بچنے کے لئے دو مستقل اِدارے بنائے، ایک بیمہ (انشورنس) دُوسرے سٹہ کا بازار، کیونکہ تجارت میں نقصان آنے کی دو وجہ ہوسکتی ہیں، ایک کوئی آسمانی آفت کہ جہاز ڈُوب گیا، یا جل گیا، یا کوئی اور ایسی ہی آفت آ گئی، دُوسرے یہ کہ سامان کا نرخ اس کی قیمتِ خرید سے کم ہو گیا، ان دونوں صورتوں میں لگا ہوا سرمایہ چونکہ اپنا نہیں بلکہ ملت کا مشترکہ سرمایہ ہے، اس لئے ان کا نقصان کم اور ملت کا زیادہ ہے، مگر انہوں نے اس تھوڑے سے نقصان کو بھی ملت ہی کے سر پر ڈالنے کے لئے، ایک طرف تو بیمہ کمپنیاں کھولیں، جس میں بینکوں کی طرح پوری ملت کا سرمایہ جمع رہتا ہے، اور جب کسی سماوی آفت سے ان سودخوروں پر کوئی نقصان آتا ہے تو بیمہ کے ذریعے وہ پورا نقصان بھی ملت کے مشترک سرمایہ پر ڈال دیتے ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ بیمہ کمپنیاں خدا کی رحمت ہیں، ڈُوبتے کو سہارا دیتی ہیں، لیکن ان کی حقیقت کو دیکھیں اور سمجھیں تو یہاں بھی وہی فریب ہے کہ ناگہانی حوادث کے وقت اِمداد کا لالچ دے کر ملت کا سرمایہ جمع کیا گیا، مگر اس سے بھاری رقموں کا فائدہ تو صرف اُونچے سرمایہ داروں کو ملتا ہے جو بعض اوقات خود ہی اپنی فرسودہ موٹر کو آگ لگا کر، یا کہیں ٹکرا کر اور بیمہ کمپنی سے رقم لے کر نئی موٹر خریدنا چاہتے ہیں، سو میں ایک دو کوئی غریب بھی ایسا ہوتا ہوگا جس کو ناگہانی موت کے سبب کچھ پیسے مل جاویں۔

اور دُوسری قسم یعنی نرخ گھٹ جانے کے خطرے سے بچنے کے لئے سٹہ کا بازار گرم کیا، اس سٹہ کے ذریعے تمام

اَفرادِ ملت کو متاثر کیا گیا، تاکہ جو نقصان ان کو قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے ہونے والا تھا وہ پھر ملت پر منتقل کردیں۔

اس مختصر بیان میں آپ نے اتنا سمجھ لیا ہوگا کہ بینکوں کا سود اور اس کی تجارت پوری اِنسانیت کے لئے فقر و فاقہ اور معاشی تنگ دستی کا موجب ہے، ہاں چند مال دار اَفراد کے اموال میں اس سے اِضافہ بھی ہوتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ملت بگڑتی ہے اور چند اَفراد بنتے ہیں، اور ملک کا سرمایہ سمٹ کر اُن کے ہاتھ میں آجاتا ہے، عام حکومتوں نے اس عظیم مفسدہ کو محسوس تو کیا، لیکن اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ بڑے سرمایہ داروں کے لئے اِنکم ٹیکس کی شرح بڑھادی، یہاں تک کہ آخری شرح ایک روپیہ میں سے ساڑھے پندرہ آنے کردی گئی، تاکہ سرمایہ اُن کے پاس سے منتقل ہوکر پھر قومی خزانے میں پہنچ جائے۔

لیکن سب کو معلوم ہے کہ اس قانون کے نتیجہ میں عام طور پر کارخانوں کے حساب فرضی اور جعلی بننے لگے، اور بہت سا سرمایہ حکومت سے چھپانے کے لئے پھر دفینوں کی شکل میں منتقل ہونے لگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دولت سمٹ کر قوم کے چند اَفراد میں مقید ہوجانے کی اِنتہائی مضرت ملک کے معاشی اور اقتصادی حالات کے لئے سب پر واضح ہے، اسی لئے اِنکم ٹیکس کی شرح اتنی زیادہ بڑھائی جاتی ہے، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ یہ تدبیر مرض کا علاج ثابت نہ ہوئی، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مرض کے اصلی سبب کو نہیں پہچانا گیا، اس لئے علاج کی مثال یہ ہوگئی کہ ؎

در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود [1]

دولت بڑے سرمایہ داروں کی طرف سمٹنے کا اصلی سبب صرف سودی کاروبار اور قومی سرمایہ سے خاص خاص افراد کی بے جا نفع اندوزی ہے، جب تک اِسلام کی تعلیمات کے مطابق اس کو بند نہ کیا جائے اور اِس کا رِواج نہ دیا جائے کہ ہر شخص صرف اپنے سرمایہ سے تجارت کرے اس وقت تک اس مرض کا علاج نہیں ہوسکتا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بینکوں کے ذریعہ پوری قوم کا سرمایہ جمع ہوکر کچھ نہ کچھ تو فائدہ عوام کو بھی ملا، وہ کتنا ہی قلیل ہو، اور بڑے سرمایہ داروں نے اس سے زیادہ فائدہ حاصل کرلیا ہو، لیکن اگر یہ بینکوں میں سرمایہ جمع کرنے کا طریقہ نہ ہو تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو پہلے زمانے میں تھا کہ لوگوں کا سرمایہ دفینوں اور خزینوں کی شکل میں زمین کے اندر رہا کرتا تھا، جس سے نہ اُن کو فائدہ ہوگا نہ کسی دُوسرے شخص کو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اِسلام نے جس طرح سود کو حرام قرار دے کر اس کا دروازہ بند کیا ہے کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر خاص خاص سرمایہ داروں میں محدود ہوجائے، اسی طرح زکوٰۃ کا فریضہ سرمایہ ٹیکس کی صورت میں عائد

[1] ترجمہ:- دروازہ تو بند کردیا مگر دُشمن گھر کے ہی اندر تھا۔

کر کے ہر مال دار کو اِس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کو منجمد حالت میں نہ رکھے، بلکہ تجارت اور کاروبار میں لگائے، کیونکہ زکوٰۃ سرمایہ ٹیکس کی صورت میں ہونے کی بنا پر اگر کوئی شخص اپنا روپیہ یا سونا چاندی دفینہ کر کے رکھتا ہے تو ہر سال اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکلتے نکلتے سرمایہ فنا ہو جائے گا، اس لئے ہر سمجھ دار اِنسان اس پر مجبور ہوگا کہ سرمایہ کو کام میں لگا کر اس سے فائدہ اُٹھائے اور دُوسروں کو فائدہ پہنچائے، اور اسی نفع میں سے زکوٰۃ ادا کرے۔

فریضۂ زکوٰۃ ایک حیثیت سے تجارت کی ترقی کا ضامن ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ فریضۂ زکوٰۃ ادا کرنے میں جیسے یہ عظیم الشان فائدہ مضمر ہے کہ قوم کے فقراء ومساکین کی اِمداد ہو، اسی طرح مسلمانوں کے معاشی حالات کو دُرست کرنے کے لئے بھی یہ فریضہ تجارت کی ترغیب کا ایک بہترین ذریعہ ہے، کیونکہ ہر اِنسان جب یہ دیکھے گا کہ نقد سرمایہ کو بند رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ نفع تو کچھ ہوا نہیں، اور سال کے ختم پر چالیسواں حصہ کم ہوگیا، تو ضرور اس کو اس طرف توجہ کرنا پڑے گی کہ اس مال کو کسی تجارت میں لگائے، اور دُوسری طرف چونکہ سود ہے، روپیہ چلانا حرام ٹھہرا تو تجارت کی یہ صورت نہ رہے گی کہ لاکھوں اِنسانوں کے سرمایہ سے صرف ایک اِنسان تجارت کرے بلکہ ہر مال دار خود تجارت میں آنے کی فکر کرے گا، اور جبکہ بڑے سرمایہ دار بھی صرف اپنے ہی سرمایہ سے تجارت کریں گے تو چھوٹے سرمایہ والوں کو تجارت میں وہ مشکلات پیش نہ آئیں گی جو بینکوں سے سودی روپیہ لے کر بڑی تجارت چلانے کی صورت میں پیش آتی ہیں، اس طرح پورے ملک میں تجارت اور اس کے منافع عام ہوں گے، اور اس کے نتیجہ میں ملک کے غرباء فقراء کو فائدہ پہنچے گا۔

سود کی رُوحانی بیماریاں

یہاں تک سود کی معاشی اور اِقتصادی تباہ کاری کا ذِکر تھا، اب سنئے کہ سودی کاروبار اِنسان کے اَخلاق اور رُوحانی کیفیات پر کیسے خراب اثرات ڈالتا ہے۔

۱- اِنسانی اخلاق میں سب سے بڑا جوہر اِیثار وسخاوت کا ہے کہ خود تکلیف اُٹھا کر دُوسروں کو راحت پہنچانے کا جذبہ ہو، سود کے کاروبار کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ فنا ہو جاتا ہے، سودخور اپنے پاس سے کسی کو نفع پہنچانا تو کیا، دُوسرے کو اپنی کوشش اور اپنے سرمایہ سے اپنے برابر آتا نہیں دیکھ سکتا۔

۲- وہ مصیبت زدہ پر رحم کھانے کے بجائے اس کی مصیبت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی فکر میں رہتا ہے۔

۳- سودخوری کے نتیجہ میں مال کی حرص اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مست ہو کر اپنے بھلے اور برے کو بھی نہیں پہچانتا،

اس کے اَنجامِ بد سے بالکل غافل ہوجاتا ہے۔

کیا سود کے بغیر کوئی تجارت نہیں چل سکتی؟

رِبا کی حقیقت اور اس کی دِینی و دُنیوی خرابیوں کا بیان کسی قدر تفصیل سے آچکا ہے، اب تیسری بحث یہ باقی ہے کہ رِبا کی معاشی اور رُوحانی خرابیاں اور قرآن وسنت میں اس کی شدید حرمت وممانعت تو واضح ہوگئی، لیکن موجودہ دور میں جبکہ رِبا ہی تجارت کا رُکنِ اعظم بنا ہوا ہے، ساری دُنیا کے کاروبار اسی پر چل رہے ہیں، اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہے، بینک سسٹم کو ترک کردینا اس زمانہ میں گویا تجارت کو بند کردینا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی مرض عام ہوکر وبا کی صورت اِختیار کرلے تو علاج معالجہ دُشوار ضرور ہوجاتا ہے، لیکن بے کار نہیں ہوتا، اِصلاحِ حال کی کوششیں انجام کار کامیاب ہوتی ہیں، البتہ صبر و اِستقلال اور ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، قرآنِ کریم ہی میں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی اِرشاد ہے:-

وَمَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج:۷۸)

''یعنی اللہ تعالیٰ نے دِین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں ڈالی۔''

اس لئے ضرور ہے کہ رِبا سے اِجتناب کا کوئی ایسا راستہ ضرور ہوگا جس میں معاشی اور اِقتصادی نقصان بھی نہ ہو، اندرونی اور بیرونی تجارت کے دروازے بھی بند نہ ہوں اور رِبا سے نجات بھی ہوجائے۔

اس میں پہلی بات تو یہی ہے کہ سطحی نظر میں بینکنگ کے موجودہ اُصول کو دیکھتے ہوئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بینک سسٹم کا مدار ہی سود پر ہے، اس کے بغیر بینک چل ہی نہیں سکتے، لیکن یہ خیال قطعاً صحیح نہیں، رِبا کے بغیر بھی بینک سسٹم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے، بلکہ اس سے بہتر اور نافع ومفید صورت میں آسکتا ہے، البتہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ کچھ حضرات ماہرینِ شریعت اور کچھ ماہرینِ بینک کے مشورہ اور تعاون سے اس کے اُصول اَز سرِ نو تجویز کریں، تو کامیابی کچھ دُور نہیں، اور جس دن بینک سسٹم شرعی اُصول پر آگیا تو اِن شاء اللہ دُنیا دیکھ لے گی کہ اس میں پوری قوم وملت کی کیسی فلاح ہے، ان اُصول وقواعد کی تشریح کا یہ موقع نہیں[1]، جن کی بنا پر بینک سسٹم کو بغیر رِبا کے چلایا جاسکتا ہے۔

رِبا اور سود کی ایک ضرورت کچھ تجارتی اَغراض کے لئے ہوتی ہے، اس کا اِنتظام تو بینک کے موجودہ اُصول میں ترمیم کے ذریعہ ہوجائے گا، اور دُوسری ضرورت سود و رِبا میں مبتلا ہونے کی فقیر وحاجت مند لوگوں کی ہنگامی اور وقتی

---

[1] احقر نے چند علماء کے مشورے سے بے سود بینکاری کا مسودہ عرصہ ہوا تیار کر بھی دیا تھا، اور بینکاری کے بعض ماہرین نے موجودہ دور میں قابلِ عمل تسلیم بھی کرلیا تھا، اور بعض حضرات نے اس کو شروع بھی کرنا چاہا مگر ابھی تک عام تاجروں کی توجہ اس طرف نہ ہونے کے سبب اور حکومت کی طرف سے اس کو منظوری حاصل نہ ہونے کے سبب وہ چل نہیں سکا، فالی اللہ المشتکی۔ ۱۲ منہ

ضرورتیں ہوا کرتی ہیں، اس کا بہترین علاج اِسلام میں پہلے سے بصورتِ زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ موجود ہے، لیکن دِین اور علمِ دِین سے بے خبری اور بے پروائی کا نتیجہ ہے جس نے آج کل نظامِ زکوٰۃ کو بھی معطل کردیا ہے، ان میں اکثر بڑے سرمایہ والے حضرات حساب کرکے پوری زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور جو لوگ پوری زکوٰۃ نکالتے بھی ہیں تو وہ بس زکوٰۃ کا نکالنا ہی جانتے ہیں کہ اپنی جیب سے نکال دیں، حالانکہ حکمِ اِلٰہی زکوٰۃ کے نکالنے کا نہیں بلکہ ادا کرنے کا ہے، اور اَدا کرنا جب صحیح ہوسکتا ہے جب اس کے مستحقین کو پہنچا کر ان کو مالکانہ قبضہ دے دیا جائے، اب غور کیجئے کہ ایسے مسلمان کتنے ہیں جو مستحقین کو تلاش کرنے کی فکر کریں، پھر ان کو پہنچانے کا اِہتمام کریں، مسلمان قوم کتنی ہی کم سرمایہ سہی، لیکن اگر ہر مسلمان جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ زکوٰۃ پوری ادا کرے، اور اَدا کرنے کا صحیح طریقہ اِختیار کرے کہ مستحقین کو پہنچائے اور اَدا کرنے کا اِہتمام کرے، تو یقیناً کسی مسلمان کو اس کی ضرورت نہ رہے کہ وہ قرض کی ضرورت سے سود و رِبا میں مبتلا ہو، اور اگر شرعی قاعدہ کے مطابق اِسلامی حکومتِ عادلہ بن جائے اور اس کے تحت شرعی بیت المال قائم ہوجائے، اور تمام مسلمانوں کے اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ اس میں جمع ہوا کرے تو اس بیت المال سے ہر ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے، اور اس طرح بیکار پھرنے والوں کو چھوٹی دُکانیں کرا کر، یا کسی صنعت میں لگا کر بھی کام میں لگایا جاسکتا ہے، کسی یورپین ماہر نے صحیح کہا کہ مسلمانوں کا نظامِ زکوٰۃ ایسی چیز ہے کہ اگر مسلمان اس کے پابند ہوجائیں تو اس قوم میں کوئی مفلس اور مصیبت زدہ نظر نہ آئے۔

الغرض اس زمانے میں سود و رِبا کے معاملات وبا کی طرح پھیل جانے سے یہ سمجھ بیٹھنا صحیح نہیں کہ موجودہ زمانہ میں سود کا کاروبار چھوڑ دینا معاشی واِقتصادی خودکشی کے مرادف ہے، اور اس زمانہ کا آدمی سودی کاروبار کرنے میں معذور ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جب تک پوری قوم یا اس کی کوئی معتد بہ جماعت یا کوئی اِسلامی حکومت پوری توجہ کے ساتھ اس کام کا تہیہ نہ کرلے اَفراد و احاد کے لئے دُشواری ضرور ہے، مگر معذور پھر بھی نہیں کہا جاسکتا۔

اس وقت ہمارے اس بیان کے دو مقصد ہیں، اوّل یہ کہ مسلمانوں کی جماعتیں اور حکومتیں جو اس کام کو صحیح طور پر کرسکتی ہیں اس طرف متوجہ ہوں اور مسلمانوں کو بلکہ پوری دُنیا کو سود کے منحوس اثرات سے نجات دِلائیں۔

دُوسرے یہ کہ کم از کم علم سب کا صحیح ہوجائے، مرض کو مرض تو سمجھنے لگیں، حرام کو حلال سمجھنے کا دُوسرا گناہ جو پہلے گناہ سے زیادہ عظیم ہے، کم از کم اس کے تو مرتکب نہ ہوں، عملی گناہ تو میں کچھ نہ کچھ ظاہری فائدہ بھی ہے، لیکن یہ دُوسرا علمی اور عقیدہ کا گناہ کہ اس کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، پہلے سے عظیم تر بھی ہے، اور لغو و فضول بھی، کیونکہ سود کو حرام سمجھنے اور اپنے گناہ کا اِعتراف کرنے میں تو کوئی مالی نقصان بھی نہیں ہوتا، کوئی تجارت بھی بند نہیں ہوتی، ہاں اِعترافِ جرم کا

نتیجہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جانے سے اس سے بچنے کی تدبیر سوچیں۔

اس وقت اسی مقصد کے پیشِ نظر آخر میں چند روایاتِ حدیث اور اِرشاداتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کرتا ہوں جو انہی آیاتِ قرآنی کا بیان ہے جن میں سود و رِبا کی شدید ممانعت اور اس پر سخت عذاب کی وعیدیں آئی ہیں، تاکہ گناہ کے گناہ ہونے کا اِحساس تو بیدار ہو، اور اس سے بچنے کی فکر ہو، کم از کم یہ صورت تو نہ رہے کہ اس حرام کو حلال بنا کر ایک گناہ کے دو گناہ بنالیں، اور بڑے بڑے صالح دِین دار مسلمان جو رات کو تہجد اور ذِکر اللہ میں گزاریں صبح جب دُکان یا کارخانے میں پہنچیں تو انہیں یہ خیال بھی نہ آئے کہ ہم سود و قمار کے معاملات میں مبتلا ہو کر کچھ گناہ کر رہے ہیں۔

سود کے بارے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشادات

۱- رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات مہلک چیزوں سے بچو! صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا: یا رسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ (عبادت میں یا اس کی مخصوص صفات میں) کسی غیر اللہ کو شریک کرنا، دُوسرے جادو کرنا، تیسرے کسی شخص کو ناحق قتل کرنا، چوتھے سود کھانا، پانچویں یتیم کا مال کھانا، چھٹے جہاد کے وقت میدان سے بھاگنا، ساتویں کسی پاک دامن عورت پر تہمت باندھنا۔ (یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم میں ہے) [۱]

۲- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے آج رات دو شخصوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے، اور مجھے بیت المقدس تک لے گئے، پھر ہم آگے چلے تو ایک خون کی نہر دیکھی، جس کے اندر ایک آدمی کھڑا ہوا ہے، اور دُوسرا آدمی اس کے کنارے پر کھڑا ہے، جب یہ نہر والا آدمی اس سے باہر آنا چاہتا ہے تو کنارے والا آدمی اس کے منہ پر پتھر مارتا ہے، جس کی چوٹ سے بھاگ کر پھر وہ وہیں چلا جاتا ہے جہاں کھڑا تھا، پھر وہ نکلنے کا اِرادہ کرتا ہے تو پھر یہ کنارے کا آدمی یہی معاملہ کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے اُن دونوں ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے بتلایا کہ خون کی نہر میں قید کیا ہوا آدمی سود کھانے والا (اپنے عمل کی سزا پا رہا ہے)۔ (یہ حدیث صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے) [۲]

۳- رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے پر بھی لعنت فرمائی، اور سود دینے والے پر بھی، اور بعض روایات میں سودی معاملہ پر گواہی دینے والے اور اس کا وثیقہ لکھنے والے پر بھی لعنت آئی ہے۔

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب المحاربین من اهل الکفر والرِّدَّة، باب رمی المحصنات ج:۲ ص:۱۰۱۳، وصحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الکبائر وأکبرها ج:۱ ص:۶۴

[۲] صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب آکل الربا ...إلخ ج:۱ ص:۲۷۹، ۲۸۰

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔[۱] اور بعض روایات میں شاہد و کاتب پر لعنت اس صورت میں ہے جبکہ ان کو اس کا علم ہو کہ یہ سود کا معاملہ ہے۔

۴- اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ چار آدمی ایسے ہیں کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اُوپر لازم کرلیا ہے کہ ان کو جنت میں نہ داخل کرے، اور جنت کی نعمت نہ چکھنے دے، وہ چار یہ ہیں: ۱-شراب پینے کا عادی، ۲-اور سود کھانے والا، ۳-اور یتیم کا مال ناحق کھانے والا، ۴-اور اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)[۲]

۵- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی جو سود کا ایک دِرہم کھاتا ہے وہ چھتیس مرتبہ بدکاری کرنے سے زیادہ سخت گناہ ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جو گوشت مالِ حرام سے بنا ہو، اس کے لئے آگ ہی زیادہ مستحق ہے۔ اسی کے ساتھ بعض روایات میں ہے کہ کسی مسلمان کی آبروریزی سود سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ (یہ روایت مسندِ احمد، طبرانی وغیرہ میں ہے)[۳]

۶- اور ایک حدیث میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ پھل کو قابلِ اِستعمال ہونے سے پہلے فروخت کیا جائے، اور فرمایا کہ جب کسی بستی میں بدکاری اور سود کا کاروبار پھیل جائے تو اس نے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو اپنے اُوپر دعوت دے دی۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)[۴]

۷- اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں سود کے لین دین کا رِواج ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان پر ضروریات کی گرانی مسلط کر دیتا ہے، اور جب کسی قوم میں رِشوت عام ہو جائے تو دُشمنوں کا رُعب و غلبہ ان پر ہو جاتا ہے۔ (یہ روایت مسندِ احمد میں ہے)[۵]

۸- اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ معراج میں جب ہم ساتویں آسمان پر پہنچے تو میں نے اپنے اُوپر رَعد و برق کو دیکھا، اس کے بعد ہم ایک ایسی قوم پر گزرے جن کے پیٹ رہائشی مکانات کی طرح پھولے اور پھیلے ہوئے ہیں، جن میں سانپ بھرے ہیں جو باہر سے نظر آرہے ہیں، میں نے جبریلِ امینؑ سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ سود خور ہیں۔ (یہ روایت مسندِ احمد کی ہے)[۶]

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب الربا ج:۱ ص:۲۷

[۲] مستدرک رقم الحدیث:۲۲۲۰

[۳] مسند احمد رقم الحدیث: ۲۰۹۵۱، المعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث:۱۱۰۵۳

[۴] مستدرک حاکم رقم الحدیث:۲۲۶۱

[۵] مسند احمد رقم الحدیث:۱۷۱۵۵

[۶] مسند احمد رقم الحدیث:۸۲۸۶

۹- اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عوف بن مالکؓ سے فرمایا کہ ان گناہوں سے بچو جو معاف نہیں کئے جاتے، ان میں سے ایک مالِ غنیمت کی چوری ہے اور دُوسرے سود کھانا۔ (طبرانی)[1]

۱۰- اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو تم نے قرض دیا ہو اس کا ہدیہ بھی قبول نہ کرو۔[2] (ایسا نہ ہو، اس نے یہ ہدیہ قرض کے عوض میں دیا ہو، جو سود ہے، اس لئے اس کے ہدیہ قبول کرنے سے بھی اِحتیاط چاہئے)۔

رِبا کی تعریف اور اس کی حقیقت اور اس کی دُنیوی تباہ کاریوں کے متعلق قرآن مجید کی سات آیتیں اور اَحادیثِ نبویہ کے دس اِرشادات اس جگہ بیان ہوچکے ہیں، سوچنے سمجھنے والے مسلمان کے لئے اتنا کافی ہے، اور اس مسئلے کے باقی ماندہ پہلوؤں پر بحث اور مکمل تحقیق کے لئے احقر کی ایک مستقل کتاب بنام "مسئلۂ سود" شائع ہوچکی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ

اے اِیمان والو! جب تم آپس میں معاملہ کرو اُدھار کا کسی وقتِ مقررہ تک تو اس کو لکھ لیا کرو،

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا

اور چاہئے کہ لکھ دے تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا اِنصاف سے، اور اِنکار نہ کرے لکھنے والا اس سے کہ لکھ دیوے جیسا

عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ

سکھایا اس کو اللہ نے سو اس کو چاہئے کہ لکھ دے اور بتلاتا جاوے وہ شخص کہ جس پر قرض ہے اور ڈرے اللہ سے جو اس کا ربّ ہے

وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا

اور کم نہ کرے اس میں سے کچھ، پھر اگر وہ شخص کہ جس پر قرض ہے بے عقل ہے یا ضعیف ہے

اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا

یا آپ نہیں بتلاسکتا تو بتلادے کارگزار اس کا اِنصاف سے، اور گواہ کرو

[1] المعجم الکبیر للطبرانی رقم الحدیث: ۱۴۵۳۷

[2] شعب الإیمان للبیہقیؒ رقم الحدیث: ۵۲۹۱

شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ

دو شاہد اپنے مردوں میں سے، پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں

مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا

ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند کرتے ہو گواہوں میں، تاکہ اگر بھول جائے ایک اُن میں سے تو یاد دِلادے اس کو

الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ

دُوسری، اور اِنکار نہ کریں گواہ جس وقت بلائے جاویں، اور کاہلی نہ کرو اس کے لکھنے سے

صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ

چھوٹا ہو معاملہ یا بڑا اس کی میعاد تک، اس میں پورا اِنصاف ہے اللہ کے نزدیک اور بہت دُرست رکھنے والا ہے گواہی کو

وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ

اور نزدیک ہے کہ شبہ میں نہ پڑو مگر یہ کہ سودا ہو ہاتھوں ہاتھ لیتے دیتے رہو اس کو آپس میں

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۖ

تو تم پر کچھ گناہ نہیں اگر اس کو نہ لکھو، اور گواہ کرلیا کرو جب تم سودا کرو،

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا

اور نقصان نہ کرے لکھنے والا اور نہ گواہ اور اگر ایسا کرو تو یہ گناہ کی بات ہے تمہارے اندر، اور ڈرتے رہو

اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ

اللہ سے اور اللہ تم کو سکھلاتا ہے اور اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے۔ اور اگر تم سفر میں ہو

وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ

اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو گرو ہاتھ میں رکھنی چاہیئے، پھر اگر اِعتبار کرے ایک دُوسرے کا تو چاہیئے کہ پورا کرے

الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ

وہ شخص کہ جس پر اِعتبار کیا اپنی امانت کو اور ڈرتا رہے اللہ سے جو رَبّ ہے اس کا، اور مت چھپاؤ گواہی کو

وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع ۳۹

اور جو شخص اس کو چھپاوے تو بے شک گنہگار ہے دِل اس کا، اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

اے ایمان والو! جب تم کسی معین میعاد کے لئے اُدھار کا کوئی معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، اور تم میں سے جو شخص لکھنا جانتا ہو اِنصاف کے ساتھ تحریر لکھے، اور جو شخص لکھنا جانتا ہو، لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جب اللہ نے اسے یہ علم دیا ہے تو اسے لکھنا چاہئے۔ اور تحریر وہ شخص لکھوائے جس کے ذمے حق واجب ہو رہا ہو، اور اسے چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے اور اس (حق) میں کوئی کمی نہ کرے۔ ہاں اگر وہ شخص جس کے ذمے حق واجب ہو رہا ہے ناسمجھ یا کمزور ہو یا (کسی اور وجہ سے) تحریر نہ لکھوا سکتا ہو تو اس کا سرپرست انصاف کے ساتھ لکھوائے۔ اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنالو، ہاں اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے ہو جائیں جنہیں تم پسند کرتے ہو، تاکہ اگر ان دو عورتوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دِلا دے۔ اور جب گواہوں کو (گواہی دینے کے لئے) بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ اور جو معاملہ اپنی میعاد سے وابستہ ہو، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اسے لکھنے سے اُکتاؤ نہیں۔ یہ بات اللہ کے نزدیک زیادہ قرینِ انصاف اور گواہی کو درست رکھنے کا بہتر ذریعہ ہے، اور اس بات کی قریبی ضمانت ہے کہ تم آئندہ شک میں نہیں پڑو گے۔ ہاں اگر تمہارے درمیان کوئی نقد لین دین کا سودا ہو تو اس کو نہ لکھنے میں تمہارے لئے کچھ حرج نہیں ہے۔ اور جب خرید وفروخت کرو تو گواہ بنالیا کرو۔ اور نہ لکھنے والے کو کوئی تکلیف پہنچائی جائے، نہ گواہ کو۔ اور اگر ایسا کرو گے تو یہ تمہاری طرف سے نافرمانی ہوگی۔ اور اللہ کا خوف دِل میں رکھو۔ اللہ تمہیں تعلیم دیتا ہے، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ ﴿۲۸۲﴾ اور اگر تم سفر پر ہو اور تمہیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو (ادائیگی کی ضمانت کے طور پر) رہن قبضے میں رکھ لئے جائیں۔ ہاں اگر تم ایک

دوسرے پر بھروسہ کرو تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہے وہ اپنی امانت ٹھیک ٹھیک ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے۔ اور گواہی کو نہ چھپاؤ۔ اور جو گواہی کو چھپائے وہ گنہگار دِل کا حامل ہے۔ اور جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔ (۲۸۳)

خلاصۂ تفسیر

اے اِیمان والو! جب معاملہ کرنے لگو اُدھار کا (خواہ دام اُدھار ہوں یا جو چیز خریدنا ہے وہ اُدھار ہو جیسے بیع سلم میں) ایک میعاد معین تک (کے لئے) تو اس (کی یادداشت ودستاویز) کو لکھ لیا کرو اور یہ ضرور ہے کہ تمہارے آپس میں (جو) کوئی لکھنے والا (ہووہ) اِنصاف کے ساتھ لکھے (یعنی کسی کی رعایت کر کے مضمون میں کمی بیشی نہ کرے) اور لکھنے والا لکھنے سے اِنکار بھی نہ کرے جیسا کہ خدا نے اس کو (لکھنا) سکھلایا ہے، اس کو چاہئے کہ لکھ دیا کرے اور (کاتب کو) وہ شخص (بتلادے اور) لکھوادے جس کے ذمہ وہ حق واجب ہو (کیونکہ دستاویز کا حاصل اِقرار حق کا ہوتا ہے تو جس کے ذمہ حق ہے اسی کا اِقرار ضرور ٹھہرا) اور (لکھاتے وقت) اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے اور اس (حق) میں سے ذرّہ برابر (بتلانے مین) کمی نہ کرے، پھر جس شخص کے ذمہ حق واجب تھا وہ اگر ضعیف العقل (یعنی معتوہ یا مجنون) ہو یا ضعیف البدن (یعنی نابالغ یا پیر فرتوت) ہو یا (اور کسی اِتفاقی اَمر سے) خود (بیان کرنے کی اور) لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو (مثلاً گونگا ہے اور لکھنے والا اس کا اِشارہ نہیں سمجھتا، یا مثلاً دُوسرے ممالک کا رہنے والا ہے اور زبان غیر رکھتا ہے اور لکھنے والا اس کی بولی نہیں سمجھتا) تو (ایسی حالت میں) اس کا کارکن ٹھیک ٹھیک طور پر لکھوادے، اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کرلیا کرو اور (شرعاً اصل مدار ثبوتِ دعویٰ کا یہی گواہ ہیں، گو دستاویز نہ ہو، اور خالی دستاویز بدون گواہوں کے ایسے معاملات میں حجت اور معتبر نہیں، دستاویز لکھنا صرف یادداشت کی آسانی کے لئے رہے کہ اس کا مضمون دیکھ کر اور سن کر طبعی طور پر اکثر تمام واقعہ یاد آجاتا ہے، جیسا عنقریب قرآن ہی میں آتا ہے) پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنالی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم (ان کے معتبر ہونے کی وجہ سے) پسند کرتے ہو (اور ایک مرد کی جگہ دو عورتیں اس لئے تجویز کی گئیں) تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی (شہادت کے کسی حصہ کو خواہ ذہن سے یا شہادت کے وقت بیان کرنے سے) بھول جائے تو ایک دُوسری کو یاد دِلادے (اور یاد دِلانے کے بعد شہادت کا مضمون مکمل ہوجائے)، اور گواہ بھی اِنکار نہ کیا کریں جب (گواہ بننے کے لئے) بلائے جایا کریں (کہ اس میں اِعانت ہے اپنے بھائی کی) اور تم اس (دَین) کے (باربار) لکھنے سے اُکتایا مت کرو خواہ وہ (معاملہ دَین کا) چھوٹا ہو یا بڑا ہو، یہ لکھ لینا اِنصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ دُرست رکھنے والا ہے، اور زیادہ سزاوار ہے اس

بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو (اس لئے لکھ ہی لینا اچھا ہے) مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی اِلزام (اور مضرت) نہیں اور (اتنا اس میں بھی ضرور کیا کرو کہ اس کے) خرید و فروخت کے وقت گواہ کرلیا کرو (شاید کل کو کوئی بات نکل آئے مثلاً بائع کہنے لگے کہ مجھ کو دام ہی وصول نہیں ہوئے، یا یہ چیز میں نے فروخت ہی نہیں کی، یا مشتری کہنے لگے کہ میں نے تو واپسی کا اِختیار بھی لے لیا تھا، یا ابھی تو مبیع پوری میرے پاس نہیں پہنچی) اور (جس طرح ہم نے اُوپر کاتب اور گواہ کو منع کیا ہے کہ کتابت اور شہادت سے اِنکار نہ کریں اسی طرح ہم تم کو بھی تاکید کرتے ہیں کہ تمہاری طرف سے) کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو (مثلاً اپنی مصلحت کے لئے ان کی کسی مصلحت میں خلل ڈالا جائے) اور اگر تم ایسا کروگے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا اور خدا تعالیٰ سے ڈرو (اور جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے وہ مت کرو) اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر اِحسان ہے کہ) تم کو (اَحکامِ مفیدہ کی) تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں (تو وہ مطیع اور عاصی کو بھی جانتے ہیں کہ ہر ایک کو مناسب جزا دیں گے) اور اگر تم (دَین کا معاملہ کرانے کے وقت) کہیں سفر میں ہو اور (دستاویز لکھنے کے واسطے وہاں) کوئی کاتب نہ پاؤ سو (ایسی حالت میں اِطمینان کا ذریعہ) رہن رکھنے کی چیزیں (ہیں) جو (مدیون کی طرف سے صاحبِ حق کے) قبضہ میں دے دی جائیں اور اگر (ایسے وقت میں بھی) ایک دُوسرے کا اِعتبار کرتا ہو (اور اس لئے رہن کی ضرورت نہ سمجھے) تو جس شخص کا اِعتبار کرلیا گیا ہے (یعنی مدیون) اس کو چاہئے کہ دُوسرے کا حق (پورا پورا) ادا کردے اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرے (اور اس کا حق نہ مارے) اور شہادت کا اِخفا مت کرو اور جو شخص اس کا اِخفا کرے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتے ہیں (سو اگر کوئی اِخفا کرے گا اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہے، سو وہ سزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

قرض اور اُدھار کے لئے اِقرار نامہ لکھنے کی ہدایت اور متعلقہ اَحکام

آیاتِ مذکورہ میں قانونِ معاملات جن کو آج کل کے قانون میں معاہدات کہا جاتا ہے اس کے اہم اُصول کا بیان ہے اور اس کے بعد ضابطۂ شہادت کے خاص اُصول کا ذِکر ہے۔

آج کل تو زمانہ لکھنے لکھانے کا ہے، اور تحریر ہی اِنسان کی زبان کی قائم مقام بن گئی ہے، لیکن آپ چودہ سو سال پہلے زمانہ کی طرف مڑ کر دیکھئے تو اس وقت دُنیا کا سب کاروبار صرف زبانی ہوتا تھا، لکھنے لکھانے اور دستاویز مہیا کرنے کا اُصول نہ تھا، سب سے پہلے قرآن نے اس طرف توجہ دِلائی اور فرمایا:-

اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ یعنی ''جب تم آپس میں اُدھار کا معاملہ کیا کرو کسی معین مدت کے لئے تو اس کو لکھ لیا کرو۔''

اس میں ایک اُصول تو یہ بتلا دیا کہ اُدھار کے معاملات کی دستاویز لکھنی چاہئے، تاکہ بھول چوک یا انکار کے وقت کام آئے۔

دُوسرا مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ اُدھار کا معاملہ جب کیا جائے تو اس کی میعاد ضرور مقرر کی جائے، غیر معین مدت کے لئے اُدھار دینا لینا جائز نہیں، کیونکہ اس سے جھگڑے فساد کا دروازہ کھلتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ میعاد بھی ایسی مقرر ہونا چاہئے جس میں کوئی اِبہام نہ ہو، مہینہ اور تاریخ کے ساتھ معین کی جائے، کوئی مبہم میعاد نہ رکھیں، جیسے کھیتی کٹنے کے وقت، کیونکہ وہ موسم کے اِختلاف سے آگے پیچھے ہوسکتا ہے، اور چونکہ لکھنا اس زمانے میں عام نہ تھا، اور آج بھی عام ہونے کے بعد دُنیا کی بیشتر آبادی وہی ہے جو لکھنا نہیں جانتی تو یہ ممکن تھا کہ لکھنے والا کچھ کا کچھ لکھ دے، جس سے کسی کا نفع اور کسی کا نقصان ہوجائے، اس لئے اس کے بعد اِرشاد فرمایا:-

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ یعنی ''یہ ضروری ہے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا اِنصاف کے ساتھ لکھے۔''

اس میں ایک تو اس طرف ہدایت کی گئی کہ کاتب کسی فریق کا مخصوص آدمی نہ ہو، بلکہ غیر جانب دار ہو، تاکہ کسی کو شبہ اور خلجان نہ رہے۔ دُوسرے کاتب کو ہدایت کی گئی کہ اِنصاف کے ساتھ لکھے، دُوسرے کے فانی نفع کے لئے اپنا دائمی نقصان نہ کرے۔ اس کے بعد کاتب کو اس کی ہدایت کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ ہنر دِیا ہے کہ وہ لکھ سکتا ہے اس کا شکرانہ یہ ہے کہ وہ لکھنے سے اِنکار نہ کرے۔

اس کے بعد یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی کتابت کس کی طرف سے ہو تو فرمایا:-

وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ ، یعنی ''لکھوادے وہ آدمی جس کے ذمہ حق ہے'' مثلاً سودا خریدا اور قیمت کا اُدھار کیا تو جس شخص کے ذمہ اُدھار ہے وہ دستاویز کا مضمون لکھوادے کیونکہ یہ اس کی طرف سے اِقرار نامہ ہوگا، اور لکھوانے میں بھی یہ اِحتمال تھا کہ کوئی کمی بیشی کردے، اس لئے فرمایا: وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـــًٔا ؕ یعنی ''اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے اور حق کے لکھوانے میں ذَرّہ برابر کمی نہ کرے۔'' معاملات میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص پر حق عائد ہو وہ خفیف العقل یا سٹھیا ہوا بوڑھا، یا نابالغ بچہ یا گونگا ہو، یا کوئی دُوسری زبان بولنے والا ہو جس کو کاتب نہیں سمجھتا، اس لئے دستاویز لکھوانے پر اس کو قدرت نہیں ہوتی، اس لئے اس کے بعد فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آئے تو ان کی طرف سے ان کا ولی لکھوادے۔ مجنون اور نابالغ کی طرف سے تو ولی کا ہونا ظاہر ہے کہ ان کے سارے معاملات ولی ہی کی معرفت ہوا کرتے ہیں، اور گونگے یا دُوسری زبان بولنے والے کا ولی بھی یہ کام کرسکتا ہے، اور اگر وہ کسی کو اپنا وکیل بنادے تو بھی ہوسکتا

ہے، قرآن میں اس جگہ لفظ "ولی" دونوں معنی پر حاوی ہے۔

ضابطۂ شہادت کے چند اہم اُصول

یہاں تک معاملات میں دستاویز لکھنے اور لکھوانے کے اہم اُصول کا بیان تھا، آگے یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی صرف تحریر کو کافی نہ سمجھیں، بلکہ اس پر گواہ بھی بنالیں کہ اگر کسی وقت باہمی نزاع پیش آجائے تو عدالت میں ان گواہوں کی گواہی سے فیصلہ ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محض تحریر حجت شرعی نہیں، جب تک کہ اس پر شہادتِ شرعی موجود نہ ہو خالی تحریر پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، آج کل کی عام عدالتوں کا بھی یہی دستور ہے کہ تحریر پر زبانی تصدیق وشہادت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتیں۔

گواہی کے لئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہیں

اس کے بعد ضابطۂ شہادت کے چند اہم اُصول بتلائے گئے، مثلاً :-

۱- گواہ دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں ہونا ضروری ہیں، ایک اکیلا مرد یا صرف دو عورتیں عام معاملات کی گواہی کے لئے کافی نہیں۔

گواہوں کی شرائط

۲- دُوسرے یہ کہ گواہ مسلمان ہوں، لفظ مِنْ رِّجَالِكُمْ میں اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے۔

۳- تیسرے یہ کہ گواہ ثقہ اور عادل ہوں، جن کے قول پر اِعتماد کیا جاسکے، فاسق وفاجر نہ ہوں، مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ میں یہ حکم مذکور ہے۔

گواہی دینے سے بلا عذرِ شرعی اِنکار کرنا گناہ ہے

اس کے بعد لوگوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب ان کو کسی معاملہ میں گواہ بنانے کے لئے بلایا جائے تو وہ آنے سے اِنکار نہ کریں، کیونکہ شہادت ہی اِحیائے حق کا ذریعہ اور جھگڑے چکانے کا طریقہ ہے، اس لئے اس کو اہم قومی خدمت سمجھ کر تکلیف برداشت کریں۔ اس کے بعد پھر معاملات کی دستاویز لکھنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو لکھنا چاہئے، اس میں اُکتائیں نہیں، کیونکہ معاملات کا قلم بند کرلینا اِنصاف کو قائم رکھنے اور صحیح شہادت دینے اور شک وشبہ سے بچنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے، ہاں اگر کوئی معاملہ دست بدست ہو، اُدھار نہ ہو، اس کو اگر نہ لکھیں تب بھی کچھ حرج نہیں، مگر اتنا اس میں بھی کیا جائے کہ معاملہ پر گواہ بنالیں کہ شاید کسی وقت فریقین میں کوئی نزاع واختلاف پیش آجائے،

مثلاً بائع کہے کہ قیمت وصول نہیں ہوئی، یا مشتری کہے کہ مجھے مبیع پوری وصول نہیں ہوئی، تو اس جھگڑے کے فیصلہ میں شہادت کام آئے گی۔

اِسلام میں عدل وانصاف قائم کرنے کا اہم اُصول کہ گواہوں کو کوئی نقصان یا تکلیف نہ پہنچے

آیت کے شروع میں لکھنے والوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ لکھنے یا شاہد بننے سے اِنکار نہ کریں، تو یہاں یہ احتمال تھا کہ لوگ ان کو پریشان کریں گے، اس لئے آخرِ آیت میں فرمایا: وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ یعنی ''کسی لکھنے والے یا گواہی دینے والے کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔'' یعنی ایسا نہ کریں کہ اپنی مصلحت اور فائدہ کے لئے اُن کی مصلحت اور فائدے میں خلل ڈالیں، پھر فرمایا: وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ یعنی ''اگر تم نے لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچایا تو اس میں تم کو گناہ ہوگا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اسی لئے فقہاء نے فرمایا کہ اگر لکھنے والا اپنے لکھنے کی مزدوری مانگے یا گواہ اپنی آمد و رفت کا ضروری خرچ طلب کرے تو یہ اس کا حق ہے، اس کو اَدا نہ کرنا بھی اس کو نقصان پہنچانے میں داخل اور ناجائز ہے۔ اِسلام نے اپنے نظامِ عدالت میں جس طرح گواہ کو گواہی دینے پر مجبور کیا ہے، اور گواہی چھپانے کو سخت گناہ قرار دِیا ہے، اس طرح اس کا بھی اِنتظام کیا کہ لوگ گواہی سے بچنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اسی دوطرفہ اِحتیاط کا یہ اثر تھا کہ ہر معاملہ میں سچے بے غرض گواہ مل جاتے اور فیصلے جلد اور آسان، حق کے مطابق ہو جاتے۔ آج کی دُنیا نے اس قرآنی اُصول کو نظر اَنداز کر دیا ہے تو سارا نظامِ عدالت برباد ہو گیا، واقعہ کے اصلی اور سچے گواہ ملنا تقریباً مفقود ہو گیا، ہر شخص گواہی سے جان چرانے پر مجبور ہو گیا، وجہ یہ کہ جس کا نام گواہی میں آ گیا اگر معاملہ پولیس اور فوجداری کا ہے تو روز وقت بے وقت تھانیدار صاحب اس کو بلا بھیجتے ہیں، اور بعض اوقات گھنٹوں بٹھائے رکھتے ہیں، دیوانی عدالتوں میں بھی گواہ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی مجرم ہے، پھر روز روز مقدمہ کی پیشیاں بدلتی ہیں، تاریخیں لگتی ہیں، گواہ بیچارہ اپنا کاروبار اور مزدوری اور ضروریات چھوڑ کر آنے پر مجبور ہے، ورنہ وارنٹ کے ذریعے گرفتار کیا جائے، اس لئے کوئی شریف کاروباری آدمی کسی معاملہ کا گواہ بننا اپنے لئے ایک عذاب سمجھنے اور مقدور بھر اس سے بچنے پر مجبور کر دیا گیا، صرف پیشہ ور گواہ ملتے ہیں، جن کے ہاں جھوٹ سچ میں کوئی اِمتیاز نہیں ہوتا، قرآنِ حکیم نے ان بنیادی ضروریات کو اہمیت کے ساتھ بتلا کر ان تمام خرابیوں کا اِنسداد فرمایا، آیت کے آخر میں اِرشاد ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ یعنی ''ڈرو اللہ سے، اور اللہ تعالیٰ تمہیں اُصولِ صحیحہ کی تعلیم دیتا ہے (یہ اس کا اِحسان ہے)، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

چونکہ اس آیت میں بہت سے اَحکام آئے ہیں، بعض فقہاء نے بیس اہم مسائلِ فقہی اس آیت سے نکالے ہیں، اور قرآنِ کریم کی عام عادت ہے کہ قانون بیان کرنے سے آگے اور پیچھے خوفِ خدا اور خوفِ روزِ جزا دِلا کر لوگوں کے ذہنوں کو تعمیلِ حکم کے لئے آمادہ کرتا ہے، اسی طریقہ کے مطابق اس آیت کا خاتمہ خوفِ خداوندی پر کیا اور یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، اگر تم کسی ناجائز حیلہ سے بھی کوئی خلاف ورزی کروگے تو خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

دُوسری آیت میں دو اہم مضمون بیان فرمائے گئے، ایک یہ کہ اُدھار کے معاملہ میں اگر کوئی یہ چاہے کہ اعتماد کے لئے کوئی چیز گروی رکھ لے تو اس کی بھی اجازت ہے، مگر اس میں لفظ "مَّقْبُوْضَةٌ" سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ شئ مرہونہ سے نفع اُٹھانا اس کے لئے جائز نہیں، مرتہن کو صرف اتنا حق ہے کہ اپنے قرض وصول ہونے تک اس کی چیز پر اپنا قبضہ رکھے، اور منافع اس کے وہ سب اصل مالک کا حق ہیں۔

دُوسرا مضمون یہ اِرشاد فرمایا کہ جس شخص کو کسی نزاعی معاملہ کا صحیح علم ہو وہ شہادت کو نہ چھپائے، اور اگر اس نے چھپایا تو اس کا دِل گنہگار ہے، دِل کو اس لئے گنہگار فرمایا کہ کوئی شخص اس کو خالی زبان ہی کا گناہ نہ سمجھے، کیونکہ اوّل ارادہ تو دِل ہی سے ہوا ہے، اس لئے اوّل گناہ دِل ہی کا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ

اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اگر ظاہر کروگے اپنے جی کی بات یا

تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

چھپاؤگے اس کو، حساب لے گا اس کا تم سے اللہ، پھر بخشے گا جس کو چاہے اور عذاب کرے گا جس کو چاہے،

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آسان ترجمۂ قرآن

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ اور جو باتیں تمہارے دِلوں میں ہیں، خواہ تم ان کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے ان کا حساب لے گا۔ پھر جس کو چاہے گا معاف کردے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔ اور

اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (۲۸۴)

خلاصۂ تفسیر

اللہ ہی کی مِلک میں ہیں سب (مخلوقات) جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں، (جیسے خود زمین و آسمان بھی اسی کی مِلک میں ہیں) اور (جب وہ مالک ہیں تو ان کو اپنی مملوکہ اشیاء میں ہر طرح قانون بنانے کا حق ہے، اس میں کسی کو مجالِ کلام نہ ہونی چاہئے، جیسا کہ ایک قانون یہ ہے کہ) جو باتیں (عقائدِ فاسدہ یا اخلاقِ مذمومہ یا گناہوں پر پختہ عزم و اِرادہ کی) تمہارے نفسوں میں ہیں، ان کو اگر تم (زبان و جوارح سے) ظاہر کرو گے (مثلاً زبان سے کلمۂ کفر کہہ دیا، یا اپنے تکبر، حسد وغیرہ کا خود اِظہار کر دیا، یا کسی گناہ جس کا قصد تھا اس کو کر ہی ڈالا) یا کہ (دِل ہی میں) پوشیدہ رکھو گے (دونوں حالتوں میں) حق تعالیٰ تم سے (مثل دُوسرے معاصی کے اُن کا) حساب لیں گے (پھر حساب لینے کے بعد بجز کفر وشرک کے) جس کے لئے (بخشنا) منظور ہوگا، بخش دیں گے، اور جس کو (سزا دینا) منظور ہوگا سزا دیں گے، اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں شہادت کے اِظہار کا حکم اور چھپانے کی ممانعت مذکور تھی، یہ آیت بھی اسی مضمون کا تکملہ ہے، اس میں اِنسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ شہادت کا چھپانا حرام ہے، اگر تم نے معاملہ کو جانتے ہوئے چھپایا تو ربّ علیم وخبیر تم سے اس کا حساب لے گا، حضرت ابنِ عباسؓ، عکرمہؒ، شعبیؒ اور مجاہدؒ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ (قرطبی)

اور عمومِ الفاظ کے اِعتبار سے عام ہے، اور تمام اِعتقادات، عبادات اور معاملات کو شامل ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مشہور قول اس آیت کی تفسیر میں یہی ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوق کے تمام اعمال کا محاسبہ فرمائیں گے، وہ عمل بھی جس کو وہ کر گزرے ہیں، اور وہ بھی جن کا دِل سے پختہ اِرادہ کر لیا، اور اس کو دِل میں چھپا کر رکھا، مگر عمل کی نوبت نہیں آئی، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابنِ عمرؓ منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مؤمن قیامت کے روز اپنے ربّ عزوجل وعلیٰ سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس کے ایک ایک گناہ کو یاد دِلائیں گے، اور سوال کریں گے کہ تو جانتا ہے کہ تو نے یہ گناہ کیا تھا، بندۂ مؤمن اِقرار کرے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے دُنیا میں بھی تیری پردہ پوشی کی، اور تیرا گناہ لوگوں میں ظاہر نہیں ہونے دیا، اور میں آج اس کو معاف کرتا

ہوں، اور حسنات کا اعمال نامہ اس کو دے دیا جائے گا، لیکن کفار اور منافقین کے گناہوں کو مجمع عام میں بیان کیا جائے گا۔ [۱]

اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے جس میں پوشیدہ چیزوں کا جائزہ لیا جائے گا، اور دِلوں کے پوشیدہ راز کھولے جائیں گے، اور یہ کہ میرے کاتبِ اعمال فرشتوں نے تو تمہارے صرف وہ اعمال لکھے ہیں جو ظاہر تھے، اور میں اُن چیزوں کو بھی جانتا ہوں جن پر فرشتوں کو اِطلاع نہیں، اور نہ انہوں نے وہ چیزیں تمہارے نامۂ اعمال میں لکھی ہیں، اور اَب وہ سب تمہیں بتلاتا ہوں، اور ان پر محاسبہ کرتا ہوں، پھر جس کو چاہوں گا بخش دُوں گا، اور جس کو چاہوں گا عذاب دُوں گا، پھر مؤمنین کو معاف کردیا جائے گا اور کفار کو عذاب دیا جائے گا۔ (قرطبی) [۲]

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اِرشاد ہے:-

إِنَّ اللهَ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِيْ عَمَّا حَدَّثَتْ أَنْفُسُهَا مَا لَمْ يَتَكَلَّمُوْا أَوْ يَعْمَلُوْا بِهٖ۔ (قرطبی) [۳]

''اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کو معاف کردیا ہے وہ جو اُن کے دِل میں خیال آیا، جب تک اس کو زبان سے نہ کہا، یا عمل نہ کیا ہو۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دِل کے اِرادہ پر کوئی عذاب وعتاب نہیں ہے، اِمام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث اَحکامِ دُنیا سے متعلق ہے، طلاق، عتاق، بیع، ہبہ وغیرہ محض دِل میں اِرادہ کرلینے سے منعقد نہیں ہوجاتے، جب تک اُن کو زبان سے یا عمل سے نہ کیا جائے، اور آیت میں جو کچھ مذکور ہے وہ اَحکامِ آخرت سے متعلق ہے، اس لئے کوئی تعارض نہیں۔ اور دُوسرے حضراتِ علماء نے اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے کہ جس حدیث میں دِل کی چھپی ہوئی چیزوں کی معافی مذکور ہے اس سے مراد وہ وساوس اور غیر اِختیاری خیالات ہیں جو اِنسان کے دِل میں بغیر قصد اور اِرادے کے آجاتے ہیں، بلکہ اُن کے خلاف کا اِرادہ کرنے پر بھی وہ آتے رہتے ہیں، ایسے غیر اِختیاری خیالات اور وساوس کو اس اُمت کے لئے حق تعالیٰ نے معاف کردیا ہے، اور آیتِ مذکورہ میں جس محاسبہ کا ذِکر ہے اس سے مراد وہ اِرادے اور نیتیں ہیں جو اِنسان اپنے قصد اور اِختیار سے اپنے دِل میں جماتا ہے، اور اس کے عمل میں لانے کی کوشش بھی کرتا ہے، پھر اِتفاق سے کچھ موانع پیش آجانے کی بنا پر اُن پر عمل نہیں کرسکتا، قیامت کے دن ان کا محاسبہ ہوگا، پھر حق تعالیٰ جس کو چاہیں اپنے فضل وکرم سے بخش دیں، جس کو چاہیں عذاب دیں، جیسا کہ مذکورہ حدیث بخاری ومسلم میں گزر چکا ہے، اور چونکہ آیتِ مذکورہ کے ظاہری الفاظ میں دونوں قسم کے خیالات داخل ہیں خواہ اِختیاری ہوں یا غیر اِختیاری، اس لئے جب یہ آیت نازل

---

[۱] صحیح البخاری، ابواب المظالم والقصاص، باب قول الله تعالىٰ: الا لعنة الله ...إلخ ج:۱ ص:۳۳۰ وصحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة الله تعالیٰ ...إلخ ج:۲ ص:۳۶۰

[۲] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآیة ج:۳ ص:۴۲۲

[۳] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان تجاوز الله تعالیٰ ...إلخ ج:۱ ص:۷۷، ۷۸

ہوئی تو صحابہ کرامؓ کو سخت فکر وغم لاحق ہوگیا، کہ اگر غیر اختیاری خیالات ووساوس پر بھی مؤاخذہ ہونے لگا تو کون نجات پائے گا، صحابہ کرامؓ نے اس فکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، تو آپ نے سب کو یہ تلقین فرمائی کہ جو کچھ حکمِ ربانی نازل ہوا، اس کی تعمیل واطاعت کا پختہ قصد کرو اور کہو: سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا یعنی ''ہم نے حکم سن لیا اور تعمیل کی'' صحابہ کرامؓ نے اس کے مطابق کیا اور اس پر یہ جملہ قرآن کا نازل ہوا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنی ''اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی قدرت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔''

جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر اختیاری وساوس اور خیالات پر مؤاخذہ نہیں ہوگا، اس پر صحابہ کرامؓ کا اطمینان ہوگیا، یہ حدیث صحیح مسلم میں بروایت ابن عباسؓ نقل کی گئی ہے (قرطبی)، [1] یہ پوری آیت آگے آرہی ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ انسان پر جو اعمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کئے گئے ہیں، یا حرام کئے گئے ہیں وہ کچھ تو ظاہری اعضاء وجوارح سے متعلق ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور تمام معاملات اسی قسم میں داخل ہیں، اور کچھ اعمال واَحکام وہ بھی ہیں جو انسان کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتے ہیں، ایمان واعتقاد کے تمام مسائل تو اسی میں داخل ہیں، اور کفر وشرک جو سب سے زیادہ حرام وناجائز ہیں، ان کا تعلق بھی انسان کے قلب سے ہی ہے، اخلاقِ صالحہ، تواضع، صبر، قناعت، سخاوت وغیرہ، اسی طرح اخلاقِ رذیلہ، کبر، حسد، بغض، حبِ دُنیا، حرص وغیرہ یہ سب چیزیں ایک درجہ میں حرامِ قطعی ہیں، ان سب کا تعلق بھی انسان کے اعضاء وجوارح سے نہیں بلکہ دِل سے اور باطن سے ہے۔ [2]

اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ جس طرح اعمالِ ظاہرہ کا حساب قیامت میں لیا جائے گا، اسی طرح اعمالِ باطنہ کا بھی حساب ہوگا، اور خطا پر بھی مؤاخذہ ہوگا۔ یہ آیت سورۂ بقرہ کے اَخیر میں لائی گئی، اس میں بڑی حکمت ہے، کیونکہ سورۂ بقرہ قرآنِ کریم کی ایسی بڑی اور مہم سورۃ ہے جس میں اَحکامِ الٰہیہ کا بہت بڑا حصہ آگیا ہے، اس سورۃ میں اُصولی اور فروعی معاش ومعاد کے متعلق اہم ہدایات، نماز، زکوٰۃ، روزہ، قصاص، حج، جہاد، طہارت، طلاق، عدت، خلع، رضاعت، حرمتِ شراب، رِبا اور قرض، لین دین کے جائز وناجائز طریقوں کا تفصیلی بیان آگیا ہے، اسی لئے حدیث میں اس سورت کا نام ''سنام القرآن'' بھی آیا ہے، یعنی قرآن کا سب سے بلند حصہ، اور ان تمام اَحکام کی تعمیل میں سب کی رُوح اِخلاص ہے، یعنی کسی کام کو کرنا یا اس سے بچنا دونوں خالص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے ہوں، ان میں نام ونمود یا دُوسری نفسانی اغراض شامل نہ ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ اِخلاص کا تعلق اِنسان کے باطن اور قلب سے ہے، سب کی دُرستی اسی پر موقوف ہے، اس لئے سورت کے آخر میں اس آیت کے ذریعہ اِنسان کو تنبیہ کردی گئی کہ فرائض کی ادائیگی یا محرمات سے پرہیز کے

---

[1] تفسیر القرطبی تحت هٰذه الآية ج:۳ ص:۴۲۱

[2] تفسیر المظہری تحت هٰذه الآية ج:۱ ص:۴۳۹، ۴۴۰

معاملے میں مخلوق کے سامنے تو حیلہ جوئی کے ذریعہ بھی راہِ فرار اختیار کی جاسکتی ہے، مگر حق تعالیٰ علیم وخبیر ہے، اس سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں، اس لئے جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ رقیب وحفیظ میرے سب ظاہری اور باطنی حالات کو لکھ رہا ہے، اور سب کا حساب قیامت کے روز دینا ہے، یہی وہ رُوح ہے جو قرآنِ کریم اِنسانوں میں پیدا کرتا ہے کہ ہر قانون کے اوّل یا آخر میں خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کا ایسا محافظ ان کے قلوب پر بٹھاتا ہے کہ وہ رات کی اندھیری میں اور خلوتوں میں بھی کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہوا ڈرتا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

مان لیا رسول نے جو کچھ اُترا اس پر اس کے رَبّ کی طرف سے اور مسلمانوں نے بھی، سب نے مانا اللہ کو

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۚ

اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو، کہتے ہیں کہ ہم جدا نہیں کرتے کسی کو اس کے پیغمبروں میں سے،

وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

اور کہہ اُٹھے کہ ہم نے سنا اور قبول کیا، تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رَبّ! اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے، اسی کو ملتا ہے جو اس نے کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا،

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا

اے ہمارے رَبّ! نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا چوکیں، اے رَبّ ہمارے! اور نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری

كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ

جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر، اے رَبّ ہمارے! اور نہ اُٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس کی ہم کو طاقت نہیں،

وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا

اور درگزر کر ہم سے، اور بخش ہم کو، اور رحم کر ہم پر، تو ہی ہمارا رَبّ ہے مدد کر ہماری

عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع

کافروں پر۔

ع ۴۰ ۸

آسان ترجمۂ قرآن

یہ رسول (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ان کی طرف ان کے رَبّ کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اور (ان کے ساتھ) تمام مسلمان بھی۔ یہ سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان لائیں، کسی پر نہ لائیں) اور وہ یہ کہتے ہیں کہ: "ہم نے (اللہ اور رسول کے اَحکام کو توجہ سے) سن لیا ہے، اور ہم خوشی سے (ان کی) تعمیل کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم آپ کی مغفرت کے طلب گار ہیں۔ اور آپ ہی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔" ﴿۲۸۵﴾ اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا۔ اس کو فائدہ بھی اسی کام سے ہوگا جو وہ اپنے ارادے سے کرے، اور نقصان بھی اسی کام سے ہوگا جو اپنے ارادے سے کرے۔ (مسلمانو! اللہ سے یہ دُعا کیا کرو کہ:) "اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہوجائے تو ہماری گرفت نہ فرمایئے۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالئے جیسا آپ نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالئے جسے اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرمایئے، ہمیں بخش دیجئے، اور ہم پر رحم فرمایئے۔ آپ ہی ہمارے حامی وناصر ہیں، اس لئے کافر لوگوں کے مقابلے میں ہمیں نصرت عطا فرمایئے۔" ﴿۲۸۶﴾

خلاصۂ تفسیر

اِعتقاد رکھتے ہیں رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز (کے حق ہونے) کا جو اُن کے پاس اُن کے رَبّ کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور (دُوسرے) مؤمنین بھی (اس کا اِعتقاد رکھتے ہیں، آگے قرآن پر اِعتقاد رکھنے کی تفصیل ہے کہ کس کس چیز کے عقیدہ رکھنے کو قرآن پر اِعتقاد رکھنا کہا جائے گا) سب کے سب (رسول بھی اور دُوسرے

مؤمنین بھی) عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ (کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے اور ذات وصفات میں کامل ہے) اور اس کے فرشتوں کے ساتھ (کہ وہ موجود ہیں اور گناہوں سے پاک ہیں اور مختلف کاموں پر مقرر ہیں) اور اس کی کتابوں کے ساتھ (کہ اصل میں سب سچی ہیں) اور اس کے سب پیغمبروں کے ساتھ (کہ وہ پیغمبر ہیں اور سچے ہیں اور پیغمبروں پر عقیدہ رکھنا اُن کا اس طور پر ہے کہ یہ کہتے ہیں) کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں (عقیدہ رکھنے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں، کسی کو نہ سمجھیں) اور اُن سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا اِرشاد) سنا اور (اس کو) خوشی سے مانا، ہم آپ سے بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! اور آپ ہی کی طرف (ہم سب کو) لوٹنا ہے، (یعنی ہم نے جو پہلی آیت میں کہا کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہوگا اس سے مراد اُمورِ غیر اختیاری نہیں بلکہ صرف اُمورِ اختیاریہ ہیں، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کسی کو (اَحکامِ شرعیہ میں) مکلّف نہیں بناتا (یعنی ان اُمور کو واجب یا حرام نہیں فرماتا) مگر اسی کا جو اس کی طاقت (اور اِختیار) میں ہو اس کو ثواب بھی اسی کا ہوتا ہے جو اِرادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو اِرادہ سے کرے (اور جو وسعت سے باہر ہے اس کا مکلّف نہیں کیا گیا، اور جس کے ساتھ قصد اور ارادہ متعلق نہیں اس کا نہ ثواب ہے نہ عذاب، اور وساوس طاقت سے خارج ہیں تو اُن کے آنے کو حرام اور اُن کے نہ آنے دینے کو واجب نہیں کیا، اور نہ اُن پر عذاب رکھا)، اے ہمارے رَبّ! ہم پر داروگیر نہ فرمایئے اگر ہم بھول جاویں یا چوک جاویں، اے ہمارے رَبّ! (ہماری یہ بھی درخواست ہے کہ) ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے، اے ہمارے رَبّ! اور (ہم یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ) ہم پر کوئی ایسا بار (تکلیف کا دُنیا یا آخرت میں) نہ ڈالئے جس کی ہم کو سہار نہ ہو، اور درگزر کیجئے ہم سے، اور بخش دیجئے ہم کو، اور رحم کیجئے ہم پر، آپ ہمارے کارساز ہیں (اور کارساز طرف دار ہوتا ہے) سو آپ ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجئے۔

معارف ومسائل

ان دو آیتوں کے خاص فضائل

یہ سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں ہیں، احادیثِ صحیحہ معتبرہ میں ان دو آیتوں کے بڑے بڑے فضائل مذکور ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے رات کو یہ دو آیتیں پڑھ لیں تو یہ اس کے لئے کافی ہیں۔ [1]

اور ابنِ عباسؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دو آیتیں جنت کے خزائن میں سے نازل فرمائی ہیں، جس کو تمام مخلوق کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے خود رحمٰن نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا، جو

[1] صحيح البخاري، كتاب فضائل القرآن، باب فضل البقرة ج:۲ ص:۷۴۹

شخص ان کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھ لے تو وہ اس کے لئے قیام اللیل یعنی تہجد کے قائم مقام ہو جاتی ہیں۔ اور مستدرک حاکم اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے سورۂ بقرہ کو ان دو آیتوں پر ختم فرمایا ہے جو مجھے اس خزانۂ خاص سے عطا فرمائی ہیں جو عرش کے نیچے ہے، اس لئے تم خاص طور پر ان آیتوں کو سیکھو اور اپنی عورتوں اور بچوں کو سکھاؤ۔[1] اسی لئے حضرت فاروقِ اعظم اور علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ کوئی آدمی جس کو کچھ بھی عقل ہو وہ سورۂ بقرہ کی ان دونوں آیتوں کو پڑھے بغیر نہ سوئے گا۔ ان دونوں آیتوں کی معنوی خصوصیات تو بہت ہیں، لیکن ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں اکثر اَحکامِ شرعیہ اجمالاً وتفصیلاً ذِکر کردیئے گئے ہیں، اِعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت وغیرہ آخری دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں اِطاعت شعار مؤمنین کی مدح کی گئی ہے، جنہوں نے اللہ جل شانہٗ کے تمام اَحکام پر لبیک کہا، اور تعمیل کے لئے تیار ہوگئے۔ اور دُوسری آیت میں ایک شبہ کا جواب دیا گیا جو ان دو آیتوں سے پہلی آیت میں صحابہ کرامؓ کو پیدا ہوگیا تھا، اور ساتھ ہی اپنے فضل ورحمتِ بے حساب کا ذِکر فرمایا گیا، وہ یہ تھا کہ جب قرآنِ کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ جو کہ تمہارے دِلوں میں ہے تم اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، ہر حال میں اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لیں گے، آیت کی اصل مراد تو یہ تھی کہ اپنے اِختیار و اِرادہ سے جو کوئی عمل اپنے دِل میں کروگے اس کا حساب ہوگا، غیر اِختیاری وسوسہ اور بھول چوک اس میں داخل ہی نہ تھی، لیکن الفاظِ قرآن بظاہر عام تھے، ان کے عموم سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اِنسان کے دِل میں غیر اِختیاری طور پر کوئی خیال آجائے گا تو اس کا بھی حساب ہوگا، صحابہ کرامؓ یہ سن کر گھبرا اُٹھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یارسول اللہ! اب تک تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہم جو کام اپنے اِرادہ و اِختیار سے کرتے ہیں، حساب اُن ہی اعمال کا ہوگا، غیر اِختیاری خیالات جو دِل میں آجاتے ہیں ان کا حساب نہ ہوگا، مگر اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر خیال پر جو دِل میں آئے حساب ہوگا، اس میں تو عذاب سے نجات پانا سخت دُشوار ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ آیت کی صحیح مراد معلوم تھی، مگر الفاظ کے عموم کے پیشِ نظر آپ نے اپنی طرف سے کچھ کہنا پسند نہ فرمایا بلکہ وحی کا اِنتظار کیا، اور صحابہ کرامؓ کو یہ تلقین فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آئے خواہ آسان ہو یا دُشوار، مؤمن کا کام یہ نہیں کہ اس کے ماننے میں ذرا بھی تأمل کرے، تم کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اَحکام سن کر یہ کہو: سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۲۸۵ یعنی ''اے ہمارے پروردگار! ہم نے آپ کا حکم سنا اور اس کی اِطاعت کی، اے ہمارے پروردگار! اگر حکم کی تعمیل میں ہم سے کوئی کوتاہی یا فروگزاشت ہوئی ہو تو اس کو معاف فرمادے، کیونکہ ہمارا سب کا آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔'' صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ایسا ہی کیا، اگرچہ اُن کے ذہن میں یہ خیال کھٹک رہا تھا کہ بے اِختیار دِل میں آنے والے خیالات اور وساوس

---

[1] المستدرك رقم الحديث: ۳۰۲۳ وشعب الإيمان للبيهقيؒ رقم الحديث: ۲۳۰۷

سے بچنا تو سخت دُشوار ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں نازل فرمائیں، جن میں سے پہلی آیت میں مسلمانوں کی مدح، اور دُوسری میں اس آیت کی اصلی تفسیر بتلائی گئی جس میں صحابہ کرامؓ کو اِشتباہ پیش آیا تھا، اب پہلی آیت کے الفاظ دیکھئے:-

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ یعنی اِیمان رکھتے ہیں رسول اس چیز پر جو اُن کے پاس نازل ہوئی اُن کے رَبّ کی طرف سے، اس میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح فرمائی اور اس میں بجائے آپ کا نام مبارک لینے کے لفظ ''رسول'' فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتشریف کو واضح کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا: وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ یعنی جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی وحی پر اِیمان واِعتقاد ہے، اسی طرح عام مؤمنین کا بھی اِعتقاد ہے، اور جو طرزِ بیان اس جملہ میں اِختیار فرمایا کہ پہلے پورا جملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اِیمان کے ذِکر میں لایا گیا، اس کے بعد مؤمنین کے اِیمان کا علیحدہ تذکرہ کیا گیا، اس میں اِشارہ ہے کہ اگرچہ نفسِ اِیمان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمان شریک ہیں، لیکن درجاتِ اِیمان کے اِعتبار سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مشاہدہ اور سماع کی بنا پر ہے، اور دُوسرے مسلمانوں کا علم اِیمان بالغیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُؤیت کی بنا پر۔

اس کے بعد اُس اِیمانِ مجمل کی تفصیل بتلائی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مؤمنین میں شریک تھا، کہ وہ اِیمان تھا اللہ تعالیٰ کے موجود اور ایک ہونے پر اور تمام صفاتِ کاملہ کے ساتھ متصف ہونے پر، اور فرشتوں کے موجود ہونے پر، اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور سب رسولوں کے سچے ہونے پر۔

اس کے بعد اس کی وضاحت فرمائی کہ اس اُمت کے مؤمنین پچھلی اُمتوں کی طرح ایسا نہ کریں گے کہ اللہ کے رسولوں میں باہمی تفرقہ ڈالیں کہ بعض کو نبی مانیں اور بعض کو نہ مانیں، جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مانا مگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہ مانا، اس اُمت کی یہ مدح فرمائی کہ یہ اللہ کے کسی رسول کا اِنکار نہیں کرتے، اور پھر صحابہ کرامؓ کے اس جملے پر ان کی تعریف کی گئی جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِرشاد کے موافق زبان سے کہا تھا: سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾۔

اس کے بعد دُوسری آیت میں ایک خاص انداز سے وہ شبہ دُور کیا گیا جو پچھلی آیت کے بعض جملوں سے پیدا ہوسکتا تھا، کہ دِل میں چھپے ہوئے خیالات پر حساب ہوا تو عذاب سے کیسے بچیں گے، اِرشاد فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ یعنی ''اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زائد کام کا حکم نہیں دیتے۔'' اس لئے غیر اِختیاری طور پر جو خیالات

وسوسے دِل میں آجائیں، اور پھر ان پر کوئی عمل نہ ہو تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاف ہیں، حساب اور مؤاخذہ صرف ان افعال پر ہوگا جو اِختیار اور اِرادہ سے کئے جائیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح اِنسان کے اعمال و افعال جو ہاتھ، سر، آنکھ اور زبان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو اعمالِ ظاہرہ کہا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک اِختیاری جو اِرادہ اور اِختیار سے کئے جائیں، جیسے اِرادہ سے بولنا، اِرادہ سے کسی کو مارنا۔ دُوسرے غیر اختیاری، جو بلا اِرادہ سرزد ہوجائیں، جیسے زبان سے کہنا چاہتا تھا کچھ، اور نکل گیا کچھ، یا رعشہ سے بلا اِختیار ہاتھ کی حرکت ہوئی، اس سے کسی کو تکلیف پہنچ گئی۔ ان میں سب کو معلوم ہے کہ حساب وکتاب اور جزا و سزا افعالِ اِختیاریہ کے ساتھ مخصوص ہیں، اَفعالِ غیر اِختیاریہ کا نہ اِنسان مکلّف ہے نہ اُن پر اس کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اسی طرح وہ افعال جن کا تعلق باطن یعنی دِل کے ساتھ ہے، ان کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک اِختیاری جیسے کفر وشرک کا عقیدہ جس کو قصد و اِختیار کے ساتھ دِل میں جمایا ہے، یا سوچ سمجھ کر اِرادہ کے ساتھ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا جس کو ''تکبر'' کہا جاتا ہے، یا پختہ اِرادہ کرنا کہ شراب پیوں گا۔ اور دُوسرے غیر اِختیاری، مثلاً بغیر قصد و اِرادہ کے دِل میں کسی بُرے خیال کا آجانا، ان میں بھی حساب وکتاب اور مؤاخذہ صرف اِختیاری افعال پر ہے، غیر اختیاری پر نہیں۔

اس تفسیر جو خود قرآن نے بیان کردی صحابہ کرامؓ کو اِطمینان ہوگیا کہ غیر اِختیاری وساوس وخیالات کا حساب وکتاب اور ان پر عذاب وثواب نہ ہوگا، اسی مضمون کو آخر میں اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا ہے: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ یعنی ''اِنسان کو ثواب بھی اس کام کا ہوتا ہے جو اِرادے سے کرے، اور عذاب بھی اس کام پر ہوتا ہے جو اِرادہ سے کرے۔''

اور مراد یہ ہے کہ اِبتداءً بلا واسطہ اس عمل کا ثواب یا عذاب ہوگا جو قصد و اِرادہ سے کرے، کسی ایسے عمل کا ثواب وعذاب بالواسطہ ہوجانا جس کا اس نے اِرادہ نہیں کیا اس کے منافی نہیں، اس سے اس شبہ کا جواب ہوگیا کہ بعض اوقات آدمی کو بلاقصد و اِرادہ بھی ثواب یا عذاب ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن شریف کی دُوسری آیات اور بہت سی روایاتِ حدیث سے ثابت ہے، کہ جو آدمی کوئی ایسا نیک کام کرے جس سے دُوسرے لوگوں کو بھی اس نیکی کی توفیق ہوجائے، تو جب تک لوگ یہ نیک کام کرتے رہیں گے اس کا ثواب اس پہلے والے کو بھی ملتا رہے گا، اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی طریقہ گناہ کا جاری کیا تو آئندہ جتنے لوگ اس گناہ میں مبتلا ہوں گے اس کا وَبال اس شخص کو بھی پہنچے گا جس نے اوّل یہ بُرا طریقہ جاری کیا تھا۔ اسی طرح روایاتِ حدیث سے ثابت ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل کا ثواب دُوسرے آدمی کو دینا چاہے تو اس کو یہ ثواب پہنچتا ہے، ان سب صورتوں میں بغیر قصد و اِرادہ کے اِنسان کو ثواب یا عذاب ہو رہا ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ یہ ثواب وعذاب بلا واسطہ اس کو نہیں پہنچا، بلکہ دُوسرے کے واسطے سے پہنچا ہے، اس کے علاوہ جو واسطہ بنا ہے اس میں اس کے اپنے عمل اور اختیار کو بھی دخل ضرور ہے، کیونکہ جس شخص نے کسی کا ایجاد کیا ہوا اچھا یا برا طریقہ اختیار کیا اس میں پہلے شخص کے عملِ اختیاری کا دخل ضرور ہے، اگرچہ اس نے اس خاص اثر کا ارادہ نہ کیا ہو، اس طرح کوئی کسی کو ایصالِ ثواب جبھی کرتا ہے جب اس نے اس پر کوئی احسان کیا ہو، اس لحاظ سے یہ دُوسرے کے عمل کا ثواب وعذاب بھی درحقیقت اپنے ہی عمل کا ثواب یا عذاب ہے۔

بالکل اخیر میں قرآنِ کریم نے مسلمانوں کو ایک خاص دُعا کی تلقین فرمائی جس میں بھول چوک اور بلا واسطہ خطاءً کسی فعل کے سرزد ہونے کی معافی طلب کی گئی، فرمایا: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ‘‘اے ہمارے پروردگار! بھول چوک اور خطا پر ہم سے مؤاخذہ نہ فرما۔’’ پھر فرمایا: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ یعنی ‘‘اے ہمارے پروردگار! ہم پر بھاری اور سخت اعمال کا بوجھ نہ ڈالئے جیسا کہ ہم سے پہلے لوگوں (بنی اسرائیل) پر ڈالا گیا ہے، اور ہم پر ایسے فرائض عائد نہ فرمائیے جن کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔’’

اس سے مراد وہ سخت اعمال ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد تھے کہ کپڑا پانی سے پاک نہ ہو، بلکہ کاٹنا یا جلانا پڑے، اور قتل کے بغیر توبہ قبول نہ ہو، یا مراد یہ ہے کہ دُنیا میں ہم پر عذاب نازل نہ کیا جائے جیسا کہ بنی اسرائیل کے اعمالِ بد پر کیا گیا، اور یہ سب دُعائیں حق تعالیٰ نے قبول فرمانے کا اظہار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کردیا۔

سورۂ بقرہ تمام ہوئی، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلَهٗ وَآخِرَهٗ وَظَاهِرَهٗ وَبَاطِنَهٗ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۲۵/ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ

***

تفسیر معارف القرآن میں قرآنِ کریم کی سورتوں کی فہرست

جامعہ دار العلوم کراچی

Jamia Darululoom Karachi